150 سے زائد مزاح نگاروں کی تحریروں سے آراستہ اردو ادب
میں طنز و مزاح کا سب سے بڑا انتخاب

بذلہ سنجانِ دو عالم

مرتب

انور احمد علوی

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب
کی خدمت میں بصد خلوص و احترام

شجاع الدین

۲۵ اپریل ۲۰۱۹ء

شجاع الدین غوری
ڈی-۲، ارم پیلس بلاک ۱۳-اے
گلشن اقبال، کراچی [illegible]

شجاع الدین غوری
ڈی-۲، ارم پیلس بلاک ۱۳-اے
گلشن اقبال، کراچی [illegible]

یہ مضامین اُردو اَدب کے طنزیہ و مزاحیہ اثاثے میں ریکارڈ کی غرض سے مرتب کیے گئے ہیں۔ کسی بھی قسم کی مطابقت یا مشابہت کے لیے مرتب، پرنٹر، پبلشر، ڈسٹری بیوٹرز، یا ادارہ ذمے دار نہ ہوں گے۔ ادارہ کا مضمون نگاروں کی آراء سے متفق ہونا بھی ضروری نہیں۔

(150 سے زائد مزاح نگاروں کی تحریروں سے آراستہ اُردو اَدب میں طنز و مزاح کا سب سے بڑا انتخاب)

بذلہ سنجانِ دو عالم

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

مرتب

انور احمد علوی

ناشر

رنگِ ادب پبلی کیشنز

نگرانِ اشاعت
شاعر علی شاعر
0345-2610434

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

کتاب : بذلہ سنجانِ دو عالم
مرتب : انور احمد علوی
کمپوزنگ : بزمِ مزاح
اشاعت : 2015ء
ناشر : رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی
ای میل : rangeadab@yahoo.com
تعداد : 500
صفحات : 880
قیمت : =/1000 روپے

پبلی کیشن کی جدید ٹیکنالوجی کے مطابق کتاب کی اشاعت کے لیے رابطہ کیجیے
رنگِ ادب پبلی کیشنز
5-کتاب مارکیٹ، اردو بازار، کراچی

اِنتسِابُ

مشتاق احمد یوسفی کے نام

انور احمد علوی

کہا جاتا ہے طنز و مزاح صرف وہی لوگ پڑھتے ہیں جو معاشرتی و سماجی شعور رکھتے ہوں۔ ہم آج تک یہی سوچ کر طنزیہ و مزاحیہ کتابیں پڑھتے رہے۔ آپ بھی یہی سمجھتے ہوئے یہ کتاب خرید لیں۔ سوچ لیں... گرانی کے اِس دور میں چند سو روپے کے عوض اپنا شمار ’باشعور افراد‘ میں کروانا کچھ مہنگا سودا نہیں!

(مرتب)

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

فہرست

مقدمہ

❖...... گو... مزاح... گو	انور احمد علوی	15

مضامین

● ...... آزاد رشیدی	خس کم جہاں پاک!	19
● ...... ابصار قادری	ناموں کا بحران	27
● ...... ابراہیم جلیس	لیڈری کا امتحان... آر ایل پی	32
● ...... ابن انشا	احوال مغلیہ خاندان کا!	37
● ...... ابن صفی	قصہ ایک ڈپلومیٹ مرغ کا!	40
● ...... ابوالفرح ہمایوں	بھنگنوں کی توپ	56
● ...... ارشد میر	فارغ البالی	61
● ...... احمد جمال پاشا	چمچہ کانفرنس	73
● ...... احمد صغیر صدیقی	ایک شعر کا تجزیہ	78
● ...... احمد ندیم قاسمی	وزارت کا خوف	81

● ...... اشفاق احمد	پوتی اپنے دادا کی نگرانی میں!	86
● ...... اظہر حسن صدیقی	میں اپنا ووٹ کس کو دوں؟	88
● ...... اقبال تبسّم	شگفتہ شگفتہ	91
● ...... اقبال ساغر صدیقی	لاؤڈ اسپیکروں کا عذاب	94
● ...... اکبر حمیدی	نظام سقّہ	98
● ...... آمرؔ	اِن سے ملیے	102
● ...... اندر جیت لال	تکیۂ کلام	105
● ...... انجم مان پوری	میر کلو کی گواہی	111
● ...... انور احمد علوی	غالب کے چند غیر مطبوعہ خطوط!؟	117
● ...... ایس ایچ جعفری	اپنا انتقال!	124
● ...... برق آشیانوی	اعضائے رئیسہ اور سر	128
● ...... بھارت چند کھنہ	ضرورت ہے... ایک صدر کی!	133
● ...... پیرزادہ شرفِ عالم	قصہ ہماری پرنسپلی کا!	141
● ...... پروفیسر محمد ظریف خان	سفرنامہ ’رنگی ٹون‘ پونے پانچ!	145
● ...... پروفیسر محمد یامین شیخ	چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر	149
● ...... پرویز ید اللہ مہدی	کہانی پر بیٹھنا	154
● ...... پطرس بخاری	اُردو کی آخری کتاب	161
● ...... جاوید اصغر	ضرورتِ رشتہ	164
● ...... جاوید علی	ٹوئنٹی ٹوئنٹی	167
● ...... چراغ حسن حسرت	روشن خیال	169
● ...... حاجی لق لق	سونے کے دانت!؟	172
● ...... حکیم سیّد ارشاد	خاوند بیوی	178
● ...... حسین امیر فرہاد	کچھ نئی اور پرانی چیزیں اور اُن کا استعمال	184
● ...... خادم حسین مجاہد	رازدارِ حیوانات	186

● ...... خواجہ حسن نظامی	جھینگر کا جنازہ	194
● ...... خواجہ عبدالغفور	خود برداشتہ مزاح	196
● ...... خورشید احمد عون	مسجد کا نہ رکھا...	202
● ...... دلیپ سنگھ	معذرت نامہ	205
● ...... ڈاکٹر اقبال ہاشمانی	تصویری خبرنامہ	212
● ...... ڈاکٹر انور سدید	حق مغفرت کرے!	217
● ...... ڈاکٹر رؤف پاریکھ	ریلوے اور اونٹ	221
● ...... ڈاکٹر سلیم اختر	چھٹا بادشاہ	226
● ...... ڈاکٹر صفدر محمود	مولوی گڈو	230
● ...... ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی	کہنا تھا کیا، کیا کہہ گئے!	238
● ...... ڈاکٹر عابد علی	اک قصۂ پارینہ!	242
● ...... ڈاکٹر عابد معز	یہ نہ تھی ہماری قسمت...	245
● ...... ڈاکٹر محمد محسن	خاندانی حکیم	252
● ...... ڈاکٹر محسن مگھیانہ	لارے شاہ	256
● ...... ڈاکٹر منصور احمد باجوہ	انسان اور جانور	265
● ...... ڈاکٹر محمد وسیع اللہ خان	شادی کی دعوت	270
● ...... ڈاکٹر محمد یونس بٹ	گنجِ گرانمایہ!	273
● ...... ڈپٹی نذیر احمد دہلوی	کچھ مزاحیہ اقتباسات	276
● ...... راجہ مہدی علی خان	راجہ اور راجندر	278
● ...... رتن ناتھ سرشار	اندھیر نگری	296
● ...... رشید احمد صدیقی	صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے!	299
● ...... رشید ارشد	ایصالِ شراب!	302
● ...... رشید بٹ	قصہ یوسفی صاحب سے 'تاثرات' لکھوانے کا!	308
● ...... رشید قریشی	بڑھاپا اور کبریٰ بیگم	314

● ...... رفیع الدین راز	خیال رکھنا	319
● ...... رئیس امروہوی	اچھے مرزا بنام مرزا پھویا مدظلہ العالے!	324
● ...... زاہد ملک	عاشقوں سے برادرانہ اپیل!	329
● ...... سعادت حسن منٹو	ترقی یافتہ قبرستان!؟	337
● ...... سر سیّد احمد خاں	بحث و تکرار	340
● ...... سلمان بٹ	خاموشی	342
● ...... سلیم آغا	اَدبی مکاتبِ فکر	345
● ...... سیّد ابوظفر زین	دولہا میاں کو سلامی	355
● ...... سیّد امتیاز علی تاج	چچا چھکن نے ایک خط لکھا!	358
● ...... سیّد امجد حسین	ایک 'ایم ایل اے' کی ڈائری کے چند ورق!	366
● ...... سیّد انیس	شرمیلے خطوط!	370
● ...... سیّد سجاد حیدر یلدرم	مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ!	380
● ...... سیّد ضمیر جعفری	دیوان صاحب	385
● ...... سیّد غلام حسین جعفری	مرزا کی موٹر سائیکل	392
● ...... سیّد مبشر منظور	ہائے ری ڈگری!	396
● ...... سیّد محبّ الحق محشر	اسٹیل کا بکس	401
● ...... سیّد محمد جعفری	نکتہ چیں	409
● ...... سیّد معراج جامی	بہوؤں میں ہے ایک!	413
● ...... شان الحق حقی	نشترِ طنز سلامت	417
● ...... شجاع الدین غوری	شیخ چاند	421
● ...... شفیع عقیل	غالب کے مصرعے	425
● ...... شفیق الرحمٰن	مجبوریاں	429
● ...... شفیق زادہ	بینک گزیدہ	439
● ...... شوکت تھانوی	ماسٹر صاحب	446

- ...... شوکت جمال کھل گیا جھاکا 450
- ...... شوکت علی مظفر زنبیل 454
- ...... صبیح محسن در مدحِ افسرانِ بالا 457
- ...... صدیق سالک ماڈرن تعزیت نامہ! 462
- ...... صولت رضا نائٹ کلب 465
- ...... ضیاء الحق قاسمی قیامت کی چال 470
- ...... ظفر اقبال کھوکھر ہدایت نامہ افسانہ نویسی 472
- ...... ظفر عمر زبیری ہٹ لِسٹ 476
- ...... عاصی کرنالی اقبال کی برکتیں 481
- ...... عبدالماجد دریابادی الفاظ کا جادو 486
- ...... عرفان احمد خان اُردو کی آخری مکمل کتاب!؟ 491
- ...... عزیز جبران انصاری طرفہ تماشا 494
- ...... عطاء الحق قاسمی لاہور کا تاریک جغرافیہ 497
- ...... عطاء اللہ عالی شفیق شفیق اور مزید شفیق الرحمٰن 501
- ...... عطاء اللہ سجاد اگر شیطان مرجائے! 507
- ...... عظیم اختر کرنا نظامت مشاعروں کی! 510
- ...... عظیم سرور میں خودکشی کرنے چلا! 515
- ...... علی سفیان آفاقی ہم نے پہلی فلم دیکھی! 520
- ...... علیم خان فلکی غزل اور پاپ گانے والوں سے التماس! 523
- ...... غفور اسد ماں کا دعا... ساس کا بددعا! 528
- ...... فاروق قیصر سردار جی کا خط! 534
- ...... فخرالدین کیفی ڈیٹ! 537
- ...... فرید بھٹہ پگلا کہیں کا! 540
- ...... فکر تونسوی میر بیمار ہوئے 543

● ...... قاسم بن نظر	ڈاکیا	552
● ...... قدرت اللہ شہاب	کیا لکھوں، کیا نہ لکھوں؟	555
● ...... کرشن چندر	پرہیز	557
● ...... کرنل محمد خان	بڑے لوگ	564
● ...... کلیم چغتائی	گردانِ گردن	569
● ...... کنہیالال کپور	مس چنبیلی	573
● ...... کوثر چاند پوری	کرسی	580
● ...... گلِ نوخیز اختر	مَیں بقلم خود	584
● ...... محمد اصغر خان	زرعی تحقیق	586
● ...... محمد خالد اختر	کراچی کا جغرافیہ	590
● ...... مرزا حیدر عباس	سائنسی اُصول	599
● ...... مرزا فرحت اللہ بیگ	میر صاحب	601
● ...... مرزا عابد عباس	قصہ ایران میں بیگم کے بچھڑ جانے کا!	605
● ...... مشفق خواجہ	غالب کا خط... مرزا ظفر الحسن کے نام	607
● ...... مجتبیٰ حسین	ٹوکیو میں ابنِ اِنشا کی یاد	614
● ...... محمد ارشاد اللہ	ہرفن مولا دیہاتی خواتین	620
● ...... محمد انوار احمد	ہم بھی ہوئے بیمار!	626
● ...... مرزا عاصی اختر	چاچا چوہان	631
● ...... مرزا عظیم بیگ چغتائی	امتحان زدہ	636
● ...... مرزا محمود بیگ	کیسے نبھاؤں کماؤں بیوی سے؟	643
● ...... محمد افضل خان	نکلے جو دانت نکلوانے!	650
● ...... محمد اکرم سرا	چک چوالیس کا اسکول ماسٹر!	657
● ...... محمد عادل گلزار	قوم سے خطاب!	666
● ...... محمد عثمان فاروق	ہوم اکنامکس	668

● ...... محمد عثمان جامعی	تعزیت کا سلیقہ	670
● ...... محمد ممتاز راشد	متضاد ناموں کا تماشا	677
● ...... محمد منور	مجلسِ ترقیِ تنقید	679
● ...... محمد منشا یاد	پھر کیا ہوا؟	689
● ...... مسٹر دہلوی	ہدایت نامہ تقریظ نگاری!	698
● ...... مسعود احمد چیمہ	نہ مسٹر نہ مولانا	702
● ...... مسعود مفتی	غلطی	706
● ...... مسیح انجم	دستر خوان کے شیر + شعر	714
● ...... مشتاق احمد یوسفی	صحافت سے سفارت تک!	720
● ...... مشکور حسین یاد	شاہی شتر غمزے	727
● ...... منصور احمد	محاورے اور ضرب الامثال	734
● ...... ملک دیوانا	حکیم فخر الدین	738
● ...... معین اعجاز	سفر ہے شرط... لیکن بس کا!	742
● ...... ملا رموزی	لندھن کا عنابی دربار	746
● ...... مولوی عبدالحق	آسان اُردو	750
● ...... م ن عشرت	نزلہ کہیں جسے!	754
● ...... منصور قیصر	اندر کی ٹوٹ پھوٹ	764
● ...... منو بھائی	مکتوبِ خالصتان	769
● ...... مہزاد سحر	ہیلو ہیلو!	773
● ...... میرزا ادیب	یہ انشائیہ نہیں ہے!؟	777
● ...... نادر خان سرگروہ	انڈہ اسکوپی	785
● ...... نسیم سحر	نقادِ اعظم – حضرت نامی گرامی	789
● ...... نظیر صدیقی مرحوم	نظیر صدیقی	793
● ...... نواب سیّد محمد آزاد	ایک مکتوب بیوی کے نام!	804

● ...... نواب مشتاق احمد خان	میری بھینس کوٹھے چڑھی	805
● ...... ن م راشد	اقبالستان سے خط	809
● ...... نریندر لوتھر	حیدر آباد کا تغرافیہ	818
● ...... نعیم نیازی	گھوڑے، کبھی بوڑھے نہیں ہوتے!	826
● ...... وجاہت علی سندیلوی	برکت ایک چھینک کی!	832
● ...... وقار محسن	بینک......'باؤ بس'	840
● ...... وحید الرحمٰن خان	آسمان سے کھجور تک!	843
● ...... ہری چند اختر / بشیر منذر	غالب اپنے کلام کے آئینے میں!	849
● ...... یوسف مرزا	ہم نے مشاعرے کی صدارت کی!	865
● ...... یوسف ناظم	ہم اور خانے	873

نا چاہتے ہوئے بھی!؟

ہم نے ادب سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا فیصلہ کرنے سے چند روز قبل یہ کتاب مرتب کرنے کا وعدہ کرلیا تھا۔ یہ خیال ہی نہ رہا کہ ہم نہ تو کسی شاعرہ کے 'محبوب' ہیں، جو وعدہ خلافی کرسکتے، نہ ہی ہمارا تعلق کاروباری طبقے سے ہے، جو اتنی غلط بیانی کرتا ہے کہ سیاستدانوں کے دعوے سچ لگنے لگتے ہیں! اس لیے دل پر پتھر رکھ کر کام کا آغاز کردیا۔ یہ کیسا اَدب ہوا کہ خود ہی کتاب لکھو، خود ہی کمپوز کراؤ، پھر خود ہی پڑھو بھی، خود ہی اپنے خرچ پر چھپواؤ، خود ہی مفت میں تقسیم کرو۔ خود ہی خبر لگواؤ، خود ہی تبصرہ کر کے تبصرے کے لیے بھجواؤ اور چھ مہینے تک اخبار خریدتے اور تبصرہ ٹٹولتے رہو۔ اور... اور پھر خود ہی تقریبِ رُونمائی منعقد کروا کے خود اپنی ہی آنکھوں میں دُھول جھونکو، پھر خود ہی اُس کی رُوداد قلمبند کرو۔ اگر غلطی سے کتاب دکانوں پر رکھوا دو تو رقم کی وصولی کے لیے مفت میں اپنے جوتے بھی گھسواؤ۔ 'کربِ تخلیق' شاید اِس آگاہی کو ہی کہتے ہوں گے! بقول ہمارے دوست کامی، ''بے وقوف بنو اور دانشور کہلاؤ!'' نجانے وہ کون لوگ ہیں، جنہیں اِن حالات میں بھی کتاب چھاپ کر فخر محسوس ہوتا ہے، ہمیں تو فقر محسوس ہوتا ہے!! اس لیے ادب سے کنارہ کشی ہمارے لیے تو سودمند ہوگی ہی، ادب کے لیے بھی نیک شگون ثابت ہوگا!

نیز ایک طرف اُردو زبان میں الفاظ کی ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہے، وہ آخری سانس لے رہی ہے، پھر بھی کچھ لوگ رسم والخط، ہجوں اور تلفظ کے اصلاح کی بات کر رہے ہیں۔ مرکب اور مفرد الفاظ کے چکر میں اپنا سر کھپا رہے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا کی زبان کا رونا رو رہے ہیں! شکر نہیں کرتے کہ ملک کی طرح زبان بھی کسی نہ کسی شکل میں زندہ تو ہے۔ جہاں 67 برس گزرنے کے باوجود، 'انجمن ترقیِ اُردو' کی مجوزہ عمارت کا نقشہ ایک خواب ہو، وہاں 'ترقیِ اُردو' کی کیا تعبیر! دراصل الفاظ کی یہ ٹوٹ پھوٹ ہی کسی زبان کے وجود میں آنے یا عدم میں لے جانے کا سبب بنتی ہے۔ کبھی اُردو زبان بھی الفاظ کی اسی ٹوٹ پھوٹ کے نتیجے میں ہی معرضِ وجود میں آئی تھی۔ دوسری طرف ایک انتہا پسند طبقہ ہے، جو کہتا ہے کہ بس کام چلاؤ، الفاظ کے درست تلفظ اور صحیح استعمال پر مت جاؤ۔ بس یہ دیکھو کہ مطلب ادا ہو رہا ہے، یا نہیں۔ اب اِن کو کون سمجھائے کہ انگریزی زبان میں "Episode" اور "Installment" دو ہم معنی لفظ ہیں، لیکن ہم نے اِن میں سے کسی کو کبھی یہ کہتے نہیں سنا کہ "میں نے مکان کی آخری "Episode" جمع کروادی ہے!" یا "یہ ڈرامے کی پانچویں "Installment" ہے!" حالاں کہ کام تو یوں بھی چل سکتا ہے۔ انگریزی زبان میں تو یہ لوگ الفاظ کے درست استعمال کا خوب خیال رکھتے ہیں، کوئی غلطی کرے تو ٹوکتے ہیں اور... اور اُردو میں بس کام چلاؤ کی تلقین کرتے ہیں!

بہر کیف، آمدم برسرِ مطلب! آج کل یہ روش عام ہے کہ بھاری بھرکم نام رکھ کر کوئی کام کیا جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے پی ایچ ڈی کا کوئی مقالہ ہے (بقول شخصے 'منہ کالا' ہے)۔ مثلاً، "اُردو مزاح نگاری میں سسرال والوں کا کردار!" مگر کتاب 'انور احمد علوی' سے شروع ہو کر 'انور احمد علوی' پر تمام ہو جاتی ہے اور قاری بے چارہ دانتوں میں اُنگلی دبا کر رہ جاتا ہے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ مرتبین، متعلقہ شاعر و اَدیب سے خاطر خواہ محنتانہ وصول کرنے کے بعد اہلِ اَدب سے اپنے اِس کام کی ستائش بھی چاہتے ہیں! اللہ اللہ!

ہم ایسی کُل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے
ہیں!

کامی کے خیال میں یہ اُن لوگوں سے پھر بھی بہتر ہیں، جو اَدب کی خدمت کے دھوکے میں مفت میں اپنا وقت اور روپیہ برباد کر رہے ہیں!

لیکن ہماری یہ کتاب اسمِ با مسمیٰ ہے، جسے مسمی نے (نا چاہتے ہوئے بھی) اس طرح مرتب کیا ہے کہ ڈیڑھ سو سے زائد معروف اور غیر معروف مزاح نگاروں کے مضامین یکجا ہو کر ایک کتاب کی صورت میں منظرِ عام پر آ گئے ہیں، کیوں کہ ہم امریکا کی طرح عالمی سطح پر تباہی کے قائل ہیں! علاقائیت کے قائل ہوتے تو یہ کتاب 'بذلہ سنجانِ گلشنِ اقبال ٹاؤن' کے نام سے مرتب کرتے۔ البتہ ہم اِن مضامین کو 'اُردو ادب کی بہترین مزاحیہ تحریریں' نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ اِن میں ایک تحریر ہماری بھی شامل ہے! اس مجموعے میں اکثریت اُن مزاح نگاروں کی ہے، جن کے ذکر کو کسی نے کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ یقیناً اِن مزاح نگاروں میں کچھ 'اہلِ کتاب' بھی ہوں گے، مگر آج تک نہ کسی مقالے میں اِن کا نام دیکھا، نہ کسی بقالے میں اِن کی کتاب! 'اُردو کانفرنس' کے شرکاء کی طرح ہر مقالے میں وہی گنے چنے نام شامل ہوتے ہیں، جو کبھی کسی پہلے مقالہ نگار نے جمع کر دیے ہوں گے۔ وجہ اِس تجاہلِ عارفانہ کی سوائے اِس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ کسی تقریب میں معمولی سا مزاح نگار موجود ہو تو وہ محفل لوٹ لیتا ہے اور ایک عام مزاح گو شاعر کے بعد بڑے بڑے نقاد شاعر بھی مشاعرے میں کلام پڑھنے سے گھبراتے ہیں۔ ہم نے کئی شاعروں کو منتظم سے لڑتے ہوئے بھی دیکھا ہے کہ مزاحیہ شاعر کے بعد مجھے کیوں پڑھوایا۔ اِس میں کسی بیرونی قوت کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے! دوسری طرف ہمارے کچھ مزاح نگاروں کا یہ حال ہے کہ وہ دوسروں پر تو طنز کرتے ہیں، اگر اُن کے بارے میں کوئی شامت کا مارا جملہ کس دے تو موقعِ واردات پر ہی اُس کا قرض چکا دیتے ہیں۔ بقول کامی، ایسے لوگوں کو اَوروں پر طنز کرنے کا کوئی حق نہیں! مزاح نگار تو باظرف ہوا کرتا ہے!

بہر حال، ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ پیشہ ایسا اختیار کرنا چاہیے، جس میں عام لوگ جانے سے گھبراتے ہوں۔ عملی زندگی میں تو ہمیں اس ہدایت پر عمل کرنے کا موقع نہ ملا۔ چوں کہ عرفِ عام میں مزاح نگاروں کے بارے میں یہی خیال کیا جاتا ہے کہ اِن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے، اس لیے اِس مفروضے پر عمل کرتے ہوئے ہم نے ادبی زندگی میں اس نصیحت کو اپنا شعار بنا لیا، یعنی مزاح نگاری کے شعبے میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ لیکن ہم اب اِس قول سے اتفاق نہیں کرتے کہ اُردو زبان میں مزاح نگاروں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے! ہماری دس انگلیاں ہیں، جن میں تیس پوریں ہیں، اگر پاؤں کی دس انگلیاں اور اُن کی تیس پوریں شامل کر لیں تو بھی مزاح نگار

اتنے کم نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے جو لوگ ایسا کہتے ہیں، اُن کی انگلیاں بارہ ڈِجٹ کی ہوں اور وہ مزاح نگاروں کے نام تسبیحات کی طرح اپنی انگلیوں پر گن لیتے ہوں، جب کہ ہماری انگلیاں تو تین ڈِجٹ کی ہیں۔ یہ لوگ دراصل تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور صرف اُن کتابوں کو شمار کرتے ہیں جو مصنّفین یا ناشران کی طرف سے اُنھیں مفت فراہم کر دی جاتی ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ کتابوں پر انعامات بھی اسی فارمولے کے تحت تقسیم کر دیے جاتے ہیں۔ اپنی بات کی تائید میں ہم سرِ دست صرف اُن مزاح نگاروں کا حوالہ دیں گے، جن کی تحریریں اِس انتخاب کی زینت بنی ہیں۔ ذرا اِن میں سے صرف زندہ مزاح نگاروں کے نام ہی اپنی انگلیوں پر گن کر دکھایئے! جب کہ ابھی لاتعداد مزاح نگار باقی ہیں اور اِن میں خواتین مزاح نگار بھی شامل نہیں ہیں۔

اِن مزاح نگاروں سے ہمارا تعلق صرف اُن کے کام کی وجہ سے ہوا۔ اِن میں سے اکثر کو ہم نہیں جانتے اور بیشتر ہمیں نہیں جانتے ہوں گے۔ ویسے بھی ہمیں کوئی نہیں جانتا، سوائے اہلیہ کے، کیوں کہ وہ اکثر کہتی رہتی ہیں کہ میں اب آپ کو اچھی طرح جان گئی ہوں!!

انور احمد علوی
(سابق مزاح نگار)
کراچی 21 دسمبر 2013ء

Website: www.anweralvi.tk
E-mail: bazmemizah@yahoo.com
Cell : +92 21 300-7029565

خس کم جہاں پاک!

آزاد رشیدی

اللہ سب کو سالے دے، لیکن نیک اور صالح دے۔ بزرگوں کے اس مقولے کے پیشِ نظر میں نے قبل اَز خانہ آبادی اپنے خدائے بزرگ و برتر سے یہ دعا مانگی کہ مجھے نیک اور صالح سالے دے۔ دعا کچھ اس طرح قبول ہوئی کہ ایک عدد شیر خوار سالا نکاح میں بندھ کر بیگم صاحبہ کے ہمراہ آ گیا اور اُس کی کرم فرمائیاں شروع ہو گئیں۔ اس سے پہلے کہ سالے صاحب کی کرم فرمائیوں کے تذکرے کروں، ان کے وارد، بلکہ نازل ہونے کے بارے میں بتاتا چلوں۔ میرے یہ برادرِ نسبتی نہ صرف اپنے والدین کی آخری اولاد ہیں، بلکہ اکلوتی اولادِ نرینہ ہیں۔ دنیائے خوش رنگ میں آنے کے بعد ان کی پرورش ان کی ہمشیرہ یعنی میری بیگم صاحبہ کے ذمّہ ٹھہری۔ چنانچہ وہ ان سے بہت زیادہ مانوس ہو گئے۔ بہ وقت نکاح اپنی ہمشیرہ کی گود میں لیٹے دودھ کی شیشی پی رہے تھے۔ قاضی نے ہم دونوں کو رشتۂ ازدواج میں باندھا، یہ گو خود بخود بندھ گئے۔ وقتِ رخصتی لوگوں نے انہیں چھڑانا چاہا تو انہوں نے رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ ان کی حالتِ زار دیکھ کر ایک تجربہ کار ضعیفہ نے مشورہ دیا۔ ”ارے جانے دو اسے۔ بہن کے ساتھ اس کے جانے سے فرق بھی کیا پڑے گا، بچہ ہے رات رات بھر پڑا سوتا رہے گا۔“ اور اس طرح یہ اپنی ہمشیرہ کے ساتھ حجلۂ عروسی تک پہنچ گئے۔

کیسی کیسی آرزوئیں، کیسی کیسی تمنائیں دل میں چھپائے نصف شب کے وقت حجلۂ عروسی میں داخل ہوئے تو پہلی نظر برادرِ نسبتی پر پڑی، جو اپنی ہمشیرہ کی گود میں محوِ خواب تھے۔ بیگم صاحبہ نے چاہا کہ انہیں بستر پر لٹا دیں، وہ بیدار ہو گئے اور پلک جھپکتے اپنی ہمشیرہ کے جسم سے ایسے چمٹ گئے، جیسے گوشت میں کنگھجورا چمٹ جاتا ہے۔ میں اور بیگم صاحبہ دونوں حسرت و یاس کا پیکر بنے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ القصہ مختصر کہ وصل کی شب، ہجر کی شب میں تبدیل ہو گئی۔ آرزوئیں اور تمنائیں دل کی دل ہی میں رہ گئیں، بلکہ منجمد ہو گئیں۔ خیر سے تین دن تک یہی قیامت برپا رہی۔

چوتھے روز خوش دامن صاحبہ انہیں اپنے ہمراہ لے گئیں، تب کہیں جا کر منہ اجیارا ہوا لیکن دو دن بعد پھر واپس آ گئے۔ بیگم صاحبہ کی ان سے محبت والہانہ دیکھ کر شیوۂ زباں بندی اختیار کیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بیگم صاحبہ شجرِ بے ثمر نکلیں تو ان کی جڑیں اور گہرائی میں اُترتی چلی گئیں، لیکن اس کے باوجود ان کی محبت میرے دل میں گھر نہ کر سکی۔ موصوف جیسے جیسے شعور کی سیڑھیاں چڑھتے گئے، ویسے ویسے نئے گل کھلاتے گئے۔ عمر کی چوتھی سے پانچویں سیڑھی پر چڑھے تو ان کی ہمشیرہ نے ایک دن مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ارے میاں کچھ فکر بھی ہے؟“

”کس بات کی؟“

”پھندن میاں چار سال چار دن کے ہو گئے ہیں۔“

”اس میں فکر کرنے کی کون سی بات ہے، چند سالوں میں چودہ سال چار دن کے ہو جائیں گے۔“

”جب سے تم نے اس نگوڑی ماری شاعری سے اُلفت بڑھائی ہے، کہیں کے نہیں رہے ہو۔“

”بیگم! پہیلیاں نہ بجھواؤ، صاف صاف بتاؤ کیا بات ہے؟“

”امی آئی تھیں۔“

”امی کا تو ہر ہفتہ دورہ ہوتا ہے!“

”منع کر دوں اُنہیں آنے سے؟“

”میری یہ مجال۔“

”مذاق چھوڑ و اور کان لگا کر سنو۔“

”سنائیے!“

”امی کہہ رہی تھیں کہ پھندن میاں خیر سے چار سال کے ہو گئے ہیں، چنانچہ ان کے دولھا بھائی کو چاہیے کہ ان کی رسم بسم اللہ کر دیں۔“

”دولھا بھائی کو حکیم نے نسخے میں نہیں لکھا کہ وہ پھندن میاں کی رسم بسم اللہ کی تقریب منعقد کریں۔“

”لو جی! یہ بھی خوب رہی، امی نے اپنے تن کا تکہ کاٹ کر تمہارے حوالے کر دیا اور تم چار چھ

ہزار خرچ نہیں کر سکتے۔“

”بیگم صاحبہ! آپ اپنی امی جان سے اس بندۂ حقیر، پر تقصیر کی جانب سے عرض کر دیجیے کہ وہ اپنے تن کا تکہ واپس اپنے تن سے لگا لیں۔ بندہ اس خدمت بے وقت و بے مصرف سے قطعاً معذور ہے۔“

”میاں جی! ہوش کے ناخن لو، اپنے کہے پر غور کرو، ایسا نہ ہو کہ اپنی ہماہمی میں اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا جنازہ نکال بیٹھو۔“

بیگم صاحبہ کی اس دھمکی نے سارے کس بل نکال دیے۔ مرتا کیا نہیں کرتا کے مصداق حکم دخترِ حوا کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور جو پونجی پیٹ کاٹ کر جوڑی تھی، برادرِ نسبتی کی رسم بسم اللہ کی تقریبِ اذیت ناک پر صرف کر دی۔ بیگم صاحبہ نے اتنا سب کچھ کرنے کے باوجود قارونِ ثانی ہونے کا خطاب مرحمت فرمایا اور ساتھ ہی ساتھ اس احسان کا ٹوکرا بھی میرے سر پر اوندھا کر دیا کہ امی نے تمہارے پھندن میاں کو چاندی کی تختی، قلم اور دوات دی ہے۔ دل تو چاہا جواب دیں، لیکن ہائے مجبوری کچھ نہ کہہ سکے۔

چنانچہ چند دن بعد پھندن میاں کو ایک مولوی صاحب نے پڑھانا شروع کر دیا۔ چار سال تک مولوی صاحب نے ان کے ساتھ اپنا مغز کھپایا، لیکن پھندن میاں 'الف' سے اُلّو اور 'ب' سے بکری سے آگے نہ بڑھ سکے۔ آخر مولوی صاحب نے انہیں پڑھانے سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ اگر وہ اتنی محنت اُلّو پر کرتے تو وہ بھی پڑھنا لکھنا سیکھ جاتا! مولوی صاحب کے رخصت ہونے کے بعد پھندن میاں بالکل آزاد ہو گئے۔ سارا دن محلے کے آوارہ بچوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتے، شام کو اپنی ہمشیرہ سے درازیِ عمر کی دعا لے کر نیند کے سمندر میں غرق ہو جاتے۔ پھندن میاں کے یہ طور طریقے ان کی امی کو ایک نظر نہ بھائے تو اس کا سہرا بھی میرے سر باندھ دیا۔ چنانچہ میں نے اپنے سر سے اس بلا کو ٹالنے کے لیے پھندن میاں کو یتیم خانے کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا اور پھر پھندن میاں نے اس اسکول سے جیسے تیسے میٹرک پاس کر لیا، لیکن قابلیت کے لحاظ سے صفر رہے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ان کی توجہ فیشن کی طرف مبذول ہو گئی۔ روز نت نئی شکلیں بناتے۔ ہر ہفتے ان کے بالوں کی نئی تراش خراش ہوتی۔ جس کسی کو جس رنگ میں رنگا دیکھتے اسی رنگ میں خود کو رنگنے کی کوشش کرتے۔ ان کو نئے نئے رنگا رنگ لباسوں میں رنگا دیکھ کر اُن کی

ہمشیرہ پھولے نہیں سماتی تھیں، صدقے اُتارتیں اور بلائیں لیتی تھیں اور اپنی امی سے کہتیں کہ اب تو اپنا پھندن روز بروز عقل مند ہوتا جا رہا ہے۔ امی بھی اپنی چہیتی بیٹی سے کچھ یوں گویا ہوتیں، ”بیٹی! آخر کون کس کا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ پھندن نے جس ماں کی آغوش میں آنکھیں کھولی ہیں، اس ماں نے بھی اپنے شوہر کو عقل مند بنایا ہے۔ اللہ رہتی دنیا تک پھندن کے باپ کو زندہ رکھے، خیر سے اتنے عقل مند ہیں کہ ایک سوٹ کا کپڑا منگواؤ تو دو سوٹوں کا کپڑا لے آتے ہیں۔ دنیا ان کو زن مرید کہتی ہے، لیکن حقیقت میں وہ میری زلفوں کے اسیر ہیں۔ بیٹی! انہوں نے ان زلفوں کی درازی کے لیے کیا کیا جتن نہ کیے۔ پیلی سرسوں کی کھلی سے سر دھلواتے، صبح سویرے اُٹھ کر ریٹھے اور آملوں کا آمیزہ تیار کرتے اور اپنے ہاتھوں سے اس آمیزے کو میرے سر پر لگاتے، بالوں کو سنوارتے، اگر کوئی بال اس دوران ٹوٹ جاتا تو اُس کا سوگ کئی دنوں تک مناتے۔“

اتفاق کی بات پھندن میاں نے اپنی والدہ کی یہ گفتگو سن لی۔ انہوں نے اس گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہمارے والد، جو کہ ہماری والدہ کے بے دام غلام ہیں، یہ سب زلفوں کی کرامت ہے، تو پھر کیوں نہ میں بھی زلفیں رکھ لوں، تا کہ میری ہونے والی بیوی بھی میری غلام بن کر رہے۔ اس دھن کے سوار ہوتے ہی انہوں نے زلفوں کو بے لگام کر دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے۔ وہ غلام فرید قوال کی فوٹو اسٹیٹ بن گئے۔ ان کے اس عمل سے ایک انقلاب بپا ہو گیا۔ روٹی میں بال، سالن میں بال، بستر پر بال، غرض جہاں دیکھیے پھندن میاں کے بال نظر آنے لگے۔ ایک دن ان کی ہمشیرہ کہنے لگیں، ”دفتر سے واپسی پر جوئیں مار دوا لیتے آنا۔“ میں نے پوچھا، ”بی بی اس کا کیا کرو گی۔“ تو کہنے لگیں، ”پھندن میاں کے سر میں جوئیں ہو گئی ہیں، وہ بے چارہ تو ہیر ڈریسر سے نکلوا لیتا ہے، لیکن میں نے سوچا جوئیں مار دوا منگوا کر کم بختوں کا گھر ہی میں خاتمہ کر دوں۔“

بیگم صاحبہ کے انکشاف سے دل دہل گیا۔ ابھی تو پھندن میاں کے ہر طرف بکھرے ہوئے بالوں کا غم تھا، اب یہ اندیشہ بھی لاحق ہو گیا کہ اگر جوئیں اشیائے خوردنی میں شامل ہو کر پیٹ میں چلی گئیں تو پھر میری موت یقینی طور پر مرضِ استسقاء سے ہی ہو گی۔

مستقبل قریب میں رونما ہونے والے اس بھیانک حادثے کے خوف کے تحت دفتر سے واپسی پر بیگم صاحبہ کے حکم کی تعمیل کرنے میں ذرّہ برابر بھی کوتاہی نہیں کی اور آنکھیں بند کر کر جوئیں مارنے والی دوا خرید لی اور پھر اُسے بیگم صاحبہ کو دیتے ہوئے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ ان کے

حضور یہ بھی عرض کیا:

”بیگم صاحبہ آپ کے برادرِ عزیز و رفیق اگر اپنی زلفوں کو قدرے ترشوالیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوگا۔“

ابھی یہ قومی زبان میں چند سادہ اور آسان الفاظ ادا ہی ہوئے تھے کہ بیگم صاحبہ نے تیوری چڑھا کر نثری ہجو کا آغاز کر دیا:

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نجانے کیوں پڑ گئے ہو میرے بھائی کے پیچھے۔ میں نے سوچا تھا کہ اسے امی، ابو کے حوالے کر دوں گی، لیکن اب نہیں کروں گی۔ زندہ ہوں جب تک رہے گا یہ ساتھ میرے، کرنا ہے تم کو جو کچھ کر لینا۔ بچے نے ذرا سے بال کیا بڑھا لیے سانپ لوٹ گیا چھاتی پر تمہاری، تمہیں تو ایک صدی پہلے پیدا ہونا چاہیے تھا۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں تمہارے جیسے کنوئیں کے مینڈکوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ ذرا باہر نکل کر دیکھو تو پتا چلے کہ کتنے بیس کے سو ہوتے ہیں۔“

یوں تو ہر ہفتہ میں دو تین بار اس قسم کی نثری ہجو بیگم صاحبہ میری شان میں تخلیق کر دیتی ہیں، لیکن برا ہو بد قسمتی کا کہ اس شہ پارے کو پھندن میاں نے بھی سن لیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو شرم و حجاب کے پردے میرے اور پھندن میاں کے درمیان پڑے تھے، وہ ایک ایک کر کے اُٹھنا شروع ہو گئے۔ انہوں نے دولھا بھائی کے بجائے یار کہنا شروع کر دیا۔ انہیں ٹوکا تو ہنس کر فرمایا۔

”یار! اگر معیوب ہوتا تو اسے ٹی وی والے نہ استعمال کرتے۔ یار! آپ تو یار کو اَب تک گا بجا رہے ہو۔ بانو قدسیہ زوجہ اشفاق احمد نے چھنال جیسی مکروہ گالی کو اپنے ایک ڈرامے میں جوں کا توں استعمال کر ڈالا ہے۔ یار! مجھے تو یہ بھی معتبر ذرائع اور باوثوق اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ زوجہ اشفاق احمد کو اس کارنامے پر پی ٹی وی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔“ پھندن میاں کی اس بصیرت افروز گفتگو کو سن کر میں نے ان سے پوچھا،

”میاں! یہ تو بتاؤ کہ تم میں اتنی عقل مندانہ گفتگو کا سلیقہ کیسے اور کیوں کر پیدا ہوا ہے۔“

”یار! یہ سب کتابوں کو گھول کر پینے کی کرامت ہے۔“ پھندن میاں نے جواب دیا۔

”کتابوں کو گھول کر پینے سے؟“ میں نے حیرت و استعجاب کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

”ہاں یار! اب تم سے کیا چھپانا، ایک سیانے نے گزشتہ دنوں بتایا تھا کہ اگر اپنی گفتگو میں سلیقہ پیدا

کرنا چاہتے ہو تو اچھی اچھی کتابوں کو گھول کر پی جایا کرو، سو میں اس پر عمل کر رہا ہوں۔"

"میاں! اب تک کتنی کتابیں گھول کر پی چکے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تقریباً تمیں کتابیں۔"

"یہ کتابیں کہاں سے حاصل کی تھیں؟"

"آپ کی الماری سے۔" پھندن میاں نے بہت بے فکری کے ساتھ کہا۔

"میری الماری سے۔" میں نے قدرے ترش لہجے میں کہا۔

"میرے یار! ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ ذرا غور و فکر کے ساتھ سوچیے کہ آپ ٹھہرے ناٹھے نگوڑے، آپ کے انتقال پر ملال کے بعد آپ کی کتابیں رڈی کے بھاؤ فروخت ہو کر کسی پنواڑی یا پرچون کی دکان پر زینت بنتیں، تو اس سے بہتر یہ ہوا کہ میں انہیں گھول کر پی گیا، یعنی اب یہ کتابیں صدقہ جاریہ کی شکل میں تبدیل ہو گئیں، آپ کے انتقال پر ملال کے بعد جب تک میں زندہ رہوں گا، عقل مندانہ گفتگو کرتا رہوں گا اور اس عقل مندانہ گفتگو کرنے سے جو ثواب حاصل ہوگا، اس میں سے کچھ نہ کچھ حصہ آپ کی مغفرت کا سبب بنتا رہے گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ میری نظروں سے دُور ہو گئے۔

ایک دن میں لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ اگر پڑوسی ملک سے جنگ چھڑ گئی تو 'میرے ڈھول سپاہیا' گا کر محاذ پر لڑنے والوں کے جوش و خروش میں اضافہ کون کرے گا، کیوں کہ مادام نور جہاں بسترِ علالت پر دراز ہیں۔ ایک مشہور جریدہ کی اطلاع کے مطابق مہدی حسن کی آواز میں پہلا سا جادو نہیں رہا۔ پکے راگ، راگنیاں الاپنے والے، استاد ایک ایک کر کے عالم برزخ کی طرف جا رہے ہیں۔ نوجوان گلوکار پاپ اور ڈسکو کے علاوہ کچھ جانتے ہی نہیں۔ میں ابھی اسی سوچ میں کھویا ہوا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا، پھندن میاں گھبرائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں طنبورہ اور بغل میں مردنگ تھا۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بہت تیزی کے ساتھ پلنگ کے نیچے گھس گئے۔ اس سے پہلے کہ میں اچانک پیدا ہونے والے ان حالات کو سمجھتا کہ بیگم صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں، ان کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا:

"کیا پھندن یہاں آیا ہے؟"

"خیریت تو ہے۔" میں نے کہا۔

”ایک ثبوت تو آپ کے روپ میں میرے سامنے کھڑا ہے، یعنی شرفاء کے گروہ سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی، اپنے لمبے لمبے گیسوؤں کو کٹوا کر صرف پرکٹی مرغی بن گئیں، بلکہ اس پردے کو بھی بالائے طاق رکھ دیا، جسے آپ کے شریف مورث اعلانے آپ کو بخشا تھا؟“

”لڑکے! یہ سب کچھ تو نہیں کہہ رہا ہے، بلکہ تیرے اندر کا وہ مرد بول رہا ہے جو ہمیشہ سے آزادیٔ نسواں کا مخالف رہا ہے۔“

”ہمشیرہ اجازت ہو تو مشہور زمانہ شرفاء کے جیتے جاگتے کرتوتوں کا احوال بیان کردوں؟“

”اپنی زبان کو لگام دے اور تیرے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ تو یہاں سے دفع ہو جا۔“

”جو حکم ہمشیرہ! ویسے کیا ہی اچھا ہوتا کہ کچھ حقیقتیں اور سامنے آجاتیں۔“

”اب ایک منٹ بھی تیری صورت دیکھنا گوارا نہیں ہے۔“

”درست فرمایا آپ نے، جب خود پر چوٹ پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ درد کیا ہوتا ہے۔“

یہ کہہ کر پھندن میاں نے مردنگ بغل میں دبایا اور طنبورہ کو ہاتھ میں پکڑ کر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے کمرے سے باہر نکل گئے۔

* *

ناموں کا بحران

ابتصار قادری

ایک دھوبی کی بیوی کا نام ماہین اور بیٹے کا نام انضمام سن کر مجھے حیرانی بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ خوشی اس لیے کہ زمانہ ترقی پر ہے اور اپنی مرضی کے نام رکھنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ بڑے گھرانوں کے ذوق اور فیشن کو دیکھ کر چھوٹے گھرانے بھی ان کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ بہر حال، یہ کوئی بُری بات نہیں ہے۔ ایڈیسن جو انگریزی زبان کا مشہور انشا پرداز تھا ایک جگہ لکھتا ہے کہ نیا فیشن پہلے شہر میں داخل ہوتا ہے، پھر اسے دیہاتوں یا گاؤں میں پہنچتے پہنچتے ایک عرصہ لگ جاتا ہے، مگر پہنچتا ضرور ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جب وہ گاؤں میں پہنچتا ہے تو اُس وقت تک وہ شہر میں پرانا ہو کر غائب ہونے لگتا ہے اور اس کی جگہ نیا فیشن آ جاتا ہے، پھر یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں بھی نام وغیرہ پہلے علمی گھرانوں یا اُونچے خاندانوں میں رائج ہوتے ہیں، اس کے بعد گھریلو ملازمین چوری کر کے انہیں اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ لیکن یہ الزام صرف ملازمین پر ڈالنا سراسر ناانصافی ہوگی۔ ناموں کی چوری بہت عام ہوگئی ہے۔ ایک تو لوگوں میں اپنے بچوں کے نئے نام رکھنے کا جنون سا پیدا ہو گیا ہے۔ وہ ایسا نام رکھنا چاہتے ہیں جو انوکھا اور خوب صورت ہو اور جسے اب تک کسی نے نہ رکھا ہو۔ پھر اس نام کو کچھ عرصے تک چھپایا جاتا ہے۔ مگر جب ظاہر ہو جاتا ہے تو ناموں کے چور اسے اغوا کر لیتے ہیں اور پھر اپنے بچوں کے لیے، یا اپنے عزیز و اقارب کے بچوں کے لیے تجویز کر دیتے ہیں۔

ایک زمانے میں جب روس سپر پاور تھا تو روسی زبان کے نام پسند کرنے کا رجحان چل پڑا تھا۔ مثلاً تانیہ، نطاشہ، انوپورنا، اناتولیا، رمزینہ، رویاکا، شپاکا، وغیرہ۔ خدا جانے یہ روسی زبان کے الفاظ ہیں، یا کسی جناتی زبان کے میں نے کسی کو جوالہ اور کسی کو آبگینہ جیسے نام بتائے، لیکن یہ شاید پسند نہیں آئے۔ خاص طور پر لڑکیوں کے لیے انگریزی زبان کے نام بھی رکھے گئے۔ مثلاً بلوسم،

اروما، ارسلہ وغیرہ۔ یہاں تک کہ نادیہ بھی مقبول ہوا' جو شاید اطالوی زبان کا لفظ ہے۔ بادشاہوں کے نام بھی رکھ لیے گئے' تا کہ ہمارے بچوں میں شجاعت، بہادری اور حکمرانی کے اوصاف پیدا ہوں۔ مثلاً جہانگیر، عالمگیر' بابر، فہد، فیصل، ارسلان وغیرہ۔ ماں باپ اپنے بچوں کو تخت و تاج نہیں دے سکتے تو کیا ہوا، کم از کم تاجداروں کے نام تو انہیں عطا کر سکتے ہیں۔ ناموں کا ایسا کال پڑ گیا کہ ہر تیسرا یا چوتھا بچہ یاسر، انعم یا ذیشان کے نام سے موسوم ہونے لگا۔

اداکار ندیم کے نام پر بھی نام رکھے گئے۔ ان کی شہرت جب عروج پر پہنچی تو اس زمانے میں پیدا ہونے والے پچاس سے ساٹھ فیصد بچے ندیم کہلائے۔ اگر ندیم نام کے بیس سے پچیس سال تک کے نوجوانوں کو اکٹھا کر لیا جائے تو ان کا ایک عظیم الشان ریوڑ آپ کو نظر آئے گا۔ اب یہ سمجھنا آپ کی مرضی پر ہے کہ یہ سب ندیم صاحب کی شہرت کے آئینہ دار ہیں؟

لوگوں کو اس کے مطلب سے کوئی غرض نہیں۔ وہ لفظوں کی خوشنمائی پر جان دیتے ہیں۔ 'حرا' جو ایک غار کا نام ہے' بڑے شوق سے لڑکیوں کا نام پڑ گیا۔ میں نے ایک سے کہا، اپنے بیٹے کا نام 'فندق' رکھ لو۔ بولے، ''خندق؟'' میں نے کہا، 'خندق' نہیں 'فندوق'۔ پوچھا، ''اس کا مطلب کیا ہے؟'' اس نے کہا، 'ہوٹل'۔ پسند نہیں آیا۔ میں نے کہا، بچی کا نام 'اشبیلیہ' رکھ لو۔ یہ پسند آیا، مگر کسی پروفیسر نے بھانڈا پھوڑ دیا' اور بتا دیا کہ یہ اندلس کے ایک شہر کا نام ہے' لہٰذا چھوڑ دیا۔ لفظوں کی بھی کیا ہیبت ہوتی ہے میں نے ایک سے کہا۔ 'غرناطہ' وہ یہ سن کر خوف سے کانپنے لگا۔ اس کو یہ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کا صوتی اثر اتنا گراجدار تھا کہ وہ سہم کر رہ گیا۔ آگے کچھ کہنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوا۔

ایک زمانہ تھا کہ بچوں اور بچیوں کے نام بہت عام سے ہوا کرتے تھے اور مقبول تھے مثلاً زلیخہ، سکینہ، شکیلہ، فہمیدہ، عذرا، مجیدہ، حمیدہ، لیمہ، نسیمہ وغیرہ اور نوکرانیوں کے نام اس طرح کے ہوتے تھے مثلاً نصیبن، شریفن، کریمن، مجیدن وغیرہ۔ مگر نوکروں کے ساتھ زیادتی کا یہ عالم تھا کہ انہیں کچھ اس طرح کے نام دیے گئے۔ مثلاً کرمو، فضلو، بخشو، عیدو، چھجو، کالو، بدھو وغیرہ۔ لیکن آگے چل کر نچلے طبقے نے آخر کار نہایت سخت ردِ عمل کا مظاہرہ کیا۔ اور ان کی لڑکیوں کے نام شازیہ، شمائلہ، سحرش، مہوش، نازش، زویا، نوشین، شگفتہ، عاشی وغیرہ ہو گئے۔ اور لڑکے سلمان، توقیر، ارسلان، فیضان اور دانش جیسے ناموں سے مالا مال ہو گئے۔ ان میں فیصل اور فہد بھی پائے جانے

لگے۔ اُونچے خاندانوں کا ناک میں دم آ گیا۔ ان کی لڑکیوں کے سارے نام ثریا، نرگس، سنبل، شہلا، صائمہ، فائزہ، صبا وغیرہ ان لڑکیوں نے چھین لیے، جن کا تعلق نچلے طبقے سے تھا۔ اب نئے ناموں کو ایجاد اور دریافت کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا، لہٰذا شوبز کی فنکار خواتین کے ناموں پر چھاپے پڑنے لگے۔ اُونچے یا درمیانہ طبقے کی لڑکیاں کچھ اس طرح کے ناموں کو اپنانے پر مجبور ہو گئیں۔ مثلاً ریما، سونیا، نرما، مرینہ، شرحہ، فرحہ، شرینہ، شفتالہ وغیرہ۔ واضح رہے کہ ناموں کا نیا پن اور ظاہری حسن کافی ہوتا ہے۔ اندر سے مطلب کچھ ہو یا نہ ہو، اس کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ مطلب کہ حیثیت اور اہمیت بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ لوگ خود سے کوئی نام پسند کر لیں تو اس کا مطلب جاننے کی کوشش نہیں کرتے، لیکن اگر آپ کوئی نام تجویز کر دیں تو فوراً پوچھیں گے کہ اس کا مطلب بتائیے۔ اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میں نے ایک سے کہا اپنی بیٹی کا نام 'شنگرف' رکھ لو۔

فوراً بولے، ”اس کا مطلب کیا ہے؟“

میں نے کہا، ”بہت اچھا مطلب ہے یعنی سنگ جراحت۔“

کہنے لگے، ”وہ کیا ہوتا ہے؟“

”یہ بھی وہ ہے، جس کو ہندی میں کہتے ہیں، سمندر سوکھ“ میں نے کہا۔

وہ بولے، ”نہ... نہ... یہ نہیں چلے گا۔“

میں نے کہا، ”پہلے مطلب تو سمجھ لو۔ یہ ایک پتھر ہے جو دواؤں میں استعمال ہوتا ہے اور اس نے بیماروں کو شفا ہو جاتی ہے۔“

وہ نہ مانے تو میں نے کہا، ”پھر ایسا کرو۔ ان میں سے کوئی رکھ لو۔ میجنی، فلیتہ، حاشیہ، ضمرغ۔“

”ضمرغ کا مطلب بتائیے۔“ وہ بولے۔

میں نے کہا، ”ببول کا گوند۔“ بولے، ”لاحول ولاقوۃ۔ بس آپ رہنے دیں۔“

میں نے کہا، ”سمندری جہاز۔“

بولے، ”ایک تو آپ سمندر کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ کبھی سمندر سوکھ اور کبھی سمندری جہاز۔“

میں نے کہا، ”اچھا ٹھیک ہے۔ اب میں ڈکشنری دیکھ کر کوئی اچھا سا نام نکال کر آپ کو بتاؤں گا۔ اور ہاں، وہ جو بیٹا ہے آپ کا تو آپ اس کے لیے ایسا کریں طباشیر نام رکھ لیں۔“

”ہاں لگتا تو اچھا ہے۔“ وہ بولے، ”مگر مطلب؟“

پھر وہی مطالب! میں نے کہا، ”بھئی آپ کا نام گل شیر ہے، وہ طباشیر کہلائے گا۔ مگر یہ شیر وہ جنگل والا نہیں۔ یہ وہ شیر ہے، جسے آپ شیر مال کہتے وقت بولتے ہیں۔“

وہ بولے، ”ٹھیک ہے، مگر مطلب؟“

”پھر وہی مطلب!“ انہوں نے میری دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی اور مطلب پوچھ بیٹھے۔

میں نے کہا، ”بھئی مطلب یہ ہے کہ طباشیر کو ہندی میں کہتے ہیں۔“

”بس، بس، بس... اب آپ رہنے دیں۔“ وہ بولے، ”پتا نہیں کتنا خوفناک مطلب ہوگا۔“

”طباشیر کو ہندی میں کہتے ہیں بنس لوچن، یعنی بانس کی چینی۔“ یہ بانس کے پتے پر پتوں کے نیچے میٹھے ذرّات کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ دراصل یہ میٹھے عرق کی صورت میں نکل کر سوکھ جاتی ہے اور چینی کے ذرّات کی طرح دکھائی دیتی ہے، دواؤں میں کام آتی ہے دل، دماغ اور اعصاب کی تقویت پہنچاتی ہے۔ اور بھی درجنوں بیماریاں اس سے دُور ہو جاتی ہیں...“

میں نے زبردستی اس کا مطلب ان کے کانوں میں ٹھونستے ہوئے شروع کیا۔

انہوں نے پھر میری بات کاٹ دی اور کچھ ناراض سے ہوئے۔ ”صاحب!“ وہ بولے۔

”آپ تو سمجھتے ہیں کہ جیسے میں کوئی عطار خانہ کھولنے جا رہا ہوں۔ آپ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی دوائی ڈھونڈ نکالتے ہیں اور اس کا نام لے ڈالتے ہیں۔ اب آپ چھوڑیں اس چکر کو۔ آگے چل کر آپ کہیں گے خمیرہ گاؤزبان رکھ لو۔ پھر کہیں گے کارمینا، سنکارا، سعالین اور آخر کار ماد اللحم تجویز کر دیں گے۔ آپ کیوں ہاتھ دھو کر میرے بیٹے کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟“

لیکن میں نے بھی ہار نہیں مانی۔ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا، ”سنو، ایک نام ہے، بہت پیارا سا۔ یہ ایک بہت بڑے رحم دل بادشاہ کا نام ہے یعنی نوشیرواں۔ اب بتاؤ کیا خیال ہے؟“

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔“ وہ خوش ہو کر بولے، ”واہ وا۔ نام ہو تو ایسا۔ نام کیا ہے پورا منہ بھر گیا اس نام سے۔ بھئی مجھے یہ پسند آ گیا۔ کہاں چھپا رکھا تھا آپ نے اسے اتنی دیر سے؟ وہی تو میں کہوں کہ پڑھے لکھے آدمیوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔“ ان کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

"بڑی محنت کی آپ نے میری خاطر۔ بتائیے کیا محنتانہ پیش کروں؟"

"تم میرے دوست ہو۔" میں نے کہا۔

"تو کیا ہوا؟" وہ بولے۔

"تم سے فیس لینا مجھے زیب نہیں دیتا۔ وہ بھی اتنے معمولی سے کام کے لیے۔"

وہ بولے، "آپ اسے معمولی سا کام سمجھتے ہیں؟" آپ نے تو میری مشکل ہی حل کر دی۔"

میں نے کہا، "ایسی کوئی بات نہیں۔" تم نے پسند کر لیا تو سمجھو مجھے میرا انعام مل گیا۔ جاؤ عیش کرو۔"

اور تب وہ بولے، "اچھا چلتا ہوں۔ بچی کے لیے بھی سوچ کر رکھنا۔ کوئی ایسا نام ہو کہ اگر بولو تو پورا منہ بھر جائے!"

وہ ابھی چند قدم گئے تھے کہ گھوم کر پھر میری طرف مڑے اور ذرا اُونچی آواز سے بولے، "مگر اگلی دفعہ آپ کو فیس لینی پڑے گی۔"

میں نے کہا، "میں سمجھ گیا۔ تم فکر مت کرو۔ قدرت کے خزانے میں کوئی کمی نہیں۔ اس کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک نام موجود ہے۔"

"بہت بہت شکریہ بھائی جی۔" وہ ذرا قریب آ کر بولے۔

"وعلیکم شکریہ بھائی جی۔" میں نے جواب دیا۔

* *

لیڈری کا امتحان... آر ایل پی

ابراہیم جلیس

ہماری ایک رشتہ دار خاتون کوئی تیس برس بعد ہم سے ملنے آئیں۔ ان تیس برسوں میں ان کے بارے میں کچھ بھی پتا نہ چل سکا تھا کہ وہ کہاں ہیں! اب اچانک ملاقات ہوئی تو بڑی خوشی ہوئی کہ وہ زندہ ہیں، خیریت سے ہیں، ایک اچھے شوہر کی اچھی بیوی اور تین جوان لڑکوں کی ماں ہیں۔

ہم نے ان سے پوچھا:

”آپ کے لڑکے کیا کرتے ہیں؟“

اُنہوں نے بُرا بُرا سا منہ بنا کر کہا:

”بڑا لڑکا سی ایس پی افسر ہے... شہر کا ڈپٹی کمشنر ہے۔ بس لگی بندھی آمدنی ہے کیوں کہ رشوت بالکل نہیں کھاتا۔“

دوسرے لڑکے کے بارے میں بھی وہ کچھ خوش نہیں تھیں، بولیں:

”دوسرا فوجی افسر ہے۔ شان ہے، رعب ہے، عزت ہے، مگر وہی لگی بندھی تنخواہ۔ ظاہر ہے کہ فوج میں رشوت کا کیا سوال؟“

البتہ تیسرے لڑکے کا ذکر کرتے ہوئے ان کا چہرہ بشاشت سے کھل اُٹھا۔

”تیسرا بیٹا البتہ سب سے اچھا نکلا۔ وہ میٹرک فیل ہے، لیکن سی ایس پی اور فوجی افسر سے زیادہ کماتا ہے۔ عزت بھی اور روپیہ بھی۔“

ہم نے حیرت سے پوچھا:

”میٹرک فیل بیٹا سی ایس پی اور فوجی افسر سے زیادہ روپیہ کماتا ہے! حیرت ہے۔“

رشتہ دار خاتون بڑے فخر سے بولیں:

”بھیا۔ وہ ہمارے ملک کا سیاسی لیڈر ہے۔“

اس انکشاف کے بعد حیرت بھی دُور ہوگئی اور مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ واقعی ہمارے ملک میں باعزت طریقے پر لکھ پتی، کروڑ پتی بننے کا سب سے آسان راستہ 'لیڈری' ہی ہے۔ کچھ زیادہ پڑھنے لکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ صرف لچھے دار تقریر کرنی آجائے، بس کافی ہے۔ پہلے لیڈر بنو، پھر مشیر، وزیر، سفیر اور بالآخر امیر بن جاؤ۔ لیکن ہم یہ سوچنے لگے کہ جب سول اور فوج کی ہر خدمت اور ہر اسامی کے لیے بڑے سے بڑے سخت ذہنی اور جسمانی امتحانات ہوتے ہیں، تو لیڈری جیسی سب سے بڑی قومی خدمت کے لیے کوئی امتحان کیوں نہیں ہے۔ سول اور فوج کی ملازمتوں میں غلطی سے یا تو خود ملازم کو نقصان ہوتا ہے یا تھوڑا بہت نقصان ملک اور قوم کو بھی ہوتا ہے۔ لیکن لیڈری تو وہ اہم ترین قومی خدمت ہے کہ لیڈر کی ذرا سی غلطی اور معمولی سی لغزش ساری قوم کو لے ڈوبتی ہے۔ تازہ ترین ثبوت جنرل یحییٰ خاں کی لیڈری ہے۔ ان کی بے جا ضد، شراب نوشی اور عیاشی کے باعث ہم نے نہ صرف آدھا ملک اور آبادی کی اکثریت کھو دی، بلکہ بقیہ آدھے ملک کا بھی نہایت برا حال ہے۔ حد ہے۔ اتنی اہم ترین قومی خدمت کا کوئی امتحان نہیں جبھی تو بیشتر نااہل حتیٰ کہ جاہل و کاہل افراد تک لیڈر بن جاتے ہیں۔ ان خود ساختہ لیڈروں ہی کی وجہ سے گزشتہ 24 برس سے پاکستان اسم بامسمّٰی یعنی 'پاک استان' نہیں بن سکا ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ قوم کو ایسے نااہل، جاہل و کاہل لیڈروں سے نجات دلانے کے لیے لیڈری کا بھی امتحان ہو اور بڑا کڑا اور سخت امتحان ہو۔ جس طرح سی ایس پی 'سول سروس آف پاکستان' اور پی ایس پی یعنی 'پولیس سروس آف پاکستان' کے امتحانات۔ اُسی طرح لیڈری کا بھی امتحان ہونا چاہیے اور اس کا نام ہو، آر ایل پی **"Real Leader of Pakistan"**

جیسے 'سی ایس پی' یا 'پی ایس سی' ویسے ہی 'آر ایل پی' صحیح لیڈری یعنی 'آر ایل پی' کا امتحان، وقت کا شدید تقاضا اور پاکستان کی شدید ضرورت ہے۔ اس امتحان کے ساتھ ہی فوج اور سی ایس پی کے امتحانوں کی طرح مکمل طبی امتحان یعنی 'میڈیکل ٹیسٹ' بھی لازمی قرار دیا جائے، بالخصوص دماغی ٹیسٹ لازمی ہونا چاہیے تاکہ ہر زید، بدر اور قمر اس سادہ اور معصوم قوم کے گلے میں زبردستی اپنی لیڈری کا 'گلا گھونٹ پھندہ' نہ ڈال سکے اور اسے سندباد جہازی کے کندھے پر زبردستی سوار 'پیر تسمہ پا' کی طرح تباہی کے گڑھے کی طرف ٹخ ٹخ نہ ہانک دے۔

آر ایل پی **"RLP"** کے امتحان کے لیے ہم نے فی الحال ایک نمونہ پرچہ سوالات مرتب

کیا ہے۔ آپ پر پورا اعتماد ہے کہ آپ "RLP" کے امتحان سے پہلے اس پرچے کو آؤٹ نہیں کریں گے۔ پرچہ حسبِ ذیل ہے:

بورڈ برائے انتخاب اصلی رہنما برائے پاکستان

امتحان آر ایل پی برائے سال 1972ء پرچہ سوالات (اوّل)

پرچہ سوالات (اوّل)

نظریاتی (THEORY)

وقت: بُرا **کل نمبر 840** **گریس نمبر 99**

سوال نمبر 1: قیامِ پاکستان سے پہلے تحریکِ پاکستان میں تم نے کیا حصہ لیا، کیا کیا قربانیاں دیں۔ دستاویزی ثبوت کے ساتھ لکھو۔

سوال نمبر 2: اگر قیامِ پاکستان کے بعد کے لیڈر ہو، تو پھر خدا کو حاضر و ناظر جان کر حلفیہ لکھو کہ پچھلے 24 سال میں تم نے عوام کے پیسے سے کتنی کوٹھیاں بنائیں، کتنی فیکٹریاں لگائیں اور کتنی شادیاں رچائیں؟ لیڈر بننے سے پہلے آپ کا کتنا بینک بیلنس تھا اور اَب کیا ہے؟

سوال نمبر 3: پاکستان میں ننانوے فیصد باشندے غریب ہیں۔ جھونپڑیوں اور چھوٹے گھروں میں رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارا کوئی لیڈر اُس وقت تک ہماری صحیح نمائندگی اور ترجمانی نہیں کر سکتا، جب تک کہ وہ ہمارے ساتھ رہ کر ہمارے دُکھ درد کو براہِ راست محسوس نہ کر سکے: لہٰذا تم سچ سچ بتاؤ کہ:

(ا) کیا تم کبھی کسی جھونپڑی یا کوارٹر میں مجبوراً یا پھر تجربتاً ہی رہے ہو؟

(ب) کیا تم سڑکوں پر بس یا دیگر سواری کی اذیت کا مزہ چکھ چکے ہو؟

(ج) کیا تم بس، ٹرام اور ریلوے کے تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں سفر کرتے ہو؟

(د) چپکے سے بتا دو کہ تمہارے ووٹ (وہائٹ) دام کتنے ہیں اور بلیک ریٹ کیا ہے؟

سوال نمبر 4: محسن بھوپالی کے مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کرو۔

تلقینِ اعتماد وہ فرما رہے ہیں آج
راہِ طلب میں خود جو کبھی معتبر نہ تھے

نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل اُنہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

آخری شعر میں شاعر نے کن کن لیڈروں کی طرف اشارہ کیا ہے؟ اُن کے نام مع اصلی ولدیت لکھو۔

سوال نمبر 5: کیا یہ صحیح ہے کہ اکثر سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کے بیانات اور تقریریں جتنی لمبی ہوتی ہیں، اُن کا نصف بھی اُس جماعت کے اراکین کی فہرست نہیں ہوتی۔

سوال نمبر 6: حسبِ ذیل عجائبات پاکستان میں سے کسی ایک پر مفصل نوٹ لکھو:

بریانی ہاؤس، بکرا پیڑھی، واپڈا، ٹوبہ ٹیک سنگھ، چمچہ۔

سوال نمبر 7: حسبِ ذیل کی صحت یا غلطی ظاہر کرو:

(ا) فرینڈز ناٹ ماسٹر۔ ترجمہ: جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی۔

(ب) کماحقہ۔ بمعنی۔ حقہ کی کمائی

سوال نمبر 8: حسبِ ذیل الفاظ کو جملے میں استعمال کرو:

کنٹرولڈ ڈیموکریسی۔ الاٹمنٹ۔ آمریت۔ مونچھ۔ مارشل لاء

پرچہ سوالات (دوم)

عملی (PRACTICAL)

سوال نمبر 1: اپنے محلے کے جن گھروں میں جتنے بھوکے بیٹھے ہوں، پہلے اُنہیں کھانا کھلاؤ اور ثبوت کے لیے بعد طعام انہیں ہمارے سامنے پیش کرو۔

سوال نمبر 2: ہفتے میں چار راتیں کسی جھونپڑی اور تین راتیں کسی کوارٹر میں بغیر مچھر دانی لگائے سونا ہوگا اور ثبوت کے لیے جھونپڑی یا کوارٹر کے مالک کو ساتھ لانا ہوگا۔

نوٹ (بلکہ کرنسی نوٹ):

جو اُمیدوار اِس امتحان میں کامیاب ہوں گے، اُنہیں اسناد یعنی ڈگریاں دی جائیں گی اور اُن کے نام قومی اخبارات میں شائع کیے جائیں گے کہ صرف یہی مستند اور قومی رہنما ہیں اور قومی اخبارات صرف انہی کامیاب لیڈروں کی تصویریں، تقریریں اور بیانات اخبارات میں شائع کریں۔ جن لیڈروں کے پاس امتحان 'آر ایل پی' میں کامیابی کی ڈگری نہیں ہوگی۔ عوام کا فرض ہے کہ انہیں فوراً حوالۂ پولیس کردیں۔

تمت بالخیر

* *

احوال خاندانِ مغلیہ کا

ابنِ انشا

اکبر

آپ نے حضرت ملا دو پیازہ اور بیربل کے ملفوظات میں اس بادشاہ کا حال پڑھا ہوگا۔ راجپوت مصوری کے شاہکاروں میں اس کی تصویریں بھی دیکھی ہوئی۔ ان تحریروں اور تصویروں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ سارا وقت داڑھی گھٹواتے، مونچھیں ترشواتے اُکڑوں بیٹھا پھول سونگھتا رہتا تھا یا لطیفے سنتا رہتا تھا۔ یہ بات نہیں اور کام بھی کرتا تھا۔

اکبر قسمت کا دھنی تھا۔ چھوٹا سا تھا کہ باپ یعنی ہمایوں بادشاہ ستارے دیکھنے کے شوق میں کوٹھے سے گر کر جاں بحق ہو گیا اور تاج و تخت اُسے مل گیا۔ ایڈورڈ ہفتم کی طرح چونسٹھ برس ولی عہدی میں نہیں گزارنے پڑے۔ ویسے اس زمانے میں اتنی لمبی ولی عہدی کا رواج بھی نہ تھا۔ ولی عہد لوگ جونہی باپ کی عمر کو معقول حد سے تجاوز کرتا دیکھتے تھے اسے قتل کر کے، یا زیادہ رحم دل ہوتے تو قید کر کے، تخت حکومت پر جلوہ افروز ہو جایا کرتے تھے تا کہ زیادہ سے زیادہ دن رعایا کی خدمت کا حق ادا کر سکیں۔

اب ہم اکبری عہد کے کچھ اہم واقعات کا ذکر کرتے ہیں:

پانی پت کی دوسری لڑائی

پانی پت میں اس وقت تک صرف ایک لڑائی ہوئی تھی پانی پت والوں کا اصرار تھا کہ اب ایک اور ہونی چاہیے۔ چنانچہ اکبر نے پہلی فرصت میں بہیر و بنگاہ کے ساتھ اُدھر کا رُخ کیا۔ اُدھر سے ہیموں بقال لشکر جرار لے کر آیا۔ اس کے ساتھ توپیں بھی تھیں اور ہاتھی بھی تھے، ایک سے ایک سفید گھمسان کا رن پڑا۔ ہیموں کی جمعیت زیادہ تھی لیکن اکبری لشکر نے تابڑ توڑ حملے کر کے کھلبلی ڈال دی بعض ہمدردوں نے اس کے جدی وطن سے پیغام بھجوایا کہ تم اور ہیموں دونوں یہاں تاشقند

آؤ، صلح کرائے دیتے ہیں لیکن اکبر نہ مانا... ہیموں ایک ہاتھی کے ہودے میں بیٹھا روپے آنے پائی کا حساب لکھ رہا تھا کہ اس لڑائی کا مال غنیمت فروخت کر کے کس کاروبار میں پیسہ لگائے۔ ناگہاں ایک تیر قضا کا پیغام لے کر اس کی آنکھ میں آن لگا اور وہ بے سدھ ہو کر گر گیا۔ ہیموں بقال کو ہم تاریخ کا پہلا موشے دایان کہہ سکتے ہیں۔

بیرم خاں کو حج کرانا

بیرم خاں اکبر کا اتالیق تھا۔ اُسی نے اس کی پرورش کی تھی اور تخت دلایا تھا۔ اکبر نے تخت پر بیٹھنے کے بعد جب سارے اختیارات قبضے میں کر لیے تو سوچا کہ پہلے اس محسن کے احسانات کا بدلہ چکانا چاہیے۔ چنانچہ بیرم خاں کو بلایا اور کہا، ”خان بابا! اب آپ جائیے، حج کر آئیے۔“ کسی کو حج پر بھیجنا خواہ وہ جانا چاہے یا نہ چاہے، بڑی نیکی کا کام ہے۔ اکبر نے اور بھی کئی لوگوں کو اُن کے نہ نہ کرتے ہوئے حج و زیارت پر بھیجا، لیکن خود ناگریز وجوہات اور چند در چند مصروفیات کی وجہ سے کبھی نہ جا سکا۔ بیرم خاں حج کو جاتے ہوئے راستے میں قتل ہو گیا۔ لیکن یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ اکبر کو اس کے مرنے کی خبر ہوئی تو بہت رنج ہوا۔ ضرور ہوا ہو گا۔

دینِ الٰہی

دینیات کی طرف اکبر کے شغف کو دیکھتے ہوئے وزیر با تدبیر ابوالفضل نے اس کے ذاتی استعمال کے لیے ایک دینِ الٰہی ایجاد کر دیا تھا اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے پہلے خلیفہ کی ذمہ داریاں خود سنبھال لی تھیں۔ چڑھتے سورج کی پوجا کرنا اس مذہب کا بنیادی اُصول تھا۔ مرید اکبر کے گرد جمع ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ اے ظلِ الٰہی تو ایسا دانا و فرزانہ ہے کہ تجھ کو تاحیات سربراہِ مملکت یعنی بادشاہ وغیرہ رہنا چاہیے اور تو ایسا بہادر ہے کہ تجھ کو ہلالِ جرأت ملنا چاہیے بلکہ خود لے لینا چاہیے۔ اس کے نام کا وظیفہ پڑھتے تھے اور اس کی تعریف میں وقت بے وقت بیانات جاری کرتے رہتے تھے۔ پرستش کی ایسی رسمیں آج کل بھی رائج ہیں، لیکن ان کو دینِ الٰہی نہیں کہتے۔

اکبر کی حکمتِ عملی

اکبر میں تعصب بالکل نہ تھا خصوصاً شادیوں کے معاملہ میں۔ کچھ ریاستیں فوجوں سے فتح کیں، باقی کے راجاؤں کی بیٹیوں کو اپنے حرم میں اور اُن کے علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل

کرلیا۔ آج کل کے سیٹھ اور مل مالک جو ایسا کرتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔

ادب کی سرپرستی وغیرہ

انارکلی ایک کنیز تھی جس کی وجہ سے شہزادہ سلیم کا اخلاق خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ اکبر نے اُسے دیوار میں چنوا دیا۔ ایک مصلحت اس میں یہ تھی کہ سیّد امتیاز علی تاج اپنا معرکہ آرا ڈرامہ لکھ سکیں اور اُردو اَدب کے ذخیرے میں ایک قیمتی اضافہ ہو سکے۔

درباری شاعر نظیریؔ نیشاپوری نے ایک بار کہا کہ میں نے لاکھ روپے کا ڈھیر بھی نہیں دیکھا۔ بادشاہ نے ایک لاکھ روپے خزانے سے نکلوا کر ڈھیر لگا دیا۔ جب نظیریؔ اچھی طرح دیکھ چکا تو روپے واپس خزانے میں بھجوا دیے۔ نظیریؔ دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ اصل میں نظیریؔ یہ حرکت خانخاناں کے ساتھ پہلے کر چکا تھا۔ خانخاناں نے شاعر کی نیت کو بھانپ کر کہہ دیا تھا کہ اچھا اب یہ ڈھیر تم اپنے گھر لے جاؤ۔ لیکن اکبر ایسا کچا آدمی نہ تھا۔

فتوحات

اکبر کا دور فتوحات کے لیے مشہور ہے۔ اس کی قلمرو بنگالے سے دکن اور گجرات تک پھیلی ہوئی تھی۔ کالنجر، میواڑ اور رنتھنبور کے راجاؤں کو اسی نے زیر کیا تھا۔ حکومت کے آخری دنوں میں قندھار بھی فتح کیا جسے قدیم زمانے میں گندھارا کہتے تھے۔ جب لوگوں نے اعتراض کیا کہ کیوں فتح کیا۔ تو بادشاہ کو بیان دینا پڑا کہ میں نے نہیں کیا۔ ہاں شہزادہ سلیم نے شاید کیا ہو۔ سو وہ میرے کہنے میں نہیں۔

سوالات

1۔ پانی پت کی دوسری لڑائی بھی پانی پت ہی میں کیوں ہوئی؟ کہیں اور کیوں نہیں ہوئی۔

2۔ اُردو ڈرامہ وغیرہ کے فروغ میں حصہ لینے کا کیا طریقہ ہے؟

3۔ تم اَن پڑھ رہ کر اکبر بننا پسند کرو گے یا پڑھ لکھ کر اُس کا نورتن؟

* *

قصہ ایک ڈپلومیٹ مرغ کا!

(افسانہ)

ابن صفی

عام طور پر کسی تحیر العقول داستان کی ابتدا اِن الفاظ سے کی جاتی ہے کہ آج میں جو کہانی سنانے جا رہا ہوں، اُس پر دوسرے تو کیا، خود میں بھی یقین نہ کرتا، اگر اس کہانی کا تعلق خود میری ہی ذات سے نہ ہوتا...

سوائے عزیزانِ گرامی! اِس معذرتی پیراگراف کو طول دینے سے کیا فائدہ؟ قصہ مختصر یہ کہ وہ ایک بے حد خوب صورت اور توانا مرغ تھا۔ خوب صورت نہ ہوتا، تب بھی مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ مجھے تو اُس کی تعریف کرنی ہی پڑتی، کیوں کہ اسی مرغ کی وجہ سے مجھے پردیس میں سر چھپانے کو جگہ مل گئی تھی۔

یقین کیجیے کہ اسی مرغ کی وجہ سے شیخ صاحب کی فیملی میں پے اِنگ گیسٹ بنا لیا گیا تھا، ورنہ اِس شہرِ غدار میں کون کسی پر اعتماد کرتا ہے۔ خصوصیت سے اگر فیلی ساتھ نہ ہو تو کرائے پر مکان بھی نہیں ملتے، چہ جائیکہ کسی اجنبی کو پے اِنگ گیسٹ بننے کا شرف حاصل ہو جائے۔ ترقی پر تبادلہ ہوا تھا، اسی لیے خوشی خوشی اپنے شہر کو خیر باد کہنا پڑا۔

ایک شام کسی معقول سے مکان کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ اچانک اِس گلفام مرغ سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ وہ بھی اس طرح کہ ایک غیر تربیت یافتہ کتا اِس پر جھپٹا تھا اور وہ اُچھل کر میری گود میں آیا تھا۔ میں نے اِسے پکڑ لیا اور کتا جھپٹ جھپٹ کر مجھ پر حملے کرنے لگا۔ مرغ میری گود میں چیخ رہا تھا اور وہ نانجار کتا اُچھل اُچھل کر اِسے مجھ سے جھپٹ لے جانے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا۔ ٹھیک اُسی وقت بائیں جانب والی کوٹھی سے ایک بیگم صاحبہ چیختی ہوئی نکلیں، جن کے پیچھے ایک لٹھ بردار ملازم بھی تھا۔ کتا اُسے دیکھ بھاگ کھڑا ہوا۔ اتنی دیر میں میری پتلون کا ایک پائنچہ تار تار

ہو چکا تھا۔ لٹھ بردار ملازم کتے کے پیچھے دوڑ گیا اور بیگم صاحبہ نے مرغ کو میری گود سے جھپٹتے ہوئے کہا، ”آپ کا بہت بہت شکریہ جناب۔“

پھر میری پھٹی ہوئی پتلون کی طرف توجہ دے کر بولیں، ”اوہو۔ کتے نے کاٹا تو نہیں؟ چلیے اندر چلیے، دیکھتے ہیں...“

یہ ادھیڑ عمر کی ایک بھاری بھرکم خاتون تھیں۔ انہوں نے ایک بار پھر مجھے گھور کر دیکھا اور غصیلے لہجے میں بولیں، ”کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہیں۔ چلیے اندر، کہیں دانت نہ لگ گئے ہوں۔“

”جی چلیے۔“ میں ہکلایا اور اُن کے پیچھے چلنے لگا۔ ٹانگ محفوظ تھی۔ کتے کے دانت نہیں لگنے پائے تھے۔

”اپنے گھر فون کر کے دوسری پتلون منگوا لیجیے۔“ بیگم صاحبہ مرغ کو سہلاتے ہوئے بولیں۔

تب میں نے انہیں اپنے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا، ”فی الحال ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں راتیں بسر کر رہا ہوں۔“

”کسی ہوٹل میں ٹھہر جاتے۔“

”ہوٹلوں کا ماحول مجھے پسند نہیں ہے۔“ میں نے شرما کر جواب دیا۔

”خوب!“ وہ مجھے گھورتی ہوئی بولیں۔ مرغ اب بھی ان کی گود میں تھا۔

اتنے میں ایک لڑکی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی، جوانہی کی طرح لحیم شحیم تھی۔ اگر بھینگی نہ ہوتی تو کسی قدر دلکش بھی معلوم ہوتی۔

”بے بی! اِن سے ملو، انہوں نے اس وقت اپنی جان پر کھیل کر میرے مرغ کی جان بچائی ہے۔“ دفعتاً بیگم صاحبہ اُس سے بولیں۔

لڑکی نے مسکرا کر سر کو خفیف سی جنبش دی، لیکن میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مجھے دیکھ رہی تھی، یا مرغ کو۔

”اور مَیں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ پے انگ گیسٹ کی حیثیت سے ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔“ انہوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”اِٹ اِز وَیری جنرس آف یو ممی!“ لڑکی چہکی۔ بالکل ایسا ہی لگا تھا، جیسے کسی شیر خوار نے

قلقاری لگائی ہو۔

''مم... مگر...'' میں ہکلایا۔

''کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ بہادر لوگ شریف بھی ہوتے ہیں۔ مَیں مطمئن ہوں۔ اپنا سامان یہیں لے آیئے۔ شیخ صاحب آپ کی فرم کے مالکان سے بخوبی واقف ہیں۔'' بیگم صاحبہ ہاتھ اُٹھا کر بولیں۔

تو جناب اس کھڑے گھاٹ سر چھپانے کی جگہ ہاتھ آ گئی تھی۔

دو تین دن بعد معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ انٹلکچوئل ہیں اور شیخ صاحب سیاسی لیڈر کہلاتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کتے کی بجائے مرغ پالتی تھیں اور اُس کو اُسی طرح گود میں اُٹھائے پھرتی تھیں، جیسے یورپین ممالک کی خواتین کتے کو اُٹھائے پھرتی ہیں۔

بے بی کا نام نوشابہ تھا اور وہ تین سال سے میٹرک میں فیل ہو رہی تھی۔ کھانے پینے کے علاوہ اُسے اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔

یہ کنبہ صرف تین افراد پر مشتمل تھا۔ شیخ صاحب، بیگم صاحبہ اور نوشابہ۔ کوٹھی بہت بڑی تھی، شاید اسی لیے پانچ عدد ملازمین بھی وہاں پائے جاتے تھے کہ کوٹھی بھری پری معلوم ہو۔ دو کمرے میرے حصے میں آئے تھے۔ ایک بیڈروم تھا اور دوسرے کو سٹنگ روم بنا دیا گیا تھا۔ کھانے کی میز پر ہم سب اکٹھے ہوتے، لیکن اتنی خاموشی رہتی جیسے کسی میت کی حاضری کھا رہے ہوں۔ شیخ صاحب کا ذہن سیاست میں اُلجھا رہتا، بیگم صاحبہ حیات و کائنات، جس میں مرغ بھی شامل تھا، کے مسائل پر غور فرماتی رہتیں اور نوشابہ صرف پلیٹوں اور قابوں پر نظر رکھتی۔

وہ گرمیوں کی ایک دوپہر تھی اور اتوار کا دن تھا، جب مجھے ایک حیرت انگیز تجربے سے دوچار ہونا پڑا۔ کوٹھی میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اتوار کو ملازمین آدھے دن کی چھٹی منایا کرتے تھے۔ شیخ صاحب فیملی سمیت کسی تقریب میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ مَیں نے سوچا کچھ دیر سو ہی لیا جائے، لہٰذا بیڈروم کی طرف چل پڑا۔ دفعتاً عقب سے آواز آئی، ''السلام علیکم!'' چونک کر مُڑا، لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا اور صدر دروازہ خود مَیں نے ہی بند کیا تھا۔ سماعت کا واہمہ سمجھ کر آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ پھر آواز آئی، ''سلام کا جواب نہ دینا بداخلاقی ہے۔''

مَیں پھرتی سے مُڑا اور پھر میری گھگھی بندھ گئی۔ بیگم صاحبہ کا مرغ آدمیوں کی طرح مجھ

سے ہمکلام تھا۔ سارے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ چھوٹ پڑا۔

"سلام کا جواب دو!" اس بار وہ کڑک کر بولا۔

مجھے یاد نہیں کہ مَیں نے سلام کا جواب دیا تھا، یا نہیں، لیکن بیڈ روم میں گھس کر دروازہ بند کر لینے کی ناکام کوشش آج بھی تصویر کی طرح آنکھوں میں پھرتی ہے۔ مجھ سے پہلے وہ بیڈ روم میں پہنچا تھا۔ ہلکے سے قہقہے کے ساتھ اُس نے کہا، "بڑے ڈرپوک معلوم ہوتے ہو۔"

میں دھم سے بستر پر گر گیا، لیکن قبل اِس کے کہ بے ہوش ہو جاتا، اُس نے مضحکہ اُڑانے کے سے انداز میں کہا، "تمہاری الماری مختلف قسم کے ڈائجسٹوں سے اَٹی پڑی ہے، لیکن تم نرے چغد کے چغد ہی رہے۔"

"بدتمیزی نہیں۔" مَیں نے جی کڑا کر کے اُسے ڈانٹ پلانے کی کوشش کی تھی۔

"جب ڈائجسٹ پڑھنے والے جہالت پر اُتر آئیں تو بدتمیزی کرنی ہی پڑتی ہے۔"

"تت... تم کون ہو؟"

"ایک توانا اور صحت مند مرغ۔" جواب ملا۔

"لل... لیکن..."

"لیکن کیا؟ ڈائجسٹوں میں چھپنے والی دیومالائی کہانیاں بھی تمہیں وسیع النظر نہ بنا سکیں۔"

"مم... میں نہیں سمجھا!"

"اِسی ماہ کے 'سرپٹ ڈائجسٹ' میں تم نے ایک ایسی بھینس کی کہانی پڑھی ہے، جو حقیقتاً نیلم پری تھی...!"

"پپ پڑھی تو ہے۔"

"تو پھر مجھ میں کون سے کیڑے پڑے ہوئے ہیں کہ تم مجھے شہنشاہِ جنات کا فرزندِ رشید تسلیم کر لینے سے گریز کر رہے ہو۔"

"نن... نہیں۔" مَیں بوکھلا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"سنو بھولے دوست! میں تم سے دوستی کرنا چاہتا تھا، ورنہ کیا مجال تھی اُس نابکار کتے کی... ٹانگیں چیر کر پھینک دیتا۔"

"سوال تو یہ ہے..."

”تمہیں یقین نہیں آیا کہ میں جنوں کا شہزادہ ہوں۔“

مَیں نے سَر کو منفی جنبش دی۔

”کس طرح یقین آئے گا؟“ مرغ کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

”گولڈ لیف سگریٹ کا ایک پیکٹ اُسی قیمت پر لا کر دکھاؤ جو اُس پر درج ہوتی ہے، تو میں تمہاری بات پر یقین کر لوں گا۔“

مرغ فوراً جواب دینے کی بجائے ایک ٹانگ اُٹھا کر مراقبے میں چلا گیا۔ پھر پورے ایک منٹ بعد اُس نے آنکھیں کھولی تھیں اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولا تھا، ”کوئی اور کام بتاؤ، یہ ناممکن ہے!“

”کیوں ناممکن ہے؟“

”یہاں کے سرمایہ داروں کا شہنشاہِ جنات بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

”سرمایہ داروں سے کیا مطلب؟“

”تو پھر یہ دکانداروں کی بھی بدمعاشی نہیں ہے؟“

”بس... بس... ختم کرو... مجھ سے فراڈ نہیں چلے گا!“ مَیں نے بیزاری سے کہا۔

”اے بدنصیب شخص! تو نے مجھ سے نولکھا ہار کی فرمائش کیوں نہیں کی۔ دو چار لاکھ ڈالر ہی مانگ لیے ہوتے!“ وہ بھنّا کر بولا۔

”ساٹھ پیسے میں چاہیے۔ نقد قیمت بھی ادا کرنے کو تیار ہوں۔“

”بس تو پھر قیامت کا انتظار کرو۔“

”اچھا چلو، یہی بتا دو کہ تم مرغا کیوں بن گئے ہو؟“

”سیاست کے چکر میں پڑ کر مرغا بنا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”شیخ صاحب کی سیاسی بصیرت مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”بات یہ ہے کہ ہماری مملکت میں بھی جمہوریت کی باتیں ہونے لگی ہیں۔“

”یعنی جناتوں میں۔“

''ہاں... ہاں... کیوں نہیں... لہٰذا شہنشاہِ جنات یعنی میرے والد حضور چاہتے ہیں کہ عوامی لیڈر بھی شاہی خاندان ہی کے کسی فرد کو بننا چاہیے۔''

''خدا کی پناہ! جناتوں میں بھی ڈپلومیسی پہنچ گئی ہے۔'' میں کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

اس پر مرغ نے ایک تضحیک آمیز قہقہہ لگایا، دیر تک ہنستا رہا، پھر بولا، ''اے بیوقوف آدم زاد! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ڈپلومیسی آدمیوں نے پیدا کی ہے۔''

''یقیناً۔'' میں نے سینہ تان کر کہا۔

''تمہارا یہ یقین جہالت پر مبنی ہے۔''

''تم بکواس کر رہے ہو۔'' مجھے بھی غصہ آ گیا۔

''اچھا اب اپنے علم میں اضافہ کرو۔ ڈپلومیسی کا بانی میری ہی قوم کا ایک فرد تھا اور اُس نے ڈپلومیسی کی بنا اُس وقت ڈالی تھی، جب آدمی کے خاکی پتلے میں جان بھی نہیں پڑی تھی۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''شاید تم سیاست کے ساتھ ہی چرس پینا بھی سیکھ رہے ہو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''جہلا کی باتوں کا بُرا نہیں مانتا۔ اس طرح سمجھنے کی کوشش کرو... ! معلم الملکوت عزازیل قومِ جنات ہی کا ایک فرد تھا، جو آدم کو سجدہ نہ کرنے کی بنا پر شیطان الرجیم قرار پایا تھا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''چلو تسلیم۔ اچھا تو پھر؟''

''ڈپلومیسی کا بانی اور خالق وہی شیطان الرجیم تھا۔ سجدے سے انکار اس لیے کیا تھا کہ خاک کے پتلے کو حقیر سمجھتا تھا، لیکن اللہ پاک کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ موجد اعظم ہے، اُس کے علاوہ اور کسی کو سجدہ نہیں کر سکتا۔''

میں اُچھل پڑا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ ڈپلومیسی کا صحیح مفہوم ہی اس وقت سمجھ میں آیا تھا۔

''اب بتاؤ، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' وہ ہنس کر بولا۔

''نن... نہیں۔''

''ڈپلومیسی کا موجد وہی تھا، لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ تم لوگوں نے اس فن کو اتنی ترقی دی

ہے کہ اب شیطان بھی چکرا کر رہ جاتا ہے۔"

میں نے سکوت اختیار کیا کہ اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا، "تم میری باتوں سے دل برداشتہ تو نہیں ہوئے؟"

"شرمندہ ہوں اپنی کم علمی پر۔"

"نہیں، دل چھوٹا نہ کرو۔ یہ کم علمی نہیں، بلکہ سمجھ کا پھیر ہے۔ شیخ صاحب کی صحبت نصیب ہونے سے پہلے میں بھی تمہاری ہی طرح چغد تھا۔"

"مگر تم تو زیادہ تر بیگم صاحبہ کی صحبت میں رہتے ہو!"

"کان زیادہ تر شیخ صاحب ہی کی طرف لگے رہتے ہیں۔"

"واقعی تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، دوستی کا ہاتھ تمہاری طرف بڑھاتا ہوں۔" مَیں نے سچ مچ بے حد خوش ہو کر کہا۔

"لیکن دوسروں کی نظروں میں تم مجھے مرغ ہی رہنے دو گے۔"

"منظور۔" مَیں نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا، "دراصل میری ایک پرابلم ہے، اسی لیے میں نے تم سے قریب ہونے کی کوشش کی تھی۔"

"کہو... کہو... میرے دوست! میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا، "مجھے نوشابہ سے محبت ہو گئی ہے۔"

"نوشابہ سے؟" میں اُچھل پڑا۔

"کک... کیوں..." وہ بوکھلا کر ہکلایا۔ "کک... کیا تم بھی؟"

"لاحول ولاقوۃ۔ اتنے عظیم الشان مرغ ہو کر بھی اتنا گھٹیا ٹیسٹ رکھتے ہو۔" مَیں بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

"اے آدم زاد! یہ معاملاتِ دل ہیں۔" وہ روہانسا ہو کر بولا۔

"مجھے تم سے ہمدردی ہے۔" مَیں سنجیدہ ہو گیا۔

وہ گلوگیر آواز میں بولا، "ہمدردی ہی تو فساد کی جڑ ہے۔ پہلے مجھے اُس سے ہمدردی ہوئی تھی کہ بدصورتی کی وجہ سے اُس کا کہیں سے رشتہ نہیں آتا۔ کڑھتے کڑھتے بالآخر خود ہی اُس کی محبت

میں گرفتار ہو گیا۔“

”تو پھر پرابلم کیا ہے؟“

”اُسے بھی محبت کرنے پر کس طرح آمادہ کیا جائے، کیوں کہ اُسے تو سوائے کھانے پینے کے اور کسی چیز سے رغبت نہیں۔ ارے مجھ پر بھی دانت رکھتی ہے۔ ایک دن اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی کہ اِس مرغ کا گوشت بے حد لذیذ ہوگا، ممی اِسے چلغوزے کھلاتی ہیں۔ تم کسی طرح اپنے گھر پار کر لے جاؤ وہیں کاٹ کر پکائیں گے۔“

اُس کا لہجہ دردناک تھا، لیکن مجھے ہنسی آ گئی۔

”میرا مذاق نہ اُڑاؤ میرے دوست!“

”مجھے افسوس ہے۔“ مَیں پھر جلدی سے سنجیدہ ہو گیا۔

”مَیں اُسے آمادہ کر سکتا تھا... لیکن...“

”لیکن... کیا؟“

”اُردو بول سکتا ہوں، لکھ نہیں سکتا۔“

”مَیں نہیں سمجھا۔“

”اُردو لکھ سکتا تو اُسے گمنام عشقیہ خطوط لکھ کر اُس کے دل میں سوزِ محبت جگانے کی کوشش کرتا۔“

”انگریزی میں لکھو۔“ مَیں نے لاپرواہی سے کہا۔

”انگریزی ہی میں تو تین سال سے فیل ہو رہی ہے۔“ اُس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”تو پھر مَیں تمہارے لیے کیا کروں؟“ مَیں نے اُکتا کر پوچھا۔

”میری طرف سے اُسے ایک خط لکھ دو۔“

اِس فرمائش پر مَیں سکتے میں آ گیا۔

”کیا سوچنے لگے؟“ اس نے میرے بازو پر ٹھونگ مار کر کہا۔

”ذرا مشکل کام ہے۔“ میں چونک کر بولا۔

”کیوں؟“

”مَیں نے کبھی کسی کو عشقیہ خطوط نہیں لکھے۔“

''اپنے لیے تو نہیں لکھ رہے!''

''مَیں لکھ ہی نہیں سکتا۔ عشق کیے بغیر کیسے لکھے جا سکتے ہیں۔''

''میاں عقل کے ناخن لو، مضمون میرا ہو گا اور صرف تحریر تمہاری۔''

''مم... میری تحریر۔ یار! کیوں گردن کٹواؤ گے۔ تم تو مرغ رہ کر بھی محفوظ رہو گے، لیکن میں ذبح کر دیا جاؤں گا۔''

''اِس کا ذمہ لیتا ہوں کہ کسی گڑبڑ کی صورت مَیں تم پر آنچ نہ آنے دوں گا!''

''ذرا دیکھو... اِدھر میری طرف!''

میں اُس کی طرف مُڑا اور ایک بار پھر بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ مرغ کی بجائے میرے سامنے ایک جوانِ رعنا کھڑا تھا۔

''دی بونیئر... دی بونیئر...!'' میں نے نعرہ لگایا۔

''شکریہ!'' اُس نے شرمیلے لہجے میں کہا اور پھر مرغا بن گیا۔

''یار! واقعی بے حد حسین ہو۔ اب تو میری بھی رال ٹپکنے لگی ہے! بڑی نسوانیت ہے تمہارے حسن میں۔''

''شکریہ۔ آج کل کی لڑکیاں ایسے ہی حسن کی شیدائی ہیں۔ پچاس سال پہلے والا مردانہ حسن رکھنے والے انہیں جنگلی لگتے ہیں۔''

''اچھا تو پھر بتاؤ، میں کیا لکھوں؟''

''پھر مجھے اُس کی عاشقانہ صلاحیتوں کا بھی معترف ہونا پڑا تھا۔ کیا خط لکھوایا تھا ظالم نے اور آخر میں لکھوایا تھا، ''اے پُر شباب نوشابہ شب بخیر...''

نیچے کسی کا نام درج نہیں کیا گیا تھا۔ تہہ کیا ہوا خط چونچ میں دبا کر وہ غائب ہو گیا۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر نوشابہ اپنے ڈیڈی کو بار بار شرمیلی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

ناشتے کے بعد میں اپنے آفس کی تیاری میں مشغول تھا کہ مرغ پھر آ دھمکا۔

''تم نے دیکھا؟'' اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''کیا دیکھا؟''

''تمہیں کیسی شرمیلی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔''

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا، شیخ صاحب کو دیکھ رہی تھی۔"

"نہیں، تمہیں دیکھ رہی تھی۔ خیر، شادی ہو جانے کے بعد اِس کا بھینگا پن ٹھیک کر لوں گا۔" وہ مغموم لہجے میں بولا۔

"تو کیا وہ سچ مچ مجھے ہی اس طرح دیکھ رہی تھی۔" میں نے کانپ کر پوچھا۔

"ہاں ہاں... تم اُس کے دل میں سوز و گداز پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہو۔"

"اے مرغ بھائی! کہیں مجھے کسی مصیبت میں نہ پھنسوا دینا!" میں گڑگڑایا۔

"تم بے فکر رہو، پیارے دوست، مَیں احسان فراموش نہیں ہوں!"

دفتر سے واپسی پر شام کو اُس نے پھر مجھ سے ایک خط لکھوایا۔

دوسری صبح جب میں دفتر جانے کے لیے کوٹھی سے نکل رہا تھا، نوشابہ گیٹ کے پاس کھڑی نظر آئی۔ جیسے ہی گیٹ کے قریب پہنچا، آہستہ سے بولی، "شام کو میرے لیے سیر بھر رَس ملائی لیتے آنا، لیکن ممی کو نہ معلوم ہونے پائے۔"

بوکھلاہٹ میں سر کو تفہیمی جنبش دے کر مَیں وہاں سے سرپٹ بھاگ نکلا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ رَس ملائی تول کے حساب سے نہیں ملتی، بلکہ درجنوں میں اِس کا حساب ہوتا ہے۔ کیا کروں، کتنی لوں! مَیں اکتاہٹ کے ساتھ بڑبڑایا۔

"تین درجن۔" کسی نے آہستہ سے کان میں کہا،

"کک... کون!" میں اچھل پڑا۔

"شہزادہ ککڑوں کوں۔"

"کہاں ہو؟"

"تمہارے داہنے کان میں... نہیں نہیں، کان جھاڑنے کی کوشش کی تو میں ضائع ہو جاؤں گا!"

داہنے کان کی طرف اُٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا۔

"اکیلی کھائے گی تین درجن؟" مَیں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں، اُس کی یہی ادا تو مجھے بھا گئی ہے۔ کھاتی ہے تو کھاتی ہی چلی جاتی ہے۔ تم فکر مت کرو۔ اُس کی فرمائشات کی قیمت مَیں ادا کروں گا۔"

اور یہ حقیقت ہے کہ تین درجن رَس ملائیوں کی قیمت مجھے اپنے کوٹ کی جیب میں مل گئی تھی۔

آٹھویں خط پر اُس نے بھینس کے پائے اور تنوری روٹیوں کی فرمائش کی تھی۔ لیکن اِس کا انتظام کوٹھی میں نہیں ہو سکتا تھا، لہٰذا پکنک پارٹی ترتیب دی گئی تھی۔ اُس رات شہزادہ ککڑوں کوں نے میری پیٹھ پر اس قدر ٹھونکیں ماریں کہ میں بلبلا اُٹھا۔

”ارے میں تو پیٹھ ٹھونک رہا ہوں۔ شاباشی دے رہا ہوں!“ وہ ہنس کر بولا۔

”یار تم نے بڑی مصیبت میں پھنسوا دیا ہے۔ آج ہی اُس نے بٹ کلیجی کی بھی فرمائش جڑ دی ہے۔ کہاں پکواتا پھروں گا۔“

”وہیں جہاں بھینس کے پائے پکوائے تھے۔“

”دیکھنا تم بھی پچھتاؤ گے۔“ میں دانت پیس کر بولا۔

”تم مجھ پر جو احسان کر رہے ہو، اُس کے عوض میں تمہیں اِس سڑی بسی زندگی سے نجات دلا دوں گا۔“

”جن بنا دو گے؟“ مَیں نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں اپنی عوامی حکومت میں تمہیں وزارتِ اُمورِ آدم زادگاں عطا کروں گا۔“

”مجھے اُلو نہ بناؤ۔“

”یقین کرو، ہمارے یہاں بھی ایک دن شہنشاہیت کا خاتمہ ہونا ہے، لہٰذا ابا حضور چاہتے ہیں کہ عوامی لیڈر شپ شاہی خاندان ہی سے اُبھرے، ورنہ ہم سب ٹوکرے ڈھوتے نظر آئیں گے۔“

”مت بور کرو۔“

”اچھا اچھا، اُس دن تمہیں یقین آئے گا، جب تمہیں اپنی سڑی بسی فرم کی اسسٹنٹ مینیجری سے نجات ملے گی اور تم میری حکومت کے ایک وزیر ہو گے۔“

”ہونہہ! جنوں کی حکومت میں مجھے وزارت ملے گی۔“ میں بے اعتباری سے بولا۔

”دیکھ لینا۔“

”تم لوگوں کو اُمورِ آدم زادگان سے کیا سروکار؟“

”میری عوامی حکومت سروکار رکھے گی۔ مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا، جب تمہارے بوڑھے لوگوں کی جوان اور حسین بیویوں پر جن آنے لگتے ہیں۔ تمہاری وزارت ایسے ہی معاملات کی دیکھ بھال کرے گی۔“

”جہنم میں جائے، میں فی الحال کیا کروں۔ اب تو وہ مجھ سے لگاوٹ کی باتیں بھی کرنے لگی ہے۔“

”تم کیا کہتے ہو۔“

”کچھ بھی نہیں، دم بخود رہتا ہوں۔“

”تم ایک وفادار دوست ہو۔“ ”تمہاری جگہ اور کوئی ہوتا تو خود ہی اُس پر قبضہ جما بیٹھتا۔“ مرغ نے سنجیدگی سے کہا۔

”اندھا یا کانا ہوتا خود ہی قبضہ جما بیٹھنے والا... تم آخر مجھے سمجھتے کیا ہو... میں نے تو فلم اسٹار ماہ لقا تک کو گھاس نہیں ڈالی۔“

”میں جانتا ہوں۔ تم بہت پارسا ہو۔ اور اِسی پارسائی کا صلہ تمہیں عنقریب ملنے والا ہے۔“

”میں بُری طرح اُکتایا ہوا تھا، اس لیے اُس سے پیچھا چھڑانے کو ایک کتاب کھول لی۔ میں نوشابہ سے بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ ایک دن اُس نے مجھے گھیر ہی لیا۔ گھر میں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

”بس خط ہی لکھتے رہتے ہو، زبان سے کچھ نہیں کہتے۔“

”زبان سے کیا کہوں۔“ میں نروس ہو گیا۔

”یہی کہ کیا کھاتے ہو اور کیا نہیں کھاتے۔“

”کک... کیا... کھاتا ہوں...؟“

”ہاں... ہاں...“

”بھینس کے پائے...“

”اور...“

”بکری کی اوجڑی...“

”اور...“ وہ کھی کھی کرتی ہوئی بولی۔

''اونٹ کی دُم۔''

''ہنسی کے مارے منہ میں دوپٹہ ٹھونس کر دوہری ہو جانے کی کوشش کرنے لگی، لیکن موٹاپے کی وجہ سے نہ ہو سکی۔''

''اللہ قسم، بہت مسخرے ہو'' وہ بالآخر بولی۔

میں نے بھاگ نکلنا چاہا، لیکن وہ راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

''تم ممی اور ڈیڈی سے کیوں نہیں کہتے۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''کک... کیا کہوں؟'' مجھ پر پوری طرح بدحواسی کا دورہ پڑ گیا۔

''یہی خط والی بات۔''

''ارے باپ رے!''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ... مم... مجھے شرم آتی ہے۔''

''تب پھر کیسے کام چلے گا۔''

''کک... کیسا کام...؟''

''اچھا تو کیا تم مجھ سے محض فلرٹ کرتے رہے ہو!'' وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

''وہ... وہ... دراصل...؟''

''اِس خیال میں نہ رہنا... میں بہت بُری ہوں! مجھے کوئی بھی دھوکا نہیں دے سکتا۔''

''سس... سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''کیا سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''وہ خط خود مَیں نے نہیں لکھے، بلکہ مجھ سے لکھوائے گئے ہیں۔''

''اچھا... اچھا...'' وہ زور سے ہنس کر بولی، ''تو تم صوفی بھی معلوم ہوتے ہو!''

''صوفی... مَیں نہیں سمجھا!'' مَیں نے حیرت سے کہا۔

''ارے ہاں ہمارے نانا ابا بھی صوفی تھے۔ رہ رہ کر یہی مصرعہ پڑھا کرتے تھے کہ کوئی اور بولتا ہے میری صدا نہ سمجھو۔''

مَیں نے دل ہی دل میں اپنا سر پیٹ لیا۔

پھر قبل اِس کے کہ مزید صفائی پیش کرنے کی کوشش کرتا، اُس نے کہا، ”اچھی بات ہے، تمہیں شرم آتی ہے، تو میں خود ہی ممی سے بات کرلوں گی۔“

میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا اور وہ چلی گئی۔

اُس رات جیسے ہی مرغ نے میرے کمرے میں قدم رکھا، مَیں آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ جب میں سب کچھ کہہ چکا تو آہستہ سے بولا، ”بس اب وقت آ گیا ہے کہ مَیں اس معاملے کو ختم ہی کردوں۔“

”کیا مطلب؟“

”صبح ناشتے کی میز پر دیکھ لینا۔“

”کیا دیکھ لوں گا؟“

”سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہوگا۔ تم نے میرے لیے بہت تکالیف اُٹھائی ہیں، تمہیں اِس کا اجر ضرور ملے گا۔“

”مجھے اجر وجر کی ضرورت نہیں ہے، اِس لڑکی سے میرا پیچھا چھڑاؤ۔“

”اچھا... اچھا...“ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر نوشابہ نہیں تھی۔ شیخ صاحب تھے اور بیگم صاحبہ۔ مرغ بیگم صاحبہ کی گود میں بیٹھا ہوا تھا۔ دفعتاً شیخ صاحب مجھے مخاطب کر کے بولے، ”میں بہت آزاد خیال آدمی ہوں!“

”ج... جی ہاں بالکل...“ میں جلدی سے بولا۔

”خون اور ہڈی کی بجائے ذاتی شرافت اور تعلیم دیکھتا ہوں۔ تم شریف بھی ہو اور تعلیم یافتہ بھی۔“

”م... میں نہیں سمجھا۔“ میرے حواس گم ہونے لگے۔

”ہمیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ بے بی تمہارے ساتھ خوش رہے گی۔“

”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟“ میں کرسی سے اُٹھ گیا۔

”بیٹھ جاؤ... بیٹھ جاؤ...“ شیخ صاحب ہاتھ اُٹھا کر بولے، ”بہت زیادہ خوشی کا مظاہرہ کرنا کم ظرفی ہے۔“

”اونٹ کی دُم۔“

”ہنسی کے مارے منہ میں دوپٹہ ٹھونس کر دوہری ہو جانے کی کوشش کرنے لگی، لیکن موٹاپے کی وجہ سے نہ ہو سکی۔“

”اللہ قسم، بہت مسخرے ہو“ وہ بالآخر بولی۔

میں نے بھاگ نکلنا چاہا، لیکن وہ راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

”تم ممی اور ڈیڈی سے کیوں نہیں کہتے۔“ اُس نے آہستہ سے کہا۔

”کک... کیا کہوں؟“ مجھ پر پوری طرح بدحواسی کا دورہ پڑ گیا۔

”یہی خط والی بات۔“

”ارے باپ رے!“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ... مم... مجھے شرم آتی ہے۔“

”تب پھر کیسے کام چلے گا۔“

”کک... کیسا کام...؟“

”اچھا تو کیا تم مجھ سے محض فلرٹ کرتے رہے ہو!“ وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

”وہ... وہ... دراصل...؟“

”اِس خیال میں نہ رہنا... میں بہت بُری ہوں! مجھے کوئی بھی دھوکا نہیں دے سکتا۔“

”سس... سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”کیا سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”وہ خط خود مَیں نے نہیں لکھے، بلکہ مجھ سے لکھوائے گئے ہیں۔“

”اچھا... اچھا...“ وہ زور سے ہنس کر بولی، ”تو تم صوفی بھی معلوم ہوتے ہو!“

”صوفی... مَیں نہیں سمجھا!“ مَیں نے حیرت سے کہا۔

”ارے ہاں ہمارے نانا ابا بھی صوفی تھے۔ رہ رہ کر یہی مصرعہ پڑھا کرتے تھے کہ کوئی اور بولتا ہے میری صدا نہ سمجھو۔“

مَیں نے دل ہی دل میں اپنا سر پیٹ لیا۔

ابنِ صفی ...... قصہ ایک ڈپلومیٹ مرغ کا

پھر قبل اِس کے کہ مزید صفائی پیش کرنے کی کوشش کرتا، اُس نے کہا، ''اچھی بات ہے، تمہیں شرم آتی ہے، تو میں خود ہی ممی سے بات کرلوں گی۔''

میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا اور وہ چلی گئی۔

اُس رات جیسے ہی مرغ نے میرے کمرے میں قدم رکھا، مَیں آپے سے باہر ہوگیا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ جب میں سب کچھ کہہ چکا تو آہستہ سے بولا، ''بس اب وقت آگیا ہے کہ مَیں اس معاملے کو ختم ہی کردوں۔''

''کیا مطلب؟''

''صبح ناشتے کی میز پر دیکھ لینا۔''

''کیا دیکھ لوں گا؟''

''سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہوگا۔ تم نے میرے لیے بہت تکالیف اُٹھائی ہیں، تمہیں اِس کا اجر ضرور ملے گا۔''

''مجھے اجر وجر کی ضرورت نہیں ہے، اِس لڑکی سے میرا پیچھا چھڑاؤ۔''

''اچھا... اچھا...'' کہتا ہوا وہ چلا گیا۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر نوشابہ نہیں تھی۔ شیخ صاحب تھے اور بیگم صاحبہ۔ مرغ بیگم صاحبہ کی گود میں بیٹھا ہوا تھا۔ دفعتاً شیخ صاحب مجھے مخاطب کر کے بولے، ''میں بہت آزاد خیال آدمی ہوں!''

''جج... جی ہاں بالکل...'' میں جلدی سے بولا۔

''خون اور ہڈی کی بجائے ذاتی شرافت اور تعلیم دیکھتا ہوں۔ تم شریف بھی ہو اور تعلیم یافتہ بھی۔''

''مم... میں نہیں سمجھا۔'' میرے حواس گم ہونے لگے۔

''ہمیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ بے بی تمہارے ساتھ خوش رہے گی۔''

''یہ آپ کیا فرمارہے ہیں؟'' میں کرسی سے اُٹھ گیا۔

''بیٹھ جاؤ... بیٹھ جاؤ...'' شیخ صاحب ہاتھ اُٹھا کر بولے، ''بہت زیادہ خوشی کا مظاہرہ کرنا کم ظرفی ہے۔''

"مگر جناب ... مم ... مَیں اس پر تیار نہیں ہوں!"

"کیا مطلب؟" شیخ صاحب کے تیور بدل گئے۔

"ابے اب بولتا کیوں نہیں۔" مَیں نے دانت پیس کر مرغ کو مخاطب کیا۔

بیگم صاحبہ کڑک کر بولیں، "تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔"

"جی نہیں، سب کچھ اِسی کا کیا دھرا ہے۔ ابے بول۔"

"ککڑوں کوں!" مرغ بولا۔

بیگم صاحبہ بھی کچھ کہنے والی تھیں کہ شیخ صاحب ہاتھ اُٹھا کر انہیں چپ کراتے ہوئے مجھ سے بولے، "تو یہ بات ہے... !تم صرف میری عزت سے کھیلنا چاہتے تھے۔"

"جی نہیں، خدا کی قسم وہ خطوط اِسی نانہجار مرغ نے لکھوائے تھے... یہ شہنشاہِ جنات کا بیٹا ہے!"

"شٹ اَپ! (شیخ صاحب دہاڑے) "پاگل پن کا ڈھونگ رچا کر تم اپنی جان نہیں بچا سکو گے۔ شیخ مدار بخش سابق ایم۔ ایل۔ اے کی عزت کو للکارنا آسان کام نہیں، میں تمہاری کھال کھنچوا لوں گا۔"

"مرغ بھائی! یہ کیا ہو رہا ہے؟" مَیں مرغ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔

"ککڑوں کوں!" جواب ملا۔

"بیگم صاحبہ... اِسی نے... !"

"بکواس بند کرو، تمہارے سارے خطوط بے بی نے مجھے دکھائے ہیں۔ کیا تمہیں اِس سے انکار ہے کہ وہ خطوط تم نے لکھے ہیں۔"

"میں نے ہی لکھے ہیں، لیکن اس نے لکھوائے تھے۔" میں نے مرغ کو گھونسا دکھاتے ہوئے کہا۔

شیخ صاحب نے پھر بیگم صاحبہ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ملازموں کو آوازیں دینے لگے۔ پانچوں قوی ہیکل ملازموں نے میز کے گرد گھیرا ڈال دیا۔

"یہ شخص کوٹھی سے باہر قدم نکالنے نہ پائے۔" شیخ صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا، تو اَے عزیزانِ گرامی! بات کو طول دینے سے کیا فائدہ۔ شیخ صاحب کی عزت کا معاملہ تھا، لہٰذا وہی

ہوا جو ہونا تھا۔

حجلۂ عروسی میں قدم رکھتے ہی ایک لفافہ میز پر پڑا نظر آیا۔ لفافے پر میرا ہی نام تحریر تھا۔ مَیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگا۔ حیرت اس پر تھی کہ طرزِ تحریر میرا ہی تھا۔ جھپٹ کر لفافہ اُٹھایا اور اُسے چاک کر کے پرچہ نکالا۔ میرے اپنے ہی ہاتھ کی تحریر معلوم ہوتی تھی۔ اس نانہجار مرغ نے یہاں بھی میرے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی، یعنی میری ہی رائٹنگ میں خط لکھ مارا تھا:

پیارے عبدالمنان!

شادی مبارک! بات دراصل یہ تھی کہ پچھلے دو ماہ سے شیخ صاحب بہت پریشان تھے۔ سیاسی موشگافیاں ترک کر کے صرف شادی بیاہ اور رسم و رواج کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے تھے۔ میرا بڑا نقصان ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر نوشابہ کا بار اُن کے ذہن سے ہٹ جائے تو وہ پھر پہلے ہی جیسے ہو جائیں گے۔ اور پیارے عبدالمنان! مجھے بھلا ابھی شادی وغیرہ سے کیا سروکار؟ ابھی تو مجھے پولیٹکل سائنس میں ایم۔ اے بھی کرنا ہے۔

تم اپنا دل چھوٹا نہ کرو۔ اگلے الیکشن میں شیخ صاحب ضرور کامیاب ہوں گے اور انہیں وزارت کا چانس بھی ملے گا۔ تم وزیر کے داماد کہلاؤ گے اور ہو سکتا ہے کہ اُسی فرم کے جنرل مینیجر بنا دیے جاؤ، جس میں اسسٹنٹ مینیجری کر رہے ہو۔ بہر حال، نوشابہ کو بالکل مفت سمجھو۔

خط پڑھ کر میں ڈھیر ہو گیا اور پھر بآوازِ بلند بانگ دینے لگا، ”ککڑوں کوں، ککڑوں کوں، ککڑوں کوں۔“

”پاگل پن نہیں چلے گا!“ مسہری پر رکھے ہوئے سرخ ڈھیر سے آواز آئی... اور... اور... میں بے ہوش ہو گیا۔

اب آگے کا حال مت پوچھ اے ہم نشیں! وہ مردود تو پولیٹکل سائنس میں ایم۔ اے کر رہا ہے اور یہ ہیچمدان، یعنی عبدالمنان، مرغا بنا ہوا ہے!

* *

بھگنوں کی توپ

ابوالفرح ہمایوں

یہ قصہ بہت پرانا ہے۔ ہمارے گھر کی صفائی پر ایک خاتون مامور تھیں۔ موصوفہ کا تعلق ایک اقلیتی فرقے سے تھا۔ آٹھ بچے ان کے زیرِ کفالت تھے، جن میں سے چند جوانی کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ چند لڑکپن، چند بچپن کے مزے لوٹ رہے تھے اور ایک شیر خواری کے سنہری دور سے گزر رہا تھا، مگر اِس عالم میں بھی خاتون کی زندہ دلی، بذلہ سنجی اور صحت برقرار تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر قہقہے لگانا تو اُن کی سرشت میں داخل تھا۔ کبھی کبھار کسی بچے کو دو ہتڑ لگانے کے ساتھ ساتھ ایک آدھ مناسب سی گالی سے بھی نواز دیا کرتیں۔

محترمہ ہماری صلاحیتوں کا امتحان لینے کی خاطر اکثر و بیشتر کوئی نہ کوئی سوال پوچھتی رہتی تھیں، جن میں زیادہ تر علمی کی بجائے فلمی ہوا کرتے اور کبھی کبھی مذہبی بھی۔ بیگم انہیں ذرا منہ نہ لگاتی تھیں، لہٰذا اُن کی تمام تر دل لگی کا نشانہ ہم ہی بنتے۔ مذہب سے اُن کی دلچسپی دیکھ کر ایک دن ہمارے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ انہیں دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی جائے۔

اِس نادر خیال کا ہاتھ آنا تھا کہ مارے خوشی کے ہم اُچھل پڑے۔ یک نہ شُد دو شُد، اگر وہ ایمان لے آئیں تو اُن کے شوہرِ نامدار اور آٹھ عدد بچے کچے دھاگے سے بندھے چلے آئیں گے۔ اِس طرح ہم بیٹھے بٹھائے یک مشت دس نیکیاں کما کر فارغ ہو جائیں گے اور اگر قدرت نے ساتھ دیا تو یہ دائرہ وسیع بھی ہو سکتا ہے، یعنی اُن کی برادری کے کچھ اور لوگ بھی اِس حلقے میں آ سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر ہم مزید ثواب کمانے کی فکر سے یکسر آزاد ہو جائیں گے اور جنت میں ایک عالی شان محل تو کہیں نہیں گیا۔ ہم طرح طرح کے خیالی پلاؤ پکانے لگے۔ دو چار روز مزید سوچ بچار کے بعد ایک دن ہم نے بیگم کو اپنے پاس بٹھایا اور اِدھر اُدھر کی کچھ باتیں بنانے کے بعد اصلی پلاؤ، قورمہ، کباب، کھیر اور شاہی ٹکڑے بنانے کا فرمان جاری کر دیا۔

”کیا دوبارہ دعوتِ ولیمہ کا ارادہ ہے؟“ وہ تعجب اور حیرت سے بولیں۔

”نہیں۔ دعوتِ ولیمہ تو نہیں، البتہ دعوتِ تبلیغ ہوگی۔“ ہم نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟ میں نے آپ کو جمعے کے علاوہ کوئی اور نماز پڑھتے تو دیکھا نہیں۔ تبلیغ کیا خاک کریں گے؟“ انہوں نے مضحکہ اُڑاتے ہوئے کہا۔

”فضول باتیں مت کرو۔“ ہم جھینپ سے گئے۔ ”اگر ہم سے نماز میں کوتاہی ہو جاتی ہے تو اِس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمارے دل میں ایمان کی کوئی رمق موجود نہیں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم تبلیغ کا فریضہ بھی انجام دیں گے۔“ ہم نے بارعب آواز میں سینہ تان کر کہا۔

”مگر تبلیغ کرنے والے ایسی شان دار دعوتوں کا اہتمام نہیں کرتے۔ وہ تو بس گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ لوگوں کو اچھی اچھی باتیں وغیرہ بتاتے ہیں اور جو رُوکھی سوکھی مل جائے، کھا لیتے ہیں۔“ بیگم نے ہمارے علم میں اضافہ کیا۔

”ہم اُن میں سے نہیں۔ ہم نے چند بزرگوں کے بارے میں سُنا ہے کہ وہ جب کسی کو دِین کی طرف بلانا چاہتے تو اُسے دعوتِ طعام دیتے اور پھر اپنی بات کہتے۔ ہم ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتے ہیں۔“ ہم نے اپنی خودی اور آواز کو بلند کرتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا۔

”اچھا!“ بیگم نے ذومعنی انداز میں گھور کر دیکھا۔ ”آپ کتنے مذہب پرست ہیں، یہ تو مجھے خوب اچھی طرح معلوم ہے۔“ اور پھر بات کو فوراً پلٹتے ہوئے فرمایا، ”بھلا تبلیغ کے لیے آپ کی نگاہِ انتخاب کن لوگوں پر پڑی ہے، ذرا میں بھی تو سنوں۔“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ تمہیں یہ علم ضرور ہونا چاہیے۔“ ہم نے سراپا انکسار ہو کر کہا، ”اِس نیک کام کے لیے ہم نے صرف ایک اور نیک شخصیت کا انتخاب کیا ہے۔ غریب اور مسکین ہے اور ایسے لوگوں پر نصیحت زیادہ اثر کرتی ہے۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے، مگر آپ نے بتایا نہیں کہ وہ بزرگ ہستی کون ہے؟“ انہوں نے نام جاننے پر اصرار کیا۔

”وہ مبارک شخصیت ہمارے بے حد قریب ہے۔ ہم لوگ اُسے خوب اچھی طرح جانتے ہیں“۔ ہم نے ڈرامائی انداز اختیار کیا۔

”صاف صاف بتائیں، پہیلیاں بجھوانے کی ضرورت نہیں ہے“۔ بیگم بھڑک اُٹھیں۔

”وہ... وہ... وہ جمعدارنی... جو ہمارے یہاں آتی ہے۔“ ہم نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”کیا... آ... آ...!!!“ وہ حلق پھاڑ کر چلائیں۔ ”اُس کمینی کو مسلمان بنائیں گے؟ کیا شادی کا ارادہ ہے؟ لعنت ہے ایسی بے ہودہ سوچ پر۔ وہ بڈھی کھوسٹ، نہ شکل نہ صورت، نہ ذات نہ پات۔“ اُن پر زنانہ قسم کا دورہ پڑ گیا۔ ”میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ ہائے میں برباد ہوگئی۔“ اور وہ زار و قطار رونے لگیں۔

چند لمحوں بعد جب اُن کی آہ وزاری میں ذرا کمی آئی تو ہم نے سمجھانے کی کوشش کی، ”اری نیک بخت! ہم یہ نیک کام پوری نیک نیتی کے ساتھ کرنے جا رہے ہیں۔ ہماری نیت میں ذرا بھی کھوٹ نہیں۔“ بیگم پھٹی پھٹی نگاہوں سے ہمیں دیکھے جا رہی تھیں۔ ”تم نے محسوس کیا ہوگا کہ وہ اکثر ہم سے مذہبی سوالات پوچھتی رہتی ہے، گویا اُس کے دل کے کسی گوشے میں اسلام سے محبت کا جذبہ انگڑائیاں لے رہا ہے، لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ بس یہی مناسب موقع ہے بھرپور وار کرنے کا۔“

بیگم صاحبہ کا چہرہ سوکھے ہوئے پھول کی طرح مرجھایا مرجھایا سا لگ رہا تھا، لیکن اِس عالم میں بھی وہ طنز کا تیر چلانے سے باز نہ آئیں، ”اگر ایسا ہی ہے تو اُس کو کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں لے جائیں۔ خوب کھلائیں پلائیں اور اچھی طرح تبلیغ کریں۔ مجھے کیوں گنہگار کرتے ہیں۔“

اچانک ہمیں غصہ آگیا۔ ”گستاخ عورت! کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ ہم ایک نیک کام کرنے جا رہے ہیں اور تم ہماری راہ میں روڑے اٹکاتی ہو۔“ ہمارا سخت اور درشت رویہ دیکھ کر وہ سہم گئیں۔ موقع مناسب جان کر ہم نے ایک اور چوٹ لگائی، ”نہ صرف یہ کہ وہ یہاں آئے گی، بلکہ کھانا بھی ہمارے ساتھ کھائے گی۔“

”کیا... کیا... کیا مطلب؟ یعنی کہ... وہ ہمارے ساتھ... ہمارے برتنوں میں کھائے گی؟“ اُن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ”نا بابا نا! یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ آپ بیٹھیے گا مہترانی صاحبہ کے ساتھ۔ میں بس کھانا پکا کر رکھ دوں گی۔“

بیگم کا خوف زدہ انداز دیکھ کر ہمیں ترس آنے لگا۔ ہم نے اپنے لہجے میں دُنیا بھر کی مٹھاس سموتے ہوئے کہا، ”دیکھو! یہ ایک نیک کام ہے۔ ہم لوگ اُس کے ساتھ کھائیں گے، پئیں گے اور ہنس ہنس کر باتیں کریں گے تو اُس کے دل پر کتنا خوشگوار اثر پڑے گا اور عین ممکن ہے کہ ہماری

خوش اخلاقی سے متاثر ہو کر وہ فوراً ہاں کر دے۔‘‘

بیگم صاحبہ کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ ’’چلیں، آپ ضد کرتے ہیں تو مانے لیتی ہوں۔ آخر آپ کے ساتھ رہنا جو ہے۔‘‘ اور ایک پھیکی سی ہنسی ہنس کر پوچھا، ’’تو کب کر رہے ہیں دعوت؟‘‘

’’بس صبح ہی اُسے کہہ دیں گے کہ رات کے کھانے پر آ جائے۔ نیک کام میں دیر کرنے کی کیا ضرورت ہے‘‘۔ ہم نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔

’’ایک دن کا وقفہ رکھ لیجیے۔ آخر تیاری کے لیے کچھ وقت بھی تو چاہیے۔‘‘ بیگم صاحبہ کا اعتراض درست سمجھتے ہوئے ہم نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

وہ عموماً صبح نو بجے آ جایا کرتی۔ پہلے بیت الخلا صاف کرتی اور پھر صابن سے ہاتھ منہ دھو کر گھر میں جھاڑو بہارو کر دیا کرتی۔ دوسرے دن جب وہ اپنا کام ختم کر کے جانے لگی تو ہم نے بلاتوقف اُسے دعوت دے ڈالی، ’’کل رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھانا۔ کچھ ضروری باتیں بھی کرنی ہیں۔‘‘

’’کیا بات کرے گا؟ ابھی بول دو۔ میرے پاس ٹیم نہیں ہے۔‘‘ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔

’’نہیں نہیں، ابھی نہیں۔‘‘ ہم گھبرا گئے۔ ’’کل شام کو جلدی آ جانا تب بتائیں گے۔‘‘ اور یہ فرض کر کے کہ اُس نے دعوت قبول کر لی ہے، ہم گردن جھکا کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

دوسرے دن وہ کام پر نہیں آئی۔ ہم نے سوچا، شام کو آ کر کام کر لے گی۔ کھانا تیار تھا مگر ہم انتظار ہی کرتے رہ گئے۔ اگلا دن بھی گزر گیا۔ کہیں بیمار نہ پڑ گئی ہو۔ لیکن پہلے کبھی اگر ایسا ہوا بھی تو کوئی دوسرا آ کر کام کر جایا کرتا تھا۔ جب تیسرا دن بھی نا اُمیدی میں گزرنے لگا تو مجبوراً ہمیں بھی اُٹھنا پڑا۔ ہم اپنے ’ہدف‘ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ دو تین جمعداروں سے پوچھا، لیکن سب نے ہماری طرف سے نگاہیں پھیر لیں۔ اُن کی نفرت کی کوئی وجہ ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ بالآخر ہم نے سوچا کہ ہیڈ جمعدار سے مل لیتے ہیں، لیکن جیسے ہی ہم اُس کے دفتر میں داخل ہوئے، ایک گرج دار آواز نے ہمارے پیر پکڑ لیے، ’’اوے بابو! تم کو اِدھر آنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ فوراً اِدھر سے نکل لے۔‘‘

ہم سہم کر ذرا پیچھے ہٹ گئے۔ ”کیا ہوا جمعدار صاحب! ہم نے کیا قصور کیا ہے؟ ہم تو ایک درخواست لے کر حاضر ہوئے تھے۔“

ہم کو کوئی درخاست مرخاست نہیں سننا۔ اپنا فوٹو فوراً گم کرو۔ ہمارا عورت کے ساتھ مذاق کرتا ہے اور پوچھتا ہے، کیا ہوا۔“ ہیڈ جمعدار نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں جناب! ہماری یہ مجال کہاں۔ ہم نے کسی سے مذاق نہیں کیا۔“ ہم نے لرزتے ہوئے صفائی پیش کی، ”ہم تو یہ پوچھنے آئے تھے کہ صفائی کرنے والی عورت تین دن سے غائب ہے۔ خیریت تو ہے نا؟“

”خیریت کا بچہ! وہ اب تمہارے گھر نہیں آئے گی۔“ ہیڈ جمعدار کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔

”بھائی صاحب! آپ کو کیسے سمجھائیں۔ ہم نے کوئی خراب حرکت نہیں کی۔“ ہم نے گھٹنے ٹیک دیے۔ ہماری سمجھ میں اب بھی نہ آیا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔

”تم نے اُس کو کھانے پر کیوں بلایا۔ کیا وہ تمہاری بہن لگتی ہے؟“ ہیڈ جمعدار اپنا بید لہراتے ہوئے یک دم کھڑا ہو گیا۔

ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ہماری عقل ٹھکانے آ گئی۔ ہماری بے ضرر سی دعوت کا مطلب وہ کچھ اور سمجھ بیٹھی اور اپنی برادری والوں کو ہمارے خلاف بھڑکا دیا۔ ہم نے فوراً ہیڈ جمعدار کی منت سماجت شروع کر دی، ”حضور! جنابِ عالی! بندے سے بہت بڑی بھول ہو گئی۔“ ہم نے رقت زدہ لہجے میں پوری کہانی اُن کے گوش گزار کر دی اور رحم کے طالب ہوئے۔

ہیڈ جمعدار کے حلق سے ایک فلک شگاف قہقہہ اُبل پڑا اور اُس کے ساتھیوں کے چہروں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”جاؤ بابا جاؤ! تم بالکل چریا ہے۔ ہم تم کو معاف کیا۔“ اس نے ہمیں دفع کرنے کے سے انداز میں ہاتھ ہلایا اور بولا، ”ابھی جاؤ! ہم کسی کو بھیج دیں گے، پر اُس کو نہیں!“

* *

فارغ البالی

ارشد میر

کساد بازاری اور معاشی بدحالی کے اس نازک دور میں فارغ البالی ہی ایک ایسی جنس ہے جس کی فراوانی ہے۔ جیسے جیسے گرانی بڑھتی جاتی ہے اور اشیائے خوردنی بازار سے نایاب ہو رہی ہیں ’شیخ چاند‘ قسم کے حضرات بڑھتے جاتے ہیں اور ان کی چندیا کی چمک دمک دانشوروں کی فصل اور نسل میں اضافہ کرتی جاتی ہے ان ’گنج ہائے گرانمایہ‘ حضرات کی تعداد میں پے در پے اضافہ ہوتا جاتا ہے اور یہ کثرتِ ذہانت و ذکاوت کی ایک روشن مثال ہے۔ چندیا کی چمک اور تابنا کی نے انسانی عظمت کے نقوش فروزاں کرنے میں سرتوڑ کوشش کی ہے۔ یہی نہیں دھوپ میں چندیا کی چمک سورج کو بھی مات کرتی ہے بلکہ بعض اوقات دھوپ کی چکا چوند سے آنکھیں بھی چندھیا جاتی ہیں اور شیخ سعدیؒ کا یہ شعر وردِ زبان ہوتا ہے:

بالائے سرش ز ہوش مندی   می تافت ستارہ بلندی

ستاروں پر کمندیں پھینکنے اور چاند تک رسائی کی بال شکن کوششیں بھی زیادہ تر گنجوں ہی کی رہینِ منت ہیں جنہوں نے ذہن رسا کا وقت بے وقت بے جا اسراف کیا۔ شب و روز اوورٹائم لگا کر بڑی بیدردی سے اپنے بالوں کی بیخ کنی کی اور تہذیب نو کے گیسو سنوار کر اسے اوج کمال تک پہنچایا۔ اصلاح احوال کی ان کوششوں اور فکر و نظر کی موشگافی نے ان حضرات پر حکمت و دانش کی راہیں کھول دیں۔ بلکہ ایک پورا چٹیل میدان ہی ان کے سروں پر استوار کر دیا۔ شاید اسی مناسبت سے اس بولتے ہوئے مصرع میں اس حقیقت حال کی ترجمانی یوں کی گئی ہے کہ:

”تہذیب کا کمال ہی بالوں کا ہے زوال“

آج تک کسی مؤرخ کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ حسبِ عادت صرف انکل سے ہی دنیا کے سبب

سے پہلے گنجے یعنی گنجوں کے باوا آدام کی نشاندہی کر سکے۔ خاص طور پر اپنے عوامی مؤرّخوں سے سخت مایوسی ہے اور ہم نے دل ہی دل میں سوچ رکھا ہے کہ ظالمو لگے ہاتھوں ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے آثار قدیمہ سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر ہی دنیا کے اوّل ترین گنجے کا سراغ لگالو کہ تمہاری تہذیب کا ہر سرچشمہ ہڑپہ اور موہنجوداڑو تک پہنچتا ہے یا خود ہی ذرا جراُت رندانہ بلکہ جراُت گنجانہ کے بَل پر اعلان کر کے ڈٹ جاؤ کہ دنیا کے پہلے گنجے کو جنم دینے کا سہرا ہماری اس صاف ستھری دھرتی کے سر پر ہے تا کہ دنیا کی دوسری قوموں میں ہماری سر بلندی بلکہ 'سر چمکی' کی داستانیں عام ہو جائیں اور برملا کہا جا سکے کہ اگر اور کسی میدان میں ہمیں برتری حاصل نہیں۔ تو کم اَز کم گنجوں کی صف میں ہم انفرادی شان رکھتے ہیں لیکن صاحب یہ نام نہاد مؤرّخ تو ایشیائی قوموں کی مانند لکیر کے فقیر ہیں بلکہ طرہ یہ کہ پیدائشی طور پر بزدل بھی ہیں۔ ان کی روایتی سرد مہری اور سرفروشی و جانبازی کی بجائے سرد و گرمیانی سے دیسی گنجوں کو گھبراتے یا احساسِ کمتری کا شکار ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں کیوں کہ گنجوں کی عظیم برادری اپنے مثالی تعاون اور باہمی اشتراک کے سبب رنگ نسل ملک یا مذہب کی قید سے آزاد ہے۔ عالمگیر انسانی برادری کا یہ متفقہ شان جب تک سروں پر قائم ہے دنیا میں امن و امان کی اصل ذمّہ داری بھی گنجوں ہی کے حصے میں آتی ہے یو این او کا صدر آج تک کوئی نہیں ہوا۔ جب تک اس کے سر پر بال تھے اور اگر کوئی اتفاقاً بالوں والا صدر چن بھی لیا گیا تو اس کے بال چند برس میں خود ہی گر گئے یا اسے سر منڈا کر اولے کھانے پڑے۔ بات چل نکلی ہے تو یہ حقیقت اپنی جگہ حقیقت ہی تو ہے کہ ایک ریڈ انڈین گنجا ایک انڈین گنجے تک کو بھی ماں جایا سمجھ کر فرطِ محبت اور وفورِ جذبات سے لپٹ جاتا ہے اور گنجا ہوتے ہوئے بھی دیس بدیس اس کی سرپرستی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے میں فخر محسوس کرتا ہے عوامی نظریے کی رو سے کبھی کبھار گنج قاروں سے بھی تھوڑا بہت شک گزرتا ہے کہ شاید جناب قارون بھی فارغ البال ہی ہوں گے۔

قارون کے گنجے ہونے کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اُردو زبان کے چند ممتاز شاعر جو کاندھالہ کے رہنے والے تھے ان پر یار لوگوں نے ایک بڑے دلکش انداز میں قارون کی رعایت سے پھبتی کسی تھی:

آتا ہے کاندھلے سے جو لاتا ہے سر پہ گنج
قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا

سر دست ان شعرائے کاندھلہ کا حلیہ ذہن نشین کرنے یا ان کے حدود اربعہ کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ حضرت احسان دانش کی رُوح ناراض ہو جائے گی۔ اگر ذرا دولت جمع کرنے سے فرصت ملے تو تاریخ عالم کے ورق الٹیے جس میں بڑے بڑے مفکر فلسفی، سیاست دان، شاعر انشا پرداز حاکم اور بورژوا گنجوں کی لمبی چوڑی فہرست ملے گی جنہوں نے اپنے گنجے ذہن رسا کے بل بوتے پر تاریخ عالم میں نقش دوام چھوڑ کر کئی روشن اور تابناک ابواب کا اضافہ کیا ہے۔ بلکہ قوم کی رہبری کا منصب اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان گنجا ہو۔ چنانچہ دیکھا جائے تو اگر ہمارے ہاں ایک سیاسی پارٹی کو نوابزادہ نصر اللہ خان کا گنجا پن راس آیا ہے تو دوسری پارٹی کے ولی خان شیخ چاند کہلاتے ہیں۔ مزدوروں کے رہنما بشیر بختیار کی مسلسل کامیابی کے پیچھے بھی یہی گنج پنہاں نظر آتا ہے۔ پاکستان کے سیاست دانوں میں گنج ہائے گرانمایہ کی موجودگی کے بارے میں ایک سودس برس پہلے اُردو زبان کے عظیم شاعر غالب نے بھی اپنے انداز دل رُبا میں جغادری گنجوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے یوں داد کے ڈونگرے برسائے تھے:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لیئم تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

اسے حسنِ ظن کے لیے غلط فہمی سے تعبیر کیجیے یا غالب کے مندرجہ بالا شعر کی تاثیر سمجھیے کہ بالوں والے تو گنجوں کی ننگی کھوپڑیوں کو دیکھ کر مذاق اُڑاتے رہے جب کہ کچھ درویش منش ان کے حالِ زار پر رحم بھی کھاتے رہے لیکن دوسری جانب خود گنجے حضرات ''بال بال بچے'' کے سب احساسِ برتری کے ہتھیار سے لیس ہو کر بلا روک ٹوک ہر جگہ اور ہر مقام پر کھوکھلے سروں اور کھوکھلے دماغوں سے دندناتے پھرتے ہیں اور یوں اپنی عظمت کا سکہ بٹھاتے ہیں۔ سچ ہے تھوتھا چنا باجے گنا۔

گنج بہر حال ایک خداداد عطیہ ہے، اس لیے ہر کس و ناکس گنجوں کے حلقے میں شامل ہونے سے قاصر ہے گنج اور اقبال بختی کا بھی چولی دامن کا ساتھ رہے چنانچہ عام مشاہدے کی بات ہے۔ کہ گنجا شخص مالی، تعلیمی و ذہنی لحاظ سے عام سطح اور معیار کے آدمیوں سے اونچا بلکہ بعض اوقات بہت اونچا ہوتا ہے۔ اس طرح کے بہت اونچے لوگوں کے لیے حکومت نے ایک الگ عمارت بھی قائم کر رکھی ہے، جسے نادان لوگ پاگل خانہ کہتے ہیں۔ بعض اوقات صحبت صالح کی طرح 'صحبت گنجا ترا گنجا کند' پر عمل پیرا ہو کر بڑے دُور رس نتائج کا باعث بھی بنتی ہے۔ چنانچہ اسی لیے کسی

زمانے میں سکندر مرزا حسین شہید سہروردی کے ساتھ ہو گئے تھے۔

بات سے بات نکلتی ہے چنانچہ عشق کرنا ہر دور میں محبوب مشغلہ ہے لیکن وادی عشق میں یہ انفرادی اعزاز صرف گنجے عاشق کو ہی حاصل ہے کہ وہ کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل آسانی سے جا پہنچتا ہے، بشرطیکہ فرش عمدہ سمینٹ کا ہو جس پر بآسانی پھسلا جاسکے، پھر اس شاعر خوش بیان کو بھی کھل کر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ جو ضیافت طبع کی خاطر بڑے دلچسپ پیرائے ہیں رقیبوں کی تعریف میں رطب اللسان ہے:

رقیبوں کی صورت پہ قربان جائیں　　　کوئی ان میں گنجا کوئی ان میں کانا

یک چشم حضرات پر بھی کسی وقت طبع آزمائی ہوگی۔ فی الحال گنجوں سے سابقہ پڑا ہے۔ قدرت نے بناوٹ کے لحاظ سے گنج کی کئی شکلیں پیدا کی ہیں کوئی گنجا گنج عالم ہوتا ہے۔ یعنی ایک سرے سے دوسرے سرے تک گنجا کوئی چھتری دار ہوتا ہے۔ جیسے صوفی تبسّم مرحوم تھے۔ بعض گنجے 'میانہ رو' ہوتے ہیں یعنی ان میں دولت اور بے دولتی کی تقسیم نصف نصف ہوتی ہے، معنوی اعتبار سے بھی گنجوں کی کئی قسمیں ہیں۔ سیاسی گنجے، سماجی گنجے، شادی شدہ گنجے، غیر شادی شدہ گنجے سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ اکثر خادمان اہلیہ قسم کے احباب کی اکثریت اس جنس گرانمایہ سے شادی کے فوراً بعد ہی روشناس ہو کر فیض یاب ہوتی ہے گُربہ کشتن روز اوّل کی گردان آج کل بلیوں کی کمیابی کی وجہ سے بے موسمی سی ہوتی جارہی ہے اس لیے متاہل زندگی کی سرگزشت نعلین کی ناز برداری سے شروع ہوتی ہے اور کفش آزادی پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس مقام پر پہنچ کر جب تک رفیقہ حیات جہیز کے کامدار جوتوں سے خدمت نہ کر دے، شوہر نامدار و وفا شعار کو کسی کل چین نہیں پڑتی، بلکہ صفاچٹ سروں والے پکار پکار کر کہتے ہیں:

"المدد پاپوش بیگم سر مرا کھجلائے ہے"

اور پھر نیاز مند قسم کے خاوند سر جھکائے اپنے لاڈلے گنجوں پر تابڑ توڑ جوتے کھاتے ہیں۔ اور اُف تک نہیں کرتے کئی جانباز اور سورما قسم کے خداوندان مجازی کے منہ سے اس شبھ گھڑی جزاک اللہ اور سبحان اللہ کے نعرے بھی براڈ کاسٹ ہوتے ہیں بیچوں قسم کے ایک مجازی خدا کی اہلیہ جب مرمت کرتے کرتے تھک گئی اور تماش بین خاوند کے گنجے سر پر جوں تک نہ رینگی تو

محترمہ نے تنگ آکر گھریلو محاذ کے سب سے اہم ہتھیار کو پھینک دیا۔ لیکن خاوند کو جو ایک محاذی کفش پر دردہ اور سرد و گرم عالم دیدہ مزاج تھا۔ اس نے دردمندانہ التجا کی کہ خدارا یہ سلسلہ جاری رکھیے۔ اسی طرح کے ایذا پسند گنج ہر جگہ اور ہر شعبہ زندگی میں پائے جاتے ہیں اور اپنے چمکدار سروں اور حسنِ ظرافت سے پہچانے جاتے ہیں اسی قماش کا ایک اور شوہر نامدار اپنی چہیتی اہلیہ کی ورزش برائے بحالی صحت اور انڈور گیم کے لیے ہمیشہ کریپ سول جوتے لایا کرتا تھا۔ کیوں کہ اس کی مستند رائے یہ تھی کہ کریپ سول جوتے راحت بخش اور لذت آمیز ہوتے ہیں اور ایک ہی ضرب میں دو مرتبہ لگتے ہیں اور یوں یہ جوتے اس مشینی اور مصروف دور میں تھوڑے سے وقت نہ جملہ حاجات پوری کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ورنہ ڈگ جوتے تو سراسر تضیع اوقات کا باعث بنتے ہیں۔

البتہ سعادت آثار شوہروں کی سبک اور نازک خرام بیگمات کی ایڑی دار جوتیاں نغمے کا حکم رکھتی ہیں ان سے مدھر موسیقی کی تانیں برآمد ہوتی ہیں پٹائی کے ساتھ ساتھ بیک گراؤنڈ میوزک کا مزہ کچھ اور ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سزا کے مستحق گنجے شوہران کرام کو گھنٹوں سر دھنتے دیکھا گیا ہے۔ کئی ماڈرن ٹیڈی قسم کے دل پھینک گنجے نوجوان وِگ لگا کر راہ چلتی لڑکیوں سے گاہے گاہے رنگ برنگی ڈیزائن دار جوتیوں سے خاطر تواضح کرواتے پائے گئے ہیں اس کا سبب بھی یہی موسیقی کا ذوق ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی واردات کے بعد ان کی آتشِ شوق اور بھی بھڑکتی ہے اور بقول شخصے:

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

بلکہ اپنے نامکمل عشق کی تکمیل کی خاطر کسی الھڑ دوشیزہ سے پاپوش کاری کے ذریعے اس دلی تمنا کا اظہار کرتے ہیں:

محبت کا ٹھپا کہاں چاہتا ہوں
میں اس گنج پر اِک نشاں چاہتا ہوں

چنانچہ اکثر ان کا شوق کوئی قتالہ شہر اور آفت جاں بہ طریق احسن پوری کر کے دلی مراد بر لاتی ہے اس کے برعکس اُلٹے بانس بریلی کو کے مصداق ایک عاشق ہرجائی نے یہ نعرہ مستانہ لگا کر اصلی اور نامور عاشقوں کی دنیا میں کھلبلی مچادی تھی:

یا الٰہی سرے سے معشوق کو گنجا کر دے
کہ وہ زلفوں میں مرے دل کو پھنسایا نہ کرے

اگر اِس قسم کے فتنہ ساز عاشقوں کی دعائیں مستجاب ہونے لگتیں تو کم اَزکم دنیا کی نصف

شاعر آبادی آج آزاد ہو چکی ہوتی۔

دنیا میں گنجوں کی کتنی قسمیں آباد ہیں۔ ابھی اس کا حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ اگر کبھی کسی اعداد و شمار کے محکمے کے سپرد ’گنج شماری‘ کا فریضہ ہو گیا تو پھر جملہ اقسام کا حال معلوم ہو سکے گا۔ اس وقت مارکیٹ میں مادر زاد گنجے خاندانی گنجے حادثاتی اور ٹیڈی گنجے زیادہ روشناس ہیں ان میں سے ہر ایک کی ذات علیٰحدہ خفیہ اور ظاہری خوبیوں کا مرقع ہے پچھلے دنوں ایک خاندانی گنجے تاریخ کے طالب علم نے ٹوپی پگڑی کی تاریخ کڑیاں ملاتے ہوئے یہ حیرت انگیز انکشاف بھی کیا تھا کہ دراصل ان کی ایجاد کس سہرا بھی گنجوں ہی کے سر ہے جنہوں نے حقے کی چلم کے سرپوش کو دیکھ کر سر ڈھانپنے کے لیے ٹوپی اور پگڑی کو رائج کیا۔ آج کل ٹوپی اور پگڑی کا رواج ایسا غائب ہوا ہے جیسے گنجے کے سر سے بال! یہ صورتِ حال گنجوں کے مفادِ عامّہ کے پیشِ نظر بے حد مہلک ہے موجودہ دور میں خاص طور پر گنجوں کو پگڑی یا ٹوپی کا انتظام کر لینا چاہیے تا کہ زراعت کے دلدادہ چندیا کو بھی بنجر یا غیر ممکن اراضی کے طور پر الاٹ نہ کرا لیں اگر ایک دفعہ سرکاری کاغذات بالخصوص پٹواری کے کاغذات میں اندراج ہو گیا تو پھر لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور گنجے حضرات سر کھجاتے رہ جائیں گے۔ پگڑی کا تنہا یہی فائدہ نہیں تھا کہ انسان پٹواری سے بچ جاتا تھا۔ بلکہ اس کے گوناگوں فائدے ہیں اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک گنجے دولہا میاں نے شیخی میں آ کر لائٹ موڈ میں سہاگ رات دلہن کے روبرو اپنے گنجے سر سے بھاری بھر کم پگڑ اُتار دیا۔ اس طرح کے رُوح فرسا منظر کی تصویر کشی راجہ مہدی علی خان مرحوم کی ٹکسالی زبان میں ملاحظہ ہو:

گنجے سر پر سے جب ہنس کے کم بخت نے اپنا پگڑا اتارا تو میں رو پڑی

البتہ اب پگڑی اور ٹوپی کے نعم البدل کے طور پر وِگ کے رواج کو گنجوں نے زیادہ ہی اپنا لیا ہے۔ بلکہ گنجویوں نے تو اس میں کئی تراشیں اور فیشن پیدا کر لیے ہیں گنجا مرد صرف مانگ والی وِگ پہنتا ہے جب کہ گنجی بیگم مانگ کے علاوہ لمبے بال، کٹے ہوئے بال جوڑا وغیرہ کئی طرح کے بال پہنتی ہے۔ تاریخ میں جولیس سیزر کا گنجے سر کو بذریعہ وِگ ڈھانپنے کا ثبوت موجود ہے اسی طرح ججوں کے سر پر بھی وِگ ایک عرصہ سے بہار دکھا رہی ہے۔

میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ جس طرح رنگوں کا ظہور قوسِ قزح کی مدد سے ہوا۔ اسی طرح

جیومیٹری جیسے نادر اور سودمند علم کے موجد بھی گنجے ہی ہوں گے۔ جہاں کہیں رنگ برنگے گنجوں کا اجتماع ہو۔ آپ کو ان کے سروں پر اعلیٰ وارفع ڈیزائنوں کے مربعے مستطیلیں، تکونیں، قوسیں، مثلثیں دائرے اور نیم دائرے نظر آئیں گے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسی نوعیت کے کسی نادر اجتماع سے ریاضی دانوں نے فائدہ اُٹھا کر علم جیومیٹری وضع کیا ہوگا۔

گنجے حضرات کمرشل بنیادوں پر بھی اپنے سروں کی بدولت مالا مال ہوتے ہیں۔ اکثر بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ اور مینیجر گنجے ہی ہوا کرتے ہیں۔ بلکہ سنا ہے کہ اب بعض کمپنیاں اپنے اشتہارات میں ایک شرط یہ بھی لگاتی ہیں کہ وہ ایک اور لحاظ سے بھی خوش قسمت ہیں:

اے دیانت، برتو لعنت از تو، نجے یاختم
اے خیانت، برتو رحمت از تو گنجے یاختم

پھر یہ بھی مت بھولیے کہ گنجا ہونے کے کئی اور فائدے بھی ہیں گنجا ہونے کی صورت میں تند و تیز آندھی میں آپ کے بال پریشان ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ نیز سردیوں میں آپ کا سر مبارک یخ اور گرمیوں میں تپ جاتا ہے اور آپ بآسانی اس قدرتی بیرومیٹر (آلہ موسمیات) کے ذریعہ درجہ حرارت معلوم کر سکتے ہیں یہی نہیں تیز بخار میں آپ برف کی ڈلی کو شفاف سر کے چاروں طرف بغیر کسی رکاوٹ کے گھما پھرا سکتے ہیں جب کہ بالوں والے غریبی دعوے کی پٹیاں سر پر رکھتے ہیں۔ ان سے بہت دیر میں خاطر خواہ، نتیجہ برآمد ہوتا ہے ظاہر ہے کہ گنجا اس حالت میں جلد صحت یاب ہوتا ہے۔ اور بالوں والے حضرات دیر میں تندرست ہوتے ہیں گنجا آدمی دنیا کی ظالم ترین مخلوق یعنی حجام سے بھی ہمیشہ کے لیے گلوخلاصی کرالیتا ہے حجام کی اوٹ پٹانگ باتوں کو بھی بوقت حجامت جان ہتھیلی پر رکھ کر بردباری سے سننے سے بھی عافیت رہتی ہے۔ بڑے بڑے تنگ مزاج، سفاک، جابر، خودسر اور خوددار بھی اس بے بسی کے لمحے میں حجاموں کے آگے سر جھکانے پر مجبور ہیں لیکن یہ اعزاز گنجے ہی کو حاصل ہے کہ وہ برملا سینہ تان کر کہہ سکتا ہے کہ

”کسی کے آگے نہ خم ہوسکی مری گردن“

گنجا تیل کنگھی کے لوازمات سے بھی بے نیاز ہے البتہ گورنمنٹ کالج لاہور کی ایک تقریب میں چند باغ و بہار طلبا نے فارسی کے گنجے استاد کی خدمت جلسہ تقسیم انعامات کے موقع پر بڑی نفیس اور اعلیٰ کنگھی کا تحفہ پیش کر کے حق بہ حق دار رسید کی تاریخ میں اپنی دانست میں ایک سنہری باب کا

اضافہ کیا تھا لیکن انہیں یہ خبر نہ تھی کہ گنجے کو کنگھی تو کیا اللہ میاں تو ناخن بھی عطا نہیں کرتا چنانچہ مثل مشہور ہے۔

خدا گنجے کو ناخن نہ دے۔

ادھر بڑھاپے کے آثار نمایاں ہوں۔ سفید بالوں کا آغاز ہو تو یار لوگ بی مار کہ خضاب اور دیگر الا بلا تیلوں کا استعمال شروع کر دیتے ہیں لیکن اگر آپ خدا کے فضل و کرم اور بیوی کے حسن سلوک سے گنجے ہیں تو آپ کو پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ سفید بالوں کا واحد علاج گنجا پن ہے۔

گنجوں کی خوبیوں کا کہاں تک شمار کیا جائے۔ یہ انہی کا فیضان ہے کہ الیکشن کے دوران میں پراپیگنڈے کے لیے بھی سر دی پر چھوٹے موٹے اشتہارات چسپاں ہو سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ حسبِ ضرورت فریق مخالف کے کارٹون بھی اس پر بنائے جا سکتے ہیں۔ اُردو زبان کے گنجے ادیب اپنے سروں پر اُردو بولو، اُردو سیکھو اور اُردو پڑھو لکھ کر سفری سائن بورڈ بھی لگا سکتے ہیں کاش اُردو زبان کا کوئی بہی خواہ گنجا مولانا صلاح الدین اور ڈاکٹر سیّد عبداللہ کو یہ صدری نسخہ بتا دیتا کہ ایسے انسان کا سر اُردو کے اس کام بھی آ سکتا ہے۔

قارئین کرام! اگرچہ یہ صحیح ہے کہ گنج خداداد نعمت ہے لیکن یہی نعمت محنت سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ ایک ایرانی دانشور کا قول ہے:

نابردہ رنج گنج میسر نمی شود　　مزد آں گرفت جانِ برادر کہ کار گرد

گنج برائے علم ہا یا گنج برائے گنج دونوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ ان میں محنت ضروری ہے اللہ تعالیٰ محنت میں برکت دیتا ہے:

لیلی لل لنسان الا ماسعی

حضرات اب تک تو ہم نے گنج کے جمالیاتی اور افادی پہلوؤں سے بحث کی ہے اب ہم اس کی بعض عمومی خوبیوں کے بارے میں آپ کو چند کار آمد باتیں بتاتے ہیں۔ گنج کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انفرادیت پسند ہے اقبال کے شاہین کی طرح انفرادی پسند اور سخت کوش وہ جماعت کے وصف سے عاری ہے جس طرح اہل دولت جو بظاہر آپس میں ربط ضبط رکھتے ہیں لیکن ان کے

دل رقابت سے پُر رہتے ہیں۔ ہر گنجا تاجر اپنی خودی کو بلند رکھتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے آج تک گنجوں کی کوئی انجمن نہیں بن سکی۔ کاش کوئی دانش مندان کے سر میں یہ حکمت بھی ڈال دے:

ذر زر کشد گنج گنج

اہل گنج ایک اعتبار سے بڑے فائدے میں ہیں وہ اس طرح کہ جب بارش میں اولے پڑتے تو ان کو سر منڈانے کی زحمت نہیں کرنا پڑتی۔ ورنہ ظریف جبل پوری مرحوم کو یہ کہنا پڑتا ہے:

بادل گھر کے آئے ہیں اور اولے پڑنے والے ہیں
اب جلد بلا حجام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

پھر آپ کو ہر شہر میں 'گنج منڈی' مل جاتی ہے گنجان آباد محلوں کو آباد کرنے کا سہرا بھی انہی کے سر ہے بعض شہروں کے نام کے ساتھ گنج کا لف اسی صداقت کی طرف اشارہ کرتا ہے چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ سابق مشرقی پاکستان میں گنجوں کی معقول تعداد تھی۔ وہاں باقر گنج نارائن گنج چھوڑ چھوٹے چھوٹے پہاڑوں کے سینے چیر کر مایہ ناز مریدانِ بال صفا نے پہاڑ گنج کی داغ بیل بھی ڈال رکھی تھی۔ اس طرح بھارت کے کئی مردم خیز خطے بھی انہی کے دم قدم سے آباد ہیں نمونے کے طور پر اور حوالے کی خاطر بیگم گنج مولوی گنج اور قائم گنج ہیں پنجاب کا علاقہ گنجی بار بھی تو چندان تھک گنجے ورکروں کی محنت شاقہ کا ثمر ہے کئی بار ایسوی ایشن میں اکثر وکلاء صاحبان گنج کی نعمت غیر مترقبہ سے بہرہ مند ہوتے ہیں یعنی وہ گنجے بھی ہوتے ہیں اور بہرے بھی اس مناسبت سے آپ ہچوں قسم کی بار کو گنجی بار کہنے میں حق بجانب ہیں۔

گنج ہر آدمی کو زیب نہیں دیتا اگر اچھا بھلا تربوز ایسا سر ہو تو اس پر گنج خوب پھبتا ہے لیکن لیموں سائز سر ہو تو آدمی جوکر نظر آنے لگتا ہے گنجوں میں ٹیڈی گنج سب سے زیادہ دیرپا اور نفع بخش ہوتا ہے اور اس کے فوائد بھی دوسروں کی نسبت زیادہ ہیں ان عمر رسیدہ دھان پان وکلا کی شہرت اور عظمت کی نشانی یہی ٹیڈی گنج ہے۔ البتہ ٹیڈی گنجوں سے لے کر گنجے ہائے گرانمایہ تک کی چمکیلی اور بھڑکیلی چندیا پر چانٹا رسید کرنے کے لیے دل بہت للچاتا ہے اور تڑاخ کی آواز سے سرور آجاتا ہے۔ اس وصف انسانی سے فائدہ اُٹھانے کے لیے بعض جفاکش لوگ گرمیوں میں نائی سے سر پر استرا پھروا لیتے ہیں۔ اور مکھن کی ٹکیہ کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ تاکہ چکنے گھڑے پر پانی نہ ٹھہرے؟

دلکش اور مترنم ہو جہاندیدہ گنجا خواہ 'گنجا پاپی' قبیلے سے ہی کیوں نہ ہو اگر پیری مریدی کا ڈھونگ رچالے تو مریدان سر کا ایک اچھا خاصا حلقہ اس کے دستِ گنج پرست پر بیعت بھی کر سکتا ہے ذرا سی ہلاشیری سے دکانداری چمکانے کا بڑا نادر موقع ہاتھ آتا ہے البتہ یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ فارغ البال ہونے کی صورت میں زندگی بیمہ کرائے بغیر بارش میں چلنا پھرنا بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔ تجربہ کار اور باراں دیدہ گنجے موسلا دھار بارش اور ژالہ باری میں کسی قیمت پر بھی گھر سے باہر کا رُخ نہیں کرتے سمجھ دار گنجے تو تیز اور کراری دھوپ میں بھی سپاٹ سروں کے بچاؤ کی خاطر گھروں میں دبکے رہتے ہیں تاکہ زیادہ حدت سے تانبے کے سر پگھلنے سے بچ جائیں۔ البتہ ہلکی پھوار میں باہر نکلنے کا اپنا ہی لطف ہے اور ننھی منی بوندیں سر پر پڑنے سے خاص مزا ملتا ہے۔ رات کو کسی گلستان یا بوستان (شیخ سعدی والی نہیں) میں سونے پر صبح گنجے سر پر شبنم کے سجے سجائے قطرے نہ صرف فرحت بخش بلکہ قابل دید ہوتے ہیں اس موقع پر اس نازک مزاج رئیس زادے کا ذکر خیر نامناسب نہ ہوگا۔ جو رات کو سالم گنجے سر پر چھتری تانے ٹہل رہا تھا۔ تو ایک زلف دراز بانکے نے بڑی حیرانی سے پوچھا۔ حضرت رات کو چھتری اوڑھنا چہ معنی دارد؟ پہلے تو چھتری بردار گنجا اس بے معنی سوال پر سیخ پا ہو گیا۔ لیکن پھر ضبط کر کے شائستگی سے یوں گویا ہوا حضرت غالباً بینائی سے محروم معلوم ہوتے ہوئے دیکھتے نہیں اوس پڑ رہی ہے۔ امریکا روس والے چاند پر تو کمندیں ڈال چکے ہیں لیکن یہاں ان کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ ریسرچ کے میدان میں سردھڑ کی بازی لگا دینے اور بال کی کھال اتارنے کے باوجود گنجے پن کا کوئی مستقل اور پختہ علاج دریافت نہیں کر سکے بلکہ نوبت بہ ایں جا رسید کہ چندیا کے لیے نقلی بالوں کا رواج بھی نہیں چلا سکے۔ وائے بے چارگی کہ امریکا کے سابق وزیر اعظم خردشیف اپنی تمام تر مساعی کے باوجود گنجوں کی برادری سے باہر نہ نکل سکے۔ کیمیا گروں کی طرح گنجوں کی یہ خوش فہمی ہر لحاظ سے قابل داد ہے کہ وہ زندگی بھر اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ان کے بال حیات مستعار میں ایک دفعہ ضرور اگیں گے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، بلکہ کہنا چاہیے، اے بسا آرزو کہ گنج شدہ اور یوں وہ زندگی کی سب سے اہم حسرت دل میں لے کر اس دنیا سے سدھار جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ مومن کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ اقبال کے یہ مرد قلندر آرزو کی شمع مسلسل جلائے رکھتے ہیں لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی بلکہ گنجا پن تو خداداد اور موروثی تحفہ بھی ہے کہ نسل در نسل منتقل ہوتا ہے چنانچہ تجربہ اور مشاہدہ اس

حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ گنجوں کی آل اولاد کو جائیداد سے کچھ ملے نہ ملے دولت گنج ضرور نصیب ہوتی ہے یہ آج کا نہیں بلکہ صدیوں پرانا دستور ہے اور نسلاً بعد نسلاً جاری رہتا ہے۔ اب قارئین کے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے گنجوں پر چند لطائف کا ذکر نہ کرنا بے ادبی کے مترادف ہوگا۔

ایک گنجا اگر منہ دھونے بیٹھے تو اس کے منہ اور پیشانی میں کوئی حد فاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک دوست نے اپنے جگری فارغ البال یار سے پوچھا کہ میاں صاحب منہ کہاں تک دھوتے ہیں کیوں کہ تمہارا فور ہیڈ ہی فور ہیڈ ہے لیکن ہیڈ نظر نہیں آتا۔

1965ء کی جنگ میں ہمارا ایک جہاز بہت دیر تک سروں پر منڈلاتا رہا۔ ایک گنجا دوست یہ جان کر کہ ہندوستانی جہاز ہی نہ ہو۔ درخت کی اوٹ میں ہوگیا۔ ایک زندہ دل دوست کی رگ ظرافت پھڑکی تو اس نے کہا قبلہ درخت سے باہر تشریف لائیے۔ جہاز لینڈ کرنا چاہتا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم میں شامل ہونے والے ایک ثقہ فوجی گنجے کا بیان ہے کہ اس نے لڑائی کے دوران اپنی چندیا پر ریگ مال گھسا گھسا کر سرسوں کے تیل کی خوب مالش کر رکھی تھی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ غنیم کی دندناتی گولیاں صفاچٹ چندیا سے پھسلتی رہیں اور یوں جان بچی سو لاکھوں پائے خیر سے گنجے گھر کو آئے۔

آپ نے اس گنجے کا لطیفہ تو ضرور سنا ہوگا جس نے طیش میں آکر ایک گھنگھریالے بالوں والے سے کہا کہ میاں سر پر کیوں چڑھ رہے ہو تو اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ حضرت خدا لگتی۔ کہیے مجھے آپ کے سر پر چڑھ کر اور پھسل کر جان سے ہاتھ دھونا ہے۔

لوگ یورپ کی ایک شکی مزاج بیگم کا واقعہ بیان کرتے ہیں جس نے اپنے خاوند کے سوٹ کا بنظر غائر جائزہ لیا۔ اور پھر جب کافی تلاش اور بسیار جستجو کے باوجود بھی اسے کوئی بھورے یا سیاہ رنگ کا بال نہ مل سکا۔ تو اس نے بڑے بھولپن سے کہا، ”کند ہم جنس باہم جنس پرواز“ معلوم ہوتا ہے کہ آج کسی گنجی عورت کے ساتھ رہے ہو۔

ایک تاریخی واقعہ بھی سن لیجیے۔ جب مرزا یادگار نے کشمیر میں بغاوت کر کے تاج شاہی سر پر رکھ لیا۔ تو اکبر اعظم نے لاہور سے کوچ کیا اور دریائے راوی کے کنارے اُترتے ہوئے کسی مصاحب سے پوچھا کہ شاعر نے یہ بیت کس گنجے کے بارے میں کہی تھی:

گلاہِ خسروی و تاج شاہی
بہر کل کے رسد حاشا وکلاء

تماشا یہ ہوا کہ مرزا یادگار سر سے گنجا نکلے۔ لگے ہاتھوں ایک دوسرا واقعہ بھی سن لیجیے جو موقع کے عین مطابق ہے اور جس کے پڑھنے سے بھلا ہونے کا بھی امکان ہے تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ ایک زمانے میں لاہور سے اُردو کا نہایت معیاری پرچہ شباب اُردو بڑی آب و تاب سے نکلتا تھا جس کے ایڈیٹر خاں احمد حسین خان خصوصیتِ گنج میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ان کا سر صفا چٹ تھا اور داڑھی مونچھیں شاید خورد بین ہی سے نظر آ سکتی ہوں۔ انہوں نے ہمارے ایک مشفق کو خود یہ شعر اپنی شان میں سنایا تھا جو بقول ان کے اکبر الہ آبادی نے انہی کے بارے میں کہا تھا:

دیکھو احمد حسین خاں کی طرف فارغ البال ایسے ہوتے ہیں

چلتے چلتے ایک اور واقعہ بھی یاد آ گیا۔ فیروز پور مشرقی پنجاب میں کسی مشاعرے میں گوپی چند امن اور شری رام لال ورما موجود تھے۔ دونوں ادیب یگانہ اور مایہ ناز صحافی سر سے گنجے تھے۔ شری سری رام پریم نے پھبتی کسی:

بڑے بڑے ایڈیٹر جن کی گنجی ہوگئی چاند

آخر میں ہماری درخواست ہے کہ گنجوں کے بارے میں لطائف کے وسیع ذخیرے کو شائع کرنا چاہیے۔ حکومت کا یہ عوامی فرض ہے کہ وہ گنجے عوام و خواص کی قدر شناسی کریں اور ان کے بارے میں جملہ لطائف کو یکجا کر کے شائع کرنے کا کوئی بندوبست استمراری کریں۔ اس سلسلے میں ادبیات پاکستان، مقتدرہ قومی زبان پاکستان رائٹرز گلڈ ادارہ ثقافت اسلامیہ، حلقہ ارباب نقص کے بیدار فوتیدہ مو ارکان کی خصوصی توجہ مطلوب ہے۔ جن کی اچھی خاصی تعداد روشن خیال برادری سے تعلق رکھتی ہے۔ خصوصاً ادارہ ثقافت اسلامیہ کا یہ فرض ہے کہ ہمارے ثقافت کو تحفظ عطا کریں۔ کتاب کا نام بھی ان کے فائدے کے لیے گنجینۂ ادب تجویز کرتا ہوں۔ اس نام میں نصابی کشش بھی ہے اُمید ہے جیسے ہی کتاب شائع ہوئی اسے کم اَز کم بی اے کے کورس میں جگہ ملے گی۔ اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگی۔

* * *

چمچہ کانفرنس

احمد جمال پاشا

چمچہ کانفرنس کا افتتاح کرنے کے لیے ایک بڑا سونے کا چمچہ کھڑا ہوا، جو سب سے نمایاں اور لمبا تڑنگا تھا۔ کہنے کو چمچماتا ہوا چمچہ تھا، پر قد میں کفگیر سے بھی نکلتا ہوا۔ اُس نے پاٹ دار آواز میں کہا:

”میرے چمچے بھائیو! میں بادشاہی چمچہ ہوں! میں نے کتنے راج بدلتے دیکھے۔ جانے والے کو پلٹ کر نہ دیکھا۔ مجھے اَن گنت راجاؤں اور بادشاہوں کا منہ لگا چمچہ رہنے کا فخر حاصل ہے۔“

ایک زنگ لگے بیچ میل، دھات والے بدصورت چمچے نے انتہائی بازاری انداز میں فقرہ کسا:

”چمچے صاحب! بادشاہی چمچوں کا دور تو کب کا گزر گیا۔ اب تو ہر طرف جنتا کے چمچوں کا زور ہے۔“

بادشاہی چمچے نے بڑی حقارت، مگر انتہائی وقار اور رکھ رکھاؤ سے پوچھا:

”آخر آپ کس کے چمچے ہیں؟“

زنگ خوردہ چمچے نے بُرا مانتے ہوئے کہا:

”میں کسی کا چمچہ وچمچہ نہیں۔“

سونے کے چمچے نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا:

کیا واقعی یہ دنیا اب اتنی گر چکی ہے کہ کوئی کسی کا چمچہ نہ رہے؟ اگر آپ کسی کے چمچے نہیں بنے ہیں تو اس چمچہ گیری کے دور میں زندہ کیسے ہیں؟“

بادشاہی چمچے اور جنتا کے چمچے میں بیچ بچاؤ کے لیے پلاٹینم کا چمچہ کھڑا ہو گیا، جو چمچہ کانفرنس کی صدارت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ چمچوں کی نگاہوں میں سینکڑوں بجلیاں سی کوند گئیں۔ بہت سی چمچیاں اُس کے جلوے کی تاب نہ لا کر غش کھا گئیں۔ تمام معزز چمچے احتراماً کھڑے ہو گئے۔

سب اُس کے چمچے معلوم ہو رہے تھے۔ پلاٹینم کے چمچے نے دُور دُور تک لائٹ مارتے ہوئے کہا:

''میں سات سمندر پار کا امپورٹیڈ چمچہ ہوں۔ چمچہ گیری کرتے میری عمر گزر گئی۔ دنیا کے تجربات کی بنیاد پر آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ بے جا بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ بھائیو! عزت کی زندگی گزارنے کے لیے کسی نہ کسی کا چمچہ ہونا ضروری ہے۔ یاد رکھیے، ہم اپنی زندگیاں کسی کا چمچہ رہنے، یا اِس کی آرزو میں گزار دیتے ہیں۔''

سونے کے چمچے نے کہا:

''جنابِ والا! جس کے بھی چمچے ہوں، مگر ہیں بہت شاندار، ضرور کسی شہنشاہ کے چمچے ہوں گے۔''

پلاٹینم کے چمچے نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا:

''بتانے کا زمانہ نہیں میرے بھائی! دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ کبھی ہمارے بھی زمانے تھے، مگر اَب چھاپے کے خوف سے چُھپے چُھپے پھرتے ہیں۔ اگر چمچہ کانفرنس میں کوئی بھی خفیہ پولیس کا چمچہ موجود ہوا تو ابھی پکڑ لیا جاؤں گا۔ آپ سے بھی کیا چوری۔ میں اسمگلروں کے بادشاہ کا چمچہ ہوں۔''

مختلف کونوں سے ایک ساتھ آواز آئی:

''اچھا اچھا! جنابِ صدر بمبیّا چمچہ ہیں۔''

''جی نہیں! خاکسار ہانگ کانگ کا چمچہ ہے!''

''جنابِ والا کا مشغلہ؟''

''جی! وہی پیشۂ آبائی، چمچہ گیری۔''

اتنے میں ایک لمبا تڑنگا، انتہائی گندہ المونیم کا چمچہ کھڑا ہو گیا اور بولا:

''مجھ سے ملیے، میں ہوں آپ سب کا پُرانا چمچہ!''

اُس کے پاس سے اتنی سخت بدبو آ رہی تھی کہ پلاٹینم اور سونے کے چمچے ایسے بچک کر ہٹ گئے، جیسے وہ انھیں کاٹ ہی تو کھائے گا۔ انھیں ڈر تھا کہیں اُس کی جوئیں اُن کے نہ چڑھ جائیں۔ انھوں نے اپنی ناکیں بند کر لیں۔ وہ بولا:

''پلاٹینم کے چمچے صاحب! میں بھی اسمگلر آپ بھی اسمگلر! اپنا ہی بھائی بند سمجھیے! جو کام آپ

چمک دمک کے پردے میں دِکھاتے ہیں، وہ ہم چمچے گندگی کی آڑ میں انجام دیتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ گندہ دھندہ، گندگی سے بڑھتا ہے۔ پھر کامیابی سے کوئی جلتا بھی نہیں۔“

پلاٹینم کے چمچے نے کہا:

”گویا، راہیں جدا جدا ہیں، منزل ایک ہے!“

اتنے میں ایک چاندی کا چمچہ کھڑا ہو گیا اور بولا:

”سچ ہے، ہم سب کی ایک ہی منزل ہے۔ مجھے دیکھیے، میں ڈاکٹروں کا چمچہ ہوں۔ مجھے بڑے بڑے ڈاکٹروں کا چمچہ رہنے کا فخر حاصل ہے۔“

کسی نے پوچھا:

”چمچہ گیری کی آڑ میں جناب کا مشغلہ کیا ہے؟“

”اپنا دھندہ تو دو نمبر کی دواؤں اور انجکشنوں کا ہے۔“

یہ سنتے ہی چاندی کے چمچے پر، لے ہو، لے ہو، شروع ہو گئی۔

”اِسے نکالو! یہ قاتل ہے!... اِسے بٹھادو! یہ زہر کا سوداگر ہے۔“

پلاٹینم کے چمچے نے چاندی کے چمچے کو بٹھاتے ہوئے ’آرڈر آرڈر‘ کہہ کہ چمچوں کو خاموش کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اتنے میں ایک اسٹین لیس اسٹیل کا چمچہ کھڑا ہو گیا اور پاٹ دار آواز میں دھواں دھار تقریر شروع کر دی:

”میں لیڈروں کا چمچہ ہوں، میں تاریخ ہوں، جب چاہوں تاریخ مسخ کر کے رکھ دوں۔ بڑے سے بڑے لیڈر کی نکیل ہوں، جسے چاہوں ڈبو دوں، مخالفت پہ آؤں تو بیڑا غرق کر دوں۔ میرا کوٹہ، پرمٹ، لائسنس اور غیر ملکی مبادلۂ زر کا اتنا بڑا دھندہ ہے کہ اگر بھنک بھی کوئی پا جائے تو ابھی اندر ہو جاؤں۔ میں بالکل نہیں پسند کرتا کہ دوسروں کے چکر میں چمچے آپس میں لڑیں۔ ہمارا کام اُلو سیدھا کرنا ہے، نہ کہ اُلو بننا؟“

اسٹین لیس اسٹیل کے چمچے کا سارے چمچوں پر بڑا رعب پڑا۔ اتنے میں جھلا کر ایک بیلچہ نما لوہے کا چمچہ کھڑا ہو گیا، جو چمچے سے زیادہ پھاوڑا معلوم ہو رہا تھا۔ لوہے کے چمچے نے کہا:

”میں ہٹلر کا چمچہ ہوں۔“

ہٹلر کا نام سنتے ہی ایک ترقی پسند چمچے کا موڈ خراب ہو گیا۔ اُس نے بگڑتے ہوئے پوچھا:

"اگر آپ ہٹلر کے چمچے ہیں تو جناب کا اِس کانفرنس میں کیا کام؟ یہ تو اپنا معاملہ ہے۔"

ہٹلر کے چمچے نے کہا:

"ہٹلر کا ساتھ تو کب کا چھوٹ گیا۔ اب تو دیسی بھائیوں کا ساتھ ہے۔ شاید آپ نے کبھی کوئی بلوہ فساد نہیں دیکھا، ورنہ آپ مجھے بآسانی پہچان لیتے۔ جو کام آپ تقریروں سے کرتے ہیں، وہ ہم ڈنڈے کے زور سے کروانے کے قائل ہیں۔"

ایک رکابی نما پتیل کا چمچہ یہ کہتا ہوا کھڑا ہو گیا کہ آپ بھی ٹھیک ہیں اور آپ بھی۔

میں نے پوچھا، "جناب کی تعریف؟"

"میں شعر واَدب کا چمچہ ہوں۔"

یہ سن کر کہ چمچے شعر واَدب تک میں دخیل ہیں، کانفرنس میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

رکابی نما چمچہ بولا:

"میں نقاد ہوں، میں ادب کے آگے آگے چلتا ہوں۔ خاکسار، ڈاکٹر اسپون ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، ڈی فل، ڈی ڈی ٹی کے نام سے دنیائے ادب میں شیطان کی طرح مشہور ہے۔ کچھ لکھتا وکھتا نہیں، مگر لکھنے والوں کی ہوا ٹائٹ کیے رہتا ہے۔"

ڈاکٹر اسپون 'ڈی کریٹنگ' کے دنیائے ادب پر نو دولتیوں کی طرح اِترانے پر، کچھ دانشوروں کے چمچوں نے ہوٹنگ شروع کر دی۔ رانگے کے دستی چمچے نے ڈاکٹر اسپون کو بٹھاتے ہوئے کہا:

"بھائیو! میں انجینئروں کا چمچہ ہوں۔ میں ایسی سڑکیں، نہریں اور پُل بنوا چکا ہوں، جن کا وجود آج تک محض کاغذی ہے۔ کیوں نہ ہو، کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا۔ میری انجینئرنگ کے آگے اسمگلروں اور چور بازاروں تک کے چمچے مات ہیں۔ میں فخرِ روزگار ہوں۔ میں چاہوں تو کوئی عمارت، بند، پل، یا سڑک ایک برسات بھی نہ جھیل پائے۔ میں انگلینڈ ریٹرن ہوں۔"

انگلینڈ ریٹرن چمچے کا تالیوں کی گونج میں چمچوں نے خیر مقدم کیا۔ ابھی وہ مزید گل افشانی کرنے والا تھا، جس کے بعد تعارفی تقریب ختم ہو کر اجلاس کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوتی کہ ایک بہت تاؤ دار لوہے کا چمچہ، جو چمچے سے زیادہ کانٹا معلوم ہو رہا تھا، کھڑا ہو گیا اور ڈپٹ کر بولا:

"میں آپ سب کو نئے قانون کے تحت گرفتار کرتا ہوں۔"

سونے کے چمچے نے گھبرا کر پوچھا:

”ہمیں گرفتار کرنے والے آپ کون ہوتے ہیں؟ مسٹر! جمہوریت ہے، آزادی ہے، کانفرنس کرنا تمام چمچوں کا بنیادی حق ہے۔ آپ ہمیں اظہارِ رائے کی آزادی کے حق سے محروم نہیں کرسکتے۔“

اُس نے کہا، ”میں پولیس کا چمچہ ہوں۔“

”آپ کوئی بھی ہوں، مگر ہیں تو چمچے۔ اگر سب چمچوں کو بند کردیا گیا، تو یہ انتظام اور قاعدے قانون کون چلائے گا؟“

پولیس کا چمچہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چمچوں نے اُس پر حملہ کردیا۔ اُس کے سیٹی بجاتے ہی چاروں طرف سے کانفرنس پر پولیس ٹوٹ پڑی۔ بار بار آنسو گیس اور لاٹھی چارج کے باوجود چمچے منتشر نہیں ہورہے تھے اور تشدّد پر اُتر آئے تھے۔ مجبوراً پولیس کو فائرنگ کرنی پڑی۔ میں نے جان بچانے کے لیے اسٹیج سے جیسے ہی ایک لمبی چھلانگ لگائی، ایک چیخ کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ ٹانگیں ادوائن میں پھنسی تھیں، بقیہ جسم زمین پر مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا...

* *

ایک شعر کا تجزیہ

احمد صغیر صدیقی

ہاتھی کو بڑا کیا بڑا کیا　　　لٹھے کو کھڑا کیا کھڑا کیا

مندرجہ بالا شعر (اگر اِسے شعر کہا جا سکے) معلوم نہیں کس کا ہے۔ عرصے تک مَیں اسے 'بونگی شاعری' کے ایک نمونے کے طور پر پیش کرتا رہا ہوں۔ لیکن اِدھر کچھ عرصے سے جو منظومات کی تشریح و تجزیے کا نیا سلسلہ شروع ہوا ہے (اب تک کوئی پانچ عدد نظموں کے تجزیے شائع ہو چکے ہیں)۔ انھیں پڑھنے کے بعد مجھے اس بات کا شدّت سے احساس ہوا کہ کاش مجھے بہت پہلے یہ تجزیے پڑھنے کو مل گئے ہوتے تو مَیں اِس 'عظیم شعر' کے ساتھ اس قدر ناانصافی کا مرتکب ہرگز نہ ہوتا، جو مَیں نے اس کے ساتھ اب تک روا رکھی۔ بہر حال، جو ہوا سو ہوا۔ مَیں نے اس شعر پر غور کیا اور پڑھے ہوئے عالمانہ تجزیوں سے روشنی کسب کرتے ہوئے اس کا تجزیہ کیا تو مجبور ہو گیا کہ ان نتائج میں دوسرے پڑھنے والوں کو شریک کروں، تا کہ تلافیِ مافات کی صورت نکلے۔

اس شعر میں ہاتھی اور لٹھا، کہیں استعارہ، کہیں میڈیم اور کہیں علامت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ شعر کو پڑھیں تو پہلی ہی قرأت میں اس کے کئی حسن بجلی کی طرح چمکتے محسوس ہوتے ہیں۔ مثلاً، اس کی روانی، بے ساختگی، ابلاغی قوت، سادگی، بے تکلفی، اختصار اور ایجاز جیسی باتیں پڑھنے والوں کو فوراً ہی "Strike" کرتی ہیں۔ ایک لفظ بھی زائد نہیں ہے اس میں۔ نہ اس میں سے کچھ کم کیا جا سکتا ہے، نہ بڑھایا جا سکتا ہے۔ یہ باتیں اس کی پہلی جہت کی طرح سامنے آتی ہیں۔

اس شعر کی دوسری جہت ہاتھی کی علامت ہے، جو اِس کا وزنی تصوّر آشکار کرتی ہے۔ شعر کی تیسری جہت، دوسری جہت کے ساتھ اسی طرح پیوست نظر آتی ہے کہ بادی النظر میں تیسری جہت نہیں لگتی، مگر ہے یہ اس کی تیسری جہت۔ اور یہ جہت لٹھے کی علامت ہے، جو اِس کے جامد تصوّر کو ہمارے سامنے لاتی ہے۔ پھر جب ہم اس کا موازنہ ہاتھی سے کرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ

شاعر نے ایک مصرعے میں زندہ شے اور دوسرے مصرعے میں بے جان شے کے کھڑے ہونے اور اِن کے کھڑے کیے جانے کی جو رعایت برتی ہے، اُس نے شعر کو بے پناہ حد تک وسیع کینوس بخش دیا ہے کہ یہ ساری کائنات یا تو مُردہ اشیاء کا مجموعہ ہے، یا زندہ اشیاء کا۔ کسی تیسری قسم کی کوئی چیز یہاں نہیں ہے۔ اس سے شاعر کی فنی چابکدستی کے علاوہ کائنات پر اُس کی گہری نگاہ کا بھی پتا چلتا ہے۔ کائنات میں موجود چیزوں کے گرد ہی دنیا کے متعدد علوم گھومتے ہیں۔ لیکن ذرا غور کریں کہ صرف دو مصرعوں میں شاعر نے جو کچھ لکھ دیا ہے، وہ ہزار ہا کتابوں پر بھاری کہا جا سکتا ہے، بلکہ یوں سمجھیے شاعر نے یہاں اِن تمام علوم کی تلخیص کر دی ہے اور وہ بھی کمال سادگی سے۔

اس شعر میں 'کھڑے' کیے جانے کا عمل بہت اہمیت رکھتا ہے۔ پڑھنے والے اس سے سرسری گزر جاتے ہیں۔ یہیں اُن سے چُوک ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ یہاں تامل کیا جائے، بلکہ کھڑا ہو جایا جائے۔ یہاں پر فوراً ہی سوال پیدا ہوگا کہ ہاتھی کے مقابلے میں لٹھا ہی بطور دوسری علامت کیوں استعمال ہوا۔ آخر شاعر نے اُس کے مقابلے میں فٹ بال یا چرخے وغیرہ کو کیوں استعمال نہیں کیا۔ حالاں کہ بات سامنے کی ہے۔ شاعر نے ازمنۂ قدیم سے رجوع کیا ہے، جب ہاتھیوں کو دریاؤں سے لٹھے نکال نکال کر باہر رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ گویا دوسرے مصرعے میں اُس نے ہاتھی کے سامنے لٹھے کو صرف اس لیے استعمال کیا ہے، تاکہ مقابلے کا جواز بھی نکل آئے اور شعر میں معنویت کی ایک نئی فضا بھی پیدا ہو سکے۔ یہاں سے گویا قاری کو شاعر ازمنۂ قدیم کی طرف لے جاتا ہے، جب بار برداری اور درآمد برآمد کے لیے وہ وسائل میسر نہ تھے، جو آج ہیں۔ شعر میں ہاتھی حرکت اور لٹھا برکت کے نمائندے کہے جا سکتے ہیں۔ اس سے شعر میں ہمارے ارتقائی سفر کے تقریباً سارے راز منکشف ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر مسئلہ ابھی اس میں ایک دبا ہوا ہے، جو کھڑے کیے جانے کا ہے، یعنی حرکت کے روک دیے جانے کی بات۔ اگر ہم اس تناظر میں دیکھیں تو اِس وقت دنیا کے اندر پھیلے ہوئے اُس رُجحان تک ہماری رسائی ہوتی ہے، جو ارتقاء کے خلاف پھیل رہا ہے۔ رجعت پسند قوتوں کی جانب سے بپا کیے جانے والے ہنگامے کو خارجی سطح پر پھیلتی، سکڑتی، سازشوں کو گویا یہ جہاں بے نقاب کرتا ہے، وہیں اپنے پس منظر سے پیش منظر تک کھینچی ہوئی یہ اُس لکیر کو بھی دریافت کرتا ہے، جسے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے اب تک کتنے فلسفی اپنی انگلیاں فگار اور خامہ خونچکاں کر چکے ہیں۔

اب اس شعر کی یہ خوبی بھی سامنے آنے لگتی ہے کہ جس طرح ہاتھی کے لیے لٹھا ضروری ہے، اسی طرح لٹھے کے لیے ہاتھی ضروری ہے۔ ہاتھی کی بڑائی کو کسی لانبی چیز ہی سے ناپا جاسکتا ہے۔ سو لٹھا ضروری ہوا۔ مگر لٹھا صرف لٹھا نہیں ہے، یہ تو یہاں ایک میڈیم کی طرح استعمال ہوا ہے۔ یہاں شاعر نے بتایا ہے کہ ہاتھی کی بڑائی کا اندازہ صرف کسی ایسی ہی چیز سے ممکن ہے، جو خود بڑی ہو۔ اب شعر میں ایک فلسفیانہ جہت اُبھرتی ہے اور ایک نئی بات سامنے آتی ہے، بلکہ اسی طرح دوسرے مصرعے میں جب شاعر یہ کہتا ہے کہ لٹھے کو کھڑا کیا، کھڑا کیا تو بتا یہ رہا ہوتا ہے کہ لٹھے کی اپنی اہمیت اُسی وقت ہے، جب اُسے کھڑا کیا جائے۔ پھر لٹھے کی صفت کی سمت بھی نگاہ جاتی ہے کہ اُسے جب تک کھڑا نہ کیا جائے تو وہ کھڑا نہیں ہوسکتا۔ مگر جب اُسے کھڑا کر دیا جائے تو وہ کھڑا ہی رہتا ہے۔ مگر یہ لٹھا اور اُس کا کھڑا کیا جانا، یہ کوئی عام باتیں نہیں ہیں، بلکہ یہ دراصل استعاراتی باتیں ہیں۔ اِن پر آپ جتنا غور کریں گے، اتنے ہی پہلو سامنے آئیں گے۔ اس جگہ شاعر کا مقصد بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی چیزوں کو کارآمد بنائے بغیر کوئی چیز کارآمد نہیں ہوتی اور یہ کہ انسان آج بھی ارتقاء کا اتنا سفر طے کرنے کے بعد اُسی جگہ کیوں کھڑا ہوا ہے۔

شعر میں تہہ در تہہ معانی و مفاہیم کی ترسیل، اسلوب اور موضوع دونوں کی مرہونِ منّت ہے۔ زیرِ نظر شعر میں زندگی کی کئی بنیادی حقیقتوں کو واضح کیا گیا ہے، مگر کسی ڈرامائی کیفیت کے بغیر۔ جب شعر کی پرتیں کھولی جاتی ہیں، تب احساس ہوتا ہے کہ ہم نے کیا پڑھا۔ شاعر نے گویا جو کچھ کہنا تھا، کہہ دیا۔ اور معانی و مطالب نکالنے کا کام قاری کے سپرد کر دیا ہے۔ جواز اور انکشاف، عمل اور ردِّ عمل کے فلسفے کو جس گہرے انداز سے اس شعر میں پیش کیا گیا ہے، اس کی مثال کم کم ملے گی۔ یہ شعر ابلاغ کی سطح پر ایسے ذہن کا متلاشی شعر ہے، جس میں بھُس نہ بھرا ہوا۔ طبیعیات اور مابعد الطبیعیات، سماجیات اور شماریات، احساسات اور بلیات، حیات و جنسیات؛ حتیٰ کہ ازدواجیات تک اس شعر کے حلقہ ہائے اثر میں شامل ہیں۔ لاحول ولاقوۃ...

* * *

وزارت کا خوف!؟

احمد ندیم قاسمی

ہمارے ایک کرم فرما غڑاپ سے ہمارے کمرے میں داخل ہوئے۔ دھڑاک سے دروازہ بند کیا، کٹاک سے چٹخنی چڑھائی اور بولے:

’’مجھے کہیں چھپا دیجیے۔‘‘

ہم سمجھے یہ صاحب اتفاق سے کوئی قتل کر بیٹھے ہیں یا بے خیالی میں ڈاکہ مارا ہے اور پولیس ان کا پیچھا کر رہی ہے چنانچہ ہم نے کہا، ’’آپ کا اپنا گھر ہے، جہاں جی چاہے چھپ جایئے، مگر پولیس آخر پولیس ہے، آج نہیں تو سال دو سال یا پانچ دس سال کے بعد تو آپ کو گرفتار کر ہی لے گی۔‘‘

بولے، ’’پولیس؟ کیا آپ نے مجھے قاتل یا ڈاکو سمجھ رکھا ہے کہ پولیس میرے تعاقب میں ہو؟‘‘

ہم نے کہا، ’’پولیس نہیں، تو پھر آپ کی بیوی آپ کے تعاقب میں ہوگی؟‘‘

وہ پہلی بار مسکرائے تو کچھ ڈھارس بندھی کہ معاملہ اتنا سنگین نہیں ہے۔ ہم نے عرض کیا، ’’تو پھر اس حواس باختگی اور بے تحاشگی کا کیا مطلب ہے؟‘‘

انہوں نے ہمارے بالکل قریب آ کر سرگوشی کی:

’’ابھی ابھی میں گھر واپس جا رہا تھا، تو محلے کے ایک معتبر آدمی نے مجھے بتایا کہ چند ایسے لوگ دوپہر سے مجھے تلاش کر رہے ہیں جن کے تیوروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مجھے وزیر بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں؛ چنانچہ میں الٹے پاؤں بھاگا اور آپ کے ہاں آ کر دَم لیا۔ آپ جانتے ہیں میں نے زندگی کتنی سادگی اور راستی سے گزاری ہے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میرا واجبی سا کاروبار ہے۔ آپ ہی بتایئے، آخر میں نے کیا قصور کیا ہے جس کی پاداش میں مجھے وزیر

بنانے کے مشورے ہو رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ میرے کسی دشمن کی سازش ہے، مگر میں تو اتنا غیر اہم آدمی ہوں کہ میرا تو کوئی دشمن بھی نہیں ہے۔ سیاست سے میرا تعلق صرف اتنا سا ہے کہ جب محلے کے حلوائیوں نے ہفتے میں چینی کے دو دن کے ناغے کے خلاف ایک قرارداد منظور کی تھی تو میں نے ہر روز چونی کی جلیبیاں کھانے والے ایک گاہک کی حیثیت میں اس قرارداد پر دستخط کر دیے تھے۔ اس کے سوا کوئی شخص میری کسی سیاسی سرگرمی کی نشان دہی کر دے تو میں اسے ایک سیر جلیبیاں کھلانے کو تیار ہوں۔ بیشک اخبار میں اعلان کر دیجیے۔”

ہم نے ان کے سر کی طرف دیکھا کہ ممکن ہے ان کے دماغ کی خرابی کا کوئی سراغ مل جائے، مگر مشکل یہ ہے کہ سر تو داناؤں اور احمقوں کے ایک سے ہوتے ہیں۔ ہم نے کہا، “وزیر بننا تو بہت بڑا اعزاز ہے بھائی صاحب۔ اور آپ وزیر بننے سے یوں ڈر رہے ہیں جیسے آپ کے دُم لگائی جا رہی ہے۔”

بولے، “دراصل مجھے وزیر بننا آتا ہی نہیں۔ میں تو یہی سوچتا ہوں تو کانپ اُٹھتا ہوں کہ اگر میں وزیر بن گیا اور مجھے کسی تقریب کی رسمِ افتتاح ادا کرنی پڑی تو قینچی سے فیتہ کاٹنے کی بجائے کہیں میں اپنی انگلی نہ کاٹ بیٹھوں۔”

ہم نے کہا، “قینچی استعمال کرنے سے آپ اتنے خوفزدہ ہیں، تو چلیے قینچی نہ سہی، فیتہ دانتوں سے کاٹ لیجیے گا۔”

کہنے لگے، “تجویز تو معقول ہے، مگر یہ جو پریس فوٹوگرافر ہیں، یہ بڑے بے رحم ہوتے ہیں۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ جن صاحب کی تصویر اُتارنے لگے ہیں، وہ کس حالت میں بیٹھا ہے۔ وہ زمانے اچھے تھے جب پورے جلسے میں صرف ایک آدھ فوٹوگرافر ہوتا تھا۔ وہ جب بھی کیمرے کا نشانہ باندھتا تھا، صاحب اپنا پوز درست کر لیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بار ایک وزیر کی اتنی خوب صورت تصویر آئی تھی کہ میں سمجھا ہندوستان کی مس نرگس کرسی پر بیٹھی ہیں۔ اب تو پریس فوٹوگرافر چیونٹیوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرف کیمرے ہی کیمرے نظر آتے ہیں۔ اب انسان کیا کیا پوز بدلے، چنانچہ پچھلے دنوں ایک وزیر کی تصویر چھپی کہ ناک میں انگلی ڈالے بیٹھے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ وزیر صاحب کی نہیں، پریس فوٹوگرافر صاحب کی بدتمیزی

ہے۔ بعینہٖ اگر پریس فوٹوگرافر نے میری تصویر اس وقت اُتار لی جب میں نے فیتہ دانتوں سے کاٹنا شروع کیا تو کتنی بھدی ہوگی۔ سب کہیں گے کہ وزیر صاحب فیتہ کاٹنے کی بجائے کھا رہے ہیں۔“

ہم نے کہا، ”بہر حال یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔“

وہ بولے، ”کیسے نہیں ہے؟ ارے صاحب میں ایک وزیر کو جانتا ہوں جنہوں نے پلیٹ میں سے قینچی اُٹھا کر فیتے کی جگہ اپنی انگلی کاٹ لی تھی اور گھبرا کر قینچی کو پلیٹ میں یوں رکھا تھا کہ پلیٹ کے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ فیتہ کٹا ہی نہیں تھا اس لیے آگے بڑھے تھے تو فیتہ ان کے قدموں سے لپٹ گیا تھا اور وہ گر پڑے تھے۔“

ہم نے مشورہ دیا، ”چلیے آپ فیتہ کاٹیے گا ہی نہیں۔ اپنے پی اے سے کہہ دیجیے گا کہ وہ سائلوں کو یہ کہہ کر واپس بھجوا دیا کریں کہ وزیر صاحب رسمِ افتتاح ادا کرنے کے سخت خلاف ہیں۔

ہمارے ایک شاعر دوست کے پاس ضلع جھنگ کے ایک بڑے زمیندار آئے کہ ان کے بیٹے کی شادی ہے اور سہرے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا، ”مہربانی فرما کر ایک اچھا سا ’چوندا چوندا‘ سہرا لکھ دیجیے۔“

شاعر نے کہا، ”میں سہرا لکھنے کے پانچ سو روپے لوں گا۔“

زمیندار صاحب بولے، ”ارے آپ شاعری کے لیے عطیہ خداوندی کو بیچتے ہیں۔“ شاعر نے کہا، ”دراصل میں سہرے لکھنے کا سخت مخالف ہوں۔ اس لیے کوئی بہت ضد کرے، تو اس سے پانچ سو روپے وصول کرتا ہوں کہ اپنی مرضی کے خلاف کام کرنے پر مجبور ہوا ہوں؛ البتہ مرثیے مفت لکھتا ہوں۔ اگر سُوءِ اتفاق سے آپ کا انتقال ہو جائے تو مجھے فوراً مطلع کیجیے گا۔ بہت مزیدار مرثیہ لکھ بھیجوں گا۔“

بہت بے دلی سے ہنسے، پھر بولے، ”اچھا یہ بتایئے کہ وزیروں کو جو بنگلہ ملتا ہے، اس کا میں کیا کروں گا؟ میں تو اتنے بہت سے خالی ڈھنڈار کمروں میں گھومتے گھومتے پاگل ہو جاؤں گا۔ میں تو گلبرگ میں لوگوں کے بڑے بڑے بنگلے دیکھتا ہوں، تو ان پر بڑا ترس آتا ہے کہ بے چارے ایک لحاظ سے دیواروں اور چھتوں والے صحراؤں میں رہتے ہیں۔ بیوی سے بھی ملاقات کرنا ہو تو

آٹھ کمرے طے کرنے کے بعد اس تک پہنچتے ہیں۔ میری تو آدھی عمر اس بنگلے میں ٹہلتے ہی گزر جائے گی۔''

ہم نے کہا، ''دیکھیے! ہر تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں اور آپ تو ایک ہی رُخ دیکھے جا رہے ہیں۔ دوسرا رُخ یہ ہے کہ آپ وزیر بنیں گے، تو آپ کے پاس بے شمار اختیارات ہوں گے اور انہیں اپنے ہموطنوں کے بھلے کے لیے استعمال کریں گے۔ مثلاً آپ نے میرے غریب خانے تک آتے ہوئے جو گلی طے کی ہے، وہ گلی کیا ہے، چھوٹے بڑے گڑھوں کا ایک انبار ہے۔ آپ وزیر بنیں گے، تو ہماری اس گلی کو پختہ کرا دیجیے گا اور سارے محلے کی دعائیں لیجیے گا۔''

یکا یک تنک کر بولے، ''میں تو کھری بات کروں گا۔ اوّل خویش بعد درویش، گلی کے ذکر سے مجھے اپنے گھر کی گلی یاد آ گئی ہے؛ چنانچہ معاف کیجیے گا، پہلے تو میری گلی پختہ ہوگی۔ بعد میں بجٹ میں گنجائش نظر آئی تو آپ کی گلی کا بھی کچھ بندوبست ہو جائے گا۔''

ہم نے کہا، ''اب بسم اللہ کیجیے اور وزیر بن جائیے۔ وزیر بننے کی کچھ نشانیاں آپ کے ہاں ظاہر ہونے لگی ہیں۔''

ابھی وہ جھینپ کر مسکرا رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم نے پوچھا، ''کون؟''

جواب میں ہمارے ان کرم فرما کا بیٹا بولا، ''ابا جی آپ کے ہاں تو نہیں آئے؟'' ہم نے دروازہ کھول دیا، تو وہ اندر آیا اور کہنے لگا، ''ابا جی! آپ نے تو حد کر دی ہے۔ سارا گھر پریشان ہے۔ میں آپ کے تمام دوستوں اور رشتہ داروں کے ہاں سے ہو کر آ رہا ہوں۔ جلدی گھر چلیے۔''

انہوں نے پوچھا، ''مگر آخر اتنی جلدی کیا ہے؟ کوئی ہمیں ملنے تو نہیں آیا تھا؟''

وہ بولا، ''جنہیں آپ سے ملنا ہے وہ دوپہر سے وہیں بیٹھے ہیں۔ انہوں نے کھانا بھی وہیں کھایا ہے۔ شام کی چائے بھی وہیں پی ہے۔ اب رات کا کھانا بھی کھا چکے ہوں گے۔ آپ کا سخت انتظار کر رہے ہیں۔''

انہوں نے استفسار کیا، ''مگر وہ لوگ کون ہیں اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟'' پھر مسکرا کر ہماری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہیں کہ میں کوئی جھوٹ بول رہا تھا؟

اتنے میں ان کا بیٹا بولا، ''وہ کہتے ہیں کہ ان کے بیٹے نے اب کے میٹرک کا امتحان دیا ہے

احمد ندیم قاسمی ...... وزارت کا خوف

اور آپ کی مدد سے اس کے پرچوں کے نمبر بڑھوانے گاؤں سے آئے ہیں۔"

ہمارے کرم فرما بھڑک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ "مگر میں کیا جانوں، ان کے بیٹے کے پرچے کس کے پاس ہیں؟"

"وہ کہتے ہیں کہ آپ کے ایک دور کے رشتہ دار کے ایک دوست کے چچا کے پاس ایک پرچہ ہے۔"

اپنے بیٹے کا جواب سن کر کرم فرما موصوف ہمارے کمرے سے نکلتے ہوئے کڑکے: "میرے ڈور کے رشتہ دار کے دوست کے چچا کی ایسی تیسی!"

✱ ✱

پوتی اپنے دادا کی نگرانی میں!

اشفاق احمد

میری بیوی میرے گھر سنبھالنے کی صلاحیت سے پوری طرح واقف ہے اس لیے اُس نے میرے کندھوں پر کبھی ایسا بوجھ ڈالا ہی نہیں جس سے مجھے بعد میں خواہ مخواہ شرمندہ ہونا پڑے۔ وہ ہر غمی اور خوشی کے موقع پر اپنے گھر اور اپنی روٹین کے قریب ہی رہتی ہے ماسوائے اُس لمحے کے جب ہم دونوں کو ایک ساتھ باہر جانا پڑے۔

پرسوں ایک ایسی افتادہ اپڑی کہ اُسے اور میری بہو کو ایک ساتھ گھر سے باہر جانا پڑا اور جاتے ہوئے وہ میری پوتی ارشیا کو میری تحویل میں دے گئیں کہ یہ مغرب کے بعد چونک کے اُٹھے گی اس وقت فیڈر فوراً اس کے منہ میں دے دیا جائے اور اُسے 'چھوٹا ہاتھی بڑا ہاتھی سیر کو گیا' والا گانا سنایا جائے۔ یہ گانا میری بیوی نے خود بنایا ہے۔ اور اس کے بول ہر ادائیگی کے وقت بدل جاتے ہیں ماسوائے اس کے مکھڑے کے کہ وہ ہمیشہ ایک سا ہی رہتا ہے۔

ماتم والے گھر پہنچ کر میری بہو نے فون کیا کہ ابو ہم اس نمبر پر ہیں اگر آپ کو کوئی تکلیف ہو تو ہمیں اس نمبر پر فون کر لیں اور اس نمبر کو احتیاط سے کسی کاپی پر لکھ لیں۔ میں نے اپنی بہو کا شکریہ ادا کیا اور فون نمبر اخبار کے ایک کونے پر لکھ لیا۔ مغرب کے فوراً بعد ارشیا بی بی نے زور کی ایک چیخ ماری اور میں نے فیڈر ان کے منہ میں داخل کر کے 'چھوٹا ہاتھی بڑا ہاتھی' والا گانا شروع کر دیا۔ کچھ تو میرے گانے کی دھن دوسرے ارشیا بیٹی کی دودھ پیتے وقت دودھ پلانے والے کے منہ پر ہاتھ پھیرنے کی عادت۔ اس نے تو دو تین گھونٹ پی کر آزادیٔ الخیار کا اعلان کر دیا۔ میں نے چھوٹا ہاتھی بڑا ہاتھی کی رہا تو میں نے ماتم والے گھر فون کر کے اپنی بیوی کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اُس نے غالباً مسکرا کر کہا آپ ارشیا کو ریڈیو سنائیں اس سے وہ فوراً چپ ہو جاتی ہے خواہ پروگرام کیسا بھی کیوں نہ ہو۔ میں نے بلبلاتی ہوئی بلبل کو گود میں اُٹھا کر دوسرے کمرے میں جا کے ریڈیو

آن کیا تو بتی جلی کھس کھس کی سرگوشی بھی شروع ہوئی، لیکن ریڈیو سے کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔ سارے بینڈ بدل کر اور والیوم فل کرنے کے بعد بھی جب ریڈیو سے کوئی حرفِ تسلی برآمد نہ ہوا تو میں نے دوبارہ اپنی بیوی کو فون کیا کہ ریڈیو چل نہیں رہا، اب کیا کیا جائے۔ اُس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا، ”مجھے بڑا افسوس ہے میں اُس وقت بتانا بھول گئی کہ ریڈیو آن کرنے کے بعد جس میز پر ریڈیو پڑا ہے، اُس کی دراز کو پورا کھول کر تین مرتبہ زور سے پھٹاک سے بند کیا جائے تو پھر ریڈیو چلتا ہے۔ میں فون بند کر کے اِس آپشن کی طرف منتقل ہونے والا ہی تھا اور میں نے ابھی میز کی دراز کھولی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میری بیوی بڑی لجاجت سے کہہ رہی تھیں کہ آپ نے جلد ہی فون بند کر دیا۔ اور میں اس وقت بتانا بھول گئی کہ میز کی تیسری دراز کھول کر تین دفعہ پھٹاک سے بند کرنا ہے۔ کوئی اور دراز کھول کر پھٹاک سے بند کریں گے تو ریڈیو چالو نہیں ہوگا۔

میں نے تیسرے دراز کو تین مرتبہ کھول کر جب پھٹاک سے بند کیا تو ریڈیو فوراً ریلوں اور ہوائی جہازوں کے بھاؤ بتلانے لگا۔ میرا خیال تھا اس ٹائم ٹیبل کو سنتے ہی ارشیا فوراً خاموش ہو جائے گی لیکن اُس نے تو آسمان سر پر اٹھا لیا اور پہلے کے مقابلے میں اور تیز ہو گئی۔ اب ایک کے بجائے دو آوازوں نے گھیر لیا ایک سامنے سے ایک پہلو سے۔ میں نے پھر ماتم والے گھر میں فون کیا اور اپنی بیوی کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس نے پہلے ذرا سا تعجب کر کے پھر فوراً کہا ادھو ہو ہو۔ آپ اس کو لاہور ایک سنا رہے ہوں گے یہ لاہور دو کی عادی ہے۔ لاہور ایک سن کر تو یہ نہ بھی رو رہی ہو تو بھی رونا شروع کر دیتی ہے۔

میں نے کہا آپ خدا کے لیے فوراً گھر آ جائیں ورنہ اس ایک دو کے چکر میں ہم دونوں جہان سے چلے جائیں گے۔ ہم پر مہربانی فرمائیں اور اس مشکل وقت میں ہماری مدد کریں۔

* *

میں اپنا ووٹ کس کو دوں؟

اظہر حسن صدیقی

بات ہو رہی تھی موسموں کی اور محفل تھی بے تکلف دوستوں کی۔ شاعر صاحب بولے، ”بھئی موسموں میں موسم تو ہے صرف برسات کا اور باقی سب بکواس ہے۔“ اور وقت اور موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انہوں نے فوراً اپنی تجویز کی تائید میں دلیل دیتے ہوئے اشعار سنانے شروع کر دیے جن میں قدرتاً زیادہ تعداد اُن کے اپنے اشعار کی تھی، جن کو سنانے کے لیے نہ جانے کب سے وہ موقعہ کی تلاش میں ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ دوسرے دوست جو بڑی دیر سے اپنی باری کے منتظر تھے جوں ہی انہوں نے شاعر صاحب کو سانس لینے کے لیے رکتے دیکھا فوراً گویا ہوئے۔ ”برسات کا موسم بھی کیا خاک موسم ہے کوئی چیز ہضم نہیں ہوتی نہ کھانے کا مزا نہ پینے کا۔“ یہ صاحب کھانے پینے کے بہت شوقین تھے اور کوئی موقعہ بھی مرغن غذاؤں کے کھانے کا ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ ان کے خیال میں سب سے بہتر موسم جاڑے کا تھا جب حلوے پراٹھے نہاری سری پائے وغیرہ کی دعوتوں میں افراط ہوتی ہے۔ اب کروڑ پتی دوست سے صبر نہ ہو سکا وہ یوں گویا ہوئے ”تم لوگ بھی کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ بھلا برسات اور جاڑا بھی کوئی موسم ہوا۔ نہ آدمی پہاڑ پر جا سکے نہ یورپ اور امریکا کی سیر کر سکے۔ موسموں میں اصلی موسم تو گرمیوں کا ہے۔“ واضح رہے کہ موصوف ہر سال گرمیاں سوئیزرلینڈ، امریکا یا دوسرے بیرونی ممالک میں گزارنے کے عادی ہیں۔ کبھی بہت مجبوری ہوئی تو ازراہِ کرم مری، سوات، زیارت یا کاغان وغیرہ پر بھی عنایت فرما دیتے ہیں۔ اب باری تھی تاجر پیشہ کی۔ وہ اب تک بڑے ضبط اور صبر سے سب کی باتیں سن رہے تھے جب مزید صبر نہ ہو سکا تو بولے، ”تم سب لوگ بیکار باتیں کر کے اپنا اور میرا وقت بلاوجہ ضائع کر رہے ہو۔ اچھا موسم تو صرف وہی ہوتا ہے جس میں چار پیسے کا منافع ہو اور وہ

ہے آج کل کا یعنی انتخابات کا موسم۔" یہ بات ہمارے بھی دل کو لگی کیوں کہ ہم خود اپنے ماحول اور اپنے حالات میں پچھلے چند مہینوں سے بڑی خوشگوار تبدیلیاں محسوس کر رہے ہیں۔ دعوت ناموں کی تعداد ایک دم سے بڑھ گئی ہے۔ دوستوں اور رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے تعلقات بہت ہی زیادہ خوشگوار ہو گئے ہیں۔ ہمیں یا ہمارے اہل خانہ کو ذرا سی چھینک بھی آتی ہے تو لوگ فوراً دوڑ بھاگ کرنے لگتے ہیں۔ ایسے ایسے لوگ اب ہمیں سلام کرنے میں پہل کرنے لگے ہیں جن کو کبھی ہمارے سلام کا جواب دینا بھی گوارا نہیں تھا۔ ہم اگر کبھی اتفاقاً چہرہ پر بیٹھی ہوئی مکھی کو اُڑانے کے لیے بھی ہاتھ اُٹھاتے ہیں تو ایک دم سے آٹھ دس ہاتھ سلام کے لیے اُٹھتے ہیں۔ تمام ملنے جلنے والے یکا یک ہی خوش مزاج اور با اخلاق ہو گئے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کے چہروں پر ہر وقت مسکراہٹ سجی رہنے لگی ہے۔ پڑوسی اور اہل محلہ ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں بڑی فراخدلی سے شرکت کرنے لگے ہیں ہمارے گھر والوں اور حد یہ ہے کہ نوکروں تک کے نام اور عمر سے آس پاس پڑوس والے بلکہ دُور دُور تک کے لوگ واقف ہو گئے ہیں۔ اس دفعہ عید پر ملنے والوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی اور اُمید ہے کہ اگر انتخابات کا موسم جاری رہا تو آئندہ تہواروں پر تحفے تحائف بھی زیادہ ہی آئیں گے۔ اگر ہماری ہر دلعزیزی کا یہی عالم رہا تو ہم تو یہی دعا کریں گے کہ یہ موسم سدا رہے۔

ہمیں اپنی اہمیت کا اندازہ ایک دم سے اس وقت ہوا جب زکوٰۃ کمیٹیوں کے لیے انتخابات کا اعلان ہوا۔ ہم نے دیکھا کہ فضا کچھ بدلی بدلی سی ہے۔ دوست احباب لوگ باگ کچھ زیادہ ہی خوش اخلاق ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے تو ہمیں اپنی بینائی اور سماعت پر شبہ ہوا کہ شاید بڑھتی ہوئی عمر کے آثار ہیں مگر جلد معلوم ہوا کہ انتخابات کا موسم آ گیا اور ووٹ ہے اس پردہ نگاری میں۔ ابھی ہم اپنی اس اہمیت کے صدمے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ تابڑ توڑ ہم پر اور خوشیاں نازل ہونے لگیں۔ جلد ہی معلوم ہوا کہ ہمارا ایک ووٹ آرٹس کونسل اور ایک ووٹ کلیہ کے انتخابات میں بھی ہے جو عنقریب ہونے والے ہیں۔ ابھی ہم انہی دو تین ووٹوں کو سنبھال کر رکھنے کی فکر میں تھے کہ بلدیاتی انتخابات کا اعلان ہو گیا۔ ساتھ ہی یہ اطلاع بھی ملی کہ صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے انتخابات بھی جلد ہی ہونے والے ہیں اور اس جانِ ناتواں کو وہاں بھی ووٹ دینا ہے۔ پتا نہیں یہ ووٹ بھگتاتے کہیں دو چار ووٹ اور ہمیں نہ مل جائیں سچ ہے خدا جب دیتا ہے تو

چھپر پھاڑ کر ہی دیتا ہے اور بقول کسی ہندی فلموں کے مکالمہ نویس کے ”بھگوان تیری لیلا نیاری ہے۔“ (براہِ کرم کیلا نہ پڑھ لیجیے گا)۔ کہاں تو ایک عرصہ تک ہم ایک ووٹ کے بھی حق دار نہیں تھے اور کہاں ایک دم سے ہم کو ایک دو نہیں اکٹھے پانچ عدد ثابت و سالم ووٹ بلا شرکت غیرے مل گئے اور وہ بھی اتنے کم عرصہ ہیں۔

ایک دعوت میں جہاں تقریباً سو سوا سو مہمان مدعو تھے بات چیت موسم سے شروع ہو کر حسبِ دستور اور آج کل کی سیاست کے اعتبار سے حسبِ توقع ایٹم بم سے ہوتی ہوئی ”پہنچی تیری جوانی تک۔“

* * *

شگفتہ شگفتہ

اقبال تبسّم

مشورہ

حافظ محمد عدنان ایڈووکیٹ میرے بہت اچھے نوجوان دوست ہیں۔ وہ اپنے ایک ایڈووکیٹ دوست کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے ہوئے کچہری سے باہر نکلے۔ سخت سردی جسم میں چھبن چھبا، یا پھر چھپن چھپا کھیل رہی تھی۔ دونوں اپنے 'کالے کوٹوں' میں اپنے اپنے جسم کو لپیٹ کر سردی سے بچنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے لیکن ناکام تھے، کیوں کہ سیاچن گلیشیئر سے اُبھرنے والی برفانی ہوائیں دم نکالے دے رہی تھیں۔ اچانک اُن کے دوست اُن سے کہنے لگے، ”یار عدنان! میں اپنا کوٹ اُتار کر اُپرّ (اوپر) نہ اوڑھ لوں؟“ اُن کے اِس معصوم مشورہ طلب کرنے پر میری سردی تو کافور ہوگئی۔ جی ہاں، قہقہوں کی گرمی سے!

پہلے کون

میں راولپنڈی سے لاہور جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن پہنچا تو ایک ٹرین پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی۔ اُس کے پیچھے ایک صاحب تیزی سے بھاگ رہے تھے۔ میں انھیں دیکھ کر دل ہی دل میں اُن پر ہنستے ہوئے سوچ رہا تھا کہ بیوقوف ایسے بھاگ رہا ہے، جیسے ٹرین سے پہلے لاہور پہنچ جائے گا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جب مجھے پتا چلا کہ میری مطلوبہ ٹرین بھی یہی ہے تو پھر مت پوچھیے۔ میں اُن سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ٹرین کے پیچھے بھاگ رہا تھا...!

بُردباری

ہمارے ایک ماموں ہیں۔ اُن کا تکیہ کلام ہے 'شاباش'۔ کوئی بھی بات ہو، وہ اپنا تکیہ کلام شاباش ضرور چھوڑتے ہیں۔ میں نے اُن سے ایک سخت شکایت کی اور بتایا کہ اُن کی وجہ سے میرا

بہت نقصان ہو گیا ہے۔ اب اُس نقصان کو پورا کرنے کے لیے پورے چھ ماہ لگیں گے۔ نہایت تحمل اور بُردباری سے کچھ دیر سوچتے رہے، پھر اُسی تحمل اور بُردباری سے کہنے لگے... ''شاباش''!

لیڈی اور کباب

میری ایک کزن طویل عرصہ کے بعد لندن سے پاکستان آئی تو اُس کے ساتھ اُس کا چھ سال کا بیٹا بھی تھا۔ حیران حیران سا گلیاں اور بازار دیکھتا پھرتا تھا۔ ایک روز اُس کا بیٹا دوڑتا ہوا اُس کے پاس آیا اور کہنے لگا، ''مما مجھے پیسے دیں، میں کباب کھاؤں گا''۔ ''بیٹا! یہاں پر کباب نہیں ملتے۔'' ماں نے جواب دیا۔ اس پر ننھے میاں کہنے لگے، ''مما! یہاں پر ایک لیڈی دیوار کے ساتھ کباب لگا رہی ہے۔ بس مجھے نہیں پتا آپ مجھے پیسے دیں۔'' آخر ننھے میاں کی ضد پر ''کباب لگانے والی لیڈی'' کو تلاش کیا گیا۔ پھر جو قہقہوں کے فوارے چھوٹے، وہ بھلائے نہیں بھولتے۔ دراصل ننھے میاں گلی میں ایک عورت کو دیوار پر 'اُپلے' تھاپتے ہوئے دیکھ کر آئے تھے۔

بریانی

اسٹاپ قریب آ رہا تھا۔ کنڈیکٹر نے آواز لگائی، ''چلو بھئی آئی نائن مرکز والے۔'' ویگن میں بیٹھی اگلی سواریاں اتر چکی تھیں، لیکن ایک مسافر سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ بے چارہ بڑی مشکل سے آگے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اِدھر کنڈیکٹر اُسے بار بار آواز لگا رہا تھا، ''مُکا مُکا۔'' (''ختم کرو، ختم کرو یعنی جلدی کرو'') مسافر اُس کی مُکا مُکا سن کر غصّے میں آ گیا اور چیخ کر کہنے لگا، ''اوئے میں 'بریانی' کھا رہا ہوں، جو مکاؤں؟''

معصوم خیال

ہم لاہور چھاؤنی سے گھر بدل کر پرانی انارکلی میں آ گئے تھے۔ ظاہر ہے زمین گول ہے، سورج رُخ بدلتا ہے، سمت بدلتی ہے۔ جن دنوں ہم نے گھر تبدیل کیا تھا، اُنھی دنوں ایوب خان نے سکندر مرزا کو لندن بدر کر کے ملک میں مارشل لا لگا دیا تھا اور سبھی وزراء تبدیل ہو گئے تھے۔ اب جو ہم پرانی انارکلی میں آئے تو یہاں کی مسجد کا رُخ لاہور چھاؤنی کی مسجد سے تقریباً بدلا ہوا تھا۔ چوں کہ اُن دنوں میں بہت چھوٹا تھا، اس لیے یہی سمجھ بیٹھا کہ جس طرح حکومتیں بدل دی جاتی ہیں،

اسی طرح کعبے کا رُخ بھی بدل دیا جاتا ہوگا!

ناکام کوشش

ایک روزنامہ کے بیورو آفس کا افتتاح تھا۔ جلسے کی کمپیئرنگ میرے ذمہ تھی۔ اُس وقت کے وفاقی وزیرِ تجارت ’سلیم سیف اللہ‘ مہمانِ خصوصی تھے، جب کہ قومی اسمبلی کی رکن ’بیگم بلقیس نصر من اللہ‘ تقریب کی صدارت کر رہی تھیں۔

اخبار کے اسلام آباد کے بیورو چیف مشتاق اعوان بھی اسٹیج پر تشریف فرما تھے۔ جلسہ شروع ہونے سے پہلے انھوں نے مجھے منع کیا تھا کہ انھیں اسٹیج پر نہ بلایا جائے، کیوں کہ مجمع کے سامنے وہ دو لفظ بھی بول نہیں سکتے۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ وہ بیورو چیف ہیں، اُن کا اسٹیج پر آنا نہایت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے انھیں بتایا کہ آپ نے مائیک پر آ کر صرف اتنا کہنا ہے کہ ”آپ تشریف لائے شکریہ“ اور یہ کہہ کر واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ جانا ہے۔ اس سے آپ کی عزت بھی رہ جائے گی اور تصویر بھی بن جائے گی۔ اس پر انھوں نے خاموشی اختیار کر لی، جو نیم رضا مندی تھی۔ اب جو میں نے اسٹیج پر آنے کے لیے اُن کا نام پکارا تو اُن کی حالت متغیر ہوگئی۔ ہوائیاں اُڑنے لگیں، چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔ باقاعدہ زور زور سے کانپنے لگے۔ بڑی مشکل سے اپنی سیٹ سے اُٹھے اور مائیک پر آ گئے۔ چوں کہ وہ بری طرح سے کانپ رہے تھے، لہٰذا مائیک پر آتے ہی سب سے پہلے تو اُن کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذوں کی کھڑکھڑاہٹ سے جلسہ گاہ کی رونق دوبالا ہوگئی۔ رہی سہی کسر اُس وقت نکل گئی، جب انہوں نے ہانپتے کانپتے ہوئے، یاد کروائے گئے الفاظ کچھ، یوں ادا کیے:

”میں شکر گزار ہوں کہ ’سلیم سیف اُتی‘ اور ’بیگم نصر من اُتی‘ تشریف لا...“

اس کے ساتھ ہی جلسہ گاہ زعفران زار بن گئی۔ اُس کے بعد اِس کا یہ نتیجہ بھی برآمد ہوا کہ تقریباً چھ ماہ تک بیورو چیف کی مجھ سے بول چال بند رہی کہ میں نے انہیں مائیک پر بلا کر جلسہ ناکام کروانے کی کوشش کی تھی!“

* *

لاؤڈ اسپیکروں کا عذاب

اقبال ساغر صدیقی

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ لاؤڈ اسپیکر کی ایجاد میں ہماری پیدائش کا بھی کچھ دخل ہے۔ مگر کہتے ہیں کہ ہمارے گاؤں کی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے جب اذان کی آواز گونج رہی تھی۔ ٹھیک اُسی وقت ہم پیدا ہوئے۔ بہر حال، اِس سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہمیں زندگی بھر لاؤڈ اسپیکر سے مفر نہیں مل سکتا۔

والدہ صاحبہ بتاتی تھیں کہ پیدائش کے بعد جب ہمارے کان میں اذان دینے کا مرحلہ پیش آیا تو ہماری بڑی بہن نے یہ منطقی نکتہ اُٹھایا کہ جب اذان کی آواز کو سارے گاؤں نے سنا تو ہم نے بھی سن لیا ہوگا۔ لہٰذا دوبارہ اذان دینے کی ضرورت نہیں لیکن ہماری بہن کے اس نکتہ کو مسترد کر دیا گیا اور مسجد کے مولوی صاحب کو کان میں اذان دینے کے لیے طلب کر لیا گیا اور غالباً ہماری زندگی کی وہ واحد اذان تھی جو ہم نے بغیر لاؤڈ اسپیکر کے سنی!

گاؤں سے جب ہم شہر آئے اور اسکول آنے جانے لگے تو ایک بار اسی لاؤڈ اسپیکر کی بدولت ہماری زبردست پٹائی ہوگئی۔ کیوں کہ ہم جس شہر میں رہتے تھے۔ ”وہاں لاؤڈ اسپیکر“ کو آلۂ مکبر الصوت کہا جاتا تھا۔ اور ہمیں آلۂ مکبر الصوت کا املا نہیں آتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود جب ہم لوگوں کو لاؤڈ اسپیکر میں تقریر کرتے دیکھتے تو ہمارا بھی دل چاہتا کہ کبھی ”ہم اور بلبلِ ناشاد گفتگو کرتے“ چنانچہ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ایک بار ہمارے محلے میں کوئی جلسہ ہوا ہم نے بھی دوسرے بچوں کی طرح جلسے کے منتظمین سے نظم سنانے کی اجازت لے لی اور جب ہماری باری آئی تو ہم فوراً میکروفون میں منہ ڈال کر شروع ہو گئے کہ:

میرا بلبل سو رہا ہے شور و غل نہ مچا

اس پر ہمیں کان سے پکڑ کر نکال دیا گیا۔ غرض کہ پیدائش کے وقت لاؤڈ اسپیکر کے ساتھ جو

عداوت بندھی، وہ اب تک بدستور چلی آ رہی ہے اور آج بھی ہم اس کے شور وغل سے پریشان ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ہمارے محلے سے ایک محلہ اُدھر کہیں محفلِ سماع برپا ہوئی اور دو قوالوں نے لاؤڈ اسپیکر پر ساری رات اس طرح اپنے فن کا جادو جگایا کہ ”جاگیں تمام رات جگائیں تمام رات“ کی تفسیر سمجھ میں آ گئی۔

ہمارے ایک دوست کا بیان ہے کہ ان کے محلے کے مولوی صاحب لاؤڈ اسپیکر سے پیغام رسانی کا کام بھی لیتے ہیں۔ مثلاً ایک بار وہ اپنی عینک گھر بھول آئے تو اذان سے قبل اپنی اہلیہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ”اے منے کی اماں میں بستر پر عینک بھول آیا ہوں ذرا کسی بچے کے ہاتھ بھجوا دینا۔“ ہم نے یہ سنا تو دل میں سوچا کہ اے کاش منے کی اماں کو بھی جوابی کارروائی کی سہولت ہوتی تو کم از کم محلے والے یہ ضرور کہتے:

”تری آواز مکے اور مدینے“

سنا ہے شہر کے معروف ترین علاقے میں ایک ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کے مقابل والی مسجد سے ہر رات نعت خوانی ہونے لگی۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کون استادِ فن ہیں، وہاں چلے گئے تو دیکھا دروازے پر تالا ہے۔ پہلے ڈاکٹر صاحب ڈرے کہ کہیں مسجد میں کوئی جنات نہ ہوں لیکن جب کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو پتا چلا کہ لاؤڈ اسپیکر کے ساتھ ٹیپ ریکارڈر فٹ ہے اور لانگ پلے کیسٹ چل رہا ہے۔

اب تو خیر لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر پابندی ہے۔ مگر جب سیاست کا دور دورہ تھا۔ تو ہر سیاسی پارٹی اپنے مخالف کے جلسے کو ناکام بنانے کے لیے سب سے پہلے لاؤڈ اسپیکر کے تار کاٹ دیا کرتی تھی۔ اسکول کالجوں کے انتخابی جلسوں میں بھی ہم نے بارہا دیکھا کہ کوئی لڑکا اُٹھا اور اُس نے لاؤڈ اسپیکر پر قبضہ کر لیا بس پھر کیا تھا۔ چشم زدن میں اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہَوا کا۔

چوک بازار میں جگہ جگہ لاؤڈ اسپیکر لگوانے کا سہرا ہمارے ایک دوست کے سر ہے۔ جہاں ہر روز صبح کاروبار کے آغاز سے پہلے تلاوت کلام مجید ہوتی اور پھر دن بھر گمشدگی کے اعلانات۔ ایک دن ہم نے اپنے دوست سے کہا اگر آپ اجازت دیں تو ہم لاؤڈ اسپیکر پر دیانتداری اور جائز منافع خوری کی گمشدگی کا اعلان کر دیں، مگر انھوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔

اسی چوک بازار میں ایک صاحب ریڑھے پر گنے کا رَس فروخت کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی آواز میں ’پی لو گنے کا رَس‘ کا نعرہ ٹیپ کر رکھا ہے جسے وہ لاؤڈ اسپیکر کی مدد سے دن بھر بجایا کرتے ہیں۔ تجارتی اغراض کے لیے لاؤڈ اسپیکر کا یہ استعمال ہمیں پسند آیا، بلکہ فقیروں کو بھی ہمارا مشورہ ہے کہ وہ اس نسخے پر عمل کر کے اپنا کاروبار چمکائیں۔ ویسے چندہ مانگنے والوں نے تو اِس کا استعمال شروع کر دیا ہے، بلکہ ریلوے اسٹیشن پر ریلوں کی آمد و رفت کا اعلان کرنے والے لاؤڈ اسپیکر کی آواز چندہ مانگنے والوں کی آواز میں یوں گم ہو کر رہ جاتی ہے کہ بے چارے مسافروں کو اُس وقت ہوش آتا ہے جب بقول جوش:

گاڑی گزر چکی تھی پٹڑی چمک رہی تھی

ایک بار ہم نے اپنے ایک دوست کے سامنے میر تقی میر کا یہ شعر پڑھا کہ:

جو اِس زور سے میر روتا رہے گا   تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

تو ہمارے دوست نے کہا میاں صاف صاف کہو کہ میر صاحب کے حلق میں بھی لاؤڈ اسپیکر پھنسا ہوا تھا۔

کچھ عرصہ ہوا ہمارے پڑوس کا ایک کم سن بچہ مرغی کے پیچھے بھاگتے ہوئے گٹر میں گر کر ہلاک ہو گیا۔ سارے محلے والے پُرسہ دینے اس کے گھر گئے اور عین اس وقت جب سب لوگ انتہائی افسردگی کے ماحول میں بچے کے ماں باپ کو صبر کی تلقین کر رہے تھے۔ کہیں سے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوا کہ حضرات، فلاں صاحب کی ایک قیمتی مرغی کہیں گم ہو گئی ہے۔ جن صاحب کو ملے گھر پہنچا کر ثوابِ دارین حاصل کریں۔

ایک دن ہمارے دوست شیخ صاحب ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے یار میں بے روزگار ہوں۔ میرے لیے کوئی سبیل نکالو۔ ہم نے کہا میاں تم تو محکمہ اوقاف کی کسی مسجد میں گریڈ نمبر 10 کے خطیب تھے تو وہ بولے وہ نوکری میں نے چھوڑ دی ہے۔ ہم نے پوچھا کیوں؟ تو بولے اُنہوں نے مجھے جس مسجد میں لگایا تھا وہاں لاؤڈ اسپیکر نہیں تھا۔ ہم نے کہا گویا:

بغیر مائیک کبھی شیخ کھانستا بھی نہیں

کچھ عرصہ ہوا ہمارے محلے کے ایک صاحب نے جو لندن چلے گئے ہیں۔ ہمیں فون کیا اور

سب کی خیر خیریت معلوم کرنے لگے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ تمہارے جانے کے بعد ہمارے برابر والے چوہدری صاحب نے اپنی کوٹھی کے لان میں ایک شاندار مسجد بنادی ہے۔ جہاں سے لاؤڈ اسپیکر پر صبح 4 بجے سے درود وسلام کے زمزمے اور نعتوں کے نغمے گونجتے رہتے ہیں۔ جس کی بدولت محلے کے تمام خرد وکلاں آج کل رومی وغزالی بننے میں مصروف ہیں۔ دوست نے پوچھا، وہ کیسے تو ہم نے انہیں اقبال کا وہ شعر سنایا کہ:

عطار ہو رومی ہو رازی کہ غزالی ہو   کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

کہتے ہیں کہ دفعہ 144 کے تحت شہر میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر پابندی ہے، مگر ہمیں وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ بلکہ ہم نے ہمیشہ یہی دیکھا کہ پابندی اور لاؤڈ اسپیکر دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کبھی ایک دوسرے کو کچھ نہیں کہتے۔

صاحبو! جب سے ہمارے محلے میں چوتھی مسجد بنی ہے، ہمیں نعتوں کے بے شمار اشعار یاد ہوگئے ہیں اور فلمی گانوں کے متعلق بھی ہماری جنرل نالج میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ کیوں کہ فلموں کی شاید ہی کوئی مشہور ومقبول دھن ایسی ہو، جس پر کوئی نعت موجود نہ ہو۔ آج ہی صبح فجر کے وقت وہ اپنی مخصوص آواز میں 'کتنی راحت فزا آج کی رات ہے' والی نعت 'ستارو تم تو سو جاؤ' کی فلمی دھن پر سنا رہے تھے۔ بہر حال، لاؤڈ اسپیکروں کی برکت سے ہم سب کا ایمان پختہ ہو رہا ہے۔ اور محلے کے سارے مسلمان پنجگانہ نماز ادا کرنے لگے ہیں۔ البتہ ہمارے محلے کے وہ ایک غیر مسلم صاحب جو محلہ کمیٹی کے رُکن بھی تھے اب نظر نہیں آتے ایک دن ہم نے دیکھا کہ وہ اپنا اسباب ٹرک پر لدوا رہے ہیں۔ ہمارے پوچھنے پر بولے میں گھر خالی کر رہا ہوں اور اَب ہم نے فیصلہ کرلیا ہے۔ ''رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں لاؤڈ اسپیکر نہ ہو۔''

ہم نے کافر کے بچے پر لاحول بھیجی اور اپنا ایمان تازہ کرنے مسجد کی طرف چل پڑے۔

* *

نظامِ سقّہ

اکبر حمیدی

نظامِ سقّے کو میں دنیا کے ایک دو ایسے حکمرانوں میں شمار کرتا ہوں، جنہوں نے تاریخ میں واقعی نئے باب کا اضافہ کیا!!

بظاہر وہ ایک دن کا حکمران تھا، مگر اپنی فراست، دُور اندیشی، انقلابی اقدامات اور جرأت مندانہ سیاسی حکمتِ عملی کے باعث دنیا کے اس عظیم مدبر حکمران نے عالمی سیاست کو ایک نئے رُخ سے رُوشناس کر دیا اور ایک بالکل جدید طرزِ حکومت کی بنیاد رکھی۔ نظامِ سقّے نے جغرافیے کو تو کچھ نہ کہا، مگر تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیا۔ حالاں کہ اس زمانے کے بادشاہ لوگ تاریخ کو تو کچھ نہیں کہتے تھے، مگر جغرافیے سے بہت بُرا سلوک کرتے تھے!

ایک منٹ کے لیے آپ سوچیے۔ آخر گزشتہ بادشاہوں نے تاریخ کو کون سا نیا زاویۂ نظر دیا تھا؟ تاحیات بادشاہت، وراثت میں تخت نشینی، شکست و فتح، معزولی یا بخشش کی حکومت، لوٹ مار اور قتل و غارت، تخت یا تختہ کے نعرے کے سوا انہوں نے کیا دیا؟ ظاہر ہے یہ ساری باتیں کسی بھی شریف آدمی کی نظروں میں پسندیدہ نہیں ہو سکتیں!!

آپ ذرا اس دن پر نظر ڈالیے جب تاریخ نے آگے بڑھ کر نظامِ سقّہ کے قدم چومے۔ کوئی اور ہوتا تو اس موقع پر تاریخ کے ہاتھ چوم لیتا اور پھر اسے اپنے گھر میں ڈال لیتا... مگر وسعتِ ظرف ملاحظہ ہو کہ نظامِ سقّہ تاریخ سے قدم چھڑا کر سیدھا اپنے بال بچوں میں چلا گیا، ہمیشہ کی طرح!!

نظامِ سقّہ کی کہانی اس قدر ہے کہ بادشاہ ہمایوں بادشاہ شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر میدان سے بھاگ نکلا۔ شیر شاہ آخر شیر شاہ تھا۔ دشمن کو بھاگ جانے کی مہلت دینے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا، تعاقب میں دوڑا۔ ہمایوں بادشاہوں کے اخلاق سے اتنا خوفزدہ تھا کہ تیراکی نہ جاننے کے باوجود راستے میں پڑنے والے دریا میں کود گیا۔ چند ہی لمحوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ دریا میں

صرف تیرا ہی جا سکتا ہے بھاگا نہیں جا سکتا!!

اس سارے منظر کو شیر دل نظامِ سقہ دیکھ رہا تھا۔ وہ جان پر کھیل کر جنگ ہارے ہوئے بادشاہ کو بچانے کے لیے دریا کی طوفانی لہروں میں کود گیا۔ بادشاہ کو بچا لیا گیا۔ ہمایوں کچھ عرصے بعد واپس لوٹا، فتح یاب ہوا، تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی، نظامِ سقہ کو بلوایا پوچھا، ”مانگ کیا مانگتا ہے؟“ اس نے کہا، ”ایک دن کی حکومت۔“ نظامِ سقہ نے ایک دن کی بادشاہت حاصل کر لی اور جب ایک دن پورا ہوا حسبِ وعدہ نفسِ مطمئنہ کے ساتھ ہمایوں کو بادشاہت واپس کر دی۔ کوئی نظریۂ ضرورت ایجاد نہیں کیا!!

بظاہر یہ کہانی بہت مختصر ہے، مگر حقیقت میں بہت طویل ہے، کیوں کہ اس کے ایک ایک موڑ پر نئے نئے مناظر ہیں اور ہر منظر اپنے اندر نئی نئی گہرائیاں رکھتا ہے!!

مثال کے طور پر آپ یہی سوچیں کہ نظامِ سقہ نے بادشاہت کیوں مانگی؟ دوسرے یہ کہ ایک دن کی بادشاہت کیوں مانگی؟ اپنی مشک کٹوا کر چام کے دام کیوں چلوائے؟ اہلِ خاندان کو جاگیروں اور خطابات سے کیوں نوازا؟ جب کہ ان زمانوں میں زیادہ سختی اہلِ خاندان پر ہی کرنے کا رواج تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ نظامِ سقہ کے خاندان میں کوئی شاعر نہیں تھا ورنہ اسے خلعتِ فاخرہ ضرور عطا کرتا۔

سب سے اہم بات یہ کہ گھر آئی حکومت کیوں واپس کر دی؟!

یہ اور اس طرح کے بہت سے سوالات تاریخ کے طالب علموں کے دماغوں میں پیدا ہوتے ہیں، مگر حسبِ عادت اصل مسائل سے نظر بچا کر نکل جانا بھی معمولی کامیابی نہیں ہوتی۔ مگر مؤرخین کی کم نظری دیکھیے کہ نظامِ سقہ جب تک بادشاہ رہا اس زمانے کا ذکر انہوں نے لکھا۔ مگر بادشاہت سے ریٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی پر کوئی روشنی نہیں ڈالی حالاں کہ یہ تاریخ کا ایک نادر واقعہ تھا!

بہر حال نظامِ سقہ کے بارے میں مؤرخین کی بے توجہی افسوس ناک ہے حالاں کہ نظامِ سقہ نے تاریخ میں داخلہ سے لے کر خارجہ تک نیا اندازِ فکر، نیا رویہ، نیا نظامِ حکومت، نئی اقتصادی اور سیاسی حکمتِ عملی اپنا کر تاریخ کو شرافت، مروت، تہذیب، سیر چشمی اور حسنِ اخلاق کی راہوں سے متعارف کروایا!

مؤرخین کا تعصب اس بات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس زمانے کے دستور کے مطابق کسی

مؤرخ نے شہنشاہ نظامِ سقہ کے نام کے ساتھ ظلِ الٰہی، جہاں پناہ، مہاراج، سلطان معظم اور مہابلی قسم کے القاب استعمال نہیں کیے۔ شاید اس لیے کہ نظامِ سقہ کے نام کے ساتھ... شمشیر ابن شمشیر قسم کے القابات نہیں تھے!

سو اَب وقت آ گیا ہے کہ تاریخ کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے اور تاریخ کو تاریخ کے نقطۂ نظر سے اہمیت دی جائے نہ کہ جغرافیہ کے حوالے سے!

میں تاریخ کو انسانی ہمدردی کے زاویۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ نظامِ سقہ سے میری ہمدردیاں بھی انسانی ہمدردی کی ذیل میں آتی ہیں۔ کیوں کہ نظامِ سقے کے حالات و واقعات، پڑھنے والے کے دل میں انسانی ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیتے ہیں! سچی بات یہ ہے کہ نظامِ سقہ نے نئی اخلاقیات مرتب کیں، جو کسی بھی انسان کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتی ہیں!

مثلاً اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر جنگ ہارے ہوئے بادشاہ کی جان بچانا بے لوث انسانی ہمدردی کی کتنی اعلیٰ مثال ہے! جزا کا وقت آیا تو صرف ایک دن کی بادشاہت طلب کی حالاں کہ ہمایوں کی ساری بادشاہت نظامِ سقہ کی بخشی ہوئی تھی۔ چام کے دام چلا کر گویا آج کی کاغذی کرنسی کی بنیاد رکھ دی۔ بادشاہت جوں کی توں واپس کر دی۔ وہ امن کے راستے سے آیا اور امن کے راستے سے رخصت ہوا۔

جغرافیہ کی تبدیلی ہمیشہ عوام الناس کے امن و سکون پر بجلی بن کر گری ہے اس کے برعکس تاریخ میں تبدیلی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی۔ نظامِ سقہ کا یہی وہ کردار ہے، جس کے باعث وہ میرا پسندیدہ حکمران ہے!

غالبؔ نے کہا تھا کہ وہ اپنے سائے سے ہمیشہ دو قدم آگے چلتا ہے۔ نظامِ سقہ نے بھی اپنے عہد کی تاریخ سے آگے کا سفر طے کیا ہے۔ وہ اتنی بڑی شخصیت کا مالک تھا کہ جب اس سے ''مانگ کیا مانگتا ہے؟'' کا سوال کیا گیا تو بادشاہت سے کم کوئی چیز اس کی نظروں میں ہی نہیں سمائی۔ بھلا اس زمانے میں ایک سقے سے یہ اُمید کہاں ہو سکتی تھی، یوں اس نے بادشاہوں کی تاریخ میں اپنا نام درج کروا کر اپنے آپ کو تاریخ کا شاندار حصہ بنا دیا۔

کبھی کبھی میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ نظامِ سقہ نے اپنی بادشاہت کا ایک دن کیسے گزارا ہوگا؟ کیسے اس نے شاہانہ لباس زیبِ تن کر کے دربارِ شاہی میں قدم رنجہ فرمایا ہوگا؟ کیسے با ملاحظہ ہوشیار

کی آوازیں گونجی ہوں گی؟ کیسے سر جھکائے اہلِ دربار کی صفوں میں سے جلالِ شاہی کے ساتھ وہ گزرا ہوگا؟ کیسے وہ تختِ شاہی پر متمکن ہوا ہوگا؟ کس طرح امراء، وزراء، سپہ سالار... باادب با ملاحظہ ہوشیار ہو کر رشک بھرے جذبات کے ساتھ اس کے سامنے جھک گئے ہوں گے؟ کیسے مرصع لباس میں خادم دربار مورچھل لیے اس کی پشت پر کھڑا مگس رانی کر رہا ہوگا؟ کس طرح شاہی محافظ ننگی تلواریں اُٹھائے چاق و چوبند بارگاہِ شاہی میں ایستادہ ہوں گے؟ شاید نظامِ سقہ نے غیر ضروری سمجھ کر اُن کی چھٹی کروادی ہوگی؟ یا شاید یہ سوچ کر کہ یہی نوکری ان کے بال بچوں کا ذریعہ رزق ہے، ان کی چھٹی نہیں کروائی ہوگی؟ شاید افواجِ شاہی اور سپہ سالار کے لیے بھی اس نے ایسا ہی سوچا ہو؟

کس طرح نظامِ سقہ نے اپنے چمڑے کی مشک کٹوا کر چام کے دام چلوادیے ہوں گے اور پھر اپنی بارعب گرجدار آواز میں اعلان کیا ہوگا، ''آج سے یہی سکہ رائج الوقت ہے۔'' کتنی کاٹ دار طنز ہوگی اس کے لہجے میں۔

شہنشاہ نظامِ سقہ کس طرح رعایا کو درشن دینے کے لیے شاہی جھروکے میں آیا ہوگا؟ کس طرح اس نے ہاتھ اُٹھا کر رعایا کے پُر اشتیاق سلاموں کا جواب دیا ہوگا؟ کس طرح اس نے رعایا کی شکایتیں سنی ہوں گی؟ کس طرح بااختیار طبقہ خواص کے رنگ اُڑ اُڑ گئے ہوں گے۔

کس طرح اس نے غریب سقوں کو جاگیریں عطا کی ہوں گی؟ فرمانِ شاہی پر اس نے دستخط کیے ہوں گے یا مغلِ اعظم کی طرح انگوٹھا لگایا ہوگا؟ کاش یہ فرمان کسی عجائب گھر کی زینت ہوتے۔

غرضیکہ نظامِ سقہ جس طرح جغرافیہ کو تہ و بالا کیے بغیر تاریخ کے ایک دروازے سے ایوانِ شاہی میں داخل ہوا تھا۔ اسی طرح جغرافیے کو مَس کیے بغیر، مگر تاریخ کو اعتماد بخش کر دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا ہوگا۔ بڑے وقار کے ساتھ!

نظامِ سقہ نے اپنے اقتدار کا ایک دن جس طرح گزارا شاید دنیا میں اس کی مثال نہ مل سکے۔

اب رہا یہ سوال کہ یہ ایک دن ہمایوں نے کیسے بسر کیا ہوگا؟ سو اس سے مجھے دلچسپی نہیں۔

* *

اِن سے ملیے

آمر

پہلے تو ہم چاہ رہے تھے کہ اس عنوان کے تحت نرسوں کے اوپر کچھ لکھا جائے، مگر پھر خیال آیا کہ نرسوں کو عموماً سسٹرز کہا جاتا ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ مضمون تو وہیں چوپٹ ہو گیا اور ہم نے ڈاکٹرز کا پوسٹ مارٹم کرنے کا فیصلہ کیا۔

بہرحال، ڈاکٹر کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ آنکھ کے ڈاکٹر، ناک کے ڈاکٹر، کان کے ڈاکٹر، دانتوں کے ڈاکٹر، ہڈیوں کے ڈاکٹر، بچوں کے ڈاکٹر، مردوں کے ڈاکٹر، عورتوں کے ڈاکٹر، جانوروں کے ڈاکٹر، وغیرہ وغیرہ۔

آنکھ کے ڈاکٹر کو 'آئی اسپیشلسٹ' یعنی 'آنکھ کا ماہر' کہتے ہیں۔ یوں تو آنکھ کے ماہر ہر گلی کوچے میں کھڑے ملتے ہیں، جو آنے جانے 'والیوں' کو مہارت سے آنکھیں جھپکا کر اپنے 'آنکھ کا ماہر' ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ لیکن یہ کام ہمارا آئی اسپیشلسٹ نہیں کرتا۔ عموماً جب لوگوں کی آنکھ میں سور کا بال گر جاتا ہے، کسی کی آنکھیں لڑ لڑ کر کمزور ہو جاتی ہیں تو یہی سیدھا سادہ آئی اسپیشلسٹ کام آتا ہے۔

اکثر لوگوں کو ہری ہری بھی سوجھنے لگتی ہے۔ لیکن وہ آئی اسپیشلسٹ کے پاس نہیں جاتے۔ کہاں جاتے ہیں۔ یہ آج تک نہیں پتا چل سکا۔

ناک کا ڈاکٹر، جی نہیں آپ غلط سمجھے، یہ ناف کا نہیں ناک کا ڈاکٹر ہے اور یہ ناک صاف کرنے کے کام نہیں آتا، بلکہ اگر کسی کی ناک نیچی ہو جائے یا کٹ جائے تو یہ بڑی مدد دیتا ہے۔ اُونچی ناک کا بھی اس کے پاس خاطر خواہ علاج ہو جاتا ہے۔

دانتوں کا ڈاکٹر 'ڈینٹسٹ' کہلاتا ہے۔ یہ دندان ساز ہوتے ہیں، لیکن اِن کا بل دندان شکن ہوتا ہے۔ دانتوں کا ماہر ہونے کے ناتے یہ بتیسی توڑ بھی سکتے ہیں اور دانت کھٹے بھی کر سکتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے دانت ہاتھی پر گئے ہوتے ہیں۔ سائز میں نہیں، بلکہ کھانے کے اور ہوتے ہیں اور

دکھانے کے اور ایسے حضرات کا علاج ڈینٹسٹ کے پاس بھی نہیں ہوتا!

بچوں کا ڈاکٹر 'چائلڈ اسپیشلسٹ' پکارا جاتا ہے، حالاں کہ کوئی 'چائلڈ' ہرگز اسپیشلسٹ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس ضمن میں مزید کچھ لکھنا فضول ہے۔

ہمیں شروع ہی سے یہ غلط فہمی رہی کہ عورتوں کے ڈاکٹر کو ہی لیڈی ڈاکٹر کہتے ہیں۔ اس غلط فہمی سے زیادہ ہم اس بارے میں اور کچھ نہیں جانتے۔ کسی کو یقین نہ آئے تو عورتوں کے ڈاکٹر کے پاس چلا جائے۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ مریضوں اور ڈاکٹروں کا چولی دامن بلکہ ٹیکے بازو کا ساتھ ہوتا ہے۔ ٹیکے کے ساتھ بازو کی بجائے ہم لکھنا تو کچھ اور چاہتے تھے، مگر اَدب و تمیز ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے صرف بازو ہی پر اکتفا کیا ہے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جب بچپن میں کسی ڈاکٹر کے ہتھے چڑھ جاتے تھے تو کلینک سے واپسی پر صحیح طرح بیٹھا بھی نہیں جاتا تھا۔ ہاں اس وقت ہم صحیح طرح ہی بیٹھے ہیں کیوں کہ بڑے جو ہو گئے ہیں۔ البتہ کوئی ڈاکٹر اپنے کلینک پر یا کلینک سے باہر، کلنک کا ٹیکہ نہیں لگاتا۔ یہ ٹیکہ کون لگاتا ہے، ہم اس کی کھوج میں ہیں۔ پتا چلتے ہی آپ کو بتا دیں گے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر اپنی پرائیویٹ کلینک کے علاوہ اکثر سرکاری اسپتالوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

اکثر ڈاکٹر خود اُسی بیماری یا کمزوری میں مبتلا ہوتے ہیں، جس کے وہ اسپیشلسٹ ہوتے ہیں۔ کبھی غور کیجیے تو آنکھوں کا ماہر خود موٹے شیشوں کی عینک لگائے ملے گا۔ کسی ڈینٹسٹ کے دانت بدنما، پیلے، دھبے زدہ اور ڈریکولا جیسے ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات ہم یونہی نہیں کہہ رہے، بلکہ ہمارا ذاتی تجربہ رہا ہے۔

جب انسان پیدا ہونا شروع نہیں ہوئے تھے تب آسمانوں پر فرشتے ڈاکٹر ہوا کرتے تھے۔ آدمؑ کی پسلی سے حوّاؑ کی تخلیق کی عظیم سرجری اللہ کے حکم سے ہوئی۔ اس کے بعد فرشتوں نے اس فیلڈ سے کنارہ کشی اختیار کر لی، کیوں کہ انہیں عبادت سے ہی فرصت نہیں۔ ویسے اگر فرشتے ڈاکٹر ہوتے تو بڑا مزہ آتا، کیوں کہ وہ پیسے نہ لیتے۔ اگر مانگتے بھی تو بھی ہم انہیں ڈپٹ دیتے، ”پیسے مانگتا ہے، زیادہ ہی پَر لگ گئے ہیں! جانتا نہیں ہم اشرف المخلوقات ہیں!؟“

اکثر ڈاکٹر بہت اچھے ہوتے ہیں اور خوب صورت بھی! بشرطیکہ لیڈی ہوں اور ابھی میڈیکل

کالج ہی میں پڑھ رہے ہوں!

ڈاکٹروں کی ایک اور قسم ہے جنہیں دماغ کا ڈاکٹر کہا جاتا ہے۔ یہ دماغ درست کرنے، دماغ کے کیڑے جھاڑنے، دماغ ٹھکانے لگانے، دماغ کا خنّاس اور فتور نکالنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ نیز کسی کا دماغ آسمان سے باتیں کرنے لگے تو بھی ان سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ یہ چاہیں تو دماغ گھما بھی سکتے ہیں۔ ان سے علاج کرانے کے لیے دماغ کا مالک ہونا ضروری ہے۔ خواہ وہ سڑا ہوا ہی کیوں نہ ہو!

ہمارا خیال ہے کہ اب ہمیں یہاں بس کرنا چاہیے، کیوں کہ ہم بھی انسان کے بچے ہیں۔ کل کلاں کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو ایسا نہ ہو کہ کوئی ڈاکٹر جس نے ہمارا مضمون پڑھ رکھا ہو، وہ بُرا مان کر ہمارا علاج کرنے سے ہی انکار کر دے۔ ویسے اگر کسی ڈاکٹر نے انکار کیا تو ہمارا زیادہ فائدہ ہوگا، کیوں کہ پھر ہم 'لیڈی ڈاکٹر' کے پاس چلے جائیں گے!

* *

تکیۂ کلام

اندر جیت لال

باہر کوٹھی کے دروازے پر سے گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ میں تیزی سے گیٹ کی طرف بھاگا۔ جب گیٹ تک پہنچا تو دیکھا میرے پڑوسی کھڑے مسکرا رہے تھے۔ میں نے کہا، ”آیئے تشریف لایئے۔“

میرے پڑوسی میرے ساتھ چلتے چلتے اندر ڈرائینگ روم تک آ گئے اور چھُٹتے ہی کہا، ”نام کیا لیں اس کا، آپ کیا باہر گئے ہوئے تھے۔ بہت دنوں سے نیاز حاصل نہیں ہوئے۔ نام کیا لیں اس کا۔ میں نے کئی دوستوں سے پوچھ تاچھ کی، لیکن شاید کسی کو بھی آپ کے باہر جانے کا علم نہ تھا۔ نام کیا لیں اس کا۔ ارے بھئی، جب چند دنوں کے لیے کہیں دوسرے شہر جانا ہو تو اڑوس پڑوس کو کم از کم ضرور بتا جایا کرو، تا کہ یار لوگ آپ کے لیے ترستے نہ رہیں۔ نام کیا لیں اس کا۔“

میرا خیال ہے آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ وہ یہ کہ میرے پڑوسی دوست ہر بات، بلکہ ہر فقرے کے ساتھ ’نام کیا لیں اُس کا‘ کا جملہ کیوں دہرایا کرتے ہیں۔ ایسے مہمل و بے معنی جملوں یا لفظوں کو تکیۂ کلام کہتے ہیں۔ اسے لوگ عادتاً استعمال کرتے ہیں۔ بقول شاعر:

کیوں تکیۂ کلام نہ ہو جائے کوئی لفظ
جب گفتگو میں ہو نہ سہارا کسی طرح

تکیۂ کلام بڑی دلچسپ اور فائدہ مند چیز ہے، کیوں کہ یہ ہر بات، ہر مدعا، ہر بیان کا تکیہ بن جاتا ہے اور متکلم تکیۂ کلام کا سہارا لے کر یا، اُس کا تکیہ بنا کر اپنی بات آگے بڑھاتا ہے۔ متکلم کو بڑی آزادی عطا کرتا ہے، تکیۂ کلام کہ وہ جس جگہ یا جس جملے کے آگے پیچھے اسے فٹ کرنا چاہے، بصد شوق فٹ کر دیتا ہے۔ لسانیات کے ایک ماہر کے الفاظ میں ”تکیۂ کلام ہمیشہ آڑے آتا ہے، بس اتنی احتیاط رہے کہ کہیں اس کی عادت نہ پڑ جائے۔“

میرے ایک ساتھی میرے ساتھ اخبار میں کام کرتے ہیں۔ بفضلِ خدا وہ ایم اے پاس ہیں۔ میرے ساتھی یعنی مسٹر بالی تکیۂ کلام آزادی کے پہلے کے زمانہ سے آج تک نبھا رہے ہیں اور ہر جملے میں فلمی بول کی طرح جڑ دیتے ہیں 'سارا کچھ'۔ جیسے، ''بس نہ ملی تو بڑا پریشان ہوا، سارا کچھ۔ اس پر اسکوٹر کرلیا، لیکن بدقسمتی سے وہ بھی راستے میں خراب ہوگیا، سارا کچھ، چنانچہ میں نے دوسرا اسکوٹر لیا۔ اب لطف یہ ہے کہ جہاں پہنچنا تھا اُس کا پتا تو گھر ہی میں لکھا رہ گیا تھا، سارا کچھ۔ قہر درویش بر جان درویش میں اسی اسکوٹر پر گھر واپس ہوگیا اور واپس پہنچ کر اطمینان کی سانس لی، سارا کچھ۔ بس یوں سمجھیے تیس روپے نقد دے کر اور دو گھنٹے ضائع کر کے خلاصی ہوئی۔ سارا کچھ۔''

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ''چلیے تیس روپے نقد دے کر اور دو گھنٹوں کی خرابی ہی سے جان چھڑالی، یہ سودا بُرا نہیں رہا۔ سارا کچھ۔ اور جب میں نے پُرزور لہجے میں 'سارا کچھ' کہا تو مسٹر بالی کچھ جھینپ گئے کہ میں نے ان کا تکیہ کلام پکڑ لیا تھا اور اِس طرح سارا کچھ اپنے جملہ میں استعمال کر کے انہیں جتا رہا تھا کہ برادر آپ کا تکیۂ کلام 'سارا کچھ' ہے اور ہم اس سے واقف ہیں۔

کسی کا تکیۂ کلام پکڑنا کوئی تحقیق یا ہوشیاری یا فخر کی بات نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میں کسی کا تکیۂ کلام پکڑنے والا کون ہوتا ہوں۔ جب حمام میں سب ننگے ہوں تو کون ایک دوسرے کا مذاق اُڑائے گا۔ تکیۂ کلام تو ہمارے سماج میں بیشتر لوگوں کا ہوسکتا ہے تو کسے پکڑیں گے آپ؟ تکیۂ کلام کی عادت پڑ جائے تو متکلم اس کے استعمال سے باز نہیں رہ سکتا، بلکہ اسے تو بالعموم احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ الفاظ کی کمی یا بیان میں زور پیدا کرنے کی خاطر کوئی تکیۂ کلام اختیار کرتا چلا آ رہا ہے، جو اَب اس کی پکی عادت بن چکا ہے۔ اکثر و بیشتر جب لوگوں کی سوچ رُک جاتی ہے تو وہ تکیۂ کلام کا سہارا لیتے ہیں۔

بیوی اگر خاوند سے کچھ کہنا چاہتی ہو تو شریکِ حیات کے نام سے تو پکارنے سے رہی اور نہ ہی اُسے مسٹر سے خطاب کرے گی۔ ہاں، ''میں نے کہا جی۔'' کہہ کر اپنا مدعا بیان کردے گی۔ اور خاوند اگر بیگم سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہوں تو وہ بھی۔ ''میں نے کہا جی۔'' کہہ کر اپنی بات کہہ ڈالیں گے۔

''میں نے کہا جی۔'' کیا جادو اثر تکیۂ کلام ہے کہ اس کے سہارے، آداب عرض و تعارف دونوں ہوجاتے ہیں۔ بات کی بات ادا ہوجاتی ہے اور لطف یہ ہے کہ بات کا جواب بھی حاصل

ہو جاتا ہے۔ دراصل ’’میں نے کہا جی۔‘‘ بڑا معنی خیز جملہ ہے۔ گرامر و صَرف و نحو سے آزاد۔ اسے الٹا سیدھا، اپنی بات سے پہلے، بعد میں، درمیان میں، آگے پیچھے، اوپر نیچے، کہیں کہہ ڈالیے، آپ کی بات سامع کے ذہن نشین ہو جائے گی اور وہ آپ سے کسی نکتے کی وضاحت طلب نہیں کرے گا۔

ہمارے سماج میں گالی ایک حد تک تکیۂ کلام کا حق ادا کرتی ہے۔ یوں گالی دو دھاری تلوار ہے۔ اور متکلم کو اگر گالی کی عادت پڑ جائے تو وہ آپ کو تو کیا اپنے بھائی بہن، ماں باپ، گورو پرمیشور کسی کو نہیں بخشتا۔ جیسا کہ میرے ایک دوست لفظ ’حرامی‘ کو بڑی بُردباری و شرافت سے تکیۂ کلام بنا بیٹھے ہیں۔ ان سے ملیے تو کہیں گے، ’’بھئی آپ بڑی حرامی شے ہیں اور میں بھی کم حرامی نہیں ہوں۔‘‘ یہاں ’حرامی‘ سے مراد ہوشیار یا چوکس ہے اس سے کم و بیش کچھ نہیں۔ غالباً ایسی ہی گالیوں کے متعلق مرزا غالبؔ نے فرمایا ہے:

گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

ایسی گالی، گالی لگتی نہیں اور نہ ہی غصہ دلاتی ہے، کیوں کہ متکلم کی مراد گالی سے ہوتی ہی نہیں وہ تو خصلتاً گالی دیتا ہے، بلکہ بکتا ہے۔ اور دوسروں کو گالی دے نہ دے، اپنے آپ کو غلیظ سے غلیظ گالیاں دن بھر دیتا رہتا ہے۔ ایسے لوگ کرسی، میز، قلم دان، جاندار، بے جان ہر چیز کو گالی دیتے ہیں۔ ہر فقرے میں گالیاں اس طرح جڑتے ہیں جیسے غزل میں مطلع دہرایا جا رہا ہو۔ ایسے آدمیوں کے منہ سے نکلی ہوئی ماں بہن کی گالی، اُلّو کا پٹھا، گدھا، کم بخت یا حرام زادہ تو پیار سے پیش کی ہوئی پان کی گلوریاں ہیں۔ اور آپ بُرا مانیں ہی کیوں یا منائیں ہی کیوں۔ جب کہ متکلم نیت سے آپ کو گالی کا نشانہ نہیں بنا رہا، تو شکوہ شکایت کاہے کو۔ وہ تو طیش یا غصے میں کہہ ڈالتا ہے، ارے یار کیا کہوں، میں تو خود اُلّو کا پٹھا ہوں۔ اور اس طرح کا اُلّو کا پٹھا وہ اپنے آپ کو دن میں بیس بار بنا ڈالتا ہے۔

کئی تکیہ ہائے کلام ایسے ہیں کہ معنی میں وہ بڑے دل پذیر اور مہذب لگتے ہیں، کانوں کو بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ہاں، متکلم انہیں ناموزوں استعمال کرتا ہے، بے محل، بے معنی، بے موقع۔ یوں بھی ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ زیادہ تر تکیۂ کلام بے موقع اور بے محل استعمال کیے جاتے ہیں۔

دراصل تکیۂ کلام کا لطف ہی اِسی میں ہے کہ وہ بیشتر ناموزوں جملے کا حق ادا کرتا ہے۔ ہاں، اگر موزوں جملے کا حق ادا کر دے تو تکیۂ کلام کی لطافت زائل ہو جاتی ہے۔

میرے ایک ہم مکتب بیسیوں برسوں سے دوستی نبھاتے چلے آ رہے ہیں۔ ہاں، 'بہت خوب' کا تکیۂ کلام ضرور استعمال کریں گے۔ انہیں اس سے کوئی مناسبت نہیں کہ کوئی افسوس ناک یا مرگِ ناگہانی ہی کی خبر کیوں نہ ہو، وہ تو کچھ سنے بغیر بلکہ سنی اَن سنی کر کے 'بہت خوب' کہہ ڈالتے ہیں۔ اب آپ سر پیٹ کر بیٹھ جائیں یا غم زدہ ہو جائیں۔ بہت خوب کہنے والے صاحب، بہت خوب کہہ کر چلتے بنے اور آپ کو پیچھے تڑپتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے۔

مجھے ایک بار بلڈ پریشر کا عارضہ ہو گیا۔ زیادہ بڑھ جانے پر صفدر جنگ ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ وہاں علاج معالجہ ہوتا رہا۔ بہر حال، ڈسچارج ہونے پر کئی ماہ گھر میں بھی احتیاط اور علاج بدستور رہا۔ اُن دنوں میرے دوست کو میری طویل بیماری کی خبر ملی۔ حضرت گھر آ دھمکے۔ میں نے اپنی طویل بیماری کی طویل داستان کہہ سنائی۔ حضرت فٹ سے بولے، ''بہت خوب۔'' میں نے کہا، میں بڑا پریشان رہا ہوں، ڈاکٹر کا علاج تو ہوا، لیکن میں بہت کمزور ہو گیا ہوں''۔ ''بہت خوب۔'' دوست نے فرمایا۔

''اب کچھ زندگی میں اچھا یا بھلا نہیں لگتا۔'' میں نے نہایت حلیم انداز میں کہا۔

''بہت خوب، بہت خوب۔''

میرا بلڈ پریشر ایک دم بڑھ گیا۔ اتنا غصہ آیا کہ شاید میں اُن کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیتا، لیکن بالکل خاموش ہو گیا اور اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ اِس سر پھرے کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اور اگر میں اسے یہ کہہ دوں کہ میں خدا کے گھر جا رہا ہوں، کوئی صورت ہو تو چارہ گری کر لو۔ تو اِس کے جواب میں یہ یہی کہہ ڈالیں گے، ''بہت خوب'' یعنی خدا کے گھر بصد شوق جایئے۔

کئی تکیہ ہائے کلام جو میں نے دوست احباب کے نوٹ کیے ہیں، وہ ہیں 'جی ہاں' لو سنو، جائے جہنم میں، اچھا اچھا، واہ واہ، وہی تو میں نہیں کہہ رہا تھا، غصے کی بات نہیں، جانے بھی دو، ہو سکتا ہے، قسم خدا کی، آپ کی قسم، ناراض مت ہوناج، کمال ہے، ہونہہ رہنے بھی دو اور پھر کئی طرح کی گالیاں (ہلکی، بھاری چھوٹی بڑی، مزے دار، غلیظ اور بے معنی)۔

تکیۂ کلام انگریزی میں بھی ہوتا ہے، جو زیادہ تر انگریز لوگ ہی استعمال کرتے ہوں گے۔

اندر جیت لال ...... تکیۂ کلام

لیکن خوش قسمتی یا بد قسمتی سے انگریز تو ہندوستان سے بستر گول کر کے چلتے بنے۔ ہاں اپنی نکٹائی، پتلون اور دوسری عادتوں کے ساتھ ساتھ انگریزی کے تکیۂ کلام بھی اِدھر چھوڑ گئے۔ کچھ ہم لوگ بھی اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے کہیں کہیں انگریزی الفاظ کا سہارا لیتے ہیں، یہ ہماری قومی عادت ہے اور لگ بھگ ہر آدمی یوسی، آئی سی، ونڈرفل، شٹ اَپ، پلیز، آئی مین، ایگزکٹلی، ایکچوئیلی، بائی دی وے، بائی گاڈ، گڈنیس، آف کورس، بائی بائی، کہہ ڈالتا ہے۔ مزہ یہ ہے کہ ایسے انگریزی الفاظ موقع محل پر تو کم اور بے موقع زیادہ دہرائے جاتے ہیں۔

ان انگریزی الفاظ وترکیبوں یا جملوں کی معنویت کے بکھیڑے میں کوئی نہیں پڑتا۔ بس یوں سمجھیے ان الفاظ کے کوئی معنی نہیں۔ انہیں چاہے کہیں فٹ کر دیجیے۔ دُور مت جائیے، میرے ہم مکتب بھروال ہی کو لیجیے۔ ماشاء اللہ ایک اچھے عہدہ پر ممتاز افسر ہیں۔ بڑے خلیق، ہنسوڑ اور دریا دل دوست ہیں، پر کیا کیجیے ’ایکچوئیلی‘ کو ہر جملے پر، ہر فقرے میں گھسیٹتے جاتے ہیں۔ جیسے، میں کل دوپہر بعد گھر پر نہ تھا، ورنہ میں آپ کو فون کر لیتا۔ ایکچوئیلی میں کل شام آپ کے ہاں آنے کے لیے تیار بھی ہوا، لیکن سارا پروگرام دھرے کا دھرا رہ گیا۔ ایکچوئیلی اس لمحہ کوئی ہمارے ہاں اپنی بیوی بچوں سمیت آ ٹپکا اور اِس حالت میں مجھے آپ کے ہاں آنے کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔ ایکچوئیلی ہوا یوں۔ اور پھر بھروال صاحب نے ایکچوئیلی کا پورا پہاڑا پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ ہر پانچ سات الفاظ کے بعد ایکچوئیلی کو ٹیپ کا بند بنا دیتے۔ میں مسکراتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ اگر انہیں ایکچوئیلی کو تکیۂ کلام بنانے کا احساس دلا دوں گا، یا کسی طرح اس کے استعمال کے بارے میں بتلاؤں گا تو سارا لطف جاتا رہے گا۔ اس لیے میں نے اپنے آپ کو ضبط میں رکھتے ہوئے یوں ہی دل میں کہا، شاباش میرے دوست! تم ایکچوئیلی کو کبھی نہیں ترک کرنا، یہ بڑا اچھا تلا لفظ ہے، یہ ہمارے لیے ایک ہلکا مزاح پیدا کرتا ہے، اس لیے اسے جی بھر کے استعمال کرتے رہو۔

ایک ماہرِ نفسیات کی رائے ہے کہ تکیۂ کلام کا استعمال کرنے والے کے تحت الشعور میں بظاہر اِس طرح کا احساس نہیں رہتا کہ وہ بے ضرورت الفاظ یا جملے دھڑا دھڑ استعمال کرتا جا رہا ہے اور اُس کے سننے والے کو یا تو بے زاری ہو رہی ہے یا بوریت۔ بہر حال، ایسے تکیۂ کلام مزاح کا رنگ پیدا کر دیتے ہیں۔

ایک افسانہ نگار کو (جیسا کہ ہر شاعر وادیب کی کمزوری ہوتی ہے) اپنے افسانے سنانے

کا بڑا شوق تھا۔ افسانہ مکمل نہ ہو تو وہ پلاٹ ہی سنا ڈالتے۔ اِن افسانہ نگار حضرت کا تکیۂ کلام تھا 'دیکھا آپ نے۔' ایک بار یہ صاحب، رشید احمد صدیقی کو اپنا پلاٹ سنا رہے تھے، جو کچھ اس طرح تھا:

''ایک سنسان بیابان تھا (دیکھا آپ نے) رات کا سناٹا، ہو کا عالم (دیکھا آپ نے) اس سناٹے میں ایک الو اُڑا (دیکھا آپ نے)۔''

رشید صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا، ''جی ہاں حضور، دیکھ رہا ہوں۔''

گھر میں بڑی بوڑھیاں 'ہائے اللہ' کا تکیۂ کلام استعمال کرتے ہیں۔ سالن بد مزہ ہو تو ناپسندیدگی کا اظہار ہائے اللہ سے ہوگا۔ کھیر اگر زیادہ مزے دار تیار ہوگئی ہے تو بھی ہائے اللہ اور اگر پوتا امتحان میں فرسٹ ڈویژن لے کر آکر یہ مژدہ سنا رہا ہے تو بڑھیا ضرور کہے گی، ''ہائے اللہ۔''
ایسے تکیۂ کلاموں ہی سے پریشان ہو کر ایک بار داغ دہلوی نے طنزاً کہا تھا:

میرے حضور مجھ کو تونگر بنائیں گے
ہر وقت داغ کا یہی تکیۂ کلام ہے

بہتر ہوگا کہ آپ تکیۂ کلام والوں کے تکیۂ کلاموں سے حظ اُٹھائیں، کچھ مسکرائیں اور اپنی شگفتگی کے لمحات کچھ اور بڑھالیں۔ متکلم کے بھولے پن اور سامع کی تیز دماغی میں بڑا لطف ہے۔ خدا ان تکیۂ کلام والوں کو سلامت رکھے۔

* * *

میر کلو کی گواہی

انجم مان پوری

احسن اپنے گواہوں کے نہ آنے کی وجہ سے مقدمہ کی تاریخ بڑھانے کے لیے مہلت کی درخواست دے کر بار لائبریری میں اطمینان سے بیٹھا ہوا اپنے وکیل سے باتیں کر رہا تھا کہ اس کا کار پرداز گھبرایا ہوا پہنچا اور بولا کہ:

"گواہوں کی پکار ہو چکی ہے، حاکم نے مہلت کی درخواست نامنظور کر دی، گواہ حاضر نہ ہوں گے تو مقدمہ خارج کر دیا جائے گا۔"

احسن کی بدحواسی دیکھ کر وکیل نے کہا کہ،

"گھبرانے کی کون سی بات ہے گواہی دینے والوں کی یہاں کمی نہیں۔" چنانچہ فنِ گواہی کے مشہور ماہر اور پیشہ ور گواہوں کے استاد میر کلو صاحب بلائے گئے۔ وکیل صاحب نے احسن سے پانچ روپے لے کر اُن کے حوالے کیے اور ساتھ لیے اجلاس پر پہنچ گئے۔ میر صاحب حاکم کو سلام کر کے کٹہرے میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ احسن سخت متحیر تھا کہ مقدمہ کی حالت سے میر صاحب بالکل واقف نہیں، مدعا علیہ کون ہے، کیا نام ہے، کتنی رقم کا دعویٰ ہے، نہ کچھ بتلایا گیا، نہ اظہار کی کوئی تعلیم دی گئی، آخر یہ اظہار کریں گے تو کیا؟ غریب سمجھا کہ مقدمہ ہوا چوپٹ۔ فریق کے وکیل کو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ احسن کا کوئی اصلی گواہ نہیں آیا ہے، میر کلو کو کٹہرے میں دیکھ کر اور بھی خوش ہوا کہ یہ بھاڑے کا ٹٹو کہاں تک چلے گا؟ اگرچہ چیف کے سوالات سے مقدمہ کی نوعیت کا اندازہ کچھ میر صاحب نے اپنی ذہانت سے لگا لیا اور یہ بھی سمجھ گئے کہ احسان علی خاں اصلی مقروض کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب بحیثیت وارث ان کے بیٹے شاہد خاں پر یہ نالش دائر کی گئی ہے، لیکن احسان علی خاں جنہوں نے تمسک لکھا تھا ان کی صورت، شکل، وضع، عمر سے واقفیت نہ ہونے کے باعث دل میں کچھ سوچنے لگے کہ فریق کے وکیل نے جرح کے سوالات شروع کر دیے۔

میر صاحب دروغ حلفی کے جرم میں ایک بار سزا پا چکے تھے، اس لیے پہلا سوال ان سے یہی کیا گیا:

وکیل: ''میر کلو صاحب! آپ کبھی جیل کی بھی سیر کر آئے ہیں؟''

میر صاحب: ''آج کل کون ملک کا خادم ایسا ہے، جو جیل سے نہ ہو آیا ہو۔''

وکیل: ''آپ کو ملک کی کس خدمت کے صلہ میں یہ فخر حاصل کرنے کا موقع ملا؟''

میر صاحب: ''گاندھی جی نے نمک کے قانون توڑنے کا بیڑا اُٹھایا تھا اور بعض لیڈروں نے جنگلات کے قانون کی خلاف ورزی کو اپنے ذمہ لیا۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ ضرورت قانونِ شہادت کی اصلاح کی ہے، اسی لیے قانون شکنی کے لیے میں نے اسی کو منتخب کیا۔''

وکیل: (حاکم کو مخاطب کر کے) ''حضور یہ دروغ حلفی کے جرم میں سزا پا چکے ہیں، مگر اپنی زبان سے صاف اقرار نہیں کرنا چاہتے۔''

حاکم: ''تو آپ اس فیصلہ کی نقل داخل کر سکتے ہیں؟ دوسرا سوال کیجیے۔''

وکیل: ''کیوں میر صاحب، احسان علی مرحوم کو آپ جانتے تھے؟''

میر صاحب: ''اے حضور! جاننے کی ایک ہی کہی، خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے، ہم دونوں ایک جان دو قالب تھے، نہ مجھے ان کے بغیر آرام، نہ ان کو میرے دیکھے بغیر چین۔''

وکیل: ''ان کی عمر کیا تھی؟''

میر صاحب: ''یہی تیس اور ساٹھ کے درمیان ہی تھی۔''

وکیل: ''یہ تیس اور ساٹھ کے درمیان کہے سے کام نہیں چلے گا، صاف کہیے وہ بوڑھے تھے یا جوان؟''

میر صاحب: ''عمر کے لحاظ سے تو بہت زیادہ بوڑھے نہیں تھے، مگر اکثر بیمار رہنے کی وجہ سے بوڑھے معلوم ہوتے تھے۔''

وکیل: ''بال سفید تھے، یا سیاہ؟''

میر صاحب: ''نزلہ کی وجہ سے بال سفید ہو گئے تھے، لیکن جب خضاب لگاتے تھے تو جوان معلوم ہوتے تھے۔''

وکیل: ''رنگ گورا تھا، یا کالا؟''

میر صاحب: ''نہایت ہی گورے چٹے آدمی تھے، لیکن وہی بیماری کی وجہ سے رنگ کچھ

سانولا ہو گیا تھا۔“

وکیل: ”لانبے تھے یا ناٹے؟“

میر صاحب: ”قد تو لانبا تھا، لیکن کمر جھک جانے کی وجہ سے ناٹے معلوم ہوتے تھے۔“

وکیل نے جھلا کر کہا، ”سوال کا صاف جواب کیوں نہیں دیتے، یہ کیا کہ لانبے تھے اور ناٹے بھی، گورے بھی تھے اور سانولے بھی، بال سفید بھی تھے اور سیاہ بھی۔ اس سے حلیہ کا کہیں صحیح اندازہ مل سکتا ہے؟“

میر صاحب: ”جناب خفا ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ایک دو روز کی ملاقات ہوتی تو البتہ اس وقت کی خاص وضع اور صورت کو بیان کرتا۔ برسوں رات دن کا ساتھ رہا، جن مختلف حالتوں میں مَیں نے ان کو دیکھا صاف صاف کہہ دیا۔“

وکیل: ”اچھا احسان علی مرحوم داڑھی بھی رکھتے تھے یا نہیں؟“

میر صاحب: ”وہ عجب آزاد وضع اور رندانہ مشرب کے آدمی تھے، جی میں آیا تو چاروں ابرو کا صفایا بول دیا اور کبھی داڑھی بڑھائی تو خواجہ خضر کو بھی مات دے دی۔“

وکیل: ”فضول گوئی کی ضرورت نہیں، میں نے پوچھا تھا کہ داڑھی رکھتے تھے یا نہیں، صرف ہاں یا نہیں کہہ دیتے، اس کے علاوہ کچھ زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں، دنیا بھر کے قصے سے ہمیں مطلب نہیں۔“

میر صاحب: ”بہتر، آئندہ سے ان ہی دو لفظوں میں جواب دوں گا۔“

وکیل: ”احسان علی خاں مرحوم برابر رہتے کہاں تھے؟“

میر صاحب: ”جی ہاں!“

وکیل: ”یہ جی ہاں کیا، میں پوچھتا ہوں کہ کہاں رہتے تھے تو آپ فرماتے ہیں جی ہاں، یہ اس سوال کا جواب ہوا؟“

میر صاحب: ”جناب ہی نے فرمایا تھا کہ جواب میں صرف ہاں یا نہیں کہو۔“

وکیل: ”میں نے ہر سوال کے لیے تھوڑے ہی یہ جواب بتلایا تھا، اچھا اب کہیے کہ وہ کہاں رہتے تھے؟“

میر صاحب: ”اپنے مکان میں۔“

وکیل: ”لاحول ولاقوۃ! عجب سمجھ ہے، میرا اس سے مطلب یہ ہے کہ شہر میں رہتے تھے، یا دیہات میں؟“

میر صاحب: ”دونوں جگہ، کبھی شہر، کبھی دیہات۔“

وکیل: ”دیہات میں ان کا مکان کس رُخ کا ہے، آپ تو وہاں بھی ساتھ جاتے ہوں گے؟“

میر صاحب: ”جی ہاں! برابر ساتھ دیہات بھی جایا کرتا تھا۔“

وکیل: ”اصلی سوال کو آپ ٹال گئے۔ دیہات میں ساتھ رہنے کو میں نہیں پوچھتا، اس کا جواب دیجیے کہ وہاں مکان کس رُخ کا ہے۔“

میر صاحب: (اتنی دیر میں جواب سوجھ گیا) ”شہر میں رہنے والوں کا دیہات میں اکثر تیر بہک جاتا ہے، وہاں جب جب گیا سمت کا مجھے صحیح پتا ہی نہ لگا۔“

وکیل: ”یہ روپے کس کام کے لیے انہوں نے لیے تھے؟“

میر صاحب: ”اپنی ضرورت کے لیے۔“

وکیل: ”کون سی ضرورت، کیا کوئی خاص ضرورت آ پڑی جو بغیر قرض لیے کام نہیں چلتا تھا۔“

میر صاحب: ”وہ نہایت ہی اولوالعزم تھے، خاص اور عام ضرورتیں ان کے لیے ایک تھیں، اپنے پاس دو چار ہزار روپے رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔“

وکیل: ”کب روپے انہوں نے لیے؟“

میر صاحب: ”جب ضرورت پڑی۔“

وکیل: کتنے دن ہوئے؟“

میر صاحب: ”تین سو ساٹھ دنوں کا ایک سال ہوتا ہے، اب حساب کرنا اور جوڑ کے بتانا کہ سب ملا کر کتنے دن ہوئے ذرا مشکل ہے۔“

وکیل: ”دنوں کو جوڑ کر بتانے کو میں نہیں کہتا۔ یہ بتائیے کہ کتنے سال ہوئے؟“

میر صاحب: ”تمسک پر لکھی تاریخ کو دیکھ کر آپ بھی جوڑ سکتے ہیں کہ کتنے سال ہوئے۔“

وکیل: ”تو صاف کہیے کہ ہمیں یاد نہیں۔“

میر صاحب: ”جی ہاں پڑھنا چھوڑے ہوئے زمانہ ہو گیا، اب حساب واقعی یاد نہیں۔“

وکیل: ”حساب کے بھولنے یا یاد رکھنے کا سوال نہیں، تمسک کب لکھا گیا تھا، کتنا زمانہ ہوا، یہ یاد ہے یا نہیں؟“

میر صاحب: ”زمانے کے بارے میں جو آپ پوچھتے ہیں تو جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، انہوں نے اپنی زندگی ہی کے زمانے میں قرض لیا تھا۔“

وکیل صاحب اس اول فول جواب سے سمجھ گئے کہ مقدمہ کے متعلق یہ حضرت کچھ بھی نہیں جانتے، صرف دفع الوقتی کر رہے ہیں، لیکن غصہ تو اس کا تھا کہ اور باتوں کے جاننے کا کیا ذکر، مدعا علیہ کی صورت تک نہیں دیکھی اور برسوں کی ملاقات اِک طرف رہی، رات دن ایک ساتھ رہنے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ اور اس پر کہیں سے گرفت میں نہیں آتے۔ آخر سوچ کر ایسا سوال کیا، جس سے وکیل صاحب کو یقین تھا کہ واقفیت اور دوستی کا سارا بھانڈا ہی پھوٹ جائے گا۔ وکیل صاحب نے سوال کیا:

وکیل: ”کہیے صاحب، احسان علی صاحب مرحوم کی آپ سے دلی دوستی تھی، برسوں ایک ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے، ان کا خط تو آپ ضرور پہچانتے ہوں گے؟“

میر صاحب: ”یہی تو اِک کمال مرحوم میں تھا، جس پر وہ برابر فخر کیا کرتے تھے، وہ نہایت ہی خوش نویس ہفت قلم تھے، ہمیشہ مختلف شان سے لکھا کرتے تھے۔ قلم پر اتنا اختیار تھا کہ ان کا ایک خط کبھی دوسرے سے ملا ہی نہیں۔“

اس جواب کے بعد وکیل صاحب نے سپر رکھ دی۔ دو بجے سے مقدمہ شروع ہوا تھا، چار بجنے کو چند ہی منٹ باقی رہ گئے تھے۔ حاکم نے مسکرا کر وکیل صاحب سے پوچھا کہ اور کچھ پوچھنا ہے؟ وکیل صاحب نے کہا، ”جی نہیں۔“ لیکن یکا یک ایک بات یاد آ گئی۔ حاکم سے کہا کہ ”حضور صرف ایک اور سوال کر کے جرح ختم کر دیتا ہوں۔ مسل کے کاغذات میں ایک جگہ احسان علی خاں مرحوم کے مرض الموت کا ضمناً تذکرہ تھا، اس کو دماغ میں رکھ کر وکیل صاحب نے سوال کیا۔

وکیل: ”میر صاحب! یہ تو بتلائیے کہ احسان علی خاں مرحوم مرے کس بیماری سے؟“

میر صاحب: (رونی صورت بنا کر) ”ہائے رونا تو اسی کا ہے کہ ان کے علاج میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا گیا، حکیم، وید، ڈاکٹر سب کا علاج کیا گیا، مگر کسی کو اصل مرض کا پتا ہی نہیں لگا۔ کوئی

کچھ کہتا تھا، کوئی کچھ 'چوں قضا آید طبیب ابلہ شود' جناب وکیل صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ ان کو موت کی بیماری تھی۔"

چار بج چکے تھے، اجلاس برخاست ہوا۔ احسن کو دوسرے روز اپنے گواہوں کے لانے کے لیے کافی موقع مل گیا اور یہ صرف میر صاحب کی بدولت ہوا۔ اس روز سے ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ گواہوں کو سچے ہونے سے زیادہ ذہین اور حاضر جواب ہونے کی ضرورت ہے۔

* * *

غالب کے چند غیر مطبوعہ خطوط!؟

انور احمد علوی

میاں! خدا تم کو سلامت رکھے۔

تین خط تمہارے آگے آئے تھے اور ایک پرسوں آیا۔ اُن کا جواب میں نے نہیں لکھا، کیوں کہ وہ جواب طلب نہ تھے۔ تم نے مجھ غم کے پتلے کو تعزیت کے سلسلے میں لکھے تھے۔ بھائی! میرے عزیزوں کے مرنے کا انتظار نہ کیا کرو، کبھی کبھی اللہ کے پیاروں کے ساتھ مجھ غریب کو بھی پوچھ لیا کرو۔

مقدر کی خرابی اِس کو کہتے ہیں۔ نواب صاحب بہت منع کرتے رہے اور برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے، مگر میں ایسے انداز سے چلا کہ چاندرات کے دن یہاں آ پہنچا۔ تم بھی شاید بیٹے کو لیے اسی انداز سے راولپنڈی کے لیے نکلے۔ بھائی! میری کراچی آمد کی اطلاع فرشتوں سے پالی تھی کیا؟ مریضوں کی تیمارداری تو تم لوگ وقت بے وقت خوب کیا کرتے ہو، یہ سوچ کر شاید اُن کی آخری بیماری ہو، مگر مہمانداری سے دل تمہارا جلد اچاٹ ہو جاتا ہے۔

لو اَب اپنے شہر کی سنو! یکشنبہ کو غرّہ ماہِ مقدس رمضان ہوا۔ اُسی دن سے ہر صبح کو 'بریلوی مسجد' میں جا کر امام صاحب سے قرآن سنتا ہوں۔ شب کو 'دیوبندی مسجد' میں جا کر تراویح پڑھتا ہوں۔ جمعہ کی نماز 'اہلِ حدیث' کی مسجد میں پڑھتا ہوں، کیوں کہ تمہارے ہاں مسلمانوں کی کوئی مشترکہ مسجد مجھ کو نظر نہ آئی!

اب کی بار ماہِ مبارک رمضان کا جو انتظام و انصرام تمہارے ہاں دیکھا، وہ واقعی دیدنی تھا۔ واہ واہ! کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔ اِدھر اذان کی آواز بلند ہوئی، اُدھر شاہی پیادوں نے تمام عبادت گاہوں کو گھیرے میں لے لیا اور چوبدار آن کی آن میں سیڑھیاں لگا، کمندیں ڈال، فصیلوں پر چڑھ گئے۔ ادنیٰ و اعلیٰ سب نے سکون سے نماز پڑھی اور گھر کی راہ لی۔ ورنہ اللہ ہی ہے، جو نمازیوں کو دوبارہ منہ اپنے اہل و عیال کا دیکھنا نصیب ہو! واللہ باللہ مومنین کا ذکر ہی کیا، ہم تو تفتہ و

زائن کو بھی سینوں سے لگائے ہوئے تھے... اگلے وقتوں کے لوگ جو ٹھہرے!

چند الفاظ وضاحت طلب ہیں، جو قیامِ کراچی کے دوران روز سننے میں آئے۔ کسی سے پوچھنے میں عار آئی اور لغت میں یہ کہیں نظر نہ آئے۔ ایک 'موبائل'، دوسرا 'حساس علاقے'، تیسرا 'نامعلوم افراد' چوتھا 'آہنی ہاتھ' اور پانچواں 'عدالتی تحقیقات'۔ صحیح صورتِ حال تو تم ہی بتلاؤ گے، لیکن پھر بھی جو میں سمجھا ہوں، پہلے وہ سن لو۔ 'موبائل' تو شاید 'موبل آئل' کا مخفف ہے، جو ہمارے زمانے میں بھی ہوا کرتا تھا، مگر استعمال اِس کا ذرا مختلف تھا۔ تم لوگ تو سنا ہے اِسے اب اپنے پیٹ کا ایندھن کرتے ہو۔ 'نامعلوم' کا صیغہ بھی خوب ہے۔ بھائی! یہ کیسے افراد ہیں، فردِ جرم عائد کرنے کے لیے اِن کا، فرد ہونا ہی کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ اب رہے 'حساس علاقے'۔ بچپن سے سنتے آئے تھے روزِ قیامت اعمال کو جسم عطا ہوگا، شاید اِسی کے مصداق تم لوگوں نے حِس کو مجسم کردیا ہے اور شہر کے کچھ حصوں میں حس انسان کے جسم سے نکل کر در و دیوار میں سرایت کرگئی ہے۔ یوں یہ بے جان سنگ وخشت حساس اور انسان بے حس ہوگئے ہیں! حضرت مجھے تو یہ سب کرشمہ معاشی خود کفالت کا لگتا ہے! بقیہ دو الفاظ پر میں کوئی تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔

تمہارے ہاں گیا تھا۔ تمہاری دونوں بچیاں سارہ اور حفصہ اچھی ہیں۔ دن میں تین چار بار روزہ کھولتی ہیں، پھر بھی افطار کے وقت روزہ داروں کے منہ سے نوالہ چھین لیتی ہیں۔

اور ہاں صاحب! اب ایک امرِ مختصر کے واسطے جداگانہ خط تم کو کیا لکھوں۔ بٹی میرے ایک دُور کے رشتہ دار کی حال ہی میں بیاہ کر کراچی آئی ہے۔ شاید قضا اُس کی اُسے وہاں کھینچ لائی ہے۔ پتا تمہارا اُسے دے دیا تھا۔ اُس کا آنا ہو تو ایک آنہ اُسے میری طرف سے دے دینا۔ آدھ آنے کی نذر بھی اُتار دینا اور اپنی بی بی سے کہنا میری بی بی کی جانب سے اُسے پیار کرلے۔ بھائی! کہیں میری جانب سے تم نہ کرلینا! اوروں کو دعا خط میں کیوں لکھوں، وہ خود زبانی سب سے کہہ دے گی۔ بندہ بری الذّمہ ہے۔ جو باتیں جواب طلب ہیں، جواب اُن کا طلب ہے۔

جمعہ 23 مئی 1995ء

خیریت کا طالب
غالب
(جو خود کبھی خیریت سے نہ رہا!)

صاحب!

جس گھڑی تمہارا فون آیا میں بازار میں تھا۔ بی بی کو دمِ شب تنہا بھیج دینے میں وہم آیا، خدا جانے اگر کوئی امرِ حادث ہو تو بدنامی تمام عمر رہے۔ اس سبب سے ہمراہ اُس کے چلا گیا، ورنہ شب عید کی، بجائے بازار کے گھر پر ہی کاٹتا۔ بھائی! مجھے تو نواب رامپور نے چلتے وقت عید کارڈ، جوڑا اور کچھ رقم بطور ہدیہ کے دے دی تھی، بی بی موزوں طبع ہوتی تو وہ بھی کسی نواب سے مراعاتِ فطرانہ ولباسِ فاخرہ پاتی۔ ناچار ساتھ اُس کو لیے کپڑے کی ایک دکان میں جا گھسا۔ علاوہ اِس کے بھی جو کچھ بن پڑا اُسے دلا دیا۔ میری جیب خالی ہوگئی، پہ اُس کا جی نہ بھرا۔

اب اصل حقیقتِ حال کی طرف آتا ہوں۔ بازار میں پھر پھر کر کئی دکانوں سے جو کچھ خریدا تھا، واپسی پر گاڑی میں بیٹھے بیٹھے چند لونڈوں کی نذر کیا اور یہ کہتے ہوئے جان محبوب پر نثار کرنے کو رکھ چھوڑی کہ جان پر کھیلنا کچھ ریختہ میں ہی جچتا ہے:

مال تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا بچا کیا ہے!

بھائی میرے! یوں بھی جہاں مال کی قیمت جان سے زیادہ ہو، وہاں مال کا روک لینا عبث ہے۔ کالی داس گپتا سے کہنا، اپنے مرتب کردہ میرے 'دیوانِ کامل' میں بھی اِس شعر کو حسبِ بالا تبدیل کر دے اور ایسے تمام اشعار جن میں سہواً یا قصداً جان کو مال پر فوقیت دی گئی ہو اُن میں موافق حالات کے ترمیم کر دے، تا کہ میرے کلام کی آفاقی حیثیت برقرار رہے۔

لو صاحب اور تماشا سنو! گھر پہنچ کر لمبر کوتوالِ شہر کا ملایا اور احوال اپنا جو کچھ راہ میں پیش آیا تھا گوش گزار کرنا چاہا، تو ناگاہ اطلاع پائی وہ خود اپنی چھینی گئی گاڑی کی رپٹ درج کرانے کو گئے ہوئے ہیں، میری دادرسی کا ہے کو کریں گے۔ صاحب! یہ بھی خوب رہی، اگلے وقتوں میں شہر کے اندیشے سے قاضی دُبلا ہوا کرتا تھا، یہاں کار کے اندیشے سے کوتوال پتلا ہو گیا۔ خدا کے حضور سربسجود ہوا میں اُس کی طرح اپنی بی بی کو ساتھ لیے پیدل واپس نہ آیا۔ ناچار بادشاہ سلامت کے توسط سے قاضی القضاۃ کے گھر رابطہ کیا تو حکم اُدھر سے قاضی الحاجات سے رجوع کرنے کا ہوا۔ کس واسطے کہ قاضی القضاۃ چند گھنٹے قبل ساتھ اپنے دو مصاحبوں کے ایک حساس علاقے سے گزرتے ہوئے گزر گئے۔ اب جنازہ اُن کا تیار ہے۔ یوں رمضان کے ساتھ قاضی جی بھی تمام ہوئے۔ شاید بول بالا حق و انصاف کا تمہاری زمین پر کرنا چاہتے ہوں گے۔ اُن کے دادا بھی قتل ہونے کو غزنی سے امرتسر آئے

کتاب ایک صاحب کو دکھائی کہ علوی صاحب ہمارے، ہم مشرب و ہمراز ہیں۔ کہنے لگے، ”مقدمہ کتاب کا پڑھ کر نہ مصنف کی زبان کا پتا چلتا ہے، نہ نشاندہی کچھ علاقے کی ہوتی ہے۔ کسی ادبی دبستان سے تعلق اور اَدبی تحریک سے وابستگی بھی صیغۂ راز میں ہے۔ بھائی! ہم تو انسانوں سے علاقہ رکھتے تھے، جن لوگوں نے انگریز سے علاقہ رکھا، وہ آج بڑے بڑے علاقے رکھتے ہیں! میں جو جانتا تھا، توضیح کر ڈالی۔ وہ پھر بھی بضد رہے کہ زبان و علاقہ مل گیا، مسلک پہ اب بھی احتمال ہے۔ حقیقت کُھل جاوے تو مَیں رائے دینے کو تیار ہوں، فی الحال اپنی راہ لو۔

افسوس ہوا دنیا سے چلتے وقت اپنے جاننے والوں کے کوائف بھی صحیح طرح جمع نہ کیے۔ کیا ہی اچھا ہو تم اپنے بارے میں سب کچھ تحریر کر دو، بلکہ میرا مشورہ ہے اگر تمہاری کوئی معاشرتی حیثیت ہو تو تفصیل اُس کی بھی لکھ بھیجو۔ اپنے منشی ایاز شیخ کے کلام کی خوبیاں فائز اُن کے بڑے عہدے پہ ہونے تلک بناتُ النّعشِ گردوں کی طرح دن کے پردے میں نہاں رہیں، جب کہ تمہیں تو ابھی ٹھیک سے لکھنا بھی نہیں آتا۔ پھر بھی کیا عجب ہے تمہاری معاشرتی حیثیت کے سبب یہ سب خامی ’پی آر‘ سے مبدّل ہو جائے۔ یہ تم ’پی آر‘ کا انگریزی نژاد لفظ پڑھ کر چونک کیوں گئے؟ بھائی میرے! یہ ایک ریلوے کمپنی کا اختصار ہے، جس کی گاڑی، دیر سے سہی مگر آگے کو چلتی ہے۔ کچھ تم کسی کو دو گے، کچھ کوئی تمہیں دے گا۔ تمہاری جیسی غیر محفوظ کتابیں لکھنے والے ’پی آر‘ کے بل بوتے پر شہرت حاصل کر لیتے ہیں۔ یا پھر تمہاری بی بی اور جیب اجازت دے تو اپنے اعزاز میں توسط سے کسی اَدبی انجمن کے شام ایک منعقد کرا لو۔ خیال رہے انجمنیں اس نوع کی تمہارے ہاں بہت ہیں۔ مگر بھائی! ایک بات تم میری سن لو، مقام اس طرح سے حاصل کیا ہوا دیرپا نہیں ہوتا۔ بس ’یار زندہ شہرت باقی!‘ اور ہاں ریل گاڑی اپنے وقتوں کی دیکھ کر حیرت ہوئی، ملک تمہارا ٹوٹ گیا، پہ یہ اب تلک جوں کی توں ہے۔

ایک بات اور ہے اور وہ محلِ غور ہے۔ روانگی سے دو روز قبل ایک نوجوان شاعر قطعؔی ناگپوری کے پندرہ شعری مجموعوں کی اجتماعی تقریبِ رونمائی منعقد ہوئی۔ نام سے قطعہ کے شاعر معلوم ہوتے تھے، مگر کلام اُن کا دیکھ کر اندازہ ہوا غزل کہتے ہیں۔ عقل میری دیکھو، دعوت نامہ تقریب کا پڑھ کر دھیان میرا شادی کی تقریب کی طرف چلا گیا اور میں کتابوں کی رونمائی کی رسم کو دلہن کی منہ دکھائی کی رسم سمجھ بیٹھا، جس میں کچھ نقدی خاوند کے رشتہ دار دلہن کو اپنا منہ دکھانے کی دیتے ہیں کہ

دوسروں کی بہو بیٹیوں کو دیکھنے کا مہذب طریقہ یہی ہے! کتابوں کی تقریبات کے لیے رونمائی کی بجائے 'خود نمائی' کی ترکیب استعمال ہو تو بہتر ہو۔ اس سے تقریب کا اصل پس منظر سامنے آجائے گا۔ ناچار صاحبِ خانہ کی ضد پر مَیں وہاں چلا گیا۔ تبصرہ نگار اور نقاد تمہارے وہاں بڑے بڑے موجود تھے۔ معیار اور اُدب کو پسِ پشت ڈال انہوں نے نہایت اُدب سے دعوت کا حق ادا کیا تا آئندہ بھی ملتی رہے اور وہ زندہ رہ سکیں۔ آفرین صد آفرین! اُس کل کے لونڈے کو چوٹی کا شاعر قرار دیتے ہوئے اُس کے کلام کی وہ وہ خوبیاں گنوائیں اور ایسے ایسے فنی محاسن نکالے جو مجھے میرے کلام میں ڈھونڈے سے نہ ملیں گے۔ کیوں صاحب! تمہارے ہاں ادبی چوٹیاں کیا اتنی نیچی ہوگئی ہیں کہ ہر کوئی انہیں بآسانی سر کر لیتا ہے! اور تو اور کئی ضرب المثل اشعار میرے بھی نقل کیے، اُن موضوعات پر اُس نوجوان کے کہے گئے اشعار کو بہتر ثابت کرنے کو میرے اکثر اشعار عادت اور واقعہ کے خلاف تھے۔ میں نادم ہو کر وہاں سے چلا آیا۔ ہاں، سیٹ شاعر کی پندرہ کتابوں کا جو اُس کی مشہوری اور میری بدنامی کو دس کتب کی قیمت میں دستیاب تھا، اکتسابِ فن کے لیے ساتھ لیتا آیا۔ بھائی! اگر بارِ خاطر نہ ہو تو میرے شاگرد الطاف حسین حالی کی کتاب 'مقدمہ شعر و شاعری' کا ایک نسخہ، ہمراہ عروض کی چند کتابوں کے، مجھے روانہ کر دو، تا کہ ان کی روشنی میں مَیں اپنے کلامِ مہمل پر نظرِ ثانی کر سکوں۔ اس باب میں کچھ ایسی جلدی نہیں، یہ تم کو خیال رہے۔

سنیچر بار 23 جون 1997ء

از اسد اللہ

* *

اپنا انتقال!

ایس ایچ جعفری

ایک وقت تھا کہ جب اپنے انتقال کے خیال سے دل آزردہ خاطر ہو جاتا تھا۔ دراصل اپنے مرنے کا کچھ ایسا غم نہ تھا، بس اپنی بیوی کی بیوگی اور چھوٹے چھوٹے بچوں (ایک آٹھ سال، دوسری چار اور تیسرا دو سال کا تھا) کی یتیمی کے ڈر سے آنکھیں نم ناک ہو جاتی تھیں اور تصور میں کچھ اِس قسم کا سین آتا تھا:

دروازے کی گھنٹی بجتی ہے اور بڑا بیٹا دروازہ کھولتا ہے۔ سامنے ایک اجنبی ہوتا ہے، جو پوچھتا ہے:

”جعفری صاحب کا گھر ہے؟“

بیٹا: ”جی۔“

اجنبی: ”گھر میں ہیں؟“

بیٹا: ”جی نہیں، باہر گئے ہوئے ہیں۔“

اجنبی: ”گھر میں... میرا مطلب ہے کہ آپ کی والدہ ہیں؟“

بیٹا: ”جی، وہ ابھی باتھ روم میں ہیں۔ ایک گھنٹے میں نکل آئیں گی۔“

اجنبی: ”اور کوئی بڑا بوڑھا گھر میں ہے؟“

بیٹا: ”نہ بڑا ہے، نہ بوڑھا ہے، بس میری چھوٹی بہن اور اُس سے بھی چھوٹا بھائی ہے۔“

اجنبی: ”اُفوہ! مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کے والد گزر گئے ہیں۔“

بیٹا: ”یہ ’گزر‘ کہاں ہے اور وہاں سے کب واپس آئیں گے؟“

اجنبی: میرا مطلب یہ ہے کہ فوت ہو گئے ہیں۔‘‘

بیٹا: ’’فوت کیا ہوتا ہے؟‘‘

اجنبی: (قدرے پریشان ہو کر) ’’افسوس ہے کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔‘‘

بیٹا: ’’یہ تو اچھی بات ہے۔ آپ کو افسوس کیوں ہے؟‘‘

اجنبی: ’’میاں! تمہارے ابا کو اللہ میاں نے بلوا لیا ہے۔‘‘

بیٹا: ’’بینک کا کوئی کام ہوگا۔‘‘

اس دوران میری بیوی، جنہوں نے گھنٹی کی آواز غالباً سن لی تھی، آ جاتی ہیں اور پوچھتی ہیں، ’’کون ہے؟ کیا بات ہے؟‘‘

بیٹا بول پڑتا ہے: ’’انکل کہہ رہے ہیں کہ ابا کو اللہ میاں نے بلا لیا ہے۔‘‘

بیوی: ’’کیا فضول بات کر رہے ہو!‘‘

اجنبی: ’’مجھے افسوس ہے، محترمہ! لیکن یہ حقیقت ہے۔‘‘

بیوی: ’’یہ نہیں ہو سکتا، صبح وہ بالکل ٹھیک تھے۔ آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ دو گھر چھوڑ کر ایک اور جعفری صاحب رہتے ہیں، جو کافی دنوں سے بیمار تھے، اُن کا انتقال ہوا ہوگا، یا ممکن ہے کہ سامنے والے صاحب ہوں۔‘‘

اجنبی: ’’مجھے افسوس ہے محترمہ!‘‘

بیوی (بات کاٹ کر): ’’کیا مجھے افسوس ہے، مجھے افسوس ہے کہ رَٹ لگا رکھی ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ابھی میرے بچے اتنے چھوٹے ہیں کہ وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ نہیں نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا!‘‘

اجنبی: ’’بہن! صبر کیجیے، اللہ کی یہی مرضی تھی۔‘‘

بیوی زور سے ’’نہیں! نہیں!‘‘ کی چیخ مار کر بے ہوش ہونے لگتی ہے۔ اتنے میں ایک پڑوسن آتی ہے اور پوچھتی ہے، ’’خیر تو ہے؟‘‘

بیوی (ابھی بے ہوش نہیں ہوئی تھی): ’’میں لُٹ گئی!‘‘ اور زور سے اپنا چوڑیوں والا ہاتھ

دیوار پر مارتی ہے (دیوار کا پلاسٹر نکل کر گر جاتا ہے۔ چوڑیاں سونے کی تھیں، اُن پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ اب بیوی نیم بے ہوشی کے عالم میں ‘‘ایسا نہیں ہوسکتا! وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے!’’ کی تکرار کر رہی ہے۔ اِس مقام پر آ کر میری آنکھیں بیوی کے شدتِ غم کے احساس سے نم ناک ہوجاتی تھیں۔ بچے پریشان ہوکر پوچھتے ہیں، ‘‘امی! کیا ہوا؟’’)

لوگ گھر میں جمع ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ بیٹی اپنے بھائی سے پوچھتی ہے، ‘‘انکل آنٹی لوگ آرہے ہیں، برتھ ڈے پارٹی ہے کیا؟’’ بیٹے کو ماں کو رونے سے لگتا ہے، معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ کہتا ہے، ‘‘پارٹی نہیں ہے لوگ ابا کو دیکھنے آرہے ہیں۔ اُن کا اِنتقال ہوگیا ہے۔’’

اب غسل دے کر میت ٹیوی لاؤنج میں رکھی جاتی ہے۔ بیٹی پوچھتی ہے، ‘‘ابا کوٹ "Cot" میں کیوں لیٹے ہیں اور یہ کپڑے کیسے پہنے ہوئے ہیں؟’’ بیوی بچوں کو لپٹا کر کہتی ہے، ‘‘ہم لوگ لُٹ گئے! تم یتیم ہوگئے! یہ پہاڑ جیسی زندگی کیسے گزرے گی؟’’ (اِس مقام پر آ کر میرا بھی دل بھر آتا تھا)۔ بالآخر بیوی بے ہوش ہوجاتی ہے، لوگ پانی کا چھینٹا وغیرہ دیتے ہیں۔ اِس دوران رونے کا مقابلہ شروع ہوچکا ہوتا ہے اور کچھ خواتین تو اِتنے خوف ناک چہرے بناتی ہیں کہ اگر دیکھ لے تو مردہ بھی دوڑ بھاگے۔

اپنے انتقال کا خیال اب بھی گاہے بگاہے آتا ہے، لیکن محض عام سی باتوں کی طرح دل کی اب وہ کیفیت نہیں ہوتی، جیسی چند دہائیاں پہلے ہوا کرتی تھی، شاید اِس لیے کہ بچے بڑے ہوگئے ہیں اور اِس مرحلے پر آ کر باپ کے گزر جانے سے بچے یتیم نہیں کہلاتے! یا پھر ممکن ہے کہ جذبات میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔ اب جو منظر ذہن میں آتا ہے، وہ کچھ یوں ہے:

خبر آتی ہے کہ میں اِس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ بیوی چیخ اُٹھتی ہے، ‘‘نہیں نہیں! ایسا نہیں ہوسکتا! وہ ایسا نہیں کرسکتے! اُنھیں معلوم تھا کہ منگل کو میرے پسندیدہ پروگرام آتے ہیں۔ اب لوگ آنا شروع ہوجائیں گے، میں 'اَنا کشری' کیسے دیکھوں گی؟ اور آج حسینہ معین کے ڈرامے کی بھی آٹھویں قسط ہے، ہائے ہائے! کیا کروں؟ وی سی آر بھی تو کام نہیں کر رہا۔ کب سے کہہ رہی تھی بنوا دیجیے۔ اگر میری سن لیتے تو مجھے یہ دن کیوں دیکھنا پڑتا! اب کس سے کہوں؟ اِن کے یہاں سوئم کے چونچلے بھی ہوتے ہیں۔ جمعے کا بھی سارا پروگرام غارت ہوا!’’

یوں ہی خیال آیا کہ اپنے مرنے کی ساعت کا اگر پہلے سے علم ہوتا تو لوگ اِس موقع کے لیے بھی دعوت نامہ چھپواتے، جو کچھ یوں ہوتا:

میرا انتقال

بتاریخ... بروز... ہونا قرار پایا ہے۔ پروگرام حسبِ ذیل ہے:
روانگی جلوس 1... بجے دوپہر... نماز 1½ بجے، بمقام سلطان مسجد
تدفین... 2½ بجے... طعام... 3 بجے

اگر یہی کارڈ بیوی کی طرف سے ہو تو:

’الحمدللہ! میرے شوہر ایس ایچ جعفری کا انتقال بتاریخ... بروز ہونا قرار پایا ہے‘۔ اگر وقت نکال کر میرے غم میں شریک ہو سکیں تو ممنون ہوں گی۔ ’الحمدللہ‘ لکھنے سے خوشی کا اظہار مقصود نہ سمجھا جائے۔ دراصل انسان اللہ کی امانت ہے اور انتقال اُس کے پاس واپسی کا ذریعہ ہے۔ غم میں شریک ہونا ضروری نہیں، بغیر اِس کے بھی شرکت کی جا سکتی ہے۔ مناسب سمجھیں تو چند رسمی لفظ اظہارِ ہمدردی کے ادا کریں اور کچھ سمجھ میں نہ آئے تو گول کر جائیں۔

نوٹ:

...... جو حضرات کسی شرعی یا غیر شرعی عذر کے باعث نماز میں شریک نہ ہونا چاہیں، وہ مسجد کے قریب ہی اپنا AC آن کر کے غزلوں، گیتوں سے لطف اندوز ہوں اور بعد میں جلوس میں شریک ہوں۔

...... جو حضرات طعام کے لیے تشریف لانا چاہیں، وہ پہلے سے لواحقین کو مطلع کر دیں، تاکہ بن بلائے آنے والوں کی وجہ سے شوربے میں پانی نہ ملانا پڑے۔

* * *

اعضائے رئیسہ اور سر

برق آشیانوی

انسان کے جسم میں کئی اعضا ہوتے ہیں، جن میں سے صرف چند ایسے ہوتے ہیں، جن کو اعضائے رئیسہ کی سند عطا فرمائی گئی ہے۔ ان اعضائے رئیسہ کی تعداد کسی حکومت کی کابینہ کے وزرا کی تعداد کی طرح نہایت ہی کم ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر کوئی وزیر اپنی وزارت سے مستعفی ہو جائے تو اس کا قلمدانِ وزارت کسی اور وزیر کے سپرد کر دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اعضائے رئیسہ میں سے کوئی عضوِ رئیس استعفیٰ دے دے (یعنی کام کرنے سے انکار کر دے) تو اس کا قلمدانِ 'ریاست' (رئیس کی مناسبت سے ریاست کا لفظ استعمال ہوا ہے) کسی دوسرے عضوِ رئیس کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔

جیسا کہ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے اعضائے رئیسہ کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے کہ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے بعض صورتوں میں تو گننے کے لیے صرف ہاتھوں کی انگلیاں ہی کافی ہو جاتی ہیں۔ ان میں بھی خاص طور پر بعض اعضائے رئیسہ کو دیگر اعضائے رئیسہ پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی مثال کے لیے بھی ہم قلمدان ہائے وزارت کو پیش کر سکتے ہیں مطلب یہ کہ بعض وزارتوں کے قلمدانوں کی حیثیت دیگر وزارتوں کے قلمدانوں سے ممتاز، اہم، وقیع اور با اختیار ہوتی ہے۔ اور بعض وزارتیں تو صرف وزارتیں ہوتی ہیں، جو جلسوں، مشاعروں، کلچرل پروگراموں یا مشاعروں کی صدارت کرنے یا عمارتوں کے سنگِ بنیاد رکھنے یا درخت اُگاؤ مہم کے موقعوں پر پودا لگانے کے لیے زیادہ موزوں و کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ ان مصروفیتوں کے بعد جو وقت بچ جاتا ہے وہ اضلاع کے دوروں میں صرف ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف بعض وزارتیں نہایت اہم ہوتی ہیں۔ زیادہ تفصیل اور مثالوں کی ضرورت ہم اس لیے نہیں سمجھتے کہ وزارتوں کی اہمیت اور فرق کو ہم جیسے غیر سیاسی آدمی کے مقابلے میں سیاسی شعور رکھنے والے عوام بآسانی سمجھ جاتے ہیں۔ ہم نے تو تمام

عمر سیاسی زندگی سے الگ تھلگ رہ کر گزاری ہے۔ حتیٰ کہ بعض سماجی انجمنوں میں بھی سیاست داخل ہوگئی تو ہم وہاں سے زمین پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے ہیں، کیوں کہ محاورے کے لحاظ سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا نہیں آیا، ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جب سے ہم نے بھاگنا سیکھا ہے تو زمین پر پاؤں رکھ کر ہی بھاگ رہے ہیں۔ دو ایک بار کوشش کی کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگیں، لیکن ہمارے پاؤں سر تک نہیں پہنچ سکے۔ اگر محاورے کا مطلب یہ ہو کہ پاؤں ہمارے ہوں سر دوسرے شخص کا تو ایسی جرأت کرنا بھی ہم سے نہ ہو سکا۔ غرض ہم نے وزارتوں اور قلمدانوں کی جو بات کی ہے تو وہ بھی اعضائے رئیسہ سے مماثلت کی حد تک ہے۔

اعضائے رئیسہ میں جن اعضا کو امتیاز اور اہمیت حاصل ہے اُن میں دل، دماغ، سر، جگر، معدہ وغیرہ ہیں۔ اُن کے بعد آنکھ، ناک، کان، گردے وغیرہ ہیں۔ دل، دماغ، سر اور جگر (مراد آبادی نہیں) کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک عضو کابینہ سے استعفیٰ دے دے تو کوئی دوسرا عضو اس کا قلمدان نہیں سنبھال سکتا۔ البتہ ایک کان، ایک آنکھ، ایک گردہ یا ایک پھیپھڑا استعفیٰ دے دے تو دوسری آنکھ، دوسرا کان، دوسرا گردہ یا دوسرا پھیپھڑا قلمدان 'ریاست' کو سنبھال لیتا ہے۔ خود ہمارے گردے نے بغاوت کی تو اس کا کابینہ ہی نہیں، بلکہ پارٹی سے بھی خارج کردیا گیا۔ اس لیے کہ اس نے پتھروں کا ایک ذخیرہ جمع کر رکھا تھا اور کسی وقت بھی دوسرے اعضائے رئیسہ پر پتھراؤ کرسکتا تھا۔ اس کو ڈاکٹروں نے ناقابلِ برداشت قرار دے کر عمر بھر کے لیے انتخابات میں حصہ لینے سے محروم کرکے پارٹی یعنی جسم سے خارج کردیا۔ چنانچہ وہ گمنامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دے کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ ہم نے اس کو بہت سمجھایا کہ سیاسی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرکے ہماری طرح گوشۂ گمنامی میں گزارے، لیکن اس نے نہ مانا اور ہماری جان کے درپے ہوگیا تھا، جو ہم برداشت نہ کرسکے۔ اور اس کو نکلوا کر پھینکوا دیا، جس کے بعد ہماری زندگی میں سکون اور امن قائم ہوگیا۔

انسان کے جسمانی نظام میں اعضائے رئیسہ کے علاوہ اعضائے غریبہ بھی ہوتے ہیں۔ ان دونوں طبقوں کے درمیان ایک طبقہ اعضائے متوسط کا بھی ہوتا ہے۔ اعضائے غریبہ کی نہ کوئی حد ہوتی ہے نہ کوئی حساب۔ یہ تو سر کے بالوں کی طرح بے شمار ہوتے ہیں۔ ویسے مردم شماری میں ان کی تعداد درج کرلی جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا شمار بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ سر کے

بالوں کا۔ اعضائے غریبہ کی فکر، اعضائے رئیسہ کو ہمیشہ دامن گیر رہتی ہے۔ چنانچہ ہر وقت ان کی کسمپرسی اور خستہ حالی پر نظر رکھتے ہیں، صرف نظر رکھتے ہیں، نظر کے علاوہ کچھ اور رکھنا مصلحت کے خلاف ہوتا ہے۔ البتہ اعضائے متوسط ہمیشہ ہماری طرح معلق لٹکتے رہتے ہیں۔ اعضائے رئیسہ ان کو اعضائے غریبہ میں شمار کرتے ہیں اور اعضائے غریبہ انہیں اعضائے رئیسہ میں گنتے ہیں۔ چنانچہ یہ نہ اِدھر کے رہتے ہیں اور نہ اُدھر کے، بلکہ چمگادڑوں کی طرح زندگی کی شاخ پر اُلٹے لٹکے رہتے ہیں۔

اعضائے رئیسہ کی اس تقسیم کے بعد ہم اعضائے رئیسہ میں سے ایک نہایت ہی اہم عضوِ رئیس کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اس عضوِ رئیس کا نام ہے 'سر'۔ 'سر' وہ عضوِ رئیس ہے، جس کے کسی ادنیٰ اشارے کے بغیر دیگر تمام اعضائے رئیسہ بھی کوئی کام نہیں کر سکتے اس لیے کہ سر میں دماغ ہوتا ہے اور دماغ میں عقل۔ چنانچہ سر کو اعضائے رئیسہ کا صدر، رہنما یا پیشوا جو بھی ہو کہا جا سکتا ہے۔ ہماری اس گفتگو کو ملا حجر الیہود بہت دیر تک غور سے سنتے رہے اور سر کا ذکر آتے ہی انہوں نے اپنی پوری عالمانہ شان کے ساتھ فرمایا۔

"میاں! یہ انگریز بھی بڑے ذی فہم اور عقل مند ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ کسی دانشور ادیب! شاعر کو جب کوئی خطاب دیتے ہیں تو 'سر' کا خطاب دیتے ہیں، دل، جگر وغیرہ کا خطاب نہیں دیتے۔"

ہم ان کی عالمانہ گفتگو کو سن کر یا تو سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں یا پھر پائے تسلیم کو سرِ تسلیم پر رکھ کر بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں، جس میں ہم آج تک کامیاب نہیں ہو سکے۔ چنانچہ اس وقت بھی ہم نے صرف سرِ تسلیم سے کام لیا۔ پائے تسلیم کو اپنی جگہ پر ہی رہنے دیا اور تقریر جاری رکھتے ہوئے عرض کیا۔

غرض اعضائے رئیسہ میں 'سر' سب سے بڑا عضوِ رئیس ہے۔ اس لحاظ سے اس کو رئیس اعظم بھی کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سر میں دماغ ہوتا ہے، جس کو عرفِ عام میں بھیجا کہا جاتا ہے اور عرف خاص میں 'مغز' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سر میں 'بھیجا' ہوتا ہے اور بھیجے میں عقل جو موٹی بھی ہوتی ہے اور دبلی بھی ہوتی ہے۔ موٹی عقل کے مقابلے میں دبلی عقل زیادہ کار آمد سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے کہ بہت دُور تک دوڑ سکتی ہے، اور بہت تیز دوڑتی ہے۔ ہر سر میں بھیجا ضرور ہوتا ہے، لیکن ہر بھیجے میں عقل کا ہونا ضروری نہیں۔

بعض لوگوں کے سر میں بھیجا ہوتا ہے، لیکن اس میں عقل نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کو فوج میں آسانی سے ملازمت مل جاتی ہے۔ بعض لوگوں کے سر میں بھیجا بھی ہوتا اور عقل بھی، لیکن وہ عقل سے کام نہیں لیتے، بلکہ عقل کے پیچھے ڈنڈا لے کر دوڑتے ہیں۔ ایسے لوگ پولیس اور جیل کی ملازمت کے لیے کار آمد ہوتے ہیں، جن کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک ڈنڈا (غلام سرور ڈنڈا نہیں) بھی ہوتا ہے۔ ایسے بھی لوگ ہیں، جن کے سر میں بھیجا ہوتا ہے بھیجے میں عقل ہوتی ہے اور وہ عقل سے کام بھی لیتے ہیں۔ ایسے لوگ پروفیسر، لکچرار یا ٹیچر ہو جاتے ہیں، جن بھیجوں میں عقل کی مقدار ضرورت سے کچھ زیادہ ہوتی ہے وہ بیرسٹر یا ایڈووکیٹ ہو جاتے ہیں۔ اس پیشے کے لیے قانونی ڈگری کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن اگر کسی بدبختی کی وجہ سے قانونی ڈگری حاصل کرنے میں چاقو دکھا کر بھی ناکام ہو جاتے ہیں تو وہ کسی اخبار یا ماہ نامے کے ایڈیٹر بن جاتے ہیں۔ بعض بھیجوں میں عقل لچکدار ہوتی ہے تو وہ لیڈر بن جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں کئی اور قسم کے سر اور بھیجے ہوتے ہیں، جن میں عقل کی مقدار ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ مقدار کی مناسبت سے تجارت، ملازمت یا زراعت جیسے پیشے اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک طبقہ اُن لوگوں کا ہے، جن کے بھیجوں میں عقل ہمیشہ بیدار رہتی ہے اور دن کا آرام اور رات کی نیند حرام کر دیتی ہے۔ اگر عقل روتی اور آنسو بہاتی رہتی ہے تو یہ لوگ سنجیدہ شاعر یا ادیب بن جاتے ہیں اور اگر مسکراتی اور ہنستی رہتی ہے تو ایسے لوگ مزاح نگار ادیب یا مزاح گو شاعر بن جاتے ہیں۔ ان تمام طبقوں کے علاوہ ایک نہایت ہی عجیب الخلقت طبقہ ایسا بھی ہے، جس کے سر میں بھیجا تو ہوتا ہے، لیکن نہ معلوم قدرت کی کیا مصلحت ہے کہ اُلٹا رکا ہوتا ہے۔ اس طبقے کے بارے میں کچھ عرض کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ اس لیے کہ آج کل ہماری بیوی بھی ہمارے مضامین شوق یا دلچسپی سے نہیں، بلکہ جستجو سے پڑھنے لگی ہیں۔

سر میں بال ہوتے ہیں (سبحان اللہ ہم نے بھی کیا نئی بات بتائی ہے) اور یہ بلالحاظ صنف پر سر میں ہوتے ہیں۔ یعنی مردوں اور عورتوں کے سروں میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ اس حد تک تو قدرت نے ہر دو اصناف کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے، لیکن ڈاڑھی اور مونچھ کی حد تک عورتوں کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا گیا اور انہیں اس 'نعمت' سے محروم رکھا گیا۔ جس کی وجہ سے عورتیں مردوں کی طرح ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنے اور مونچھوں پر تاؤ دینے کے قابل نہیں رہیں۔ اور مجبوراً انہیں دست پناہ اور بیلن کا سہارا لینا پڑا۔ اگر عورتوں کو بھی ڈاڑھی اور مونچھوں کی نعمت سے

سرفراز فرمایا جاتا تو شعراء جس طرح اپنے محبوب کے ابروؤں کی کمانوں اور گیسوؤں کی درازی کی تعریف کرتے ہیں۔ اسی طرح مونچھوں کے تاؤ اور ڈاڑھی کی درازی کی تعریف کرتے۔ عورتیں بھی جنھوں نے سر کے بال جمانے اور کٹانے میں نت نئے فیشن ایجاد کیے ہیں اس سے زیادہ ڈاڑھی سنوارنے کے دلکش اور دلفریب فیشن ایجاد کرتیں۔

بعض لوگوں کے سروں میں بال کم ہوتے ہیں اور بعض لوگوں کے سروں میں بالکل نہیں ہوتے۔ جن سروں میں بال بالکل نہیں ہوتے ایسے سر گنجے کہلاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سروں میں بالوں کا نہ ہونا بڑے آدمی ہونے کی علامت ہے۔ ہمارے سر سے تین چوتھائی بال غائب ہو چکے ہیں، لیکن ہم ایک چوتھائی بھی بڑے آدمی نہیں بنے۔

وزن اُٹھانے کے معاملے میں بھی سر نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ حج بیت اللہ کے دوران جب ہم اپنے قافلے سے بچھڑ کر منیٰ کے بازار میں 'باسروں سامان' پھر رہے تھے (کیوں کہ ہمارے ساتھ ہمارا سر ہی تھا اور اس پر سامان بھی) تو ہمارا سر بہت مفید ثابت ہوا اس لیے کہ صبح سے دوپہر تک ہم اپنا سامان یعنی بستر اور سوٹ کیس اپنے سر پر لادے اپنے کیمپ کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ ویسے کبھی کبھی اپنے شانوں پر بھی رکھ لیتے تھے، لیکن سر پر رکھ لینے میں جو آرام اور لطف آتا تھا۔ وہ شانوں پر لے کر پھرتے میں نہ تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے سر پر 'سامان کا سایہ' دھوپ کی شدّت سے بچنے میں بھی معاون ثابت ہوا۔ آخر میں جب ہم اپنے مسائل سے فارغ ہو کر حرم پہنچے تو سب سے پہلے فاروق سیف الدین کے حق میں درازیٔ معلمی و معلوفی کی دعا مانگی اور اپنے لیے دعا مانگی کہ یا اللہ ہمارا حج قبول فرما۔

* *

ضرورت ہے... ایک صدر کی!

بھارت چند کھنہ

مبادا کہ عنوان سے کسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہو یہ بات شروع میں ہی واضح کر دی جاتی ہے کہ اس عنوان کا تعلق کسی ترقی یافتہ یا پس ماندہ ملک کے صدر کے چناؤ سے نہیں، کسی سرکاری، غیر سرکاری، ترکاری، ریزگاری یا ریاکاری فروشوں کی انجمن کے صدر کے انتخاب سے بھی نہیں ہے۔ بلکہ موضوع کا تعلق ایسے صدور سے ہے، جن کو کسی ادبی جلسہ کسی تہذیبی محفل، کسی مشاعرہ، کسی شامِ غزل، کسی شبِ بہاراں، کسی کتاب کے رسمِ اجرا، کسی دانشور کو جس کی کشتیٔ حیات بحرِ فنا میں ڈوبنے ہی والی ہو خراجِ عقیدت پیش کرنے یا پھر کسی رنگارنگ پروگرام کے موقعہ پر صدر بنا کر جلسہ میں کسی اصلی دلہن کی طرح بٹھا دیا جانا مقصود ہو، جس میں یہ صدر خاموش، غمگین، شرمسار، لاچار آنکھوں میں نیند کا غبار سنبھالے جملہ ستم رانیوں کو اپنی کرنی کا پھل سمجھ کر، سہتا ہوا چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ اس کی نازبرداری کے سلسلے میں پانی کا ایک گلاس (گلاس صاف ستھرا ہونا ضروری نہیں) اس کے سامنے دھر دیا جاتا ہے، تا کہ اس کو صرف خون کے گھونٹ ہی پینے پر اکتفا نہ کرنی پڑے۔ البتہ اس کو اس بات کی پوری پوری آزادی ہوتی ہے کہ:

تھک جائے جو اِک پہلو تو وہ پہلو بدل ڈالے

مگر بانیانِ جلسہ اس بات کی کیا گارنٹی فراہم نہیں کرتے کہ صدارت کے فرائض ادا کرتے ہوئے اکڑ جانے کے بعد صاحبِ صدر کا جوتا چپل اسی جگہ پر جہاں وہ اس سے رخصت ہوئے تھے۔ ان کا انتظار کرتا، ان کی طرح اپنی رکھی ہوئی جگہ پر رکھا مل جائے گا۔ کیوں کہ ایسے جوتوں کے انتظار میں اُردو کے کئی آبلہ پا شیدائی، ہاتھ کی صفائی دکھلاتے ہوئے اپنے دکھتے پیروں کی حفاظت کا اہتمام اور بد بخت صدر کی اپنے جوتے سے محرومی کا پکا انتظام کر دیتے ہیں اور پھر یہ ظالم

صاحبِ صدر کی پریشانی کی کیفیت کو دُور سے دیکھنے کے لیے جلسہ کے اختتام تک موجود بھی رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے تجربہ کار صدر در بوقتِ صدارت اپنے جوتوں کو اپنی صدری کے اندر کچھ ویسی ہی احتیاط سے سینے سے لگائے رکھتے ہیں، جس طرح الہ دین کے قصہ کا جادوگر طلسمی چراغ کو سنبھالے رکھتا ہے۔ البتہ یہ کیفیت کسی وی آئی پی کے ساتھ پیش نہیں آسکتی۔ کیوں کہ موصوف کے جوتے اُتارتے ہی اُن کا پرسنل اسسٹنٹ، پرسنل اٹنڈنٹ کے فرائض سنبھالتے ہوئے ان پر جھپٹ کر گرتا ہے اور ان کو اپنی پرسنل کسٹڈی میں لے لیتا ہے۔

یہ ایسے جلسے ہوتے ہیں، جو معشوق، دھوبی، درزی، یا جاکی کے وعدوں کی طرح کبھی وقت یا تاریخِ اعلان کردہ منعقد نہیں ہوتے، جن کے بارے میں اعلانات چھپواتے وقت بانیانِ جلسہ کے کسی قلم تراش قسم کے انسان کے دماغ میں جلسہ کا، جو کبھی بھولے سے بھی اعلان میں عظیم الشان قسم سے کم درجے کا نہیں ہوتا، ایک موہوم و مبہم سا خاکہ ہوتا ہے، ایک طرح کی کانپتی ہوئی پرچھائیں، ایک بھٹکتا ہوا سا خیال، جلسہ منعقد کرنے کی ایک آرزو! بس یوں سمجھیے کہ کسی شخص کے دل میں کوئی خواہش پیدا ہوئی، قلم حرکت میں آیا اور ایک اعلان جاری ہو گیا۔

اس اعلان میں مقام، تاریخ، وقت اور سال کا قطعی تعین نہیں ہوتا، بلکہ مبہم سے اشارے ہوتے ہیں۔ پھر یہ سوچ شروع ہوتی ہے کہ جلسہ گاہ کون سی ہوگی یا ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں کانفرنس ہال کے خیال، اسمبلی کی چھت، شہرِ نگاراں کا سب سے بڑا تھیٹر اس کا سب سے وسیع اور شاندار اسٹیڈیم، شادی گھروں، کالج کے میدانوں، سرائے خانوں، خانقاہوں، مندروں کے پچھواڑوں، درگاہوں کے احاطوں، ہوٹلوں کے تہہ خانوں، فیکٹریوں کے گوداموں، مرغزاروں اور زیارت گاہوں کے محلِ وقوع ذہن میں آتے ہیں۔ جب یہ سب مقامات پیشگی ہی سارے سال کے لیے بک ہو چکے ہوتے ہیں اور ان کو کسی وسیلہ سے بک نہیں کیا جاسکتا تو تان کسی پراچین بارہ دری پر ٹوٹتی ہے، جس کے باروں دروازے اس کی صدیوں پرانی شان و شوکت کی یاد میں تڑپ تڑپ کر ایسے ٹوٹے پھوٹے آرتھرائٹس کے مریض کے جوڑ، جو ہلکے سے ہوا کے جھونکے سے بھی لرزنے لگتے ہیں۔ اور جن میں سے ایسی آوازیں پیدا ہوتی ہیں جیسی کسی ہندوستانی دہشت انگیز فلم کے ایسے وحشت ناک سین میں سنائی دیتی ہیں جس میں ازلی بے وقوف ہیروئن، پیدائشی چالاک ولن کے جھانسوں میں آکر کسی انتہائی اندھیری رات کو کسی بھوت بنگلے میں ہیرو سے ملاقات

کرانے کا یقین دیے جانے پر بھاگم بھاگ پہنچ جاتی ہے اور بنگلے میں سے آنے والی خوفناک آوازوں کو سن کر بے تحاشا چیخیں مارنے لگتی ہے اور جب تھک جاتی ہے تو کوئی خون منجمد کر دینے والا دردناک فلمی گانا شروع کر دیتی ہے۔ ان ہولناک آوازوں کو سن کر سنیما ہال میں بیٹھے بچے ماؤں کی چھاتیوں سے چمٹ جاتے ہیں اور مائیں سمٹ کر اپنے احمق شوہروں کے شانے تھام لیتی ہیں۔ ایسے جلسہ گاہ میں اگر جلسہ شروع ہونے سے عین پہلے برقی آف ہو جائے تو جلسہ میں بھی خوف کی لہر پھیل جاتی ہے۔ گھپ اندھیرے میں کچھ بانیانِ جلسہ آپس میں گفتگو اور تکرار سے گزرتے ہوئے، جوتم پیزار پر اُتر آتے ہیں کہ فلاں ابن فلاں نے ہمارے موجودہ برقی انتظام کی برکتوں کو جانتے ہوئے بھی اخراجات میں انتہائی کفایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے پیٹرومیکس کا انتظام بھی احتیاطاً رکھنے سے سب کو باز رکھا تھا۔ بانیانِ جلسہ کی خوش قسمتی اس میں ہوتی ہے کہ یہ سارا ایکشن اندھیرے میں انجام پاتا ہے اور اس کو فلمانے کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا۔ اس افراتفری کی کیفیت میں بعض تجربہ کار منتظمین صدر جلسہ کو جا کر تھام لیتے ہیں کہ کہیں وہ مٹی کا مادھو ڈر کے مارے جلسہ سے فرار نہ ہو جائے اور جس کی غیر موجودگی کو پٹرومیکس، ویکس کی بتی، اگربتی یا چائے کی پتی بھی پورا نہ کر سکے۔

بات جو انتخابِ صدر کے تعلق سے شروع ہوئی تھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی انتخابِ صدر کا مسئلہ، اگرچہ اس کو کوئی خاص کام انجام دینا نہیں ہوتا اس کے روایتی مقام کے باعث بہت اہم ہوتا ہے۔ اوّلاً کسی ناش (ن۔ الف۔ شین) یعنی نہایت اہم شخصیت کی تلاش شروع ہوتی ہے۔ مقصد بسا اوقات صرف جلسہ کی زینت ہی نہیں ہوتا، بلکہ کسی منتظم جلسہ کے پیشِ نظر کسی اٹکی ہوئی فائل کا نکلوانا، کسی فراموش شدہ سڑک کی مرمت، بجلی کا کنکشن، بلدیہ ٹیکس کو جو کسی مکان کو کسی بلدیہ کے منتظم نے محل سمجھ کر عائد کر دیا ہو کم کروانا، کسی مقام پر پانی کی سربراہی یا ایسی ہی بعض مصیبتوں سے چھٹکارا پانا ہوتا ہے۔ اس لیے صدارت کے لیے ناموں کا گانٹھنا محض تعارف حاصل کرنے یا ربط پیدا کرنے کے مقصد سے کیا جاتا ہے اور جلسہ کے بعد شخص متعلقہ کوئی موقع پا کر راست برسرِ مطلب آ جاتا ہے۔ خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ جب کوئی اہم شخصیت صدارت کرنا قبول فرما لیتی ہے تو پرسنل اسسٹنٹ بعض صورتوں میں اہم شخصیت کی لمبائی بانیانِ جلسہ کو بتلا دیتا ہے، یہ اطلاع ہار کی موزونیت سے تعلق رکھتی ہے، کیوں کہ ایسا بھی ہو چکا ہے کہ جب کسی بہت اہم شخصیت کے لیے

ان کی اہمیت کے اعتبار سے بانیانِ جلسہ نے نہایت عظیم الشان قسم کا ہار پہنایا تو شخصیت کا قد ہار کی لمبائی سے ایک فٹ کم نکلا اور چوں کہ اس اہم شخصیت کو دس پندرہ قدم چل کر کسی تصویر کی نقاب کشائی کرنا تھا، اس لیے موصوف بائیں ہاتھ سے ہار کو اُٹھائے اس طرح قدم اُٹھا رہے تھے، جس طرح بارش میں عورتیں ساڑی کے نچلے حصہ کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے اُونچا اُٹھا کر چلتی ہیں۔ اور یہ ناپ کی بات اس وقت سے اور بھی اہمیت حاصل کر چکی ہے جب کسی ایسے ہی جلسہ میں منتظمین نے ایک نہایت عمدہ موٹا تازہ ہار صاحبِ صدر کی آرائش کے لیے بنوایا تھا، مگر جب جلسہ میں گلپوشی کی رسم انجام دی جانے لگی تو معلوم ہوا کہ صاحبِ صدر کی شخصیت اپنی اہمیت کی موزونیت کے اعتبار سے نہایت غذا گزیدہ تھی۔ سر پر ٹوپی کی بجائے ایک عظیم الشان پگڑ بندھا تھا، جو غالباً موصوف کو وراثت میں ملا تھا ورنہ فی زمانہ سر کو ڈھانپنے کے لیے اس قدر کپڑے کا استعمال امرِ محال معلوم ہوتا ہے، اس میں اس قدر کپڑا تھا کہ تمام بانیانِ جلسہ کے لیے ایک ایک کُرتا پاجامہ سلائی کرنے کے لیے کافی تھا۔ اور پھر شاید خدا کو یہی منظور تھا کہ وہ ہار ان کے سر کے محیط سے چھوٹا ثابت ہو، جس کے باعث پہلے تو صاحبِ صدر کا پگڑ سر سے کھسک کر ان کے قدموں میں آ رہا۔ پھر ان کی جٹائیں پریشان ہو کر ان کے چہرے پر نقاب کی شکل میں نمودار ہوئیں اور بالآخر ہار پہنانے کی کشمکش میں ہار کا دھاگا ٹوٹ گیا اور سرِ محفل صاحبِ صدر کے سر پر پھولوں کی بارش ہو گئی۔ اور صاحبِ صدر کسی پُرانے زمانے کے شاہی دربار کے مسخرے کی طرح حاضرین کے لیے تصویرِ فرحت بنے غصہ سے کانپتے کھڑے تھے۔ کیفیت یہ تھی کہ:

گھونگٹ کے تار رنگے گئے رنگِ عتاب میں

جب سے یہ واقعہ ہوا ہے بانیانِ جلسہ بطور احتیاط پھولوں کو ربر کی ڈوری میں پرو کر لاتے ہیں، تا کہ اگر بفرضِ محال ہار صدر جلسہ کے سر اور گردن کے محیط سے کم نکلے تو کم اَز کم ربر کی ڈوری کی مدد سے گلے میں ہار کی طرح تو نہ سہی، چوڑی کی طرح سر میں پہنا دیا جائے اور گردن میں پھانسی کے پھندے کی طرح پھنسا رہے۔

بے پناہ طور پر اہم شخصیتوں کو صدر بنانے میں ایک اور بڑی مصیبت جو مضمر ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ بسا اوقات سین سے یک لخت بغیر کسی اطلاع کے غائب ہو جاتے ہیں، بالکل اسی طرح

جس طرح کوئی مشکل کشا کسی دفتر میں دوسرے دن ملنے کا وعدہ کر کے اسی دن ایک ماہ کی رخصت پر بوریا بستر باندھ کر رفو چکر ہو جاتا ہے اور ڈیڑھ ماہ بعد طلوع ہوتا ہے۔ بہر حال، جلسہ میں یہ حال ہوتا ہے کہ حاضرین، مقررین اور منتظمین سب موجود، مگر صاحبِ صدر غیر موجود ہوتے ہیں۔ جب پون گھنٹہ انتظار میں گزر جاتا ہے اور مدعوئین شور وغل مچانے کے موڈ سے بڑھ کر اپنے دل میں کچھ اور ٹھانے نظر آتے ہیں تو صاحبِ صدر زیرِ بحث کے دفتر، دولت خانہ، خانہ ہارے دوستاں اور دوسرے اڈوں پر جہاں وہ بعض اوقات مل سکتے ہیں، ٹیلی فون کھڑکھڑائے جاتے ہیں۔ بعض مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر موصوف کو گھوڑوں کے چوک نزد پھسل بنڈہ، حیدر آباد میں صدارت کرنی تھی تو وہ اس وقت جنگل میں منگل منانے بھا کڑہ ننگل پہنچے ہوتے ہیں۔ اور بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ ان کی آمد و رفت کا جاننے والا ان کی حرکات و سکنات سے بالکل لاعلمی کا اظہار کرتا ہے۔ منتظمین جلسہ سر پیٹ لیتے ہیں اور جلسہ میں آکر سامعین کی صفوں میں سے کسی سادہ لوح انسان کو گلے میں ہاتھ ڈال کر اُٹھا لاتے ہیں اور ڈائس پر لا کر سامعین سے اس کا تعارف کراتے ہیں۔ اعلان کردہ صدر کی غیر موجودگی کے تعلق سے اپنے غم و غصّہ کو صدر مستور کی گوناں گوں مصروفیات، بھاری سرکاری، غیر سرکاری، معاشرتی اور جمہوری ذمہ داریوں کی چادر میں لپیٹ کر معافی مانگتے ہیں اور سامعین میں سے پکڑے ہوئے بکرے کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ موصوف کی صدارت میں ان کے جلسہ کی شان کچھ اور بڑھ جائے گی، کیوں کہ مسندِ صدارت پر ان کی موجودگی 'آمد' بمقابلہ 'آورد' کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد نئے صدر کو تالیوں کی گونج میں ہار پہنانے کی کارروائی سر انجام پاتی ہے۔

حاضرین کرام! خاکسار بیان کر چکا ہے کہ بعض اوقات صدرِ اعلان کردہ کی نقل و حرکت سے متعلقین اور غیر متعلقین ہر دو ناواقف ہوتے ہیں۔ ایسے ہی بیک گراؤنڈ میں اصلی صدر کے طلوع نہ ہونے پر جب سامعین میں سے پکڑے ہوئے مہرے کو صدارتی ہار پہنایا جا رہا تھا تو عین اس وقت اصل صدر صاحب نہ معلوم کہاں کہاں سے بھٹکتے ہوئے جلسہ میں جلوہ افروز ہو گئے اور آناً فاناً ڈائس پر پہنچ گئے۔ ان کو وہاں موجود پا کر گل پوشی کرنے والے ہاتھ ہوا میں منجمد ہو گئے۔ گل پوشی کرانے والی جھکی گردن مارے شرم کے کچھ اور جھک گئی اور سامعین صدور کے اس جوڑے کو بیک وقت ڈائس پر دیکھ کر بے اختیار سیٹیاں اور تالیاں بجانے لگے۔

اس کیفیت میں کنوینر جلسہ نے خود بھی ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ پھر فاتحانہ انداز سے فرمایا کہ ”مجھے یقینِ کامل تھا کہ ہمارے معزز صدر وعدہ فرما کر ضرور وعدہ وفا کریں گے۔ وہ دیر سے ضرور تشریف لائے ہیں، مگر اَدبی جلسوں میں دیر، دیر نہیں ہوتی، بلکہ مروّجہ روایات کا ثبوت فراہم کرتی ہے اور بہر صورت دیر آید درست آید کی مثل تو مشہور ہے ہی۔ مجھے اس بات کی بڑی مسرت ہے کہ اعلان کے مطابق جلسہ کی کارروائی عزت مآب کی صدارت میں شروع ہو رہی ہے۔“

یہ سن کر ظاہر ہے کہ سامعین میں سے پکڑ کر لایا ہوا مرغا کھسکنے کی کوشش کرتا ہے، مگر کنوینر صاحب اپنی ٹانگ سے اس کی راہِ فرار کو روکتے ہوئے مزید یہ اعلان کرتے ہیں کہ ”عزت مآب کی صدارت میں جلسہ کا پہلا دور منعقد ہوگا اور صاحبِ صدر کے تشریف لے جانے پر ایک مختصر سی محفل شعر و لطیفہ گوئی برپا ہوگی، جس کی صدارت ہمارے عارضی صدر صاحب کریں گے۔“

اس اعلان پر مزید سیٹیوں، تالیوں اور کرسیوں کی سیٹوں کو پیٹنے کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ اصلی صدر کو ہار پہنایا جاتا ہے، جس کو گلے سے اُتار کر موصوف میز پر سامنے رکھ دیتے ہیں۔ پھر تصویر لی جاتی ہے اور کنوینر صاحب میز پر سے ہار اُٹھا کر ایک کارکن کے حوالے کر دیتے ہیں، تاکہ تصویر کشی میں آسانی ہو۔ مگر وہ کارکن کو یہ تاکید بھی کر دیتے ہیں کہ ہار کو محفلِ شعر کے صدر کے لیے محفوظ رکھنا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ یہ ہار اپنی افادیت کی آخری منزل پر اس وقت پہنچتا ہے جب کنوینر صاحب اس کو دوسرے صدر کے پنجے سے بھی بچا کر بالآخر اپنے گھر لے جاتے ہیں اور اپنی بیگم کو بھی یہ کہہ کر خوش کر دیتے ہیں کہ:

ہار پھولوں کا مری جان تیرے واسطے آخر شب

لیکن جب بانیانِ جلسہ کی گرفت میں کوئی نامور، اہم ٹھوس اور چکنی ہستی نہیں آتی اور ایسا بارہا ہوتا آیا ہے کہ کوئی نیا شگوفہ کھل جاتا ہے، مثلاً اسمبلی کی تحلیل، وزارت کی نئی تشکیل، قلم دانوں کی نئی تقسیم، کسی غیر متوقع اور اچانک وفات سے کسی اہم جگہ کا خالی ہو جانا، الیکشن کی آمد اور دی فیکٹرز کی آمد و رفت وغیرہ سے اہم شخصیتیں اپنے معمول کے سب معمولی کام چھوڑ کر اپنے رشتے استوار کرنے، اپنے لیے زیادہ اہم مقام حاصل کرنے کے لیے مختلف مقامات کے دوروں پر نکل پڑتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر ’تاش‘ منڈی سے دفعتاً اسی طرح غائب ہو جاتے ہیں، جس طرح مداری کی

تھیلی سے انڈے، راشن کی دکان سے شکر یا کیروسین کا تیل اور میری کھونٹی پر لٹکائی ہوئی پتلون کی جیب سے ریزگاری۔ ان حالات میں بانیانِ جلسہ کو کسی ن، م، ش یعنی نہایت معمولی شخصیت کی تلاش ہوتی ہے۔ مگر شخصیت خواہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو اس میں بھی صدارت کا رتبہ حاصل کرنے کے لیے چند خوبیوں کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔

سب سے پہلے غیر اہم شخص کے حلیے کو دیکھا جاتا ہے۔ سوال خوب صورتی کا نہیں ہوتا، بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایسا شخص معقول ہونے کے علاوہ دید کے ناقابل نہ ہو۔ اس کی صورت شکل ڈراؤنی اور گھناؤنی نہ ہو اور محفل میں مستورات کو مسلسل گھورنے والا نہ ہو۔ اور اس بات کی پڑتال بھی کر لی جاتی ہے کہ اس کے پاس کم اَز کم ایک جوڑا کپڑوں کا ایسا ہو، جن کو پہن کر وہ جلسہ میں معقول سا انسان نظر آئے۔ ان اُمور کے متعلق اطمینان کر لینے کے بعد اس کے کپڑے پہننے کے سلیقے پر بھی نظر ڈالی جاتی ہے، کیوں کہ بعض ایسے شرفا بھی سفید پوشوں میں نظر آتے ہیں، جو اپنی بہترین بش شرٹ کا ستیاناس اس طرح کر کے رکھ دیتے ہیں کہ اوپر کے دو بٹن چھوڑ کر تیسرے بٹن کو سب سے اوپر والے کاج میں لگا دیتے ہیں اور اپنی اس حماقت سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ بعض یہی سلوک پتلون کے سامنے کے بٹنوں اور کاجوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں اور پھر کئی ایسے بھی بے خبر سے ہوتے ہیں، جو پتلون کے زِپ یا بٹنوں کے استعمال کو یکسر بے ضرورت سمجھتے ہیں۔

خیر ان بے ہودگیوں سے ہٹ کر صدر کے انتخاب میں صدر کی صحت کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔ بانیانِ جلسہ اپنے شکار کو بالکل اسی طرح دیکھتے ہیں، جس طرح کوئی ماہر باورچی مرغ خریدتے وقت اس کے صحت مند ہونے کا یقین کر لینا چاہتا ہے۔ بات یہ ہے کہ زندگی اس وقت ایک ایسے دور سے دوچار ہے، جس میں عام سفید پوش سیاہ منڈی میں سفید چینی کی قیمت سن کر مارے غصہ کے لال پیلا ہو جاتا ہے۔ وہ چینی کو چائے کی پیالی میں اسی احتیاط اور اختصار سے ڈالتا ہے، جیسے کوئی ہومیوپیتھک ڈاکٹر دوائی کی پڑیاں بنا رہا ہو۔ صابن کی قیمتوں کی ترقی اقبال کی وجہ سے اس کے استعمال میں اس پر اس طرح نرمی سے ہاتھ پھیرتا ہے، جس طرح کوئی بزرگ نئے برخوردار کو دعا دیتے وقت اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتا ہے اور ٹوتھ پیسٹ کی قیمت بڑھتے ہوئے عروج سے مرعوب ہو کر اس کو ٹوتھ برش پر ایسی چابکدستی سے بکھیرتا ہے، جس طرح کوئی پیتھالوجی کا ماہر قطرۂ خون کو شیشے کی سلائیڈ پر جاننے کے لیے پھیلاتا ہے کہ آخر اس [illegible]

[illegible]

بھارت چند کھنہ ...... ضرورت ہے... ایک صدری

دل میں اس قدر شور کیوں مچا رکھا تھا۔ ایسے دورِ حیات میں صاحبِ صدر کے رشتۂ حیات کی پختگی کو جانچنا اس لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ کہیں دورانِ جلسہ صاحبِ صدر پر دل کا دورہ نہ پڑ جائے اور منتظمین جلسہ کے لیے یہ ضروری ہو جائے کہ پہلے کسی ڈاکٹر کو فوراً فراہم کریں پھر اسٹریچر اور ایمبولینس کا انتظام کریں۔ صدر کو اس میں ڈال کر اسپتال پہنچائیں اور اگر موصوف راستہ ہی میں ملکِ عدم کے راستہ پر پڑ جائیں تو ان کے کفن دفن کا اہتمام بھی کریں۔

پھر بانیانِ جلسہ اس بات کا یقین بھی کر لینا چاہتے ہیں کہ صدارت کے لیے جس شخص کو گانٹھا جا رہا ہے وہ پابندی سے وقت پر جلسہ گاہ وارد ہو جائے گا۔ وہ کسی ایسے جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتے، جس میں صاحبِ صدر انکم ٹیکس نہ دینے کی پاداش میں گرفتار ہو کر بوقتِ صدارت جیل خانے میں تشریف فرما، مچھروں اور کھٹملوں سے نبرد آزمائی کر رہے ہوں یا پھر گرفتار ہونے کے ڈر سے راہ فرار اختیار کر چکے ہوں۔ چنانچہ وہ ایسے سفید پوش کو ڈھونڈتے ہیں، جو انکم ٹیکس کے محکمہ کی دسترس سے باہر ہو، مگر ایسا بھی نہ ہو، جو اپنی شرافت کو بھاڑ میں جھونکتے ہوئے منہ پھاڑ کر سفر خرچ، بھتہ اور صدارت کے دوران پہنے جانے والے کپڑوں کی دھلوائی اور استری کروانے کے اخراجات طلب کر بیٹھے۔ ان کے پیشِ نظر تو ایسا شخص ہوتا ہے، جو نہ صرف سفر خرچ وغیرہ کا مطالبہ نہ کرے، بلکہ مقام جلسہ پر پہنچنے کے لیے جو راستہ اسے اختیار کرنا ہو اس راہ پر آتے ہوئے چند کارکنوں کو بھی اپنی شکستہ حال موٹر میں بٹھا کر ساتھ لیتا آئے، تا کہ صاحبِ صدر کو جلسہ گاہ کی تلاش میں زحمت نہ اُٹھانی پڑے۔ بعض مرتبہ تو ہوشیار جلسہ ساز تکلف بر طرف کرتے ہوئے صدرِ جلسہ کو اس بات کا پابند بھی کر دیتے ہیں کہ آتے ہوئے مائیکروفون فٹ کرنے والے کو ساز و سامان کے ساتھ لیتے آئیں۔ ایسی صورت میں بعض مرتبہ ایسی صورتِ حال بھی پیدا ہو چکی ہے کہ لفٹ دینے کے بعد مائیکروفون لگانے کی اُجرت بھی صاحبِ صدر کو بالآخر ادا کرنی پڑی۔ کیوں کہ جلسہ کے بعد جملہ بانیانِ و منتظمینِ جلسہ ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔

* * *

قصہ ہماری پرنسپلی کا!

پیرزادہ شرفِ عالم

آج کل بے روزگار طبقہ سب سے مظلوم طبقہ ہے، بلکہ معاش کی موجودہ دگرگوں صورتِ حال کے بعد تو برسرِ روزگار افراد بھی مظلوم افراد کی فہرست میں شامل کیے جانے لگے ہیں۔ بے روزگاری کا ایک دور ہم نے بھی گزارا ہے۔ اپنے کنوارے پن کی باقاعدہ سند حاصل کرنے کے بعد کئی جگہوں پر نوکری کے لیے درخواست دی اور اپنے بہت سے چاہنے والوں کے توسط سے بھی اکثر دفاتر میں صدا لگائی۔ ٹیسٹ میں تو ہر جگہ کامیاب ہوئے، مگر انٹرویو میں فیل ہوگئے۔ جہاں ان دونوں مراحل کو بہ حسن و خوبی سر کرلیا، وہاں موٹر سائیکل ہماری راہ کی دیوار بن گئی، جس کے بغیر ملازمت کا حصول ناممکن تھا۔ اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہزار دو ہزار کی ٹیوشن سے کوئی فرد موٹر سائیکل کس طرح خرید سکتا ہے۔ ہمارے دن اسی طرح گزر رہے تھے کہ ایک دن صبح صبح ہمارے ایک خیر خواہ گھر آئے اور کہنے لگے، ”آپ کے لیے ایک ملازمت ہے۔“ ان کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ ہمارے لیے مژدۂ جاں فزا ثابت ہوئے۔ جب انہوں نے یہ کہا کہ ہم ایک نیا اسکول بنا رہے ہیں، جس کے لیے پرنسپل کی حیثیت سے آپ کی خدمات درکار ہیں۔ ہم کچھ دیر تک سناٹے میں آگئے کہ یہ صاحب کیسی باتیں کرگئے اور گلی میں جس جگہ کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔ گلی کے ایک لڑکے نے ہمیں جھنجھوڑا اور ہم گھر آکر کافی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑے رہے کہ ہم میں ایسی کون سی خاص بات ہے کہ ان صاحب نے اسکول کی پرنسپلی کے لیے ہمارا انتخاب کیا ہے۔ جہاں تک جسمانی ساخت کا تعلق ہے تو وہ پرنسپلی کے لیے قطعاً موزوں نہیں ہے۔ جب بھی ذرا تیز ہوا چلتی ہے تو ہم اپنی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ گھر پر ہی رہا جائے۔ اگر ہوا کے کسی بگولے کی نذر ہوگئے تو گھر والے ڈھونڈتے ہی رہ جائیں گے۔ ’اندھا کیا چاہے دو آنکھیں‘ کے مصداق خدا کا شکر ادا کیا۔ اگرچہ تنخواہ کم تھی، مگر تسلی کے لیے یہ بات کافی تھی کہ ہم اب ایک پرنسپل بن گئے

ہیں۔ خیر صاحب! ہم دوسرے ہی دن خوب اہتمام سے تیار ہوئے، اپنی نیلے رنگ کی واسکٹ، سفید رنگ کی شلوار قمیص زیبِ تن کی اور بڑی ’پرنسپلانہ شان‘ سے گھر سے نکلے۔ بڑی مشکل سے اسکول کے مقام تک پہنچے، جہاں استقبال کے لیے ہمارے خیر خواہ موجود تھے۔ تین کمروں پر مشتمل اسکول مسلسل ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ جب وہ کام بتائے گئے، جو ہمیں اسکول کے باقاعدہ آغاز سے قبل کرنے تھے تو دن میں ہی تارے نظر آنے لگے۔ سب سے پہلا کام جو ہمیں سونپا گیا، وہ اسکول کی پبلسٹی کے لیے پینٹر کی تلاش تھی۔ چوں کہ وہ اسکول ہمارے اپنے علاقے سے خاصے فاصلے پر تھا، لہٰذا فوری طور پر کسی پینٹر کا ملنا انتہائی مشکل کام تھا۔ بڑے جان جوکھوں کے بعد پینٹر تک رسائی ہوئی اور پورا دن اس کے سر پر کھڑے ہو کر اُس گھر کی دیوار پر، جسے کچھ عرصے بعد اسکول بننا تھا، اسکول کا نام لکھوایا۔ اس کے بعد ڈیسکوں اور بینچوں کی تیاری کے لیے بڑھئی کی خدمات حاصل کیں۔ اس کام کو بھی بہ حسن و خوبی مکمل کیا۔ مگر ہماری پرنسپلی کے باقاعدہ آغاز کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ اب جو کام ہمیں سونپا گیا تھا، وہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، جسے کرنے کے لیے ہم قطعاً تیار نہیں تھے۔ وہ یہ تھا کہ اسکول کے اطراف میں موجود بازاروں اور چوراہوں پر بینرز آویزاں کیے جائیں۔ چوں کہ ہم اس علاقے میں مقامی نہیں تھے، لہٰذا یہ کام بھی ہمیں خود کرنا تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ہمارے ان خیر خواہ کا، جنھوں نے اس علاقے کا اپنا کوئی واقف کار ایک عدد سیڑھی کے ساتھ ہمارے ہمراہ کرنے کا وعدہ کیا۔ مگر اُن کی اس پیشکش کے باوجود ہم نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس نام نہاد پرنسپلی کو خیر باد کہہ دیا جائے۔ مگر جب ہم نے ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کیا تو ہمیں حضرت میرؔ یاد آ گئے:

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

لہٰذا ہم نے ایک اور فیصلہ کیا کہ اگر یہ زندگی کی حقیقت ہے تو پھر ایسے ہی سہی۔ ویسے بھی ہمیں اس علاقے میں کون جانتا ہے اگر ایک آدھ کھمبے پر چڑھ کر بینر لگانا پڑ گیا تو کوئی بات نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال مسلسل ہماری ہمت بڑھا رہا تھا کہ بس پرنسپلی ہم سے چند قدم کے فاصلے پر ہے، پھر ہم ہوں گے، پرنسپل کی ایک خوب صورت سی کرسی اور ایک گھنٹی ہوگی، جسے بجا کر ہم اسکول کے بابا سے ہر تھوڑی دیر بعد چائے کی پیالی کی فرمائش کریں گے۔ خیر صاحب! اگلی صبح ہم تھے، ایک سیڑھی تھی اور ہمارے خیر خواہ کے واقف کار۔ تین بینرز تو واقف کار صاحب نے ہمت

کر کے علاقے کی مختلف جگہوں پر لگا دیے۔ وہ تو اللہ بھلا کرے ہمارے خیر خواہ کا کہ بینر صرف چار تھے، لہٰذا اس موقع پر ہم نے یہ طے کیا کہ آخری بینر ہمیں خود لگانا چاہیے اس سے واقف کار پر ہمارے اعلیٰ اخلاق کا گہرا اثر پڑے گا۔ بس جناب! ہم پہلے سیڑھی پر چڑھے، پھر کھمبے پر اور پھر بینر لگانے کے لیے پوری طرح تیار ہوئے۔ معاً ہمارے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ایک اسکول کا ہونے والا پرنسپل بازار میں کھمبے پر چڑھ کر بینر لگا رہا ہے! بس اس کے بعد ہم نے ایک زوردار چیخ ماری ’’نہیں‘‘ اور ایک آن میں نیچے آ کے کپڑے جھاڑ کر بڑے سکون سے کھڑے ہو گئے۔ حیران تھے کہ اتنی اونچائی سے تو ہم آج تک نہیں گرے اس کے باوجود جسم پر ایک معمولی سی خراش تک نہیں آئی؟ مگر جوں ہی ہمارے کانوں میں یہ آوازیں آئیں، ’’مر گیا میری ٹانگ، مر گیا‘‘ تو دیکھا، واقف کار صاحب زمین پر پڑے کراہ رہے ہیں۔

اب ہمیں خود کو چوٹ نہ لگنے کی وجہ سمجھ میں آئی۔ واقف کار صاحب، جو نیچے سیڑھی پکڑے کھڑے تھے، ہمارے ناتواں بوجھ تلے دب گئے اور ہم بالکل محفوظ رہے۔ بس جناب پھر کیا تھا، ہم تھے، ہمارے کاندھے پر واقف کار صاحب تھے اور قریبی کلینک کا راستہ تھا۔ ہم چلے جا رہے تھے اور مدہوشی کے عالم میں واقف کار صاحب کلینک کے درست راستے کی طرف رہنمائی کر رہے تھے۔ اس موقع پر ہمیں پہلی جماعت کی اُردو کی کتاب میں ایک دوسرے کی مدد کے حوالے سے موجود سبق یاد آ گیا، جس میں گاؤں میں آگ لگنے کے بعد دوستوں کی باہمی مدد کو بیان کیا گیا ہے۔ اندھا دوست اپنی ٹانگوں سے معذور ساتھی کو کاندھے پر اُٹھائے، اُس کے بتائے راستے پر چلتا جاتا ہے اور اِس طرح دونوں کی جان بچ جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ساتھ جو واقعہ پیش آیا، اُس میں واقف کار صاحب کی جان تو بچ گئی، مگر ہم زندہ ہوتے ہوئے بھی زندگی سے محروم ہو گئے۔ جب کلینک پہنچے تو اُن صاحب کو مسلسل آدھے گھنٹے تک کاندھے پر اُٹھائے رکھنے سے ہمارے کاندھے شل ہو چکے تھے اور اپنے خستہ حال جسم کو ابھی کچھ آرام دینے بھی نہ پائے تھے کہ ڈاکٹر نے کہا، بھائی اِن کی ہڈی کا فریکچر ہو گیا ہے، ہڈی کے کسی ماہر ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا پڑے گا۔ اس وقت ہم نے مرتا کیا نا کرتا کے مصداق واقف کار صاحب کو ایک ایمبولینس میں اُمورِ ہڈی کے ماہر کے پاس جانے کا فوری فیصلہ کیا۔ چوں کہ ہم بچت کے زرّیں اُصولوں پر بھی سختی سے کاربند رہے ہیں، لہٰذا بجلی کی سی تیزی سے ہمارے ذہن میں یہ خیال آیا، کیوں نہ واقف کار صاحب کی ٹانگ کسی پہلوان کو

دکھائی جائے۔ اس طرح ہماری پرنسپلی کی پہلی تنخواہ ڈاکٹر کی نذر ہونے سے بچ جائے گی، جس کے ملنے میں تقریباً 20 دن باقی تھے۔ اس موقع پر کسی سے ادھار لینا ضروری تھا۔ ہم واقف کار صاحب کے مستقبل کے حوالے سے کچھ ایسے ہی خیالات میں گم تھے، ساتھ ہی ساتھ واقف کار صاحب کی دردناک چیخیں، 'مر گیا... آہ میری ٹانگ... مر گیا...' ایک دل ہلانے والا منظر پیش کر رہی تھی۔ ہمیں مزید وقت ضائع کیے بغیر کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ واقف کار صاحب کی زندگی کی گاڑی کے اس فیصلہ کن موڑ پر اسٹیئرنگ ہمارے ہاتھ میں تھا۔ ہمارے ذہن میں فلم کے ایک منظر کی طرح دونوں مسلسل گردش کر رہے تھے، پہلوان یا ڈاکٹر؟ پہلوان یا ڈاکٹر؟ اس نازک موقع پر ہم نے ایک بار پھر اپنے ہمزاد کی خدمات حاصل کیں۔ وہ ہم سے مخاطب ہوا کہ چند پیسوں کی خاطر کسی کی زندگی سے نہ کھیلو۔ آن کی آن میں فیصلہ تبدیل کیا اور ہڈیوں کے جوڑنے کے ماہر ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ واقف کار صاحب کا ایکسرے ہوا، اُن کی ٹانگ پر موٹا سا پلستر چڑھا، جسے دیکھ کر ہماری رُوح خشک ہوگئی کہ اب ہم انہیں کاندھے پر اُٹھا کر کیسے لے کر جائیں گے؟ پچھلے دو گھنٹے کی مسلسل مشقت کے بعد ہمیں ان کی ٹانگوں پر چڑھائے گئے پلستر کا وزن خود اُن کے اپنے وزن سے زیادہ نظر آ رہا تھا۔ جب ڈاکٹر کا بل ہمارے ہاتھ میں آیا تو ہمارے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے۔ بڑی مشکل سے ہسپتال کی انتظامیہ کو اس بات پر قائل کیا کہ ہم ایک اسکول کے ہونے والے پرنسپل ہیں، ہمارا اعتبار کریں اور ہمارے ساتھ ہسپتال کا کوئی فرد بھیج دیں، ہم اپنے گھر پہنچ کر بل کی ادائیگی کردیں گے۔ خیر صاحب! گھر پہنچے، اس عالم میں کہ ہمارے بدن پر نیلی واسکٹ تھی اور نہ ہی ہماری عید والی سینڈل، کیوں کہ یہ دونوں چیزیں ہم واقف کار صاحب کو ہڈی کے کلینک پہنچانے کے عوض ٹیکسی کے ڈرائیور کو معاوضے کے طور پر دے چکے تھے۔ والدہ نے جب ہماری یہ حالت دیکھی تو بہت حیران ہوئیں اور فوراً مطلوبہ رقم ہمارے سپرد کی۔ ہم نے رقم ہسپتال کے نمائندے کو دی اور اُسے اپنے واقف کار صاحب کے گھر کا پتا سمجھا کر روانہ کیا اور اپنی نام نہاد پرنسپلی سے توبہ کر کے پرنسپل بننے کے تمام ارمانوں اور حسرتوں کو دل میں دفن کر کے اس شعر پر عمل کرتے ہوئے سو گئے:

کس کس کو یاد کیجیے کس کس کو روئیے
آرام بڑی چیز ہے منہ ڈھک کے سوئیے

* *

سفرنامہ رُنگی ٹون، پونے پانچ!

پروفیسر محمد ظریف خان

بجلی بچاؤ کی مہم اور طویل وقفہ تعطل اپنی جگہ، مگر وعدہ کے مطابق باجی کے گھر پہنچنا لازمی تھا۔ کیوں نہ ہو؟ آخر کو بھانجی کی ہونے والی/ والا/ ساس/ سسر اور اُن کا پورا ٹبر 'لڑکی' دیکھنے جو آ رہے تھے۔ رات اور وہ بھی شبِ دیجور، یہ بھی کیا نعمت ہے، جو عیبوں پر کچھ ایسا پردہ ڈال دیتی ہے، جیسے چہرے کے تمام بگڑے نقوش، پکی رنگت اور ڈینٹ وغیرہ میک اَپ کی تہوں کے پیچھے غائب غلّا ہو جاتے ہیں۔ اور جب میک اَپ ڈھل کر اُترتا ہے تو بسا اوقات بیگم صاحبہ کو شوہر نامدار بھی پہچان نہیں پاتے۔ تو میرا خیال ہے کہ کم از کم بَرد کھوے کے سے لوڈ شیڈنگ رہا کرے، تا کہ فریقین اور اُن کے حالی موالی ایک دوسرے کا اصل روپ نہ دیکھ سکیں۔

تو آمدم برسرِ مطلب! اورنگی ٹاؤن پانچ نمبر سے پونے پانچ تک کا فاصلہ تو صرف نصف میل ہے، یعنی کُل 880 گز، نصف جس کے 440 گز، فُٹ 2640، جب کہ انچ دس ہزار سات سو ساٹھ ہوتے ہیں، مگر گھپ اندھیرے میں وہاں تک جانا طولِ شبِ فراق طے کرنے کے برابر ہے۔ طولِ شبِ فراق ایک شعری ترکیب ہونے کے ساتھ ساتھ کہاوت یا ضرب المثل بھی ہے، جس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ ریاضی کے ایک پروفیسر کسی اَدق سوال کو حل کرنے میں محو تھے۔ اُن کی ادب نواز شریکِ حیات نے اُن کے استغراق کو دیکھا تو مسکرا کر یہ شعر پڑھ دیا:

دعویٰ بہت ہے علمِ ریاضی میں آپ کو
طولِ شبِ فراق ذرا ناپ دیجیے

پروفیسر صاحب نے جب بیوی کی یہ دعوتِ مبارزت سنی تو غصہ میں بھنا کر اُٹھے، تبدیلیِ لباس کے کمرے میں گئے اور واپس آ کر بڑے فخر کے ساتھ بولے، ''تین فٹ دو انچ۔'' اس جواب پر بیوی تو ہنس ہنس کر لوٹن کبوتری بن گئی، جب کہ پروفیسر صاحب اپنا سر اپنے بغیر ناخنوں والی انگلیوں

سے کھجا کھجا کر یہ سوچ رہے تھے کہ آخر اُن سے کیا غلطی یا حماقت سرزد ہوئی ہے؟ تو دوستو! بات اس کے سوا کچھ اور نہ تھی کہ صاحب موصوف سے صرف املا کی غلطی سرزد ہوئی تھی۔ وہ 'فراق' کو فراک سمجھ کر گھر والی کی کسی قمیص کا طول ناپ آئے تھے!

چوں کہ ابھی سفر شروع نہیں ہوا، صرف ارادہ کیا گیا ہے، تو کیوں نہ اورنگی ٹاؤن کا تعارف ہی کرا دیا جائے، تاکہ سند رہے اور بہ وقتِ ضرورت کام آوے اور سفرنامہ پڑھنے والا یہ نہ کہہ پاوے کہ واہ صاحب واہ، اُس مقام سے تو متعارف ہی نہیں کرایا گیا، جہاں کا سفرنامہ تحریر کیا جا رہا ہے۔

اورنگی ٹاؤن جو کراچی میں ضلع غربی میں واقع ہے، کبھی ایشیاء کی سب سے بڑی کچی آبادی تھی، اب نہیں ہے۔ وہاں بے شمار مکانات ڈیفنس اور کلفٹن کی کوٹھیوں کو شرماتے ہیں، تاہم بڑا علاقہ اب بھی ہڑپہ اور موئن جو داڑو کے کھنڈرات سے افضل نہیں۔ اس بستی کا موجودہ رقبہ کم و بیش 150 مربع کلومیٹر اور آبادی پندرہ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ یہاں پاکستان کے ہر صوبے اور ہر زبان والے لوگ رہتے بستے چلے آ رہے ہیں، تاہم آبادی کا بڑا حصہ اُن افراد پر مشتمل ہے جو خود، یا اُن کے باپ دادا، ستر کی دہائی میں پاکستان کی خاطر اپنا سب کچھ لٹوا کر مرحوم مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) سے سابق مغربی پاکستان (یعنی 'نئے پاکستان') میں آئے تھے۔ اِن اُردو دانوں کی اکثریت کا لہجہ اکتسابی اُردو سے قدرے مختلف ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ اورنگی ٹاون کو 'رنگی ٹون' کہتے ہیں۔ اورنگی ٹاؤن کے زیادہ تر علاقے اور محلّے اپنے قریب واقع بس اسٹاپوں کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ نمبر 1 سے 12 نمبر تک، مگر درمیان میں ساڑھے، پونے اور سوا کے سابقے بھی شامل ہیں۔ مثلاً، ساڑھے گیارہ، پونے پانچ اور سوا چھ وغیرہ وغیرہ۔ بستی میں صفائی ستھرائی کا عالم یہ ہے کہ یہاں ہر ہر قدم پر کیچڑ کا 'دریائے ٹیمز' اور گند بلا اور کوڑا کرکٹ کا 'کے۔ٹو' پایا جاتا ہے۔ بستی کے متعدد سیکٹر اِن کے ناطے ہی شناخت کیے جاتے ہیں۔ مثلاً، پونے پانچ کے قریب ایک گندا نالہ چار دہائیوں سے قرب و جوار میں رہنے والوں کے مشامِ جاں کو معطر کرتا چلا آ رہا ہے۔ ساڑھے گیارہ کے درمیان اُردو چوک سے شروع ہونے والی سڑک پر (اگر اُسے سڑک کہا جا سکے تو؟) متعدد گہرے گہرے گڑھے ہیں، جہاں دن میں بے شمار گاڑی والوں کے تختے اُلٹتے ہیں، جب کہ کمزور بینائی رکھنے والے لوگ یا بزرگ افراد اُن میں گر کر اُن ہڈی جوڑنے اور موچ نکالنے والوں کی دکانوں کی رونق بڑھاتے ہیں، جو کم از کم

دو در جن کی تعداد میں یہاں پر قائم ہیں۔ تین نمبر پر واقع کالج اُس کچرا کنڈی کی نسبت سے جانا پہچانا جاتا ہے، جسے ہفتوں، بلکہ مہینوں صاف نہیں کیا جاتا، اور اُس میں سے اُٹھتے ہوئے بدبو کے بھبکے کئی میل دور سے اپنی موجودگی کا پتا دیتے ہیں۔ یعنی بقول شاعر:

درد اُٹھ اُٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانہ دل کا

اورنگی ٹاؤن سے میرا مادری تعلق ہے۔ وہ اس طرح کہ میری والدہ ماجدہ چند برس قبل تک اورنگی ٹاؤن ساڑھے گیارہ میں رہا کرتی تھیں، جب کہ اسی بستی سے میرا علاقہ ہمشیر گی کا بھی ہے کہ میری چھوٹی ہمشیر اورنگی ٹاؤن نمبر پونے پانچ (نزد نالہ اورنگی) میں قیام پذیر ہے۔ یہ آج سے چند برس پہلے کی بات ہے، جب مجھے شدید سرد رات کو 9 بجے کے قریب اورنگی نمبر 5 سے پونے پانچ تک کا سفر کرنا پڑا۔ ہوا یوں کہ 1-D کی کھڑکھڑاتی، لیکن دن دناتی تیز رفتار بس کسی دوسری بس سے دوڑ لگاتی ہوئی آئی اور پونے پانچ کے اسٹاپ پر رکنے کی بجائے سیدھی پانچ نمبر پر جا ٹھہری۔ اُس وقت ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ ظاہر ہے کہ لوڈ شیڈنگ تھی۔ میں احتیاطاً ایک ٹارچ اپنے ساتھ لے گیا تھا، مگر اُس کے سیل عین وقت پر جواب دے گئے۔ میں قسمت کو بُرا بھلا کہتا ہوا بہن کے گھر کی طرف رواں دواں تھا۔ بہن کے گھر ہر حال میں پہنچنا ضروری تھا، کیوں کہ لڑکے والوں کی آمد کے وقت لڑکی کے بڑے ماموں کی موجودگی ناگزیر و لابدی تھی۔ اس نصف میل کے پاپیادہ سفر کے دوران میرا جو حال ہوا، اتنا خراب تو سعودی عرب، قطر، مال دیپ اور سری لنکا کے ہزاروں میل کے اسفار میں بھی نہ ہوا تھا۔ میں جیسے ہی بس اسٹاپ پر اُتر کر بائیں جانب کی پہلی گلی میں داخل ہوا تو گندے پانی کے ایک جوہڑ میں میرا دایاں پاؤں بغیر اجازت کے اندر داخل ہو گیا۔ اور پھر کیچڑ کے چھپاکے میرے سر سے بھی اوپر چلے گئے۔ پانی کا سر سے اونچا ہونا تو سُنا ہی تھا، مگر کیچڑ کا سر سے گزرنا پہلی مرتبہ دیکھا یا برداشت کیا۔ اس مصیبت سے نکل کر آگے چلا تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے پیر تلے ایک پتلی سی رسّی آ گئی ہو۔ پھر اُس کے ساتھ ہی ایک کتے کی دردناک بھونک نے حواس مختل کر دیے۔ وہ رسی نہیں، بلکہ ایک کتے کی دُم تھی، جسے وہ تا حدِ امکان پھیلا کر بیٹھا ہوا تھا۔ کتے کا نالہ و شیون سن کر میں نے بھاگ لینے ہی میں عافیت سمجھی اور دوڑ لگا دی۔ اگر اُس وقت میں جان سُن بھی ہوتا تو میرا مقابلہ نہ کر پاتا۔ وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ اس گھپ اندھیرے میں اندھا دھند دوڑتے ہوئے میں کہیں رپٹ کر منہ کے بَل نہ گرا، ورنہ کتا وہیں مجھے چیر پھاڑ کر افغانستان یا عراق

بنا ڈالتا! مگر اس بھاگم دوڑ کے درمیان (دوران نہیں) ایک کھلا گٹر میرا منتظر ضرور تھا۔ اندھیرے میں بندہ اُسے دیکھ نہ پایا اور اللہ کا نام لیے بغیر اُس میں جا پڑا۔ اب کتا ہے کہ گٹر کے دھانے پر کھڑا ہوا بھونک رہا ہے اور میں ہوں کہ گٹر کے اندر ہی اندر سے ”بچاؤ... بچاؤ“ کے نعرے مار رہا ہوں۔ اُدھر ’رنگی ٹون‘ والوں کی یہ حالت کہ مارے خوف کے کوئی بھی گھر سے باہر آنے کو تیار نہیں۔ خدا خدا کر کے کسی شریف آدمی کے دل میں نیکی سمائی۔ وہ عصاب بدست باہر نکلا۔ اُس نے کتے کو مار بھگایا اور پھر مجھے سہارا دے کر گٹر سے نکالا۔ مگر جیسے ہی اُس کی نظر میرے دائیں ہاتھ پر پڑی، وہ اُلٹے پیروں بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سیاہ رنگ کی ٹارچ کو ٹی ٹی یا پستول سمجھ بیٹھا ہوگا!

اس آفت سے نجات پا کر میں جیسے ہی چند قدم اور چلا تو ہیجان، گھبراہٹ اور خوف کے سبب مجھ پر شدید نقاہت کا غلبہ ہوا۔ میرا سر بُری طرح چکرایا اور میں چاروں شانے چت، کچرے کے ایک ڈھیر پر جا گرا۔ اگلی صبح کے دھندلکے میں نماز فجر کے بعد کسی قریبی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر ہونے والے اس زوردار اعلان سے میری آنکھ کھلی:

”پچاس برس سے زائد کی عمر کا ایک بچہ گزشتہ رات نو بجے سے غائب ہے۔ وہ گھر واپس آ جائے۔ اُسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔“

اور پھر میں نے دیکھا کہ میری زندہ لاش کے چاروں طرف کچھ رنگی ٹونی کھڑے تھے! جن میں سے ایک بڑی یاسیت کے ساتھ کہہ رہا تھا، ”ارے...! ای کا گجب ہے... سُسرا اَب تو بوری بنا ہی پھینک گئے... ای کا لاس ساری رات ٹھنڈا میں پڑا رہا۔“

(ارے یہ کیا غضب ہوا۔ سُسرے اب تو بوری کے بغیر ہی پھینک گئے۔ اس کی لاش ساری رات سردی میں پڑی رہی)۔

اب اس کے سوا اور کیا لکھوں کہ ان سانحات و حادثات کی بدولت میرا دس ہزار سات سو ساٹھ انچ کا سفر بھی نا تمام رہا۔ مگر کیا ہوا؟ سفرنامہ تو لکھا جا سکتا تھا، اور لکھا گیا ہے۔ آخر کو بڑے بڑے سفرنامہ نگار بھی تو صرف ایک دم لگا کر لالہ موسیٰ سے لوسا کا پہنچ جاتے ہیں۔

* *

چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر

پروفیسر محمد یامین شیخ

اس مسلمہ حقیقت سے تو کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا کہ پیدل چلنا صحت کے لیے مفید ہے۔ حکیم لقمان سے لے کر جالینوس تک اور جالینوس سے حکیم سعید تک سب نے یہی تاکید کی کہ اگر صحت عزیز ہے تو پیدل چلو۔ ہم نے اِن حکماء کی باتوں کو نا صرف پڑھا بلکہ ان کی قیمتی نصیحتوں کو اپنی گرہ میں بھی باندھ لیا تاکہ ان پر عمل پیرا ہوسکیں۔ مگر وائے قسمت کہ بچپن میں تو بائیسکل ہماری شریک سفر بن کر ہمارے پیدل چلنے میں مانع رہی اور جوانی میں موٹر سائیکل نے اپنی اُلفت میں ایسا اسیر کیا کہ پیدل چلنے کا موقع ہی نہ دیا اور ہم اور وہ ایسے لازم و ملزوم ہوئے کہ خدانخواستہ کسی وجہ سے اس کے بغیر دوستوں میں اکیلے نکل بھی گئے تو انہوں نے اس کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے فوراً ہی پوچھا کہ میاں خیر تو ہے آج آپ کی بائیک نظر نہیں آ رہی! گویا ان کی نظر میں ہم سے زیادہ ہماری بائیک معتبر اور محترم ٹھہری۔ اس کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ پیدل نہ چلنے سے ہمارا جسم فربہی کی طرف مائل ہوا اور ہمیں اپنی صحت کی طرف سے تشویش لاحق ہوگئی۔ کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ صبح اُٹھ کر ورزش کی جائے یا کم از کم باقاعدہ سیر کی عادت اپنائی جائے، تاکہ پیدل چلنے سے ہم بھی شاہ رخ اور سلمان خان کی طرح اسمارٹ نظر آئیں نہ کہ عدنان سمیع کی طرح پھول کر کپا بن جائیں اور لوگوں کے لیے تفریحِ طبع کا باعث بنیں۔ کچھ ہلکا سا یہ خدشہ بھی درپیش ہوا کہ جس طرح اُن کی شریکِ حیات زیبا بختیار نے اُن کے موٹاپے سے شرما کر اعلان بیزاری کرتے ہوئے اپنا راستہ جدا کرلیا، اسی طرح ہماری شریکِ سفر ہمارے موٹاپے سے گھبرا کر اعلان بغاوت نہ کردے۔ غرضیکہ اسمارٹ رہنے اور اپنی صحت کو برقرار رکھنے کے شیخ چلی کی طرح کئی منصوبے بناتے اور بگاڑتے رہے، مگر اُن پر کبھی بھی عمل پیرا ہونے کا موقع نہ ملا۔

پڑوس میں ایک ریٹائرڈ ریلوے گارڈ رہتے تھے، جن کا سب ہی احترام کرتے تھے۔

ساٹھ پینسٹھ سال کے پیٹے میں ہوتے ہوئے بھی ان کی صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ گھوڑے کی طرح چاق و چوبند، سارا دن گلیوں اور بازاروں میں دوڑتے نظر آتے۔ وہ نا صرف سحر خیز تھے، بلکہ صبح سویرے اُٹھ کر کئی کئی میل پیدل چلنا، ان کا روزمرّہ کا معمول تھا۔ فجر کی نماز گھر سے کوسوں دُور ایک مسجد میں ادا کرتے۔ گھر کا سودا سلف دُور دُور سے پیدل ہی جا کر لاتے۔ ہم نے انہیں کبھی بھولے سے بھی تانگہ یا رکشا کے نزدیک جاتے ہوئے نہ دیکھا۔ وہ دوسروں کو بھی ہمیشہ پیدل چلنے کی نصیحت کرتے۔ ایک دن ہماری شامت اعمال کہ ہم خود ہی ان کے ہمراہ حیدرآباد جانے کا پروگرام بنا بیٹھے۔ ہمیں اپنے ایک قریبی عزیز کی مزاج پُرسی کے لیے تلک چاڑی جانا تھا اور انہیں ڈومنوا روڈ پر کسی شادی میں شرکت کرنا تھی۔ طے یہ پایا کہ گھر سے ساتھ ہی نکلا جائے۔ پہلے مریض کی عیادت، پھر شادی میں شرکت اور رات کو ٹرین سے ساتھ ہی واپسی۔ ہمیں دوپہر کی ٹرین سے روانہ ہونا تھا، اس لیے تقریباً دوپہر کے ایک بجے کے قریب سیٹلائٹ ٹاؤن سے نکلے۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں اسٹیشن کے فاصلے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم نے سڑک سے گزرتے ہوئے ایک آٹو رکشا کو ہاتھ کے اشارے سے روکنا چاہا، تاکہ آرام سے اسٹیشن پہنچ کر ٹرین میں سوار ہوا جا سکے۔ ہمارے اس عمل کو گارڈ صاحب نے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا کہ میاں ہم تو ہمیشہ سے رہے پیدل چلنے کے عادی، جوانی کا ذکر ہی کیا کہ دس بیس میل پیدل چلنا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا تھا۔ اب اِس عمر میں بھی جب تک دو چار میل پیدل نا چل لیں۔ کھانا ہضم ہی نہیں ہوتا۔ یہ اسٹیشن کا فاصلہ بھی کوئی فاصلہ ہے۔ دو قدم ذرا تیز بڑھائے اور منزل پر پہنچے۔ تم جوان ہو کر بھی ذرا سے فاصلے سے گھبراتے ہو۔ ڈگمگاتے ہو۔ اس عمر میں تو آدمی کو عزم اور حوصلے کا پیکر ہونا چاہیے۔ پھر علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھتے ہوئے ہمارا حوصلہ بڑھایا (غالباً ہمیں شرم دلائی کہ):

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پر جو ڈالتے ہیں کمند

ہم نے ان کی بزرگی اور پڑوسی ہونے کا احترام کرتے ہوئے ان کی پیدل چلنے کی بات مان لی۔ ہمیں البتہ یہ خوش فہمی ضرور تھی کہ موصوف عمر رسیدہ آدمی ہیں، دو چار فرلانگ پیدل چل کر خود ہی کہیں گے کہ میاں اب کچھ تھک گیا ہوں۔ گرمی کی بھی شدت ہے، اب کوئی سواری پکڑ ہی لو، مگر یہ آخر تک صرف خوش فہمی ہی رہی اور ہم اسٹیشن کی طرف رواں دواں رہے۔ اسٹیشن کا طویل راستہ

ہمیں ہلکان کیے دے رہا تھا اور اس پر ستم یہ کہ ان کی سبک رفتاری، دھوپ کی تپش اور لُو کے تھپیڑوں نے ہمارا بُرا حال کر دیا۔ وہ اس رفتار سے اسٹیشن کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے جیسے ان پر پیچھے سے شکاری کتوں کا ایک خطرناک غول جھپٹنے والا ہو، یا جیسے کوئی مفرور قیدی پولیس کی حراست سے چھٹکارا پا کر کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں دوڑا چلا جا رہا ہو۔ تیز رفتاری کے اس عمل نے ہمارا سانس اتنا پھلا دیا کہ اگر کچھ دیر بعد اسٹیشن کی عمارت سامنے نظر نہ آ جاتی تو شاید ہم حوصلہ ہار بیٹھتے۔ ہماری ہمت بڑھانے کے لیے فرمانے لگے کہ آپ صرف دو کلومیٹر کے فاصلے سے گھبرا گئے، جب کہ ہم نے داستانوں میں پڑھا ہے کہ مجنوں نے تلاشِ لیلیٰ میں پیدل ہی صحراؤں کو روند ڈالا، فرہاد نے عشقِ شیریں میں پیدل ہی فلک بوس پہاڑوں کو سَر کر لیا۔ ایک آج کل کے کاہل و سُست جوان ہیں کہ ایک فرلانگ مسافت طے کرنے کے لیے گھنٹوں سواری کے انتظار میں تو کھڑے رہتے ہیں، مگر مجال ہے جو پیدل سرک بھی جائیں۔ ہم نے ادب سے عرض کیا کہ بزرگوار اُس زمانے میں کار یا رکشا ایجاد ہی نہیں ہوا تھا، ورنہ مجنوں اور فرہاد بھی لینڈ کروزر میں سوار لیلیٰ اور شیریں کو ڈھونڈتے نظر آتے اور اپنے قیمتی جوتے پیدل چل کر نہ گھسواتے۔ اگر پیدل چلنا ہی عاشقوں کا شیوہ رہا ہے تو سوہنی اپنے مہینوال سے ملنے پیدل ہی جاتی، مٹکے کی سواری سے لطف اندوز نہ ہوتی۔ ڈوڈی الفائد اپنی لیڈی ڈیانا کو پیرس کی گلیوں میں پیدل ہی گھماتا، رولز رائس کار ڈرائیو کرتے جان کا نذرانہ پیش نہ کرتا۔ آج کے دور کے دوسرے خوش حال اور فارغ البال عاشقوں کا حال بھی اِن جیسا ہی ہے کہ وہ دولت کے گھمنڈ میں پجارو اور کرولا سے کم کی گاڑی میں بیٹھنا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ مفلوک الحال عاشق بھی کم سے کم رکشا یا ٹیکسی میں سوار ہو کر محبوباؤں کے آستانوں پر حاضری دیتے نظر آتے ہیں۔ آج کل کی محبوبائیں بھی لیلیٰ اور شیریں کی طرح سادہ اور بھولی بھالی نہیں ہیں کہ اپنی محبت کا امتحان صرف دودھ کی نہر نکلوا کر کر لیں، یا صحرا میں قیس کو دیوانگی کی حالت میں پا کر خود بھی دیوانی ہو جائیں۔ وہ تو اپنے عاشقوں کی مالی حیثیت کا صحیح اندازہ کر کے راہ و رسم بڑھاتی ہیں اور جیسے ہی ان کی جیب خالی ہوتی ہے، ان سے ایسے نظریں پِھراتی ہیں، جیسے ان سے کبھی شناسائی ہی نہ ہو۔ باتوں ہی باتوں میں ہم اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ ٹکٹ لینے سے گارڈ صاحب نے یہ کہہ کر اجتناب کیا کہ انہوں نے ساری عمر ریلوے کی ملازمت کی ہے اور اُن سے بھلا ٹکٹ کا کون پوچھے گا۔ گویا انہوں نے تاحیات گاڑیوں میں اپنا اور اپنے احباب کا فری سفر کا حق محفوظ کر لیا۔

خیر ہم گاڑی میں سوار ہوئے اور تین بجے حیدر آباد پہنچے۔ اسٹیشن سے باہر آئے تو پھر میرے قدم رکشا کی جانب بڑھتے دیکھ کر گارڈ صاحب فرمانے لگے کہ میاں تلک چاڑی کا فاصلہ تو صرف پندرہ بیس منٹ کی مسافت پر ہے۔ دو قدم بڑھائے تو منزل سامنے۔ ہم نے شرما حضوری میں پھر اُن کی بات مان لی۔ آخر میرے محلے کے بزرگ تھے اور سعادت مندی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ان کی بات مان لی جائے۔ ابھی تھوڑی دُور ہی چلے تھے کہ انہوں نے اپنی رفتار پھر بڑھا دی۔ ہم شاید پیدل چلنے سے اتنا نہ تھکتے، جتنا اُن کی رفتار کا ساتھ دینے سے تھکے۔ تلک چاڑی پہنچتے پہنچتے ہم حال سے بے حال، جسم پسینے میں شرابور، ٹانگیں تھکن سے چور۔ گو کہ اُس وقت بدن گرم ہونے سے پاؤں اکڑے ہوتو نہیں، مگر اِس پیدل چلنے کی مشق کا اثر دوسرے دن ہوا، جب ہمیں اپنی ہلکی پھلکی ٹانگیں مَن مَن کی معلوم ہوئیں۔ تلک چاڑی پر ہم نے اپنی خود کی خیریت نا ہوتے ہوئے بھی اپنے عزیز کی خیریت دریافت کی۔ گارڈ صاحب نے حسبِ عادت انہیں بھی صحت مند رہنے کے لیے زیادہ سے زیادہ پیدل چلنے کا مشورہ دیا۔ گویا ان کے نزدیک ہر مرض کا علاج پیدل چلنے میں ہی تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر ہم ڈومنوا روڈ کی طرف چلے۔ گارڈ صاحب نے سرے گھاٹ کے راستے پیدل ہی پیدل شادی ہال تک مارچ کروایا۔ پیدل چلنے کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ بھوک خوب کھل کر لگی اور شادی کا کھانا سیر ہو کر کھایا۔ مجھے قوی یقین تھا کہ کھانا کھانے کے بعد گارڈ صاحب میں اتنی ہمت نہ ہوگی کہ وہ پیدل چلنے کا سوچیں بھی۔ کھانے کے بعد ہم شادی ہال سے باہر آئے۔ باہر نکلتے ہی بزرگوار فرمانے لگے، ”چوں کہ شادی بیاہ میں مرغن کھانا ہوتا ہے، جسے ہضم کرنا آسان نہیں ہوتا اور اگر کھانا ہضم نہ ہو تو کئی امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اسٹیشن تک پیدل چلنا ہی مفید ہوگا۔“ ہمیں چار و ناچار پھر اُن کی بات ماننی پڑی۔ سٹی کالج کے سامنے والے روڈ سے ہوتے ہوئے قلعے کے سائڈ والے روڈ پر پہنچے۔ گارڈ صاحب اب بھی کسی ہرنی کی طرح اِٹھلاتے، بل کھاتے، اُڑے چلے جا رہے تھے اور ہم کسی تھکے ہوئے بیل کی طرح بوجھل قدم اُٹھائے ان کا بمشکل ساتھ دے پا رہے تھے۔ اسٹیشن پہنچے تو گاڑی تیار کھڑی تھی۔ انُ کے پیدل چلنے کے شوق کو دیکھ کر ہمیں تو یہ ڈر ہونے لگا کہ موصوف کہیں پیدل ہی میر پور خاص چلنے کی نہ ٹھان لیں، مگر شکر ہے کہ انہوں نے شاید ہم پر ترس کھا کر ایسا ارادہ نہ کیا اور گاڑی میں سوار ہو بیٹھے۔ یہ ایک سوا گھنٹہ کا سفر اطمینان سے کٹا۔ اسٹیشن سے باہر آتے ہی حسبِ عادت گارڈ صاحب نے پیدل چلنے پر اصرار

کیا۔ ہم نے تمام اخلاقی ضابطوں کو بالائے طاق رکھ کر رکشا والے کو آواز دی اور اُن کی ہمسفری کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہتے ہوئے اکیلے ہی رکشا میں جا بیٹھے۔ تھکن سے چور گھر پہنچ کر ایسے گھوڑے بیچ کر سوئے کہ صبح ہی آنکھ کھلی۔

اب بھی اکثر گارڈ صاحب سے محلے میں آتے جاتے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ ہم اُن کا سامنا کرنے کی بجائے، اُن سے کترا کر گزرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ مبادہ حسبِ عادت وہ ہمیں اپنے ساتھ پھر پیدل چلنے کی دعوت دے ڈالیں اور ہم انہیں انکار کر کے گستاخی کے مرتکب ہو جائیں۔

* *

کہانی پر بیٹھنا

پرویز یداللہ مہدی

اللہ والے مراقبے میں بیٹھتے ہیں۔ ڈھونگی پیر فقیر 'چلہ' پر بیٹھتے ہیں۔ جنگجو آدمی 'گھوڑے' پر بیٹھتے ہیں۔ پھسپھسے کمزور دل لوگ گدھے پر بیٹھتے ہیں۔ حسین لوگ سر آنکھوں پر بیٹھتے ہیں۔ خبیث لوگ اعصاب پر بیٹھتے ہیں، لیکن جن بدنصیبوں کی قسمت پھوٹ جاتی ہے وہ 'کہانی' پر بیٹھتے ہیں اور ان دنوں بفضلِ تعالیٰ ایک ایک کہانی پر کئی کئی کہانی نویس ایک ساتھ بیٹھتے ہیں۔ نتیجتاً بے چاری کہانی اتنا بوجھ سہہ نہیں پاتی اور 'پردہ سیمیں' پر پہنچنے سے پہلے ہی کاغذ پر دم توڑ دیتی ہے۔

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

کہانی پر بیٹھنے کی اصطلاح اگرچہ کہ خالص فلمی اصطلاح ہے، لیکن ملک کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے۔ فلمیں آج ہماری زندگی کا جزو لاینفک بن چکی ہیں۔ البتہ ایسے اصحاب جن کی 'کل' اس جزو لاینفک سے ابھی تک محروم ہے ان کی خاطر اس فلمی اصطلاح کی مختصر سی وضاحت پیش ہے۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں فلمی دنیا کی ہر بات ہر ادا نرالی ہے یہاں فلمی کہانی پر بحث مباحثے کے لیے کہانی نویسوں کی جو ملی جلی بیٹھک بلائی جاتی ہے، اسے انگریزی میں "Sitting" کہتے ہیں اور ہندوستانی میں کہانی پر بیٹھنا!

فلمی دنیا میں بے شمار اچھے برے کہانی نویس پہلے سے موجود ہیں اور آئے دن نئے نئے کہانی نویس بھی اپنی قسمت آزمانے آتے رہتے ہیں۔ تاہم کہانی نویسوں کی اس بھیڑ کے باوجود کہانیوں میں نہ تو کوئی انفرادیت نظر آتی ہے نہ نیا پن ہاں، ہر کہانی نویس کا کہانی پر بیٹھنے کا اپنا جداگانہ اسٹائل ضرور ہوتا ہے۔

ایک مشہور کہانی کار ہیں، جن کے نام کو فی الوقت ہم صیغۂ راز میں رکھنے پر مجبور ہیں۔ آدمی ویسے کافی مہذب اور سلیقہ مند ہیں، لیکن فلمی کہانی پر جب بھی بیٹھتے ہیں، بڑے ہی پھوہڑ انداز میں

'اکڑوں' بیٹھتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہم نے انہیں ازراہِ مذاق ٹوکا، ''قبلہ آپ کی اس مخصوص بیٹھک کو دیکھ کر یوں لگتا ہے، جیسے آپ کہانی پر نہیں، بلکہ 'ضرورت' کے لیے بیٹھے ہوں۔'' جواب میں موصوف نے اپنی بیٹھک میں ذرا بھی تبدیلی کیے بغیر فرمایا، ''یہ درست ہے کہ میں فی الوقت ضرورت کے تحت ضرور بیٹھا ہوں لیکن جس 'ضرورت' کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ فی الحال مجھے لاحق نہیں ہے البتہ ضرورت چاہے فطری ہو یا غیر فطری، ہر ضرورت مند اسی طرح اکڑوں بیٹھتا ہوں۔''

ایک اور مشہور اور معمر فلمی کہانی نویس و مکالمہ نگار ہیں، کسی زمانے میں جن کا طوطی بولتا تھا۔ ایک وقت میں آٹھ آٹھ فلمیں لکھتے تھے۔ کام کرنے کا ان کا طریقۂ کار جداگانہ ہونے کے ساتھ مضحکہ خیز بھی ہوا کرتا تھا۔ کرتے یوں تھے کہ لکھنے کے کمرے میں فلموں کی تعداد کے حساب سے میز کرسیاں لگوایا کرتے تھے۔ کام کے اوقات کو بھی فلموں کی تعداد کی مناسبت سے برابر برابر تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ پہلی کہانی کو مقررہ وقت پر دینے کے بعد دوسری کہانی کے لیے چھلانگ لگا کر دوسری میز پر پہنچ جاتے تھے۔ اس کے بعد تیسری، پھر چوتھی۔ اسی طرح تمام دن چھلانگ لگا کر کہانیوں پر کام کیا کرتے تھے۔ موصوف چوں کہ حقے سے بھی شغف فرماتے تھے، چنانچہ حقے کی لمبی نَے بھی موصوف کے ساتھ اُچھلا کرتی تھی۔ چنانچہ ان دنوں سنا ہے موصوف کا حقہ 'میوزیم' میں پہنچ گیا ہے اور خود موصوف کسی 'سرکس' میں بھرتی ہو گئے ہیں۔

بعض کہانی کار اِس زور سے کہانی پر بیٹھتے ہیں کہ بے چاری کہانی کا کچومر نکل جاتا ہے۔ چوں کہ کہانی نویس حضرات فلم ساز کی مرضی پر کہانی پر بیٹھتے ہیں، اس لیے اُس کی مرضی کے خلاف اُٹھ نہیں سکتے اور جو کم عقل اپنی مرضی سے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہیں پھر اُنہیں کسی کہانی پر 'بیٹھنا' تو دُور 'کھڑا ہونا' بھی نصیب نہیں ہوتا۔

کہانی پر کہانی کار کے علاوہ فلم ساز اور ہدایت کار کے ایسے چمچے بھی بیٹھتے ہیں، جو نام نہاد قسم کے دانشور ہوتے ہیں۔ روزانہ اُجرت پر کام کرنے والے اِن پیشہ ور حضرات کا کام کہانی کو آگے بڑھانا نہیں ہوتا، بلکہ کہانی کار کے کام میں روڑے اٹکانا ہوتا ہے۔ کہانی پر بیٹھنے والے جمگھٹے میں سب سے تکلیف دہ پوزیشن یا تو کہانی کار کی ہوتی ہے یا پھر کہانی کی۔

اس قبیل کا ایک واقعہ بھی سن لیجیے۔ ایک بیٹھک کے دوران جیسے ہی فلم ساز کے چمچے کو یہ علم

ہوا کہ کہانی کے تقاضے کے مطابق کہانی کار نے آخر میں ہیرو کو مار دیا ہے تو وہ دوڑا دوڑا گیا اور فلم ساز کو موقعِ واردات پر لے آیا۔ فلم ساز جس وقت کہانی کار کے روبرو پہنچا تو غصّے سے بھنایا ہوا تھا۔ آتے ہی برس پڑا۔ ”مسٹر تم کو اتنا مال دے کر کہانی پر اِس واسطے بٹھایا تھا کہ تم ہم کو ہی مار ڈالو۔“ کہانی نویس ہکا بکا رہ گیا۔ گڑ بڑا کر بولا، ”میں کچھ سمجھا نہیں سیٹھ جی، میں آپ کو کیوں ماروں گا۔ میں نے تو صرف ہیرو کو مارا ہے۔ وہ بھی کہانی کی "Demand" کے پیشِ نظر۔ اَب سیٹھ نے غصیلی نظروں سے اپنے چمچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”یہ تو بولتا ہے کہ اِس نے ہم کو نہیں ہیرو کو مارا ہے۔“ چمچے نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت جواب دیا، ”یہ سچ ہے سیٹھ جی کہ اس نے ہیرو کو مارا ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اپنے من پسند ہیرو کو مرتا دیکھ کر پبلک آپ کو مار دے گی۔ ہیرو تو لاکھوں روپے لے کر جھوٹ موٹ مرے گا، پھر زندہ ہو جائے گا۔ لیکن فلم پِٹ جانے کے بعد آپ کا سورگ باش ضرور ہو جائے گا۔“ چمچے کی اِس شاطرانہ چال نے بے چارے کہانی کار کو آنِ واحد میں کہانی پر سے ایسا اُٹھایا کہ بے چارہ مدتوں کسی کہانی پر نہیں بیٹھ سکا۔ بیٹھنے کے قابل ہی نہیں رہا۔

فلمی کہانی کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ بہت کم لکھی جاتی ہے زیادہ تر اڑائی جاتی ہے تو پھر کہانی پر بیٹھنے کا یہ کھڑاگ کس لیے پھیلایا جاتا ہے؟ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ اڑائی ہوئی کہانی میں کہانی نویس ایک ساتھ سر جوڑ کر ’توڑ جوڑ‘ کرتے ہیں۔ اور پھر ’بارہ مسالے‘ کی ایسی چاٹ تیار کرتے ہیں، جسے پبلک چٹخارے لے لے کر دیکھتی ہے اور فلم ساز روپے بٹورتا ہے اور ٹھاٹھ کرتا ہے۔ البتہ فلم پِٹ جانے کی صورت میں ’ٹھاٹھ‘ کے بجائے ’کھاٹ‘ فلم ساز کی منتظر ہوتی ہے۔ جس پر وہ اس وقت تک پڑا رہتا ہے جب تک کہ اس کی کوئی اگلی فلم ’ہٹ‘ نہیں ہو جاتی۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ یہی کھاٹ بے چارے فلم ساز کو قبرستان یا شمشان گھاٹ بھی پہنچا دیتی ہے۔

کہانی پر بیٹھکوں کا اہتمام زیادہ تر ہوٹلوں میں کمرے بک کروا کے کیا جاتا ہے۔ اونچے کہانی کاروں کی بیٹھک بھی اونچی ہوا کرتی ہے۔ یعنی یہ سلسلہ اکثر دُور دراز کشمیر کی برفیلی وادیوں تک پھیل جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جو بیٹھک سطحِ مرتفع سے جتنی زیادہ اونچی ہوتی ہے کہانی اتنی ہی نچلی سطح کی ہوتی ہے یعنی وہی بات جتنی اونچی دکان اُتنا ہی پھیکا پکوان۔

ہوٹلوں میں کمرے بک کروا کے جو بیٹھکیں بلائی جاتی ہیں۔ ان میں ایسے کہانی کاروں کو بڑا فائدہ ہوتا ہے، جو چھت سے محروم ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے کہانی کار بھی ہوٹلوں میں بیٹھک کو ترجیح

دیتے ہیں، جو شاندار بنگلوں اور فلیٹوں میں رہتے ہیں اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ کہانی کار ابتدا میں چھت سے محروم ہوتا ہے اور یہ محرومی چوں کہ اس کے مرحوم ہونے تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اسی لیے اس کی زندگی اس مصرعے کی تفسیر ہوتی ہے:

کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر...!!

’پردۂ سیمیں‘ پر خواتین کی جس قدر بھرمار ہے، پردے کے پیچھے اتنا ہی کال، یعنی فلم کے فنی شعبوں میں ابتدا ہی سے مردوں کی عمل داری رہی ہے۔ فلمی کہانی کے میدان میں بھی شروع سے مردوں کا راج رہا۔ کبھی کبھار ایک آدھ خاتون ادیبہ کے ناول پر فلم ضرور بنی ہے۔ ایک آدھ فلم کے مکالمے بھی کسی خاتون ادیبہ سے لکھائے گئے ہیں، لیکن یہ فلمیں چوں کہ باکس آفس پر کامیاب نہ ہوسکیں۔ اس لیے پھر کسی نے ان کی ہمت افزائی کی ہمت نہیں کی۔ ابھی حال ہی میں ہماری ملاقات ایک ایسی خاتون ادیبہ سے ہوئی، جو فلموں میں کہانی گیت اور مکالمے لکھنے کی خواہشمند ہیں۔

ہم نے ان سے پوچھا، ’’جیسا کہ آپ جانتی ہیں فلمی دنیا کے کسی شعبے میں بغیر جدوجہد اور "Struggle" کے چانس نہیں ملتے۔ آپ بھی یقیناً جدوجہد کے دور سے گزر رہی ہوں گی۔‘‘

’’جی ہاں۔‘‘ خاتون ادیبہ نے جواب دیا۔

’’مردوں کی بہ نسبت میں سمجھتا ہوں آپ کو اتنے حوصلہ شکن حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا ہوگا۔ ہم نے انہیں کریدا۔

’’آپ کا کہنا کسی حد تک درست ہے۔ لیکن آزمائشوں سے میں بھی گزر رہی ہوں۔‘‘

محترمہ کے اس اعتراف پر ہم نے پوچھا، ’’کہیں ان آزمائشوں نے آپ کو نا اُمید تو نہیں کردیا۔‘‘

’’ہرگز نہیں جناب۔‘‘ موصوفہ نے ٹھوس لہجہ میں کہا، ’’نا اُمیدی مجھے چھو کر بھی نہیں گزر سکتی۔ آپ کی دعا سے میں تو اُمید سے ہوں۔‘‘

محترمہ کے اس جواب نے ہمیں اس قدر چونکا دیا کہ دوبارہ پھر ان سے ملاقات کرنے کی ت نہیں ہوئی۔ البتہ آج بھی جب موصوفہ کا خیال آجاتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ چل کر ملاقات کی

جائے۔ ان سے نہیں ان کی 'اُمید' کے نتیجے سے!

عام خیال یہ ہے کہ موجودہ رجحان کے مطابق فلمی کہانی لکھنا کچھ مشکل کام نہیں۔ لیکن اسے سنانا ایک فن ضرور ہے اور یہ آرٹ کسی فائن آرٹس کالج سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ اس آرٹ کے ڈانڈے کسی فائن آرٹس سے نہیں ملتے، بلکہ مسمریزم، ہپناٹزم سے ملتے ہیں۔ بعض کامیاب کہانی کاروں کے بارے میں افواہ مشہور ہے کہ 'بھانامتی' جیسا خطرناک جادو تک جانتے ہیں!

ایسے ہی ایک کہانی نویس کے تعلق سے مشہور ہے کہ کہانی سناتے ہوئے کہانی کا ایک حصہ بن جاتے تھے یعنی جب کہانی میں رونے دھونے کا سین آتا، موصوف خود دھاڑیں مار کر رونے لگتے تھے۔ اسی طرح مزاحیہ سین سناتے تو خود ہنسی کا غبارہ بن جاتے اور مار دھاڑ کے سین سناتے تو کافی خوں خوار ہو جاتے تھے یعنی مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ سنا ہے ایک مرتبہ کوئی نازک سا نوجوان پروڈیوسر موصوف کے یہاں کہانی سننے پہنچا، لیکن تھوڑی ہی دیر بعد موقع واردات پر موجود راویوں کے بیان کے مطابق نوجوان فلم ساز کہانی نویس کے کمرے سے حواس باختہ نکلا اور پھر بے تحاشا سڑک پر دوڑتا چلا گیا۔ جب گھر کے بھیدی سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو معلوم ہوا کہ کہانی نویس نے بے چارے فلم ساز کو کہانی کا وہ سین عملاً سنانے کی کوشش کی تھی، جس میں ویلن ہیروئن کی آبرو ریزی کی کوشش کرتا ہے۔

چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ جو آخری کہانی انہوں نے سنانے کی کوشش کی تھی وہ ایک مرڈر میسٹری "Murder Mystry" سے بھرپور کہانی تھی۔ جس کے پہلے ہی سین میں ایک قتل دکھایا گیا تھا۔ چنانچہ ان دنوں کہانی نویس موصوف قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ یہ تو خیر ایک ایسے کہانی نویس کی داستاں تھی جنہوں نے راست اپنے ہاتھ خون میں رنگے تھے۔ اب ایک ایسے کہانی نویس کا قصہ سنیے، جو چار چار قتل کرنے کے باوجود آزادانہ گھوم پھر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ موصوف ایک عدد دھانسو کہانی کے ساتھ فلم انڈسٹری میں داخل ہوئے۔ ایک فلم ساز کو پھانسا، کہانی سنائی۔ ادھر کہانی ختم ہوئی ادھر فلم ساز ختم۔ دوسرے پروڈیوسر کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس کے بعد ایک اور غافل فلم ساز ان کی کہانی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اب اس خونی کہانی کے چرچے انڈسٹری میں اس قدر عام ہو چکے تھے کہ تمام فلم ساز چوکنے ہو گئے۔ اپنی جان سبھی کو پیاری ہوتی ہے۔ انہی دنوں ایک نئے فلم ساز کی آمد کی خبر سن کر کہانی نویس اپنی خونی کہانی سمیت پہنچ گئے۔

لوگوں نے بے چارے نو آموز فلم ساز کی جان کی خبر سنائی۔ فلم ساز سچ مچ سخت جان ثابت ہوا۔ کہانی سننے کے بعد بھی زندہ نظر آیا۔ ایک دن بیتا، دوسرا دن بیتا، پھر تیسرا اسی طرح چار دن بیت گئے۔ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ خطرہ ٹل گیا، لیکن پانچویں روز اچانک فلم ساز کے انتقال کی خبر پھیلی۔ نامہ نگاروں نے کہانی نویس کو جا گھیرا۔ سب کی زبان پر یہی ایک سوال تھا۔ پچھلے تین فلم ساز تو کہانی سنتے ہی ڈھیر ہو گئے تھے۔ لیکن یہ چوتھا فلم ساز چار دن تک کیسے اور کیوں کر زندہ رہا...!''

جواب میں کہانی نویس نے چٹکی بجاتے ہوئے یہ مسئلہ حل کر دیا، دراصل اس فلم ساز کو میری کہانی چار روز بعد سمجھ میں آئی... بس...''

کہانی نویس کے ہاتھوں فلم سازوں کا حشر آپ نے سنا، بلکہ دیکھا لیکن جب کہانی نویس فلم ساز کے ہتے چڑھ جاتا ہے تو اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ کہتے ہیں کہ ایک مشہور فلم ساز کے ہاں ایک نو آموز کہانی نویس کہانی سنانے پہنچا۔ کہانی جس وقت شروع ہوئی فلم ساز کے چھوٹے بچے بھی وہیں پاس بیٹھے کھیل میں مشغول تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد کہانی نویس کو محسوس ہوا کہ فلم ساز کا دھیان کہانی کے بجائے اپنے بچوں کی طرف ہے، وہ اپنے بچوں کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرے جا رہا ہے۔ کہانی کے ساتھ ایسا سوتیلا سلوک کہانی نویس کو کھل گیا۔ اس نے کہانی روک دی اور جھنجھلا کر بولا، ''میں کہانی سنا رہا ہوں اور آپ کا دھیان بچوں کی طرف لگا ہوا ہے۔ آخر اس بے توجہی کی وجہ؟''

فلم ساز نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا، ''میں دراصل اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

یہ جواب سن کر کہانی نویس اور بھی جھنجھلا گیا اور بولا، ''مگر میری کہانی سے آپ کے بچوں کے مستقبل کا کیا تعلق؟

جواب میں فلم ساز نے اسی طرح سرد لہجے میں کہا، ''بڑا گہرا تعلق ہے اگر میں نے آپ کی کہانی پر فلم بنا ڈالی تو پھر ان بچوں کا جو حشر ہوگا وہ مجھے ابھی سے صاف نظر آ رہا ہے۔''

فلمی کہانیاں عموماً فلمساز اداروں کی معاشی حیثیت اور ان کی سابقہ فلموں کے معیار اور مزاج کو مدنظر رکھ کر تیار کی جاتی ہیں۔ اس لیے کہانی کی خرید و فروخت کے معاملے میں صحیح پارٹی کے در پر صدا لگانا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ بڑا لطیفہ ہوا۔ میرے ایک شناسا کو فلمی کہانیاں

گڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ آئے دن اپنی طویل طویل کہانیاں سنا کر مجھ سے مشورہ طلب کرتے ہیں کہ کون سی پارٹی یہ کہانی سنتے ہی خرید لے گی؟ ایک روز حسبِ معمول موصوف نے اپنی فلمی کہانی سنائی، جس میں مزدوروں کے مسائل، ہڑتالوں اور سرمایہ داروں کی سیاسی چالوں کی بھرمار تھی۔ چنانچہ موصوف نے کہانی ختم کرکے جیسے ہی مجھ سے مشورہ طلب کیا کہ اس کہانی کو کون سی پارٹی کو سنانا مناسب ہوگا۔ تو میں نے برجستگی سے کہا، ”یہ کہانی آپ کمیونسٹ پارٹی کو سنایئے۔“

کہتے ہیں ہر فنکار کو تخلیق کے کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔ چاہے فن کار مقدر کا سکندر ہو یا مقدر کا مچھندر۔ تخلیق کا کرب اس کا مقدر رہتا ہے، اس کلیے کی روشنی میں یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ کہانی کو جنم دینا کسی جیتے جاگتے ہمکتے ہوئے وجود کو جنم دینے سے کم نہیں ہوتی۔ البتہ فلمی کہانی کا جنم عموماً غیر فلمی ہوتا ہے۔ یعنی فلمی کہانی فطری طریقہ سے خود بخود پیدا نہیں ہوتی، بلکہ ’سیزیرین‘ کے ذریعہ اسے بطن فنکار سے باہر لایا جاتا ہے۔“ بعض اوقات تو فلم ساز اور اس کی حاشیہ بردار چنڈال چوکڑی اس قدر دھما چوکڑی مچاتی ہے کہ جو کہانی جنم لیتی ہے وہ اس نومولود کی طرح نحیف اور کمزور ہوتی ہے، جو ساتویں ہی مہینے میں تولد ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے آپ میں سے بہتوں نے کہانی کار کو نہ دیکھا ہو۔ لیکن انڈوں پر بیٹھی ہوئی مرغی ضرور دیکھی ہوگی۔ بے چارے کہانی کار کی کچھ ایسی پوزیشن ہوتی ہے اور جس طرح مرغی یہ نہیں دیکھتی کہ جن انڈوں پر اُسے بٹھایا گیا ہے وہ اس کے اپنے ہی ہیں یا کسی اور کے۔ اسی طرح کہانی کار کو بھی اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ کہانی کس کی ہے۔ اس کا کام تو بس کہانی پر بیٹھنا ہوتا ہے۔ البتہ مرغی اس معاملے میں خوش قسمت ہوتی ہے کہ مقررہ میعاد کے بعد انڈوں میں سے ’چوں چوں‘ کرتے چوزے نکل آتے ہیں، جب کہ اکثر کہانی کار اپنی ’چول چول‘ ڈھیلی کروانے کے بعد بھی کہانی کے انڈوں میں سے چوزہ تو دور مرا چوہا بھی نہیں نکال پاتے۔ بس کڑک مرغی کی طرح کڑکڑاتے رہ جاتے ہیں!

* *

اُردو کی آخری کتاب

پطرس بخاری

ماں کی مصیبت

ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے اور دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بچہ حسبِ معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کے منہ کو تک رہی ہے اور پیار سے حسبِ ذیل باتیں پوچھتی ہے!

ا۔ وہ دن کب آئے گا جب وہ میٹھی میٹھی باتیں کرے گا؟

۲۔ بڑا کب ہوگا؟ مفصل لکھو۔

۳۔ دولہا کب بنے گا اور دلہن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔

۴۔ ہم کب بڈھے ہوں گے؟

۵۔ تو کب کمائے گا؟

۶۔ آپ کب کھائے گا؟ اور ہمیں کب کھلائے گا؟ باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر واضح کرو۔ بچہ مسکراتا ہے اور کیلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے جب ننھا سا ہونٹ نکال نکال کر باقی چہرے سے رونی صورت بناتا ہے۔ تو یہ بے چین ہو جاتی ہے۔ سامنے پنگوڑا لٹک رہا ہے۔ سلانا ہو تو افیم کھلا کر اس میں لٹا دیتی ہے۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی ہے (باپ کے ساتھ دوسرا بچہ سوتا ہے) جاگ اُٹھتا ہے تو جھٹ چونک پڑتی ہے اور محلے والوں سے معافی مانگتی ہے۔ کچی نیند میں رونے لگتا ہے۔ تو بے چاری ماتا کی ماری آگ جلا کر دودھ کو ایک ابال دیتی ہے۔ صبح جب بچے کی آنکھ کھلتی ہے تو آپ بھی اُٹھ بیٹھتی ہے اس وقت تین بجے کا عمل ہوتا ہے۔ دن چڑھے منہ

دھلاتی ہے۔ آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے اور جی کڑا کر کے کہتی ہے کیا چاند سا مکھڑا نکل آیا واہ واہ۔

کھانا خود بخود پک رہا ہے

دیکھنا۔ بیوی آپ بیٹھی پکا رہی ہے۔ ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے۔ ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے۔ دھوے دھائے برتن صندوق پر چنے ہیں، تاکہ صندوق کھل سکے۔ ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں۔ کسی میں دال ہے اور کسی میں آٹا کسی میں چولہے پھکنی اور پانی کا لوٹا پاس ہے، تاکہ جب چاہے آگ جلالے جب چاہے پانی ڈال کر بجھا دے۔ آٹا گندھا رکھا ہے چاول پک چکے ہیں۔ نیچے اُتار کر رکھے ہیں۔ دال چولہے پر چڑھی ہے۔ غرض یہ کہ سب کام ہو چکا ہے۔ لیکن یہ پھر بھی پاس بیٹھی ہے میاں جب آتا ہے تو کھانا لاکر سامنے رکھتی ہے۔ پیچھے کبھی نہیں رکھتی، کھا چکتا ہے تو کھانا اُٹھا لیتی ہے۔ ہر روز یوں نہ کرے تو میاں کے سامنے ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جائے۔ کھانے پکانے سے فارغ ہوتی ہے۔ تو کبھی سینا لے بیٹھتی ہے۔ کبھی چرخہ کاتنے لگتی ہے کیوں نہ ہو؟ مہاتما گاندھی کی بدولت یہ ساری باتیں سیکھی ہیں۔ آپ ہاتھ پاؤں نہ ہلائے تو ڈاکٹر سے علاج کروانا پڑے۔

دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے

بڑی محنت کرتا ہے۔ شام کو بھٹی چڑھاتا ہے دن بھر بیکار بیٹھا رہتا ہے۔ کبھی کبھی بیل پر لادکر لادتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے۔ کبھی نالے پر دھوتا ہے کبھی دریا پر تاکہ کپڑوں والے کبھی پکڑ نہ سکیں۔ جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے۔ گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے۔ صرف بہار کے موسم میں کام کرتا ہے۔ دوپہر ہونے آئی اب تک پانی میں کھڑا ہے۔ اس کو ضرور سرسام ہو جائے گا۔ درخت کے نیچے بیل بندھا ہے۔ جھاڑی کے پاس کتا بیٹھا ہے۔ دریا کے اس پار ایک گلہری دوڑ رہی ہے؟ دھوبی انہیں سے اپنا جی بہلاتا ہے۔

دیکھنا دھوبن روٹی لائی ہے۔ دھوبی کو بہانہ ہاتھ آیا ہے۔ کپڑے پٹڑے پر رکھ کر اُس سے باتیں کرنے لگا۔ کتے نے بھی دیکھ کر کان کھڑے کیے۔ اب دھوبن گانا گائے گی۔ دھوبی دریا سے

نکلے گا۔ دریا کا پانی پھر نیچا ہو جائے گا۔

میاں دھوبی! یہ کتا کیوں پال رکھا ہے؟ صاحب کہاوت کی وجہ سے اور پھر یہ تو ہمارا چوکیدار ہے دیکھیے! امیروں کے کپڑے میدان میں پھیلے پڑے ہیں کیا مجال کوئی پاس تو آ جائے، جو لوگ ایک دفعہ کپڑے دے جائیں پھر واپس نہیں لے جا سکتے۔ میاں دھوبی تمہارا کام بہت اچھا ہے میل کچیل سے پاک صاف کرتے ہو۔ ننگا پھراتے ہو۔

◆ ◆

ضرورتِ رشتہ

جاوید اصغر

شادی جیسے روحانی، تہذیبی اور نفسیاتی فرض کی ادائیگی کے لیے جن اشیا کی اشد ضرورت ہوتی ہے ان میں رشتہ سرِ فہرست ہے۔ جب تک آپ کو رشتہ دستیاب نہ ہو آپ اور جو چاہیں کر لیں کم اَز کم شادی نہیں کر سکتے۔ یوں، رشتے کی تلاش کے بغیر شادی اور شادی کے ارادے کے بغیر رشتے کی تلاش نہ صرف معیوب لگتی ہے، بلکہ ایسے افعال سرانجام دیتے ہوئے بعض اوقات منہ کی بھی کھانا پڑتی ہے۔ گئے وقتوں میں شادی کرنا اتنا مشکل نہ تھا جتنا رشتہ تلاش کرنا۔ حالاں کہ اس زمانے میں رشتوں کے مسائل اور وسائل اتنے گمبھیر نہ تھے جتنے آج ہیں۔ اس وقت گاؤں کے میراثی کو علم ہوتا تھا (اللہ جانے کیسے پتا کرتا تھا) کہ کون سا بچہ یا بچی رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کو تیار بیٹھے ہیں۔ یوں وہ ہاتھوں میں 'چھوارے' لے کر چلتا اور جہاں اور جس کے ساتھ میراثی راضی ہوتا، رشتہ طے پا جاتا۔

اس وقت رشتے دستیاب تو تھے، لیکن لڑکیوں کے رشتوں کے لیے لڑکوں کے والدین کو اپنی 'جوتیاں' توڑنا پڑتی تھیں۔ (وہ جوتیاں توڑ کر کلیم "Claim" نہیں کرتے تھے، بلکہ لڑکی والوں کے گھر رشتہ مانگنے کے لیے آتے جاتے جوتیاں گھس جاتی تھیں) دیگر شرائط اتنی سخت نہ تھیں۔ صرف لڑکے اور اُس کے خاندان کی شرافت ہی کو معیار سمجھا جاتا تھا۔ اور لڑکیوں کے والدین کو بھی آج کی طرح، رشتے 'دریافت' نہیں کرنے پڑتے تھے۔ رشتے طے کرتے وقت بیٹیوں کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ رشتے ہونے کی اس ساری کارروائی میں لڑکا اور لڑکی بالکل بے قصور ہوتے، بلکہ بقول عطاء الحق قاسمی:

''شادی کرتے ہوئے ان سے پوچھا جاتا اگر وہ راضی ہوتے تو شادی کر دی جاتی اور اگر نہ راضی ہوتے تب بھی کر دی جاتی!'' شادی ہونے کے بعد 'متاثرین' ایک عرصے تک باری باری

شرمانے کا مشرقی فریضہ سرانجام دیتے۔ والدین کی طے شدہ شادیاں والدین ہی کے بقول، اکثر کامیاب رہتیں۔ رشتوں کے معاملے میں 'کچھ لو اور کچھ دو' یعنی وٹہ سٹہ کا اُصول بھی مدِ نظر رکھا جاتا۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

زمانے کی اقدار و روایت کیا بدلیں، اشتہار سازی کی مہم نے 'ضرورتِ رشتہ' جیسے خالصتاً نجی معاملے میں بھی اپنی ٹانگ اڑا کر میراثیوں کا مستقبل تاریک کر دیا۔ اب ضرورتِ رشتہ کے اشتہارات شائع کیے جانے لگے ہیں۔ جن میں 'فریقین' کے تمام کوائف شائع کیے جاتے ہیں۔ ستم یہ کہ لوگوں نے اسے بھی کاروبار بنا لیا ہے اور شادی دفتر تک کھول لیے ہیں، اور ستم بالائے ستم یہ کہ شادی کو واقعی دفتری کارروائی بنا کے رکھ دیا ہے۔ اشتہارات میں اگرچہ شادی کرنے کے لیے بے تاب مرد و زن کے کوائف جاری کیے جاتے ہیں، لیکن ہمارے ذاتی خیال میں یہ اشتہارات ادھورے ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض عبارات کو حذف کر دیا جاتا ہے، جس سے صورتِ حال پوری طرح واضح نہیں ہو پاتی۔ یہ اشتہارات اس طرح ہونے چاہییں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

اشتہار نمبر 1

30 سالہ دوشیزہ، دراز قد (عمر کی طرح ہی) گرین کارڈ ہولڈر (طویل العمری کا منطقی سبب بھی گرین کارڈ کا حصول ہے) گریجویٹ، ایک کنال کوٹھی دوشیزہ کے نام (شادی کے بعد باقی خاندان اسی کوٹھی میں رہے گا، اب کوٹھے پر تو نہیں جائے گا نا!) کے لیے سمارٹ، ہنس مکھ، کروڑ پتی (بشرطیکہ وہ رزقِ حلال نہ ہو) نوجوان، بلکہ بالکل نوجوان کا رشتہ درکار ہے۔ موصوف کا محبّ وطن ہونا ایک اضافی خوبی تصور کی جائے گی۔

اشتہار نمبر 2

ایک **45** سالہ نوجوان، خوب صورت بھی، دراز قد، گھنگھریالے بال (کالا کولا کے استعمال کے بغیر سفید نظر آتے ہیں) ایم اے۔ امریکا، لندن اور دبئی میں اپنا ذاتی کاروبار (یعنی وہی کام کرتے ہیں، جو اِن کی ذات کے لوگ وہاں کرتے ہیں) کے لیے ایک نہایت ہی نوجوان دوشیزہ درکار ہے، جو اُمورِ خانہ داری میں ماہر ہو۔ چلو شریف بھی ہو۔ عقل مند ہونا ضروری نہیں۔

ہم بتاتے چلیں کہ ایک روز ہم بھی 'تفننِ طبع' کے لیے ان اشتہارات کو بنظرِ غائر پڑھ رہے

تھے کہ درمیان میں ہی 'ضرورتِ گردہ' کا بھی اشتہار نظر آیا، جو ہمارے ذوق پر تو گراں گزرا، لیکن ہم نے اسے کتابت کی غلطی سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

آج کل خود سے طے شدہ رشتوں میں بہت سے مراحل تو 'زوجین' پہلے ہی طے کر لیے ہیں۔ والدین کو تو صرف اخلاقی حمایت حاصل کرنے اور 'سنگِ بنیاد' رکھنے کے لیے 'طلب' کیا جاتا ہے۔ جو رشتے والدین طے کرتے ہیں اس میں لڑکے والے خُور نما، پڑھی لکھی، سلیقہ شعار اور زیادہ جہیز لانے والی کو پسند کرتے ہیں۔ (جہیز آنے کے بعد بعض لڑکے والے تو لڑکی سے بھی دستبردار ہونے کو تیار ہو جاتے ہیں) اور لڑکی والوں کی خواہش ہوتی ہے لڑکا خوب صورت ہو، مالدار ہو، سرکاری ملازم ہونے کی صورت میں 'ایمان داری' کو اپنے تمام اُمور میں پہلی و آخری رکاوٹ سمجھتا ہو۔ اکیلا ہو اور اگر بزورِ تقدیر والدین رکھتا بھی ہو تو انہیں خود سے جدا کرنے کے لیے دامے، درمے، سخنے، قدمے، تیار ہو۔

کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں کہ اگر ضرورتِ رشتہ کے اشتہارات اسی شد و مد کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر بکھرتے رہے اور روزگار کے اشتہاروں کی بندش اسی طرح جاری رہی تو مستقبل کے بارے میں کوئی سی بھی خطرناک پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ اس سے جہاں ہمارے خاندانی نظام کو دھچکا لگنے کا خطرہ ہے، وہاں 'شٹل کاک' والا برقع اوڑھنے والی خالاؤں کا کاروبار بھی متاثر ہوگا۔

ہم وضاحت کرتے چلیں کہ ہمارے اس مضمون کو ہماری طرف سے 'ضرورتِ رشتہ' کا اشتہار نہ سمجھا جائے، باوجود یہ کہ ہم بھی چار جماعت پڑھے، ٹھیک ٹھاک خوب صورت اور جوان ہیں، کیوں کہ 'نو' تو عہدِ رفتہ کا قصہ ہوا۔

* *

ٹوئنٹی ٹوئنٹی

جاوید علی

وقتِ واحد میں چار کی جو سہولت دی گئی ہے، اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم نے بھی دو عدد شادیاں کر رکھی ہیں۔ ہماری دوسری بیگم کا نام ہے ’کرکٹ‘۔ آئے دن اس کھیل نے جس تیزی سے نئے پیراہن اوڑھے ہیں، اس کا جواب نہیں۔ ’ٹیسٹ کرکٹ‘ سے ’وَن ڈے کرکٹ‘ تک، پھر زمانہ آ گیا ’ٹوئنٹی ٹوئنٹی‘ کا۔ اب اس کے آگے کیا ہوگا، یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ ”بات نکلے گی تو پھر دُور تلک جائے گی۔“ کرکٹ میں یہ اختصار، زندگی کے دوسرے شعبوں پر کس طرح اثر انداز ہوا ہے، اس کی ایک مثال اس چھوٹی سی کہانی میں بھی ملتی ہے:

پچھلے ماہ ہم مختصر دورے پر اپنے وطنِ عزیز یعنی حیدرآباد دکن گئے تھے۔ کام ہی کچھ ایسا آن پڑا تھا کہ جانا پڑا۔ شاید یہ پہلی دفعہ ہوا کہ اتنی قلیل مدّت کے لیے ہم ہندوستان گئے، ورنہ ہمارا تو یہ ریکارڈ ہے کہ جب بھی ہم رخصت پر گئے، دو ماہ سے کم نہیں ٹھہرے۔ ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ واپسی کی تاریخ میں ہمیشہ ردّ و بدل ہوتا رہا ہے۔ اکثر ہمارا قیام اتنا لمبا ہو جاتا ہے کہ اہلِ محلّہ کو تشویش لاحق ہو جاتی ہے اور پوچھ بیٹھتے ہیں، ”میاں! کیا آپ "Final Exit" پر آ گئے کیا؟“ ایسی صورت میں ایک ایک کو یقین دلانا پڑتا ہے کہ ہم جلد ہی واپس جانے والے ہیں۔ ویسے لوگوں کو یقین اسی وقت آتا ہے، جب ہم واقعی کُوچ کر چکے ہوتے ہیں۔ ہمیں حیدرآباد پہنچے ہوئے ابھی چار دن ہی ہوئے تھے کہ خبر آئی ہماری چچی گزر گئی ہیں۔ ایک بیرونِ ملک مقیم شخص جب کبھی چھٹی پر جاتا ہے تو اسے شادی، منگنی، سالگرہ وغیرہ کی تقریبات میں شرکت کے مواقع تو ملتے ہی رہتے ہیں، مگر کبھی کبھی ایسے افسوسناک واقعات بھی رونما ہو جاتے ہیں۔

اپنی متوقع واپسی سے دو روز قبل ہم ناشتے سے فارغ ہو کر ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے پورے انہماک سے ایک لائیو کرکٹ میچ دیکھ رہے تھے کہ بیگم کی آواز کانوں میں پڑی، ”آپ کو اپنی

واپسی کی بکنگ کنفرم کروانے جانا ہے۔ دوپہر ہونے کو آئی ہے۔ ” ہم ابھی اس وارننگ کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اُڑا دینے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ نوکرانی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور بولی، ” صاحب! باہر کوئی صاحب آئے ہیں اور اپنا نام حافظ صاحب بتاتے ہیں۔ ” ہم تذبذب میں پڑ گئے کہ یہ کون صاحب ہوں گے۔ پہلے تو کبھی اس لقب کے کوئی صاحب ہم سے ملنے نہیں آئے۔ بہرحال، ہم باہر نکلے، اُن صاحب سے علیک سلیک ہوئی تو وہ کچھ یوں مخاطب ہوئے، ” حضرت، میرا نام بلیغ الدین ہے اور میں حافظ صاحب کے نام سے جانا جاتا ہوں۔ آپ کی چچی کے انتقال کی خبر سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ بہرحال، آپ سے عرض یہ کرنا تھا کہ اگر آپ اپنی مرحومہ چچی کے نام پر قرآن بخشوانا چاہتے ہیں تو مجھے حکم دیجیے۔ میں روز ایک پارہ پڑھ کر پورے ایک ماہ میں ختم کر دوں گا، آپ کے قیام تک۔ ” ہم شش و پنج میں پڑ گئے کہ انہیں کیسے سمجھائیں کہ ہم ان کی پیشکش قبول کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ صرف اتنا کہہ سکے، ” مولانا! آپ کی پیشکش کا شکریہ، مگر ہم کل واپس جا رہے ہیں اور... ” مولانا نے ہماری بات پوری بھی نہ ہونے دی اور برجستہ فرمایا، ” دیکھیے! مرحومہ کی رُوح کو ثواب پہنچانے اور اپنے فرض کی ادائیگی کا ایسا موقع ہاتھ سے جانے مت دیجیے۔ آپ کے لیے ایک اسپیشل آفر ہے۔ میرے پاس ایک قرآن ’پڑھا ہوا‘ بھی موجود ہے۔ آپ میرا معاوضہ عنایت کر دیجیے۔ میں وہی پڑھا ہوا قرآن آپ کی مرحومہ چچی کے نام پر بخش دیتا ہوں!!! ”

* * *

روشن خیال

چراغ حسن حسرت

میرے دوست چودھری علی محمد باتونی حجاموں سے بہت ڈرتے ہیں اور اس معاملے میں وہ حق بجانب ہیں کیوں کہ ان کا حجام جس کے خاندان میں سو پشت سے ’حاجمی‘ یا یوں کہیے ’خلافت‘ چلی آتی ہے اسی طرح ان کا مزاج شناس ہے۔ جس طرح اُس کے باپ دادا چودھری صاحب کے آباواجداد کے مزاج شناس تھے جہاں خط بناتے بناتے استرا شہ رگ کے قریب پہنچا، خلیفہ نے کہا۔

’’چودھری بھینس کے لیے گھاس چاہیے۔‘‘

چودھری بے چارہ اس حالت میں انکار کرنے سے تو رہا۔ چہرے پر مسکراہٹ کے آثار پیدا کرنے کی ایک ناکام کوشش کرتے ہوئے جواب دیا! ’’لے جائیو۔‘‘

خلیفہ نے پانی دیکھ کر پاؤں پسارے اور کہنے لگا۔

’’چودھری اب کے دھان سے ہمیں کوئی حصہ نہیں ملا۔‘‘

چودھری بولے، ’’ملے گا ضرور ملے گا۔‘‘

غرض خلیفہ نے خط بناتے بناتے چودھری کو مونڈ لیا۔

میں باتونی حجاموں سے کبھی نہیں ڈرا تھا لیکن پارسال ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کی ہیبت میرے دل پر بٹھا دی، شام کا وقت تھا اور میں ایک دعوت میں شریک ہونے جا رہا تھا رپن اسٹریٹ سے آگے بڑھا تو سامنے ایک حجام کی دکان نظر آئی جس پر ہیئر کٹنگ سیلون لکھا تھا۔ میں نے دو دن سے حجامت نہیں بنوائی تھی دکان دیکھ کر میرا بایاں ہاتھ بے اختیار ٹھوڑی پر پہنچ گیا اور میں نے جی میں کہا کہ لاؤ اس سے دو منٹ میں حجامت کیوں نہ بنوالیں۔

مجھ سے پہلے دکان میں صرف ایک لمبے قد اور چوڑے ہاڑ کا آدمی بیٹھا خط بنوا رہا تھا۔ اس کے بڑے بڑے گلچھے اس طرح معلوم ہوتے تھے جیسے کنویں کی جگت پر آر پار دو کوے بیٹھے ہوں

خلیفہ نے میری طرف دیکھے بغیر کہا، ”تشریف رکھیے میں ابھی فارغ ہوا چاہتا ہوں۔“

یہ حجام چھوٹے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا آدمی تھا۔ میری طرف تو اس کی پشت تھی لیکن آئینے میں سے اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا اس کے گال پچکے ہوئے اور آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئی تھیں خط بنانے سے فارغ ہو کر اس نے میری طرف توجہ کی اور کہنے لگا:

”فرمائیے آپ بال کٹوائیں گے یا صرف داڑھی منڈوانے کا ارادہ ہے؟“

میں نے جواب دیا، بال تو پھر کبھی کٹواؤں گا اس وقت مجھے صرف داڑھی منڈوانا ہے!“

”آپ کی داڑھی کے بال ذرا سخت معلوم ہوتے ہیں اور میں ہمیشہ اصول فن کو مدنظر رکھتا ہوں اس لیے داڑھی منڈوانے میں آپ کو ذرا دیر تو ضرور لگے گی لیکن حجامت ایسی ہوگی کہ گھنٹہ بھر کھونٹی ٹٹولتے رہے اور سراغ تک نہ ملے۔ اصل میں یہ فن ایسا آسان نہیں کہ جس کسی کو استرا پکڑنا آ گیا حجام بن بیٹھا۔“

”میں حجام کوئی کوئی، ہوتا ہے ورنہ جو لوگ کسوت بغل میں دابے پھرتے ہیں اور حجام اور خلیفہ اور خدا جانے کیا کیا کہلاتے ہیں گھسیارے ہیں گھسیارے۔ دراصل گھسیارے اور حجام کھرپے اور استرے میں بڑا فرق ہے مگر اس فرق کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جنہیں اللہ نے سوجھ بوجھ دی ہے یہ کہہ کر اس نے اپنے نائب کو اشارہ کیا اور وہ برش لے کر میری طرف بڑھا حجام استرا تیز کرتے ہوئے بولا:

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے پچھواڑے جو ہوٹل ہے وہاں کل رات ایک خون ہو گیا۔ سنا ہے لکھنو کے ایک نوجوان سیٹھ کو کسی ظالم نے چھری بھونک کر مار ڈالا مقتول کی نوجوان بیوی اس کے ساتھ تھی وہ کہتی ہے کہ آدھی رات کو کسی نے ہمارے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا میرا شوہر باہر نکلا کوئی آدمی کمبل اوڑھے کھڑا تھا۔ کچھ دیر دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے پھر مجھے اپنے شوہر کی چیخ سنائی دی اور ساتھ ہی ایسا معلوم ہوا کہ چند لوگ بڑے زور سے بھاگ رہے ہیں۔

”میں نے خود لاش دیکھی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی وار میں آنتیں باہر نکل آئیں اور مقتول تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا اور عجیب بات یہ ہے کہ جس کرسی پر آپ بیٹھے ہیں ابھی دو دن ہوئے بے چارا سیٹھ یہاں بیٹھا ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کر رہا تھا!“

یہ سن کر میرے سارے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ حجام نے استرا میری کنپٹی پر رکھ دیا اور کہنے لگا،

”میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جس عمارت میں یہ ہوٹل ہے اس میں بھوتوں کا بسیرا ہے۔ اکثر لوگوں نے

رات کے وت ایک سیاہ پوش کو پھرتے دیکھا ہے اس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے اور اس میں سے خون بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ دوسرے ہاتھ میں تلوار ہے جسے گھماتا ہوا وہ ہوٹل میں سے گزرتا چلا جاتا ہے۔"

یہ کہتے کہتے خلیفہ نے استرے کو گھمایا تو میں سہم گیا۔ تھوڑی دیر وہ چپ چاپ حجامت کرتا رہا پھر کہنے لگا:

"کبھی آپ نے سوچا کہ اگر کوئی حجام حجامت کرتے کرتے پاگل ہو جائے تو کیا ہو؟ دیکھیے نا! اس وقت استرا آپ کے حلق پر ہے اگر میں چاہوں تو..." یہ کہہ کر اس نے اس طرح میری طرف دیکھا کہ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ داڑھی مونڈ چکا تو کہنے لگا۔ "اب ذرا آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ فرمائیے اور میری ہنرمندی کی داد دیجیے۔"

"میں تو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا کڑک کر کہا:

"بھاڑ میں گئے تم اور تمہاری ہنرمندی۔"

وہ بولا، "کیا ہوا؟"

میں نے کہا، "چہ خوش! ابھی کچھ ہوا ہی نہیں تم سے یہ جنوں بھوتوں کی کہانیاں اور قتل و خون کے قصے سنانے کو کس نے کہا تھا:"

وہ کہنے لگا اچھا تو آپ میری باتیں سن کر پریشان ہو گئے حالاں کہ میری ہنرمندی استرے کی باڑھ میں نہیں انھی باتوں میں ہے آپ نے اتنا تو سنا ہوگا کہ خوف و دہشت کے عالم میں انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں یہ کوئی دور از کار خیال نہیں بلکہ اس میں بہت حد تک واقعیت ہے بلکہ میرا تو تجربہ ہے کہ جب انسان پر ہیبت و دہشت کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس کے جسم کے تمام بالوں میں ایک تناؤ سا پیدا ہو جاتا ہے ایک حجام کے نقطۂ نظر سے یہ تناؤ بہت مفید ہے کیوں کہ اس حالت میں وہ بآسانی حجامت بنا سکتا ہے۔ اگر میں آپ کو یہ قصے نہ سناتا تو آپ کی داڑھی کیسے مونڈ سکتا تھا اور مونڈ بھی لیتا تو جگہ جگہ سے چھل جاتی۔ ذرا آئینے کو دیکھیے کہیں کوئی ہلکی سی خراش بھی تو نہیں۔ درحقیقت آپ کو آج تک کسی تعلیم یافتہ اور روشن خیال حجام سے واسطہ نہیں پڑا۔ بہر حال اگر آپ کو میری باتوں سے کسی قدر تکلیف ہوئی ہے تو اس کے لیے میں معافی کا خواستگار ہوں۔

* *

سونے کے دانت!؟

حاجی لق لق

یحییٰ آفندی کو ہنسنے کا بہت شوق تھا۔ اگر کوئی اس سے کہتا کہ ''آفندم! موصل میں طاعون پھیل گئی ہے۔'' تو وہ اپنے چہرے کو افسوسناک بنانے کی بجائے ہنس دیتا۔ اگر کوئی اس کو یہ خبر سناتا کہ ''کمان افسر تمہیں ملازمت سے برخاست کرنے کی فکر میں ہے۔'' تو غم زدہ ہونے کی بجائے اس کی باچھیں کھل جاتیں۔ اگر کوئی شخص غصے میں آ کر اس سے کہتا کہ ''یحییٰ آفندی جہنم میں جاؤ۔'' تو وہ دانت نکال کر کہتا، ''اکیلا یا گھوڑے سمیت؟''

اس کا ہنسنا اس کی قلبی کیفیت کا مظہر نہ ہوتا تھا، بلکہ بات یہ تھی کہ حضرت کے بالائی دانت تمام کے تمام سونے کے تھے۔ جنگِ عظیم کے دوران میں جب کہ وہ کرنل لارنس کی فوجوں میں ترکوں کے ساتھ لڑ رہا تھا تو اس کے دانت میدانِ جنگ میں 'شہید' ہو گئے تھے۔ لارنس جب دمشق میں داخل ہوا تو کپتان یحییٰ آفندی نے ایک فرانسیسی دندان ساز سے سونے کے دانت لگوا لیے تھے۔ وہ اپنے سنہری دانتوں پر بڑا فخر کیا کرتا تھا اور یہی باعث تھا کہ وہ ہر بات پر خواہ اچھی ہو یا بُری، ہنس دیتا تھا، تا کہ لوگ اس کے سنہری دانتوں کو دیکھ کر اُس کی امارت سے مرعوب ہو جائیں۔

میں اور یحییٰ آفندی گھوڑوں پر سوار ایک ایسے علاقے سے گزر رہے تھے، جسے تمدن کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ میرے پیچھے دس گُردسواروں کا ایک دستہ تھا اور ہم اپنی رسالہ فوج میں شامل ہونے کے لیے جا رہے تھے، جو موصل سے دو سو میل کے فاصلے پر پڑی تھی۔

ہم جس گاؤں سے گزرتے تھے۔ دیہاتی لوگ بھاگ کر ہمیں دیکھنے کے لیے آتے تھے اور جب قریب پہنچتے تو یحییٰ آفندی کے دانتوں کی طرف ٹکٹکی لگا دیتے تھے۔ جو اُن کے قریب آنے سے پہلے ہی ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کرنے لگتا تھا، تا کہ اس کے دانت نظر آ سکیں۔

یحییٰ تو اپنی امارت کا مظاہرہ کر رہا تھا، لیکن میری جان ہوا ہو رہی تھی۔ کیوں کہ میں ان

غیر متمدن یہودیوں کو شبہ کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ مجھے ان کی نظروں میں تحریص کے ساتھ بربریت بھی نظر آ رہی تھی اور میں ڈر رہا تھا کہ یحییٰ آفندی کے دانت ہمیں کسی مصیبت میں مبتلا نہ کر دیں۔

آخر میں نے اس سے یہ بات کہہ دی اور درخواست کی کہ بھیا! تم بڑے امیر ہو۔ تمہارے سولہ دانت سونے کے ہیں۔ تم عجائباتِ روزگار میں سے ہو، لیکن خدا کے لیے دیہات سے گزرتے وقت منہ بند رکھا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ دانتوں کے لالچ میں آ کر تمہیں کوئی 'ڈز' کر دے۔ میرا خیال تھا کہ 'ڈز' کے تصور سے یحییٰ ڈر جائے گا اور پھر دانت نکالنے کی جرأت نہ کرے گا، لیکن اس نے ایک قہقہہ لگایا اور اتنا طویل قہقہہ کہ کئی لمحوں تک اس کے دانت نظر آتے رہے۔

مجھے صرف اس علاقے کے دیہاتیوں ہی سے خطرہ نہیں تھا، بلکہ اپنے محافظ سپاہیوں کا ڈر بھی تھا۔ ان کی نظروں میں بھی خیریت نہیں دیکھتا تھا اور پانچ سال سے کُردوں میں رہنے کے باعث مجھے یہ بخوبی علم تھا کہ وہ ایک روپے کے لیے انسان کو ہلاک کر دیتے ہیں یہ تو سونے کے پورے سولہ دانت ہیں۔

میں نے ایک دفعہ انہیں ایسی باتیں کرتے بھی سن لیا تھا جنہیں یحییٰ آفندی کے قتل کی سازش کہنا چاہیے۔ لیکن مجھے متوجہ دیکھ کر اِس صفائی سے بات کو بدل دیتے کہ اُن پر الزام لگانے کے لیے میرے پاس کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔

ایک رات ہم ایک جنگل میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے کہ آدھی رات کے وقت مجھے کچھ مشکوک نقل و حرکت محسوس ہوئی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا دیکھا کہ ایک سپاہی بندوق تھامے، دبے پاؤں یحییٰ آفندی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جونہی میں اُٹھ کر بیٹھا، سپاہی بھاگ کر میرے پاس آیا اور بولا، ”باش کاتب صاحب (ہیڈ کلرک۔ میں اس فوج کا ہیڈ کلرک تھا) وہ دیکھو! جنگل میں شیر کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔“ میں نے اس طرف نگاہ کی جس طرح وہ انگلی سے اشارہ کر رہا تھا۔ مجھے کوئی چیز دکھائی نہیں دی۔ میں نے یونہی کہہ دیا، ”ہاں۔ ہاں وہ ہے۔“ پھر ایک لمحے کے بعد بولا، ”آنکھیں غائب ہو گئی ہیں۔ شاید شیر بھاگ گیا ہے!“

میں نے اپنے وفادار چاؤش (حوالدار) کو جگا دیا اور کہا، ”پہرہ دو۔ اس جنگل میں شیر ہیں۔“ لیکن میں نے اگلی صبح یحییٰ آفندی سے اس واقعے کا ذکر کیا تو اس نے حسبِ معمول ایک طویل قہقہہ لگایا اور کہا، ”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ احمد نے ضرور شیر ہی دیکھا ہوگا۔“

اب ہم پہاڑی علاقے سے گزر رہے تھے، جو گزشتہ علاقوں کی بہ نسبت زیادہ غیر متمدن تھا۔ ہم ایک گاؤں میں پانی پینے اور خوراک کی اشیا لینے ٹھہرے تو گاؤں کے زن و مرد ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ ان کی نظریں پچھلے علاقے کے دیہاتیوں سے کہیں زیادہ مشکوک تھیں لیکن عجیب بات یہ تھی کہ یہ لوگ بڑھ بڑھ کر یحییٰ آفندی کے ہاتھ کو بوسے دے رہے تھے۔ میں اس بات کو بھی شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا، کیوں کہ مجھے یاد تھا کہ ضلع سلیمانیہ کے دیہاتیوں نے ایک دفعہ میرے ہاتھوں پاؤں کو بوسہ دینے کے بعد مجھے لوٹ لیا تھا لیکن میں نے انگریزی زبان میں، جب اپنے شبہ کا اظہار یحییٰ پر کیا تو اُس کی باچھیں کھل گئیں اور اُس نے کہا، ''یُو فول۔''

اس علاقے میں تین دن چلنے کے بعد ہمیں ایک بلند پہاڑی کی چڑھائی چڑھنی تھی۔ کئی گھنٹوں تک چلنے کے بعد ہمیں دُور ایک گاؤں نظر آیا، جس کے سفید مکان درختوں اور جھاڑیوں کی سبزی میں بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ جب ہم گاؤں کے قریب پہنچے تو ہمیں نقارہ بجنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے یحییٰ سے پوچھا، ''یہ کیا ہے؟'' یحییٰ آفندی نے ہنس کر کہا، ''خطرے کی گھنٹی۔ گاؤں کے پہرے دار نے ہمیں دیکھ لیا ہے اور دشمن سمجھ کر دیہاتیوں کو جمع کر رہا ہے۔''

''جمع کر رہا ہے تو پھر کیا ہے؟ ہم بارہ آدمی اعلیٰ درجے کی انگریزی بندوقوں سے مسلح ہیں۔ ہم لڑیں گے۔'' میں نے کہا۔

''ماشاء اللہ! آپ لڑیں گے۔ لیکن آفندی یہ بھی معلوم ہے کہ اس علاقے میں بندوق نہ صرف ہر زن و مرد کے پاس ہوتی ہے، بلکہ ہر گھر میں کئی کئی بندوقیں فالتو ہوتی ہیں۔'' یحییٰ بولا۔

''تو پھر واپس چلیں۔'' میں نے کہا۔

''بے سود، گاؤں اتنی زیادہ دُور نہیں کہ وہ ہمیں آ نہ لیں اور اَب تو ہم ان کی بندوقوں کی زد سے دُور بھی نہیں رہے۔ ہم بھاگے اور گاؤں والوں نے فائر کیے اس لیے بھگوڑوں کی موت مرنے سے لڑائی کرنا بہتر ہے۔ ہاہاہا''

''لیکن ممکن ہے کہ گاؤں والے ہم سے دوستانہ سلوک کریں۔''

''یہ ہماری روش پر منحصر ہے۔'' یحییٰ نے کہا۔

میں کچھ اور کہنے کو تھا کہ ہم گاؤں کے بالکل قریب جا پہنچے اور ہم نے دیکھا کہ ایک شخص جو گاؤں کا شیخ معلوم ہوتا تھا ہماری طرف چلا آ رہا تھا اس کے پیچھے صرف چار پانچ آدمی تھے، وہ بھی

غیر مسلح۔

میں نے جلدی سے یحیٰ آفندی کو ہدایت کردی کہ وہ مجھے کُردی زبان سے ناآشنا ظاہر کرے اور یہ کہے کہ یہ ہندوستانی افسر صرف اپنی زبان اور انگریزی زبان جانتا ہے۔ ساتھ ہی میں نے یہ کہا کہ دانت نکال کر اپنی جیب میں ڈال لو، لیکن یحیٰ آفندی نے دانتوں کی بات سن کر پھر قہقہہ لگایا۔

شیخ ہمارے قریب آیا۔ ہم گھوڑوں سے اُترے اور یحیٰ آفندی نے السلام علیکم کہہ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ شیخ نے بڑے تپاک کے ساتھ مصافحہ کیا۔ اس کے بعد میری باری آئی۔ میں نے گڈ مارننگ کہہ کر مصافحہ کیا اور شیخ نے خندہ پیشانی کے ساتھ کہا، ''وعلیکم السلام'' جب مصافحہ سے فارغ ہوا تو یحیٰ آفندی نے اپنے سپاہیوں کو کاشن دیا۔ ''پریذیڈنٹ آدم!'' اس پر سپاہیوں نے، جو گھوڑوں سے اُترے ہوئے تھے۔ شیخ کی جرنیلی سلامی اُتار دی۔

شیخ ہمیں لے کر اپنی حویلی کی طرف بڑھا جہاں ایک بڑے کمرے میں ایک گڑھے کے اندر آگ کا انبار لگا ہوا تھا۔ شیخ نے ہمیں اندر داخل ہونے کے لیے کہا اور ہمارے سپاہیوں کو اس کے ملازمین کسی اور جگہ لے گئے۔ شیخ کے دو ملازموں نے ہمارے گھوڑے تھام لیے، لیکن یحیٰ آفندی نے کہا، ''میرا گھوڑا ہمیشہ میرے پاس رہنے کا عادی ہے اس لیے اسے بھی اندر لے جایا جائے۔'' شیخ نے اس بات کو مان لیا۔ کمرا بہت فراخ تھا۔ اس کے ایک طرف پردے کے پیچھے غالباً شیخ کا حرم تھا اور دوسری طرف خالی تھا۔ وہاں یحیٰ آفندی کے گھوڑے کو باندھ دیا گیا اور میرے گھوڑے کو کسی نامعلوم جگہ پر پہنچا دیا گیا۔

ہم ایک قالین پر اپنے میزبان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد شیخ کی خوب صورت اور نوجوان لڑکی ہمارے لیے قہوہ لائی۔ ہم نے قہوہ پینا شروع کیا اور لڑکی ایک طرف بیٹھی یحیٰ آفندی کے دانتوں کو دیکھنے لگی۔ شیخ کُردی زبان میں یحیٰ آفندی سے باتیں کر رہا تھا اور میں اس طرح بیٹھا تھا گویا ان کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ کبھی کبھی یحیٰ مجھ سے انگریزی میں بات کر کے شیخ پر یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ شیخ کی گفتگو کا ترجمہ کر رہا ہے، لیکن دراصل اس کا موضوع شیخ کی لڑکی تھا۔ لڑکی بڑی حریص نظروں سے یحیٰ کے دانتوں کی طرف دیکھ رہی تھی اور شیخ کی نگاہیں بھی منتبہ تھیں۔ آخر شیخ نے پوچھا، ''آپ کے دانت سونے کے کیوں کر بن گئے!''

”میں حضرت اویس قرنی کی اولاد میں سے ہوں۔“ یحییٰ نے کہا، ”جن کے دانت جنگِ اُحد میں شہید ہوئے تھے۔ خدا نے خوش ہو کر حضرت اویس قرنی پر یہ رحمت نازل فرمائی کہ حضرت کے زمانے سے آج تک آپ کی اولادِ نرینہ کے بچوں کے دانت سونے کے ہوتے ہیں۔“

شیخ نے تعجب کا اظہار کیا اور لڑکی نے یحییٰ کی طرف محبت کی نظروں سے دیکھا۔ یحییٰ قہوہ پی رہا تھا، لیکن جونہی اس نے قہوے کی پیالی کو جس میں نصف قہوہ موجود تھا، شیخ کی ایک بات کا جواب دینے کے لیے فرش پر رکھا۔ لڑکی نے اُسے اُٹھا کر پی لیا۔ دیکھ کر شیخ نے ایک عجیب و غریب آواز نکالی اور کہا، ”اوہ کم بخت لڑکی۔“

یحییٰ نے یہ الفاظ کہنے کی وجہ پوچھی تو شیخ نے کہا کہ یہاں کے رواج کے مطابق آپ کا جھوٹا قہوہ پی لینے کا مطلب یہ ہے کہ لڑکی آپ سے شادی کرنا چاہتی ہے اور اَب آپ بھی انکار نہیں کر سکتے۔ انکار کی سزا موت ہے۔“

”موت؟“ یحییٰ نے کہا اور مجھ سے انگریزی میں کہا، ”اب کیا کیا جائے؟“ میں نے کہا، ”یہ سب دانت حاصل کرنے کی چالیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن اب ہاں کہنے کے سوا کیا چارہ ہے؟“

شیخ اس کا مطلب بھی یہی سمجھا کہ یحییٰ آفندی شیخ کی بات کا ترجمہ کر کے مجھے سمجھا رہا ہے۔ میں نے مسکرا کر اور شیخ کی طرف مخاطب ہو کر انگریزی میں ایک ڈبل گالی دی۔ یحییٰ آفندی نے اس گالی کا یہ ترجمہ کیا کہ ”باش آفندی آپ کو مبارک باد کہتے ہیں۔“

شیخ کے اشارے سے دعوت کا سامان ہونے لگا اور رات کے وقت قاضی کو بلا کر نکاح پڑھا دیا گیا۔ بڑے دھڑلے کی ضیافت ہوئی، جس میں پندرہ بیس اکابرِ دیہہ شامل ہوئے۔ آدھی رات تک محفلِ گرم رہی اس کے بعد مہمان رخصت ہو گئے۔ اُدھر شیخ نے یحییٰ آفندی سے کہا کہ ”آپ کو حرم کے ایک کمرے میں اپنی بیوی کے پاس سونا ہوگا، لیکن کیا یہ بالکل صحیح ہے کہ آپ کی نرینہ اولاد کے دانت سونے کے ہوں گے؟“ یحییٰ نے کہا، ”یقیناً! لیکن اس کا انحصار آپ کی بیٹی پر بھی ہے۔ اگر اسے مجھ سے سچی محبت ہے تو اس کے بیٹے کے دانت لازمی طور پر سونے کے ہوں گے، لیکن اگر محبت کسی غرض پر مبنی ہوگی تو نہ صرف اس کی نرینہ اولاد سونے کے دانتوں سے محروم ہوگی، بلکہ میرے منہ کے دانت بھی غائب ہو جائیں گے۔“

اس گفتگو کے بعد شیخ نے یحییٰ سے کہا کہ اُٹھیے اور زنان خانے میں چلیے، لیکن یحییٰ نے کہا کہ

آپ چلیے میں گھوڑے سے کچھ باتیں کرلوں۔ یہ میری باتیں سمجھتا ہے اور میں اسے کہنا چاہتا ہوں کہ کوئی فکر نہ کرو۔ میں تم سے صبح ملوں گا۔ یہ سن کر شیخ پردے کے پیچھے چلا گیا اور یحییٰ گھوڑے کے پاس۔ چند منٹ کے بعد وہ واپس آیا۔ شیخ پھر باہر نکلا اور اسے اندر لے گیا۔ میں وہیں آگ کے پاس قالین پہ دراز ہوگیا۔

صبح ہوئی تو یحییٰ میرے پاس آیا، لیکن اس کے دانت غائب تھے۔ شیخ پردے سے باہر آیا اور غصے سے بولا، ”اب کیا ارادہ ہے اور تمہارے سنہری دانت کیا ہوئے؟ یحییٰ نے کہا کہ تمہاری لڑکی کو مجھ سے سچی محبت نہ تھی اس لیے دانت غائب ہوگئے۔ شیخ نے کہا، ”یہ سب دھوکا ہے اور تمہیں اس کی سزا ملے گی۔“ اس کے بعد اس نے ہم دونوں اور پھر پورے کمرے کی ہر چیز کی تلاشی لی۔ اسے دانتوں کی تلاش تھی۔

ہمیں کمرے سے باہر نکالا گیا تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے دس سپاہی بندوقوں کے بغیر، کوئی دو سو آدمیوں کے نرغے میں کھڑے ہیں۔ شیخ نے ایک اشارہ کیا اور جلاّد ہاتھ میں خنجر لیے آگے بڑھا، لیکن قبل اس کے کہ وہ یحییٰ پر وار کرے، شیخ چلاّیا، ”ٹھہرو۔“ یہ کہہ کر شیخ کچھ سوچ میں پڑ گیا اور چند لمحوں کے بعد بولا، ”چوں کہ تم ایک دفعہ میرے داماد بن چکے ہو، اس لیے میں داماد کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا۔ جاؤ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔“ ہمیں اپنے اپنے گھوڑے دے دیے گئے، لیکن بندوقیں غائب کردی گئیں۔ ہم فوراً سوار ہوکر بھاگے اور کئی میل تک ہم نے ایک دوسرے سے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ آخر جب ہم نے دیکھا کہ اب ہم خطرے سے باہر ہیں تو میں نے یحییٰ آفندی سے کہا، ”عجب ماجرا گزرا۔“ یحییٰ آفندی نے اس پر قہقہہ لگایا اور کہا، ”وہ دانت کیسے لے سکتے تھے، شیخ کی لڑکی نے مجھے سوتا پا کر میرے دانتوں کو نکالنے کی کوشش کی تھی، لیکن وہاں کیا رکھا تھا؟“

میں نے متعجب ہوکر پوچھا، ”دانت کہاں گئے؟“ اس نے گھوڑے کی دُم میں ہاتھ مار کر دانت نکالے اور قہقہہ لگا کر کہا، ”یہ رہے دانت!“

* * *

خاوند بیوی

حکیم سیّد ارشاد

شادی مرد کے لیے آبادی ہے یا بربادی؟ اگر کوئی مفکر اس مسئلے کا قطعی فیصلہ دے سکیں تو اپنے نام کا اعلان اخبارات میں کریں۔ انہیں انعام دیا جائے گا۔ ہم نے یہی دیکھا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے مَردوں نے اس معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی آخر تھک ہار کر یہی فیصلہ دیا کہ اپنی شادی کو ایک مذاق سمجھو جو قدرت نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ تمہاری بیوی بھی اس مذاق کا پس منظر سمجھنے لگے گی، لیکن مذاق کی کوئی حد تو مقرر ہوتی ہے۔ زندگی بھر کے لیے مذاق کرنا کہاں تک جائز ہے۔

جب سے عورتوں کو اپنے حقوق کے دورے پڑنے لگے ہیں، یہ مذاق المیہ بننے لگا ہے۔ مغرب میں عورتوں نے اپنے پورے کے پورے اور سارے کے سارے حقوق لے لیے۔ پھر وہاں سے مَردوں کے متعلق جو تشویشناک خبریں آئیں تو اِن سے ہمارے ہاں کے مرد چکرا ہی تو گئے۔ پچھلے دنوں ایک انگریز نے اہلِ امریکا اور اہلِ روس سے بڑی ہی دردمندانہ اپیل کی۔ فرمایا: ”تم چاند میں پہنچ کر جو چاہو کرو، مگر خدا کے واسطے وہاں پر عورت کو نہ لے جانا۔“ برنارڈ شا نے مَردوں کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا، ”مَردو! آؤ بھاگ کر رودبارِ انگلستان کو پار کریں اور جبل الطارق ہوتے ہوئے کسی ایسے مسلمان ملک میں پہنچ جائیں جہاں مرد عورتوں کے ہاتھوں محفوظ ہیں۔“ مغرب کے مَردوں کے یہ ارادے بڑے ہی ہولناک ہیں۔ پہلے تاجر بن کر آئے اور حاکم بن کر بیٹھ رہے۔ خدانخواستہ اگر بیویوں سے تنگ آ کر انہوں نے پھر سے اِدھر کا رُخ کر لیا تو نہ معلوم کیا بن کر بیٹھ رہیں گے۔ اگر اتنے عرصے میں ہمارے ہاں کی عورتوں نے سارے حقوق حاصل کر لیے تو ہمارے ہاں کے مرد کدھر جائیں گے۔ ایک طرف خلیج بنگالہ اور بحر ہند ٹھاٹیں مارتا ہے اور دوسری طرف کوہ ہمالہ کی فلک شگاف چوٹیاں ہیں۔ ہمارے مرد کولمبس واقع نہیں ہوئے کہ

سمندر میں کود کر کوئی نئی دنیا معلوم کرلیں اور نہ وہ ہلیری اور تن سنگھ ہیں کہ مونٹ ایورسٹ پر بیٹھ کر عورتیں سے کہیں، ''لو کرلو ہمارا کیا کرتی ہو۔'' غرضیکہ مرد عجیب مخمصے میں ہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اگر مَردوں کو شادی سے پہلے پوری طرح معلوم ہو جائے کہ شادی کیا ہوتی ہے تو اوّل تو مرد شادی ہی نہ کریں اور اگر کر بیٹھیں تو پھر بہت جلد شادی سے کنارہ کشی کر جائیں۔ ان خاوندوں کی تعداد تو ہمارے ملک کے سیاستدانوں سے کئی گنا زیادہ ہے، جو زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ اگر ہم کسی اور شے سے شادی کرسکتے تو عورتوں سے یقیناً شادی نہ کرتے۔ شادی پر جبر کا عنصر کچھ ایسا غالب ہے کہ بڑے بڑے شریف مرد شادی کرنے پر مجبور ہیں۔ بعض دفعہ تو بڑے نیک صورت بزرگوں کو دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ انہوں نے بھی شادی فرمائی ہوگی۔ لیکن بہت سے ٹھوس دلائل کی موجودگی میں ماننا ہی پڑتا ہے کہ وہ بھی شادی کا ارتکاب فرما چکے ہیں۔ ان مَردوں کی تعداد جو شادی کرنے کے بعد کفِ افسوس ملتے ہیں قریب قریب ان مَردوں کے برابر ہے، جو شادی کرنے کے لیے مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں دیہات میں شادی کو 'بُور کے لڈو' کہا جاتا ہے، جو کھائے وہ بھی پچھتائے، جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔ بعض مغربی مفکرین نے شادی کو ایک قلعے سے تشبیہ دی ہے۔ جو لوگ قلعے کے اندر ہیں وہ باہر نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور جو لوگ باہر ہیں وہ اندر گھسنے کے لیے بے قرار ہیں۔ یہ تو ہے مَردوں کا حال۔ رہی عورتیں تو ان کے متعلق کوئی مرد بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا اور یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں مرد ہوں۔ دنیا کا سب سے گہرا سمندر بحرالکاہل ہے۔ عورت کا من بحرالکاہل سے کہیں زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ مرد بے چارا اس کے من کی گہرائیوں کی پیائش کرتا کرتا ہی جان دے دیتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دنیا میں جتنی عورتیں ہیں، اتنی ہی ان کی اقسام ہیں۔ اس لیے ان کے متعلق کوئی کلیہ قائم کرنا حماقت ہے۔ تاہم قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں شادی کرکے بہت ہی خوش ہوتی ہیں اور اُن کی خوشی کے اسباب وعلل کا کھوج لگانے کے لیے کوئی دُور کی کوڑی لانے کی بھی ضرورت نہیں۔

میرے ایک دوست تھے، جو کسی حد تک فلسفی واقع ہوئے تھے، شادی سے پورے پانچ برس بعد ملے۔ ضمناً یہ بھی عرض کردوں کہ میرے جتنے دوستوں کی شادیاں ہوئیں، وہ مجھے شادی کے پانچ برس کے بعد ہی ملے۔ میں ہی اکیلا ایسا تھا، جس نے شادی سے دس برس بعد دوستوں کی خبر

لی۔ وجہ آگے چل کر بیان کروں گا۔ اچھا تو میرے فلسفی دوست فرمانے لگے، “جب میری شادی نہ ہوئی تھی تو میں اکثر سوچتا کہ جہاں تک لڑکے والوں کا تعلق ہے وہ شادی بیاہ کے موقعوں پر باجے بجانے اور خوشیاں منانے میں حق بجانب ہیں، کیوں کہ وہ کسی کی لڑکی لاتے ہیں۔ آخر یہ لڑکی والے کیوں رنگ رلیاں مناتے ہیں اور ڈھول بجاتے ہیں۔ وہ تو اپنی لڑکی کسی کو دیتے ہیں۔ اپنی شادی کے بعد اب بات میری سمجھ میں آ گئی۔” میں نے پوچھا، “آپ کیا سمجھے۔” فرمانے لگے، “لڑکی والے اپنی لڑکی کو ایک آنریری گدھا لے کر دیتے ہیں، جو ساری عمر بوجھ اُٹھا اُٹھا کر ہلکان ہوگا۔” میرا ایک انگریز پرنسپل تھا اس نے شادی نہیں کی تھی۔ جب وہ باجے وغیرہ کی آواز سنتا تو کہتا، “کسی غریب کو سزائے عمر قید سنائی جا رہی ہے۔” جب وہ کسی دولھا کو گھوڑی پر سوار، سہرا باندھے، سرخ کپڑوں میں ملبوس دیکھتا تو کہتا، “دیکھو دیکھو لڑکو! آدمی کو کس طرح بیوقوف بنایا جاتا ہے۔”

آزادیِ گفتار، نقل و حرکت اور میل ملاپ کی آزادی، آزادی کی وہ اقسام ہیں، جن کی حفاظت کے لیے انسانوں نے جانیں تک قربان کر ڈالیں۔ ہر قسم کی جمہوریت لفظاً یا عملاً تسلیم کرتی ہے کہ آزادی کی یہ اقسام انسان کے فطری مطالبے ہیں، مگر شادی ایک قسم کا آرڈیننس ہے، جو خاوند کی ان آزادیوں کو یکسر ختم کر ڈالتا ہے۔ مہذب ممالک میں تو یہ مشہور ہے کہ اندھی بیوی اور بہرے خاوند کی شادی بڑی کامیاب رہتی ہے۔ ہمارے ملک میں تو بہرے خاوندوں کی ضرورت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ مجھے تو ایک جوگی کی بات رہ رہ کر یاد آتی ہے، جس سے اس کے چیلوں نے کہا تھا کہ حضور آپ کے فلاں چیلے کی منگنی ہوگئی۔ جوگی نے کہا، “وہ ہم سے گیا۔” پھر چیلوں نے کہا، “حضور اس کا بیاہ ہوگیا ہے۔” جوگی بولا، “لو دوستوں یاروں سے گیا۔” ایک دن چیلوں نے کہا، “جناب وہ صاحبِ اولاد ہوگیا ہے۔” جوگی نے کہا، “اب اپنے آپ سے بھی گیا۔” جرمنی کے لوئی کہنی نے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں بتایا ہے کہ چہرے کو دیکھ کر تشخیصِ مرض کیوں کر ممکن ہے۔ یوں تو اکسپرٹوں کی فیکٹریاں سمندر پار ہی بنی ہیں۔ تاہم میں نے بھی اس بات میں اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر کافی مہارت حاصل کر لی ہے کہ مرد کے چہرے کو دیکھ کر بتا سکوں کہ اس کی شادی ہوگئی ہے یا نہیں۔ ہمارے ملک میں مَردوں کی شادی ہو جانے کی علامات اتنی واضح ہیں کہ اہلِ مغرب کو ہمارے لیے آلۂ شادی نما (میرج میٹر) بنانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اس مرض کی علامات کچھ تو مجلسی ہوتی ہیں، کچھ اقتصادی اور کچھ جسمانی۔ ان تمام علامات کو بیان کرنے

کے لیے دلیل و نہارؔ کے کئی ایڈیشن درکار ہیں۔ تاہم 'عاقلاں را اشارہ کافی است'۔ تمام علمائے عروسی اس بات پر متفق ہیں کہ شادی سخت قسم کا متعدی مرض ہے۔ ماں باپ سے اولاد کو لگتا ہے۔ اساتذہ سے شاگردوں کو لگتا ہے اور شہروں اور محلوں میں ایک سے دوسرے کو لگتا ہے۔

شادی کی ابتدائی علامات میں سے پہلی علامت تو یہ ہے کہ دوست احباب ڈھونڈتے پھریں مگر دوست کا کہیں پتا نہ چلے۔ اگر وہ کہیں اتفاقاً ہاتھ لگ بھی جائے تو یہ کہہ کر چلا جائے: ''مجھے ایک ضروری کام ہے۔'' میں نے کوئی درجن بھر دوستوں کو ان کی شادیوں کے موقعوں پر تحفے تحائف دیے۔ اب کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ ان کے پاس جاؤں اور کہوں میاں! میرے تحفے خواہ کتنی ہی فرسودہ حالت میں ہوں واپس کر دیجیے۔ میری تمہاری کوئی دوستی ووستی نہیں۔ تم تو تحفے لے کر ایسے غائب ہوئے کہ سکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغرساں بھی تمہارا پتا نہ چلا سکیں۔ اکثر دلہنوں کو میں نے جا کر بھی سمجھایا کہ آپ کے خاوند کا دوست آپ کی سوکن تو نہیں، جو آپ میرے معاملہ میں مشہور کہاوت 'سوکن کا جلاپا' کی یاد تازہ فرما رہی ہیں۔ علمائے علم الابدان کی تحقیقات بالکل درست ہیں کہ عورتوں کے کان نہیں ہوتے، جو کسی کی بات سن لیں۔ جب میں نوجوانوں کو اپنے احباب کی شادیٔ کے موقعوں پر تحفے دیتے دیکھتا ہوں تو مجھے ان پر بڑا ترس آتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ دھاڑیں مار مار کر اور سینہ پیٹ پیٹ کر انہیں سمجھاؤں کہ تمہارا ہر تحفہ مجھے ایک درخواست معلوم ہوتا ہے، جس میں لکھا ہے، ''گزارش کمترین کی یہ ہے کہ تاریخ امروزہ سے میرا نام دوستوں کی فہرست سے خارج کر دیا جائے۔ عبدالرحمٰن عفی عنہ۔'' دلہنیں خاوندوں کو کچھ ایسا کمیونسٹ بنا دیتی ہیں کہ وہ خطرناک قسم کی خفیہ اور پوشیدہ سرگرمیوں میں مصروف رہنے لگتے ہیں اور اُدھر ضبطِ تولید کے بانی اور ماہر مالتھوس کی رُوح آسمانوں کی دیواروں سے ٹکریں مار مار کر فریاد کرتی ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور ایسا کیوں ہو رہا ہے اور ایسا کب تک ہوتا رہے گا؟

معاشی اور اقتصادی اعتبار سے ہندوؤں کے ہاں بیوی کو 'مایا کی دیوی' سمجھا جاتا ہے۔ میں تو بار بار یہی کہوں گا کہ بیوی مایا کی دیوی نہیں، بلکہ دولت کا دیو ہے، جو مرد کی تمام کمائی چٹ کر جاتا ہے۔ ایک صاحب نے اپنی دلہن کے ساتھ فوٹو کھنچوایا اور پروف لا کر مجھ سے رائے طلب فرمائی۔ میں نے کہا فوٹو تو خوب ہے، لیکن ایک کسر رہ گئی ہے۔ پوچھنے لگے، ''کیا؟'' میں نے کہا دلہن کا ہاتھ آپ کی جیب میں نہیں۔ ایک صاحب اپنے دوست سے کہنے لگے، ''رات ہمارے ہاں چور

انوار احمد علوی

آ کر میرے کوٹ کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔" دوست نے پوچھا کہ تم نے کیا کیا۔ وہ صاحب بولے "میں لیٹا مسکراتا رہا، کیوں کہ کوٹ میری بیوی نے کھونٹی پر لگایا تھا۔" بیویاں مَردوں کی یوں جامہ تلاشی لیتی ہیں، جس طرح پولیس والے حوالاتی قیدی کی جامہ تلاشی لیتے ہیں۔ پولیس والے از خیر برآمد شدہ اشیا کی فہرست تیار کرلیتے ہیں، مگر یہاں پر نہ فہرست اور نہ ذکر۔ یہی وجہ تو ہے کہ شادی کے بعد ہوٹلوں اور ریستورانوں کے مینیجر، بیرے، خانسامے اپنے گاہک کی صورت کو ترس جاتے ہیں۔ اگر بھولے بھٹکے کبھی آپ ان کے ساتھ یا وہ آپ کے ساتھ ہوٹلوں میں چلے بھی جائیں تو اس وقت جب آپ بل ادا کر چکیں گے وہ جھوٹ موٹ جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہیں گے، "میں دیتا ہوں۔ میں دیتا ہوں۔" اگر آپ اس وقت ان کی تلاشی لیں تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ شادی کے بعد بیوی مرد کی جیب پر یوں پل پڑتی ہے، جس طرح نادر خاں ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دو عربی گھوڑے خریدے اور اپنے اصطبل میں بھیج دیے۔ شام کو اپنے وزیر سے کہنے لگے، "وزیر صاحب دو گھوڑے خریدے ہیں آؤ! دکھاؤں۔" اصطبل میں گئے تو معلوم ہوا کہ وہ گھوڑے ٹیکا صاحب اپنے اصطبل میں لے گئے ہیں۔ رنجیت سنگھ نے برہم ہو کر کہا کہ دیکھو جی میں نے گھوڑے کس شوق سے خریدے تھے اور ٹیکا صاحب فوراً لے گئے ہیں۔ وزیر بولا، "حضور یوں لے گئے ہیں جیسے ابا کی چیز ہو۔" رنجیت سنگھ مسکرا کر واپس لوٹ آئے جب کوئی شخص آپ کی جیب میں بلا تکلف ہاتھ ڈالے تو کہہ دیا کریں، "میری جیب میں یوں ہاتھ ڈالتے ہو جیسے میری بیوی ہو!"

مغرب کے معالجین آج تک حیران ہیں کہ فقط مرد کیوں گنجے ہوتے ہیں۔ عورتیں کیوں گنجی نہیں ہوتیں۔ حالاں کہ مَردوں میں اس عارضے کا سبب اتنا واضح ہے کہ اس پر کوئی دلیل لانے کی ضرورت نہیں۔ پاکستان ٹائمز میں ایک دفعہ گنجے پن پر بحث چل نکلی اور میں نے اس موضوع پر چند خطوط شائع کیے تھے۔ آپ کسی چوک میں کھڑے ہو جایے اور مَردوں کی چندیا کا بغور ملاحظہ فرمایئے۔ ہر دوسرے تیسرے مرد کا سر آپ کو بلیرڈ کی گیند کی طرح صفاچٹ نظر آئے گا۔ بس آپ سمجھ لیجیے کہ ان حضرت کی شادی ہو چکی ہے۔ رہا اس بات کا جواب کہ بعض نوجوان ایسے بھی تو ہیں، جن کی ابھی شادیاں نہیں ہوئیں، مگر وہ گنجے ہو رہے ہیں تو اس بات کا سمجھنا کوئی مشکل نہیں۔ شادی کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک جسمانی شادی اور ایک دماغی شادی۔ دراصل ایسے نوجوان دماغی طور

حکیم سید ارشاد ...... خاوند بیوی

پر شادی شدہ ہوتے ہیں اور ان کی بیوی کوئی فلم ایکٹرس یا کوئی ایسی عورت ہوتی ہے، جس کا انہیں ابھی نام بھی معلوم نہیں ہوتا۔ ایک صاحب دوسرے دوست سے کہنے لگے، ”یہ کیا بات ہے تمہارے بال سر کے اگلے حصے سے گرنے لگے ہیں اور میرے پچھلے حصے سے؟“ دوست نے جواب دیا، ”جب تمہاری بیوی تمہارے سر پر حملہ آور ہوتی ہے تو تم بھاگنے کی کوشش کرتے ہو اور بندہ تو اٹینشن ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے۔“

ہمارے ہاں رواج ہے کہ شادی سے پہلے دلہن کو علاوہ اور چیزوں کے ایک جوتا بھی بھیجا جاتا ہے۔ جب میری شادی ہونے لگی تو اللہ بخشے میری والدہ نے فرمایا کہ ایک نفیس سینڈل لے آؤ۔ میں نے کہا مجھے اپنے سر کے لیے اسلحہ پیشگی مہیا کرنا ہے؟ ایک صاحب اپنی ماہانہ تنخواہ لے کر گھر میں داخل ہوئے اور بیوی نے کہا، ”مجھے جوتا تو لا دیں۔“ میاں اُلٹے پاؤں واپس لوٹے۔ بیوی پکاری، ”ناپ تو لیتے جایئے۔“ خاوند نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا، ”ناپ میرے پاس ہے تو سہی۔“ بیوی کے جوتے اور خاوند کے سر کا، جو گہرا تعلق قائم ہو گیا ہے اس سے بددل ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ابھی ہم مہذب اور ترقی یافتہ دنیا سے بہت ہی پیچھے ہیں۔ ایک مہذب ملک میں ایک نوجوان کسی فیکٹری کے مینیجر کے پاس بغرض ملازمت حاضر ہوا۔ مینیجر نے پوچھا، ”عمر؟“ جواب ملا، ”تیس سال۔“ مینیجر نے سوال کیا، ”تعلیم؟“ نوجوان نے عرض کیا، ”سینیئر کیمبرج تک۔“ پھر مینیجر نے پوچھا، ”تجربہ؟“ جواب ملا، ”کوئی خاص نہیں۔“ مینیجر نے گھور گھور کر اُمیدوار کی پیشانی کو دیکھا اور سوال کیا، ”کیا تمہاری شادی ہو گئی ہے؟“ نوجوان نے جواب دیا، ”نہیں جناب یہ تو خچر کی دولتی سے زخم آ گیا تھا۔“ جب تک خچر کی دولتی سے آنے والے زخم کو شادی کی علامت نہ سمجھا جائے ہم متمدن اور مہذب دنیا کی صف میں کھڑے ہونے کے حق دار نہیں۔

* *

کچھ نئی اور پرانی چیزیں اور اُن کا استعمال

حسین امیر فرہاد

تلوار

اس سے گوبھی، کدو، ساگ اور تربوز وغیرہ عمدہ طریقے پر کاٹے جا سکتے ہیں اور دیوار پر لٹکا کر آپ یار دوستوں پر رعب بھی ڈال سکتے ہیں کہ پدرِ من سرباز بود!

قلم

یہ ازار بند ڈالنے کے کام آتا ہے۔ گیارہ سال تک پاکستان میں بہت سے لکھنے والوں نے اس سے یہی کام لیا۔ اس پر کپڑا لپیٹ کر آپ اِس سے کان بھی صاف کر سکتے ہیں۔ اسے جیب میں ٹانگ کر آپ یار دوستوں پر یہ رعب ڈال سکتے ہیں کہ آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔

گھڑی

یہ بڑی کارآمد چیز ہے! آپ بازار سے سودا سلف خریدیں۔ پیسے کم ہوں تو یہ وہاں کام آتی ہے۔ گھڑی دے کر سودا گھر لے جایئے۔ دوسرے دن پیسے دے کر گھڑی چھڑا لیجیے۔ گھر سے بھاگ نکلنے کا پروگرام ہو تو نوجوانوں کے اُس وقت بھی بہت کام آتی ہے۔

ٹائم پیس

ہر گھر میں اس کا ہونا بہت ضروری ہے۔ خاص کر بچوں والے گھر میں۔ اگر بچے رو رہے ہوں تو اس کا الارم بجا کر انہیں چپ کرایا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی ناراضی کے وقت بیوی کے کان میں بھی بجائی جا سکتی ہے۔ ویسے ٹائم پیس دیکھنے کے کام بھی آتی ہے۔

کتاب

یہ بھی بڑی کارآمد چیز ہے۔ یہ فربہ بھی ہوتی ہے اور کمزور ٹیڈی سائز میں بھی۔ ایک زمانہ میں

یہ پڑھی بھی جاتی ہوگی۔ ردی میں بک بھی سکتی ہے۔ لڑائی جھگڑے میں بھی کام آتی ہے۔ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ لوڈ شیڈنگ میں آپ اِسے پنکھے کی طرح جھل بھی سکتے ہیں۔

اخبار

یہ بھی بڑی کار آمد چیز ہے۔ روزگار یا رشتہ تلاش کرنے والوں کے لیے بڑی مفید چیز ہے۔ باسی اخبار دستر خوان کے طور پر کام آتا ہے۔

چپلی

یہ وہ واحد کثیر المقاصد ہتھیار ہے جس کا کوئی لائسنس نہیں۔ سرحد میں اس سے ٹیڑھی بیوی کو بھی سیدھا کیا جاتا ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ اس کی پچھلی پٹی میں ہاتھ ڈال کر اسے سر تک اُٹھا کر بیوی کے سر پر دے مارنا پڑتا ہے۔ سنا ہے اس طرح وہ بے زبان درست ہوجاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

البتہ مختلف علاقوں میں اس کے مختلف نام ہیں: سرحد میں سپلئی، پنجاب میں چھتر، بلوچستان میں جوتی، سندھ میں موچڑا، ایران میں پیزار اور عرب میں نصال۔ ان میں خطرناک قسم سینڈل کی ہوتی ہے۔ مگر سب سے زیادہ خطرناک ملٹری کا بوٹ ہوتا ہے۔ یہ انسان کو کم سے کم گیارہ سال تک گونگا اور بہرا ضرور بنا دیتا ہے!

مسجدیں

اللہ کا گھر کہلاتی ہیں۔ سونے کے کام آتی ہیں۔ ان کے منبروں سے سیاسی تقریریں بھی کی جاتی ہیں۔ لڑائی جھگڑے بھی یہاں پروان چڑھتے ہیں اور کفر کے فتوے بھی یہاں سے داغے جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں غیر مسلموں کو مسلمان بنایا جاتا تھا۔ آج کل یہاں مسلمانوں کو کافر بنایا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم

یہ تعویذوں کے کام آتا ہے۔ عدالتوں میں قسم اُٹھانے کے کام بھی آتا ہے۔ بچوں کے نام اسی سے رکھے جاتے ہیں۔ اگر کوئی مر رہا ہو یا مر جائے تو اُس کے سرہانے اس کا پڑھنا کار آمد ہے۔ یہ بڑی بابرکت کتاب ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب۔ مگر بلا سمجھے اور بلا عمل کیے۔

رازدارِ حیوانات

خادم حسین مجاہد

جانوروں کی پُر امن دنیا میں انسدادِ امن کے لیے قیام پذیر ٹارزن کے فرسٹ کزن پروفیسر وحشت جنگل پوری (پی ایچ ڈی حیوانات و نباتات فرام افریقہ) کے ہتھے چڑھے آوارہ صحرائی کو انتالیس دن نو گھنٹے پچیس منٹ اور اٹھاون سیکنڈ ہو چکے تھے۔ انسانوں کے جنگل سے گھبرا کر تبدیلی واٹر اینڈ ایئر کے لیے جب اس نے یہاں کا رُخ کیا تھا تو اسے ہرگز یہ احساس نہ تھا کہ پروفیسر جنگل پوری کے روپ میں شامت اس کی منتظر ہوگی۔ جنگل کے عین درمیان میں واقع جنگلی جانوروں کے بھٹ اور جھونپڑی کے درمیانی قسم کی چیز دیکھ کر پہلی بار اسے ڈاک بنگلے کا گمان گزرا تھا، جو بعد میں پروفیسر وحشت جنگل پوری کا ریسرچ سینٹر ثابت ہوا تھا۔ جانوروں کی عمرانیات پر مصروفِ تحقیق پروفیسر وحشت جنگل پوری سے مل کر آوارہ صحرائی کو اس دم اتنی خوشی ہوئی تھی جتنی خوشی عوام کو حکومتی وعدے سن کر ہوتی ہے۔ پروفیسر وحشت جنگل پوری جانوروں کی معاشرت کا حصہ نظر آتا تھا، کیوں کہ وہ نہ صرف ہر جانور کی زبان سمجھ لیتا تھا، بلکہ بول بھی لیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ چمگادڑوں کے ایک خاندان کے ساس بہو کے تنازعے کا حل تلاش کرنے کے لیے ان کے دلائل سن رہا تھا۔ ان کا جھگڑا نمٹا کر سب سے پہلے تو پروفیسر نے آوارہ کو دیکھ کر اُس خوشی کا اظہار کیا، جو شہر سے بھاگ کر آنے والوں کو دیکھ کر اسے ہوتی تھی۔ اس کے بعد آوارہ کو شہری معاشرت سے مکمل طور پر بدظن کرنے کے لیے حیوانی معاشرت کی خوبیوں پر دلائل دے کر اپنے ساتھ مستقل رہائش کے لیے ورغلانا شروع کر دیا۔ پروفیسر نے اسے چار سو بیس مرتبہ یقین دلا کر قائل کر لیا کہ چالیس دن مخصوص ماحول میں رہ کر مخصوص غذا کے استعمال کے بعد آوارہ ہر جانور کی زبان سمجھنے لگ جائے گا اور اگر مزید چالیس دن اس کی شاگردی میں رہا تو ہر جانور کی زبان سیکھ کر گپ شپ بھی لگا سکے گا... گو آوارہ صحرائی کا یقین، یقینِ محکم میں نہ بدل سکا پھر بھی اس نے خود کو پروفیسر

کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ مخصوص ماحول جس میں آوارہ کو رکھا گیا تھا۔ پروفیسر کے ریسرچ سینٹر کا ایک گوشہ تھا جہاں بیٹھ کر آوارہ ہر قسم کے جانوروں کو دیکھ اور سن سکتا تھا علاوہ ازیں مخصوص غذا کے نام پر پروفیسر اسے اب تک تمام جانوروں کی غذا وقتاً فوقتاً کھلا چکا تھا اور ان حالات میں وہ اپنی زبان بھی تقریباً بھول چکا تھا۔ کبھی کبھی ترنگ میں آ کر وہ کسی نہ کسی جانور کی آواز نکال دیتا اور جانوروں میں غلط فہمی کے بیج بونے کی کوشش کرتا۔ عین اس وقت جب کہ پروفیسر کی مقرر کردہ میعاد ختم ہونے میں کچھ گھنٹے باقی تھے، آوارہ کے کان کھڑے ہوگئے۔ اس کے بالکل سامنے ایک گدھا فیملی خانگی مذاکرات میں مصروف تھی، جو اب سے تھوڑی دیر پہلے تک آوارہ کے لیے ڈھینچوں ڈھینچوں سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے، مگر اب وہ ڈھینچوں ڈھینچوں اس کے لیے ناقابلِ فہم نہ رہی تھی۔ اس نے فوراً کان لگا کر سنا۔ مادر گدھی جونیئر گدھے سے کہہ رہی تھی۔

”بیٹا تمارے دادا سو رہے ہیں شور مت کرو۔“

جونیئر گدھے نے شور بند کیا اور سوئے ہوئے دادا گدھے کے کان کے ساتھ منہ لگا کر زور سے پھرر... رر... کی۔ دادا گدھے ایک جھٹکے سے اُٹھے اور غضب ناک ہو کر بولے۔

”ابے انسان کی اولاد! گدھا بن گدھا! ہر وقت انسان مستیاں ہی کرتا رہتا ہے۔ بالکل انسانوں کی طرح ضدی، بدتمیز اور ڈھیٹ ہو گیا ہے۔“

”دادا آپ نے مجھے اتنی بڑی گالی دی ہے میں یہ چراگاہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“ جونیئر گدھا ناراض ہو کر ایک طرف بھاگ گیا۔

”ارے یہ تو یوں غائب ہو گیا جیسے انسان سے انسانیت۔ میں کہتی ہوں روکیے اسے۔“ جونیئر کی ممی نے دُہائی دی۔

”تم پُرسکون ہو کر گھاس سے لنچ کرو چند دن انسانوں کی ٹھوکریں کھائے گا تو خود ہی واپس آجائے گا۔“

یہ سن کر آوارہ کے تو چودہ طبق روشن ہو گئے اس نے ایک دم اُٹھ کر گھاس کو لات ماری، جو پروفیسر نے اسے صبح کھانے کے لیے دی تھی۔ یہ دیکھ کر دادا گدھے نے آوازہ کسا۔

”انسان کیا جانے گھاس کی بہار۔“

آوارہ نے غصّے میں آ کر گدھے کو ’یک لتی‘ جڑ دی اور پروفیسر کی تلاش میں روانہ ہوا تا کہ

اسے خوشخبری سنائے۔ جاتے جاتے اس نے گدھے کی بڑبڑاہٹ سنی۔

"یہ تو انسان پن پر اُتر آیا۔ ہمارے لیے اب خاموشی ہی بہتر ہے۔"

پروفیسر وحشت پوری آوارہ کو محدب عدسے کی مدد سے چیل کے گھونسلے میں ماس تلاش کرتے ہوئے ملے۔ یہ خبر سن کر انہوں نے آوارہ کو مبارک باد کے طور پر پدی کا شوربہ پلایا۔ آوارہ کو مزید مشق کے لیے سیر کا حکم دے کر خود نقار خانے میں طوطی کی آواز سننے چل دیے۔

کچھ دُور ایک بیل اور گائے راز و نیاز میں مصروف تھے آوارہ قریب ہوا تو اس کے کانوں میں آواز پڑی۔

"تجھے ہزار بار کہا ہے کہ گھاس کھانے کے دوران دم پر کنٹرول رکھا کر۔ اس سے میں ڈسٹرب ہوتا ہوں، مگر تو بالکل اللہ میاں کی انسان ہے ذرا عقل نہیں۔" بیل کہہ رہا تھا۔

"مجھے طعنے دے رہا ہے انسان کے۔ تو بھی تو نرا انسان ہی ہے۔" گائے نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"ایسی سڑی ہوئی زبان ہے تیری۔ پھر بھی نجانے کیوں حکیموں میں مشہور ہے۔" بیل نے جل کر کہا۔ قبل اس کے کہ وہاں گھمسان کی جنگ شروع ہوتی اور ہمیشہ کی طرح غیر جانب دار فریق یعنی آوارہ کام آجاتا، اس نے راہ فرار اختیار کی۔

جس درخت کے نیچے آوارہ سانس لینے رکا، اس پر کچھ اُلو محو خواب تھے۔ اچانک ایک نوجوان اُلو کسی رنگین و سنگین خواب سے بیدار ہوا اور دوسری شاخ پر سوئی ہوئی نوجوان مادہ کو جگا کر راز و نیاز میں مصروف ہوگیا۔ اچانک ساتھ موجود اس کے باپ کی آنکھ کھل گئی اور اُس نے ان کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر غصے میں کہا۔

"او انسان کے پٹھے! تجھے انسانوں جیسی حرکتیں کرتے شرم نہیں آتی۔ نجانے تم کب سے ہم سب کو انسان بنا رہے ہو۔ آئندہ ایسی حرکت کی تو وہ حشر کروں گا کہ چاروں طرف انسان بولنے لگیں گے۔"

نوجوان اُلو نے اس کی توجہ آوارہ کی طرف دلائی تو اُس نے ایک عجیب سی چیخ ماری اور اُس درخت پر موجود سب اُلو اُڑ گئے۔ آوارہ بڑبڑاتے ہوئے ایک اور درخت کی طرف بڑھا تو اس پر موجود کوّوں کا جوڑا کچھ اس قسم کی شر انگیزی میں مصروف تھا۔

''خدا خیر کرے ہمارے گھونسلے کے نیچے انسان بول رہا ہے۔ یا تو کوئی مصیبت آنے والی ہے یا کوئی مہمان۔'' کوے کی بیگم بولی تو آوارہ نے اشتعال میں آ کر چیتے کی طرح اُچھل کر ان کے گھونسلے کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی، مگر گر کر زخمی ہو گیا۔

''انسان چلا جانور کی چال اپنی چال بھی بھول گیا۔'' کوے نے آوازہ کسا۔

آوارہ ابھی اُٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ درخت کی جڑ میں سے ہلکی ہلکی آوازیں آنے لگیں۔

''تمہیں انسان کیوں سونگھ گیا ہے۔ آدمی تمہارے سامنے پڑا ہے دشمن کو ڈنک نہ مار کر تم غداری کے مرتکب ہو رہے ہو۔ آستین کے انسان ہو تم۔'' کوئی سانپ بڑے غصے سے کہہ رہا تھا۔

''ابا جی یہ دور آپ کا نہیں ہے۔ اب انسان ہم سے بھی زیادہ زہریلا ہوتا ہے ہمارا ڈسا تو بچ سکتا ہے، مگر اِس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا آدھے سے زیادہ خاندان ان انسانوں نے ختم کر دیا ہے۔ انسان کا کاٹا تو مردے سے بھی ڈرتا ہے۔ میں اسے کاٹنے کی ہمت کیسے کر سکتا ہوں۔'' دوسرے سانپ نے اپنی صفائی پیش کی۔

''تو پھر ایسا طریقہ ہونا چاہیے کہ انسان بھی مر جائے اور ڈنک بھی محفوظ رہے۔''

بزرگ سانپ کی سازش سن کر آوارہ نے پھر دوڑ لگائی۔ ایک قطعے میں کچھ کتے بیٹھے تھے وہ دندناتا ہوا قطعے میں داخل ہوا۔

''یوں بغیر اجازت منہ اُٹھائے چلا آ رہا ہے برتن کا منہ کھلا ہو تو انسان کو شرم کرنی چاہیے۔'' ایک کتے نے کہا۔

''بھئی اب یوں تو نہ کہو وہ اتنی دُور سے آیا ہے کچھ خاطر مدارات کرو۔'' دوسرے کتے نے طنز کیا۔

''انسان کو عزت ہضم نہیں ہوتی۔'' تیسرے نے ارشاد فرمایا۔

''وحشت کا شاگرد جنگل کا نہ شہر کا۔'' چوتھے نے ہنس کر کہا۔ اور آوارہ کو گھیرنا شروع کر دیا۔

''جب تک یہ دُم ہلا کر ہماری خوشامد نہیں کرے گا ہم اسے جانے نہیں دیں گے۔'' پانچویں نے جارحانہ انداز میں کہا۔

''اس سے دُور رہو اگر اِس نے کاٹ لیا تو چودہ ٹیکے لگوانے پڑیں گے اور اِس نے ہمیں شہر

میں دیکھ لیا تو ہم سب انسان کی موت مارے جائیں گے۔‘‘ بزرگ کتے نے سب کو سمجھایا اور وہ آوارہ سے دُور ہو گئے۔ آوارہ نے خدا کا شکر ادا کیا، مگر وہاں سے نکلتے ہوئے نادانستگی میں ایک بلی کا راستہ کاٹ بیٹھا، جو شاید کہیں جا رہی تھی۔ اس بدشگونی کی وجہ سے بلی نے بیٹھ کر رونا شروع کر دیا۔ آوارہ کو بڑی شرمندگی ہوئی اور وہ راستے سے ہٹ کر ایک درخت کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ بلی نے روتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

‘‘کھسیانا بندہ درخت نوچے۔’’

عین اسی لمحے ایک کتا روٹی لے کر بھاگتا ہوا نظر آیا، جو وہ یقیناً شہر سے پار کر کے لایا تھا۔ چالیس دن کے بعد روٹی کی شکل دیکھ کر آوارہ کا دل بھر آیا اور اُس کے منہ سے بے اختیار پانی بہنے لگا۔ بلی نے فوراً اس پر آوازہ کسا۔

‘‘انسان کو روٹیوں کے خواب۔’’ اس کے بعد وہ سفر ملتوی کر کے واپس چلی گئی۔

قریب ہی ایک درخت پر طوطوں کا ایک جوڑا راز و نیاز میں مصروف تھا آوارہ ان کی "Privacy" میں مخل ہونے کے لیے آگے بڑھا تو اسے آواز سنائی دی۔

‘‘ظالم! تمہیں پتا ہے تم کتنے دنوں بعد ملنے آئے ہو؟’’ لیڈی طوطا شکوہ کناں تھی۔

‘‘تمہارے جانے کی خبر سن کر تو میرے ہاتھوں کے انسان اُڑ گئے تھے۔’’

‘‘ہاں ایک ماہ بعد آیا ہوں۔’’ طوطے نے سرد مہری سے جواب دیا۔

‘‘حد ہو گئی انسان چشمی کی۔ اتنی سنگ دلی سے بول رہے ہو یقیناً تم نے کہیں اور دل لگا لیا ہے۔’’ لیڈی طوطا رونے لگی۔

‘‘یہ عورتوں کی طرح ٹسوے بہانا بند کرو ورنہ میں پھر کبھی نہیں آؤں گا۔’’ طوطے نے ’طوطا گی‘ کا مظاہرہ کیا۔

لیڈی طوطا خاموش ہو گئی اور پھر وہ آنکھوں سے باتیں کرنے لگے، جو آوارہ کی سمجھ میں کہاں آتیں۔ وہ وہاں سے روانگی کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اسی وقت نچلی شاخ پر موجود بھڑوں کے چھتے سے ایک باریک آواز آئی۔

‘‘امی! شہر میں انسانوں نے میری سہیلی کے خاندان کو ختم کر دیا ہے۔ ان کا پورا گھر جلا دیا ہے۔ اس نے مجھے پیغام بھجوایا ہے مجھے اجازت دیں کہ میں ساتھیوں کے ہمراہ جا کر ان سے اس

ظلم کا بدلہ لوں۔“

”کتنی بھولی ہے تو! ہمارے ڈنک سے بھلا انسان کا کیا بگڑ جائے گا اُلٹا ہمارے مرنے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ میں تجھے انسانوں کے چھتے میں ہاتھ نہیں ڈالنے دوں گی۔“

مادر بھڑ نے بے بی بھڑ کو سمجھایا۔

”ماں تو بعض اوقات عجیب باتیں کرتی ہے۔ میں ابھی نیچے کھڑے انسان کو کاٹتی ہوں پھر پتا چل جائے گا کہ اسے تکلیف ہوتی ہے یا نہیں۔“

جونیئر بھڑ کا ’دردناک‘ اعلان سن کر آوارہ کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے فوراً دوڑ لگائی اور دُور موجود قدرتی تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ سانس روک کر جب وہ تہ میں پہنچا تو ایک مچھلی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”چھ ماہ مرتبان میں بند رکھنے کے بعد وہ تمہیں چھوڑ بھی گیا تو کون سا احسان کیا ہے کہ تم اس کے لیے نوکری سے نکلے افسر کی طرح پریشان ہو رہی ہو۔“

”یہ ٹھیک ہے کہ ایک انسان سارے جگ کو گندا کرتا ہے، لیکن کبھی بُرے لوگ بھی اچھائی کر جاتے ہیں۔ یہ اس کی نیکی ہے کہ مجھے واپس چھوڑ گیا ہے وہ مجھے پکا کر کھا بھی تو سکتا تھا۔“ دوسری مچھلی نے کہا۔

سانس لینے کے لیے آوارہ باہر سطح پر آیا تو بھڑ مایوس ہو کر جا چکی تھی۔ وہ تالاب سے باہر نکلا کنارے کے قریب ایک مگرمچھ اپنی مسز کو جھاڑ رہا تھا۔

”یہ انسان کے آنسو بہانا بند کرو میں تمہارے فریب میں آنے والا نہیں ہوں۔“

”یقین کرو تمہاری ماں کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ میں تو خود ان کی وجہ سے بہت غمگین ہوں۔“ مسز نے صفائی پیش کی عین اسی وقت مگرمچھ نے آوارہ کو دیکھ لیا اور اس کی طرف پیش قدمی کی کوشش کی، مگر آوارہ فوراً بھاگ نکلا۔

آوارہ ایک اونٹ فیملی کے پاس سے گزرا تو ننھے اونٹ نے آوازہ کسا۔

”انسان رے انسان تیری کون سی بات سیدھی۔“ پھر وہ باپ سے بولا۔

”نجانے یہ کس کروٹ بیٹھے گا۔ میں تو اس پر سواری کروں گا۔“

”نرا انسان ہے تو، تجھے کیا پتا کہ انسان کی دشمنی کتنی بُری ہوتی ہے۔ انسان جتنا ہو گیا ہے،

مگر عقل نہیں آئی۔ تو اس پر سواری کا خیال چھوڑ دے ورنہ یہ تجھ پر سوار ہو جائے گا۔" ڈیڈی اونٹ نے اسے سمجھایا۔ اور آوارہ وہاں سے کچھ دُور ہاتھیوں کی ایک فیملی کی سُن گُن لینے چل پڑا۔

"دریا کی پرلی طرف والی چراگاہ کا قبضہ کب مل رہا ہے؟" ایک ہاتھی دوسرے سے پوچھ رہا تھا۔

"بس ملنے ہی والا ہے یوں سمجھو کہ انسان نکل گیا ہے اس کا جو تارہ گیا ہے۔" دوسرے نے بتایا۔

"یہ چراگاہ اب تک تو ہمارے لیے سفید انسان ہی ثابت ہوئی ہے۔" تیسرے ہاتھی نے گفتگو میں حصہ لیا۔

"انسان کے کام کہنے کے اور کرنے کے اور... اگر وحشت پوری اپنے فیصلے سے پھر گیا تو؟" پہلا بولا۔

"انسان کے پاؤں میں سب کا پاؤں، اس کے مقابلے میں ہماری کون سنے گا۔" چوتھا بولا۔

"ہم انسان سے بھلائی کے طلبگار ہیں، ہمارا تو اللہ ہی حافظ ہے۔" تیسرا بولا۔

"اگر وحشت نے کوئی گڑبڑ کی تو اس کو سونڈ میں لپیٹ کر کچومر نکال دیں گے تمہیں تو پتا ہی ہے مرا انسان بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔" دوسرا بولا۔

اپنے استاد کے بارے میں ایسے خوفناک منصوبے سن کر آوارہ کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس کی مخبری کے لیے اس نے واپس پروفیسر کے ریسرچ سینٹر کا رُخ کیا۔ راستے میں بھینسوں کا جوڑا سیاسی بحث میں مشغول تھا۔

"تجھے ہزار بار سمجھایا ہے کہ جس کی حکومت اس کے عوام۔" بھینس کا شوہر کہہ رہا تھا۔

"عقل بڑی کہ انسان۔ تمہاری رائے نہایت گمراہ کن ہے۔" مسز نے جواب دیا۔

"مجھے تو لگ رہا ہے کہ میں انسان کے آگے بین بجا رہا ہوں۔" بھینس کے میاں نے بحث سمیٹتے ہوئے کہا۔

آوارہ وہاں سے ہٹا تو اسے کچھ دُور جانوروں کا دانشور طبقہ سیمینار میں مشغول نظر آیا۔ وہ بھی چھپ کر ایک جگہ بیٹھ گیا، تاکہ کارروائی سن سکے۔ اس وقت دانشور شیر اس موضوع پر مقالہ پڑھ رہا تھا کہ انسان بچے دیتا ہے کہ انڈے۔ اس کے بعد لومڑی نے انسان کی مکاری پر ایک مضمون

پڑھا۔ ایک کتے نے اپنی ریسرچ پیش کی کہ پہلے انسان کے دُم ہوتی تھی جو اس نے اپنے افسروں کے سامنے اس قدر ہلائی کہ ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد ایک اونٹ نے انسان کی کینہ پروری پر سے پردہ اُٹھایا اور کئی ایک مثالیں بھی دیں۔ پھر قربانی کے قابل ایک بکرے نے دُہائی دی کہ انسان کے ہاتھوں اس کی نسل کو شدید خطرہ ہے۔ بڑی عید پر سب سے زیادہ استحصال بکروں کا کیا جاتا ہے حالاں کہ قربانی تو کئی اور جانوروں کی بھی ہو سکتی ہے۔ اس دانشور بکرے نے شاید آوارہ کو دیکھ لیا تھا اسی لیے اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ اگر یہ امتیازی سلوک بند نہ کیا گیا تو بکرا ورلڈ اسٹیٹ کے قیام کے بعد انسانوں کی مائیں بھی خیر نہ منا سکیں گی۔ ایک چیل نے اسے سمجھا بجھا کر اسٹیج سے اُتارا کہ انسان کے دل میں رحم کہاں۔ اس کے بعد کوے میاں نے انسان کی لالچی فطرت کے خفیہ گوشوں کی نقاب کشائی کی اور کرگس صاحب نے غیبت اور مردے کھانے کے درمیان تعلق کی وضاحت کی۔ بعد ازاں ایک مکڑے نے انسان کے خوشامدانہ کردار پر سیر حاصل بحث کی۔ یہ سب سن کر آوارہ خود پر قابو نہ پا سکا اور میٹنگ ہال میں پہنچ کر جانوروں کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ جس طرح سب جانور بُرے نہیں ہوتے اسی طرح سب انسان بھی بُرے نہیں، مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ جانوروں تک اپنی بات پہنچانے کے لیے ابھی اسے مزید چالیس دن کا کورس کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ جنگل میں انسان کی آواز کون سنتا ہے۔

کچھ دیر بعد آوارہ صحرائی پروفیسر وحشت جنگل پوری کے پاس اگلے کورس کی ابتدا کرنے کی بجائے جانوروں کی باتیں سمجھنے کی صلاحیت ختم کرنے کا طریقہ پوچھ رہا تھا۔

* *

جھینگر کا جنازہ

خواجہ حسن نظامی

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا... خدا نے پردہ ڈھک لیا۔ افوہ! جب میں لمبی لمبی مونچھوں کا خیال کرتا ہوں، جو وہ مجھ کو دکھا کر بلایا کرتا تھا، تو آج اُس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو، قیصر ولیم کی برابری کرتا تھا۔ اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا، اگر دل سے عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر وذلیل مشہور ہیں، مَیں اُن کو چار چاند لگا کر چمکاؤں گا۔

ایک دن اس مردم کو میں نے دیکھا کہ حضرت عربی کی 'فتوحاتِ مکیہ' کی ایک جلد میں چھپا ہوا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا، ''کیوں رے شریر! تُو یہاں کیوں آیا؟''

اُچھل کر بولا، ''ذرا اِس کا مطالعہ کرتا تھا۔''

''سبحان اللہ! بھائی کیا خاک مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی، یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔''

بولا، ''وہ قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں، مگر نہ اُن کو سمجھے ہیں، نہ اُن پر عمل کرتے ہیں، لہٰذا وہ بوجھ اُٹھانے والے گدھے ہیں، جن پر علم وفضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔ مگر مَیں نے اِس مثال کی تقلید نہیں کی۔ خدا مثال دینی جانتا ہے، تو بندہ بھی اُس کی دی ہوئی بلاغت سے ایک نئی مثال پیدا کرسکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے، جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں۔ سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔ یہ جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی حال ہے، ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔''

جھینگر کی یہ بات سن کر مجھ کو غصہ آیا اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا۔ جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر کہنے لگا، ''واہ! خفا ہو گئے، بگڑ گئے۔ لاجواب ہو کر لوگ اپنا ہی کیا کرتے ہیں۔ لیاقت تو یہ تھی کہ کچھ جواب دیتے۔ لگے ناراض ہونے لگے اور دھتکارنے۔''

ہائے! کل تو یہ تماشا دیکھا تھا، آج غسل خانہ میں وضو کرنے گیا تو دیکھا، بے چارے جھینگر

کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی ہے اور وہ اُس کو دیوار پر کھینچے لیے جاتی تھیں۔ جمعہ کا وقت قریب تھا۔ خطبہ کی اذان پکاری جا رہی تھی۔ دل نے کہا، جمعہ تو ہزاروں آئیں گے۔ خدا سلامتی دے، نماز پڑھ لینا۔ اس جھینگر کے جنازہ کو کندھا دینا ضروری ہے۔ یہ موقعے بار بار نہیں آتے۔ بے چارہ غریب تھا، خلوت نشین تھا، خلقت میں حقیر و ذلیل تھا، مکروہ تھا، غلیظ سمجھا جاتا تھا۔ اِس کا ساتھ نہ دیا تو امریکا کے کروڑ پتی راک فیلر کے شریکِ ماتم ہو گے!

اگر چہ اِس جھینگر نے ستایا تھا، جی دکھایا تھا، لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو۔ اس واسطے میں کہتا ہوں، خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ ہمیشہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں، کسی سوراخ میں، بوریے کے نیچے آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔ نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا، نہ سانپ کا ڈسنے والا پھن۔ نہ کوے کی سی شریر چونچ تھی، نہ بلبل کی مانند پھولوں کی عشق بازی۔ شام کے وقت عبادت رب کے لیے ایک مسلسل بین بجاتا تھا اور کہتا تھا کہ غافلوں کے لیے صور ہے اور عاقلوں کے لیے جلوۂ طور۔

ہائے! آج غریب مر گیا، جی سے گزر گیا۔ اب کون جھینگر کہلائے گا۔ اب ایسا مونچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا۔ ولیم میدانِ جنگ میں ہے، ورنہ اسی کو دو گھڑی پاس بیٹھا کر جی بہلاتے کہ مری مٹی کی نشانی ایک یہی بے چارہ دنیا میں باقی رہ گیا ہے۔

ہاں تو ''جھینگر کا جنازہ ہے، ذرا دھوم سے نکلے'' چیونٹیاں تو اِس کو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کر دیں گی۔ میرا خیال تھا کہ اِن شکم پرستوں سے اِس توکل شعار فاقہ مست کو بچاتا اور ویسٹ منسٹر ایبے یا قادیان کے بہشتی مقبرہ میں دفن کراتا، مگر جناب یہ کالی چیونٹیاں ہیں، افریقہ کے مردم خور سیاہ وحشیوں سے کم نہیں۔ کالی جو چیز بھی ہو، ایک بلائے بے درماں ہے۔ اس سے چھٹکارا کہاں ہے۔ خیر تو مرثیے کے دو لفظ کہہ کر مرحوم سے رخصت ہونا چاہیے:

جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے
قیصر کا پیارا ہے، اِسے توپ پہ کھینچو

اے پروفیسر، اے فلاسفر، اے متوکل درویش، اے نغمہ ربانی گانے والے قوال! ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اُٹھانے اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا ریزولیوشن پاس کرتے ہیں۔ خیر اَب تو تُو شکم مور کی قبر میں دفن ہو جا، مگر ہم ریزولوشن میں تجھے یاد رکھیں گے۔

خود برداشتہ مزاح

خواجہ عبدالغفور

شوخ بیانی، طنز و استہزاء، رمز، ایجاز، ہزل، ریختی، مخول، ٹھٹھا، مضحکات، سخن چینی، تفنن، ہجو، ضلع جگت اس طرح کی کئی اصناف و اقسام ہیں، جن میں بالعموم کسی اور کو نشانہ ملامت بنا کر ہم خوش ہو لیتے ہیں اور دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ کسی کو گندے پانی میں شرابور ہوتے ہوئے یا کیلے کے چھلکے پر سے پھسلتے ہوئے دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑتے ہیں۔ کسی کے ہکلانے پر، کسی کی نادانستہ غلطی پر، نقالی پر ہنس لینا ہمارا روزمرّہ کا معمول ہے اور ہم کسی بے مذاق سے بخوشی لطف اندوز ہوتے ہیں جب کہ اس کا معمول یا نشانہ کوئی اور ہو بر خلاف اس کے جب کسی کے مذاق سے ہماری اَنا کو دھچکا لگتا ہے یا ہماری کسی کمزوری پر کوئی ہنستا ہے تو ہم کو بے حد ناگوار گزرتا ہے۔ یہ اس لیے بھی ہوتا ہے کہ ہم سب اپنی کمزوریوں اور خامیوں سے بخوبی واقف رہتے ہیں گو ان کا اقرار نہیں کرتے اس لیے دوسروں کے انہی عیبوں پر ہنس کر خود کے احساسِ کمتری کو مٹانا چاہتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا فرار ہے۔ بقول بہادر شاہ ظفر:

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ہم بہت زیادہ خوش اُس وقت ہوتے ہیں کہ جب کوئی اور اپنے آپ کو نشانہ ملامت یا نشانہ ہدف بنا کر خود ہنستا ہے اور ہم کو بھی ہنسنے پر اُکساتا ہے۔ ایسے میں ہم اپنے کو کسی اور کی زد سے محفوظ پا کر طمانیت اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس قسم کی ظرافت جو خود برداشتہ ہو سب سے زیادہ بلند پایہ، صاف اور ستھری ہوتی ہے اور دماغی صحت کا بیّن ثبوت ہوتی ہے اور یہی دماغی صحت ایک قسم کا تحفظ اور گارنٹی ہے صحتِ جسمانی کے لیے۔ جو استاد اپنی کلاس میں اپنے آپ پر ہنس سکتے ہیں ان کے روابط اپنے شاگردوں سے بڑے خوشگوار اور عزت افزا ہوتے ہیں۔ ہمیں یاد ہے کہ ہم

لوگوں نے کالج میں ایک فٹ بال ٹیم طلبا کی بنائی اور دوسری اپنے اساتذہ کی۔ پروفیسروں کی اس ٹیم کے لیے ہم نے انگریزی کے نامور پروفیسر ویرابھدر ڈو کا نام بطور کپتان لکھا۔ یہ جسمانی اعتبار سے نہایت ہی منحنی، لاغر اور دُبلے پتلے تھے۔ جب نوٹس ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے اپنے نام کے آگے صرف یہ لکھا۔ کیا آپ لوگ ایسے پروفیسروں کو بھی مستثنیٰ نہیں کریں گے کہ جو فٹ بال سے بھی مختصر ہیں۔ کتنا زبردست طنز ہے یہ اپنے آپ پر، کس قدر ہنسے ہیں ہم اس مذاق پر۔ جس آدمی میں مزاح کی حس ہو وہی اِس قسم کا وار کرسکتا ہے خود پر۔

حضرت غالبؔ نے اس طرح کی چوٹیں اپنے آپ پر خوب کی ہیں:

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ   آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

اکبرؔ الٰہ آبادی نے بھی اس طرح کی خنجر زنی کی ہے کہ خود کو لہولہان کردیا:

بھیا رنگ یہی ہے اچھا   ہم بھی کالے، یار بھی کالا
عاشقی کا ہو بُرا اُس نے بگاڑے سارے کام   ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے ہو گئے

مارک ٹوین نے مزاح کی اِس صنف کو روشنی دینے والی بجلی سے تعبیر کیا ہے اور دوسروں کو ایذا پہنچانے والے مذاق کو آسمانی بجلی کہ جو جلا کر بھسم کردیتی ہے۔ باب ہوپ اس قسم کی ظرافت کے لیے مشہور ہیں کہ جس کو "Ad lib" کہا جاتا ہے۔ جو مذاق فی البدیہہ اپنے آپ پر چسپاں کردیا جاتا ہے، اکثر اس میں لطیف قسم کی دیوانگی شریک ہوتی ہے اس لیے اُس کو "Mad lib" بھی کہا جاتا ہے۔ باب ہوپ سوچ کر اپنے متعلق ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں کہ جو اُن کی کم ہمتی، بزدلی یا ناسمجھی کی دلیل قرار دی جاسکتی ہیں۔ مکہ بازی کے تعلق سے اُنہوں نے ٹیلی ویژن پر بتایا کہ وہ بھی اِس میں دخل رکھتے تھے۔ لیکن وہ ہمیشہ دوسروں کے سہارے ہی اکھاڑے کے اندر جاتے اور باہر آتے رہے۔

اس قسم کی باتوں سے دوسرے بے حد حظ اُٹھاتے ہیں اور خوب ہنستے ہیں، لیکن اِن باتوں کے کہنے کے لیے نہ صرف دل گردہ چاہیے، بلکہ قوتِ ارادی بھی۔ ہم اپنے آپ پر ہنستے ہیں تو ساری دنیا ہمارے ساتھ ہنستی ہے اور جب ہم دوسروں پر ہنستے ہیں تو وہ ہمارا ساتھ دینے کی جرأت نہیں رکھتے۔ جو اپنی بڑائی ہانکتا ہے، اپنی فتوحات کی داستان سناتا ہے، جو اپنے کارہائے نمایاں سنا کر

مرعوب کرنا چاہتا ہے، تعلّی کرتا ہے، ڈینگیں مارتا ہے، اُس کو کوئی بھی برداشت نہیں کرتا، بلکہ اُس کو بور کا خطاب دیا جاتا ہے، مگر باب ہوپ کی طرح اپنی کمزوریوں کو اُچھال کر تماشا دیکھیے۔ لوگ آپ سے پیار کرنے لگتے ہیں، مشفقانہ مربیانہ اور احساسِ برتری سے بھرپور پیار۔ اِس میں اُن کی انا کو ایک بڑا درجہ ملتا ہے۔

ہمیں ایک موقع پر صدارت کا اعزاز بخشا گیا اور بہتوں نے تعریف و توصیف کے پل باندھ دیے۔ خطبۂ صدارت کا وقت آیا تو ہم نے وہ قصّہ دہرایا کہ سمندر میں ڈوبتے ہوئے ایک لڑکے کو دیکھ کر کنارے پر شور مچا۔ بچاؤ، بچاؤ، لڑکا ڈوب رہا ہے۔ کوئی اس کو بچاؤ، لیکن کسی نے بھی پانی میں کودنے کی ہمت نہ کی۔ اتنے میں ایک صاحب دکھائی پڑے کہ جو سمندر میں لڑکے کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بڑی مشکلوں سے انہوں نے اس کو کنارے پر کھینچا۔ لوگوں نے بڑی واہ وا کی۔ ان کی ہمت کی داد دی۔ یہ کچھ سنبھلے تو بولے، ”وہ تو سب ٹھیک ہے کہ میرے ہاتھوں لڑکے کی جان بچ گئی ہے۔ پر کوئی یہ تو بتاؤ کہ سمندر میں مجھے ڈھکیلا کس نے؟“

جولیٹ پو امریکا کی گرل اسکاوٹ (گرل گائیڈ) تحریک کی بانی مبانی کو ثقل سماعت کی کمزوری تھی، مگر وہ اپنے اِس عیب سے خود برداشتہ ظرافت پیدا کرتی تھیں۔ ایک بار خود انہوں نے اپنے تعلق سے اس قصّے کو دہرایا کہ کسی جلسے کی وہ صدارت کر رہی تھیں اور انہوں نے محسوس کیا کہ مقرّر کو خاطر خواہ داد نہیں مل رہی تھی اور لوگ واہ وا کر رہے تھے نہ تالیاں بجا رہے تھے۔ اپنی کمزوری کی وجہ سے یہ سن بھی نہ سکتی تھیں کہ مقرّر کیا کہہ رہا ہے اس کے باوجود انہوں نے تقریر کے دوران خوب واہ وا کی۔ خود بیان کرتی ہیں کہ بعد میں اُنہیں پتا چلا کہ مقرر ان کی تعریف کر رہا تھا۔

لائیڈ جارج کہتے ہیں کہ انہیں کسی نے بتایا کہ دریا میں ڈوبتے ہوئے آدمی کی جان بچانے کے لیے ایک صاحب کود پڑے اور جب ڈوبنے والے کے قریب پہنچے تو پہلے اُس کو پانی سے اوپر کھینچ کر اُس کی صورت بغور دیکھی اور اطمینانِ خاطر کے بعد اس کو گھسیٹ کر باہر نکالا۔ بعد میں لوگوں نے اس شخص سے پوچھا کہ ڈوب مرنے والے کی جان بچانے سے پہلے اس کی صورت دیکھنا کیا ضروری تھا؟

لائیڈ جارج بڑے مزے سے اِس قصّے کا منتہیٰ سناتے ہیں کہ اس شخص نے بتایا کہ وہ اس امر کا جلد اَز جلد اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ جس کی جان بچا رہا ہے وہ لائیڈ جارج تو نہیں!

اِس قسم کی اعلیٰ اور پاک ظرافت مہاتما گاندھی کی زندگی میں بہت ملتی ہے۔ اُن کی خوش مذاقی مسلمہ ہے اور ان کی صحت مند طویل عمری کا راز بھی یہی کہ وہ ہر حال میں ہشاش بشاش رہتے اور ان کی ہر بات میں خوش مزاجی کی چاشنی ضرور شریک رہتی۔ اپنے آپ پر فقرے کسنے سے بھی وہ باز نہ آتے۔ ان کے چار لڑکے تھے۔ سب سے بڑے صاحبزادے گاندھی جی کے مزاج اور ان کی عظمت کے اُونچے معیار پر پورے نہیں اُترتے تھے۔ کسی نے پوچھا، ”آپ کی اتنی عظیم الشان ہستی ہے کہ آپ کے قریب آنے والے اجنبی بھی آپ کے کردار کے زیرِ اثر آجاتے ہیں اور اپنی کمزوریوں کو دھوڈالتے ہیں۔ مگر یہ آپ کے صاحبزادے ایسے کیوں نکلے؟“ گاندھی جی نے زیرِ لب تبسّم کے ساتھ کہا، ”میں جب جیسا تھا اس زمانے کی اولاد بھی ظاہر ہے کہ ویسی ہی ہوگی۔“

کبھی کبھار خاکساری اور انکسار کے سچے جذبات بھی اپنے آپ پر بھرپور وار کرکے اوروں کو فضیلت دیتے ہیں اور دوسروں کو متبسّم ہونے کا موقع عطا کرتے ہیں۔ رابرٹ منٹگمری جنگِ عظیم میں ہائی کمانڈ تھے۔ جو، ای، براؤن مشہور فلم اسٹار ان کے سیکٹر میں آئے تو انہوں نے خواہش کی کہ ان کے ساتھ تصویر کھینچی جائے۔ جو، ای، براؤن نے بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ اتنے بڑے کمانڈرانِ چیف کے ساتھ ان کی تصویر آئے گی۔ مگر منٹگمری نے کہا، ”آج مجھے بڑی مسرت ہورہی ہے۔ میں اپنے بچوں کی ایک دیرینہ خواہش پوری کررہا ہوں کہ ایک مشہور عالم ہستی کے ساتھ اپنی تصویر کھنچوا کر انہیں بھیج سکوں گا۔“

اوروں کی نظر میں اپنے آپ کو بعید از قیاس طریقہ سے لاعلم اور کمزور کرکے بھی مزاح کی رگ کو پھڑکایا جاسکتا ہے۔

مارک ٹوین نے یوں ہی پوچھا، ”کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ میں کیوں ہندسا گر کی طرح ہوں؟“ بہت سارے لوگوں نے مختلف وجوہ بتائیں اور قیاس آرائیاں پیش کیں، مگر ایک بھی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ بالآخر مارک ٹوین ہی سے وضاحت کرنے کو کہا گیا، انہوں نے جواب دیا، ”میں خود نہیں جانتا، جبھی تو آپ سے پوچھتا تھا۔“

ٹینس کے ایک بہت پُرانے اور نامور کھلاڑی نوجوان لڑکوں کو ٹینس کھیلتے دیکھ رہے تھے اور جب انہوں نے محسوس کیا کہ وہ گیند کی سروس میں بہت ہی کمزور ہیں تو بہ جوش و خروش میدان میں کود پڑے اور کہا کہ ”ہم سروس کرکے بتاتے ہیں۔“ گیند اور بلا ہاتھ میں لے کر ٹینس کورٹ پر

بہت ہاتھ چلائے، لیکن ہر بار ان کی گیند غلط گرتی رہی۔ جب یہ بہت ہی تھک گئے اور ایک بار بھی سیدھی گیند نہ لگا سکے تو ہنس کر کہا، ”تو دیکھا تم لوگوں نے کہ غلط سلط سروس کس طرح کی جاتی ہے۔ اب تم احتیاط سے سیدھی سروس کرنا۔“

کبھی کبھی لوگ واقعات اور حالات سے فائدہ اُٹھانے کی خاطر بظاہر اپنے آپ کو مورد لعن وطعن بناتے ہیں، لیکن ان کے پیچھے زبردست مزاح چُھپا ہوتا ہے، جو ستم ظریفی کا مظہر ہوتا ہے۔

ایک نیتا نے بتایا، مجھے اپنی پارٹی کے الیکشن کے وقت جب ووٹ لینا ہوتا ہے تو میں ٹیکسیوں میں خوب گھومتا پھرتا ہوں اور ہر ٹیکسی ڈرائیور کو کرایے کے علاوہ خوب بخشش دیتا ہوں اور تاکید کرتا ہوں کہ میری پارٹی کو ضرور ووٹ دینا۔

ان کے مخالف نے کہا، ”جی ہاں میں بھی ایسے ہی ٹیکسیوں میں گھومتا ہوں اور کرایہ کے علاوہ کچھ بھی ٹپ نہیں دیتا اور تاکید کرتا ہوں کہ وہ آپ کی پارٹی کو ووٹ دے۔“

اب یہ امر واقعہ ہے کہ اپنے تعلق سے کچھ ایسی باتیں کرنا بھی کارگر ہوتا ہے، جس میں اپنی مذمت ہو اور دوسروں کو سراہنا ہو۔ ایک بار اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے ہم نے اس قسم کے خود برداشتہ طنز کے وار کیے۔

”میری تقریر سے پہلے آپ نے تالیاں بجائیں وہ آپ کی نیک نیتی کی دلیل تھیں۔ دورانِ تقریر میں جو تالیاں بجائی گئیں وہ اس کا اظہار تھا کہ آپ کو مجھ سے اچھی تقریر کی اُمید وابستہ ہے اور اب جو اختتام پر آپ واہ وا کر رہے ہیں وہ محض شکر گزاری کا جذبہ ہے کہ آپ کے بور ہونے سے پہلے تقریر ختم کر رہا ہوں۔“

کسی نے ایک بار ہم سے پوچھا، ”آپ اکثر تقریریں کرتے ہیں تو کیا آپ ہمیشہ مختلف موضوعات پر بولتے ہیں؟ ہم نے کہا جی نہیں۔ میں تو وہی ایک گھسی پٹی تقریر ہر جگہ جھاڑ دیتا ہوں۔“ سوال کرنے والے نے حیرت سے دریافت کیا، ”اگر وہی حاضرین پھر سے جمع ہوں تو آپ کیا کریں گے؟“

ہم نے بتایا، ”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جو ایک بار ہمیں سن لیتا ہے وہ پھر کیوں آنے لگا!“

برناڈ شا سے ایک بہت ہی حسین رقاصہ نے کہا، ”میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں کہ

اس سنجوگ سے جو اولاد ہوگی وہ نہ صرف میری طرح خوب صورت ہوگی، بلکہ آپ کی طرح ذہین اور صاحبِ فہم و ذکا ہوگی۔"

برنارڈ شا نے اپنی بدشکلی پر خود ہی وار کرتے ہوئے کہا، "اور شکل و صورت میری طرح اور فہم و فراست میں آپ کی طرح ہوئی تو؟"

ہمارے نیتا نرنجن بابو خود بیان کرتے ہیں کہ انہیں ریڈیو اسٹیشن اپنی تقریر نشر کرنے جانا تھا۔ ایک ٹیکسی کو روکا تو ڈرائیور نے کہا۔ میں گھر جا رہا ہوں۔ نرنجن بابو کی ریڈیو پر تقریر سننا ہے۔ نرنجن بابو کو فخر محسوس ہوا کہ ٹیکسی ڈرائیور تک ان کی تقریر سننے کا اس قدر مشتاق ہے پھر بھی انہیں جلدی تھی کرایہ کے علاوہ پانچ روپے بخشش کا وعدہ کیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نہ صرف فی الفور راضی ہوگیا، بلکہ کہنے لگا، "چلیے صاحب چلیے نرنجن بابو کو گولی ماریے۔ ان کو سن کر کیا لینا دینا ہے مجھے۔"

دنگل میں کشتیاں ہو رہی تھیں۔ ایک پہلوان اپنے حریف سے بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ اُن کے دوستوں نے کہا گھبراؤ نہیں یار بس دل ہی دل میں دہراتے رہو کہ میں یہ کشتی ضرور جیت جاؤں گا۔ اور بس تم ضرور جیت جاؤ گے۔

پہلوان نے تلملا کر کہا، "جی یہ بات کچھ کارگر نہیں لگتی۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں جھوٹا ہوں۔"

یہ تو ہوئیں روز مرہ کی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والی حکایتیں۔ لیکن ہمارے استاد شعرائے باکمال نے نہ صرف مزاحیہ انداز میں، بلکہ سنجیدہ کلام میں بھی اپنے آپ پر طرح طرح سے طنز و مزاح کے گہرے وار کیے ہیں:

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ   شرم تم کو مگر نہیں آتی

اکثر شعرا نے زندگی کی تلخیوں، غمِ زمانہ، غمِ روزگار اور غمِ یار کے باوجود فطری خوش مزاجی کا سہارا لے کر یاسیت سے فرار کی خاطر خود کو طنز و استہزا کا شکار بنایا ہے۔ زمانے کو بُرا بھلا کہا ہے قدرت سے ٹکر لی ہے، لیکن کسی اور کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا:

غم جو کھاتا ہوں تو مجھ کو کھائے جاتا ہے یہ غم   کھاؤں گا پھر کیا میں دنیا بھر کا غم کھانے کے بعد

---

[1] خواجہ عبدالغفور ...... خود برداشتہ مزاح

مسجد کا نہ رکھا...

خورشید احمد عونؔ

بڑے بھائی صاحب کے گھونسوں، لاتوں اور ڈانٹ ڈپٹ کی برکت سے نماز کی عادت بچپن ہی سے پڑ گئی اور عمر کے باقی حصے میں چاہنے کے باوجود بھی یہ عادت ترک نہ کی جا سکی۔ شروع شروع میں ہم نماز سے کتراتے تھے، بھائی جان بازو سے پکڑ، مسجد کے گیٹ تک پہنچا کر جونہی استنجا خانے میں قدم رکھتے، ہم بغلی دروازے سے بغلیں بجاتے ہوئے چوک میں پہنچ جاتے اور پھر نماز، فضل سبحان جلیبی والے کے پاس ایک روپیا فی رکعت کے حساب سے ادا کرتے۔

صبح اور عشاء کی نمازیں ہم پر اکثر بھاری ثابت ہوتیں، کیوں کہ بھائی جان نہ صرف اپنی نگرانی میں لے کر جاتے اور واپس لاتے، بلکہ پیشانی پر موجود بالوں کی اُلجھی لٹ کو ہاتھ لگا کر دیکھتے بھی کہ ہم نے وضو بھی کیا ہے کہ نہیں۔ گو کہ ’وضو کرنے‘ کی ترکیب ہم نے ایجاد کر لی تھی کہ باقی نمازیں ادا کرنے جب چوک میں جاتے، تو واپسی پر رمضان ہوٹل کی ٹنکی سے (منہ کو، خاص طور پر سامنے کے بالوں کو) ہلکا سا گیلا کر دیتے تھے۔ لیکن مسئلہ صبح سویرے اُٹھنے کا تھا۔ بھائی جان ہمیں بستر میں لپیٹ کر اُٹھاتے اور باہر ’جبے‘ پر جھاڑ کر گلی کے کتوں کے حوالے کر دیتے۔ یوں ہم اُن سے پہلے مسجد میں پہنچ جاتے۔

ان تمام مشکلات سے چھٹکارا ناممکن دیکھ کر ہم نے چار و ناچار پورے پانچ وقت کی (اصل) نماز خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھنا شروع کر دی۔ اور پھر یہ غیر ارادی افعال کا ایسا حصہ بنی کہ کسی فلم کا کوئی بھی سین ہو، ہیرو صاحب اپنی داستانِ محبت چھیڑنے والے ہوں، اپنے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہوں، یا خوب صورت رقص شروع ہونے کو ہوتا ہم ’پاز کا بٹن‘ دبا کر مصلا بچھا دیتے ہیں (وضو فلم شروع ہونے سے پہلے کر لیتے ہیں)۔ اگر سنیما گھر جانا ہو تو ایسے سنیما کا انتخاب کرتے ہیں، جو کسی مسجد کے قریب ہو اور حفظِ ماتقدم کے طور پر مصلاّ بھی ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ صرف

سینما بینی یا فلم بینی پر کیا موقوف، زندگی کے باقی اُمور کی انجام دہی کے دوران میں بھی ہم زہد و اتقا کی کثرت سے بے خودیِ ذات کے اُس مرتبے پر پہنچے کہ اکثر مسجد جا کر واپس لوٹ آئے۔ مگر گھنٹوں بیٹھے سوچتے رہے کہ وضو بھی کیا تھا، یا نہیں۔

نماز کے دوران ہم "Serial time" سے نکل کر "Pure time" میں داخل ہو جاتے ہیں، جہاں ماضی کی کوتاہیاں، حال کی بے حالی اور مستقبل کے تاریک منصوبے یکجا ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ البتہ نماز کے کم یا زیادہ ہونے کا اندازہ ہم مستقبل کے منصوبوں سے لگا لیتے ہیں۔ اگر ہم لیکچرار بنتے ہیں تو دو رکعات ادا کی ہیں۔ نامی گرامی ادیب بن چکے ہیں، انٹرویو اخبارات کی زینت بنتے ہیں، نصف درجن کے قریب معاشقے ظہور پذیر ہو گئے ہیں، سرکاری خرچ پر بیرونِ ملک دورے ہو رہے ہیں، تو سمجھیں ہم نے عشاء کی نماز پوری پڑھ لی ہے۔ تراویح کے دوران تو ہم کئی بار ملک کے صدر منتخب ہوئے۔ صدر بھی ایسے کہ جس نے نہ صرف مقررہ مدّت پوری کی، بلکہ ملک سے بیروزگاری، مہنگائی اور غربت کا خاتمہ بھی کیا۔ ایک دفعہ تو وتر کے دوران دعائے قنوت کے لیے کہی گئی تکبیر پر رکوع میں چلے جانے سے ملک دشمن عناصر کی گولی سے بچے بھی تھے! ویسے ہمیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ایک شبِ وصل جب مؤذن کو پچھلے پہر خدا یاد آیا تو اُس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مسجد کو دوڑ پڑے:

ورنہ ہم شب کا کوئی وار تو چل جانا تھا

تاہم، ان اعترافات سے اپنے آپ کو زاہد ثابت کرنا مقصود نہیں (جو بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو، ثابت نہیں کی جاتی!) بلکہ یہ تو تمہید ہے، اُن آزمائشوں اور تکالیف کے بیان کی، جو ہمیں نماز کی ادائیگی میں درپیش رہیں۔

مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے ہم ہمیشہ ایک خوف سا محسوس کرتے ہیں، مگر یہ خوفِ الٰہی نہیں، 'خوفِ الٰہی بخش' ہے، جس کے ذمّے ہماری مسجد کی دیکھ بھال ہے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ ہم تمام دنیاوی کاموں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد جب رات گئے مسجد کے صدر دروازے پر پہنچتے ہیں تو الٰہی بخش تالا لگا رہا ہوتا ہے۔ ڈرتے ڈرتے کہتے ہیں، ''نماز پڑھنی ہے،'' وہ ہمیں خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے دروازہ کھول دیتا ہے۔ پھر ہتھیلی پر تالے کی ضرب لگا کر کہتا ہے،

"جاتے ہوئے تالا لگا دینا۔" الٰہی بخش کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ وہ اپنا کام مقررہ وقت پر ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اس کو دس بجے تک صحن مسجد میں پڑی تمام چٹائیاں اندر پہنچا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ غالباً 9:59 کے پچیسویں سیکنڈ پر جو اُس نے، ہماری پیشانی، ناک، ہاتھوں، پیروں اور زمین کے درمیان حائل چٹائی کو ایک جھٹکے سے کھینچا تو ہم مینڈک بے پشت کے بل چکر کھاتے ہوتے دوبارہ سجدے میں گر پڑے۔ خدا کی عظمت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ الٰہی بخش کی مہارت کی داد بھی دی کہ اس نے ہمارا سجدہ ٹوٹنے نہ دیا!

الٰہی بخش کے علاوہ مسجد کی انتظامیہ میں چند بزرگ ایسے بھی ہیں، جو ہماری نماز میں خلل ڈالنے کے فریضے کو امرِ ربی سمجھ کر سرانجام دیتے ہیں۔ نمازوں کا حساب کتاب ایک بزرگ نے سنبھال رکھا ہے۔ تکبیرِ اولیٰ کے لیے اُٹھے ہمارے ہاتھوں کو پکڑ کر نیچے کرتے ہوئے پوچھتے ہیں "ہاں، یہ بتاؤ، کل عصر کے وقت کہاں تھے؟" جواب کوئی بھی دیں وہ شک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے پائنچے چڑھا کر کہتے ہیں، "خوں... منہ میرا طرف خانہ کعبہ شریف اللہ اکبر۔"

یہ دیکھنے کو کہ ہم نماز پڑھ رہے ہیں، یا (اُن کی طرح) ویسے ہی منہ ہلا ہلا کر نماز پڑھنے کی اداکاری کر رہے ہیں، ایک بزرگ تو اتنے قریب آجاتے ہیں کہ ہم سجدۂ سہو تک بھول جاتے ہیں۔ مستقبل کے تمام منصوبے تلپٹ ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ پائنچے اوپر ہیں، مختلف حرکات و سکنات تو نہیں کی جارہی ہیں، نماز واقعی 'ہمارے' فقہ کے مطابق پڑھی جارہی ہے یا... چوں کہ ان بزرگ صاحب نے ہمیں کبھی آرام و سکون کے ساتھ مستقبل کے لیے حکمتِ عملی طے نہ کرنے دی، اس لیے بکھرے منصوبوں کے ساتھ ہم بھی بکھر گئے۔ لیکن جہاں بھی گئے، یہ دو کم نہ ہوا۔

اپنے محلے کی مسجد میں تو ایک ہی فرقہ تھا، جس کے ہم آہستہ آہستہ عادی بنا دیے گئے تھے لیکن بعض جگہوں پر ہمیں لگاتار کئی ماہ تک دوسرے فرقے کی مسجد میں نماز پڑھنی پڑی۔ اجنبی ماحول، نامانوس لوگ اور 'کچھ کچھ' مختلف طریقۂ نماز۔ دل کی دھڑکن مزید تیز ہو جاتی۔ ایک دفعہ تو یوں محسوس ہوا کہ سارے نمازی ہمیں کسی دوسرے جزیرے کی مخلوق سمجھ کر غور سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک دو بچوں نے تو ہمیں چھو بھی کہ آیا ہم انسان ہیں بھی یا نہیں۔ خوف سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پوری نماز 'جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو' کے وِرد میں گزر گئی۔ پوری اُمید تھی کہ نماز ختم ہونے

کے بعد لوگ پکڑ لیں گے، مار مار کر باہر نکالیں گے، پھر اُس جگہ کو دھوئیں گے، جہاں ہم کھڑے تھے، لیکن صحیح سلامت نکل آنے پر گھر جا کر سجدۂ شکر ادا کیا۔

بعض مساجد کے نام ہی اُن کے فرقے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ایسی مسجد میں تو نماز پڑھتے ہوئے 'نکل سی جاتی ہے جاں ہر رکعت میں گویا'۔ دروازے پر پولیس تعینات، دھماکے کا خوف، ہر نمازی پر خود کش حملہ آور ہونے کا یقین، ناگہانی شہادت پر افسوس، (پہلے سے علم ہو تو ہم اپنے تمام دوستوں اور عزیزوں کو دی گئی قرض کی رقوم واپس لے لیں!) کلمۂ شہادت کا وِرد اور گناہوں سے مغفرت کی دعا، ہر رکوع اور سجدے کی تسبیح بن جاتی ہے۔ جو لوگ ہمارے مقروض ہیں وہ بار بار یاد آتے ہیں۔ ایک دو دفعہ تو وہ لوگ بھی یاد آ جاتے ہیں، جن کے ہم مقروض ہیں! تاہم، ایسے گمراہ کن خیال کو سر جھٹک کر اُسی وقت اپنے دماغ سے نکال باہر کرتے ہیں۔

بعض مساجد کے در و دیوار پر کچھ احکامات، ہدایات، یا دھمکیاں لکھی ہوتی ہیں۔ مثلاً 'اِس جگہ سے آگے جوتے لے جانا منع ہے۔' 'اپنے جوتوں کی خود حفاظت کریں' پانی کم استعمال کریں، غسل کرنا منع ہے۔ جو غسل کرتے ہوئے پکڑا گیا، سو روپیا جرمانہ اور کپڑے ضبط، سیاسی گفتگو سے پرہیز کریں، بلا اجازت تقریر کرنا منع ہے۔ مسجد میں داخل ہوتے ہی خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو جاتی ہیں۔ استنجا خانے میں جب پانی زیادہ استعمال ہو جاتا ہے تو یہ خوف دامن گیر ہوتا ہے کہ کوئی چوری چھپے دیکھ تو نہیں رہا۔ لجاجت سے کپڑے سمیٹے جو اُوپر دیکھتے ہیں تو واقعی ایک ہاتھ نے دروازے کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے، یا الٰہی اب کیا ہوگا۔ بُرے پھنسے، دروازہ کھول کر بھاگ بھی نہیں سکتے۔ مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے ہو جاتے ہیں تو آواز آتی ہے، ''بھائی جلدی نکلو۔ جماعت نکلی جا رہی ہے۔'' پھر جب نماز شروع کرتے ہیں تو دھیان جوتوں کی طرف رہتا ہے۔ ہر آہٹ پر جی چاہتا ہے کہ نماز توڑ کر چور چور کا الارم بجا دیں۔ باقی رکعات، ننگے پاؤں گھر جانے کے طریقے سوچنے اور نئے جوتے خریدنے کے لیے پیسوں کے انتظام کی منصوبہ بندی میں گزر جاتی ہیں!

'سیاسی گفتگو سے پرہیز کریں' کے عین نیچے مولوی صاحب کی جائے نماز ہے، جہاں وہ جماعت سے پہلے اپنے خاص احباب سے محوِ گفتگو ہوتے ہیں، ''خدا خیر کرے! نئی حکومت کیا گل کھلائے گی۔ مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے، حکومت کے قابو سے باہر ہو گئی ہے۔''

ایک دفعہ مسجد کے 'سربراہ' سے پوچھا، "یہ سو روپیہ جرمانے کے ساتھ کپڑے ضبط کرنے والی دھمکی آپ کے کس ارادے کو ظاہر کرتی ہے" ۔ "بات یہ ہے کہ" وہ گویا ہوئے، "اکثر لوگ یہاں نہانے آتے تھے، مگر جیب خالی کر کے۔ دھمکی کا دوسرا حصہ تو ہم نے بعد میں شامل کیا ہے کہ کوئی نہانے کے لیے بغیر کپڑوں کے نہیں آسکتا۔"

جماعت سے نماز پڑھنا تو ہمارے لیے واقعی مشکل ترین مرحلہ ہے۔ قطاریں بنتے ہی مولوی صاحب کی تیز نظریں ہمارے سراپا کا جائزہ لیتی ہیں۔ پھر جلالی لہجے میں حکم ہوتا ہے، "اپنے موبائل فون بند کر لیں، شلوار اُونچی کر لیں، کندھے سے کندھا اور ٹخنے سے ٹخنہ ملا لیں۔" حکم ملتے ہی دائیں بائیں سے موٹے تازے افراد دباؤ ڈالنا شروع کر دیتے ہیں اور ہماری چیخ نکل جاتی ہے۔ 'قعدہ' کا عمل خاص طور پر تکلیف دہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر بزرگوں کے درمیان بیٹھنے سے آپ کی عاقبت بھی بگڑ سکتی ہے۔ دائیں طرف سے دومن کے حاجی صاحب اوپر لڑھک آتے ہیں۔ خراٹوں کی آواز میں ہم انہیں کوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ صلوٰۃ توڑ کر قبل از وقت سلام پھیریں اور بلند آواز سے صلواتیں سنانا شروع کر دیں۔ پھر ارادہ کرتے ہیں کہ جونہی امام صاحب سلام پھیریں گے، ہم ایک جھٹکے سے کھڑے ہو جائیں گے، تا کہ حاجی صاحب دھڑام سے نیچے آ رہیں، مگر 'السلام علیکم ورحمۃ اللہ' کی تیز آواز سن کر حضرت جاگ اُٹھتے ہیں اور ہم لہو کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں!

کبھی سوچتے ہیں، نماز گھر پر ہی پڑھ لیا کریں۔ مولوی صاحب کا ڈر، نہ جوتے چرائے جانے کا دھڑکا۔ کبھی سوچتے ہیں، نماز اپنے ہی مسلک کی مسجد میں پڑھا کریں گے، تا کہ اپنے طریقۂ نماز سے محفوظ رہیں۔ لیکن پھر اچانک ہم نے پکا فیصلہ کر لیا کہ جب بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا پڑی، اپنی بغلی جیبوں میں نوکدار آلے ڈال کر لے جائیں گے اور جماعت شروع ہوتے ہی اُن کے سِروں کو باہر نکال دیں گے...

* *

معذرت نامہ

دلیپ سنگھ

یہ ایک خط کا جواب ہے، جو مجھے بلی ماراں دتّی کے کسی نسیم صاحب نے لکھا ہے۔ اپنے خط میں نسیم صاحب مجھ پر بہت برسے ہیں۔ گالیاں دی ہیں، ایسی گالیاں جنہیں کھا کر میں بہت بدمزا ہوا۔ انہوں نے اور باتوں کے علاوہ مجھے گرہ کٹ کا بھائی چور کہا ہے۔ صرف گالیوں پر اکتفا کیا ہوتا تو شاید میں برداشت کر جاتا، لیکن انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر میں کبھی ان کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ میری ہڈی پسلی برابر کر دیں گے۔ نسیم صاحب نے بھاری بھر کم الفاظ استعمال کیے ہیں۔ کچھ اس وزن کے الفاظ جو عبادت بریلوی صاحب بالعموم اپنے تنقیدی مضامین میں استعمال کیا کرتے ہیں۔ ان کے وزن دار الفاظ سے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ پہلوان قسم کے آدمی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسے آدمی کے دل میں میرے لیے پُرخاش کا خیال رہے، اس لیے میں اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لیے یہ خط لکھ رہا ہوں۔

میرا خط پڑھنے سے پہلے نسیم صاحب کی ناراضگی کا پس منظر سمجھ لیجیے۔ کچھ مہینے پہلے مرزا عبدالودود کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ 'گٹھلیوں کے دام' شائع ہوا تھا۔ مرزا اپنی کتاب میرے پاس لائے تھے کہ میں اس پر تبصرہ لکھوں۔ بہر حال، وہ تبصرہ دتّی کے رسالے 'گھامڑ' میں شائع ہو گیا۔ نسیم صاحب نے وہ تبصرہ پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ 'گٹھلیوں کے دام' مزاحیہ ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے، چنانچہ بیس روپے میں انہوں نے یہ کتاب خرید لی۔ جب کتاب پڑھی تو احساس ہوا کہ وہ تو ٹھگ لیے گئے ہیں، بلکہ ان کا کہنا ہے کہ کتاب پڑھ کر انہیں یوں لگا جیسے کسی نے ان کی جیب کاٹ لی ہو، جس میں بیس روپے تھے۔ اور چوں کہ انہوں نے یہ کتاب میرا تبصرہ پڑھنے کی بنا پر خریدی تھی، اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ میں اس جیب کترے کا رشتہ دار ہوں۔

نسیم صاحب! آپ کے خط کو پڑھنے سے مجھے یقین ہو گیا کہ آپ کو کتاب پڑھنے کی تمیز تو

شاید ہو، ہاں تبصرہ پڑھنے کی ہرگز نہیں ہے۔ میں نے یہ ہرگز نہیں لکھا تھا کہ یہ کتاب مزاحیہ ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ میں جانتا ہوں میں نے یہ بھی نہیں لکھا کہ مرزا عبدالودود کی کتاب بالکل واہیات ہے، کیوں کہ اگر میں اس طرح لکھتا تو مرزا اُسی طرح میرے خون کے پیاسے ہوتے، جس طرح آپ ہیں۔ اور ماشاءاللہ ان کی صحت آپ کی صحت سے کسی لحاظ میں کم نہیں۔

آیئے! میں آپ کو تبصرہ پڑھنا سکھاؤں:

میں نے لکھا تھا کہ "مرزا عبدالودود نے بہت ہی قلیل مدت میں مزاح نگاروں کی صف میں اپنی جگہ بنالی ہے۔" آپ نے سمجھا میں یہ کہہ رہا ہوں کہ مرزا جب مزاح کے میدان میں داخل ہوئے تھے تو وہاں پہلے سے موجود مزاح نگاروں نے اپنی اپنی نشست چھوڑ کر اُن کی خدمت میں گزارش کی کہ حضور یہ کرسیاں دراصل آپ ہی کے لائق ہیں، تشریف رکھیے۔ نسیم صاحب! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں نے تو تبصرہ کی زبان میں یہ کہنے کی کوشش کی تھی کہ مرزا نے مزاح نگاروں کی صف میں بالکل ایسے جگہ بنائی ہے، جیسے ریل کے ایک بہت ہی بھرے ہوئے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں ایک نیا مسافر اپنی جگہ بناتا ہے، یعنی دروازہ بند پا کر پہلے انہوں نے کھڑکی سے بستر اور صندوق پھینکا، پھر اُسی رستے خود کود پڑے۔ بستر کسی کے سر پر پڑا، صندوق نے کسی اور کو زخمی کیا، ایک دو مسافر ان کے بوجھ کے نیچے دب گئے۔ ایسا بھونچال آنے پر لوگ خود ہی اِدھر اُدھر سرک گئے اور اِس طرح مرزا نے اپنی جگہ بنالی۔

میں نے لکھا تھا کہ "مرزا نے ابھی ابھی اس دشت میں قدم رکھا ہے۔ اس دشت کی سیاحی کے لیے تو عمر پڑی ہے۔" آپ سمجھے میں کہہ رہا ہوں کہ ان کا قدم پڑتے ہی اس دشت میں پھول اُگ آئے ہیں۔ جب وہ پوری عمر اِس دشت میں قدم رکھے رہیں گے تو یہ دشت 'نشاط باغ' بن جائے گا۔ حضور! میرا یہ مطلب بالکل نہ تھا۔ میں تو مرزا کو بڑے پیار سے مشورہ دے رہا تھا کہ بھلا اس دشت کی سیاحی کے لیے عمر پڑی ہے، ابھی سے اس میں کیوں کود رہے ہو، بیس پچیس سال اور صبر کرو۔ جب کوئی اُردو پڑھنے والا نہیں رہے گا تو بڑے شوق سے اس دشت کی سیاحی پر اُترنا، تا کہ کوئی آپ کی اس بے راہ روی پر اعتراض ہی نہ کر سکے۔

میں نے لکھا ہے کہ "مرزا کا لکھنے کا انداز ریسی ہے۔" آپ نے سمجھ لیا کہ ان کے اندازِ بیان میں وہی روانی ہے جو ریس کے گھوڑوں میں ہوتی ہے، یعنی ایک خوب صورتی، ایک ادائے بے نیازی

کے ساتھ تیزی سے منزل تک پہنچنے کی آرزو۔ نہیں صاحب! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ ریس سے میرا مطلب گھوڑ دوڑی سے ضرور تھا، لیکن ان گھوڑوں کی دوڑ سے نہیں جو بمبئی کے مہالکشمی میدان میں دوڑتے ہیں، بلکہ ان گھوڑوں سے تھا جو تانگوں کے آگے جتتے ہیں اور جو سڑکوں پر پیدل اور سائیکل سوار لوگوں کو روندتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اور اگر اڑ جائیں تو ایسے اڑتے ہیں کہ کوچوان کا چابک بھی انہیں اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔

میں نے لکھا تھا کہ ”کتاب کے تمام جملے مصنف کی محنت کے آئینہ دار ہیں۔“ آپ سمجھے میرا مطلب یہ ہے کہ مصنف نے ایک ایک جملے پر وہ محنت کی ہے، جو ایک ذہین لڑکا اپنے امتحان کی تیاری میں کرتا ہے، تاکہ وہ کلاس میں اوّل آسکے۔ نہیں صاحب! میرا یہ مطلب بالکل نہیں تھا۔ میرا اشارہ اُس محنت کی طرف تھا جو ایک دھوبی ایک گندے کھیس میں سے میل نکالنے کی کوشش میں کرتا ہے، یعنی پتھر پر مار مار کر۔ اتنے زور سے مارنے کے باوجود کھیس پھٹ جاتا ہے، پر میل نہیں نکلتا۔

میں نے لکھا تھا کہ ”مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔“ آپ نے سمجھا کہ یہ کتاب یوں بکے گی، جیسے متھرا کے پیڑے یا ناگپور کے سنگترے یا بمبئی کی بھیل پوری۔ نسیم صاحب! میری یہ مراد ہرگز نہ تھی۔ پہلی بات تو یہ آپ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اُردو کی کوئی کتاب اِن معنوں میں ہاتھوں ہاتھ نہیں لی جاتی۔ یہ ہمیشہ ہاتھوں ہاتھ دی جاتی ہے، یعنی کتاب کو آپ خود شائع کرتے ہیں اور پھر اُسے آپ دوسرے ادیبوں کو ہاتھوں ہاتھ بانٹتے ہیں۔ وہ بھی کچھ اس طرح کہ اِس ہاتھ سے دے، اُس ہاتھ سے لے... یعنی وہ بھی آپ کو اپنی کتابیں اسی طرح پیش کریں۔

جہاں تک مرزا کی کتاب 'گٹھلیوں کے دام' کا تعلق ہے، میرا مقصد یہ بھی نہیں تھا۔ جب میں نے لکھا کہ 'یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی' تو میرا مطلب تھا کہ پبلشر سے یہ کتاب سیدھے ردّی والے لے جائیں گے۔ وہاں سے یہ لفافے بنانے والوں کے ہاتھ پہنچ جائے گی۔ پھر وہاں سے یہ حلوائیوں کے ہاں جائے گی اور وہاں سے یہ گاہکوں تک پہنچے گی۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ اتنی سی بات سمجھ کیوں نہیں پائے؟ خیر، بیس روپے خرچ کرنے کے بعد تو آپ سمجھ گئے ہوں گے!

آپ نے لکھا ہے کہ میں نے تبصرے میں مرزا کے مضامین میں سے کچھ ایسے فقرے نقل کیے ہیں جو بہت خوب صورت اور معنی خیز ہیں، اُن سے آپ کو دھوکہ ہوا کہ شاید ساری کتاب ہی خوب صورت ہوگی۔ ایسے کتنے فقرے میں نے نقل کیے تھے؟ کل چار۔ اور یہ میں ہی جانتا ہوں کہ

انہیں کتاب میں سے ڈھونڈنے میں مجھے کتنی ریاضت کرنا پڑی۔ تقریباً پوری رات میں کتاب کھنگالتا رہا، تب کہیں جا کر چند فقرے ہاتھ لگے... ویسے ایک گزارش کر دوں کہ دو سو صفحے کی کتاب میں دو چار جملے تو اچھے نکل ہی آتے ہیں۔ بھائی جان! وہ گھڑی جو کئی سال سے بند پڑی ہو وہ دن میں دو بار صحیح وقت بتا سکتی ہے۔

آپ کی شکایت ہے کہ میں نے اپنے تبصرے میں لکھا ہے کہ "میں تمام اُردو داں حضرات سے اِس کتاب کے مطالعے کی پُرزور سفارش کروں گا۔" جی میں نے ضرور لکھا ہے، لیکن آپ کو دیکھنا چاہیے تھا کہ سفارش کرنے والے کی اپنی حیثیت کیا ہے۔ میں تو دن میں سینکڑوں لوگوں کو سفارشی خط دیتا رہتا ہوں۔ کبھی وزیرِ نشر و اشاعت کے نام، کبھی وزیرِ تعلیم کے نام، کبھی شہر کے ... کے نام کہ اِس کو ریڈیو کا اسٹیشن ڈائریکٹر بنا دو، اُس کو کالج کا پرنسپل بنا دو، اِس محلے میں پانی کا نل لگوا دو، لیکن آج تک میرے سفارشی خط والے لوگوں کو کسی نے سرکاری دفتر کے قریب نہیں گھسنے دیا۔ میری سفارش پر لگے ہوئے نل سے کسی نے پانی نہیں پیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے میری سفارش کیوں مان لی۔

تبصرہ کو جلدی ختم کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ "میں مصنف اور قاری کے درمیان اب کھڑا نہیں رہنا چاہتا۔" نسیم صاحب! آپ اس کا مفہوم یہ سمجھے کہ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ قاری جلد سے جلد اِس کا مطالعہ شروع کر دے اور اِس سے لطف اندوز ہو۔ نہیں جناب! میرا مطلب یہ ہرگز نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ جو قاری بھی اِس کتاب کو پڑھے گا، مصنف کی گردن پر ہاتھ ڈالنا چاہے گا۔ قاری کے پاس کتاب پہنچتے ہی مار پیٹ ہوگی، اس لیے میں جلد اَز جلد راستے سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مصنف اور قاری کے مابین اس مار پیٹ میں میری پگڑی اُتر جائے۔

اب صرف اتنی سی بات رہ گئی ہے کہ تبصرے اس طرح کیوں لکھے جاتے ہیں کہ آپ جیسے سادہ لوح قاری ان کا مطلب ہی نہ سمجھ سکے۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ تبصرے کا یہ بنیادی اصول ہے اور یہ اُصول میں نے نہیں بنایا۔ ایک عرض اور کر دوں کہ جب مرزا صاحب اپنی کتاب میرے پاس تبصرے کے لیے لائے تھے تو ساتھ ہی برفی کا ایک ڈبہ بھی لائے تھے۔ برفی بڑی اعلیٰ قسم کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اُس کی خوشبو اور خوش رنگی نے کتاب کے بارے میں میری رائے گڈمڈ کی ہو

آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ قیمتی جہیز کے ساتھ ایک معمولی لڑکی ایک اچھی دلہن بن جاتی ہے اور ساس سسر کے علاوہ دولہا میاں کو بھی خوب صورت لگنے لگتی ہے۔ تبصرہ نگاری میں اگر مجھ سے قدرے غلطی ہوئی ہے تو محض بر فی کی وجہ سے۔

اُمید ہے کہ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ 'تبصرہ' کس طرح پڑھا جاتا ہے۔ یقین مانیے، بیس روپے میں یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ پھر بھی اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو بندہ معافی کا خواست گار ہے۔

* * *

تصویری خبرنامہ

ڈاکٹر اقبال ہاشانی

یہ پہلی تصویر ہے، مشہور سماجی کارکن عبدالستار دھاکہ کے ہونہار صاحبزادے عبدالقادر پٹاخہ کے ولیمے کی۔ عموماً ولیمے کی تصویر کچھ اس انداز سے شائع ہوتی ہے کہ دس بارہ مشہور افراد پیٹ پر ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہیں کہ پتا نہیں چلتا کہ نماز پڑھ رہے ہیں یا کھانے کے بعد پیٹ کو سہلا رہے ہیں۔ مگر اس تصویر کا فوٹو گرافر یا تو نیا ہے، یا پھر اُس نے عام روش سے ہٹ کر تصویر اُتاری ہے۔ اس نے عین اس وقت تصویر کھینچی ہے، جب اچانک کھانا کھلتا ہے۔ میدانِ حشر کا سا منظر ہوتا ہے کہ اس وقت باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو نہیں پہچانتا۔ ہر کوئی پلیٹ ہاتھ میں لیے مالِ غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہوتا ہے۔ بڑے بڑے معزز اور نامی گرامی لوگ کچھ اس طرح سے لوٹ مار کرتے نظر آتے ہیں کہ مزاروں پر منعقد ہونے والے لنگرِ عام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ فوٹو گرافر کو ابھی شاید بھوک نہیں لگ رہی تھی، ورنہ وہ بھی اس افراتفری میں شامل ہوتا۔ تصویر دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ بہت سارے بھوکے ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ ایک دو پہلوان قسم کے بندے اس قدر بے تاب ہیں کہ لوگوں کے کاندھوں پر ہی جا چڑھے ہیں۔ ایک بزرگوار لوگوں کی ٹانگوں سے نمودار ہو رہے ہیں۔ ہاتھ میں کھانے سے بھری پلیٹ ہے اور چہرے پر فاتحانہ چمک۔ پلیٹ میں اتنا کھانا بھرا ہے کہ موصوف چار دن تک بآسانی کھا سکتے ہیں۔ اس تصویر میں کوئی انہونی بات یوں نہیں ہے کہ اس قسم کے ہوش رُبا مناظر ہم سب، اکثر تقریبات میں دیکھتے آئے ہیں، بلکہ اس میں شامل ہوتے ہیں۔

تو آیئے پھر دوسری تصویر دیکھتے ہیں۔ یہ تصویر ایک رسم افتتاح کی ہے۔ علاقے کے ناظم صاحب نے جہدِ مسلسل کے بعد علاقہ میں ایک نئی کچرا کنڈی قائم کروائی ہے۔ یہ اسی کے افتتاح کی تصویر ہے۔ ظاہر ہے، جب ساری محنت ناظم صاحب نے فرمائی ہے اور اس کچرا کنڈی کا وجود بھی محض ان کی ذاتِ گرامی کی وجہ سے ظہور میں آیا ہے، تو لازمی ہے کہ افتتاح بھی ان کے

دستِ مبارک سے ہو، لہٰذا اس تصویر میں ناظم صاحب افتتاح کرتے نظر آ رہے ہیں۔ آگے ایک فیتہ بندھا ہوا ہے اور ناظم صاحب کے ہاتھوں میں ایک قینچی ہے، جو 'بوبی ہیئر کٹنگ سیلون' کے مالک ارشد بوبی حجام سے عاریتاً لی گئی ہے۔ یہ وہی قینچی ہے، جس کی زد میں آ کر کروڑوں بال کٹ چکے ہیں اور اربوں اپنی باری کے منتظر ہیں۔ آج اس کرموں جلی کا نصیب جاگا ہے کہ ناظم صاحب کے ہاتھوں فیتہ کاٹے گی۔

ناظم صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ ہے۔ بھئی مسکرائیں گے ناں، آخر اُن کے دور میں اس عظیم الشان کچرا کنڈی کا افتتاح جو ہو رہا ہے۔ ان کے برابر ایک صاحب خالی پلیٹ ہاتھ میں لیے کھڑے ہیں۔ پلیٹ خالی اس لیے ہے کہ اس میں رکھی قینچی اب ناظم صاحب کے دستِ مبارک میں ہے۔ اِردگرد کچھ اور لوگ بھی کھڑے ہیں، جو اِس تاریخی واقعے کی تصویر بنوانا چاہتے ہیں، تا کہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔ ایک صاحب نے منہ پر رومال رکھا ہوا ہے۔ یہ ذرا احتیاط پسند معلوم ہوتے ہیں کہ کچرا کنڈی شروع ہونے سے پہلے ہی ناک ڈھک لی ہے۔ ممکن ہے کہ انھوں نے ناظم صاحب کے پسینے کی ناگوار بو سے بچنے کے لیے ایسا کیا ہو، خیر نیتوں کا حال تو خدا ہی جانتا ہے۔ ایک دوسرے صاحب کی شکل سے صاف پتا چل رہا ہے کہ وہ پریشان ہیں اور اِس شاندار کارکردگی پر قطعی خوش نہیں۔ کچھ غم اور غصّے کی سی بھی کیفیت نظر آ رہی ہے۔ شاید اِن صاحب کا گھر اِس کچرا کنڈی کے بالکل برابر میں ہے۔ یہ آنے والے وقت کا سوچ کر ہلکان ہوئے جا رہے ہیں کہ اب گھر میں ہر وقت کچرا کنڈی سے اُٹھتے بدبو کے بھبکے چکراتے رہیں گے۔ تیسرے صاحب کچھ بے چین سے نظر آ رہے ہیں۔ شاید اِن کو انتظار ہے کہ کب ناظم صاحب اپنا کام سرانجام دیں اور یہ ہاتھوں میں تھاما ہوا کچرے سے بھرا شاپنگ بیگ کچرا کنڈی میں ڈال کر اُس کا عملی افتتاح کریں۔ عقب میں ایک اور شخص ہاتھ میں جھاڑو اُٹھائے کھڑا ہے۔ یہ یقیناً اس علاقے کا جمعدار ہے۔ یہ تمام علاقے کا کچرا ٹرالی میں بھر کر لائے گا اور اِس کچرا کنڈی میں پھینک دے گا۔ کوڑے کرکٹ اور غلاظت کا ڈھیر جمع ہوتا رہے گا۔ ہفتہ بھر میں جب یہ ایک چھوٹی موٹی پہاڑی کی شکل اختیار کر لے گا، تب کارپوریشن کی گاڑی آ کر اِس پہاڑی کو ہٹائے گی۔ کسی ہفتہ ناغہ ہوا تو یہ پہاڑی بلند ہو جائے گی۔ محلے کے بچے اس پر کوہِ پیمائی کی مشق کریں گے۔

اگلی تصویر ایک دہشت گردی کی ہے، جسے ہماری قابلِ فخر پولیس نے حالیہ کارروائی میں گرفتار

کیا ہے۔ دو سپاہی مجرم کے اِردگرد سینہ تان کر یوں کھڑے ہیں کہ لگتا ہے کہ وہ خود دہشت گرد ہوں۔ اکثر شکاری اپنے شکار کیے ہوئے شیر کے اوپر ایک پاؤں رکھ کر تصویر بنواتے ہیں۔ سپاہیوں کے چہروں سے صاف پتا چل رہا ہے کہ کچھ اسی قسم کی خواہش ان کے دلوں میں بھی انگڑائی لے رہی ہے، مگر مجبور ہیں کہ ایسا نہیں کر سکتے۔ شاید انہیں یہ بھی ڈر ہو کہ اگر یہ دہشت گرد پولیس کی حراست سے فرار ہو گیا، جس کے قوی امکانات بھی ہیں تو پھر کسی دن یہ دہشت گرد انہیں نیچے لٹا کر کچھ اسی قسم کی تصویر بنوا سکتا ہے۔

مبینہ دہشت گرد کے جذبات و احساسات کیا ہیں۔ اس کا بالکل پتا نہیں چل رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پولیس والوں نے اُس کے سر پر کپڑا ڈال رکھا ہے۔ یہ کپڑا کیوں ڈالا گیا ہے اور مجرم کی رُونمائی کیوں پسند نہیں کی گئی، اس کی بھی چند وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ممکن ہے مجرم باحیا اور شرمیلا ہو۔ اپنا چہرہ حجاب میں ہی رکھنا چاہتا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ پولیس کا اپنا ہی کوئی بندہ ہو اور صرف اپنی کارکردگی جتانے کے لیے پولیس نے یہ تصویر بنوائی ہو۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ پولیس نہ چاہتی ہو کہ دہشت گرد کے چاند سے مکھڑے کو نظر لگ جائے۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہماری پولیس کو مجرم کی عزتِ نفس کی فکر ہو کہ وہ مجروح نہ ہو جائے۔ شریف آدمیوں کی چوں کہ عزتِ نفس نہیں ہوتی، اس لیے ان کی گرفتاری پر، تصویر کھنچواتے ہوئے ایسی کوئی پیش بندی نہیں کی جاتی!

اب آتے ہیں ایک اور تصویر کی طرف۔ جی یہ سیٹھ شکور بھائی باٹلی والا کی تصویر ہے۔ سیٹھ صاحب اپنے ایک عزیز کے ساتھ کھڑے ہیں، جو حال ہی میں امریکا سے آئے ہیں۔ سیٹھ صاحب نے ان کے اعزاز میں ڈنر دیا ہے۔ اس گروپ فوٹو میں ہمارے دوست غنی بھائی پان والا بھی پان چباتے اور پیک بہاتے نظر آ رہے ہیں۔ سیٹھ صاحب کے عزیز، عرصۂ دراز کے بعد امریکا سے تشریف لائے۔ یہ خوشی کی بات ہے، انہیں ڈنر دیا گیا۔ اس موقع پر گروپ فوٹو بنوایا گیا، یہ اس سے بھی زیادہ خوشی کی بات ہے، مگر اخبار میں یہ تصویر لگوانے سے کیا حاصل؟ بھئی ڈالر وہ صاحب کما رہے ہیں، امریکا میں مزے وہ کر رہے ہیں۔ ممکن ہے سیٹھ صاحب کو بھی ڈالر بھجواتے رہ ہو [illegible] دیے ہوں، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قارئین اور عوام بے چارے کیا کریں؟ اس خوشی میں بغلیں کیوں بجائیں؟

یہ سلسلہ آگے بھی چلے گا۔ اگلی بار غنی بھائی پان والا اپنے پوتے کے ختنے کی خوشی میں دعوت کا اہتمام کریں گے۔ ایک بار پھر تصویر بنوائی جائے گی اور اخباروں کی زینت بنے گی۔ آخر اخبار کے فوٹو گرافر کا بھی پیٹ ہے، اسے پیسہ ملے گا تو وہ یہ تصویر ضرور شائع کروائے گا!

لیجیے صاحب، ایک اور تصاویر ملاحظہ فرمائیے۔ یہ 'یوسی فلاں' کے نائب ناظم صاحب ہیں۔ ازراہِ محبت ایک ننھے نونہال کو پولیو کے قطرے پلا رہے ہیں۔ بچہ اپنی والدہ کی گود میں ہے۔ والدہ محترمہ اپنے بچے کو کم اور نائب ناظم کو زیادہ دیکھ رہی ہیں۔ نظروں میں کچھ پیار بھی جھلک رہا ہے۔ یہ نائب ناظم کی کوئی رشتہ دار ہیں؟ اگر نہیں تو پھر اِن میں کیا رشتہ ہے؟ یہ تحقیق طلب امر ہے۔ ساتھ میں ڈاکٹر اجے کمار بھی کھڑے ہیں۔ نائب ناظم کو قطرے پلاتے ہوئے کڑی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ نائب ناظم جوشِ محبت میں آ کر بچے کو دو کی بجائے بیس قطرے نہ پلا ڈالیں۔ تصویر میں کچھ اور لوگ بھی کھڑے ہیں، کیوں کھڑے ہیں، ان کا کام کیا ہے؟ لگتا ہے، صرف تصویر بنوانے کا شوق ہے۔ اخبار میں تصویر لگے، یہ کسے اچھا نہیں لگتا؟

اگلی تصویر پریس کلب کے باہر مظاہرہ کرنے والوں کی ہے۔ یہ کسی ناکارہ ادارے سے نکالے گئے، ناکارہ لوگوں کی ہے۔ ان سب لوگوں نے بینر اُٹھا رکھے ہیں، جن پر مظلوم کی فریاد بھی ہے اور ظالم کے ظلم کی شکایت بھی۔ کچھ لوگوں نے اپنی قمیص اُتار رکھی ہیں، گلے میں روٹیاں لٹکا رکھی ہیں، جنہیں مظاہرے کے بعد نہاری اور پایوں کے ساتھ کھایا جائے گا۔ ان میں سے ایک صاحب تو کچھ زیادہ ہی جذباتی لگ رہے ہیں۔ اچھا ہوا فوٹو گرافر نے عجلت سے کام لیا۔ قرائن سے تو یہی لگ رہا ہے کہ موصوف قمیص کے بعد کچھ اور بھی اُتارنے کے موڈ میں ہیں۔ ارے نہیں! آپ غلط سمجھے۔ میری مراد بنیان سے ہے۔

یہ ایک اور تصویر ہے، ''ہیپی برتھ ڈے انگلش گرامر اسکول'' کی سالانہ تقریبِ اسناد کی۔ ڈائس پر کچھ لوگ پھولوں کے گجرے پہنے، فضا مہکا رہے ہی۔ اسکول کے طلبا یا طالبات کہیں نظر نہیں آ رہیں۔ بھلا تصویر میں ان کا کیا کام...؟

اسکول کی پرنسپل خوش گلو صاحبہ، مہمانِ خصوصی محکمۂ تعلیم کے ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب کو شیلڈ پیش کر رہی ہیں۔ پرنسپل صاحبہ بھی مسکرا رہی ہیں اور ڈپٹی صاحب کی بھی باچھیں کھلی پڑی ہیں۔ بھئی مفت میں شیلڈ جو مل رہی ہے! طلبا و طالبات جو تصویر میں نظر نہیں آ رہے، یقیناً سوچ رہے ہوں

گے کہ امتحانات میں محنت ہم نے کی، اچھے نمبروں سے پاس ہم ہوئے اور شیلڈ دی جا رہی ہے ڈپٹی صاحب کو۔ بڑوں کی باتیں بڑی ہی ہوتی ہیں۔ ان نونہالوں کو کیا پتا کہ پرنسپل صاحب ان کے مستقبل اور اسکول کی نیک نامی کے لیے یہ سب کر رہی ہیں۔ ڈپٹی صاحب خوش ہو کر جائیں گے تو اِس بار میٹرک کے نتائج اسکولِ ہٰذا کے اچھے آئیں گے۔ ممکن ہے شیلڈ صرف شو پیس ہو اور لفافہ کام کی ادائیگی پر پیش کیا جائے! مگر بچوں کو بھلا اِن باتوں سے کیا سروکار۔ وہ تو بالکل سطحی ذ رکھتے ہیں، سطحی سوچ رکھتے ہیں۔

ویسے ہم بڑے بھی کیا کم ہیں۔ اگر بڑے کے ہاتھ سے کانچ کا گلاس گرے اور ٹوٹ جائے تو ہم کہتے ہیں کہ جی گلاس ٹوٹ گیا اور اگر یہی حادثہ کسی بچے کے ہاتھوں سرزد ہو، تو ہم کہتے ہیں ا اس نے گلاس توڑ دیا۔ تمام بڑے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بڑے ملک بھی چھوٹے ملکوں کے بار میں یہی رویّہ رکھتے ہیں۔ خود بھلے سے ایٹم بم گرا کر انسانوں کو ہلاک کر دیں، چھوٹا ملک اگر ایٹ قوت، وہ بھی پُر امن مقاصد کے لیے، حاصل کرنا چاہے تو واویلا مچانا شروع کر دیتے ہیں!

اب یہ آخری تصویر مولانا بانکے بہاری صاحب کی ہے۔ ماشاء اللہ کیا پُر نور چہرہ ہے۔ گ میں پھولوں کے اتنے سارے ہار پڑے ہیں کہ سب کچھ چُھپ گیا ہے۔ الحاج صاحب، چونکہ ا حج کر کے تشریف لائے ہیں اور اَب آئندہ الیکشن میں کھڑے ہونا چاہتے ہیں، اس لیے ابھی سے عوام میں مشہور ہونے کے لیے مختلف حیلوں بہانوں سے اپنی تصویریں اخباروں میں شائع کر رہے ہیں۔ پچھلی بار بیواؤں کو سلائی مشینوں کی تقسیم کے موقع پر تصویر شائع ہوئی تھی۔ اس تقریب میں ایک ہی بیوہ آئی تھی اور ایک ہی سلائی مشین تھی۔ مقصد تصویر کھنچوانا تھا۔ خیر، مقصد تو اچھا تھا الحاج صاحب نے ایک عدد بیوہ کی تو مدد کی۔ یہ الگ بات کہ بعد میں معلوم ہوا، وہ بیوہ خود الحاج صاحب کی زوجہ محترمہ تھیں۔

میرا خیال ہے کہ اتنی تصویریں کافی ہیں۔ اگر قارئین کا دل نہ بھرا تو آئندہ رنگین تصویروں خبرنامے کے ساتھ حاضر ہو سکتا ہوں۔ صرف حکم فرمائیے۔

* * *

حق مغفرت کرے!

ڈاکٹر انور سدید

حق مغفرت کرے، مرحوم سے ملاقات، ایک تصویر کے ذریعے ہوئی۔ گلفشاں چہرہ، بولتی ہوئی روشن آنکھیں، گھنگھریالے بال، ٹوپی اور چھڑی یوں تھامے ہوئے تھے کہ ٹوپی، کتاب اور چھڑی، فاؤنٹین پین لگتی تھی۔ خیال تھا کہ پڑھے لکھے آدمی ہوں گے اور شام کی ملاقاتوں میں خوب گاڑھی چھنے گی، لیکن ایک مجلس میں ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ علومِ متداولہ کی تحصیل ان کی نظر میں ہمیشہ ہیچ رہی ہے۔ اس لیے اسکول کی دو چار جماعتیں پڑھ کر گلو خلاصی حاصل کر لی، البتہ زندگی کے کالج سے جو تعلیم حاصل کی، وہ ایم اے، پی ایچ ڈی وغیرہ سے کم نہ ہوگی۔ انسانی نفسیات ان کا محبوب موضوع تھا اور دوستوں کی دُکھتی رگ کو پہچانتے تھے۔ مرحوم کی امتیازی خوبی یہ تھی کہ ہمیشہ دوست کی کمزوری اور اپنے فائدے پر نظر رکھتے۔ جب تک اپنے مفاد کا جوہر کشید ہوتا رہتا، اس کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے اور دوستی کا دَم بھرتے۔ جوں ہی بھرم کھل جاتا، یہ بھی منہ موڑ لیتے اور اپنے بالا خانے پر مسند جما کر دوستوں کا مردہ خراب کرتے۔

شہرت کی ہوس عمر کے وسطی دور میں پیدا ہوئی تو شاعر بننے کی سوجھی۔ فوراً مقامی شعراء کا دربار سجایا اور خود اُس کے راجہ اِندر بن بیٹھے۔ علیم انصاری اور چھپھڑ اگر دابادی اس دربار کی سرخ و سبز پریاں تھیں۔ یہیں سے مرحوم کو پہلے شعر کہنے کا اور پھر چھپوانے کا شوق پیدا ہوا۔ عروض کا فن عبدالقدیر وصفؔ سے اور اصلاحِ سخن کا فن کلیجہ حافظ آبادی سے سیکھا۔ پھر بھی کلام سے بے رنگی دُور نہ ہوئی اور رسائل میں چھپنے کی نوبت نہ آ سکی۔ بالآخر اپنا رسالہ جاری کر لیا، جس میں اپنی غزل اور نام یکساں خط کے جلی قلم سے شائع کرتے اور ہر رسالے کے سرورق پر اپنے بچپن کی تصویریں چھاپتے۔ حجرہ شاہ مقیم، کالا شاہ کاکو اور پنڈی بھٹیاں کے تمام بڑے بڑے شاعروں نے، جن کا کلام ان کے رسالے میں بالالتزام شائع ہوتا تھا، انہیں ملک الشعراء تسلیم کیا اور خطوط میں انہیں

شاعری کی آبرو کہنے پر اصرار کیا۔ یہ تمام خطوط ان کے رسالے کے بہرۂ مراسلات میں شائع ہو چکے ہیں، تاکہ ادب میں ان کا مقام متعین کرنے میں نقاد کو سہولت ہو۔ مرحوم کے بعض حاسدوں کا خیال ہے کہ یہ خطوط ان کے اپنے قلم سے لکھے گئے تھے اور رسالے میں فرضی ناموں سے شائع ہوئے۔ یہ بات اگر سچ بھی ہو تو مرحوم کے ادبی مرتبے پر کوئی حرف نہیں آتا۔

مرحوم موضوع کی تلاش میں شہر کے تمام کونے کھدروں کا سفر سائیکل پر کر کے جہاں کہیں حسن کی جھلک دیکھتے فوراً اٹین شن ہو کر فکرِ سخن میں غرق ہو جاتے۔ فطرت کے نگار میں چہروں سے اکتسابِ حسن ان کا مشغلۂ لطیف تھا اور یہ ان کے تخلیقی جذبے کے لیے ہمیشہ مہمیز کا کام دیتا۔ مرحوم اپنے آپ کو اُن دیوداسیوں کا پجاری سمجھتے تھے، جن کے چرن دیوتا چومتے ہیں۔ سائیکل بڑی تیزی سے چلاتے تھے۔ کبھی کبھی ودیا کی متلاشی کوئی دیوداسی شانتی کو تج کر جوتا سنبھال لیتی تو سائیکل کی رفتار اور تیز ہو جاتی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کی سائیکل کا رُخ اُس وقت ہمیشہ گھر کی طرف ہوتا تھا اور اِس عالم میں وہ کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھتے۔

مرحوم تخلیقِ شعر کے لیے داخلی جذبے کو کم اور خارجی عوامل کو زیادہ پیشِ نظر رکھتے تھے۔ بیڑی، چرس اور شراب کی طلائی تثلیث ان کے معمولاتِ عامہ میں شامل تھی۔ کبھی کبھی مشاعرہ پڑھنا ہوتا تو ٹنکچر زنجی بیرس سے شغلِ ناؤنوش کرتے۔ مرحوم پرولتاری ذہن رکھتے تھے، اس لیے تمام عمر اچھی شراب سے نفرت رہی۔ ہاں، کبھی شیخ محمد حسین فیصل کے بالا خانے سے ایک آدھ جرعہ مل جاتا تو بر بنائے انکسار انکار نہ کرتے، بلکہ شیخ صاحب سے کہہ کر بڑے گوشت کے کباب بھی منگواتے۔ ان کے ایک ہم عصر نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ جب بیڑی پیتے ہیں تو فلسفی لگتے ہیں۔

اس قول کو نبھانے کے لیے ساری عمر دھوئیں کے مرغولے ہوا میں چھوڑ کر خلاؤں میں جھانکتے رہے۔

مرحوم غچہ دینے کے فن میں ماہر تھے۔ رسالہ چھاپتے تو ادیبوں کو شہرت کا غچہ دے کر بلا معاوضہ مضامین حاصل کر لیتے۔ پرانے رسائل کے مضامین پر قینچی چلا کر ایڈیٹروں کو غچہ دے لیتے۔ مشاعرہ منعقد کرتے تو شاعروں کو حقِ شعر گوئی ادا نہ کرتے اور دسویں مرتبہ مفت پڑھوا لیتے۔ عوام میں ٹکٹ خدمتِ ادب کے نام پر بیچتے اور کوشش کرتے کہ وہ شعراء، جن کا نام اشتہار میں چھاپا گیا؟ مشاعرے میں شریک نہ ہوں۔ سرکاری اطلاع کے لیے نفع اور نقصان کا گوشوارہ یوں تیار کرتے کہ

نقصان کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہتا اور وہ انجمنیں، جن کی امداد کے لیے یہ مشاعرے منعقد ہوتے تھے ہمیشہ عوام کی عدمِ توجہ کی شکوہ زار رہتیں۔ مقامی شعراء کی یہ شکایت درست نہیں کہ ان سے فیس وصول کرنے کے باوجود مرحوم انہیں مشاعرے میں غزل پڑھنے کا موقع نہ دیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شاعر انہیں پوری فیس پیشگی ادا نہ کرتے تھے، اس لیے انہیں غچہ دینا مرحوم کا حق تھا، جسے وہ تمام عمر پورے خلوص سے استعمال کرتے رہے۔

بحیثیت مدیر مرحوم کو فخر تھا کہ وہ کبھی مسودوں کے ذمہ دار نہیں ثابت ہوئے۔ چنانچہ اکثر حامد کی پگڑی محمود کے سر پر رکھ دیتے۔ اس طرح انہوں نے ہاتھ کی صفائی سے کئی منفرد انشاء پردازوں کو اُبھرنے کا موقع دیا، جو سب کے سب اپنی دانست میں اس زمانے کے محمد حسین آزاد یا ابوالکلام تھے۔ یہ انشاء پرداز اکثر مرحوم کے مشاعروں کی رُودادیں مفت لکھا کرتے تھے۔

مرحوم ضمیر کی خلش کو انسانی ترقی کے راستے میں بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ چنانچہ دفتر آنے سے پہلے اپنے بے داغ ضمیر کو ہمیشہ گھر کی کسی الماری میں مقفل کر دیتے اور تمام دن دفتر میں پورے سکون سے کام کرتے۔ کہا کرتے تھے کہ اس اقدام سے اپنے دوستوں کو دھوکا دینے میں عار محسوس نہیں ہوتی، جھوٹ بولتے ہوئے دل پر بوجھ نہیں پڑتا اور وعدہ خلافی کرتے ہوئے مجھے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اکثر محفلوں میں فرماتے کہ بیسویں صدی کے اس روشن دور میں ضمیر کو بیدار رکھنا، تاریک قرونِ اولیٰ کی تجدید کرنا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس گناہ کا کبھی ارتکاب نہیں کیا۔

خوشبوؤں میں سے مرحوم کو صرف روپے کی خوشبو پسند تھی اور اِس کے حصول کے لیے تمام عمر پاپڑ بیلتے رہے۔ اس کوشش میں کئی دوستوں، قرابت داروں اور رشتے داروں کو ناراض کر لیا۔ آخری عمر میں یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے اور زندگی کے آلام سے کنارہ کشی کی ٹھانی۔ پہلے سر پر استرا پھرایا، پھر چار ابرو کا صفایا کیا، بدن پر بھبوت ملا، الماری میں رکھے ہوئے ضمیر کو نکالا اور اپنے پیرِ طریقت سائیں جمال کی تصویر کو سینے سے لگا، جنگل میں نکل گئے۔ وہیں ایک دن برگد کے درخت کے نیچے رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

ان کے یارِ غار مولانا انجم واسطی نے سنا تو سر پیٹ لیا اور فوراً نو سو ننانوے کا سگریٹ پی کر نو سو اٹھانوے تاریخیں کہہ ڈالیں۔ لوحِ مزار کے لیے ان کے ایک ہم عصر نے یہ شعر تجویز کیا:

زمانے میں یوں تو ہزاروں ہیں رسوا، جہاں میں ہیں لاکھوں ہی برباد لیکن
اس انورؔ کی بھی زندگانی تو دیکھو، اسے بھی ذرا زندگانی کہو تو

لوگ کہتے ہیں کہ مرنے سے پہلے وہ ٹکٹکی باندھے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید کپل وستو کے شہزادے گوتم کی طرح انہیں بھی گیان حاصل ہو گیا تھا:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

* * *

ریلوے اور اونٹ

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

دیر آید درست آید کا مقولہ ضرور کسی سرکاری محکمے کے افسر کی تخلیق ہوگا اور محکمہ بھی کون سا؟ ریلوے! جس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ ریلوے سے تو اونٹ بہتر ہے۔ کل تو خیر اس کی بھی ایک آدھ ہی بمشکل سیدھی ہوگی، لیکن اس پر سوار ہونے میں حیرانی، پریشانی اور پشیمانی ریلوے کے سفر سے کم ہی ہوتی ہے۔ ریل کے سفر میں حیرانی یہ ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ تکلیف اور کہاں ہو سکتی ہے، پریشانی یہ کہ اس جانکاہ سفر سے جان کب اور کیوں کر چھوٹے گی اور پشیمانی اس بات کی کہ ریل میں سفر کیا ہی کیوں تھا۔ پھر اونٹ کے سفر میں ہری جھنڈی بھی نہیں ہلانا پڑتی۔ بس خود ہلتے رہیے۔ اونٹ بغیر کھائے پیے کئی روز تک سفر کر سکتا ہے۔ ریلوے والے بغیر کھائے پیے کوئی کام نہیں کرتے۔

بات ہو رہی تھی مقولے 'دیر آید درست آید' کی۔ ریلوے والوں نے اس مقولے کو غالباً اپنا ماٹو بنا رکھا ہے۔ مقولے تو اور بھی ہیں مثلاً، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، شکر ہے کہ ریلوے والوں نے اسے اپنا ماٹو نہیں بنایا ورنہ انتظار گاہ کی دیوار پر یہ الفاظ بخوبی کندہ کروائے جا سکتے ہیں یا ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر 'یہ منہ اور مسور کی دال' لکھوایا جا سکتا ہے۔

کہتے ہیں کہ اونٹ صحرا کا جہاز ہے۔ ہوگا، لیکن رفتار میں ریل کو نہیں پہنچ سکتا۔ مثلاً اگر ایک اونٹ اور ایک ٹرین کراچی سے بیک وقت لاہور روانہ کیے جائیں تو لاہور پہنچنے میں اونٹ پانچ دن لے گا، لیکن ٹرین اس سے بہت پہلے لاہور پہنچ جائے گی یعنی صرف دو دن میں اور یہ جو اونٹ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بغیر کھائے پیے کئی روز تک سفر کر سکتا ہے تو اُسے اس تحسین پر مغرور نہ ہونا چاہیے، کیوں کہ اُس سے کہیں زیادہ وہ لاغر و ضعیف اور قد میں کوتاہ حیوان مثلاً ٹرین کے مسافر، کئی کئی روز تک کھائے پیے اور سوئے بغیر سفر کرتے ہیں۔ ممکن ہے اونٹوں کا نقطہ نظر اس ضمن میں کچھ اور ہو۔ ہم اُن کی رائے کا احترام کرتے ہوئے اُن سے گزارش کریں گے کہ وہ پہلے اس مضمون کا مطالعہ کرلیں۔

ریلوے مسافروں کے کھائے پیے بغیر سفر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ریلوے کا کھانا اس قابل نہیں ہوتا کہ اُسے حلق سے نیچے اُتارنے کی جرأت کی جائے۔ اگر شوقِ فضول اور جرأتِ رندانہ سے کام لے کر چند نوالے معدے میں پہنچا دیے جائیں تو ریل کا سفر سفرِ آخرت میں تبدیل ہونے کے خاصے امکانات ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہم نے تیز رو کا لنچ کھایا اور پھر ایک ہفتہ دردِ شکم میں مبتلا رہ کر ریلوے والوں کی جان و مال کو دعائیں دیتے رہے۔

اس لنچ میں جو کچھ پیش کیا گیا، اُس کا احوال بھی سن لیجیے۔ سالن کے نام پر لال بھبوکا پانی رکابی میں پڑا تھا، جس میں تجریدی آرٹ کے چند نمونے مارے شرم کے منہ چھپانے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن شوربہ نما پانی یا پانی نما شوربہ اتنی کم مقدار میں تھا کہ مرحوم گائے کی واحد بوٹی اس میں ڈوب کر مرنے سے قاصر تھی:

ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

تحقیق کرنے پر دریافت ہوا کہ یہ بوٹی ربڑ کی بنی ہوئی تھی۔ اُسے دانتوں میں دبا کر توڑنے کی کوشش کی تو چچا غالبؔ یاد آ گئے:

کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

دراصل ریلوے کے سالن میں اعلیٰ درجے کی ولایتی ربڑ استعمال ہوتی ہے، لہٰذا کوئی چھوٹا موٹا شیشی اُسے توڑنا تو کجا، چبانے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ ایک بزرگ نے ہمارے سامنے کوشش کی تھی۔ بوٹی دانتوں میں دبا کر زور سے کھینچا تھا کہ مصنوعی بتیسی کھٹاک سے نکلی اور غلیل سے نکلے پتھر کی طرح ٹکٹ چیکر کو لگی، جس نے سراسیمہ ہو کر کہا، ”بزرگوار! کاٹ کھانے کو کیوں دوڑ رہے ہیں؟ صرف ٹکٹ ہی تو مانگا ہے۔“

اس لنچ میں دو عدد پلاسٹک کی بنی ہوئی روٹیاں بھی شامل تھیں، جن کے بارے میں طعام گاہ والوں کو خوش فہمی تھی کہ وہ شوربے میں تیرتی اس ناقابلِ فہم اور ناقابلِ فہم شے کے ساتھ کھائی جا سکتی ہیں جسے وہ آلو کہنے پر مصر تھے؛ حالاں کہ وہ آلو چبانا لوہے کے چنے چبانے والی بات تھی۔

چاول قدرے اچھے تھے۔ وہ دیگر اشیا کے مقابلے میں کم خراب تھے، اس لیے اچھے لگے۔ بس کھاتے ہوئے دانتوں کا استعمال ذرا زیادہ کرنا پڑتا تھا کہ کچے چاول ہضم کرنے میں معدہ تال

مٹول سے کام لیتا ہے؛ البتہ پانی کا گلاس ساتھ رکھنا ضروری تھا، تا کہ جب دانتوں میں ریت کچر کچر بجنے لگے تو لقمے کو پانی سے دھکا دے کر نیچے اُتارا جا سکے۔

ریلوے والوں کا خیال ہے کہ وہ لنچ کے ساتھ فرنی بھی دیتے ہیں۔ اس فرنی کا ایک فائدہ تو ہم نے بھی اُٹھایا اور وہ یہ کہ اپنی کتاب کی پھٹی ہوئی جلد اس سے چپکا لی۔ یہ کتاب آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ مجال ہے جو ذرا بھی پھٹی ہو۔ پینے کا جو پانی لنچ کے ساتھ فراہم کیا گیا۔ اُس میں بس ایک قباحت تھی اور وہ یہ کہ اُسے پیتے ہوئے آنکھیں بند رکھنا پڑتی تھیں تا کہ اُس کا گدلا پن اور اُس میں تیرتے ہوئے بے شمار ناقابلِ شناخت اجزا بعد میں رہ رہ کر یاد نہ آ سکیں۔ اس پانی میں ایک سہولت اس کا درجۂ حرارت بھی تھا۔ گلاس میں اگر تھوڑی سی چائے کی پتی اور چینی ڈال دی جائے تو خوش ذائقہ اور نفیس قہوہ تیار ہو سکتا ہے اور اگر سفر میں ان اشیا کی فراہمی مشکل ہو تو یونہی نوشِ جاں کیجیے کہ گرم پانی صحت کے لیے مفید ہوتا ہے، معدے کے تمام جراثیم فوری طور پر ہلاک کر دیتا ہے۔

ہم شرط لگانے کو تیار ہیں کہ یہ 'مینو' اگر کسی اونٹ کو بھی پیش کیا جائے تو وہ بھی اسے کھانے سے انکار کر دے گا، لیکن اونٹ کو قدرت کی جانب سے یہ آسانی مہیا کی گئی ہے کہ وہ کئی دن کی بھوک ہڑتال کے بعد بھی مستانی چال چل سکتا ہے، ریلوے کا محتاج نہیں۔ لیکن اشرف المخلوقات انسان بے چارہ اس قسم کے تجربات کا متحمل نہیں ہو سکتا اور متحمل ہو تو اس سے جانبر نہیں ہو سکتا۔

رہی سونے کی بات تو ٹرین میں سونا ایسا ہے جیسا غالبؔ کے لیے وصال کہ:

گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

آپ دن بھر کے سفر کی صعوبت سے نڈھال ہیں اور اپنی سیٹ پر اُکڑوں بیٹھے سونے کی اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔ برتھ آپ کو ملی نہیں، کیوں کہ وہ سب قلیوں نے بُک کروالی تھیں۔ آپ پاؤں بھی زمین پر نہیں رکھ سکتے کہ اس سے بعض مسافروں کے آرام میں خلل پڑے گا۔ یہ بعض مسافر وہ ہیں، جو موقع پا کر آپ کی نشست کے آگے فرش پر بوریا بستر بچھا کر پڑ رہے اور اب آپ سے زیادہ آرام میں ہیں۔ نیند بھی آ رہی ہے، لیکن سامان چوری ہونے کا دھڑکا بھی لگا ہے۔ ایک آنکھ بند ہے اور دوسری سامان پر لگی ہوئی۔ ادھر ایک ہاتھ دل پر ہے اور دوسرا جیب پر۔

بشری تقاضوں سے مجبور ہو کر آپ کی آنکھ لگتی ہے کہ ٹرین ایک دھچکے سے کسی بیابان میں رُک

جاتی ہے اور دریافتِ احوال پر معلوم ہوتا ہے کہ انجن فیل ہو گیا۔ پُرانے زمانے میں ریلوے انجن فیل ہونے کا فیشن نہیں تھا، لیکن آج کل یہ وبا کچھ زیادہ ہی پھیل رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ اگلے وقتوں میں اونٹوں کے قافلوں میں حدی خواں بھی ہوا کرتے تھے۔ اُن کی حدی خوانی سے اُونٹوں کی رفتار میں اضافہ ہوتا رہتا تھا اور وہ مستانہ وار صحرا عبور کرتے چلے جاتے۔ (یہاں اونٹ ایک بار پھر ریلوے پر بازی لے گئے) حدی خوانوں کا زمانہ تو لد گیا اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب اونٹ اتنے باذوق نہیں رہے کہ محض گانا سن کر اپنی دُھن میں مست چلتے چلے جائیں۔ سو ریلوے والوں کو چاہیے کہ وہ اپنے انجنوں کی دل بستگی کے لیے موسیقی کا بندوبست کریں۔ ہو سکتا ہے آئے دن انجن فیل ہونے کا سبب ان کی موسیقی سے محرومی ہو۔

انجن فیل ہونے کے کئی گھنٹے بعد قریبی جنکشن سے متبادل انجن آئے گا تو گاڑی چلے گی۔ چلتی کا نام گاڑی ہے، لیکن یہ زیادہ دیر نہیں چلنے کی۔ ڈرائیور بس آپ کے سونے کا انتظار کرے گا۔ جیسے ہی آپ کو نیند آئی وہ جھٹ گاڑی کسی اسٹیشن پر اس مہارت سے جھٹکا دے کر روکے گا کہ برتھ پہ رکھا سارا سامان اور کم وزن والے مسافر دھڑام سے نیچے آ رہیں گے، تاکہ سوئے ہوئے بیدار ہو جائیں اور سو کر اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کریں۔

اونٹ کے سفر میں ایک فائدہ بھی ہے کہ کوئی پھیری والا اونٹ پر گھوم پھر کر سودا نہیں بیچ سکتا اور نہ کوئی جیب کترا آپ کی جیب کاٹ سکتا ہے۔ اونٹوں کے حق میں یہ دلائل سن کر آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کراچی اور لاہور کے درمیان کوئی اونٹ سروس، چلانے والے ہیں، جس کے لیے یہ ساری اشتہار بازی ہو رہی ہے۔ رفعِ شر کی خاطر اونٹ کے چند عیوب بھی بیان کرتے چلیں اور وہ یہ کہ آپ اونٹ پر پاؤں پسار کر کتاب پڑھ سکتے ہیں نہ اونٹ پر ٹہل سکتے ہیں۔ اس قسم کے نخروں کا اونٹ متحمل نہیں ہو سکتا اور اگر ہو بھی جائے تو یہ آپ کی صحت کے لیے شدید نقصان دہ ہوگا۔ مزید برآں یہ کہ ہر چند اونٹ بغیر کھائے پیے سفر کر لیتا ہے، مگر اس کے سواروں کو پیٹ بھرنے کا جتن کرنا ہی پڑتا ہے۔ (یہ ساری بُرائیاں پڑھ کر کسی اونٹ کی دل آزاری ہو تو ہم معذرت خواہ ہیں)۔

اسی طرح ٹرین کے سفر میں بھی کچھ نہ کچھ کھانا ہی پڑتا ہے چاہے اس کے لیے دل پر کتنا ہی جبر کیوں نہ کرنا پڑے۔ 'لنچ' کھا کر ہمیں خاصی عبرت حاصل ہوئی تھی آزمودہ را آزمودن جہل است، چنانچہ ناشتا ہم نے کسی اسٹیشن پر کرنے کا فیصلہ کیا۔ پھیری والے سے کچھ کیک اور بسکٹ خریدے،

ہر دو علی الترتیب ضرورت سے زیادہ سخت اور نرم تھے۔ بسکٹ ہم نے فوراً ان بزرگ کی نذر کر دیے تھے، جو گزشتہ روز بوٹی چبانے کے حادثے میں اپنی بتیسی سے محروم ہو گئے تھے۔ وہ نرم بسکٹ کھانے کے لیے دانتوں کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اس نئی ایجاد کو دیکھ کر دل بے حد خوش ہوا۔ آخر کار ہم نے بھی اتنی ترقی کر لی ہے کہ بچوں کے لیے مغرب سے طرح طرح کی غذائی اشیا درآمد کرنے سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ یورپ اور امریکا والے بچوں کے لیے اس سے نرم خوراک بنا کر دکھائیں تو مانیں۔ اس کے بعد کیک کی باری آئی، جسے کھانے کے لیے ہم نے ہتھوڑا تلاش کرنا شروع کیا۔ تلاشِ بسیار کے بعد نامرادی ہاتھ آئی۔ آخر اُسی پھیری والے سے اس کیک کی ترکیب استعمال دریافت کی تو وہ مسکرا کر بولا، ”صاحب! سامنے پٹڑی پر رکھ دیجیے۔ ابھی دس منٹ میں خیبر میل آتی ہوگی۔ گزر جائے تو چورا اُٹھا لیجیے اور چائے میں ڈال کر چمچ سے کھائیے۔ بڑا لذیذ ہوتا ہے۔“

بسکٹ اور کیک پر فاتحہ پڑھ کر چائے پر توجہ دی۔ چائے سے پہلے ہمیں ایک گلاس میں گرم اور گدلا پانی دیا گیا۔ ہم نے پوچھا یہ کیا ہے اور چائے کہاں ہے؟ ہنس کر بولے یہی تو چائے ہے۔ چائے کے نام پر چنے کے چھلکوں کا عرقِ شیریں زہر مار کیا اور جب واپس ریل گاڑی میں چڑھے تو اپنی نشست پر ایک پہلوان جی کو براجمان پایا۔ اُن کے مونچھوں پر تاؤ دینے سے ظاہر تھا کہ وہ طاقت کو سب سے ازلی دلیل سمجھتے ہیں۔ اُن کا تن و توش پیشِ نگاہ رکھتے ہوئے ہم اُن کی اس اَن کہی دلیل کے فوراً قائل ہو گئے۔ اس نشست پر ہم نے اس وقت تک جو سفر کیا تھا، وہ محض اُن کی خوش اخلاقی، ہمدردی اور وسعتِ قلبی کا نتیجہ تھا ورنہ چاہتے تو ہمیں پہلے ہی اُٹھا دیتے۔ یہ تو اُن کی مہربانی اور فیاضی تھی کہ ہمارے اُٹھنے کا انتظار کیا۔ بھلے مانس تھے، ورنہ لوگوں میں اب اتنی مروّت کہاں رہی ہے؟

بقیہ سفر انہی پہلوان جی کے قدموں میں بیٹھ کر کیا۔ وہ بھی اس طرح کہ ہمارے سوٹ کیس پر پہلوان جی کی صحت مند ٹانگوں کے بعد جو تھوڑی بہت جگہ بچ گئی تھی، وہاں اپنی جانِ ناتواں کے ساتھ سمٹ رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سفر میں سامان، پہلوان اور نخرے نہ ہوں تو اونٹ سے بہتر کوئی سواری نہیں۔ ٹکٹ کا تردّد نہ قلیوں کی جھک جھک سگنل کا جھگڑا نہ انجن کا انتظار۔ بس منہ اُٹھائے چل دیے اونٹ کی طرح۔

* *

چھٹا بادشاہ

ڈاکٹر سلیم اختر

شاہ فاروق سے ایک انٹرویو کے دوران میں بادشاہت کے مستقبل کے بارے میں سوال کیا گیا، جس کے جواب میں شاہ فاروق نے جو کچھ کہا، وہ اب حوالے کی چیز بن چکا ہے۔

”دنیا میں صرف پانچ بادشاہ باقی رہیں گے۔ چار تاش کے اور ایک برطانیہ کا۔“

ہے نا پتے کی بات! لیکن شاہ فاروق سے چوک ہو گئی کہ وہ چھٹے بادشاہ کا نام فراموش کر گئے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بادشاہ تھے یا پھر یہ کہ وہ پاکستان میں نہیں تھے۔ صاحب! وہ چھٹا بادشاہ ہے کلرک بادشاہ۔

کلرک۔ زبان پہ بارے خدایا یہ کس کا نام آیا! آپ نے ایسے سربراہانِ مملکت کے نام سنے ہوں گے جنہیں بے تاج بادشاہ کہا جاتا ہے۔ سو ہمارے کلرک بھی بے تاج بادشاہ ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ آٹھویں، دسویں یا بارہویں گریڈ میں ہوں، مگر شہنشاہی تیوروں میں کبھی فرق نہ آنے پائے گا۔ انہیں سیٹ پر بیٹھا دیکھیں (یہ بھی اتفاق کی بات ہے) تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تختِ طاؤس پر براجمان ہوں۔ اسی لیے تو اپنے کیس کی خیریت معلوم کرنے والا شخص ان کے حضور ایک قابلِ گردن زدنی مجرم ٹھہرتا ہے جیسے تھانیدار ملزم کو بڑھکانے کے لیے جان بوجھ کر اسے نظر انداز کرتا ہے اور پھر غافل جان کر اچانک گدھ کی طرح جھپٹتا ہے۔ کچھ یہی انداز کلرک بادشاہ کا ہوتا ہے۔ وہ آپ کے وجود سے بے خبر ساتھ کی مملکت کے بادشاہ سے سیاست پر پُر جوش تبصرہ کر رہا ہے یا چائے پی رہا ہے یا دوسرے بادشاہ سے ملک میں اخلاق کی گری ہوئی صورتِ حال پر نہایت رُوح فرسا قسم کی باتیں سن رہا ہے۔ الغرض! وہ فائل کے علاوہ ہر کام میں مصروف لگے گا۔ آپ سہمے سہمے سے انداز میں اسے سلام کرتے ہیں، لیکن وہ جواب میں صرف ناک پر سے مکھی اڑا دیتا ہے۔ آپ دوبارہ کہتے ہیں:

''میں جی...''

مگر وہ یوں خشمگیں نظروں سے دیکھتا ہے کہ دل کی دل میں رہ جاتی ہے۔

جب پڑوسی بادشاہ سے وہ بین الاقوامی اُمور طے کر لیتا ہے، تو پھر آپ کی طرف متوجہ ہوئے بغیر پوچھے گا۔ ''کی گل اے؟''

آپ اپنے چہرے پر مصنوعی بشاشت لا کر اور پوری بتیسی کھول کر اسے بتانا شروع کرتے ہیں۔ مگر اس نے اب ایک ڈرافٹ کا اس انہماک سے مطالعہ شروع کر دیا ہے جیسے کسی دشمن ملک کے بادشاہ کا الٹی میٹم ہو۔ آپ اسے غیر متوجہ پا کر اس طرح چپ ہو جاتے ہیں جیسے قبلہ نواب صاحب کو غیر متوجہ پا کر میر تقی میر غزل کا مطلع سنانے کے بعد خاموش ہو گئے تھے۔ جب نوابی شان میں کلرک بادشاہ 'ہوں' کہتا ہے تو آپ کا ٹیپ ریکارڈر دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ مگر اس نے تو ایک آفس نوٹ لکھنا شروع کر دیا ہے۔ آپ دونوں ہاتھ باندھے نہایت خشوع وخضوع سے کیس کے تمام اہم نکات واضح کر دیتے ہیں، مگر اس کے لیے تو آپ کی آواز بیک گراؤنڈ میوزک کا کام کر رہی ہے۔ اور پھر اچانک وہ کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر پہلی مرتبہ آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے۔ آپ ان جلالت مآب آنکھوں کو برمے کی طرح دل میں اُترتے محسوس کرتے ہیں اور آنکھیں جھکا لیتے ہیں۔ اس پر آپ کو وہ یہ خوشخبری سناتا ہے کہ یہ کیس اس کے پاس نہیں ہے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' آپ گھبرا کر کہتے ہیں۔

''سر جی! یہ میری ٹیبل پر نہیں ہے۔'' (سر جی اس لہجے میں گویا خالصہ کہہ رہا ہو)۔

''تو اس کے بارے میں کہاں سے پتا چلے گا؟''

ڈائری والوں سے پوچھیں۔ یہ کم بخت چٹھیاں اِدھر اُدھر کر دیتے ہیں؟''

''یہ کدھر ہے؟''

''اُدھر۔'' وہ ہاتھ کا دائرہ بنا کر کہتا ہے۔

آپ کو ناراض ہو کر گالیاں دیتے ہوئے جانے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ آپ اسی سلوک کے مستحق تھے۔ حضرت! بادشاہوں کے دربار میں حاضری کے کچھ آداب ہوا کرتے ہیں جنھیں ملحوظ نہ رکھنے پر گردن مار دی جایا کرتی ہے۔ آج کل کیوں کہ جمہوریت ہے اور عوام کا راج ہے اور محکمے عوام کی خدمت کے لیے ہوتے ہیں اس لیے عوام کو بے حد محتاط ہو کر زندگی بسر کرنے اور پھونک

پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ آپ کی خدمت میں یہ ابتدا ہی میں عرض کر دیا گیا تھا کہ کلرک بھی بادشاہ ہوتا ہے۔ جس طرح بادشاہ کے دربار میں خالی خولی کورنشات اور تسلیمات سے بات نہیں بنتی، بلکہ حسبِ مقدور نذر پیش کرنی لازم ہوتی ہے، اسی طرح کلرک بادشاہ کے حضور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے اور مردہ آواز میں سلامتی بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ اس کے حضور نذر پیش کیجیے اور پھر جلالت مآب کا رنگ دیکھیے۔ فوراً اپنے تختِ طاؤس سے اُترے گا اور شاہی آداب کے مطابق آپ سے معانقہ کرے گا۔ کینٹین پر تین چار بے تکلف بادشاہوں کی پُر لطف صحبت میں وہ آپ کو چائے پلائے گا۔ (پروٹوکول کے مطابق جس کا بل آپ کو ادا کرنا ہوگا کہ آدابِ مہمانداری کے یہ عین مطابق ہے) چائے پیتے ہوئے حسبِ دستور آپ کو اخلاقی قدروں کی پامالی ایسے دلدوز موضوعات پر ان کی رقت آمیز گفتگو میں شریک ہونا ہوگا اور عین اس وقت کہ حالت رونے والی ہوگی، کسی ایک کو یہ یاد آجائے گا کہ منور ظریف مرحوم کی ایک زبردست فلم چل رہی ہے۔ چنانچہ تفریح کے شاہی قواعد کی پیروی میں آپ ان سب کو مدعو کرتے ہیں جسے بڑی فراخدلی سے قبول کر لیا جاتا ہے۔ سینما میں وہ اپنے ان حاضر دوستوں کے علاوہ غیر حاضر دوستوں کی صحبت میں تشریف لاتے ہیں۔ آپ ان کے لیے ریڈ کارپٹ تو نہیں بچھا پاتے، لیکن انٹرول میں انہیں وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیتے ہیں۔ فلم کے اختتام پر وہ سب گلے مل کر رخصت ہوتے ہیں۔ وہ چلتے چلتے کان میں پھونک جاتا ہے۔

"پرسوں تشریف لے آئیے۔"

اتنے پیسے خرچ ہونے پر آپ کو ملول نہ ہونا چاہیے کہ آپ نے مختلف حکومتوں کے بادشاہوں سے روابط پیدا کر لیے ہیں، جن سے آپ اور آپ کے احباب بہرہ ور ہوتے رہیں گے۔

پرسوں آپ ابھی کمرے میں پوری طرح سے داخل نہیں ہو پاتے کہ وہ پیشوائی کے لیے اپنی کرسی سے اُٹھ کر آتا ہے۔ نہایت محبت سے آپ کا ہاتھ تھام کر اپنی کرسی پر بٹھاتا ہے اور ڈسپیچ نمبر لگی چٹھی آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی فلم پر تبصرہ شروع کر دیتا ہے۔ یہ آپ کے امتحانی پرچے کا آخری مگر نہایت اہم سوال ہے اور اس کے درست جواب پر مستقبل کے کئی اُمور کا انحصار ہے۔ آپ محض شکریہ ادا نہیں کریں گے، بلکہ اسے ایک اور فلم پر مدعو کریں گے ابھی وہ فلم کا پروگرام طے کر رہا ہوگا کہ ایک یتیم صورت شخص اسے سہمے سہمے لہجے میں سلام کرتا ہے، جس کے

جواب میں وہ صرف ناک پر سے مکھی اُڑا کر آپ کی طرف ہی متوجہ رہے گا اور تب کشف کے اس لمحہ میں آپ کو یہ احساس ہوگا کہ آپ بھی تو ایک فاتح ہی ہیں جس نے کلرک بادشاہ کو زیر کرلیا ہے۔ تو صاحب دنیا میں پانچ کے علاوہ دو بادشاہ اور بھی برقرار رہیں گے۔ ایک کلرک بادشاہ اور ایک اسے تسخیر کرنے والا بادشاہ۔

* * *

مولوی گڈو

ڈاکٹر صفدر محمود

مولوی گڈو کے نام کی وجہِ تسمیہ کا تو مجھے علم نہیں اور نہ میں نے کبھی جاننے کی کوشش کی۔ اللہ نے انہیں مفصل تن و توش سے نواز رکھا تھا، مگر حیرت ہے کہ ان کا نام مولوی گڈو پڑ گیا تھا۔ تکبیر کی یہ تصغیر کس طرح عمل میں آئی، اس امر سے کالج کا کوئی طالب علم آگاہ نہ تھا۔ ہوسکتا ہے مولوی صاحب بچپن میں ’گڈے‘ (پتنگ) اڑاتے رہے ہوں یا بچپن میں بزرگوں نے پیار سے گڈو کہا ہو اور پھر وہ پیار کا نام اصل نام پر حاوی ہو گیا ہو۔

مولوی گڈو بارعب بزرگ تھے۔ دیکھنے میں ہرگز اندازہ نہ ہوتا تھا کہ وہ ایک کالج کی ویران سی مسجد کے امام ہوں گے۔ ظاہری طور پر وہ سیاستدان یا گاؤں کے چوہدری لگتے تھے جو عام طور پر ساٹھ پینسٹھ برس کی عمر کے لگ بھگ نو سو یا اس سے زیادہ چوہے پورے کر لینے والی بلی کی طرح تائب ہو جاتے ہیں، عمل میں نماز اور جسم میں داڑھی کا اضافہ کر لیتے ہیں اور قریب آتی ہوئی قیامت کی چاپ کے خوف سے اسی مولوی کے پیچھے باقاعدگی سے نماز پڑھنی شروع کر دیتے ہیں جس کو جوانی کے زمانے میں گالیاں دے کر بھی بے مزہ نہ ہوتے تھے۔ البتہ جب مولوی گڈو اپنی خضابی ریشِ مبارک کی اوٹ میں چھپے ہوئے باریک ہونٹوں کو جنبش دیتے اور گفتگو فرماتے تو چند ہی منٹوں میں اپنی اصلیت ظاہر کر دیتے۔ اس حد تک سب ان کی حق گوئی و بے باکی کے قائل تھے۔ وہ اللہ میاں کی بہت سی ’قدرتوں‘ سے قریبی واقفیت رکھتے تھے۔ جمعہ کی نماز کے خطبے میں ان قدرتوں کا ذکر کچھ اس اعتماد سے کرتے تھے جیسے وہ اللہ میاں کی نہ ہوں بلکہ ان کی اپنی ’قدرتیں‘ ہوں۔ لیکن وہ اللہ میاں کی ایک واضح قدرت سے واقف نہ تھے۔ وہ یہ کہ اللہ میاں نے لاتعداد انسان صرف دیکھنے کے لیے پیدا کیے ہیں، بولنے کے لیے نہیں اور بہت سوں کو صرف بولنے کے لیے پیدا کیا ہے، دیدار فروشی کے لیے نہیں۔ مولوی گڈو ’دیدارو‘ لوگوں میں سے تھے

دگفتار ولوگوں میں سے نہیں تھے۔

مولوی گڈو کا قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ تقریباً یہی قطر پیٹ کا بھی تھا۔ قد لمبا نہ ہوتا تو سر سے پاؤں تک پیٹ ہی پیٹ رہ جاتے۔ گردن اتنی موٹی تھی کہ معلوم ہوتا سر براہ راست دھڑ پر پڑا ہے۔ یہی کیفیت دیگر اعضائے رئیسہ وغیر رئیسہ کی تھی۔ سردیوں میں وہ عام طور پر سیاہ شیروانی زیب تن کرتے، جوان کی روایت کے مطابق، نواب صاحب نے ان کی ایک عالمانہ تقریر سے مغلوب ہو کر ہدیۂ حقیر کے بطور پیش کی تھی۔

مولوی گڈو کے حاسدوں کا کہنا تھا کہ وہ شیروانی نواب صاحب نے ان پر ترس کھا کر بھجوائی تھی۔ جبھی تو اب کچھ وقت گزرنے کے بعد شیروانی ان پر پھبتی کم تھی اور پھنستی زیادہ تھی۔ ان کی شخصیت کا دوسرا جزو ان کا سائیکل تھا جو اس وقت عمر کی چالیس بہاریں دیکھ چکا تھا اور اپنے تمام تر بڑھاپے کے باوجود مولوی صاحب کا بوجھ برداشت کر رہا تھا۔ عینی شاہدوں کا بیان تھا کہ مولوی صاحب اپنے سائیکل کی دیکھ بھال اپنی گھر والی سے بھی زیادہ کرتے تھے۔ پطرس کے سائیکل کی مانند، مولوی گڈو کے سائیکل کا بھی ہر حصہ، سوائے گھنٹی کے، خوب بجتا تھا، بلکہ شور مچاتا تھا، اور کبھی ان پر ترس آتا تھا اور کبھی سائیکل پر۔ بہر حال دیکھنے والے سائیکل کی خوئے وفا سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ مولوی صاحب جب سائیکل کی کاٹھی پر براجمان ہوتے تو ان کے ڈھیلے ڈھالے پیٹ کا فالتو گوشت گدی کے دونوں طرف تھیلوں کی مانند لٹکتا نظر آتا۔ ہر وقت یہ خطرہ رہتا کہ نہ جانے کب کون سا حصہ ناقص پلستر کی طرح زمین پر آن گرے۔ مولوی صاحب ہینڈل پر یوں جھک کر سائیکل چلاتے گویا سائیکل سے پہلے منزل پر پہنچ جانے کا ارادہ ہو۔ جب سائیکل سفر کا آغاز کرتا تو پہلے پہل چوں چوں چاں چاں شوں شوں اور گرر گرر کی پُرسوز آوازیں سنائی دیتیں۔ جب سائیکل دروزہ کی ابتدائی منزل سے نکل کر ذرا رفتار پکڑتا اور ان آوازوں کے ساتھ پھٹ پھٹ کی آوازیں بھی شامل ہو جاتیں تو عجب سماں ہوتا۔ گویا سڑکوں پر خطرے کا الارم بج جاتا۔ لوگ دُور دُور تک سڑک کی ایک طرف ہٹ جاتے اور اس آفتِ ناگہانی کے گزر جانے کا انتظار کرنے لگتے۔ ارد گرد کے درختوں پر سے پرندے گھونسلے چھوڑ کر فضا کی بلندی میں پناہ تلاش کرنے لگتے اور کتے کسی خطرے کی آمد کے احساس سے بھونکنا شروع کر دیتے۔ یوں مولوی صاحب کے استقبال کا منظر انتہائی دلچسپ ہوتا۔

ڈاکٹر مسرور محمود ...... مولوی گڈو

مولوی گڈو کو مسجد سے ملحق ہوسٹل میں ایک کمرہ بھی دیا گیا تھا تا کہ ان کو حجرے کی کمی محسوس نہ ہو اور وہ خانۂ خدا کی قیمتی اشیاء اس کمرے میں برائے حفاظت رکھ سکیں۔ چنانچہ اس کمرے میں ایک چارپائی اور کرسی کے علاوہ، مولوی صاحب کی صابن دانی مع دیسی صابن، تولیہ، سرمہ دانی، سرسوں کے تیل کی شیشی، کنگھی، موچنا اور سرخ ڈنڈی والا ڈنڈا ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔ وہ اس تمام ’شرعی ساز و سامان‘ کو مسجد کی چیزوں کی مانند احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لہٰذا شاذ و نادر ہی استعمال کرتے تھے۔ البتہ پڑوسی طلبا کی چیزوں کو بے تکلفی سے استعمال کرنا اپنا ’بنیادی حق‘ سمجھتے تھے کیوں کہ اسلام نے پڑوسی کے حقوق پر بہت زور دیا ہے!

مولوی صاحب کی تقرری کا دائرہ صرف نمازیں پڑھانے تک محدود تھا لیکن انہوں نے ایک زائد فرض خود اپنے اوپر مسلط کر لیا تھا جس کی بجا آوری کو وہ اپنے لیے ذریعۂ مغفرت سمجھتے تھے۔ وہ زائد فرض تھا طلبا میں تبلیغ اور ان کے کردار و اخلاق کی اصلاح۔

مولوی صاحب بڑے تکلف سے مجسمۂ عجز و انکسار بنتے مگر جیسا کہ لازمۂ مولویت ہے، وہ خود کو کسی بھی دوسرے عالمِ دین سے کم نہیں سمجھتے تھے بلکہ کچھ زیادہ ہی سمجھتے تھے۔

مولوی صاحب سے اپنے تعارف کا حادثہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ مجھے ابھی ہوسٹل کا اسیر ہوئے چند ہی روز گزرے تھے۔ رات کے کھانے کے لیے میز پر بیٹھا تھا کہ اچانک روٹیوں کی سپلائی منقطع ہو گئی۔ ساتھ بیٹھے ہوئے ایک سینیئر سے پوچھا تو کہنے لگا کہ مولوی گڈو صاحب آئے ہیں۔ اب سپلائی کا رُخ اس طرف ہو گیا ہے۔ ”لیکن ان کے آنے سے پہلے تو ہم کئی طلبا کھانا کھا رہے تھے پھر بھی روٹیاں مسلسل مل رہی تھیں۔“ میں نے پوچھا تو اس نے کہا، ”کھانا کھانے کے بعد تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔“ ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو میرا ساتھی مجھے مولوی گڈو کی میز پر لے گیا۔ میں نے دیکھا مولوی صاحب کے سامنے سالن کی تین پلیٹیں پڑی تھیں اور تنوری روٹیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ مولوی صاحب ’معرکۂ سالن و روٹی‘ میں اس قدر انہماک سے دادِ شجاعت دینے میں مصروف تھے کہ انہوں نے نگاہ اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ میں اس منظر سے بہت محظوظ ہوا اور زیرِ لب مسکراتا ہوا ڈائننگ ہال سے نکل گیا۔ روٹیوں کا ڈھیر اور تین پلیٹ سالن کی منطق میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ مگر میرے ساتھی کی تفسیرِ احوال نے یہ گتھی سلجھا دی۔ اس نے کہا کہ آج کل مولوی گڈو فقر کی ابتدائی منازل طے کر رہے ہیں اور وہ تین پلیٹیں سالن اور 13 تنوری روٹیاں

کھا کر 313 کی حجت پوری کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا، ''یہ 313 کا کیا فلسفہ ہے؟'' بولا، ''میاں 313 تاریخِ اسلام میں ایک معروف عدد ہے اور مولوی صاحب کے دل میں اسلام کا بے پناہ احترام ہے۔''

میں نے دل میں سوچا، اگر مولوی صاحب کے جملہ معتقدین نے بھی 313 کے احترام میں ہانڈی روٹی سے یہی سلوک کیا تو پاکستان کو گندم میں خود کفیل ہونے میں ایک صدی مزید درکار ہوگی۔

تبلیغ کے ضمن میں مولوی گڈو کا طریقۂ واردات یہ تھا کہ وہ رات کے 'مختصر' سے کھانے کے بعد جس کا مختصر سا ذکر آپ سن چکے ہیں، ہوسٹل کا چکر لگاتے اور جس کمرے میں انہیں چند طلبا اکٹھے دکھائی یا سنائی دیتے، وہ اس کمرے میں تشریف لے جاتے۔ انہوں نے رُوحانی طور پر اس قدر پختگی حاصل کر لی تھی کہ ان کے قدم ہمیشہ اسی کمرے کی جانب اٹھتے جس کے مقیم کو اُس روز مہینے کے خرچ کی رقم موصول ہوئی ہو یا جس کمرے میں اسی روز پھل، مٹھائی، شربتِ رُوح افزاء کی بوتل یا کوئی اور ذائقے دار شے اُتری ہو۔ اس معاملے میں مولوی گڈو نے کبھی غلطی نہ کھائی۔ وہ جانتے تھے کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے نام کی مہریں فرشتوں نے کچھ زیادہ ہی لگا رکھی ہیں... تاہم یہ قصور فرشتوں کا تھا، نہ کہ ہمارے مولوی صاحب کا!

کمرے پر قبضہ کرنے کے بعد، مولوی گڈو کا انداز بالکل ہائی جیکر کا سا ہوتا، یعنی کمرے میں موجود طلبا کو اُٹھنے، کھانسنے بلکہ دَم مارنے کی بھی اجازت نہ ہوتی۔ فوری طور پر وعظ و تبلیغ کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ چنانچہ اگر کسی بے چارے کو باتھ روم جانا ہے، یا اگلے دن کے پرچے کی تیاری کرنی ہے یا اس کی محبوبہ کے فون آنے کی نازک گھڑی آن پہنچی ہے تو کیا؟ مولوی صاحب کی موجودگی میں کوئی ہل نہ سکتا تھا، کیوں کہ وعظ و تبلیغ کے دوران اٹھانا گویا دین کی شان میں گستاخی ہے اور گستاخی بڑھ کر کفر بھی بن سکتی ہے۔ (یوں بھی مولوی صاحب کو کفر کا فتویٰ دینے کا بہت شوق تھا) پھر ہمارے مولوی صاحب یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ انسان ایک بار کافر ہو جائے تو پھر کافر ہی رہتا ہے خواہ بعد میں امامِ مسجد ہی کیوں نہ بن جائے۔ لطف تو اس وقت آتا جب کوئی طالب علم کام کرتے کرتے چند لمحوں کے لیے اپنے قلم میں سیاہی بھرنے آتا اور پھر خالی قلم ہاتھ میں پکڑے، کفر کے فتوے سے بچنے کے لیے انتہائی بے بسی کے عالم میں میز کی نکڑ پر بیٹھ کر مولوی صاحب کی باتیں

سننے لگتا۔ ایسے میں بے چارے کی عجیب و غریب حالت ہوتی۔ بار بار یہ خیال آتا کہ کمرہ کھلا ہے، ہوسکتا ہے واپسی تک کوئی شے غائب ہو جائے۔ ادھر مولوی صاحب کا لیکچر ختم ہونے کے کوئی آثار نہ ہوتے کیوں کہ لیکچر کے خاتمے کے قریب مٹھائی، پھل یا کم اَز کم رُوح افزاء پر 'ختم' پڑھا جاتا تھا اور پھر ختم شریف والی شے حاضرین کو سونگھا کر مولوی صاحب کی نذر کردی جاتی تھی۔ تا کہ مولوی صاحب میزبان کے لیے نالہ' نیم شبی'، کے دوران انتہائی خلوص اور خضوع و خشوع سے بخشش کی دعا کر سکیں... چنانچہ نو گرفتار کا دل اور ذہن اپنے کمرے میں اٹکا رہتا اور جسم اس میز کی نکڑ سے لٹکا رہتا جس کی گرفت سے اب وہ مولوی صاحب کی 'رُخصتی' تک آزاد نہ ہوسکتا تھا۔ سوزِ و سازِ رومی سے محروم وہ بے چارہ اندر ہی اندر پیچ و تابِ رازی، کھاتا رہتا اور مولوی صاحب کے حق میں 'دعائے خیر' کرتا رہتا۔

مولوی صاحب کے وعظ کے ضمن میں ان کے سامعین، کو ایک بڑی نادر سہولت میسر تھی۔ وہ یہ کہ ان کی گفتارِ دلپذیر آسانی سے نہیں بھولتی تھی کیوں کہ وہی چند ایک باتیں یعنی قیامت کا خوف، فرشتوں کا گنہگاروں کی گردنوں کو توڑنا، مارنا پیٹنا اور جہنم کی آگ میں پھینکنا جیسے وہ اللہ میاں کی نوری مخلوق نہ ہوں، کسی پنجابی فلم کے ہیرو ہوں یا کسی تھانے کے سپاہی۔ مولوی صاحب نے مبلغ یہی گنی چنی باتیں اپنے استاد، بڑے مولوی صاحب، سے وراثت میں پائی تھیں اور انتہائی سعادت مند شاگرد کے مانند اس متاعِ گراں مایہ کو اپنی اصل حالت میں سینے سے لگا رکھا تھا۔ اس میں کمی یا اضافہ کر کے وہ انحراف یا تجاوز کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے تھے اور نہ کبھی ہوئے۔ یوں بھی اس علمِ خالص میں اضافے کے لیے قدرے محنت کی ضرورت تھی اور مولوی صاحب فقر کی جس منزل میں تھے وہاں ان کو اپنی جسمانی تربیت سے ہی فرصت نہ تھی کہ وہ ذہنی تربیت کا سوچ سکتے۔ اس صورتِ حال سے انہیں ایک فائدہ یہ ہوا تھا کہ ماسوا جمعہ کی نماز کے، باقی نمازوں میں وہ خود ہی موذن، خود ہی مقتدی اور خود ہی امام ہوا کرتے اور یوں ان کے خضوع و خشوع میں خلل پڑنے کا کوئی اندیشہ نہ ہوتا۔

باقاعدگی سے جمعہ کی نماز پڑھنے والوں میں، میں بھی شامل تھا۔ مولوی گڈو اپنے وعظ کا آغاز قیامت کی نشانیوں سے کرتے، بڑی رقت اور دقت سے آنکھوں میں آنسو لا کر بتایا کرتے کہ قیامت نزدیک آرہی ہے۔ 'کچھ کرنا ہے تو کرلو۔ ورنہ اگلے جہان میں فرشتے مار مار کر تمہاری

گردنیں توڑ دیں گے۔ یہ بھی قیامت کی قربت کے آثار ہیں کہ بانگیں (اذانیں) ہوتی رہتی ہیں اور تم پڑے سوتے ہو۔ کالج میں لیکچرار (لیکچر) دیتے رہتے ہو لیکن نماز پڑھنے نہیں آتے ہو۔ اللہ کی قدرتوں پر غور کرو۔ دیکھو! بھینس گھاس سبز رنگ کا کھاتی ہے لیکن دودھ سفید رنگ کا دیتی ہے۔ کچھ کرنا ہے تو کرلو۔ قیامت آرہی ہے۔ فرشتے مار مار کر تمہاری گردنیں توڑ دیں گے۔"

دورانِ وعظ کچھ گنہگار بار بار اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے کہ فرشتوں کے ڈنڈے شاید یہاں پڑیں گے۔ اور کچھ معصوم ہنسی روکنے کے لیے بار بار وضو کے بہانے اِدھر اُدھر کھسک جاتے اور ان کے وضو کا عمل وعظ سے طویل تر ثابت ہوتا۔

شبِ معراج آئی تو مولوی صاحب نے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم شروع کردی اور یوں انہوں نے کم اَز کم تین چار سو روپے اکٹھے کرلیے۔ طلبا سے کہا، شبِ معراج کو نمازِ عشاء کے بعد مسجد میں ختم شریف ہوگا اور بعد ازاں بوندی کے لڈو تقسیم کیے جائیں گے۔ ہم جب مسجد میں پہنچے تو دو ٹوکرے لڈوؤں کے سجے سجائے رکھے تھے۔ ابھی نماز میں کچھ وقت تھا اور مولوی صاحب حسبِ معمول وعظ کے نام پر سامعین کی گردنیں توڑ رہے تھے۔ اسی دوران لڑکوں نے کھسر پھسر شروع کردی کہ یہ لڈو بمشکل سو روپے کے ہوں گے۔ باقی رقم کہاں گئی؟ کچھ طلبا کا خیال تھا کہ مولوی صاحب نے مٹھائی کی دکان پر کھڑے کھڑے باقی رقم کی مٹھائی کھالی ہوگی۔ لیکن قدرے سمجھ دار طلبا کا کہنا تھا کہ اتنی رقم کی مٹھائی کھانے کے بعد مولوی صاحب کی زبان میں جو مٹھاس اور شیرینی آنی چاہیے تھی، وہ غائب ہے۔ چنانچہ انہوں نے مٹھائی نہیں، رقم ہی کھائی ہے۔ قیاس آرائیوں کا یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ نماز کا وقت آگیا۔ اکثر نوجوان نماز پڑھنے نہیں، لڈو کھانے آئے تھے چنانچہ انہوں نے ہر دو چار رکعات نماز کے بعد مولوی صاحب سے آنکھ بچا کر ٹوکروں پر حملے شروع کردیے۔ چند ایک حملوں کے بعد مولوی صاحب کو صورتِ احوال کا احساس ہوا تو غصّے کے عالم میں ٹوکرے اُٹھا کر اپنے سجادہ کے قریب رکھ لیے اور اعلان کردیا کہ اب جو نا ہنجار ٹوکرے کو ہاتھ لگائے گا، کافر ٹھہرے گا۔ اس اعلان کے بعد، مولوی صاحب نے مطمئن ہو کر دوبارہ نماز کی نیت باندھ لی۔ مولوی صاحب کی مصروفیت سے فائدہ اُٹھا کر بعض شر پسند عناصر نے سجدے کی حالت میں ٹوکرے سے ہاتھوں ہاتھ لڈو نکال نکال کر تقسیم کرنے شروع کردیے۔ اس کے ساتھ ہی چھینا جھپٹی اور ہنسی مذاق کا سلسلہ چل نکلا۔ مولوی صاحب نے تنگ آکر جلد از جلد نماز ختم کی اور ٹوکرے

اپنے ساتھ رکھ کر ختم پڑھنے لگے۔ ختم شریف کے بعد مولوی صاحب نے لڈو خوروں کو جہنم کی بشارت دی اور ان کی گردنیں فرشتوں سے تڑوا کر طلبا سے کہا کہ قطار بنائیں اور باری باری لڈو حاصل کریں۔ اب یہ ہوا کہ یار لوگ لڈو لے کر پھر قطار میں آن کھڑے ہوتے۔ کچھ دیر کے بعد جب مولوی صاحب کو اس حرکت کا احساس ہوا تو انہوں نے غصے سے لڈو تقسیم کرنے بند کر دیے اور باقی بچا ہوا ٹوکرا اُٹھا کر ہوسٹل کی جانب چل دیے۔

جونہی مولوی صاحب لڈوؤں کا ٹوکرا کمرے میں رکھ کر اسے تالا لگا کر اطمینان سے گھر کے لیے رخصت ہوئے، شرپسندوں نے میٹنگ بلائی جس میں طے پایا کہ بہر حال باقی ماندہ لڈوؤں کا بھی صفایا لازم ہے۔ تالے کو کھولنے کی کوششیں کی گئیں۔ لیکن وہ سخت جان نکلا۔ شاید جاتے ہوئے مولوی صاحب تالے پر لاحول ولا پڑھ گئے تھے۔ جب یہ ترکیب کامیاب نہ ہوئی تو فیصلہ کیا گیا کہ گوریلا پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے روشن دان پر حملہ آور ہوا جائے۔ روشن دان مناسب حد تک کھلا ہوا تھا اور اس سے کمرے میں داخل ہونا مشکل نہ تھا۔ ایک پھرتیلے نوجوان نے یہ مشن اپنے ذمے لے لیا اور اندر داخل ہو کر لڈو قسط وار روشن دان سے برآمدے میں منتظر دوستوں تک پہنچا دیے۔ یہ پہلے ہی فیصلہ ہو چکا تھا کہ مالِ غنیمت تقسیم کر کے کھایا جائے گا۔ اور اس پر جھپٹنے، پلٹنے، پلٹ کر جھپٹنے کا مظاہرہ نہیں کیا جائے گا تاکہ مشن کو قدرے خفیہ رکھا جا سکے۔

میں صبح ناشتے کی میز پر بیٹھا تھا تو مولوی صاحب ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے۔ چہرے پر خلافِ معمول رونق تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ رات کے لڈوؤں کی غذا نے مولوی صاحب کی صحت پر خوشگوار اثرات مرتب فرمائے ہیں۔ بیرے کو یہ کہہ کر چلے گئے کہ ناشتا کمرے میں پہنچا دو۔ میں یہ سن کر زیرِ لب مسکرایا کہ مولوی صاحب جس چیز کے لیے کمرے میں ناشتا منگوا رہے ہیں وہ تو ”ماما تیری مورنی کو چور لے گئے۔“ کا مصداق بن چکی ہے۔

ناشتے کے بعد کتابیں لینے کمرے میں آیا اور ابھی کتابیں کاپیاں ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور پھر مولوی صاحب نمودار ہوئے، چہرہ اترا ہوا تھا جیسے کسی بہت بڑے صدمے سے دوچار ہوئے ہوں۔ میں نے بمشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے چہرے پر سنجیدگی کا خول چڑھایا اور پوچھا، ”جی فرمائیے۔“ کہنے لگے، کسی دوزخی نے سارے لڈو چرا لیے حتیٰ کہ میرے ناشتے کے لیے بھی کچھ نہ چھوڑا اور نہ ہی محلے کے بچوں کے لیے، محلے سے ان کی مراد ان کی زوجہ

محترمہ تھیں جن کا بالغوں سے ذکر کرنا مولوی صاحب کے نزدیک ایک غیر شرعی فعل تھا۔ میں نے اظہارِ ہمدردی کیا اور وعدہ کیا کہ مجرموں کی نشاندہی کر کے ثوابِ دارین حاصل کروں گا۔ مولوی صاحب چند لمحوں کے لیے کچھ سوچتے رہے اور پھر کسی اور ہمدرد سے داستانِ غم یا 'لڈو آشوب' عرض کرنے چلے گئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد مولوی صاحب دوبارہ تشریف لائے۔ میں نے پوچھا، ''قبلہ کچھ پتا چلا؟'' رونی سی شکل بنا کر کہنے لگے، ''پتا کیا چلنا تھا، لڈوؤں کے ساتھ ساتھ میری باقی اشیا بھی غائب ہیں۔ کوئی بدمعاش تیل، صابن، تولیہ، سرمہ، کنگھی سب کچھ لے اُڑا۔ صرف استرا چھوڑ گیا ہے۔ میرے ہاتھ آئے تو اسی استرے سے میں اس کا سر مونڈ دوں گا۔'' میں نے مولوی صاحب کو تسلی دینے کی کوشش کی لیکن وہ چور پر لعنت کی آگ برساتے ہوئے اور قیامت کے روز فرشتوں کے ہاتھوں عمل میں آنے والی کارروائی کا ذکر کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد کالج کھلا اور میں جمعہ کی نماز ادا کرنے گیا تو مولوی صاحب نظر نہ آئے۔ کسی اور بزرگوار نے نماز پڑھائی اور ہم ہوسٹل واپس آ گئے۔

رات کے کھانے پر مولوی صاحب کا ذکر چھڑا تو میں نے پوچھا، ''مولوی صاحب کہاں ہیں؟ نظر نہیں آئے۔'' ایک باخبر طالب علم نے بتایا ''مولوی صاحب نے دوسری شادی کر لی ہے۔''

''کیا ہنی مون منانے گئے ہیں؟''

''ہنی مون کیا منائیں گے وہ شہر چھوڑ گئے ہیں۔''

''ہائیں! وہ کیوں؟''

''دراصل انہوں نے لڑکی کے والدین سے اجازت لیے بغیر اس سے شادی فرمائی تھی۔''

''افسوس ہم ان سے شادی کے لڈو نہ کھا سکے۔'' اسی طالب علم نے سرد آہ بھر کر کہا جس نے مولوی صاحب کے کمرے سے لڈو چرانے کا آپریشن مکمل کیا تھا۔

* * *

کہنا تھا کیا، کیا کہہ گئے!

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

منجملہ دیگر صفات کے، بڑے آدمیوں کا ایک وصف یہ ہے کہ ان کی غلطی بھی ان کی حیثیت اور مرتبے کے اعتبار سے بڑی ہوتی ہے۔ گزشتہ ہفتے ہماری ملاقات ایسی ہی ایک دانا و بینا اور معزز ہستی سے ان کے دولت خانے پر ہوئی۔ اتفاق سے ان کا تعلق ایک دینی جماعت سے ہے لہٰذا ہم ملاقات سے پہلے ہی ان سے کسی قدر مرعوب تھے۔ ہم یہ بھی عرض کر دیں کہ وہ سالہا سال سے ہمارے پڑوسی ہیں لیکن کچھ شہری زندگی کی 'برکتیں' اور کچھ علاقے کا مخصوص طرزِ رہائش، ہماری ان سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ ہمیں چوں کہ اجتماعی فلاح کے ایک کام کے سلسلے میں (جس میں صحت کے حوالے سے ہمارا اپنا مفاد بھی پوشیدہ تھا) ان کا تعاون درکار تھا لہٰذا گفتگو کے آغاز ہی میں ان کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے انہیں بتایا ''میں دل کا مریض ہوں اور میری 'ٹرپل بائی پاس سرجری' ہو چکی ہے۔'' موصوف نے پُر جوش انداز میں کہا، ''ماشاء اللہ!'' ایک لمحے کے لیے ہم اس ناگہانی اور بے محل پزیرائی پر بوکھلا اُٹھے لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ شاید یہ بات سمجھ نہیں پائے (اگرچہ اچھے خاصے پڑھے لکھے ہیں)۔ چنانچہ اپنی زوال پذیر صحت کے بارے میں انہیں مزید آگاہ کیا ''میری دو مرتبہ انجیو پلاسٹی بھی ہوئی ہے۔ اس طرح میرے دل پر تین دفعہ کام ہوا ہے۔'' انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ خشوع و خضوع کے ساتھ دوبار فرمایا، ''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ!'' ہم پھر بھی یہ گمان کر کے خاموش رہے کہ شاید انہوں نے طنز کیا ہے۔ (اگرچہ ہم، بزعم خود، طنز و مزاح کے میدان کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں)۔

اپنے امراضِ قلب پر اُن صاحب کی دل خراش داد و تحسین رولنے کے بعد ہم نے بہ صد احترام انہیں آگاہ کیا کہ ان کا ایک (غیر ارادی) طرزِ عمل اہلِ علاقہ اور خصوصاً ہمارے لیے مسلسل

تکلیف کا باعث بنا ہوا ہے کیوں کہ ہمارا گھر ان کے بالمقابل واقع ہے۔ یہاں ہمیں، بر سبیل تذکرہ، اپنے استاد مولانا محمود حسنؒ کا ایک قول یاد آیا۔ فرمایا کرتے تھے، ''لوگوں سے تعلقات کے ضمن میں 'عدم قصدِ ایذا' کافی نہیں بلکہ 'قصدِ عدم ایذا' لازم ہے۔'' یعنی ہم یہ کہہ کر اپنے کسی غیر پسندیدہ فعل سے بری الذمہ نہیں ہو سکتے کہ ''میرا مقصد آپ کو تکلیف پہنچانا نہ تھا'' بلکہ ہمارے ہر فعل میں یہ قصد یا ارادہ ضرور ہونا چاہیے کہ اس سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ بہر حال، ہم نے ان صاحب سے مودبانہ اپیل کی کہ وہ اپنی ایک مخصوص عادت پر نظر ثانی کر لیں۔ انہوں نے ہمسایوں کے حقوق کی اسلامی تعلیمات کا اعتراف کرتے ہوئے ہماری اپیل کو یکسر مسترد تو نہیں کیا لیکن مکمل تعاون کا یقین بھی نہیں دلایا۔ ہم نے پھر بھی مصالحانہ رویّہ اپنایا اور یہ سوچ کر خاموش ہو رہے کہ ''اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں''، البتہ اُٹھتے وقت انہیں دبے الفاظ میں احساس ضرور دلایا کہ انہوں نے ہماری صحت کے بارے میں ہمدردی یا تشویش کے دو کلمات کے بجائے اُلٹا 'ماشاءاللہ' کہہ کر گویا اس کیفیت کو سراہا ہے۔ اس پر وہ تنک اُٹھے۔ بولے، ''اور کیا سبحان اللہ کہتا؟'' ہم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی، ''جناب، آپ صرف اللہ خیر کرے کہہ دیتے تو مجھے اطمینان حاصل ہو جاتا۔'' کہنے لگے، ''یہ آپ کا طریقہ ہوگا۔''

اب ہم جان گئے کہ اتنی عمر، تعلیم، تجربے، سماجی مرتبے اور دینی جماعت سے وابستگی کے باوجود یہ بے چارے نہ صرف اس بات سے لاعلم ہیں کہ ماشاءاللہ کا استعمال کہاں کیا جاتا ہے بلکہ یہ اپنی اصلاح پر آمادہ بھی نہیں۔ پھر انہوں نے اپنی بات میں مزید زور پیدا کرنے کی خاطر مثال دی، ''خوب صورت بچے کو دیکھ کر کہتے ہیں نا، ماشاءاللہ!'' عرض کیا، ''لیجیے، آپ نے خود ہی مسئلہ حل کر دیا، خوب صورت بچے کو دیکھ کر کہتے ہیں، ماشاءاللہ یعنی اللہ نظر بد سے بچائے اور بچے کے حسن میں اضافہ کرے۔'' ہم نے انہیں مزید برانگیختہ کرنا مناسب نہ سمجھا ورنہ ہم بھی مثالیں دیتے کہ اگر کوئی شخص کسی کو بتائے کہ میری والدہ کی طبیعت اور بگڑ گئی ہے تو کیا سننے والا اس پر کہے گا، ماشاءاللہ؟ اگر کوئی افسردہ چہرے کے ساتھ ہمیں مطلع کرے کہ اس کا بیٹا دوسری بار بھی امتحان میں فیل ہو گیا ہے تو کیا ہم 'ماشاءاللہ' کہہ کر اس کے زخموں پر نمک پاشی کریں گے؟ اس لیے کہ ماشاءاللہ میں اظہار مسرّت کے ساتھ ساتھ دعا کا تاثر بھی پایا جاتا ہے۔ چند منٹ وہاں ٹھہر کر ہم اُٹھ کھڑے ہوئے کیوں کہ وہ بضد رہے کہ تین بار دل سے چھیڑ چھاڑ پر ماشاءاللہ سے بہتر کوئی

’کلمۂ خیر‘ نہیں ہو سکتا۔

گو ہماری عمر اَب ستر سے تجاوز کر چکی ہے۔ واجبی سی تعلیم بھی حاصل کی ہے، بہت محدود مطالعہ بھی ہے اور لکھنے کا روگ تو گزشتہ چھ عشروں سے پال رکھا ہے لیکن بیماری یا تکلیف کے ذکر پر ماشاء اللہ کا تبصرہ اور اس پر ایک صاحب بصیرت کے پُر اعتماد اصرار نے ہمیں مجبور کر دیا کہ حقائق کی تلاش کے لیے تھوڑی بہت تحقیق کریں۔ ہم نے سب سے پہلے فرہنگ آصفیہ سے رجوع کیا جو اُردو کی مستند ترین لغت ہے۔ جہازی سائز کی چار جلدوں پر مشتمل اس ضخیم لغت کو مولوی سیّد احمد دہلوی نے نظام حیدر آباد دکن کی ایما پر 1908ء میں مرتب کیا تھا۔ اس لغت کی جلد چہارم کے صفحہ نمبر 261 پر ’ماشاء اللہ‘ کے آگے یہ معنی درج ہیں: ”چشمِ بد دور، خدا چشمِ زخم اور چشمِ بد سے محفوظ رکھے۔ کیا کہنا۔“ لغت میں اس ’کلمہ تحسین‘ کے ذیل میں یہ شعر دیا گیا ہے:

ظاہر میں تو ایسے ہیں کہ ماشاء اللہ
سب یہ کہتے ہیں زیادہ ہوں گے انشاء اللہ

کسی کو نظر بد سے بچانے کی دعا اسی وقت دی جاتی ہے جب اس کی کوئی کیفیت دوسروں کے لیے باعث رشک / حسد ہو۔ یا دوسرے ایسا ہونے کی حسرت کریں۔ تو کیا کوئی ذی شعور یہ حسرت کر سکتا ہے کہ اس کے دل کی ’بار بار مرمت ہو؟‘ کیا اس کا یہ حال سن کر ماشاء اللہ کہنے والا (غیر ارادی طور پر سہی) اس کے مصائب میں اضافے کے لیے دعا گو نہیں ہے جیسا کہ مثال میں دیے گئے مندرجہ بالا شعر سے ظاہر ہے؟ پھر ہم نے دور حاضر کی سب سے معتبر لغت (جو حکومت پاکستان کے ایک ادارے ’اُردو لغت بورڈ‘ نے 22 جلدوں میں تاریخی اُصولوں پر مرتب کی ہے) سے رجوع کیا۔ اس کی جلد ہفت دہم (17) کے صفحہ نمبر 117 پر ’ماشاء اللہ‘ کے سامنے یہ معنی لکھے ہوئے ہیں، ”کلمۂ تحسین و آفرین، خدا کے فضل سے، خدا کی رحمت سے، خدا کی مدد اور تائید سے۔“ مثالوں میں یہ جملے دیے گئے ہیں:

- تم ماشاء اللہ نہایت عقل مند ہو اور میری سب سے بڑی مشیر سلطنت ہو۔ (عبدالحلیم شرر، ’مینا بازار‘) اور
- جب سے لڑکی ماشاء اللہ سیانی ہوئی ان کا گھر چوراہا بن گیا ہے۔ (”بیگماتِ شاہانِ اودھ“)

’ماشاء اللہ‘ کے لغوی معانی، مثالوں اور عام استعمال سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے خوبی اور خوش بختی کی تعریف کی جاتی ہے نہ کہ تکلیف اور بد بختی کی توصیف!

جس دینی جماعت سے مذکورہ بالا ممتاز شخصیت کا تعلق ہے وہ وقتاً فوقتاً اپنے کارکنوں کے لیے تربیتی کورس منعقد کرتی ہے۔ ہماری مخلصانہ تجویز ہے کہ اگلے کسی کورس میں بسم اللہ، الحمدللہ، استغفراللہ، سبحان اللہ، ماشاءاللہ، الا ماشاءاللہ، واللہ، للہ، اللہ حافظ، حاشااللہ، حاشاوکلا، حاشارحمٰن، جزاک اللہ، بارک اللہ، یرحمک اللہ، انشاءاللہ، معاذ اللہ، نعوذ باللہ، بحمداللہ، فی امان اللہ، الاماں الحفیظ، اناللہ وانا الیہ راجعون، لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم، اللہ الغنی، اللہ اللہ خیر سلاّ، خدانخواستہ، خدا بخشے، خدا کرے، خدا خدا کرکے، خداداد، خدارا، جیسے محاورات اور عام گفتگو کے کلمات کو بھی نصاب کا حصہ بنایا جائے ورنہ وابستگانِ جماعت کی طرف سے ان کے غلط استعمال پر عام لوگ یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ:

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

* *

اِک قصّہ ٔ پارینہ!

ڈاکٹر عابد علی

عشق و محبت کا دل سے تعلق اب قصہ ٔ پارینہ ہو چکا ہے۔ جس طرح شاعر و ادیب کبھی اپنے محبوب کو چاند سے تشبیہ دیا کرتے تھے، لیکن جب سے انہیں چاند کی حقیقت کا علم ہوا ہے، انہوں نے چاند ہی کو اپنی شاعری سے خارج کر دیا ہے۔ آج عشق و محبت، بہادری اور بزدلی سب کا تعلق دل سے نہیں، بلکہ دماغ سے جوڑا جا رہا ہے۔ تازہ خبر یہ ہے کہ امریکا نے فروخت کے لیے مصنوعی دل تیار کر لیے ہیں۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب تو ایک بار کہہ بھی گئے تھے کہ ”لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور۔“ اگر آج غالبؔ زندہ ہوتے تو اُنہیں اس بات پر یقین نہ آتا کہ ان کی کہی ہوئی بات سچ ثابت ہو چکی ہے۔ ان مصنوعی دلوں سے زندہ رہنے کا دورانیہ صرف 215 دن ہے۔ ممکن ہے، مستقبل میں مزید دنوں یا سالوں کا اضافہ ہو جائے۔ ہم ایشیائی ممالک کے لوگ تو ابھی تک اوریجنل دلوں کا ہی کاروبار کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو قسطوں پر بھی:

سنا ہے لے رہے ہو گھر کا تم سامان قسطوں پر
یہ میرا دل بھی حاضر ہے بہت آسان قسطوں پر

عاشقوں کا تجزیہ کیا جائے تو اُن میں دو اقسام پائی جاتی ہیں۔ ایک وہ، جن کے لیے ایک ہی بار دل لگانا عذاب بن جاتا ہے اور اُن کے لیے زندگی بھر کے لیے ایک ہی محبت کافی ہوتی ہے۔ دوسری قسم کے عاشق دل پھینک ہوتے ہیں۔ ایک جگہ جی بھر جائے تو دوسرے بام و در پے تاکنے شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی قدر و قیمت جاننے والے اتنے کارڈیک سرجن نہیں، جتنے شاعر ہوتے ہیں، یہاں تک کہ شاعر بغیر دل کے بھی زندہ رہ لیتے ہیں۔ مثلاً:

جو بھی تھا حسبِ حال رکھا تھا
ہم نے دل ہی نکال رکھا تھا

ویسے یہ دوسرے کے دل بھی اپنے پاس بطور امانت رکھ لیتے ہیں۔ شاعروں کو اپنا، ا

دوسروں کا دل ہر حال میں رکھنا پڑتا ہے، کیوں کہ شاعری بے دلی سے کی ہی نہیں جا سکتی۔ کبھی یہ دل کو دریا، سمندر، صحرا، پھول، باغ، قریہ، بستی، صحن، گھر، رستہ، گلی وغیرہ کہنے پر مجبور ہوتی ہے۔ کبھی شعرا کا دل دیکھتا بھی ہے اور سنتا بھی ہے، یعنی آنکھ اور کان بھی رکھتا ہے۔ گویا شعری زبان کے کسی بھی خانے میں اور شعری منطق کی کسی بھی سطح پر اِسے بڑی چابکدستی سے فِٹ کر دیا جاتا ہے۔ یہ دل ایسا معصوم ہے کہ خوشی خوشی سب کچھ بن جانے پر تیار۔ اپنے خلاف، اپنے حق میں، چپ چاپ ہر دلیل پر راضی۔ اور جب کوئی پُرسانِ حال نہ ہو تو کسی سے بھی اپنا حال کہنے پر آمادہ۔ چنانچہ پرانے زمانے سے شعرا اور عاشق، پنجروں میں بند پرندوں ہی کو اپنے دل کے قریب محسوس کرتے ہیں اور اپنا سارا کچا چٹھا انہیں سنا کر دل ہلکا کر لیتے ہیں۔

دل کے حوالے سے تاریخ میں ایک تیر انداز مشہور ہے، جس کا نام 'کیوپڈ' تھا۔ وجۂ شہرت یہ تھی کہ اُس کا چلایا ہوا تیر دل میں پیوست ہو جاتا تھا۔ آج کل کے ناکام عاشق چٹھیاں بھیجتے وقت اُسی کیوپڈ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ ہمارے ادب میں دل کے حوالے سے کئی محاورے استعمال ہوتے تھے، کچھ اب بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً، دل آب آب ہونا، دل آزاری کرنا، دل اچاٹ ہونا، دل باغ باغ ہونا، دل برداشتہ ہونا، دل بھر آنا، دل پتھر کا ہونا، دل پر سانپ لوٹنا، دل جل کر کباب ہونا، دل چُرانا، دل جلانا، دل ڈانواں ڈول ہونا، دل سے اُترنا، دل کا ٹکڑا اور دل کو دل سے راہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔ اب کچھ شعرا کی بھی سن لیں:

ناتوانی سے غمِ ہجر کی ایسے بیٹھے
اُٹھے دنیا سے مگر دل نہ ہمارا اُٹھا

◆

وہ اس ادا سے دھڑکن کو تول لیتا ہے
ملائے ہاتھ تو دل کو ٹٹول لیتا ہے

◆

وہ جو دل توڑ گیا، چھوڑ گیا مدت سے
یاد کیوں آتی ہے عابدؔ اسی ہرجائی کی

◆

مجھ میں عدو میں تم سے بھی بڑھ کر پیار ہے
دل سے نہ ہو وہ نام کو تم پر نثار ہے

◆

انور احمد علوی

اچھا نہیں جو راز تپ عشق فاش ہو
اے نبض دل کی بات نہ کہنا طبیب سے

○

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

○

دل تو میرا اُداس ہے ناصؔر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

○

ابھی زخمِ نو کا شمار کیا ابھی رُت ہے دل کے سنگھار کی
ابھی اور پھوٹیں گی کونپلیں ابھی اور کھلنے گلاب ہیں

○

حالِ دل کہتے تھے جن سے چل بسے وہ ہم خیال
اجنبی سے لوگ ہی اب رازداں ہونے لگے

○

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا
یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں

○

کاش! ہر فرد اِس مرضِ دل سے محفوظ رہے، ورنہ پھر کہیں میؔر کی طرح یہ نہ کہنا پڑ جائے:

”دیکھا اِس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا“

* *

یہ نہ تھی ہماری قسمت...

ڈاکٹر عابد معز

وطن سے خطوط آتے ہی رہتے ہیں، لیکن اس مرتبہ بیگم کا عجیب و غریب خط آیا۔ ایسا خط انہوں نے پہلے کبھی نہیں لکھا تھا۔ خط کیا تھا، معمہ تھا۔ معمہ حل کرنے کے لیے میں نے خط کو ایک مرتبہ پڑھا، دوسری بار غور سے پڑھا، پھر پڑھا اور پھر بار بار پڑھتا ہی چلا گیا۔ باتیں اور جملے ذہن سے چمٹ کر رہ گئے اور وقفہ وقفہ سے مجھے پریشان کرنے لگے۔ لکھا تھا:

”آخر مجھ میں کیا کمی تھی آپ نے ایسا کیوں کیا؟ میں اپنی مرضی سے آپ کو چھوڑ کر نہیں آئی۔ بچوں کی خاطر بہت سوچ سمجھ کر ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ پھر آپ اتنی جلدی کیوں پریشان ہو گئے؟ اگر تنہائی ستانے لگی تھی تو نوکری چھوڑ کر آ جاتے، یا ہمیں بلا لیتے۔ ہم آپ کے بغیر خوش ہیں... ہر آتی جاتی سانس میں مَیں آپ کو یاد کرتی ہوں۔ ہر لمحہ آپ کا چہرہ میرے سامنے رہتا ہے اور آپ کی آنکھیں میرا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ یہ وہی معصوم چہرہ ہے، جو ہر دم اور ہر پَل اپنی وفا کا اقرار کرتا رہتا تھا۔ کیا آپ کو وہ عہد و پیماں بھی یاد نہیں آئے! پپو آسمان میں اُڑتے جہاز کو دیکھ کر کہتا ہے کہ ڈیڈی اِس پلین سے گھر آ رہے ہیں۔ رانی بٹیا ہر وقت آپ کو یاد کرتے ہوئے تصور میں آپ کو دیکھتی رہتی ہے۔ ڈیڈی اِس وقت دفتر میں ہوں گے... آپ کو معصوم بچوں کا بھی خیال نہیں رہا۔ اب مَیں ان سے کیا کہوں۔ وہ میری پریشانی اور رونے کا سبب دریافت کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کیسے بتلاؤں کہ آپ نے ہم پر کیا ظلم ڈھایا ہے۔“

دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامے سوچنے لگا کہ آخر مَیں نے ایسا کون سا کارنامہ انجام دیا ہے، جس کے سبب بیگم کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی ہے اور بچوں پر ظلم ہوا ہے۔ مَیں نے ایسا کون سا کام کیا ہے، جسے بیگم بچوں کو بتلا نہیں سکتیں۔ سعودی عرب کے ریگِ رواں کا تنہا مقابلہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ کفیل، اقامہ اور شورطہ کے مسائل سے نبرد آزما ہونا، مجنوں کی صحرا نوردی سے کم نہیں

لگتا۔ بیگم اور بچوں کے بغیر بتائی مَیں اپنی پچھلی دو سالہ زندگی کا ایک ایک دن یاد کرنے لگا۔ کھا پکانا، برتن مانجھنا، کپڑے دھونا، دفتر جانا، ٹیلی ویژن گھورنا، بے خوابی کی نیند سونا اور ویک اینڈ پر 'تفریح' کے نام پر دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرنا، فلمیں دیکھنا، کبھی کبھار شاپنگ کرنا، مشاعروں اور اَدبی محافل میں شریک ہونا، مختلف منصوبوں اور تجاویز پر لاحاصل بحث کرنا اور احباب کو چھوڑنے اور وصول کرنے ایئرپورٹ جانا۔ یہی تو یہاں پر میرے جیسے 'غریب الوطن' اور بعید العیال' لوگوں کی زندگی ہے۔ اس معمول سے ہٹ کر مَیں نے کچھ بھی تو نہیں کیا ہے۔ کہیں تاک جھانک کی ہے اور نہ ہی کوئی دیوار پھاندنے کا سوچا ہے۔ یہاں پر تو اِس قسم کے مواقع ہی میسر نہیں ہیں۔ یہاں کنواروں کے گھر الگ، اُن کے تفریحی حصے جدا ہیں۔ عوامی مقامات پر بھی اُن کی جگہ مختلف ہوتی ہے۔ یہاں 'چھڑے' دراصل اچھوت ہیں۔ اسی لیے اکثر بیویاں سَوت کے خطرے سے بے نیاز ہو جاتی ہیں اور بہت آسانی سے اپنے شوہروں کو دیوانہ بنا کر صحرا میں مجنوں کی طرح بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتی ہیں۔

بیگم کے خط کے ساتھ چچا جان کی چٹھی بھی تھی۔ چٹھی میں بزرگوار مجھ سے سخت ناراض دکھائی دے رہے تھے۔ اپنی ناراضگی کا انہوں نے سلیقے سے یوں اظہار کیا:

''میاں! تمہاری فرمانبرداری کی مثال ہم فخر سے تمہارے چھوٹوں کو دیا کرتے تھے۔ یہ تمہاری عادت رہی تھی کہ معمولی سے معمولی بات پر تم ہم سے مشورہ لیتے تھے۔ مشورے کا صرف نام ہوتا، ہمارے کہنے کو تم حکم سمجھتے تھے، لیکن اس مرتبہ تم نے اپنے بزرگوں سے صلاح و مشورہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اگر تمہیں اپنی بیوی سے شکایت تھی تو مسئلے کو خاندان والوں کے سامنے رکھتے۔ ہم بڑے بزرگ (معلوم نہیں اب تم ہمیں ایسا سمجھتے بھی ہو یا نہیں) خاندانی انصاف پسندی کی روایت کے مطابق تمہارے ساتھ زیادتی نہ ہونے دیتے۔ تمہاری بیوی میں ہمیں تو کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ خوب صورت اور خوب سیرت ہے۔ پتا نہیں، کس کی باتوں میں آ کر تم نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا اور اپنی بیوی بچوں پر ظلم کے مرتکب ہوئے۔''

سب کچھ ہو جانے کے باوجود چچا جان مجھ سے مایوس نہیں تھے۔ انہوں نے مزید لکھا:

''ہمیں یقین نہیں آتا کہ ایسا ہوا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ہمارا اُبھروسا سلامت رہے۔ اگر ایسا ہوا بھی ہے تو تم اپنی بیوی اور بچوں سے غفلت نہ برتنا، اُن سے وہی سلوک روا رکھنا، جس کے

مستحق ہیں اور ہاں، انصاف کا دامن کبھی نہ چھوڑنا۔“

میں حیران اور پریشان کہ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ آخر میں نے کیا کیا ہے۔ میرے اور بیگم کے درمیان ایسا کون سا مسئلہ درپیش تھا، بلکہ اب بھی موجود ہے، جسے حل کرنے کے لیے میں نے بزرگوں سے مشورہ کیے بغیر اور خود غرضی سے کام لیتے ہوئے اپنی بیوی اور بچوں پر ظلم ڈھایا ہے۔ بہت سوچا کہ کیا بات ہو سکتی ہے۔ کیا میں نے اپنی دولت جوئے میں ہار دی ہے، یا کسی پر لٹا دی ہے۔ کیا میری جمع پونجی کسی بینک میں ڈوب گئی ہے۔ کیا میری کمائی بیوی اور بچوں کو نہیں مل رہی ہے اور گھر والے تنگدستی کا شکار ہیں۔ کیا میں اُن کی طرف سے غافل ہو گیا ہوں اور انہیں حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ تھک ہار کر میں نے بیگم کو فون کیا۔ سلام دعا کے بعد ”کیسی ہو؟“ پوچھنا غضب ہو گیا۔ بیگم زار و قطار رونے لگیں۔ میری پریشانی بڑھ گئی۔ پیشانی پر نمودار ہونے والے پسینہ کو پونچھتے ہوئے میں نے دریافت کیا، ”خدارا مجھے بتلاؤ، ہوا کیا ہے؟“

بیگم نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا، ”کچھ نہیں، سب خیر ہے۔“

میں پریشانی میں مختلف سوالات کرنے لگا، ”کیا کسی کا انتقال ہوا ہے؟ کیا کوئی حادثہ کا شکار ہوا ہے؟ کیا کوئی بیمار ہے؟ کیا کسی سے لڑائی ہوئی ہے؟ کیا گھر میں چوری ہوئی ہے، کیا پلاٹ پر کسی لینڈ گرابر، یا فلیٹ پر کرائے دار نے قبضہ کر لیا ہے؟“ سب سوالوں کے جوابات نفی میں ملے تو میں نے گھبراہٹ میں نام بنام بچوں اور قریبی رشتہ داروں کے متعلق پوچھا۔ جواب ملا، ”سب خیریت سے ہیں، بس میری قسمت... “ ٹھنڈی آہ کے ساتھ بیگم پھر رونے لگیں۔

جھنجلا کر میں فون پر دھاڑا، ”آخر مجھے بتلاتی کیوں نہیں کہ ہوا کیا ہے۔ تمہارا خط ملنے کے بعد سے سخت پریشان ہوں۔“

جواب ملا، ”آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ آپ کی خوشی ہی میری خوشی ہے۔“

میں نے اسی سختی سے پوچھا، ”میری خوشی میں اگر تمہاری خوشی ہے تو پھر یہ رونا دھونا کیا۔“

”سب کچھ لُٹ جانے پر کیا رونا نہیں آتا۔ اب یہ رونا دھونا تو زندگی بھر کا ہے۔“ محسوس ہوتا تھا کہ بیگم آنسوؤں کو بمشکل ضبط کر پا رہی ہیں۔

صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ میں نے فون پر چیخ کر غصہ سے سوال کیا، ”تم بتلاتی کیوں نہیں کہ میں نے کیا کیا ہے؟“

بیگم نے بھرائی آواز میں جواب دیا، ''آپ نے جو کیا، ٹھیک ہی کیا ہے۔ آپ غصہ نہ کریں اور نہ پریشان ہوں۔ آپ کی خوشی میں ہم سب کی خوشی ہے۔''

''پھر وہی بکواس، میری خوشی میں تمہاری بلکہ ہم سب کی خوشی ہے! کیا؟''

''ایسے پوچھ رہے ہیں، جیسے جانتے نہیں ہیں۔'' بیگم نے جواب دیا۔ چلیے میں ہی پوچھ لیتی ہوں۔ کیسی ہے وہ؟ کیا نام ہے؟ کہاں کی رہنے والی ہے؟ عمر کیا ہے؟ پڑھی لکھی تو ہوگی؟ رنگ کیا ہے؟ بال کیسے ہیں؟ آپ ہمیشہ سے میرے چھوٹے قد کو ناپسند کرتے رہے ہیں۔ وہ لانبی تو ہوگی؟ اُسے ساتھ لے کر گھومنے میں آپ کو اَب شرمندگی نہیں ہوگی۔ وہ آپ کا خیال تو رکھتی ہوگی۔ کیا وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے؟ کیا آپ اُسے مجھ سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔'' بیگم نے جواب میں سوالوں کی بوچھار کردی۔

چند لمحوں کے لیے مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ خیال کیا کہ بیگم ہیجانی کیفیت میں کچھ کا کچھ کہہ رہی ہیں۔ لیکن اب مطلع صاف ہونے لگا تھا۔ اطمینان ہوا کہ خطرناک حالات درپیش نہیں ہیں۔ مَیں نے پُرسکون لہجے میں استفسار کیا۔ ''کون کیسی ہے؟''

''خدارا! اتنے بھولے بن کر میرے زخموں پر نمک تو نہ چھڑکیے۔'' بیگم نے التجا کی۔

''یقین کرو۔ تمہاری باتیں میرے پلے نہیں پڑ رہی ہیں۔ تم کس کی بات کر رہی ہو؟'' مَیں نے پھر سوال کیا۔

''آپ کی دوسری...'' اتنا کہہ کر بیگم پھر رونے لگیں۔

''دوسری کون...؟'' مَیں نے شرارتاً وضاحت چاہی۔

''میری سَوت!'' بیگم نے روتے ہوئے جواب دیا۔

مَیں نے آرام سے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا، ''کاش! یہ سچ ہوتا۔ اِس شریف آدمی میں اتنی ہمت کہاں ہے کہ وہ دوسری بیوی کو برداشت کر سکے۔ یوں بھی آپ کے ہوتے ہوئے دوسری کی کیا ضرورت ہے۔ آپ ہی بہت، بلکہ بہت زیادہ ہیں۔ دوسری کے بارے میں مَیں سوچ بھی نہیں سکتا۔ مطمئن رہیے، مَیں صرف اور صرف آپ ہی کا ہوں۔''

''دل رکھنے کے لیے آپ باتیں خوب کرتے ہیں۔ انہی باتوں کے چکر میں مَیں آپ کو سمجھ نہ پائی۔ خیر، جو ہو چکا سو ہو چکا۔ مجھے سوت قبول ہے۔ بس آپ خوش رہیے اور اُسے بھی خوش رکھیے۔

میری جانب سے اُسے شادی کی مبارک باد دیجیے اور کہیے کہ آپ کا خیال رکھے۔ وقت پر کھانا اور دوائیں کھلائے...“ اتنا کہہ کر بیگم فون بچوں کے حوالے کر کے مزید رونے کے لیے چلی گئیں۔

بات بالکل صاف ہو چلی تھی۔ بیگم کے مطابق اُن کی غیر موجودگی اور اپنی تنہائی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے مَیں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ بیگم کا رونا دھونا اصل سَوت کا غم ہے۔ چچا جان کو دوسری شادی کرنے سے پہلے اُن سے مشورہ نہ کرنے کا دُکھ ہے، جب کہ میرا غم اِن دونوں سے الگ اور عجیب قسم کا درد ہے۔ غمِ روزگار کا بوجھ اُٹھائے تنہا اپنوں سے دُور پڑا ہوا ہوں۔ دُوری اپنوں سے محبت کی چنگاری کو بھڑکا دیتی ہے۔ ایسے حال میں کہاں اور کس سے دل لگے۔ کبھی کسی سے دل لگانے کا خیال آیا بھی تو اِس سے پہلے شورطہ کا ہاتھ گریبان کی جانب بڑھتا دکھائی دیتا ہے، یا پھر مطوّع کی بید ہوا میں لہرانے لگتی ہے۔ اِن حالات سے پرے نظر، میرا دل اپنے پاس ہے کہاں؟ مَیں اِسے ہزاروں میل دُور اپنوں کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ تو پھر یہ دوسری شادی کی افواہ اُٹھی کیسے اور بیگم تک کیوں کر پہنچی؟ کسی نے بیگم کو بیوقوف بنایا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میرے کسی دوست کی شرارت ہو۔ بیگم کو چاہیے تھا کہ پریشان ہونے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیتیں، لیکن بیگم نے اپنا اور میرا تماشا بنا دیا۔

بیگم کو مزید مضطرب ہونے سے بچانے اور حقیقت جاننے کے لیے مَیں نے پھر فون کیا اور صفائی پیش کی، ”بیگم! مَیں نے دوسری شادی نہیں کی ہے۔ میری ایک ہی شادی ہوئی ہے اور وہ بھی بڑے بزرگوں نے دھوم دھام سے تمہارے ساتھ کی تھی۔ تمہیں بھی یاد ہوگا۔ وداعی کے وقت تم اسی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں، جس طرح اب رو رہی ہو۔ میرے لیے یہی ایک شادی کافی ہے۔ میرا دوسری شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اگر کبھی سوچا تو سب سے پہلے تمہیں بتلاؤں گا۔ مجھے لگتا ہے کسی نے تمہیں بیوقوف بنایا کہ مَیں نے دوسری شادی...“

”مجھے کسی اور نے نہیں، آپ نے بیوقوف بنایا ہے اور آپ ہی نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔“ بیگم نے میری بات کاٹی۔ ”آپ نے سوچا ہوگا کہ مَیں کیا کر لوں گی۔ دو چار دن رو دھو کر خاموش ہو جاؤں گی۔“ پھر ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں، ”سب آپ کے پلان کے مطابق ہی ہو رہا ہے۔“

مَیں نے نرمی سے بیگم کو سمجھایا، ”فرضی سَوت کے بارے میں سوچ کر کیوں ہلکان ہو رہی

ہو۔ میری بات کا یقین کرو۔ اچھا یہ بتلاؤ تمہیں کس نے کہا ہے کہ مَیں نے شادی کی ہے، مَیں اُسی سے تردید کراؤں گا۔"

جواب ملا، "مَیں کانوں کی کچی نہیں ہوں۔ لوگ اگر کہتے تو مَیں کبھی یقین نہ کرتی۔ شادی کی اطلاع خود آپ نے دی ہے!"

"مَیں نے...؟؟" مَیں نے حیرت سے استفسار کیا۔

"جی ہاں! آپ نے اپنے ہاتھوں سے یہ خوشخبری تحریر کی ہے۔" بیگم نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جو کام مَیں کر نہیں سکتا، اس کی اطلاع تمہیں کیسے دے سکتا ہوں۔" مَیں نے صفائی پیش کرنے کے ساتھ دعویٰ کیا۔

"اِسے چوری اور سینہ زوری کہتے ہیں۔" بیگم نے طنز کیا۔

"اچھا بتاؤ مَیں نے کب اور کیا لکھا ہے؟" مَیں نے مسئلہ کا حل رکھا۔ "آپ نے لکھا ہے، میں نے نیا عقد کیا ہے، اس لیے چھٹی پر نہ آسکوں گا۔ ظاہر ہے کہ چھٹی میں نئی بیوی کے ساتھ ہنی مون پر جائیں گے۔ مجھے تو ہنی مون پر نہیں لے گئے، لیکن اُسے ضرور لے جایئے۔ میری طرف سے آپ دونوں کو اجازت ہے..."

مَیں ہنسنے لگا تو بیگم کہنے لگیں، "آپ کو اپنی کامیابی پر یوں ہی خوش ہونا چاہیے۔"

مَیں نے ہنسی روک کر کچھ کہنے کی کوشش کی تو بیگم نے کہا، "اب آپ مجھے بہلانے کے لیے کہیں گے کہ مَیں نے یوں ہی مذاق کیا ہے، لیکن مَیں جانتی ہوں، بات سنجیدہ ہے۔" بیگم کی آواز رندھ گئی۔

مَیں نے ٹیلی فون کا ریسیور اپنے سر پر دے مارنا چاہا، لیکن کیا فائدہ۔ دیارِ غیر میں تیمارداری کے لیے کوئی اپنا بھی تو نہیں ہے اور پھر یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ ایک اور عقد ہوتا اور دوسری بیوی خیال رکھنے کے لیے موجود ہوتی! مَیں نے بیگم کو سمجھایا۔ "یہ 'عقد' وہ 'عقد و نکاح' والا نہیں ہے، جس میں دلہن کو بیاہ کر لایا جاتا ہے۔ یہاں 'عقد' سے مُراد 'عقد العمل' یعنی 'جاب کنٹریکٹ' ہے۔ میرے جملے کا آسان ترجمہ یوں ہے کہ مَیں نے نئی نوکری کر لی ہے۔ نئے دفتر میں اتنی جلدی چھٹی نہیں مل

سکتی۔ پورے گیارہ مہینوں کی قید با مشقت کے بعد ایک ماہ کی چھٹی نصیب ہوگی، اس لیے میں وطن نہیں آسکتا، لیکن تم نے سوچ لیا کہ مَیں نئی دلہن کے ساتھ ہنی مون پر...“

”سچ... آپ نے شادی نہیں کی! کھایئے میری قسم...“ بیگم خوشی سے چیخ پڑیں۔

”خدا کی قسم، مَیں نے دوسرا عقد نہیں کیا ہے (پھر دوسری ہی سانس میں تصحیح کردی) یعنی دوسری شادی نہیں کی ہے۔“

* * *

خاندانی حکیم

ڈاکٹر محمد محسن

”چلو یار تمہیں ایک خاندانی حکیم سے ملاتے ہیں۔ سند یافتہ تو نہیں ہے، لیکن تجربہ ہے۔ صدری نسخے ہیں۔ خوب چلتی ہے۔ ایک جمِ غفیر لگا رہتا ہے مطب میں۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے لوگ آ کر فیض حاصل کرتے ہیں۔ جانتا ہوں، تمہیں حکیموں سے للّٰہی بغض ہے، عداوت ہے۔ چڑ ہے، لیکن ان سے ملو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔ یار پیشے کی بنیاد پر کسی سے عداوت کوئی اچھی بات نہیں۔ اُٹھو چلو بھی۔“ ڈاکٹر اصغر نے زور دیتے ہوئے کہا، ”اچھا بھئی چلو چلتے ہیں۔ ہمیں کسی سے چڑ نہیں، نہ حکیموں سے چڑ ہے، نہ ویدوں سے۔ چڑ ہے تو بس جعل سازوں سے، دھوکے بازوں سے، مکاروں سے۔“

پہلی ہی ملاقات میں اندازہ ہو گیا کہ اگر اُن سے نہ ملتے تو نہ جانے کتنے اہم رازوں سے محروم رہ جاتے۔ جب ہم مطب پہنچے، ان کے اُٹھنے کا وقت ہو رہا تھا۔ آخری مریض ایک بوڑھی خاتون تھیں، اپنے بیٹے کے ساتھ آئی تھیں۔ بیٹا کسی میڈیکل کالج میں سال سوم کا طالب علم تھا۔ بڑی عقیدت و احترام سے دکھا رہا تھا۔ والدہ کو پیشاب کی تکلیف تھی، کھل کر نہ ہوتا تھا، رک رک کر ہوتا تھا۔ کئی دنوں سے پریشان تھیں۔ حکیم صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا، بڑے انہماک سے دیکھتے رہے۔ نبض پر ہاتھ رکھے رکھے فرمانے لگے، ”رئیس میاں! میرا خیال ہے ان کا پروسٹیٹ بڑھ گیا ہے۔ دوا زیادہ کام نہیں کرے گی۔ مجھے بھی یہی تکلیف ہو گئی تھی، رُک رُک کر پیشاب آتا تھا۔ دوائیں کام نہیں آتی تھیں۔ آپریشن کرا لیا۔ خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ہوں۔ ان کا بھی آپریشن کرا دیں، ان شاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“ رئیس میاں بولے، ”لیکن یہ تو خالص مردانہ بیماری ہے“ حکیم صاحب فرمانے لگے، ”میاں یہاں سب ممکن ہے۔“ ان کی اس حیرت انگیز تشخیص پر ہمارے کان کھڑے ہوئے، اور اُن سے فیض یاب ہونے کے لیے دل میں ایک اُمنگ سی پیدا ہوئی۔

فارغ ہوتے ہی ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ یہ جان کر وہ بہت خوش تھے کہ ہم بھی پیشۂ طب سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اور بات تھی کہ ان کا تعلق پیشۂ طبِ مشرق سے تھا اور ہمارا طبِ مغرب سے۔ رسمی تعارف کے بعد فرمانے لگے، ”ڈاکٹر صاحب! بڑا خراب زمانہ آگیا ہے۔ لوگوں نے طب جیسے عظیم علم کو چہار دیواری میں محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ چار سالہ کورس کر لیا اور بن گئے طبیب۔ نہ کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا، نہ کسی کے مطب پر عطاری کی۔ کام کے نسخے تو سینے میں دفن ہوتے ہیں۔ کتابوں میں بھلا کہاں ملنے لگے۔ برسوں کسی حاذق وقت کی خدمت کرو، تب کہیں چند صدری نسخے ہاتھ آتے ہیں۔ ایک ایک نسخے کے لیے کوسوں سفر کرنا پڑتا ہے۔ اب ہمیں دیکھیں، خاندانی حکیم ہیں، سات پشتوں سے ہمارا یہی پیشہ چلا آرہا ہے۔ یہ بزرگوں کے صدری نسخے ہی ہیں، جو کام آرہے ہیں۔ لوگ فیض اُٹھا رہے ہیں۔ خود ہم نے چند ایسے نسخے دریافت کیے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ہم تنگ نظر نہیں، جس دوا سے مریضوں کو فائدہ ہوتا ہو، اسے فوراً اپنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے، بہت سی ایلو پیتھک ادویہ سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

بعض ادویہ کے ایسے ایسے فوائد ہم پر منکشف ہوئے ہیں کہ بتانے بیٹھ جائیں تو آپ دنگ رہ جائیں۔ مثلاً ایک چاول نما گولی ہوتی ہے، شاید یہ 'پریڈنی سولونی' کہلاتی ہے۔ قسم خدا کی، جادو ہے، ایسے ایسے کام لیے ہیں اس گولی سے کہ بس۔ 'لعوق سپستاں' میں اس کا سفوف ملا کر دمہ کے مریضوں پر آزمایا، ایسا جادو دکھایا کہ دنیا حیران رہ گئی۔ میری یہ دریافت 'لعوقِ ضیق النفس' کے نام سے خوب چل رہی ہے۔ دمہ کے مریض کونے کونے سے آتے ہیں اور خدا کے فضل و کرم سے بالکل تندرست ہو کر جاتے ہیں۔ چند دنوں میں وزن بھی بڑھ جاتا ہے اور چہرے پر رونق آجاتی ہے۔ مریض کو دیکھ کر کسی کو یقین نہیں آتا کہ کبھی دمہ کا مریض تھا۔ یہ ہی دوا ایکزیما میں اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ داد و چنبل کے ہزاروں مریض اب تک فیض یاب ہو چکے ہیں۔ جلد کے امراض میں اسی دوا کو 'لعوقِ چنبل' کے نام سے استعمال کراتے ہیں۔ اور تو اور یہی دوا جوڑوں کے درد کے لیے اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ ہم اسے جوڑوں کے درد میں 'لعوقِ وجع المفاصل' کے نام سے استعمال کراتے ہیں۔ ایسے ایسے مریض جو دو قدم چلنے سے معذور تھے، آج دوڑتے پھر رہے ہیں۔ خدا نے ہمارے ان مرکبات میں بڑی شفا رکھی ہے۔

ایک دوا اور دریافت کی ہے۔ شرطیہ وزن بڑھاتی ہے، شدید بھوک لگاتی ہے۔ ویسے تو میں

کسی کو اس نسخے کی ہوا بھی لگنے نہیں دیتا، لیکن کیوں کہ آپ اصغر میاں کے ساتھ آئے ہیں، اس کے چند اجزا آپ کو بتاتا ہوں۔ یہ دراصل 'جوارش جالینوس' کی ترمیم و تصحیح شدہ شکل ہے۔ اس میں تین اجزا شامل ہیں۔ جوارش جالینوس، چاول نما گولی، جو کہ دمہ کے لیے استعمال کراتا ہوں اور ذیابیطس شکری میں استعمال ہونے والی مقبول عام چاول نما ایلو پیتھک دوا۔ نام میں نہیں بتاؤں گا، آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب! کمال کی دوا ہے یہ بھی۔ کیسا ہی سوکھا سڑا آدمی ہو، ایک مہینہ استعمال کرے، پھول کر کپا ہو جاتا ہے۔ جسے بھوک نہ لگتی ہو، اُس کو آدھا چمچہ چٹا دیں، بھوک سے بے تاب ہو جائے گا۔ ایسے بچے جن کے پیچھے والدین کھانے لیے پھرتے ہیں، ان کے لیے تو اکسیر ہے اکسیر۔ اس قدر مقبول ہے یہ دوا کہ بیان سے باہر ہے۔ اس کے چند اجزاء اور ہیں، جو میں آپ کو بتانے سے قاصر ہوں۔ میں نہیں چاہتا، یہ نسخہ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کے ہتھے چڑھے۔

وزن کم کرنے کے لیے بھی ایک دوا بنائی ہے۔ یہ بھی میری اپنی دریافت ہے۔ اس کے تمام اجزاء تو میں آپ کو ہرگز نہیں بتاؤں گا۔ ہاں، اتنا بتا سکتا ہوں کہ اس میں بھی ایک ایلو پیتھک دوا کو شامل کیا گیا ہے۔ تعجب تو اِس بات پر ہوتا ہے کہ ایلو پیتھک ڈاکٹر اپنی ہی ادویہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ میری اس دوا کا جزوِ اعظم جو ایلو پیتھک دوا ہے، اُسے 'تھائی روکسن' کہتے ہیں۔ بڑی سستی دوا ہے، لیکن قیامت کی چیز ہے۔ اس کا سفوف 'جوارش کمونی' میں چند اور اجزاء کے ساتھ ملا کر استعمال کراتا ہوں۔ ہاتھی کو کھلا دیں، ہرن بن جائے۔ چوکڑیاں بھرنے لگے۔ کیسا ہی موٹا آدمی ہو، سوکھ کر کانٹا ہو جاتا ہے۔ ایک راز کی بات بتاؤں، شاید آپ کو یقین نہ آئے۔ بہت سے فلمی ستارے خود کو سلم رکھنے کے لیے چپکے چپکے یہی دوا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے نمائندے اکثر اس دوا کو خریدنے آتے رہتے ہیں۔"

ہم ان کی باتیں سن رہے تھے اور حیران تھے کہ اس ملک میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر اصغر کو بار بار احسان مند نگاہوں سے دیکھتے تھے کہ انھی کی بدولت ایسے نابغۂ روزگار سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے ان کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا، "کینسر پر بھی کوئی کام کیا ہے؟" فرمانے لگے، "کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ ایک دوا بنائی ہے، قدیم اطباء کے نسخوں کی روشنی میں۔ 'حب سرطان' کہلاتی ہے، لیکن اثر آہستہ آہستہ کرتی ہے۔ بڑا صبر آزما علاج ہے کینسر کا۔ ذرا مہنگا ہے، تین سال کا کورس ہے۔ چھ مہینوں سے کم کی دوا نہیں دیتا، جسے لینا ہو لے، نہ لینا ہو نہ لے۔ لیکن افسوس!

صد افسوس! کینسر کے مریض جلد ہی داغِ مفارقت دے جاتے ہے۔ اگر تین سالہ کورس مکمل کر لیں تو مجھے اللہ کی ذات سے اُمید ہے کہ مکمل صحت یاب ہو جائیں۔ ابھی تک تو کوئی مریض بھی تین سالہ کورس مکمل نہیں کر پایا۔“

ابھی ان سے باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ چند مریض آ گئے، دکھانے کے لیے ضد کرنے لگے۔ ہم سے کہنے لگے، بڑی دُور سے آئے ہیں یہ لوگ، ذرا انہیں دیکھ لیں، پھر اطمینان سے باتیں کریں گے۔ ایک مریض کمر کے درد میں مبتلا تھا۔ شاید کافی دنوں سے دوا لے رہا تھا۔ فائدہ نہ ہوا تو شاکی ہو کہنے لگا، ”حکیم صاحب! بڑے دنوں سے علاج کر رہا ہوں۔ دوا بھی بڑی پابندی سے کھا رہا ہوں، لیکن کمر کا درد نہیں جا رہا۔“ یہ سنتے ہی حکیم صاحب چراغ پا ہو گئے۔ غصے سے فرمانے لگے، ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میری دوا اثر نہ کرے۔ تم نے ضرور وزن اُٹھایا ہو گا۔“ اس نے بہت کہا، قسم لے لیں، جو میں نے وزن اُٹھایا ہو۔ نہ مانے۔ پوچھا، ”آبدست کس سے کرتے ہو؟“ کہنے لگا، ”پانی سے۔“ پوچھا، ”مسلم شاور سے کرتے ہو، یا لوٹے سے؟“ کہنے لگا، ”لوٹے سے۔“ فوراً بولے، ”اتنے عرصے سے وزنی لوٹا اُٹھا رہے ہو، فائدہ کیا خاک ہو گا۔ یا تو وزن اُٹھا لو، یا علاج کرا لو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے، کسی اور سے علاج کرا لو۔ میرے بس کا نہیں تمہارا علاج کرنا۔“ وہ بے چارہ گڑگڑاتا ہی رہا، انھوں نے دوا نہ دی۔

اس کے بعد ایک مریض نے دکھایا۔ دس پندرہ دنوں سے بخار تھا۔ اس کا حال سنا اور نسخہ لکھ کر ہم سے مخاطب ہوئے، ”جانتے ہو، بخار کے اس مریض کو میں نے کیا دیا ہے؟“ ”آپ ہی بتائیے۔“ ہم نے کہا، ”جناب والا! میں نے ’معجون کبیر‘ میں ’اسپرین‘ کی بیس گولیوں کا سفوف ملوا دیا ہے، دیکھتا ہوں کہ بخار کیسے نہیں اُترتا۔ اس کا تو باپ بھی اُترے گا، بخار کی ایسی کی تیسی“... ہم ان کا منہ دیکھتے رہ گئے!

* *

‘‘پھر کسی نے گائیڈ کیا کہ لارے شاہ سے ملو۔’’

‘‘کام ہو جائے گا۔’’

‘‘یہ لارے شاہ کون ہے؟’’

‘‘یہ کچھ بھی نہیں ہے اور سب کچھ ہے۔’’

‘‘کیا مطلب؟’’

‘‘اس نے بس ایم پی ایم ایف کیا ہوا ہے۔’’

ایم بی ایس تو ہم نے سنا تھا یہ بھلا کون سی ڈگری ہوئی؟’’

‘‘بھئی وہ مڈل پاس میٹرک فیل ہے۔’’

‘‘یار اُس کی اتنی اپروچ ہے تو میٹرک کیوں نہیں کر لیتا۔’’

‘‘وہ کہتا ہے کرنے کو تو میں بی اے بھی کر لوں، مگر کیا فائدہ؟ کرنا تو یہی کام ہے۔’’

‘‘کون سا کام؟’’

‘‘یہی، لوگوں کے کام کروانا۔’’ وہ تو بار بار یہ مصرعہ بھی دُہراتا ہے، ‘‘ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا۔’’

‘‘پھر تو وہ بڑے کام کی چیز ہے۔ مجھے بھی ملاؤ نا یار اُس سے۔’’

‘‘بات ہی کوئی نہیں۔ ملا دیں گے میرے یار۔’’

ہم تو اُس وقت حیران و پریشان ہو گئے، جب کچھ دنوں بعد ہمارا دوست لارے شاہ سمیت ہمارے کمرے میں آ گیا:

‘‘لارے شاہ! یہ ہمارے دوست ہیں، جن کا تذکرہ ہم نے آپ سے کیا تھا۔’’

‘‘جی آپ فکر ہی نہ کریں۔ مسئلہ ہی کوئی نہیں۔’’

ہم ایک تو اپنے دوست کے ممنون تھے کہ اس نے ہمارا اتنا خیال رکھا، اوپر سے لارے شاہ کے صدقے واری جا رہے تھے، جو بنفسِ نفیس ہمارے پاس آ گیا تھا۔ ہمیں تو سچی مچی یوں لگا کہ جیسے نوکری خود چل کر ہمارے کمرے میں آ گئی ہے۔ ہم نے لارے شاہ کے لیے فوراً کینٹین سے چائے منگوائی اور ساتھ اُبلے ہوئے انڈے بھی، کیوں کہ ہمارے دوست نے ہمیں کان میں بتا دیا تھا کہ لارے شاہ کو اُبلے ہوئے انڈے بہت پسند ہیں۔ لارے شاہ کی فرمائش پر ہم نے نوکری کی

درخواست، مع ضروری دستاویزات کی فوٹو کاپی کے، اس کے حوالے کر دی۔

”بس سمجھیں آپ کو نوکری مل گئی۔“

ہم اپنے آپ کو کمرے کی بجائے دفتر میں محسوس کرنے لگے۔ دن گزرنے لگے۔ خیالی طور پر ہم جو دفتر پہنچ چکے تھے، آہستہ آہستہ تشویش میں مبتلا ہو کر خیالی دفتر سے باہر آنے لگے۔ حسنِ اتفاق کہ ایک روز وہ دونوں ہمیں سڑک پر ہی مل گئے۔ ہمیں دیکھتے ہی ہمارا دوست لارے شاہ سے پوچھنے لگا، ”وہ ہمارے دوست کی درخواست کا کیا بنایا؟“

”کام ہو جائے گا، آپ فکر نہ کریں جی۔ سمجھیں "Appointment Letter" آپ کے ہاتھ میں ہے۔“

ہم نے اپنے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ دوست ہمیں ایک طرف لے گیا اور ہمیں کان قریب لانے کو کہا۔ ہم نے کان دھر دیے، ”یار اِسے آنے جانے کا کرایہ تو دو اور کچھ چائے پانی کے لیے بھی۔“

اب ہمیں سمجھ آیا کہ کام تو ہمارا تھا، ہمیں اس سے خود ہی پوچھنا چاہیے تھا۔ ہم نے جیب میں ہاتھ ڈالا جو کچھ بھی برآمد ہوا لارے شاہ کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے سارے نوٹ بلا تکلف اپنی جیب میں ڈال لیے۔

ہم پھر روزانہ انتظار کی سولی پہ لٹکتے رہے۔ تب ہمیں پتا چلا کہ انتظار کی سولی کس قدر تیز ہوتی ہے اور اس پہ لٹکنا کیا معنی رکھتا ہے۔ چند دنوں بعد لارے شاہ کی تلاش میں ہم خود نکل پڑے۔ وہ گھر پہ تو ملتا ہی نہیں تھا۔ ہماری طرح اور لوگ بھی اس کا پتا کر کے مایوں لوٹ رہے تھے۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ اسے ڈھونڈنا کتنا دشوار ہے۔ سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ وہ خود ہی کہیں آوارہ گردی کرتا ہوا مل جائے۔

لارے شاہ کی خوبی یہ تھی کہ وہ اتنی ملائمت سے ملتا تھا اور اِس قدر اُمید بندھا دیتا تھا کہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر ہمیں یہ سوچنے کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی کہ ہمارا کام نہیں ہوگا۔ عاجزی اس میں کُوٹ کُوٹ کر بھری تھی۔ مجال ہے سامنے دم مار جائے۔ اسے اتنا فرماں بردار دیکھ کر تو ویسے بھی یقین کرنے کو جی چاہتا تھا۔ اور ہمارے سامنے تو اس پہ اعتماد کرنے کی سب سے بڑی وجہ

لارے شاہ

ڈاکٹر محسن مگھیانہ

سیانے کہتے ہیں، سچائی میں بڑی طاقت ہوتی ہے، مگر کیا کیجیے کہ اب جھوٹ میں اس سے بھی زیادہ طاقت آ گئی۔ اب تو جھوٹ بولنے کا فیشن اتنا عام ہو گیا ہے کہ سچ بولنے والا نئے زمانے کی کوئی **"Antique"** لگتا ہے اور ایسا نظر آنا یقیناً جہاد سے کسی طور کم نہیں۔ فی زمانہ سچ اور جھوٹ کے درمیان کی ایک چیز ایسی ایجاد ہوئی ہے کہ پیدا ہوتے ہی اس نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے ہیں۔ یہ 'لارا' ہے۔ کرکٹ والا لارا نہیں۔ ویسے تو اُس لارے نے بھی اپنے بیٹ سے کئی ریکارڈ توڑ دیے ہیں، مگر ہم اس لارے کی بات کر رہے ہیں، جو لارے لپے کے نام سے مقبول ہے۔ پہلے پہل تو اِس کو اپنانے والوں کی تعداد بہت کم تھی، مگر اَب ماشاء اللہ کروڑوں نہیں، تو لاکھوں لوگ اس میں دیوانگی کی حد تک مبتلا پائے گئے ہیں۔ یہ ہماری خام خیالی تھی کہ لارے شاہ صرف ہمارے ہی محلے میں رہتا ہے، مگر تحقیق پر معلوم ہوا کہ یہاں تو پورے ملک کے ہر محلے کیا، ہر گلی میں ایک آدھ لارے شاہ ضرور بستا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں بھی بہت سارے لارے شاہ پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض ممالک کے سربراہِ مملکت بھی اندر سے لارے شاہ ہوتے ہیں، گو دنیاوی نام کوئی اور رکھا ہوتا ہے۔

زمانۂ طالب علمی میں لارے شاہ سے اتنا واسطہ نہیں پڑتا، جتنا عملی زندگی میں پڑتا ہے۔ ویسے بھی چھوٹے موٹے لارے لگانے والے، لارے شاہ بننے کے لیے کوالیفائی نہیں کرتے۔ جونہی ہم نوکری کی تلاش میں نکلے ہم نے کوئی سہارا ڈھونڈنا شروع کر دیا، جو ہمیں نوکری دلا سکے۔ چوں کہ یہ ابتدائے عشق تھی، اس لیے فوری طور پر کوئی سفارش ہاتھ نہ لگ سکی۔ سوچا، انسان کی اپنی بھی تو کوئی عزت ہوتی ہو گی۔ چلیں خود نوکری مانگ کے دیکھتے ہیں۔ باہر والے آہنی گیٹ پہ کھڑے چوکیدار سے بچ بچا کر اندر پہنچے تو چپڑاسی نے آ لیا۔ اس سے نمٹ چکے تو اندر کیا دیکھتے ہیں

کہ ضرورت مندوں کا ایک سیلاب اُمڈا ہوا ہے۔ ایک کو دیکھو تو منہ پہ بارہ بجے ہیں، دوسرے پہ نظر ٹھہری تو اُس کے چوبیس بجے تھے، تیسرے کے چھتیس، سو گنتی ختم ہو سکتی ہے، مگر ہم ان کے چہرے پہ بے روزگاری کی وجہ سے چھائی مایوسی کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے۔ بڑی مشکل سے سیٹ پر بیٹھے کلرک تک ہماری رسائی ہوئی، جس نے تقریباً ہم سے اُلجھتے ہوئے یہ بتایا کہ نوکری کی کوئی سیٹ خالی نہیں۔ “کب تک خالی ہوگی”۔ “آپ روزانہ پتا کرتے رہیں، جس روز خالی ہوئی، آپ کی ہوگی، کیوں کہ میں تو اس سیٹ پر لگ نہیں سکتا۔”

ہم یہ روکھا سا جواب پا کر اور اپنا ذاتی منہ لے کر باہر نکل آئے اور تو کچھ نہ کر سکے، بس یہی کہہ سکے:

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

ہم پژمردہ دل سے سڑکیں ناپ رہے تھے کہ رستے میں ایک دوست مل گیا۔

“تم اتنے پریشان کیوں ہو؟”

“تم اتنے خوش کیوں نظر آ رہے ہو؟”

“میں تو اِس لیے خوش ہوں کہ نوکری مل گئی ہے۔ یہ دیکھو **"Appointment Letter"**” ہم نے بڑی حسرت سے سفید کاغذ کے اس پُرزے کو دیکھا، جس پہ انتہائی گھٹیا اور پتلا کاغذ لگا ہوا تھا اور نہایت گھسی پٹی مشین سے آرڈر ٹائپ کیا گیا تھا، مگر یہ اسی قسم کا لیٹر تھا، جو ہمیں نہیں ملا تھا اور جس کو پانے کی حسرت دل میں لیے پھرتے تھے۔

“یہ تو اصلی لگتا ہے۔”

“بالکل اصلی ہے۔”

“مگر یہ ملا کیسے؟” “میں تو وہاں گیا تھا۔ کلرک کہنے لگا۔ کوئی سیٹ ہی خالی نہیں۔”

“یہ تو بس ان کا اخباری بیان ہوتا ہے۔ اندر کھاتے سیٹیں بچا کے رکھی ہوتی ہے۔”

“مگر تمھیں کیسے پتا چلا۔”

“میں نے بھی پہلے تمہاری طرح حماقت کی تھی۔ خود ہی چلا گیا تھا۔”

“پھر؟”

"پھر کسی نے گائیڈ کیا کہ لارے شاہ سے ملو۔"

"کام ہو جائے گا۔"

"یہ لارے شاہ کون ہے؟"

"یہ کچھ بھی نہیں ہے اور سب کچھ ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اس نے بس ایم پی ایم ایف کیا ہوا ہے۔"

ایم بی بی ایس تو ہم نے سنا تھا یہ بھلا کون سی ڈگری ہوئی؟"

"بھئی وہ مڈل پاس میٹرک فیل ہے۔"

"یار اُس کی اتنی اپروچ ہے تو میٹرک کیوں نہیں کر لیتا۔"

"وہ کہتا ہے کرنے کو تو میں بی اے بھی کر لوں، مگر کیا فائدہ؟ کرنا تو یہی کام ہے۔"

"کون سا کام؟"

"یہی، لوگوں کے کام کروانا۔" وہ تو بار بار یہ مصرعہ بھی دُہراتا ہے، "ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا۔"

"پھر تو وہ بڑے کام کی چیز ہے۔ مجھے بھی ملاؤ نا یار اُس سے۔"

"بات ہی کوئی نہیں۔ ملا دیں گے میرے یار۔"

ہم تو اُس وقت حیران و پریشان ہو گئے، جب کچھ دنوں بعد ہمارا دوست لارے شاہ سمیت ہمارے کمرے میں آ گیا:

"لارے شاہ! یہ ہمارے دوست ہیں، جن کا تذکرہ ہم نے آپ سے کیا تھا۔"

"جی آپ فکر ہی نہ کریں۔ مسئلہ ہی کوئی نہیں۔"

ہم ایک تو اپنے دوست کے ممنون تھے کہ اس نے ہمارا اتنا خیال رکھا، اوپر سے لارے شاہ کے صدقے واری جا رہے تھے، جو بنفسِ نفیس ہمارے پاس آ گیا تھا۔ ہمیں تو سچی مچی یوں لگا کہ جیسے نوکری خود چل کر ہمارے کمرے میں آ گئی ہے۔ ہم نے لارے شاہ کے لیے فوراً کینٹین سے چائے منگوائی اور ساتھ اُبلے ہوئے انڈے بھی، کیوں کہ ہمارے دوست نے ہمیں کان میں بتا دیا تھا کہ لارے شاہ کو اُبلے ہوئے انڈے بہت پسند ہیں۔ لارے شاہ کی فرمائش پر ہم نے نوکری کی

درخواست، مع ضروری دستاویزات کی فوٹو کاپی کے، اس کے حوالے کر دی۔

”بس سمجھیں آپ کو نوکری مل گئی۔“

ہم اپنے آپ کو کمرے کی بجائے دفتر میں محسوس کرنے لگے۔ دن گزرنے لگے۔ خیالی طور پر ہم جو دفتر پہنچ چکے تھے، آہستہ آہستہ تشویش میں مبتلا ہو کر خیالی دفتر سے باہر آنے لگے۔ حسنِ اتفاق کہ ایک روز وہ دونوں ہمیں سڑک پر ہی مل گئے۔ ہمیں دیکھتے ہی ہمارا دوست لارے شاہ سے پوچھنے لگا، ”وہ ہمارے دوست کی درخواست کا کیا بنایا؟“

”کام ہو جائے گا، آپ فکر نہ کریں جی۔ سمجھیں "Appointment Letter" آپ کے ہاتھ میں ہے۔“

ہم نے اپنے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ دوست ہمیں ایک طرف لے گیا اور ہمیں کان قریب لانے کو کہا۔ ہم نے کان دھر دیے، ”یار اِسے آنے جانے کا کرایہ تو دو اور کچھ چائے پانی کے لیے بھی۔“

اب ہمیں سمجھ آیا کہ کام تو ہمارا تھا، ہمیں اس سے خود ہی پوچھنا چاہیے تھا۔ ہم نے جیب میں ہاتھ ڈالا جو کچھ بھی برآمد ہوا لارے شاہ کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے سارے نوٹ بلا تکلف اپنی جیب میں ڈال لیے۔

ہم پھر روزانہ انتظار کی سولی پہ لٹکتے رہے۔ تب ہمیں پتا چلا کہ انتظار کی سولی کس قدر تیز ہوتی ہے اور اس پہ لٹکنا کیا معنی رکھتا ہے۔ چند دنوں بعد لارے شاہ کی تلاش میں ہم خود نکل پڑے۔ وہ گھر پہ تو ملتا ہی نہیں تھا۔ ہماری طرح اور لوگ بھی اس کا پتا کر کے مایوں لوٹ رہے تھے۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ اسے ڈھونڈنا کتنا دشوار ہے۔ سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ وہ خود ہی کہیں آوارہ گردی کرتا ہوا مل جائے۔

لارے شاہ کی خوبی یہ تھی کہ وہ اتنی ملائمت سے ملتا تھا اور اِس قدر اُمید بندھا دیتا تھا کہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر ہمیں یہ سوچنے کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی کہ ہمارا کام نہیں ہوگا۔ عاجزی اس میں کُوٹ کُوٹ کر بھری تھی۔ مجال ہے سامنے دم مار جائے۔ اسے اتنا فرماں بردار دیکھ کر تو ویسے بھی یقین کرنے کو جی چاہتا تھا۔ اور ہمارے سامنے تو اس پہ اعتماد کرنے کی سب سے بڑی وجہ

ہمارے دوست کی نوکری تھی، جو اُس نے نکلوائی تھی۔ ہمیں اب نوکری تلاش کرنے کے علاوہ اور کوئی کام تھا ہی نہیں، سو لارے شاہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ہم نے بالآخر اُسے ریڑھی پر آلو چھولے کھاتے رنگے ہاتھوں پکڑ ہی لیا۔

”سر آؤ۔ آلو چھولے کھاؤ۔“

”لارے شاہ مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”آپ بھی کمال کرتے ہیں بادشاہو۔ آپ نوکری کی وجہ سے پریشان ہو اور اسی لیے بھوک بھی نہیں لگتی۔ آپ فکر کیوں کرتے ہو؟ آج کل میں آپ کا کام ہو جائے گا۔ آپ آلو چھولے تو کھاؤ۔“

ہم نے بھی سوچا نوکری تو اپنے وقت پر مل ہی جائے گی، آلو چھولے کھانے کا یہ سنہری موقع کیوں ضائع کیا جائے۔

”میں آپ کو سچی بات بتاؤں۔“ وہ بولا۔

ہمارا دل دھک سے رہ گیا، کہیں لارے شاہ یہ تو نہیں کہنے والا کہ ہمیں نوکری نہیں مل سکتی۔ آلو چھولے کھاتے ہمارا ہاتھ رُک گیا۔ ”بتاؤ۔“ ہم نے مریل سی آواز میں کہا۔

”دراصل بات یہ ہے۔“

ابھی وہ اصلی بات بتانے چلا تھا کہ پریشانی میں ایک چھولا ہمارے حلق میں پھنس گیا۔ یوں لگا سانس بند ہو چلی ہے۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہونے کو تیار تھے۔ وہ تو شکر ہے ہمیں کھانسی آئی اور وہ چھولا حلق سے نکل کر دُور جا گرا۔

”یہ لیں پانی۔“

ہم نے ذرا سا پانی پیا۔ سانسیں بحال ہو گئیں۔

لارے شاہ کہنے لگا، ”آپ فکر نہ کریں، نوکری آپ کو مل جائے گی۔ آپ کی حالت قابلِ رحم ہو گئی ہے۔ اب مجھے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ اصل میں بات یہ تھی۔“

”یار بتا دو کیا بات تھی۔“

”وہ لوگ پیسے مانگتے ہیں۔“

”مگر میرے پاس تو پیسے ہیں ہی نہیں۔ اور پھر یہ تو رشوت ہوئی نا۔ میں رشوت تو نہیں دوں

گا۔ ہرگز نہیں۔ چاہے نوکری ملے یا نہ ملے۔“

”آپ تو جذباتی ہو رہے ہیں۔ میں نے یہ تھوڑی کہا ہے کہ وہ رشوت کھانا چاہتے ہیں۔ وہ تو کھانے کے لیے پیسے مانگ رہے تھے، یعنی وہ لنچ ہمارے ساتھ کسی اچھے ہوٹل میں کرنا چاہتے تھے۔ روٹی تو سب نے کھانی ہے، اسے بھلا رشوت تو نہیں کہتے۔“

”ہاں واقعی۔ کھانا تو سب نے کھانا ہوتا ہے، لیکن میں تو بالکل خالی ہو گیا ہوں۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ پہلی دفعہ پیسے میں بھر دوں گا، آپ میرے دوست کے دوست ہیں۔ جب آپ کو پہلی تنخواہ ملے اُس میں سے دے دیجیے گا۔“

ہم سوچنے لگے کہ لارے شاہ کتنا عظیم آدمی ہے، جو اِس کسمپرسی کے عالم میں ہماری مدد کر رہا ہے فرطِ عقیدت سے ہمارا جی چاہا کہ اس کے ہاتھ چوم لیں، مگر اُس کے ہاتھ پر آلو چھولے کا مصالحہ لگا ہوا تھا۔

ہماری حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی، جب تیسرے دن نوکری کے آرڈر ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ ہم اس کاغذ کے ٹکڑے کو پا کر یوں محسوس کر رہے تھے کہ دنیا کی ساری دولت ہمیں مل گئی ہے۔ ہم نے لارے شاہ اور اپنے دوست کو بیک وقت گلے لگا لیا۔ پہلی تنخواہ پر ضرور آپ کا قرضہ چکا دوں گا، بلکہ ایک بہت بڑی پارٹی دوں گا۔ آلو چھولے کی ریڑھی پر۔ ہماری باچھیں کھلی دیکھ کر وہ دونوں بھی مسکرا دیے۔

نوکری ملنے پر ہم تو لارے شاہ کی صلاحیتوں کے قائل ہو گئے اور جہاں بیٹھتے اس کے گن گاتے۔ بعض دوستوں نے ہمیں ’کثرتِ تعریف‘ سے ٹوکا اور سمجھایا کہ کہیں ایسا کرنے سے لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ ہم لارے شاہ کے نئے ایجنٹ ہیں۔ ہم پر اِن نصیحتوں کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ یوں ہنسی خوشی تین ماہ گزر گئے۔ ہم نے پہلی تنخواہ سے لارے شاہ کا قرض چکا دیا، باقی محض چند سکے بچے تھے۔ سوچا انہیں رکھ کر بھی بھلا ہم کیا کریں گے، کیوں کہ ابھی گھر سے نان و نفقہ جاری تھا۔ سو باقی ماندہ تنخواہ خیرات کر دی۔ پھر اُن دوستوں کو کھلا ڈالی، جو شہر میں ہر اُس شخص کے پاس پارٹی کھانے پہنچ جاتے تھے، جس کو پہلی تنخواہ ملی ہو۔ ایسے ہی جیسے شادیوں پہ کئی شادیانے بجانے والے اور گڑوی بجانے والیاں سونگھ کر پہنچ جاتی ہیں۔

نوکری ملنے کے تیسرے مہینے جب کہ دوسرے ماہ کی تنخواہ کا آدھا حصہ ہم اِدھر اُدھر خرچ

کر چکے تھے۔ دفتر سے ہمیں یہ مژدہ سنایا گیا کہ خیر سے ہمیں کسی دُور دراز علاقے میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ سننے میں یہ آیا کہ جہاں ہمیں ٹرانسفر کیا گیا ہے، وہاں برس ہا برس سے کوئی سرکاری نوکر نہیں پہنچا تھا۔ حکومت کو شاید کہیں سے مخبری ہو گئی تھی کہ ہم ہی وہ مجاہد ہیں، جو یہ کارنامہ سرانجام دے سکتے ہیں۔ حکومت نے خفیہ اداروں کے ذریعے یہ بھی معلوم کروالیا تھا کہ اس مجاہد کا لارے شاہ کے علاوہ کوئی سفارشی نہیں۔

اب ہمیں نئے سرے سے لارے شاہ کو تلاش کرنا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ خود خوش قسمتی سے سڑک پہ چلتا مل جائے تو ٹھیک، وگرنہ اُسے ڈھونڈنا بہت مشکل تھا۔ ہم لارے شاہ کی تلاش میں پاگل ہوئے پھرتے تھے۔ جب جنون حد سے بڑھا تو خدا کا کرنا کیا ہوا وہ صاحب خود ہی ہنتے مسکراتے ہمارے سامنے آن کھڑے ہوئے:

”آپ ہنس رہے ہیں اور ہماری جان پر بنی ہے۔“

”میری جان۔ کیا ہو گیا ہے؟“

”ہونا کیا تھا، ٹرانسفر ہو گیا ہے۔“

”کہاں؟“

”ڈھٹے کھوہ میں“ ہم نے زچ ہو کر کہا۔

”یار تم تو ایسے ہی گھبرا گئے ہو۔ ٹرانسفر ورانسفر تو نوکری کا حصہ ہے۔ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ میں اپنے یار کی خاطر کل ہی آرڈر رکوا دوں گا۔“

اس کے حوصلہ دینے سے ہماری جان میں جان آئی، لیکن اس بار چوں کہ زور زیادہ لگنا تھا، سو خرچہ بھی زیادہ اُٹھنا تھا۔ لارے شاہ نے بعد از تحقیق بتایا کہ ایک ممبر اسمبلی ہماری جگہ اپنا بندہ لایا ہے۔ پہلے تو میں اسے یقین دلاؤں گا کہ آپ بھی اپنے بندے ہیں۔ پھر اُسے لاہور لے جانا پڑے گا۔ گاڑی تو اُس کے اپنے پاس ہے بس ایک دن کو اُسے پانچ تاروں والے ہوٹل میں ٹھہرانا پڑے گا۔

”فائیو سٹار ہوٹل؟“ ہماری تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ ”کیا دو تین ستاروں سے گزارہ نہیں ہو سکتا؟“

”نہیں میرے یار آخر وہ ممبر اسمبلی ہے۔“

ہم مرتے کیا نہ کرتے، پیسوں کے انتظام میں لگ گئے۔ پچھلے ماہ کی آدھی تنخواہ پہ اس بار

لارے شاہ راضی نہ ہوا۔ کہنے لگا کہ پچھلی دفعہ تو میرے پاس پیسے تھے بھر دیے۔ اس بار میری اپنی جیب بھی خالی ہے، سو ہم نے ایک دوست سے اُدھار لے کر اُس کی مطلوبہ رقم پوری کر دی۔

''بس آپ سمجھیں آرڈر ہو گئے۔''

پھر لارے شاہ کا انتظار تھا اور ہم تھے۔ دن پہ دن گزرتے گئے۔ لارے شاہ کی کوئی خبر نہ آئی۔ گھر میں تو وہ ملتا ہی نہیں تھا۔ شہر کی ساری سڑکیں چھان ماریں، کہیں بھی وہ آوارہ مزاج ہاتھ نہ لگا، یہاں تک کہ دوست بھی ہماری حالت پہ ترس کھانے لگے۔ ''ہم نے کہا تھا نا کہ لارے شاہ کی اتنی تعریفیں نہ کیا کرو۔'' تب ہمیں دوستوں نے کہا کہ ایک اور آدمی ہے، جو یہ کارنامہ سرانجام دے سکتا ہے۔ اس وقت ہماری حالت اس بیمار کی سی تھی کہ جو ایک پیر کے دم سے آرام نہیں پاتا اور پھر اُسے کسی دوسرے پیر کی تلاش ہوتی ہے۔ جو دُور جنگل میں کسی جھونپڑی میں اکیلا بیٹھا صرف عبادت کیا کرتا ہے، یا حسبِ فرمائش کوئی تعویذ یا دعا دے دیتا یا دم کر دیتا ہے۔ ہمارے پاس اب کوئی چوائس ہی نہیں تھا، سو لارے شاہ اوّل کو چھوڑ کر اَب ہم لارے شاہ ثانی کے پاس اس لیے چلے گئے کہ ہمیں یقین تھا کہ ہر لارے شاہ ایک آدھ مرتبہ تو کام کر ہی دیتا ہے۔ لارے شاہ ثانی کے پاس پہنچے تو کہنے لگا، ''وہ تو ہے ہی فراڈیا۔ آپ وہاں کیسے پھنس گئے؟''

ہم نے دل ہی دل میں سوچا ایسے ہی، جیسے اب ہم آپ کے پاس پھنسنے والے ہیں۔ عملی زندگی کے ساتھ ساتھ ہماری لارے شاہوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، مگر ہم حیران تو اِس بات پہ تھے کہ یہ لوگ کیسے چرب زبان ہوتے ہیں اور لوگوں کو کیسے مطیع کر لیتے ہیں۔ ہمارے محلے کا مشہور لارے شاہ (جسے ہم نے لارے شاہ سوم قرار دیا تھا) تو اِس قدر شیریں زبان تھا کہ بلدیاتی الیکشن میں کھڑا ہوا تو لوگوں نے متاثر ہو کر اُسے بلدیاتی کونسلر بنا دیا۔

نجانے کیوں ہم لارے شاہوں کو اندر سے جانتے بھی ہوتے ہیں، پھر بھی ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آ جاتے ہیں۔ دراصل وہ مکھن ہی ایسے لگاتے ہیں، یا حالات و واقعات کی روشنی میں چرب زبانی اور مختلف حربہ ہائے خصوصی سے ایسے گھیر ڈالتے ہیں کہ آدمی ان کے دام میں پھنستا اور اُن کی بنائی مکھن کی دلدل میں ایسے پھسلتا چلا جاتا ہے کہ جب تک ہوش آتا ہے، سب کچھ لٹ چکا ہوتا ہے۔ اور پھر ''سب کچھ لٹا کر ہوش میں آئے تو کیا کیا۔''

ہم یونہی سوچنے لگے کہ سب سے بڑا لارے شاہ کون ہو گا؟ تو ہمیں یاد آنے لگا کہ جب بھی

ہمسایہ ملک سے جنگ ہونے لگتی ہے تو کوئی ہمیں لارا لگا دیتا ہے کہ ہمارا بحری بیڑا بحیرۂ عرب میں آپ کی مدد کو پہنچنے والا ہے۔ ہم دنیا کے لارے شاہ کی سابقہ تاریخ سے بھی واقف ہوتے ہیں کہ ماضی میں کیسے ہمارے ساتھ دھوکا کیا، مگر... لارے شاہ کی چکنی چپڑی باتیں ہی ایسی ہوتی ہیں کہ پھر معرکۂ کارگل کے بعد ہم خود امریکا پہنچ کر واشنگٹن میں لارے شاہ کی باتوں میں ہاں میں ہاں ملانے لگتے ہیں۔

لارے شاہ کو صرف مردوں کی حد تک محدود رکھنا، عورتوں کے بنیادی حقوق کی پامالی سے کم نہیں۔ آخر محبوب بھی تو لارے شاہ ہوتا ہے۔ پری وش کے لارے میں آنے کو تو کس کافر کا جی نہیں چاہتا۔ وہ خود لارا نہ بھی لگائے تو اُس کے اشاروں کو ہم خود سے بھی تو لارا سمجھ لیتے ہیں۔ اور کبھی واقعی وہ محبت کا لارا لگا دے تو بندہ تو بالکل ہی کملا ہو جاتا ہے۔ لارے شاہ اگر لڑکی ہو تو بھلا ہم اسے لاری شاہ کہہ سکتے ہیں، لیکن شاہ تو مرد ہوا۔ ملکہ اس لیے نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ابھی تو اس نے صرف لارا لگایا ہے ملکہ تو نہیں بنی۔ یوں لاری ملکہ کی بجائے لاری شہزادی کہہ سکتے ہیں، مگر اس سے کوئی مناسب صوتی تاثر نہیں بنتا۔ چلیں ہم اپنی محبوبہ کو لاری شاہی کہہ دیتے ہیں۔ شاہی کہنے سے کم از کم یہ گمان ہوتا ہے کہ اس کا شاہی خاندان سے کوئی تعلق ہے، یا پھر وہ تصور ہی تصور میں شاہی بگھی پہ ار ہوئی آ رہی ہوتی ہے۔ ہم اس بگھی پہ سوار ہونے کی ہر چند کوشش کرتے ہیں، مگر کیا کیجیے کہ وہ نازو ادا دکھاتی ہے، مسکرا کر لارا تو لگا دیتی ہے، پر ہمیں شاہی بگھی میں نہیں بٹھاتی۔ آخر کو وہ لاری شاہی ہے۔

ہماری قسمت دیکھیے کہ پاکستان بننے سے اب تک جو بھی حکمران رہے، ایک سے بڑھ کر ایک لارے شاہ ثابت ہوئے۔ عوام بے چاری ان کے رُخِ زیبا کو تکتی رہی اور وہ لارے لگاتے رہتے۔ حتیٰ کہ ان کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے تو پھر لارا لگاتے ہوئے ڈھٹائی سے کہتے ہیں، ''ہم دوبارہ آئے تو پھر دیکھنا ملک کی قسمت بدل کر رکھ دیں گے...''

* * *

انسان اور جانور

ڈاکٹر منصور احمد باجوہ

انسان اور جانور کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ اتنا ہی پرانا جتنی انسان کی تاریخ پرانی ہے۔ جب اپنے ہی بھائی کو قتل کر کے، قابیل حیران تھا کہ اب اس کے سارے گناہوں کا بوجھ تو لے لیا، اس کی لاش کا کیا کروں تو ایک کوّے نے ہی عقل سکھائی تھی کہ اسے زمین میں دفن کر دو۔ تاہم، صحیح یا غلط انسان کا ہمیشہ سے یہ گمان رہا ہے کہ عقل، فہم اور شعور میں جانور اس سے بہت پیچھے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انسان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ جانور اس سے کچھ نہ کچھ عقل سیکھ لیں۔ جو اس جھانسے میں آگئے، ان کے گلے میں طوق ڈال کر انسان نے اپنی خدمت میں لگا لیا۔ جنہوں نے تاڑ لیا کہ حضرت کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں، وہ جنگلوں اور بیابانوں میں انسان کی پہنچ سے دُور جان بچاتے پھرتے ہیں۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ جو احمق جال میں پھنس گئے وہ تو پالتو یا دوسرے الفاظ میں دیگر جانوروں کے مقابلے میں تہذیب یافتہ کہلائے کہ کھونٹے پر بندھے ہوئے چارہ کھاتے ہیں اور جو واقعتاً عقلمند تھے کہ اپنی آزادی کو قربان کرنے پر تیار نہ ہوئے وہ جنگلی اور وحشی ٹھہرے۔ تاہم انسان یہ بات تسلیم کرے یا نہ کرے، یہ حقیقت ہے کہ اس نے جو کچھ جانوروں کو سکھایا ہے، اس سے بہت زیادہ ان سے سیکھا ہے۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو انسان کے ہر روپ اور ہر انداز میں کسی نہ کسی جانور کی جھلک نظر آتی ہے۔ یوں انسان بے شمار جانوروں کی عادات و خصائل کا ایک مجموعہ ہے۔ مختلف اوقات میں کبھی ایک جانور اپنا سر اُٹھا کر زبانِ حال سے پکارتا ہے کہ یہ رہا آپ کا خادم اور کبھی دوسرا۔ دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں خدا جانے کتنے چرندے، پرندے اور درندے اپنے اپنے روپ دکھاتے ہیں۔ کبھی شیر، کبھی لومڑی، ابھی گدھا ابھی گھوڑا، آج بھیڑیا کل بکری، کبھی دانت دِکھائے، کبھی دُم دبائے۔ بعض اوقات مختلف جانور بیک وقت لڑتے جھگڑتے نمودار ہوتے ہیں اور دیکھنے والا ششدر رہ جاتا ہے کہ کس روپ کا اعتبار کروں اور کس کا اعتبار نہ کروں۔

وہی جو شیر بن کر زیر دستوں پر گرج اور برس رہے ہوتے ہیں، زبردست کے سامنے آتے ہی بکری بن جاتے ہیں۔ پھر زیر دستوں کی طرف نظر اُٹھتی ہے تو پھر شیر کا روپ دھار لیتے ہیں۔

جانور دوست بھی ہوتے ہیں اور دشمن بھی، بالکل انسانوں کی طرح، تاہم انسانوں کے برعکس ان کی دوستیاں تو مستقل اور پائیدار ہوتی ہیں، مگر دشمنیاں عارضی۔ جانور، بیر، بغض اور کینہ نہیں رکھتے۔ حساب چکا سکے تو چکایا ورنہ بھول گئے۔ شکار پر لڑیں گے، ایک دوسرے کے منہ سے کھینچیں گے، مرنے مارنے پر تل جائیں گے، مگر جوں ہی شکار ختم ہو گیا یا پیٹ بھر گیا، ساری کدورت بھول جائیں گے۔ انسان میں جانوروں کے بے شمار اوصاف ہیں، خدا جانے یہ وصف کیوں نہیں آسکا۔ نفرت کی آگ جب ایک دفعہ دل میں لگتی ہے تو سات سمندروں کے پانی بھی اسے نہیں بجھا سکتے۔ دشمن کا سر خاک آلود کر کے بھی کدورت نہیں جاتی، جسم میں میخیں گاڑ کر بھی حسرت پوری نہیں ہوتی، زندہ جلا کر بھی دل ٹھنڈے نہیں ہوتے۔ اے کاش انسان کی محبت اور چاہت بھی ایسی ہی بے انتہا ہوتی!

جانور وفادار بھی ہوتے ہیں اور بے وفا بھی۔ جو وفادار ہیں ان کی وفا کے ناتے، مفادات کے بندھن سے نہیں بندھے ہوتے، وفاداری ان کی سرشت میں ہے۔ ان کے سامنے ان کے بھائی بند، یکے بعد دیگرے قربان ہوتے چلے جاتے ہیں، مگر ان میں سے کوئی وفا کے رشتوں کو توڑ کر، بھاگ نکلنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ کیا آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ کسی غریب کی گائے، بھینس، بھیڑ، بکری یا مرغی شام کو اپنے گھر آنے کی بجائے، ہمسائے میں کسی امیر گھرانے میں ٹھکانہ ڈھونڈتی پھرتی ہو کہ وہاں کھانے کو بہتر ملے گا۔ پریشاں نظری صرف انسان ہی کے حصے میں آئی ہے۔ جن جانوروں یا پرندوں کو ہم بے وفا کہتے ہیں انہیں بے وفا گردانا بھی انسانی ذہن کی کرشمہ سازی ہے۔ بے وفا وہ ہوتا ہے، جو وفا کا جھانسا دے کر موقع ملنے پر پیٹھ میں خنجر گھونپ دے۔ یہ ہنر صرف انسانوں کو ہی آتا ہے۔ جانوروں نے انسانوں سے بہت کچھ سیکھا ہے، مگر یہ فن نہیں سیکھ سکے۔ بے وفائی کو 'طوطا چشمی' کا نام دے کر ہم نے بلاوجہ طوطوں کو بدنام کیا ہے۔ آزاد ہواؤں کے باسی کو زبردستی پکڑا، ایک مربع فٹ کے پنجرے میں بند کر کے عمر قید کی سزا سنا دی اور اگر اسے کبھی موقع ملا اور وہ اُڑ گیا تو اسے، آزادی کے پروانے کا خطاب دینے کی بجائے 'طوطا چشم' قرار دے دیا۔ دشمن کی جیل سے فرار کا کارنامہ اگر کوئی انسان انجام دے تو مردِ حُر کہلائے اور سینکڑوں صفحات آزادی کے لیے اس کی تڑپ کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے سیاہ کر دیے جائیں اور اگر وہی کام بے چارہ طوطا کرے

تو بے وفا ٹھہرے۔ ایسی ڈنڈیاں مارنی انسان کو خوب آتی ہیں تبھی تو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔

یوں تو انسان اور جانوروں کے درمیان 'حسنِ سلوک' کی ٹریفک بالعموم یک طرفہ ہی رہی ہے، مگر بعض جانوروں کے ساتھ زیادتیوں کی تو ہم نے انتہا کر دی ہے۔ اب گدھے کو دیکھ لیجیے! کتنا صابر، شاکر، مطیع، فرمانبردار اور محنتی ہے۔ سینکڑوں من بوجھ اس پر لاد دیں، اس کی کمر دہری ہو جائے، مگر اُف تک نہیں کرے گا، مگر اس کا صلہ اسے یہ ملا کہ احمق بے وقوف اور گدھا قرار پایا۔ توہین آمیز محاوروں سے ہر زبان کی لغت بھری پڑی ہے۔ اس شریف النفس جانور کے بارے میں ایک اُردو لغت کیا کہتی ہے ذرا ملاحظہ کیجیے!

گدھا: احمق نادان

گدھا برسات میں بھوکا مرے: احمق خود مصیبت میں پڑتا ہے۔

گدھا پیٹے گھوڑا نہیں ہوتا: بیوقوف کو اَدب سکھانے سے عقل نہیں آتی۔

گدھا دھوئے سے بچھڑا نہیں ہوتا: کمینہ اچھا لباس پہن کر شریف نہیں بن سکتا۔

گدھا کیا جانے زعفران کی قدر۔ بیوقوف کو جاہ و منصب کی کیا قدر۔

گدھا گھوڑا ایک بھاؤ: اچھی بری چیز ایک بھاؤ۔

گدھا گیا دم کی تلاش میں کٹا آیا کان: احمق کو اپنے نقصان کی تلافی کی کوشش میں مزید نقصان۔

گدھوں کے ہل پھرنا: ویران ہو جانا۔

گدھے کا کھایا نہ پاپ میں نہ پُن میں: غیر مستحق کو دینے کا نہ ثواب نہ عذاب۔

گدھے کا ماس کتے کے دانت: گدھے کے گوشت کو کتا ہی کھاتا ہے۔

گدھے کو گلقند: احمق کو بڑا رُتبہ۔

گدھے کو حلوا کھلا کر لاتیں کھانا: بُرے کے ساتھ بھلائی کر کے نقصان اُٹھانا۔

گدھے پر کتابیں لادنا وغیرہ وغیرہ۔

اب بتایئے! گدھے نے ایسا کیا جرم کیا ہے کہ اس طرح اس کی تذلیل کی جائے، جب کہ خود اپنا عالم یہ ہو کہ مطلب براری کے لیے گدھے کو باپ بنانے پر تیار ہوں۔ گدھے سے یہ بھی شکوہ ہے کہ:

جو گدھا تھا وہ آخر گدھا ہی رہا
گرچہ مکّے سے بھی ہو کے وہ آ گیا

ملاحظہ کیجیے! یہ شکایت وہ انسان کر رہا ہے، جو خود شیطان کو دل کی پناہ گاہ میں چھپا کر، طواف کر کے، بڑے اور چھوٹے شیطانوں کو کنکریاں مار کر، ویسے کا ویسا محفوظ و مامون واپس لے آتا ہے اور اس کی خدمت میں پہلے سے بھی بڑھ کر جُت جاتا ہے۔ انصاف سے بتائیے! آپ نے کتنے حاجیوں کی زندگی میں حج کے بعد انقلاب آتے دیکھا ہے۔ پھر آخر گدھے کو ہی سارا الزام کیوں دیا جائے۔

اُردو میں گدھا جو ذلیل ہوا سو ہوا، پنجابی نے اسے 'کھوتا' بنا کر رہی سہی کسر بھی نکال دی:

زبان بگڑی سو بگڑی تھی خبر لیجیے دہن بگڑا
گدھا تھا جو بھلا چنگا اسے کھوتا بنا ڈالا

جب اس سے بھی دل نہ بھرا تو 'کھوتے دا پتر' پر اُتر آئے۔ جس روز کھوتے کی باری آ گئی اس دن پتا چلے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔

گدھا تو خیر 'گدھا' نظر آتا ہے، اُلو جو شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے، ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتا ہے، انسان کے نہ لینے میں نہ دینے میں، اسے بھی ایسا تختۂ مشق بنایا کہ توبہ ہی بھلی۔ پھر 'اُلو کے پٹھے' کو بھی نہ بخشا حالاں کہ اگر اُلو کا کوئی قصور تھا تو معصوم پٹھے کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت تھی۔

کہتے ہیں کہ ایک صاحب ایک اُلو خریدنے کے لیے پرندوں کی دکان پر گئے۔ ہر رنگ، نسل اور سائز کے اُلو موجود تھے۔ ایک اُلو پسند کر کے قیمت پوچھی تو دکاندار نے سو روپے بتائی۔ ساتھ ہی ایک ننھا منا سا اُلو بھی پنجرے میں بند تھا۔ اس کی قیمت دریافت کی تو دکاندار بولا، ''دو سو روپے''۔ حیران ہو کر گاہک نے پوچھا یہ کیا ماجرا ہے کہ بڑے اُلو کے سو روپے اور چھوٹے کے دو سو۔ دکاندار نے اطمینان سے جواب دیا، ''دراصل بڑا اُلو صرف اُلو ہے اس لیے اس کے سو روپے ہیں جب کہ چھوٹا اُلو نہ صرف اُلو ہے، بلکہ ساتھ 'اُلو کا پٹھا' بھی ہے اس لیے اس کی قیمت دو سو روپیہ ہے'' اُلو کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کے ساتھ توہین آمیز سلوک صرف ہمارے ہاں ہی ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ایک یونیورسٹی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ درختوں کی طرف نگاہ گئی تو بے شمار اُلوؤں کو، اُلوؤں کی طرح بے حس و حرکت، بیٹھے ہوئے پایا۔ اس نظارے میں محو تھے کہ ایک استاد آ گئے، پوچھنے لگے، ''کیا دیکھ رہے ہیں۔'' ہم نے کہا، ''یونیورسٹی میں بڑے اُلو ہیں، انہیں دیکھ رہا تھا۔'' ہنس کے فرمانے لگے، ''ہاں یونیورسٹی میں واقعتاً بے شمار اُلو ہیں۔'' ہم یونیورسٹی کا نام جان بوجھ کر نہیں لکھ

رہے کہ اہلِ جامعہ ناراض ہوں گے، کیوں کہ اب تک اُلوؤں کی تعداد میں اور بھی اضافہ ہو چکا ہوگا۔ مغرب میں چوں کہ اُلو عقلمندی اور دانائی کی علامت ہے اس لیے اگر وہاں کسی یونیورسٹی یا کالج میں اتنے اُلو پائے جاتے تو وہ یقیناً بڑے خوش ہوتے اور انہیں چھپانے کی بجائے ہر آنے جانے والے کو بلا بلا کر خود دکھاتے کہ دیکھو ہماری یونیورسٹی میں کتنے اُلو ہیں۔ ہمیں خود یورپ یا امریکا جانے کا اتفاق تو نہیں ہوا، مگر ہمارا گمان یہی ہے کہ وہاں اگر کسی کو اُلو کا پٹھا کہا جائے تو وہ ناراض ہونے کی بجائے خوشی کا اظہار کرے گا کہ اسے کسی عقلمند کی نشانی بتایا جا رہا ہے۔ اُدھر جانے والے اگر چاہیں تو تجربہ کر کے دیکھ سکتے ہیں۔

کتے کی وفاداری غلامی کی حد تک جا پہنچتی ہے۔ مار کھاتا ہے، دھتکارا جاتا ہے، مگر مالک کے در کو نہیں چھوڑتا۔ ذرا چمکارے تو پھر بھاگ کر قدموں میں لوٹنے لگتا ہے۔ صوفیاء کو اس کی یہ خصلت بہت پسند ہے۔ اس پر مستزاد اس کی شب بیداری اور قناعت پسندی ہے۔ روٹی کے ٹکڑے سے، چوسی ہوئی ہڈی سے بہل جائے گا، کھانا سامنے رکھا ہوا دیکھے گا، مسکینوں کی طرح تکتا رہے گا، مگر آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ ماریں اور پھر ٹکڑا ڈالیں تو مار بُھلا کر پھر آ جائے گا۔ دنیا داروں کو بھی اس کی ایک عادت بڑی پسند ہے اور وہ ہے دُم ہلانے والی۔ فرق صرف یہ ہے کہ کتا صرف ایک مالک کے آگے پیچھے دُم ہلاتا ہے اور صرف اسی کے التفات کا خواہشمند ہوتا ہے، جب کہ غرض کے مارے ہوئے دنیا دار جب اور جہاں کسی مفاد کی بو پاتے ہیں وہیں دُم ہلانا شروع کر دیتے ہیں ایک ملتفت نہ ہوا تو دوسرے کے پیچھے دُم ہلانے لگے۔ چھوٹے بڑے، غریب و امیر، اعلیٰ و ادنیٰ کی کوئی قید نہیں، ہر ایک، ہر وقت کسی نہ کسی آستانے کی تاڑ میں ہے کہ جہاں سے مفادات کی چند ہڈیاں اس کے حصے میں بھی آ جائیں۔ ایک آستانے سے مایوس ہوئے تو دوسرے کی طرف چل پڑے۔ بعض اوقات دل کے کسی گوشے سے آواز آتی ہے کہ جتنی تگ و دو، دنیا اور دنیا داروں کو خوش کرنے کے لیے کر رہے ہیں، اس کا عشرِ عشیر بھی دنیا کے اصل مالک کو راضی کرنے کے لیے کرتے تو کسی اور در، کسی اور آستانے پر جانے کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ مگر دنیا کے شور و غوغا میں دل کی یہ آواز کسی نے کبھی سنی بھی تو اَن سنی کر دی۔

* *

شادی کی دعوت

ڈاکٹر محمد وسیع اللہ خان

شادیوں میں عموماً مرد حضرات 'کھانے' کے لیے شرکت کرتے ہیں اور خواتین 'دِکھانے' کے لیے! کھانا تو یہ رسماً کھاتی ہیں۔ لیکن شادی کی دعوت کھانا... کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ یہ ایک ایسا فن ہے جس کے لیے بڑے ریاض کی ضرورت ہے۔ اکثر اناڑی اور نوسکھیوں کو اچھی مشق نہ ہونے کی وجہ سے کھانے کے اختتام پر یا اُس سے بھی پہلے، میزبان کی سات پشتوں کو نہایت خوب صورت القاب سے نوازتے سنا گیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ 'دعوت' نہیں، بلکہ 'عداوت' تھی۔ یہ بھی اچھی رہی، مشق خود کو نہیں اور کوس رہے ہیں بے چارے میزبان کو۔

'شادی کی دعوت' کھانے کے فن میں کمال حاصل کرنے کے لیے حسبِ ذیل تیاری اشد ضروری ہے:

دعوت نامے کا کبھی 'اعتبار' نہ کریں

دعوت کے وقت کا اندراج، میزبان کی ایک چال ہوتی ہے۔ ایسی چالوں میں چند اناڑی اور وقت کے پابند قسم کے افراد آ جاتے ہیں۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ جب کچھ لوگ شادی کے مقررہ ہال یا لان میں جمع ہو کر اُلوؤں کی طرح ایک دوسرے کو اور بیرے وغیرہ اُن کو دیکھیں، تو میزبان اپنے گھر پر مخصوص لوگوں کے بیچ میں ان وقت پر پہنچنے والوں کی بے وقوفی پر قہقہے لگائے، لوٹ پوٹ ہو جائے۔ یہ ایک ایسی تفریح ہے، جسے اَب شاذ ہی کوئی میزبان کھونا چاہے گا۔ آپ میزبان کی چال کو اُسی پر الٹ دیجیے۔ ہمیشہ دعوت کے مقررہ وقت سے کم اَز کم تین گھنٹہ یا اس سے بھی دیر بعد پہنچیں۔

آنتوں کو قل ہو اللہ نہ پڑھنے دینے کی مشق

کچھ عقل مند، شادی کی دعوت کا سنتے ہی ایک یا دو وقت کا کھانا چھوڑ دیتے ہیں تا کہ دعوت میں خوب جم کر کھا سکیں۔ انہیں تو یہ بھی پتا نہیں کہ آج کل میزبان کھانا تو پکواتے ہیں لیکن یہ مہمانوں کو وقت پر اور عزت کے ساتھ کھلا کر اُن کی دعائیں لینے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ مختلف لوگوں سے مختلف اوقات کی بے عزتیوں کا بدلہ لینے کے لیے ہوتا ہے۔ یہ کہنا بھی بڑی شان کی بات ہے کہ ہمارے یہاں کھانے کی اتنی دیگیں بچ گئیں، جن کو دوسرے روز کتوں اور بلیوں نے بھی کھایا۔ اگر اپنی آنتوں کو تکلیف سے بچانا چاہتے ہیں، تو ہمیشہ اپنے گھر پر کھانا کھا کر دعوت میں جائیں۔ وہاں اگر کھانا مل بھی گیا تو پھر رسماً چھونا ہی تو ہے۔ بچوں کو بھی دعوت سے پہلے ٹھونس کر کھلائیں تا کہ وہ شادی ہال یا لان کے باہر ٹھیلے پر ملنے والی چیزوں سے اپنے پیٹ بھر کر اور آپ کی جیبیں خالی کر کے، پیٹ میں گڑبڑ کی شکل میں آپ کو اسپتال کی شکل نہ دکھائیں۔

شادیوں میں آخر میں پہنچنے کی مشق کریں

یعنی رات بارہ بجے سے دو بجے رات تک۔ اگر جو غلطی سے کہیں پہلے پہنچ گئے، تو پھر میز پر طبلہ بجائیں۔ رسمی علیک سلیک سے وقت گزاریں۔ سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کریں، لیکن کن اکھیوں سے بیروں کی حرکات پر نظر رکھیں کہ اب وہ اسپرٹ کی شمع لگا رہا ہے، اب طباق میں گرم پانی ڈال رہا ہے، وغیرہ۔ پلیٹیں کس طرف لگائی گئی ہیں اور آپ اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے کیا کیا لیں گے وغیرہ وغیرہ:

وہ اُدھر دیکھتے ہیں، بات اِدھر کرتے ہیں

اپنے غصہ پر قابو رکھنا سیکھیں

کبھی ہتھے سے نہ اکھڑیں۔ کھانا میزبان کی مرضی سے ہی کھولا جائے گا، آپ کے نتھنے پھڑکانے سے نہیں!

اپنی گاڑی نہ ہونے کی صورت میں

ایسے لوگوں کو پہلے دیکھ لیں جو آپ کو واپسی میں گھر پہنچا سکتے ہیں۔ انہی سے گاڑھی چھنائیں،

ورنہ رات دو بجے ٹیکسی رکشا والوں کی منت سماجت کے لیے تیار رہیں۔

قریب کے شادی ہال یا لان بھی لگے ہاتھوں دیکھ ڈالیں

خالی لفافہ اپنی قمیص کی سامنے کی جیب میں تھوڑا سا باہر نکلا ہوا رکھیں۔ چھوٹا موٹا ہار بھی ہاتھ میں رکھیں۔ باتوں باتوں میں کھانے کی قسم کے متعلق معلوم کریں۔ اگر اقسام پسند ہوں، یا دوسرے ہال میں آپ کے اپنے ہال سے بہتر کھانا ہو، یا پہلے کھلایا جا رہا ہو، تو پھر دیر نہ کریں۔ یہ احتیاط رکھیں کہ 'رسمِ ختنہ' میں شادی کی مبارک باد نہ دے آئیں۔

کچھ شادیوں میں یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جیسے ہی بیروں نے قاب پر سے ڈھکن اُٹھائے، ایک ہجوم اس جوش و خروش سے اُٹھ کھڑا ہوا، جیسے شیطان کو کنکریاں مارنے جا رہا ہو۔ ایسے میں کچھ لوگ کھڑے ہوتے ہیں، لیکن اپنے پاؤں پر نہیں چلتے، بلکہ ہوا میں اُڑتے ہوئے کھانے تک جا پہنچتے ہیں۔ کچھ لوگ جنگ و جدل کی کیفیت میں کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اپنے کپڑوں کو بھی کھانا نوش کرواتے ہیں۔ کہیں قاب کے چمچ سے ہاتھا پائی ہوتی ہے۔ کوئی، چمچ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے کھیر ہاتھوں سے نکال اور کھا رہا ہوتا ہے۔ کہیں کوئی کسی مخصوص بوٹی کی تلاش میں، قطار میں لوگوں کے موجود ہونے کے باوجود، پوری قاب کھنگال رہا ہوتا ہے۔ کہیں کوئی پوری قاب ہی اپنے سامنے رکھ کر کھا رہا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ شامیانے گرنے کے واقعات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ کہیں کھانا ختم ہو جاتا ہے، میزبان بغلیں بجا رہے ہوتے ہیں اور مہمان چمچے قبضے میں کیے، ایک دوسرے کو مخاصمانہ نظروں سے گھور رہے ہوتے ہیں۔ ایسے میں بچے میزوں کے گرد 'پکڑنی' کھیل رہے ہوتے ہیں اور مائیں اپنے اپنے لالوں پر صدقے ہو رہی ہوتی ہیں۔ اگر آپ کا دل ہڈی یا بوٹی کھینچ مارنے کو بھی چاہ رہا ہو تو دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ چند سر پھرے آپ کو مزید راحت پہنچانے کے لیے ہوائیاں چلاتے ہیں۔ آتش بازی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، جس سے مہمان تتر بتر ہو جاتے ہیں اور میزبان سکون کا سانس لیتا ہے۔

* *

گنجِ گرانمایہ!

ڈاکٹر محمد یونس بٹ

وہ ادب کے گنجِ گرانمایہ میں سے ہے۔ اُس کا سر اُوپر سے خالی ہے، حالاں کہ ہمارے ہاں شعراء کا اندر سے خالی ہوتا ہے! اُس کے پاس سنوارنے کو بال نہیں تو کیا ہوا، دھونے کو منہ تو بہت ہے۔ بات بات پر لطیفہ سناتا ہے۔ جس دن محفل میں سنجیدہ ہو، دوستوں کو اس کی صحت کی فکر ہونے لگتی ہے۔ لطیفہ سنانے سے پہلے ہی ہنسنے والوں کو ہنسا لے گا کہ بعد میں کیا پتا کوئی ہنسے یا نہ ہنسے۔ چپ رہنا اس کے لیے مشکل ہے، حالاں کہ یہ تو اتنا آسان ہے، اس کے لیے زبان تک نہیں ہلانا پڑتی۔ امجد اسلام امجد بات کر رہا ہو تو کسی کا لحاظ نہیں کرتا، جب لحاظ کر رہا ہو تو بات نہیں کرتا، بُرے کی بات سن لیتا ہے، مگر بُری بات نہیں سنتا، اگر بُری بات سننا چاہے تو بولنے لگتا ہے، زمانۂ طالب علمی میں بھی اس کے موسلا دھار بولنے کی وجہ سے استاد اُسے اُٹھا کر اسٹیج پر بٹھا دیتا۔ اب اتنا بڑا ہو گیا ہے، مگر تقریبات میں آج بھی اسے اُٹھا کر اسٹیج پر بٹھا دیتے ہیں۔ اُس کے بارے میں وہ لوگ بھی اچھی رائے رکھتے ہیں، جو اس سے ایک بار بھی نہیں ملے۔ شاید اچھی رائے کی وجہ بھی یہی ہو!

باتوں باتوں میں خوب صورت عورتوں کو شیشے میں اُتار لیتا ہے، مگر خود اُن کی موجودگی میں زیادہ سے زیادہ جرابیں ہی اُتار سکتا ہے۔ عورتوں سے ملنے سے پہلے، جہاں دوسرے بال، ٹائیاں اور چشمے ٹھیک کر رہے ہوتے ہیں، یہ نیک ٹھیک کر رہا ہوتا ہے۔ اس نے جو چاہا وہ حاصل کیا، بلکہ جو حاصل کیا وہی چاہا۔

امجد ہر کام میں اپنے بہن بھائیوں میں اوّل رہا، وہ تو پیدا ہونے کے معاملے میں بھی اوّل آیا۔ اُس کا گھرانہ ایسا مذہبی تھا کہ خواتین اُردو شعروں سے بھی پردہ کرتیں، مگر اُس نے اس کو ذریعۂ عزت بنایا، جسے غالبؔ نے بھی ذریعۂ اظہار ہی بنایا تھا۔ سارے کام اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ اُس نے تو شادی بھی اپنی مرضی سے کی، حالاں کہ ہمارے ہاں بندے کو اپنی مرضی سے شادی کرنے کا

موقع اس وقت ملتا ہے، جب وہ اپنی اولاد کی شادی کرتا ہے۔ ویسے ہمارے ہاں شادی کے بعد مرد خود کو اور عورت اپنی قمیصوں کو تنگ محسوس کرتی ہے، مگر امجد شادی شدہ ہو کر بھی گھر میں زیادہ رہتا ہے، جس سے یہی لگتا ہے کہ اسے شادی شدہ عورتیں بہت پسند ہیں۔

پہلے لمبریٹا اسکوٹر پر سوار پھرا کرتا تھا، جس پر سفر کرنا دراصل پیدل چلنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہی ہوتا تھا، وہ اور اس کا جڑواں دوست، عطاء الحق قاسمی، جہاں کوئی بارات دیکھتے، اس میں شامل ہو جاتے، جس سے کسی اور کو کوئی فرق پڑتا نہ پڑتا، بارات کے ساتھ آنے والے بھانڈوں کی آمدنی آدھی رہ جاتی۔ یہ دونوں دولہے کے پاس جا کر اُسے کہتے، ”اچھا موقع ہے، اب بھی انکار کر دو۔“ مگر امجد کی شادی ہوئی تو عطا نے کہا تھا، ”اچھا موقع ہے چپ کر کے بیٹھے رہو۔“ اگرچہ اب دونوں عمر کے اس حصے میں ہیں، جہاں بُری بات بُری لگنے لگتی ہے، مگر اَب بھی جہاں اکھٹے ہوں، وہاں لوگ اکھٹے ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ وہ باتیں کرتے ہیں کہ سننے والا ٹین ایجر ہو تو اُسے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرنا پڑتی ہیں۔

اخبار پڑھتا نہیں دیکھتا ہے اور لوگوں کو دیکھتا نہیں پڑھتا ہے۔ ایک ہی ملاقات میں اس قدر بے تکلف ہو جاتا ہے کہ دوسرا گھبرانے لگتا ہے کہ کہیں قرض ہی نہ مانگ لے! دوسروں کی باتیں اس توجہ اور پیار سے سنتا ہے، جیسے بچوں کو سن رہا ہو۔ سمجھتا بھی یہی ہے۔ کرکٹ پسند ہے۔ بہت اچھی باؤلنگ کراتا ہے، جو مخالف ٹیم کے لیے بہت اچھی ہوتی ہے! محنت سے نہیں گھبراتا، بندہ اسے کنگھی کرتا دیکھ لے تو اُسے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے۔

ہمیشہ آٹوگراف بک پر لکھتا ہے۔ ”جو بھی کچھ ہے، محبت کا پھیلاؤ ہے“ اگر آٹوگراف لینے والی خاتون اُمید سے نہ ہو، پھر بھی یہی لکھتا ہے۔ اس کا پسندیدہ رنگ بلیو ہے۔ یہ رنگ ہمیں بھی پسند ہے، بشرطیکہ فلم کا ہو!

کھانا اُس وقت ختم کرتا ہے، جب کھانا ختم ہو جائے۔ اسے علم ہوتا ہے کہ لاہور میں اچھا کھانا کہاں سے ملتا ہے اور لوگ اس کے علم سے استفادہ کرتے ہیں۔ اسی لیے جب کوئی نیا ریستوران کھلتا ہے تو وہ اسے بتا کر سمجھتے ہیں کہ آدھے شہر کو بتا دیا۔ اسے کھلا کر بھی یہی سمجھتے ہیں! پیٹ بھر کر کھائے نہ کھائے، پلیٹ بھر کر ضرور کھائے گا۔

امجد اسلام پہلے مختصر، تخلص کرتا تھا اور جب کسی مشاعرے میں پڑھتا، مختصر مختصر کی آوازیں

آتیں۔ اب تو وہ امجد ہو گیا ہے۔ شاعری اور ڈرامے نے اسے عزت نہیں دی، اُس نے انہیں عزت دی ہے۔ اس کے اس قدر دوست ہیں کہ اسے پتا نہیں کون کون اس کا دوست ہے۔ دوستوں کی اس کے بارے میں بھی یہ رائے ہے۔ امجد ہر لحاظ سے ایک مکمل انسان ہے، یعنی اس میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں، جو انسان کو فرشتہ بننے سے روکے ہوئے ہیں۔

✡ ✡

کچھ مزاحیہ اقتباسات

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی

'توبۃ النصوح' میں نصوح اپنی بیماری اور خیالات میں تبدیلی کے بعد اپنی بیوی فہمیدہ سے اپنے بچوں کی محبت و عادات اور تربیت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اپنے لڑکوں کی وضع قطع اور طور طریقوں سے وہ انتہائی نالاں ہے، چنانچہ کہتا ہے:

"... ایک نابکار کو دیکھو کہ وہ ماش کے آٹے کی طرح ہر وقت اینٹھا ہی رہتا ہے۔ کبھی سینے پر نظر ہے، کبھی بازوؤں پر نگاہ ہے آدم زاد ہو کر لقا کبوتر کا پٹھا بنا پھرتا ہے۔ اتنا اکڑتا ہے اتنا اکڑتا ہے کہ گردن گدی میں جا لگی ہے۔ کپڑے ایسے چست کہ گویا بدن پر ہی سیے گئے ہیں..."

"دوسرا ناہنجار صبح اُٹھا اور کبوتر کھول باپ دادا کا نام اُچھالنے کو ٹھے پر چڑھا۔ پھر سوا پہر دن چڑھے تک وہیں دھما چوکڑی مچائی۔ مارے باندھے مدرسے گیا۔ عصر کے بعد پھر کوٹھا ہے اور کنکوا ہے..."

"تیسرے نالائق بڑے میاں سو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ! محلّہ نالاں، ہمسائے عاجز، اِس کو مار اُس کو چھیڑ، چاروں طرف ایک تراہ تراہ مچی رہی ہے... ان کی حرکات و سکنات، نشست و برخاست کوئی بھی تو بھلے مانسوں کی سی نہیں، گالی دینے میں ان کو باک نہیں، فحش بکنے میں ان کو تامل نہیں، قسم ان کا تکیہ کلام، نہ زبان کو روک نہ منہ کو لگام ہے۔"

'فسانۂ مبتلا' میں مبتلا اپنی پہلی بیوی غیرت بیگم سے دوسری بیوی کی آمد کے متعلق پوچھتا ہے تو وہ غضبناک ہو کر یوں جواب دیتی ہے:

"... واہ چوری اور سینہ زوری! آج کو بڑے ماموں جان ہوتے تو اُلٹے استرے

سے مردار کا سر منڈوا دیتے اور تم کو تو اپنی لاج کا پاس لحاظ، آج کیا برسوں سے نہیں۔ بڑے ماموں جان کی زندگی تک چوری چھپے کرتے تھے، وہ مرتے تو کھل کھیلے۔ مردانہ مکان تو مدتوں سے کنچنیوں کا چکلہ ہو رہا ہے۔ ایک زنانہ مکان بچا تھا، سو میں خوب جانتی ہوں کہ تم اُس کی تاک میں لگے ہو، مگر جب تک میں جیتی ہوں، دیکھوں تو کون رستم کی جنی میری ڈیوڑھی کے اندر پاؤں رکھتی ہے۔ اپنا اُس کا خون ایک کر دوں تو سہی...''

* *

راجہ اور راجندر

راجہ مہدی علی خان

راجندر سنگھ بیدی صاحب کا نام شاید آپ نے سنا ہو گا۔ نہیں بھی سنا تو کوئی حرج نہیں۔ آخر اس میں شرمانے کی کیا بات ہے، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ سب قصور بیدی صاحب کا ہے جو ابھی تک پورے ملک سے اپنے آپ کو متعارف نہ کرا سکے۔ اور اب کیا متعارف کرائیں گے۔

کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ "لڑکے! ان حرکتوں سے باز آ جا اور کچھ کر! نہیں تو ایک دن گمنامی کی موت مر جائے گا۔" لیکن اس ظالم نے مجھے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ "راجہ صاحب! اس دنیائے ناپائیدار میں نام پیدا کرنے کا کیا فائدہ! دوسری دنیا میں نام پیدا کرنے کا کیا فائدہ! دوسری دنیا میں نام پیدا کرنا چاہیے دنیا کا چمن تو یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور اپنی اپنی بولیاں بول کر اڑ جائیں گے:

دو دن کر لے غٹرغوں غوں دنیا کبوتر خانہ ہے   تھوڑا ہنسنا تھوڑا رونا پھر اوپر اُڑ جانا ہے

راجہ صاحب! افسانوں اور افسانوں کے خود ساختہ کرداروں سے زیادہ اہم وہ کردار ہیں، جو خدا نے زندگی کے اسٹیج پر ان کی جیب میں کچھ پیسے ڈالے بغیر بھیج دیے ہیں۔ ہمیں رازقِ مطلق کا پارٹ ادا کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً ان کی جیب میں کچھ نہ کچھ ڈالتے رہنا چاہیے۔"

آپ اب از راہِ کرم و اَدب نوازی۔ افسانہ نگاری کے مسئلے پر تھوڑی دیر کے لیے لعنت بھیج دیجیے اور بیدی صاحب سے ملیے۔

بیدی صاحب ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں مقبول ہوں نہ ہوں، ملک کے ایک خاص طبقے میں بے حد مقبول اور ہردلعزیز ہیں، سچ پوچھیے تو یہ خاص طبقہ شاعروں اور ادیبوں

اور اس کی خوشحالی اور اہمیت کے زیادہ تر ذمہ دار خود
کے طبقے سے بدرجہا زیادہ اہم اور خوشحال ہے
بیدی صاحب ہیں اور جب تک زندہ ہیں خدا انہیں عمر خضرؑ عطا فرمائے) اس طبقے کے لاکھوں افراد
کبھی بھوکے نہ مر سکیں گے۔

آپ سوچیں گے کہ آخر ملک کا وہ کون سا طبقہ ہے، جس کے بیدی صاحب دیوانے ہیں۔
کانگریسی؟ نہیں۔ مہا سبھائی، نہیں۔ جن سنگھی؟ نہیں۔ نیشنلسٹ؟ نہیں، موچی؟ نہیں چلیے اب میں
آپ کو زیادہ زحمتِ انتظار نہیں دوں گا۔

آپ لوگ یہ سن کر شاید خوش ہی ہوں گے کہ بیدی صاحب کی یہ محبوب جماعت ملک کے
لچوں، لفنگوں، بیکاروں اور نکموں کا عظیم الشان طبقہ ہے۔ بیدی صاحب کے تمام دوست اور دشمن
اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور شاید یہ خاکسار بھی بیدی صاحب کے... متعلق کچھ کہنے پر میں
نے کمرِ ہمت تو باندھ لی ہے، مگر سوچتا ہوں کہ ان کے متعلق کیا بتاؤں کیا نہ بتاؤں۔ سچ پوچھیے تو
بیدی صاحب کا دوست ہونے کے باوجود میں ان کی عظمتوں سے کما حقہ واقف نہیں۔ قلم بار بار کچھ
سوچ کر رُک جاتا ہے۔ سمجھ لیجیے کہ مجھے اتنا معلوم ہے کہ کئی دوسرے بُرے کام کرنے کے علاوہ افسانے
بھی لکھتے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ 'ایک چادر ملی سی' سائبیریا میں بہت پاپولر ہوا تھا۔ جونہی یہ افسانہ
سائبیرین زبان میں منتقل ہوا۔ اہلِ سائبیریا میں سنسنی پھیل گئی اور انہوں نے اپنے رینڈیروں کی
دموں پر انگلی رکھ کر قسم کھائی کہ آئندہ ہم کبھی اپنی میلی چادریں نہ دھوئیں گے صرف اسی افسانے کو
پڑھا کریں گے اور کرشن چندر کا کوئی افسانہ سائبیرین زبان میں منتقل نہ ہونے دیں گے۔

پچھلے دنوں ایک روسی ادیب بیدی صاحب سے انٹرویو لینے آیا تو اس نے علاوہ دوسرے
سوالوں کے ایک سوال یہ ہی پوچھا کہ مسٹر بیدی! آپ نے صاف دل اور صاف باطن ہونے کے
باوجود اپنے اس افسانے کا نام 'ایک چادر اجلی سی' کے بجائے 'ایک چادر میلی سی' کیوں رکھا؟"

بیدی صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا، "موسیلو! ہندوستان کے زیادہ تر لوگ غریب
ہیں۔ ان کے پاس کپڑے دھونے کے لیے صابن نہیں ہوتا۔ ان کی دل شکنی کا امکان تھا اس لیے میں
نے افسانے کا نام 'ایک چادر میلی سی' رکھنا مناسب سمجھا۔ جب ہندوستان خوشحال ہو جائے گا تو آنے
والی نسلیں خود میرے افسانے کا نام بدل دیں گی۔" یہ کہہ کر بیدی صاحب پر رقت طاری ہو گئی۔
بیدی صاحب کی حالت دیکھ کر اور ان کا درویشانہ جواب سن کر انٹرویو لینے والے پر بھی

رقت اور وحشت کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے اپنا گریبان پھاڑ ڈالا اور اپنے سر میں بہت سی خاک اور کپڑوں پر بہت سی راکھ مل لی۔ اپنا سوٹ اپنی ٹائی، اپنا بوٹ ایک غریب کمیونسٹ مزدور کو پیش کر کے بیدی صاحب کی ایک چڈی پہن لی۔ بیدی صاحب نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ دونوں کمیونسٹ دوست ایک دوسرے سے ہمکنار ہو کر کئی گھنٹوں تک زار زار روتے رہے۔ اس کے بعد یکا یک کمیونسٹ درست 'ورکرز' کا نعرہ لگا کر اٹھا اور چڈی سمیت روس کی سرزمین کو پیدل بھاگ گیا۔

بیٹھے بیٹھے اسے کیا جانیے کیا یاد آیا

بحیثیت دوست مجھے راجندر سنگھ بیدی صاحب کے بارے میں صرف ایک ہی بات قطعی طور پر معلوم ہے وہ یہ کہ بیدی صاحب بہت سی قابل اعتراض خوبیوں کے مالک ہیں۔ ان خوبیوں کو بعض لوگ صریحاً خرابیاں بھی کہہ سکتے ہیں، یہ اپنا اپنا ذوق ہے اور بھارت کی سیکولر حکومت میں ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ جیسی چاہے خوبیاں یا خرابیاں اپنے اندر پیدا کر لے۔

بیدی صاحب بعض لوگوں کے نزدیک خوش قسمتی سے اور بعض لوگوں کے نزدیک بدقسمتی سے بڑے ہی بدقسمت واقع ہوئے ہیں۔ بدقسمتی کا نام انہوں نے اپنے دل کی تسلی کے لیے 'خوش قسمتی' رکھ لیا ہے اور یہ بھی کوئی بری بات نہیں۔

بیدی صاحب نے ایک مرتبہ اپنے ایک دوست سے کہا تھا کہ "اس لحاظ سے میں بڑا ہی خوش قسمت ہوں کہ میرا کوئی دوست یا دشمن ایسا نہیں جو کم اَز کم پانچ سال تک میرے یہاں مہمان نہ رہا ہو۔" ان کے دوست بظاہر سوٹ پہننے والے ٹائی لگانے والے، تعلیم یافتہ انسان ہیں، مگر بباطن کوئی موچی ہے، کوئی چمار ہے اور کوئی لوہار۔ میرا مقصد خدانخواستہ کسی پیشے کی تذلیل کرنا نہیں۔ شاعری، افسانہ نگاری اور مضمون نویسی بھی تو کچھ ایسے ہی پیشے ہیں۔

میرا مطلب صرف یہ ہے کہ بیدی صاحب کے ان بے شمار پیارے دوستوں کی مہمان نوازی، مستقل رہائش، کھانے پینے اور جیب خرچ کا انتظام بھی بیدی صاحب کے ذمے ہے۔ میں خود بھی سات آٹھ سال بیدی صاحب کا مستقل مہمان رہ چکا ہوں۔

بیدی صاحب کے یہاں کوئی مہمان زیادہ سے زیادہ پانچ سال تک رہ سکتا ہے۔ اگر پھر بھی ازراہِ محبت ان کا دامن نہ چھوڑنا چاہے تو بیدی صاحب اسے نیا مکان کرائے پر لے دیتے ہیں اور

ہر ماہ اسے خرچ کے لیے ایک خاص رقم پہنچا دی جاتی ہے جسے عموماً پنشن کہا جاتا ہے۔

بیدی صاحب اکثر کہا کرتے ہیں کہ لفظ 'نہیں' گنہگاروں کی لغت میں لکھا ہے۔ چنانچہ اہل کمال اس کے اس طے شدہ اُصول سے خوب فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ کوئی عمر بھر کے لیے ان کا مہمان بن جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے، ''میں مہمان بن کر آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ میرا حصہ ہر ماہ فلاں شہر فلاں پتے پر بھیج دیا کیجیے۔'' کوئی ان کی جیبوں کی تلاشی لے کر آنے پائیاں تک نکال لے جاتا ہے۔ کوئی ان کی بینک کی پاس بک نکال کر سادہ چیک پر ان سے دستخط کرا کے رقم خود بھر لیتا ہے۔ وہ کس سے 'نہیں' نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سردار راجندر سنگھ بیدی کے بجائے بعض لوگ انہیں سردار مروّت سنگھ بیدی بھی کہتے تھے۔

بیدی صاحب جن دنوں بہت قلاش ہوتے ہیں اور ان کا کوئی دوست یا دشمن اپنے گھر کے دردناک حالات سنا کر اس سے رحم کا طالب ہوتا ہے تو وہ جب بھی اسے اپنے در سے ناکام نہیں لوٹاتے۔ کہیں سے ہزار دو ہزار روپیہ قرض لے کر اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ساتھ ہاتھ جوڑ جوڑ کر اس سے معذرت بھی کرتے ہیں کہ ''بڑی کوشش کی، مگر دو ہزار سے زیادہ رقم کہیں سے نہ مل سکی۔'' اگر مانگنے والے کی حالت پر انہیں بہت ہی رحم آ جائے تو روپیہ دینے کے بعد اظہارِ افسوس کے طور پر اس سے گلے مل کر خوب رو بھی لیتے ہیں۔ اکثر رو رو کر بے ہوش ہو جاتے ہیں اور قرض لینے والا پیسے جیب میں ڈال کر انہیں اسی مخدوش حالت میں چھوڑ کر چمپت ہو جاتا ہے۔

بیدی صاحب کے گھر میں جب مہمان دوستوں یا مہمان دشمنوں کی تعداد پچاس سے زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ بال بچوں سمیت 'کلیان رفیوجی کیمپ' میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ تمام روپیہ چوں کہ مہمانوں کے حوالے کر آتے ہیں اس لیے کلیان کیمپ میں بال بچوں سمیت یا تو بھوکے رہتے ہیں یا بھیک مانگ کر گزارا کرتے ہیں۔ اب اتنا حق تو ہر شخص کو حاصل ہے کہ وہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان بچانے کے لیے کچھ بھی کرے۔

راجندر سنگھ بیدی صاحب... کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ ایک کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ مشہور شاید وہ ہوں گے، لیکن انہیں کھاتے یا پیتے میں نے کبھی نہیں دیکھا، البتہ ان کے مہمانوں کو دن میں پانچ چھ مرتبہ کھاتے پیتے ضرور دیکھا ہے۔ وہ چھپ چھپ کر کھاتے یا پیتے ہوں تو دوسری بات ہے۔

بیدی صاحب کا گھرانہ بڑا پیارا گھرانہ ہے۔ ان کی ایک بچی تو بہت چھوٹی ہے، جو شاید تعلیم

حاصل کرتی ہے۔ بڑی بچی کی شادی کر دی گئی ہے۔ مسز بیدی ابھی اس بچی کی شادی کی مخالف تھیں وہ اسے مزید تعلیم دلانا چاہتی تھیں۔ لیکن ایک دن بیٹھے بیٹھے جانے بیدی صاحب کو کیا خیال آیا کہ اس بچی کی شادی کے درپے ہو گئے، کہنے لگے "مجھے خیال آیا ہے کہ اس بچی کی شادی کر دینا ضروری ہو گیا ہے۔ اگر اس کی شادی ہو جائے تو اس کے حصے کا کھانا اور کپڑا کسی غریب بچی کو مل سکتا ہے۔ ایشیا کی ہر بچی میری اپنی بچی ہے۔ اس بچی کو میں نے کافی لکھا پڑھا دیا ہے۔ پالا پوسا ہے۔ وہ اپنا حق لے چکی ہے اب دوسروں کی باری ہے چنانچہ اس بچی کی شادی کر دی گئی۔ ان کی دوسری بچی دعائیں مانگتی رہتی ہے کہ "اے خدا مجھے بہت جلدی بڑا نہ کر دینا اور نہ ڈیڈی مجھے بھی گھر سے نکال دیں گے۔"

بیدی صاحب کے دو صاحبزادے ہیں۔ ایک ہو بہو سردار راجندر سنگھ بیدی ہے۔ اس بچے میں اور ایک گائے میں کوئی فرق نہیں۔ بڑا ہی پیارا اور معصوم ہے۔ بیدی صاحب نے اسے زمانے کی ہوا نہیں لگنے دی۔ سنا ہے بیدی صاحب نے اسے ایک کمرے میں مقفل رکھ کر پالا ہے۔ یہ بچہ ماڈرن دنیا اور اس کے لوازم سے بالکل بے خبر ہے۔ اس بچے نے جواَب تک ماشاء اللہ جوان بھی ہو گیا ہے۔ نہ ہوائی جہاز دیکھا ہے، نہ ٹرینیں، نہ بسیں، نہ کرشن چندر۔ ایک مرتبہ بیدی صاحب صبح صبح اسے سیر کرانے لے گئے تو راستے میں ایک مرغا نظر پڑا۔ بد قسمتی سے مرغے نے اذان دے دی۔ برخوردار ڈر کر بیدی صاحب سے چمٹ گیا۔ اور کہنے لگا، "ڈیڈی یہ کون صاحب ہیں؟ اور اتنے زور زور سے کیوں رو رہے ہیں؟ کیا انہیں بھی پیسے کی ضرورت ہے؟"

بیدی صاحب بغیر جواب دیے جلدی سے اسے گھر گھسیٹ لائے۔ اور اس کو اس کمرے میں مقفل کر دیا، جس میں اس بچے نے اپنے بچپن کے بہت سے دن گزارے تھے کہ اسے زمانے کی ہوا نہ لگ جائے۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ اس لڑکے نے ایک دن اپنے گھر کے قید خانے کی کھڑکی سے ہاتھی گزرتے دیکھ لیا تو بے چارہ وہیں بے ہوش ہو گیا کہ جانے کیا چیز ہے۔

بیدی صاحب کے دوستوں کو جب اس واقعے کا علم ہوا تو انہوں نے بیدی صاحب کے قدموں پر سر رکھ کر اسے 'قید خانے' سے نجات دلائی اور کئی دن کے بحث مباحثے کے بعد بیدی صاحب کو قائل کر دیا کہ اس بچے کے لیے اسکول جا کر تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ بیدی صاحب نے اس شرط پر لڑکے کو اسکول جانے کی اجازت دے دی کہ وہ برقع پہن کر ٹیکسی میں بیٹھے، اسکول

جائے اور برقع پہن کر واپس آئے۔

بیدی صاحب کا دوسرا لڑکا بیس بائیس سال کا دبلا پتلا ہونہار جوان ہے۔ بیدی صاحب نے اسے بھی قید خانے ہی میں پالنے کی کوشش کی تھی، لیکن لڑکا بے حد ذہن اور چالاک تھا۔ منہ پھٹ اور آنکھوں میں ذہانت کی ایسی چمک کہ اندھیرے میں آنکھیں کھول دے تو تاریکیاں جگمگا اُٹھیں۔ وہ بیدی صاحب کے 'قید خانے' میں زیادہ دن نہ رہ سکا۔ ایک دن کمرے کی کھڑکی کی سلاخیں توڑ کر نکل بھاگا۔ اس لڑکے کا نام سردار نریندر سنگھ بیدی ہے۔ سردار نریندر سنگھ سلمہٗ نے رات کے 9½ بجے کے قریب قید خانے سے فرار ہو کر سب سے پہلے ایک ہیر کٹنگ سیلون میں پناہ لی۔ ایک گھنٹہ بعد جب وہ سیلون سے باہر نکلا تو نہ وہ 'سردار' رہا تھا نہ 'سنگھ' صرف نریندر بیدی ہو کر رہ گیا تھا۔ نریندر فارغ البال ہو کر رات کے گیارہ بجے گھر پہنچا۔ گھر کی دیوار پھاند کر صحن میں کودا۔ وہاں سے شرم کے مارے منہ چھپاتا ہوا دوڑ کر خواب گاہ میں پہنچا ہی تھا کہ گھر کے لوگوں نے اسے دیکھ لیا۔ نریندر کو کلین شیو اور کلین ہیڈیڈ دیکھ کر گھر کے کسی فرد نے نہ پہچانا، گھر کے سب لوگ ہاتھوں میں لکڑیاں لے کر چور چور کہتے ہوئے اس پر ٹوٹ پڑے۔

اس نے بہتیرا شور مچایا کہ میں چور نہیں ہوں سردار نریندر سنگھ بیدی ہوں، مگر کسی نے اس کی ایک نہ مانی۔ سب چلا چلا کر کہنے لگے، "کیا سردار نریندر سنگھ بیدی ایسا ہوتا ہے؟" اور بیدی صاحب بولے:

"چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد"

ایک تو چوری کی نیت سے گھر میں کودا۔ دوسرے کلین شیلون ہو کہ اپنے آپ کو سردار کہہ رہا ہے۔ چار سو بیس کہیں کا۔"

چنانچہ گھر کے سب لوگوں نے اسے نہ پہچانتے ہوئے پولیس اسٹیشن بھیج دیا۔ لڑکا ذہین اور چالاک تھا۔ اس نے فوراً پولیس اسٹیشن سے مجھے ٹیلی فون کیا کہ "میں کیرالا ہیر کٹنگ سیلون میں جا کر فارغ البال ہو گیا ہوں۔ گھر کے لوگوں نے مجھے نہیں پہچانا اور بیدی صاحب چور سمجھ کر مجھے پولیس اسٹیشن میں ڈپازٹ کرا گئے ہیں۔ ہزاروں چوروں، ڈاکوؤں کو گھر میں پناہ دیتے ہیں اور چوں کہ میں گھر کا چور تھا، اس لیے انہوں نے مجھ پر لنکا ڈھانی ضروری سمجھی اور میرے لیے سب سے مناسب جگہ پولیس اسٹیشن ہی سمجھ بیٹھے۔ خدا کے لیے آ کر میری جان چھڑائیے۔"

انور احمد علوی

میں فوراً پولیس اسٹیشن پہنچا۔ ایک لمحے کے لیے میں بھی نریندر کو نہ پہچان سکا۔ اس وقت پہچانا جب وہ مجھے دیکھ کر ہنس پڑا۔

میں نے اپنے چہرے پر غصے کے نقلی تاثرات پیدا کرتے ہوئے اسے خوب ڈانٹا اور پھٹکارا اور کہا، ''شرم نہیں آتی، ایک تو اتنی بری حرکت کر بیٹھے ہو، دوسرے ڈھٹائی سے اب ہنس بھی رہے ہو۔''

وہ ہنس کر بولا، ''انکل! میں خوب سمجھتا ہوں۔ آپ اندر سے خوش اور باہر سے ناراض ہو رہے ہیں۔ میں انڈین مسلمز کو اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''بکو نہیں!'' کہہ کر میں نے اس کی ضمانت دی اور چھڑا لیا۔ اسے اس کے گھر لے چلا تو وہ بولا، ''انکل! آج رات تو میں آپ ہی کے گھر رہوں گا۔ کل صبح دونوں ساتھ چلیں گے کہیں ایسا نہ ہو کہ رات کے اندھیرے میں میرے ساتھ آپ بھی پٹ جائیں۔''

دوسرے دن میں نریندر کو اس کے گھر پہنچا آیا۔ اب نریندر بیدی پر گھر کے لوگوں نے خاندان والوں نے اور سوسائٹی نے جو جو ستم کیے اور 'مبارکباد' کے جو جو خوب صورت ہار پہنائے اس کی تفصیل نریندر ہی سے پوچھیے۔ نہ پوچھیں تو اور بھی اچھا ہے۔ سماج کے معاملات میں زیادہ دخل دینا اچھا نہیں ہوتا۔

نریندر ایک ذہین، عقلمند، ہوشیار اور عملی نوجوان ہے! منہ پھٹ اور صاف گو۔ بیدی صاحب نے اس کا نام مرکھنا بیل رکھا ہے۔ وہ اسے ہر وقت غیر مناسب ٹائپ کی نصیحتیں کرتے رہتے ہیں۔ قسمیں کھا کھا کر اسے دنیا کے غیر فانی ہونے کا یقین دلاتے رہتے ہیں۔ نریندر جواب دیتا ہے کہ ''ڈیڈی! اوّل تو دنیا فانی ہی نہیں ہے، سب پرانے ڈھکوسلے ہیں۔ اگر دو منٹ کے لیے مان بھی لیا جائے کہ دنیا فانی ہے تو پھر مجھ کو اور آپ کو اس کی ہر نعمت سے جلد از جلد محظوظ ہو لینا چاہیے:

زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نہ ماند

سب چوروں اور ڈاکوؤں کو اب اپنی شرافت کی قید سے رہائی دے دیجیے۔ ہماری گورنمنٹ نے ان سب کے لیے ہزاروں جیلیں کھول رکھی ہیں کیوں نہ ہم انہیں وہاں بھیج کر امن اور چین کی زندگی بسر کریں۔ آخر آپ نے نیک اعمال کر کے روحوں کی بے چینی اور درد و کرب کے سوا کیا

حاصل کیا ہے۔ اگر کوروؤں اور پانڈوؤں کے زمانے میں آپ ہوتے تو جنگ مہابھارت نہ ہوتی۔ اور اگر جنگ مہابھارت نہ ہوتی تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ اس کا جواب دنیا بھر کے دانشوروں سے جا کر پوچھ لیجیے۔ میں کوئی عقلمندی کی بات کروں گا تو آپ اسے بیوقوفی سمجھیں گے۔ محض اس لیے کہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ اگر یہی باتیں ہریش چندر، بکرماجیت یا مہاراجہ اشوک یا مسٹر کینیڈی یا مسٹر خرد شچیف آپ سے کہتے تو آپ ان کے پاؤں پکڑ لیتے۔ میں نہیں کہتا کہ میری باتیں سن کر آپ میرے چرن چھوئیں آپ میرے بزرگ ہیں۔ بہر حال کم از کم میری عقلمندی کی داد تو دیجیے۔ اب اپنی زندگی مصیبتوں کے بھنور میں ڈال کر آپ مجھ سے کیوں کہتے ہیں کہ:

ہم تو ڈوبے ہیں میاں تم کو بھی لے ڈوبیں گے

میں نہیں ڈوبوں گا، نہیں ڈوبوں گا، نہیں ڈوبوں گا۔ اور اگر ڈوبوں گا تو آپ کے ساتھ نہیں۔

اپنا اپنا سمندر، اپنی اپنی موت۔”

اس قسم کی بے باکانہ اور گستاخانہ تقریریں سن کر بے چارے بیدی صاحب آہ بھر کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نریندر پاگل ہو گیا ہے اور ایک مرتبہ انہوں نے پاگل خانہ کے انچارج کو ٹیلی فون کر کے کچھ باتیں بھی کی تھیں۔ پاگل خانے کا انچارج اتنا بے وقوف تھا کہ نریندر کے بجائے انہیں لینے کے لیے آ پہنچا۔

بیدی صاحب باغی نریندر کی حالت پر سولہ سولہ آنسو روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے اُمید تھی کہ میرا بیٹا نیکی اور شرافت میں مجھے بھی مات دے دے گا۔ لیکن افسوس کہ یہ تو دنیادار نکلا۔ میری تمنا تھی کہ میں اسے گیروے کپڑے پہنا کر کسی تیرتھ استھان بھیج دوں گا۔ جہاں وہ اپنی باقی عمر عبادت اور خلق خدا کی خدمت میں گزار دے لیکن یہ تو دنیادار غنڈہ نکلا۔ یہ تو فلمیں بنانا چاہتا ہے۔ بیدی صاحب کو اگر دنیا میں کوئی دُکھ ہے تو یہی ہے۔ ویسے انہیں اس قسم کے ہزاروں اور بھی دُکھ ہیں، لیکن ان دُکھوں کا نام تو انہوں نے سکھ رکھ دیا ہے۔ عزیزم نریندر کا اصرار ہے کہ بیدی صاحب اس کے دُکھ کو بھی سمجھ لیں۔

بیدی صاحب کے گھر کا سب سے اہم فرد ان کی بیگم ہیں جنہیں بیدی صاحب نے زبردستی تین چوتھائی بلکہ اس سے بھی زیادہ سردار راجندر سنگھ بیدی بنا لیا ہے۔ بہت سے نوکروں کی موجودگی

کے باوجود وہ خود کھانا پکاتی ہیں۔ گھر کے دوسرے چھوٹے موٹے کام بھی وہ خود ہی انجام دے لیتی ہیں۔ نوکروں سے مہینے میں شاید ایک آدھ معمولی سا کام لے لیا جاتا ہے کیوں کہ بیدی صاحب کا حکم ہے کہ ”نوکروں کو زیادہ پریشان نہ کیا جائے ممکن ہے ان میں سے کوئی ولی اللہ ہو۔“

بیدی صاحب مساوات کے شدت سے قائل ہیں۔ صبح شام کھانا وہ اپنے تین نوکروں اور ا کے ساتھ ایک خوب صورت میز پر کھاتے ہیں۔ مسز بیدی سالن کی پلیٹیں رکھنے کے بعد گرم گرم چپاتیاں میز پر لاتی جاتی ہیں اور یہ لوگ مزے سے کھاتے جاتے ہیں۔ لیکن یہ نارمل دنوں کی بات ہے، لیکن جب گھر میں مہمانوں کی بھرمار ہو جاتی ہے تو بیدی صاحب کو کھانا نہیں دیا جاتا۔ بیدی صاحب کا یہی حکم ہے کہ ان کے حصے کا کھانا مہمانوں کو کھلا دیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کھانا کم پڑ جانے کی وجہ سے کوئی مہمان بھوکا رہ جائے اور انہیں بددعا دے بیٹھے۔ ایسے موقعے پر وہ خود اپنے پیٹ پر بیس سیر کا پتھر باندھ کر سو جاتے ہیں، جو پاکستان سے بھاگتے وقت وہ اپنے مکان سے اُٹھا لائے تھے۔

جب گھر میں بدتمیز مہمان عین کھانے کے وقت غیر متوقع طور پر دھاوا بول دیتے ہیں تو مسز بیدی پر وہ دن یا وہ گھڑیاں قیامت کی ہوتی ہیں۔ بیدی صاحب مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر باورچی خانے میں چلے جاتے ہیں اور مسز بیدی کو اس قسم کی ہدایات دیتے ہیں:

(1) امبالال ویجی ٹیرین ہے۔ اس کے لیے صرف ٹنڈے، گوبھی دال، آلو اور پراٹھے پکا لو۔

(2) پریتم سنگھ نان ویجی ٹیرین ہے اس کے لیے جھٹکے کا گوشت، پراٹھے، کباب، قیمہ اور کلیجی بھون لو۔

(3) نفاست علی خاں مرچیں کم کھاتا ہے اس کے لیے کم مرچوں والے چار پانچ سالن کافی رہیں گے۔ ساتھ ایک پیٹھا، بعد میں ایک پان۔

(4) ضیغم علی خاں بہت زیادہ مرچیں کھاتے ہیں۔ ان کے لیے قیمے بھری شملے کی مرچیں، ہری مرچوں بھرے پراٹھے، نان، تیکھا قورمہ، دس بارہ سیخ کباب اور آدھا سیر مسور کی دال کافی ہوگی۔ یاد رکھنا وہ گن کر اکتالیس پھلکے کھاتے ہیں۔ کہیں بھوکے نہ رہ جائیں۔ احتیاطاً اکاون پھلکے تیار کر لینا۔

(5) پنڈت ہری سنگھ نارائن پیاز اور لہسن سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے لیے حلوہ پوری، دال چاول

اور چاول کی کھیر کافی ہوگی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ پولسن کی کافی کے دو گلاس پیتے ہیں ملائی والے۔

(6) ملانند لال صرف سری پائے، اوجڑی اور گردے کھاتے ہیں۔ کالی گاجر کا جلوہ انہیں بہت پسند ہے۔ لیکن پہلے حلوہ کھاتے ہیں بعد میں سری پائے۔

(7) روسی مہمان خرشچوخوان کے لیے روسی ڈشیں میری کتاب میں دیکھ کر تیار کر لینا۔ یا خواجہ احمد عباس کو ٹیلی فون کر کے ترکیبیں معلوم کر لینا۔

(8) مسٹر ہیرالڈ انگریز ہیں۔ زیندر کو جلدی سے ٹیکسی پر بھیجو کہ فلورا فاونٹین جا کر تمہاری سہیلی روزی کو بلا لائے۔ اس کی نگرانی میں انگریزی کھانے تیار کر لینا۔ مسٹر ہیرالڈ کہتے ہیں کہ میں کھانا کھانے کے بعد انڈین نسوار سونگھوں گا۔ اختر الایمان کو ٹیلی فون کر دو کہ تھوڑی سی انڈین نسوار بھیج دے۔

(9) بصرے سے مولانا عبدالوہاب صاحب تشریف لائے ہیں۔ عرب عموماً بکری کا گوشت نہیں کھاتے۔ ان کے لیے کہیں سے بھی اونٹ کا گوشت حاصل کرو۔ اونٹ کے گوشت کے تیس چالیس کباب، قورمہ، بریانی تیار کر لینا، کچھ نان بازار سے منگوا لینا۔ اور ہاں خیال آیا، ادھر کے لوگ شاید گھوڑے کا گوشت بھی تو کھا لیتے ہیں، کہیں سے گھوڑے کا گوشت بھی منگوا لو۔ ذرا زیادہ ہی منگوا لینا۔ میں بھی چکھوں گا کہ کیسا ہوتا ہے اونٹ اور گھوڑے کا گوشت نہ ملے تو پڑوسیوں کا اونٹ اور کرشن چندر کا گھوڑا ذبح کرا لینا۔ بعد میں ان دونوں حضرات سے نپٹ لوں گا۔ کھجور کے حلوے کی ترکیب یاد نہ رہی ہو تو اونٹ کے دودھ کی ربڑی تیار کر لینا۔ محلے میں کوئی اونٹنی نہ ہو تو بکری کے دودھ میں تھوڑا نمک ڈال لینا۔ اونٹ کا دودھ بن جائے گا۔ لیکن یہ بات مولانا عبدالوہاب کو نہ معلوم ہونے پائے۔ اگر عبدالوہاب، صاحب کو کھانا پسند نہ آیا تو تم پورے مشرقِ وسطیٰ میں بدنام ہو جاؤ گی اور اگر میں کبھی وہاں گیا تو عرب مجھ کو تھوتھو کریں گے کہ یہ ہے وہ آدمی جس نے بیوی کو کھانا تک پکانا نہیں سکھایا۔ ہاں نوکروں سے زیادہ کام نہ لینا نہ انہیں ڈانٹنا اور دیکھو جب تک کھانا تیار نہیں ہوتا، ڈرائنگ روم میں چائے، کافی، شربت اور پان برابر بھیجتی رہنا۔ اس وقت بارہ بجے ہیں۔ دو بجے تک کھانا تیار ہو جانا چاہیے۔“

عورت چاہے کتنے ہی بڑے دل کی ہو کتنی ہی تعلیم یافتہ ہو، اسے اپنے کپڑے اور زیور بہت عزیز ہوتے ہیں۔ بادام کیوری کے شوہر نے اپنی بیگم مادام کیوری سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ''اپنے کچھ زیور اور کپڑے ہونولولو کے ریفیوجیوں میں بانٹ دو'' تو وہ اپنے شوہر کی اس قدر دل آزار بات سن کر سخت برہم ہو گئی تھیں۔ انہوں نے غصّے میں آکر ٹیسٹ ٹیوبیں اور سائنس روم کے بہت سے شیشے اور لوہے کا سامان توڑ ڈالا تھا۔ اور اپنے شوہر کو مار پیٹ کر میکے چلی گئی تھیں۔ مسز بیدی ایک ہندوستانی عورت ہیں وہ ایسا نہیں کر سکتیں۔

بیدی صاحب کے گھر پر مانگنے والوں اور مانگنے والیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ جیسے ہی دروازے کی گھنٹی بجتی ہے مسز بیدی آہ بھر کر کلیجہ تھام لیتی ہیں۔ ملنے والی اگر کوئی عورت ہے تو وہ یقیناً بیوہ ہوگی اور بیدی صاحب سے مدد لینے آئی ہوگی۔ مسز بیدی چوں کہ وقت ضائع کرنے کی قائل نہیں۔ اندر آنے والی نسوانی آواز سنتے ہی وہ فوراً چائے کی پیالی تیار کر لیتی ہیں اور ایک طشتری میں بسکٹوں کے بجائے اپنی ایک سونے کی انگوٹھی، ایک سونے کی چوڑی اور ایک پازیب سجا کر۔ چائے کی پیالی 'سُرڑ سُرڑ' پی جاتی ہیں اور طشتری میں رکھی ہوئی چیزیں پرس میں ڈال کر بیدی صاحب سے ہاتھ ملا کر اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسز بیدی کو صبر کی تلقین کر کے چلی جاتی ہیں۔

مسز بیدی کی تمام ساڑیاں، سوٹ، شلواریں، ریشمی دوپٹے، نئی سینڈلیں، بیدی صاحب محتاج عورتوں میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ مسز بیدی بغیر اُف کیے فوراً سب کچھ اللہ کی راہ میں دے دیتی ہیں، کیوں کہ اس کے سوا بیدی صاحب کے راج میں اور کوئی چارہ بھی تو نہیں۔

بیدی صاحب کے پاس دوستوں، دشمنوں، بال بچوں اور نیک دل بیگم کے علاوہ ایک مظلوم کار بھی ہے۔ جو دن کے وقت ان کے مہمانوں دوستوں یا دشمنوں کے کام آتی ہے اور رات کو ان کا بھنگی سیر کرنے کے لیے اسے سمندر کے ساحل پر لے جاتا ہے۔ اسے حکم ہے کہ صبح سات بجے سے پہلے پہلے کار واپس لے آئے۔ سنا ہے رات کو وہ کار بھاڑے پر بھی چلا لیتا ہے۔ اور رات بھر میں ستر پچھتّر روپے کما لیتا ہے بیدی صاحب بھی اس راز سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ ان کی کار کھٹارا بن جائے گی، مگر وہ چشم پوشی کر جاتے ہیں کہ کیوں کسی بھنگی کا دل توڑا جائے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہریجن تحریک سب سے پہلے بیدی صاحب ہی نے شروع کی تھی۔

بیدی صاحب کا بیان ہے کہ گزشتہ پانچ سال میں انہیں صرف ایک مرتبہ اپنی کار میں بیٹھنے کا

موقع ملا ہے وہ بھی اس وقت جب وہ کار خریدنے گئے تھے۔ اس وقت ان کے خیر خواہوں کو معلوم نہ تھا کہ وہ کار خریدنے جا رہے ہیں۔ ورنہ کار کے لیے انہوں نے جو روپیہ اکٹھا کیا تھا فوراً ادھار لے لیتے اور بیدی صاحب کو یا تو عمر بھر کار نصیب نہ ہوتی یا اگر ان کے دوست اس روپے سے کار خرید بھی لاتے تو بیدی صاحب کو اپنی کار میں ایک دن بھی بیٹھنا نصیب نہ ہوتا۔

جب وہ کار خریدنے گئے ڈرائیور ان کے ساتھ تھا۔ بے چاری کار گیرج سے نکل کر جب سڑک پر پہنچی تو ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بیدی صاحب نے ایک بس اسٹاپ کے سامنے رکوا دیا۔ اور ایک بہت ہی لمبے کیو میں کھڑے لوگوں کو لفٹ پیش کی۔ دس آدمیوں نے بخوشی اپنی خدمات پیش کر دیں۔ ڈرائیور کے روکنے کے باوجود بیدی صاحب نے نو آدمیوں کو کار میں ٹھونس لیا۔ دسویں کے لیے بالکل جگہ نہ تھی۔ بیدی صاحب نے اپنے آپ کو گاڑی کے پیچھے کیریئر پر رسّے سے بندھوا لیا اور ڈرائیور کو حکم دیا کہ وصول مسافروں کو ان کی منزل مقصود پر پہنچا کر ثوابِ دارین حاصل کیا جائے۔

اس کام میں پورے پانچ گھنٹے لگ گئے کیوں کہ بمبئی میں فاصلے بہت زیادہ ہیں۔ لیکن بیدی صاحب کو جب ڈرائیور نے رسے سے کھول کر کیریئر سے اُتارا تو وہ بے ہوش ہو چکے تھے۔ ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے دے دے کر بڑی مشکل سے انہیں ہوش میں لایا گیا۔

پانچ گھنٹے بعد جب خالی کار لے کر بیدی صاحب آگے بڑھے تو ایک بس اسٹاپ کے قریب ایک واقف کار کو دیکھ کر کار پھر کھڑی کر لی۔ دس گیارہ مزید مسافروں نے جو ڈیڑھ گھنٹے سے بس اسٹاپ پر کھڑے تھے ان سے التجا کی کہ اگر آپ اندھیری کی طرف جا رہے ہیں تو ہمیں بھی بٹھا لیجیے ڈیڑھ گھنٹے سے کھڑے ہیں، مگر کوئی بس خالی نہیں ملتی۔

بیدی صاحب کسی کو ‘نہ’ نہیں کہہ سکتے۔ انہوں نے پھر دس سواریاں لاد لیں اور خود کار کی چھت پر بیٹھ گئے۔ جب دھوپ بڑی آب و تاب کے ساتھ چمکی تو انہوں نے سوا روپے کی برف خرید کر سر پر رکھ لی۔ وہ ایک تماشا تو بن گئے، لیکن ہر ایک کو جہاں جانا تھا وہاں پہنچا دیا۔ اس طرح کار ہر ایک میل آگے بڑھنے کے بعد ان کے گھر سے بیسیوں میل دُور نکل جاتی تھی۔ ہر سڑک پر وہ اسی طرح ولی اللہ بن کر اپنی کار میں سفر کرتے رہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ انہیں اپنے گھر پہنچنے میں پورے تین دن لگ گئے۔

اس عرصے میں مسز بیدی، بیدی صاحب کے گم ہو جانے کی رپورٹ شہر کے تمام پولیس اسٹیشنوں میں درج کرا چکی تھیں بیدی صاحب کے بچے بیدی صاحب کی تلاش میں شہر کی تمام فلم کمپنیوں کی خاک چھان چکے تھے۔ ڈرائیور کی ہندو بیوی نے یہ سمجھ کر کہ وہ ودھوا ہو گئی ہے، اپنے سر میں سیندور کے بجائے راکھ ڈال لی تھی۔ اپنی کلائیوں پر اینٹیں مار مار کر اپنی تمام چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں۔ تمام عزیزوں کو بذریعہ تار طلب کر لیا تھا اس کی چیخوں کی آواز آسمان سے بھی آگے جا رہی تھی۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ ”ہائے بے چاری کی شادی ہوئے ابھی سات ہی دن گزرے تھے۔“ اور اس بے چاری کے عزیز کہہ رہے تھے۔ ”ڈائن اپنی شادی کے ساتویں دن ہی شوہر کو کھا گئی۔“

بیدی صاحب کے قریبی عزیز بیدی صاحب کے گھر آ گئے تھے اور مسز بیدی کو طعنے دے رہے تھے کہ ”تم بچے کا ذرا بھی خیال نہیں رکھتیں۔“ بیدی صاحب کے گھر رہنے والے پچیس مہمانوں کا برا حال تھا۔ وہ کلیجہ تھام کر روتے تھے اور دھاڑیں مار مار کر کہتے تھے۔ ”ہائے بیدی جی، ہمارا کیا ہو گا؟ خدا خدا کر کے بیدی صاحب گھر آئے اور محلے بھر کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔

بیدی صاحب کا کچھ وقت افسانے لکھنے، کچھ لچے لفنگوں کی جھوٹی دردناک داستانیں سننے ہیں، کچھ وقت محتاجوں، فقیروں اور بیواؤں سے رو رو کر گلے ملنے میں، کچھ اپنے بال بچوں کو صبر کی تلقین کرنے میں اور کچھ مختلف سیاسی پلیٹ فارموں پر تقریر کرنے میں گزر جاتا ہے۔

بیدی صاحب پرانے راجاؤں اور مہاراجوں کی طرح رات کو غریب پرجا کا حال معلوم کرنے نکل جاتے، مہمانوں سے بچے کھچے کچھ پیسے دو ڈھائی آنے ان کی جیب میں ہوں تو مصیبت زدگان میں تقسیم کر آتے ہیں ورنہ رو رو کر ان سے زبانی ہمدردی کر لینے ہی کو کارِ ثواب سمجھ واپس آ جاتے ہیں۔

رات بھر اپنی رعایا کی دیکھ بھال کرنے کے بعد صبح چار بجے کے قریب واپس آ کر اپنے گھر کے سامنے سر کے نیچے ایک اینٹ رکھ کر فٹ پاتھ پر سو جاتے ہیں کیوں کہ مہمانوں کی وجہ سے اکثر انہیں گھر میں سونے کو جگہ نہیں ملتی۔

معزز مہمان صبح آ کر انہیں بیدار کرتے ہیں کہ ”اُٹھیے۔ بیدی صاحب؛ گھر میں خرچ نہیں ہے۔“

بیدی صاحب چونک کر اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ اُٹھ کر کپڑوں کی گرد اور مٹی جھاڑتے ہیں، اندر جا کر

نہاتے ہیں۔ چائے کی ایک پیالی پی کر یہ مظلوم اور اُداس رُوح پیسے کی تلاش میں بمبئی کے شور و شغب میں بھٹکنے کے لیے چلی جاتی ہے۔

مندرجہ بالا سطور تک مضامین مکمل تھا۔ ایک مہینے تک یونہی رکھا رہا کسی پرچے میں بھیجنے کی نوبت نہیں آئی کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

ایک دن عزیزم نریندر میرے گھر گھبرائے ہوئے آئے۔ انہوں نے ایک عجیب خبر سنائی۔ ایسی خبر تو آئے دن بیدی صاحب کے متعلق سننے میں آتی رہتی ہیں لیکن اس وقت میرا موڈ کچھ ایسا تھا کہ کچھ کر ہی بیٹھنے کو جی چاہا۔

چنانچہ میں نے اور میرے دوستوں نے سازش کر کے بیدی صاحب کو ہمالیہ کی بلندی سے کوئی پانچ ہزار فٹ نیچے ایک گہرے کھڈ میں پھینک دیا کہ اب خود ہمیں ان کی صورت نظر نہیں آتی۔ شروع شروع میں انہوں نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر وہ اکیلے تھے اور ہم پانچ، کامیابی ہمیں کو نصیب ہوئی۔

اس حادثے کا آغاز اور انجام نریندر کی آمد سے ہوا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ اتنے گھبرائے گھبرائے کیوں ہو، کیا بات ہے؟ تو اس نے بتایا کہ گھر میں صرف پانچ سو روپے رکھے تھے کہ صبح صبح تین شاعر ہمارے یہاں آ گئے۔ پہلے تو انہوں نے اپنی بے شمار گلی سڑی غزلیں سنا کر بیدی صاحب سے غلط داد وصول کی۔ مجھے تو اس پر بھی اعتراض تھا مگر اس کے بعد اپنی گھریلو زندگی کے بہت سے فرضی دردناک افسانے سنا کر بیدی صاحب سے تمام روپے لے گئے۔ گھر میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ میں نے اور ممی نے انہیں بہت سمجھایا کہ کم از کم وہ سو روپے تو گھر کے خرچ کے لیے رکھ لیجیے مگر وہ نہ مانے اور میں یہاں آ گیا ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب کبھی اپنے گھر میں واپس نہ جاؤں گا۔”

میں نے بیدی صاحب کے جملہ امراض کا حل سوچ لیا ہے۔ کل صبح صبح میں، کرشن چندر، مہندر ناتھ، خواجہ احمد عباس اور عصمت چغتائی تمہارے گھر آ رہے ہیں یا تو بیدی صاحب ٹھیک ہو جائیں گے یا ہم سے ان کے تعلقات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔”

دوسرے دن علی الصبح ہم سب بیدی صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے بڑے خلوص سے ہمارا خیر مقدم کیا اور حسبِ توقع معذرت کر کے غسل خانے میں چلے گئے میں غسل خانے کے

دروازے کے ساتھ کان لگا کر کھڑا ہو گیا کہ وہ کب پانی کا ڈونگا بالٹی سے نکال کر سر پر ڈالتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اندازہ کر لیا کہ اس وقت وہ منہ پر صابن مل رہے ہوں گے۔ اور اگر میں غسل خانے کا دروازہ کھول کر بازو بڑھا کر کھونٹی پر سے ان کے کپڑے اُتار لوں تو وہ نہ دیکھ سکیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں موقع دیکھ کر آنکھیں بند کیے غسل خانے میں داخل ہو گیا اور چپکے سے کھونٹی پر سے بیدی صاحب کے کپڑے اُتار کر بند آنکھوں باہر نکل آیا:

ایسی چوری کا پتا خاک لگاتا کوئی

جب وہ نہا کر فارغ ہوئے تو کھونٹی پر نظر ڈالی۔ پہلے تو انہوں نے قہقہہ لگایا۔ پھر ہنس کر بولے، ''اے بھائی میرے کپڑے کون چور لے گیا؟''

میں نے جواب دیا، ''بیدی صاحب! ہم سب باتھ روم کے دروازے کے سامنے بیٹھے ہیں۔ خبردار باہر ننگے مت آنا۔ یہاں بہت سی شریف قسم کی خواتین بھی موجود ہیں۔''

وہ بولے، ''لیکن یہ کیا بے ہودگی ہے؟''

کرشن چندر بولے، ''یہ بے ہودگی وے ہودگی کچھ نہیں نہ مذاق ہے، یہ حقیقت ہے اور آپ نے جو قیامتیں اُٹھا رکھی ہیں، ان کا شافی علاج۔''

بیدی صاحب حیرت زدہ ہو کر بولے، ''کون سی قیامتیں اُٹھا رکھی ہیں میں نے؟''

خواجہ احمد عباس بولے، ''یہ بُری بُری نیکیاں، یہ سدا برت، یہ حاتم طائیت، یہ خودکشیاں، مہاتما بدھ ازم آپ کب چھوڑیں گے؟''

''بیدی صاحب بولے، ''کیا تم میرا کیریکٹر خراب کرنے آئے ہو؟''

خواجہ احمد عباس بولے، آپ کو اپنے اُصول بدلنے پڑیں گے۔ کیوں کہ زمانہ بڑا نازک ہے۔ آپ کو دونوں ہاتھوں سے دستار تھامنی ہی پڑے گی۔

بیدی صاحب بولے، ''تم نے اپنے سو روپے اس دن بھنگیوں میں کیوں بانٹ دیے تھے؟''

خواجہ احمد عباس بولے، ''میں تو کمیونسٹ ہوں، تم کمیونسٹ تھوڑی ہو؟''

بیدی صاحب بولے، ''خیر اب تم لوگ مذاق چھوڑو، میرے کپڑے اندر پھینکو ورنہ ساری کمیونزم نکال دوں گا۔''

میں نے جواب دیا، ”بیدی صاحب مذاق کرنے والوں کے چہرے پر پھٹکار، پانچ منٹ کے اندر، اندر گھر کے تمام مفت خوروں، چوروں، ڈاکوؤں کو دفع کیجیے، لچے لفنگوں کی پٹنیں بند کیجیے اور آئندہ کے لیے وعدہ کیجیے کہ اب اپنا پیسہ گھر والوں پر صرف کریں گے، تو کپڑے ملیں گے ورنہ نہیں۔ ہم سب اپنے اُصولوں کے بڑے پکے ہیں اور ہم سب اس وقت ایک طے شدہ سازش کے تحت یہاں جمع ہوئے ہیں ایک غنڈہ عظیم کی سرکردگی میں۔“

بیدی صاحب بولے، ”تم سب جہنم میں جاؤ مجھے تم لوگوں کی کوئی پروا نہیں نہ تمہارے مشوروں کی ضرورت ہے۔ میں باہر آ کر تم سب کی طبیعت صاف کر دوں گا۔“

عصمت پہلی مرتبہ بولیں، ”بیدی صاحب خدا کے لیے کہیں باہر مت آ جایئے۔ میرے ساتھ اس وقت اور بھی بہت سی خواتین بیٹھی ہیں اور سنیے یہ بچے سب کچھ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کو اس وقت تک باہر نہیں نکالا جائے گا جب تک آپ ایک شریف آدمی نہ بن جائیں۔“

بیدی صاحب بولے، ”میں یہاں بڑے مزے میں ہوں۔“ دوست نما دشمنو!“

عصمت نے جواب دیا، ”بڑے مزے میں ہیں تو مزے میں رہیے ہم آپ کے مزوں میں خلل نہ ڈالیں گے۔“

منت خوشامد کرنے کے بعد جب بیدی صاحب کا بس نہ چلا تو مغلظات پر اُتر آئے زور زور سے چلانے لگے۔ ”عصمت صاحبہ کے سوا باقی سب کمینو! رزیلو، مردودو! پاجیو! شرم نہیں آتی؟ میرے کپڑے اندر پھینک دو یا یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ ورنہ میں تم سب پر مداخلت بیجا کا مقدمہ دائر کر دوں گا۔“

جب ہم پر ان گالیوں اور دھمکیوں کا بھی اثر نہ ہوا تو انہوں نے ہمیں دو دو گالیاں دینی شروع کر دیں کہ عصمت کان میں انگلیاں ٹھونس کر وہاں سے بھاگ گئیں۔

اس طرح شام کے پانچ بج گئے۔ پانچ بجے کے قریب میں نے چائے کی ایک پیالی اور دو بسکٹ اندر غسل خانے میں بڑھا دیے۔ بیدی صاحب نے دونوں چیزیں مالِ غنیمت سمجھ کر جھپٹ لیں۔

رات کے گیارہ بجے تک نہ بیدی صاحب ہارے نہ ہم اتنے میں نوکر ہوٹل سے ہم سب کا کھانا لے آیا۔ ایک ٹرے ہم نے بیدی صاحب کو پکڑا دی۔

بیدی صاحب کھانا کھاتے جاتے تھے اور ہمیں بددعائیں دیتے جاتے تھے۔ ہر لقمے کے ساتھ وہ ہمیں ایک چٹپٹی گالی اس طرح دیتے تھے جیسے ہر لقمے کے ساتھ وہ تیکھی چٹنی استعمال کر رہے ہوں۔

اتنے میں مسز بیدی بھی گھر آ گئیں۔ جب وہ اس معاملے میں مداخلت کرنے آئیں تو ہم سب نے ان سے جھگڑا کر لیا کہ اگر آپ نے اس معاملے میں ذرا بھی دخل دیا تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ چند گھنٹوں، چند دنوں یا چند ہفتوں کی تکلیف سے اگر گھر کے سب لوگوں کی جنسی زندگی جنت بن جائے تو کیا حرج ہے۔"

تمام رات ہم سب باتھ روم کے سامنے دریوں پر چوکنے ہو کر بیٹھے رہے اور رات بھر باتھ روم میں سے بیدی صاحب کی گالیوں کی صدائیں آتی رہیں۔ اور مسز بیدی ہم سے لڑتی رہیں کہ بری بات ہے۔

دوسرے دن صبح ہم نے انہیں ناشتا بھی پہنچایا اور دوپہر اور رات کا کھانا بھی۔ کھانا کھا کر برتن مارے غصے کے کھڑکی کی سلاخوں میں سے باہر سڑک پر پھینک دیتے تھے اور ساتھ ہی پچیس ہزار گالیاں فضا میں گونج جاتی تھی۔

اس طرح تین دن گزر گئے۔ ان تین دنوں میں ہم پر، مسز بیدی پر اور بیدی صاحب پر جو بیتی، کچھ نہ پوچھیے۔ یہاں تک کہ مسز بیدی ہم سے ناراض ہو گئیں۔ نریندر مارے شرم کے گھر سے بھاگ گیا۔ ہم ڈھیٹوں کی طرح ڈٹے رہے۔ چوتھے دن بیدی صاحب کو ہار ماننی پڑی اور ہم نے ان سے مندرجہ ذیل حلفیہ وعدے لے لیے جو انہوں نے باتھ روم میں بیٹھے بیٹھے ہزاروں گالیوں کے ساتھ دہرائے۔

1۔ میں مسمی راجندر سنگھ بیدی آئندہ بڑی بڑی نیکیاں نہیں کروں گا۔ تم کمینے، پاجی، رذیل ہو!

2۔ بیکار اور لچے لفنگوں میں اپنی دولت تقسیم نہیں کروں گا۔ جیسے تم لوگ، لعنت ہو تم سب پر!

3۔ تمام مہمانوں کو گھر سے نکال دوں گا، پنشنیں بند کر دوں گا۔ خدا تمہارا بیڑہ غرق کرے۔

4۔ جب تک زندہ ہوں، نیک چلن رہوں گا، نیک چلنی سے مراد وہ چلن ہیں، جنہیں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، مہندر ناتھ اور راجہ مہدی علی خاں جیسے غنڈے اچھے چلن قرار دیں۔ بڑے آئے رہنما یان قوم

5۔ تم لوگوں کے مشورے اور تحقیقات کے بغیر کسی کو ایک پیسہ نہ دوں گا۔ تمہاری طرح کمینہ بن جاؤں گا۔ یہ پانچوں شرطیں منوانے کے بعد ہم نے بیدی صاحب کو کپڑے دے کر باتھ روم سے باہر نکالا۔ جب وہ باہر نکلے تو مارے غصّے کے بھرے ہوئے تھے۔ بھابی اور عصمت کو چھوڑ کر انہوں نے ہم سب کو ایک لٹھیا سے اتنا پیٹا کہ کسی کی ہڈی غائب ہوگئی اور کسی کی پسلی۔ جب ہم نے شور مچایا تو بولے کہ ”میں نے یہ قسم تو نہیں کھائی تھی کہ تم لوگوں کی مرمت نہیں کروں گا۔ آئندہ سے میری تمہاری دوستی ختم خبردار جو کبھی میرے گھر میں قدم رکھا۔“

میں نے جواب دیا، ”آپ ہم سے ناراض ہوں یا ناخوش یا بیزار ہم لوگوں نے تین راتیں جاگ کر اور اپنے کاموں کا حرج کر کے آپ کے گھر میں امن و خوشی کے چراغ جلا دیے ہیں۔ ہمارا یہی مقصد تھا جو پورا ہوگیا۔“

اس حادثے کے بعد نہ کبھی بیدی صاحب نے ہمیں اپنے گھر بلایا، نہ کبھی ہم ان کے گھر گئے۔ ایک مرتبہ وہ اپنی کار میں بیٹھے ایک بس اسٹاپ سے گزرے۔ خدا کے فضل و کرم سے اب کے کار میں صرف بیدی صاحب تھے۔ انہوں نے ہمیں ایک لمبے کیوں میں دیکھ لیا اور بڑے زور سے کار بھگا کر لے گئے۔ میں نے کرشن چندر کو دیکھ کر ایک زبردست قہقہہ لگایا۔

خواجہ صاحب بولے، ”جو شخص اپنی گاڑی میں دس دس آدمیوں کو بٹھا کے اپنے آپ کو کیریئر پر بندھو لیتا تھا۔ آج دوستوں کو دیکھ کر کیسا اڑنچھو ہوگیا۔“

مہندر ناتھ نے کہا، ”اب بیدی صحیح معنوں میں انسان بن گیا ہے۔ میں تو بہت خوش ہوں۔ اب شاید اس کا بھنگی بھی بیکار ہوگیا ہوگا۔“

ہم چاروں نے نعرہ لگایا۔ ”راجندر سنگھ بیدی زندہ باد! ہم لوگ زندہ باد!“

سوائے بیدی صاحب کے مانگنے والے دوستو اور نہ مانگنے والے دشمنو! سن لو کہ بیدی صاحب پہلے سے بیدی صاحب نہیں رہے اب کوئی صاحب ان کے پاس جا کر اپنا وقت اور بس یا ٹیکسی کا کرایہ ضائع نہ کریں۔

✡ ✡

اندھیر نگری

رتن ناتھ سرشار

ایک رنگے سیار باباجی گیروے کپڑے پہنے ایک موٹے تازے چیلے کو ساتھ لیے بھجن گاتے، کھنجری بجاتے ایک نئی بستی میں وارد ہوئے۔

باباجی: ”بچہ جاؤ کچھ نون تیل لکڑی لاؤ، روٹی پکاؤ، خود بھی کھاؤ، ہم کو بھی کھلاؤ اور دندناؤ۔“

چیلا چلا، بازار میں پہنچے تو دکانیں جمی ہوئیں... اب جس دکان پر جاتے ہیں اور جو سودا چکاتے ہیں سب ٹکے سیر۔ چکرائے کہ ایں یہ کیا اسرار ہے۔ ٹکے ہی سیر مربا، ٹکے ہی سیر اچار ہے۔ ایک خوانچے والے سے پوچھا یہ کیا ہے؟ باباجی یہ ریوڑیاں ہیں۔ اور یہ؟ یہ بیسن کے لڈو ہیں۔ اور یہ؟ یہ دال موٹ ہے۔ اور یہ؟ یہ کھاجا ہے۔ اہو ہو ہو۔ کھاجا تو کھاجا۔ ایک کھاجا چکھ گئے، پھر دوسرا اُڑایا۔ اِس طرح خوب مٹھائی ٹونگی اور کچھ کھائی، کچھ باندھی پوٹ، وہاں سے ماری لوٹ تو باباجی کے پاس۔

باباجی: ”کیوں بچہ کچھ گھی شکر لایا؟“

چیلا: ”ہونہہ گھی کیا کرو گے کھاجا کھاجا۔ مٹھائی چکھو۔

بابا: اِس نگری کا نام کیا ہے؟

چیلا: باباجی ہمیں تو مٹھائی کھانے سے کام ہے۔

اندھیر نگری چوپٹ راجا، ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا... اندھیر نگری کے چوپٹ راجا برآمد ہوئے۔ واہ بھئی واہ اچھے راجا ہیں تو اندھیر نگری کیوں نہ ہو۔ راجا صاحب شرابی، مدکیے، چرسیے، گنجیڑیے، بھنگیڑیے، چانڈو باز، افیمچی نشے میں چور، نیم مست و مخمور کرسی پر بیٹھے ہیں، مگر گرے پڑتے ہیں۔ اتنے میں ایک فریادی آیا۔

وزیر: جہاں پناہ، ایک فریادی آیا ہے۔

راجا: تمہارا دادی آیا ہے؟

وزیر: نہیں جہاں پناہ ایک فریادی آیا ہے۔

راجا: اچھا۔ ہوں۔ تو پانچ بلاؤ (بہکی بہکی باتیں)

فریادی: حضور، کل دیوار گر پڑی، میرا لڑکا دب کر مر گیا۔

راجا: ہاں دیوار مر گیا۔ لکڑا دب گیا۔ دیوار کو سلی دے دو۔

وزیر: جہاں پناہ! دیوار گر پڑی اور اس کا لڑکا مر گیا۔

راجا: ہاں ہاں، جہاں پناہ گر پڑا اور دیوار پر لکڑ لغر گیا۔ اچھا لکڑے کو پھانسی دے دو۔

وزیر: نہیں، خداوند لڑکا دب کر مر گیا۔

راجا: معمار کو سولی دے دو۔

معمار: پیر و مرشد میں بے قصور ہوں۔ یہ مزدور کی شرارت ہے۔

راجا: مزدور کو سولی دے دو۔

مزدور: مَیں نے کیا کیا۔ سقّے کا قصور تھا۔

راجا: اچھا، جاؤ سقّے کو سولی دے دو۔

سقہ: حضور! میری کیا خطا۔ آپ کا کوتوال جو آیا تو مارے ڈر کے پانی زیادہ گر گیا۔

راجا: کوتوال کو سولی دے دو۔

پھانسی پر کوتوال صاحب چڑھائے گئے تو چوبدار نے عرض کیا کہ پیر و مرشد پھانسی کا منہ بڑا ہے اور کوتوال دُبلا پتلا۔

راجا: اچھا تو کسی موٹے آدمی کو پکڑ کر پھانسی دے دو۔

موٹا اس اندھیر نگری میں بابا جی کا چیلا تھا۔ دھرے گئے۔ ہائے غضب بھئی، ہم نے کیا کیا کہ پھانسی پر چڑھائے جائیں گے؟

واہ، تم سب میں موٹے ہو، چور رنگ کیے جاؤ گے۔

ارے تو یارو، یہ بھی کوئی جرم ہے کہ موٹا تازہ ہوں۔

اتنے میں بابا جی بھی حسنِ اتفاق سے سامنے آ نکلے۔ دیکھا کہ چیلا رو رہا ہے۔

بابا: کیوں بچہ! کیا کہا تھا کہ یہ اندھیر نگری چھوڑ دو۔ نہ مانا۔ آخر وہی آگے آیا نا۔

چیلا: بابا جی بچاؤ۔ میری طرف سے پھانسی پر چڑھ جاؤ۔

بابا: ارے! آج اچھا دن ہے جو پھانسی پر چڑھے وہ سُرگ لوک کو جائے۔ میں پھانسی پر جاتا ہوں۔

چیلا: نہیں میں جاتا ہوں۔

اتنے میں راجا بھی گرتے پڑتے آ نکلے۔

راجا: وزیر، پھانسی نہیں ہوئی۔

وزیر: خداوند! گرو چیلے لڑ رہے ہیں میں پھانسی پر چڑھوں، وہ کہتا ہے میں پھانسی پر چڑھوں۔ آج بڑا تیرتھ کا دن ہے جو پھانسی چڑھے وہ بیکنٹھ میں جائے۔

راجا: ہاں تو چل میں پھانسی پر خود چڑھ جاؤں۔ لیجیے چوپٹ راجا کھٹ کھٹ کرتے پھانسی پر چڑھ گئے۔

* * *

صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے!

رشید احمد صدیقی

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے   لیکن میری عمر تمام نہیں ہوتی!

آج تک یاد نہیں، گھر بھر میں کوئی مجھ سے سویرے اُٹھا ہو اور رات میں میرے بعد سویا ہو۔ دو کوّے البتہ ایسے ہیں، جو میرے صحن میں آ کر دو درختوں پر الگ الگ آ کر بیٹھتے ہیں، جو ایک دوسرے اور میری چارپائی سے پندرہ فٹ کے فاصلہ پر واقع ہیں اور تاروں کی چھاؤں میں مجھے باری باری لعنت بھیجنا شروع کرتے ہیں۔ خدا جانے یہ کوّے کون ہیں۔ کہاں کے ہیں اور کیوں ہیں؟ یہ یقیناً میاں بیوی نہیں ہیں۔ میاں بیوی میں اتنا اتفاق کہاں کہ سالہا سال پابندی سے یک زبان ہو کر صبح کے وقت آئیں اور مجھے لعنت بھیج کر جائیں۔ دونوں عورتیں نہیں۔ اس لیے کہ دو عورتیں ایک ہی شخص پر زیادہ دن تک لعنت نہیں بھیج سکتیں۔ ایک اِن میں سے اُس شخص سے شادی کر لے گی اور طوق لعنت بن جائے گی۔ دونوں مرد بھی نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ مرد کو اپنی لعنتوں سے کہاں چھٹکارا کہ وہ مجھ پر لعنت بھیجنے کی تفریح میں پڑے۔ شور کر کے اُن کو اُڑا نہیں سکتا۔ اس لیے کہ یہ کوّے تو میرے شور سے اُڑ جائیں گے، لیکن دوسرے کوّے، جو ان سے بھی زیادہ کوّے ہیں، وہ اُٹھ بیٹھیں گے۔ صحن میں ذرا فاصلہ پر جہاں نوکروں کا خاندان سوتا ہے، وہاں بھی ایک سے ایک اچھے درخت ہیں۔ اُن کے آس پاس ہر طرح کے مقویات بھی پھیلے ہوئے ہیں، لیکن یہ وہاں نہ جائیں گے۔ میں اِن کو چھوڑ کر اپنا کمرہ کھولوں گا، دروازہ پر پانچ سات مینڈک اور ہزاروں لاکھوں مچھر ہوں گے اور میرے ساتھ کمرے میں داخل ہو جائیں گے۔ اب میرا کام یہ ہے کہ اِن مینڈکوں کو چارپائی یا تخت کے نیچے گھس کر نکالوں اور مچھروں کا حال یہ ہے کہ جب سے اِن پر ڈاکٹروں نے کچھ اتہامات لگائے ہیں، انھوں نے ڈی ڈی ٹی سے مرنا چھوڑ دیا۔ کمرے میں

روشنی کر کے پڑھنا لکھنا شروع کرتا ہوں۔ جہاں انسپریشن مچھروں سے ملتا ہے اور اوریشن مینڈکوں سے۔ اور یہ کمبخت مینڈک اتنے قریب سے داد دیتے ہیں کہ چونک پڑتا ہوں کہ مَیں اُن پر، یا وہ مجھ پر تو نہیں بیٹھے ہیں۔

میں نے اپنے مکان کا مردانہ حصہ کچھ دنوں سے مقفل کر دیا ہے۔ کھلا رہتا تھا، تو چور چارپائی اُٹھا لے جاتے تھے، مویشی باغ چر جاتے تھے اور راستے سے گزرنے والے نماز پڑھنے آجاتے تھے۔ وہ اِس طرح کہ اندر سے لوٹا، پانی، تولیا جانماز منگائی، ان سب کے ساتھ نماز باجماعت اپنے گھر جا کر پڑھی۔ زنان خانے کا دروازہ میرے سائبان سے خاصے فاصلہ پر واقع ہے۔ صبح سے رات گئے تک کھٹ کھٹ ہوتی رہے گی اور میں جا جا کر دیکھوں گا کہ کیا حادثہ ہے۔ حادثات ملاحظہ فرمائیے۔ فلاں کا انتقال ہو گیا، آپ کیا کر رہے ہیں۔ فلاں کا ڈنر ہے، آپ مدعو ہیں۔ فلاں رسالہ نکلنے والا ہے، ایک مضمون لکھیے اور پانچ خریدار بنائیے۔ فلاں مسجد بن رہی ہے، نماز پڑھنی ہوگی۔ فلاں کی بیوی بھاگ گئی ہے، ذرا چوکنے رہیے گا۔ ایک بچہ گم ہو گیا ہے، ذرا چوکنے رہیے گا۔ ذرا دیکھیے گا، آپ کے بچوں میں تو نہیں مل گیا۔ میں فیل ہو گیا ہوں، ممتحن نے بے ایمانی کی ہے۔ ذرا وائس چانسلر صاحب سے چل کر کہہ دیجیے اور فارن اسکالرشپ بھی تو وائس چانسلر صاحب ہی کے ہاتھ میں ہے۔ میرا ایک سال بچ جائے گا، زمین داری کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ یونیورسٹی پہنچا، اتنے لیکچر ہیں، اتنے ٹیوٹوریل، اتنی میٹنگ، اتنے انٹرویو، اتنی سفارشیں۔ گھر واپس آیا۔ ڈاک دیکھی۔ فلاں صاحب سے اتنے روپے لے لیے ہیں اور ہدایت دی گئی ہے کہ تم سے لے لیں۔ فلاں گاڑی سے مَیں اور بیوی بچے، ایک ملازم اور دو نوکرانیوں کے ہمراہ ایک ہفتہ کے لیے آ رہے ہیں، بڑا ضروری کام ہے۔ میں اُردو میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا یا چاہتی ہوں۔ عنوان یہ ہوگا، مقالہ آپ لکھ دیجیے۔ اَز خرداں خطا و بزرگاں عطا! ایک ادبی کانفرنس ہو رہی ہے، صدارت فرمائیے، ورنہ تازہ کلام سے مشرف فرمائیے۔ میرے نانا کا انتقال ہو گیا۔ ویسا ہی ایک مضمون لکھ دیجیے، جیسا کہ آپ ایسے موقعے پر اکثر لکھا کرتے ہیں۔ آپ کے ہاں سے اُردو میں جن لوگوں نے ڈاکٹریٹ حاصل کی ہے اُن کے مقالات کا خلاصہ لکھ بھیجیے۔ کھانا کھانے بیٹھا، نوکروں کی چوری، گندگی، نکمہ پن اور دوسروں کے اختلافات و عادات پر جھگڑا شروع ہو گیا۔ نوکروں سمیت سب نے اپنے اپنے زور اور ظروف کے بقدر حصہ لیا۔ کھانا ختم ہوا، بات بڑھ گئی۔ کمرے میں آ کر

لیٹا۔ برآمدے میں بچوں نے فٹ بال شروع کر دیا۔ سینے کی مشین چلنے لگی اور نل پر جو میرے کمرہ کی دیوار سے لگا ہوا ہے، کپڑا دھویا یا پچھاڑا جانے لگا۔

چار بجے خواتین تشریف لانا شروع کریں گی۔ اب میں کمرہ میں مقید ہو گیا۔ خواتین کے ساتھ اُن کی نوکرانیاں، نوکرانیوں کے بچے۔ تعداد کے لیے ہندسے مقرر ہیں، ان کی تعداد کے لیے اب تک کوئی ہندسہ دریافت نہیں ہو سکا۔ اِن کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر محلّہ کے کتّے، بلّی، بکری، مرغی سب آن پہنچے۔ اِن سب نے سارے پھول پودے روند ڈالے۔ خواتین نے پنکھا، پانی، پان، جانماز مانگی اور بیک وقت بولنا، ہنسنا، چیخنا شروع کر دیا۔ اور بیچ بیچ میں ہوا پیکدان کے ہر جگہ پیک ڈالنی شروع کر دی۔ یہ قافلہ اُٹھ کر یہاں سے کہیں اور چلا جائے گا۔ وہاں سے کہیں اور... اور میں کلب چلا جاؤں گا۔

* *

ایصالِ شراب!

رشید ارشد

ہمیں ہر روز ڈاک سے بے شمار خطوط ملتے ہیں۔ ہمارے فین کلب سے نہیں، ہمارے چاہنے والوں کی طرف سے نہیں۔ ایسے خطوط امریکا میں ہر ایک کو ملتے ہیں۔ اسے جنک میل کہتے ہیں، یعنی رڈی ڈاک۔ اتنی رڈی اپنے ملک میں گھر آجائے تو بیچ کر سبزی ترکاری کا خرچ نکل آتا ہے، لیکن یہاں رڈی کو کوئی رڈی کے بھاؤ نہیں پوچھتا۔ رڈی تو چھوڑیں، ہمیں اپنی پُرانی کار بھی جیب سے پیسے دے کر اُٹھوانی پڑی۔ جو ڈاک ہمیں ملتی ہے، یہ سب اشتہارات کے پلندے ہوتے ہیں۔ سپر مارکیٹ کے اشتہارات۔ ڈیپارٹمنٹل اسٹورز کے دیدہ زیب مجلّے۔ درد کے بغیر دانت نکالنے والوں کی طرف سے منادی۔ گورے رنگ کو سانولا کرنے کی گارنٹی۔ 'گھر بیٹھے ہزاروں کمایئے' کی خوشخبری اور ہماری مالی حالت پر رحم کھانے والوں کی طرف سے ہمدردی۔ بینکوں والے بھی منت سماجت کر رہے ہیں کہ قرضہ لے لو۔ واپسی کا غم نہ کھانا۔ ٹی وی والے بھی قسطوں پر دینے کو تیار۔ فرنیچر والے بھی بیچنے کو بے قرار۔ سب کہتے ہیں، بھائی صاحب لے تو جاؤ، استعمال میں لاؤ، پیسوں کی کیا جلدی ہے؟ آپ کہیں بھاگے تو نہیں جا رہے؟ اپنے دیس میں جو بھی دکاندار ہے، اُس کے ہاں 'آج نقد کل ادھار' ہے۔ 'ادھار محبت کی قینچی ہے' کا پرچار ہے۔ امریکا میں ہر کوئی منت سماجت کر رہا ہے کہ ادھار لے لو۔ نقد کی بات کریں تو کہتے ہیں 'اگلی دکان پر'۔ اپنے وطن میں ادھار لینا ہو تو کسی کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگانا پڑتا ہے۔ امریکا میں دکاندار پاؤں پڑ کر اُدھار دیتے ہیں۔

ہم ایسی ڈاک کھولے بغیر اُٹھا کر کچرے کے ڈرم میں پھینک دیتے ہیں۔ لیکن کل کی ڈاک جو پھینکنے لگے تو کسی خیر اندیش کی طرف سے آئے ہوئے ایک ایسے عنایت نامے پر نظر پڑ گئی، جسے پھینکنا محال ہو گیا۔ خط کا مضمون کچھ اِس قسم کا تھا:

”دوستو! زندگی کا اعتبار نہیں۔ موت سے فرار نہیں۔ دنیا ایک عارضی ٹھکانا ہے۔ ایک دن ہم سب کو جانا ہے۔ یہ کھیل ازل سے جاری ہے۔ ’آج وہ، کل تمہاری باری ہے‘۔ یہ لمحہ سب پہ بھاری ہے۔ آج کل موت بھی آسان نہیں۔ یہ حقیقت ہے گمان نہیں۔ ڈاکٹر، گورکن اور تابوت کا خرچہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ میت گاڑی اور قبر کا خرچ الگ۔ کفن بھی سستا نہیں ملتا۔ کندھا دینے کو دوست نہیں ملتا۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

کس انتظار میں بیٹھے ہو فیصل اب تک تم
اُٹھو اور آپ جنازے کو اپنے کندھا دو

تو بھائیو! ہمارے پاس ان سب مشکلات کا حل ہے۔ یہ ہماری محنتِ شاقہ کا پھل ہے۔ دوسری کمپنی والے مُردوں کو دفناتے ہیں۔ ہم مُردوں کو جلاتے ہیں۔ جلاتے نہیں، جلا دیتے ہیں۔ راکھ ایک شیشی میں ڈال کر آپ کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں۔“

آگے چل کر مُردے کو دفنانے کے نقصانات اور جلانے کے مفادات پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے:

”آج کل ہر کوئی سفر میں ہے۔ کوئی گاؤں چھوڑ، دُور شہر میں رہتا ہے۔ کوئی ملک چھوڑ، دیارِ غیر میں جا بستا ہے۔ اہلِ قبور سے جدائی کا غم ڈستا ہے۔ ہم نے یہ مشکل بھی آسان کر دی ہے۔ مرنے والوں کی جدائی کا غم نہ کھاؤ۔ جہاں جاؤ، انہیں بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ راکھ کی شیشی بیگ میں رکھو یا جیب میں۔ جب غم ستائے نکالو اور فاتحہ پڑھ لو۔ چند آنسو بہا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لو۔ اِس وقت سیل جاری ہے لیکن زندگی کی گارنٹی ہے، نہ قیمتوں کی۔ فوراً رجوع کریں اور آج ہی ایڈوانس بکنگ کروالیں۔“

ڈاک میں آنے والے خطوط کی طرح ای میل کے بھی ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ ان کو بھی چھانٹنا اور ضائع کرنا ایک دردِ سَر ہے۔ ایک دن چھانٹی کرتے وقت ایک ایسی ای میل پر نظر پڑ گئی، جس میں یہ افسوس ناک اطلاع دی گئی تھی کہ ہمارے پڑوسی ڈیوڈ اسمتھ صاحب بہ قضائے الٰہی داغِ مفارقت دے گئے ہیں۔ تعزیت کو آنے کی زحمت گوارا نہ کریں۔ یہ خط پڑھ کر سخت افسوس ہوا۔ ڈیوڈ اسمتھ صاحب کے مرنے کا افسوس تو تھا ہی کہ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ لیکن زیادہ افسوس اِس بات کا ہے کہ ہمیں تعزیت سے محروم رکھا گیا۔ ہم نے تو اُن کا مرثیہ اُسی وقت

موزوں کرلیا تھا، جب دو دن پہلے انہیں گھر کے سامنے چھینکتے دیکھا تھا۔ تاریخ بھی نکال لی تھی، جس میں ایک آدھ دن آگے پیچھے کی گنجائش رکھ لی تھی۔ مرحوم کی عمر کی مناسبت سے 'مرگِ ناگہانی' اور 'حسرت اُن غنچوں پہ ہے' وغیرہ تراکیب کا استعمال بھی کرلیا تھا کہ امریکا میں کوئی نوّے کے پیٹے میں ہو تو اُسے جوان ہی سمجھا جاتا ہے۔

ڈیوڈ اسمتھ کے گھر والوں نے تو تعزیت کے لیے آنے والوں کو منع کردیا کہ اُن کے کرنے کو اور بھی بہت کام تھے۔ لیکن اگر کسی کی طرف سے تعزیت کے لیے بلاوا آ بھی جائے تو وہاں سارا دن بیٹھے رہنے کا پروگرام بنا کر نہ جائیں۔ اپنی بیاض اور پان دان گھر پر ہی چھوڑتے جائیں۔ یہ تصور بھی مت لے کر جائیں کہ مرحوم کی بیوہ سَر میں خاک ڈالے بالوں کو نوچ رہی ہوگی۔ سینے پر دوہتڑ مار مار کر بین کر رہی ہوگی۔ یہ لوگ ایسا نہیں کرتے۔ کوئی چل بسے تو چولھا جلتا رہتا ہے۔ کاروبارِ حیات جاری رہتا ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں شادی ہال ہوتے ہیں امریکا میں جنازہ ہال ہوتے ہیں۔ مرحوم کے غسل، آخری دیدار اور تعزیت کا انتظام وہیں ہوتا ہے۔ ایک کمرے میں تابوت رکھا ہے۔ تابوت کے ساتھ مرحوم کی بیوہ جدید فیشن کا ماتمی لباس پہنے، فینسی میک اَپ کیے کھڑی ہے۔ آپ لائن میں لگ جائیں۔ جب باری آئے تو کہہ ڈالیں، 'بہت افسوس ہوا'۔ رونی صورت بنانے کی ضرورت نہیں۔ مرحوم کی خوبیوں کا ذکر نہ لے بیٹھنا کہ پیچھے بھی لوگ لائن میں کھڑے ہیں۔ بیوہ ہر ایک کو ایک ہی جواب دیتی ہے، ''آنے کا شکریہ۔'' اِس سے زیادہ کچھ کہنے سننے کا وقت تعزیت کرنے والوں کے پاس ہے، نہ لواحقین کے پاس۔ جنازہ ہال کا مالک بھی بار بار گھڑی دیکھتا ہے کہ یہ نکلیں تو وہ آئے۔ دوسری پارٹی جنازہ لیے باہر پارکنگ لاٹ میں منتظر ہے۔ اگر پانچ منٹ دیر سے پہنچے تو آپ کسی اور پارٹی سے اظہارِ افسوس کر رہے ہوں گے۔ لیکن اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا! کوئی نہیں دیکھتا کہ کون آیا، کون نہیں آیا۔ کوئی گلہ نہیں کرتا کہ 'فوتگی' پر نہیں آئے۔ ہمارے ہاں لڑائی جھگڑے کے لیے کوئی بہانہ چاہیے۔ کوئی شادی ایسی نہیں ہوتی، جس میں قریبی رشتہ داروں میں جھگڑا نہ ہو۔ ''واہ صاحب! یہ خوب رہی! ہم سے پوچھے بغیر رخصتی کی تاریخ طے کرڈالی؟''، بعض نکتہ چیں تو جنازے پر بھی یہی اعتراض لے بیٹھتے ہیں۔ امریکا میں کوئی اپنے انجام کو پہنچ جائے تو پڑوسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔ ہو بھی جائے تو اتنی مروّت نہیں کہ کوئی کھانا پکا کر لے جائے۔ ان

ملکوں میں سوئم، چہلم اور برسی کا تکلف نہیں۔ مرثیے اس لیے نہیں پڑھے جاتے کہ ان لوگوں کی طبیعت کبھی موزوں نہیں ہوتی۔ دیگیں بھی ایسے مواقع پر نہیں پکتیں۔ شاعری اور نہاری انہیں مرغوب نہیں۔ مرنے والوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کرنے کا حکم ہے۔ اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ ''بہت افسوس ہوا'' اور گاڑی دوڑا کر گھر واپس آ گئے۔ اس کے لیے تو فرصت کے لمحات چاہییں۔ محفلیں درکار ہیں۔ ہمارے ہاں تعزیت کی صورت میں، احباب سے ملاقات کا اچھا خاصا بہانہ نکل آتا ہے۔ کچھ سیاست پر گفتگو۔ کچھ موسم کی شکایت۔ کون کتنے پر آؤٹ ہوا، کس نے کتنی وکٹیں لیں۔ کوئی کرکٹ میں مہارت جتا رہا ہے۔ کوئی سیاسی گتھیاں سلجھا رہا ہے۔ کوئی امریکا کو کھری کھری سنا رہا ہے۔ کسی کو یاد آ جائے تو مرحوم کا ذکرِ خیر بھی آ جاتا ہے۔ لیکن بات کا رُخ پھر بدل جاتا ہے۔

ہمارے دیکھے کی بات ہے۔ گاؤں میں 'فوتگی' ہو گئی۔ دُور کے رشتہ داروں کو اطلاع ملی تو تعزیت کے لیے عورتوں کا ایک قافلہ چل پڑا۔ رستے میں گپیں ہانکتے ہنسی ٹھٹھا کرتے، جب یہ قافلہ گاؤں کے قریب پہنچا تو عورتوں نے ہاتھ سَر پر رکھ لیے اور وہ بین کیے کہ آسمان سَر پر اُٹھا لیا۔ جب گھر کے سامنے پہنچیں تو دیکھا کہ دروازے پر تالا لگا ہوا ہے۔ لواحقین رو دھو کر کفن دفن کر۔کر، اپنے اپنے کاموں کو نکل گئے تھے۔ عورتیں جو صدمے سے نڈھال ہو رہی تھیں، اب غصّے سے پاگل ہو گئیں۔ گھر والوں کو وہ گالیاں دیں کہ اُن کا حدود اَربعہ ایک کر دیا۔ ''جاؤ تہاڈے دادے دی داڑھی...''

جنرل چارلس ییگر "Charles Yeager" امریکی ایئر فورس کے مشہور کمانڈر تھے۔ یہ پہلے پائلٹ ہیں، جنھوں نے آواز سے زیادہ رفتار سے جہاز چلانے کا ریکارڈ 1947ء میں قائم کیا تھا۔ ہم انہیں اس ناتے جانتے ہیں کہ 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں امریکا نے انہیں پاکستان بھیجا تھا کہ جاؤ دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ اصطلاح میں ایسے شخص کو 'آبزرور' کہتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ انہیں پاکستان ایئر فورس کے ایڈوائزر کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔ جنگ کے دوران یہ اسلام آباد میں مقیم تھے۔ اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ جب پاکستان اور بھارت کے درمیان فضائی جنگ شروع ہوئی تو اُنہیں پاکستانی سرحدوں کے اندر گرائے گئے بھارتی فضائیہ کے طیاروں پر فاتحہ خوانی کا موقع ملا۔ اُن کے ریکارڈ کے مطابق بھارتی تباہ شدہ

طیاروں کی تعداد پاکستان کے مقابلے میں تین گنا زیادہ تھی۔ جہاں کوئی روسی ساخت کا بھارتی مِگ طیارہ گرتا، یہ ہیلی کاپٹر لے کر پہنچ جاتے۔ تعزیت کے دو رسمی کلمات پڑھنے کے بعد طیارے کا نمبر نوٹ کرتے اور ملبہ اُٹھوا کر پوسٹ مارٹم کے لیے امریکا بھجوا دیتے۔ ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کی پناہ گاہ پر حملے کے دوران جو امریکی ہیلی کاپٹر گرا تھا، امریکی حکام نے اُس کے ملبے کا بھی فوری مطالبہ کر دیا تھا۔ ہم نے بھی کہا، صاحب، ملبہ ہمارے کس کام کا، فوراً اُٹھاؤ! ہم تو اپنے شہریوں کو بھی ملبہ ہی سمجھتے ہیں۔ جس پر امریکا انگلی رکھ دے، حوالے کر دیتے ہیں۔ اہلِ دانش و علم و ہنر بھی جب دیکھتے ہیں کہ اُن کی حیثیت ملبے سے زیادہ نہیں تو اپنی عزت اور جان بچا کر خود ہی بھاگ جاتے ہیں، ”جس کو ہو دین و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں؟“ یہاں مولوی نیک عالم یاد آتے ہیں۔ فرمایا، ”جو قوم اہلِ علم و ہنر کو ملبہ سمجھتی ہے، ملبے کا ڈھیر بن کر رہ جاتی ہے۔“

بات جنرل چارلس ییگر کی ہو رہی تھی۔ کیا جنرل صاحب اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا کر بھارتی طیاروں کے ملبے پر "Ashes to ashes, dust to dust" ہی پڑھتے رہے؟ نہیں صاحب! اُن کی کچھ اور مصروفیات بھی رہیں۔ ایک تو اُنہوں نے اُردو زبان سیکھی، جس پر ہمارے اربابِ اختیار اور ’اعلیٰ طبقہ‘ مٹی ڈال کر فاتحہ پڑھ چکے ہیں، دوسرے اُنہیں ایک پاکستانی رئیس کی نانی کی تعزیت کا موقع بھی ملا۔ لکھتے ہیں:

”تعزیت کرنے والوں کا موج میلا لگا رہتا تھا۔ دستر خوان پر دنیا و جہان کی گپ شپ اور دنبے کے گوشت کی ضیافت کا سامان تھا۔“

اب آپ پوچھیں گے کہ مرنے پر بس موجاں ہی موجاں۔ کوئی رنج و الم، کوئی آہ و بکا، کوئی آنسو، کوئی سسکی؟ کیوں نہیں؟ اپنے پیاروں کی جدائی کا غم کسے نہیں ہوتا۔ رونے دھونے اور ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر بین کرنے کے لیے دو پیشہ ور عورتوں کی خدمات حاصل کر لی گئی تھیں۔

جاپان میں جہاں کئی شہر ہنگامہ آرائی اور شور و غوغا والے دیکھے، تو ایک دن زندگی کا دوسرا رُخ دیکھنے ایک شہرِ خموشاں کی طرف بھی جا نکلے۔ ہر قبر کے سرہانے شراب کی بوتلیں رکھی تھیں۔ کسی پر وہسکی، کسی پر برانڈی، کسی پر واڈکا۔ ہم نے پوچھا، ”بھئی یہ کس واسطے“؟ ”اس واسطے کہ مرحوم کو یہ برانڈ بہت پسند تھا“۔ ”لیکن کتنے دنوں سے یہ بوتل بند کی بند رکھی ہے؟ مرحوم نے اُٹھ کر کارک

تک نہیں کھولا۔ ایک چسکی تک نہیں لی“۔ ”بھئی! یہ ارواح کا مسئلہ ہے۔ نروان اور گیان کی باتیں ہیں۔ مابعد الطبیعیات کی گتھیاں سلجھانا تمہارے بس کی بات نہیں۔ شراب کی بوتل سے مرحوم کی رُوح کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ احساسِ تنہائی دُور ہوتا ہے۔ تمہارے لیے تو اگلی زندگی میں شراب کا وعدہ ہے۔ ہمیں یہیں سے اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ تم ایصالِ ثواب پر ایمان رکھتے ہو۔ ہم ایصالِ شراب پر۔“

* *

قصّہ یوسفی صاحب سے 'تاثرات' لکھوانے کا!

رشید بٹ

ہم نے برِصغیر کے ایک نابغۂ روزگار شاعر ثاقب لکھنوی کے نایاب کلام کا انتخاب شائع کیا اور تقریبِ پذیرائی میں دورِ حاضر کے ایک نابغۂ روزگار کو ڈرتے ڈرتے مدعو کیا کہ جانے زحمت گوارا کریں، نہ کریں۔ لیکن دعوت نامے والے پلڑے میں چوں کہ ایک بھاری بھرکم سفارش کا 'باٹ' رکھا تھا، لہٰذا موصوف نہ صرف آئے، بلکہ اسٹیج کی بجائے حاضرین وسامعینِ باتمکین میں تشریف فرما ہوئے۔ یوں تو ہم برسوں سے اُن کے حلقۂ 'قارئین و ارادت' میں شامل تھے، تاہم یہ ہمارا اُن سے پہلا 'باضابطہ' تعارف تھا۔ لیکن ذرا رکیے، اس موضوع کے حوالے سے اپنے سمندِ گفتگو کو لگام دیتے ہوئے ہم کچھ اپنے بارے میں بتا دیں۔ ہم اور ہماری بیوی بگڑے صحافی ہیں۔ وہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو بن جاتا ہے۔ سو ہم دونوں بھی جو بگڑے تو صحافی سے پرنٹر اور پبلشر بن گئے۔ کتاب 'انتخابِ کلامِ ثاقب لکھنوی' بھی ایسا ہی ایک شاخسانہ تھی۔ ہمارے ممدوحِ مذکورہ نے کتاب کو اُلٹ پلٹ کے دیکھا اور اُس کی طباعت، خصوصاً جلد بندی کی خوب داد دی۔ بھاری بھرکم سفارش کے 'باٹ' نے کچھ منتخب حاضرین وسامعین کے لیے کھانے کا اہتمام بھی کر رکھا تھا، لہٰذا کھانے پر اُن سے 'رج' کے باتیں ہوئیں اور ہم نے بزعمِ خود اپنا شمار اُن کے شناساؤں، بلکہ دوستوں میں کر لیا۔

ہماری بیوی حمیرا اطہر ہم سے زیادہ پڑھی لکھی اور زیادہ مشہور صحافی ہیں۔ ہمارے گھر میں ایک لمبی قطار ایوارڈز اور اسی قماش کی دیگر اشیا مثلاً، تصاویر اور طغروں کی لگی ہوئی ہے۔ کچھ میزوں پہ رکھے ہیں، کچھ شیلفوں پہ اور کچھ دیواروں پہ آویزاں ہیں۔ ایک بار چند دوست آ گئے تو روال تبصرہ شروع ہو گیا۔ ایک صاحب رہ نہ سکے تو ہم سے گویا ہوئے، ''اِن اشیائے ناخورونوش میں کچھ تمہارا بھی ہے؟'' تو دوسرے فوراً پھٹ پڑے، ''ارے بھئی! جب ایسی چیزیں جہیز میں آنے لگیں تو

دوہری مشقت کی کیا ضرورت ہے؟" ایسے میں ہم کیا کہتے سنتے کہ ہماری ساری پیشہ ورانہ زندگی تو کتابیں ترجمہ کرتے اور خبریں بناتے بیت گئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ حکومتِ چین کی دعوت پر کوئی پندرہ برس وہاں گزار آئے۔ اُن کی کتابیں اُردو میں ترجمہ کرتے رہے اور موصوفہ کالم اور مضمون نگاری کرتی رہیں، جن میں نام بھی تھا اور ایوارڈ بھی۔ تین ایوارڈ تو اُنہوں نے آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی (عرفِ عام میں اے پی این ایس) کے سالانہ مقابلوں میں 'پیٹ لیے'۔ ایک زمانے میں وہ 'بابری مسجد' پر اعلیٰ پائے کی کتاب لکھ کر اور ہم سپریم کورٹ میں بھٹو مرحوم کے آخری بیان 'اگر مجھے قتل کر دیا گیا' کا ترجمہ کتابی صورت میں چھاپ کر دھڑا دھڑ بیچنے کا 'کھڑکی توڑ ہفتہ' منا چکے تھے۔ اُن ہی دنوں ہم ملک کا معروف ماہنامہ 'شوٹائم' نکال کر اور چند برس اُس کی ایڈیٹری کر کے بند بھی کر چکے تھے۔ لوگ آج بھی ہمارے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہتے ہیں، "یار! تم پھر شوٹائم کیوں نہیں نکال لیتے؟" اور ہم ہنس دیتے ہیں، ہم چپ رہتے ہیں۔ ان تمام احوالِ واقعی کے نتیجے میں ہمارا خیال تھا کہ ہم دونوں میاں بیوی، زیادہ نہ سہی، کچھ نہ کچھ تو 'شہرتِ عام اور بقائے دوام' حاصل کر چکے ہیں۔ مگر مشتاق احمد یوسفی صاحب کو ہماری 'شہرتِ عام اور بقائے دوام' ایک آنکھ نہ بھائی اور اُنہوں نے اس کا 'کماحقہٗ' انداز میں بھُرکس نکال کے رکھ دیا۔ ارے ارے، آپ ابھی بھی نہیں سمجھے؟ ہم اُوپر اِن ہی کا تو ذکر کر رہے تھے!

ہوا یوں کہ حمیرا نے ایک دن بات چھیڑی کہ میں نے اتنے کالم لکھے ہیں، ادبی انٹرویوز کیے ہیں، یہ لکھا ہے، وہ لکھا ہے، کیوں نہ انہیں مرتب کیا جائے اور الگ الگ کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ سب سے پہلے کالم لے لیتے ہیں، اس کے بعد انٹرویوز کی کتاب لے آئیں گے۔ میری مختلف تحریروں کی کم اَز کم چھ کتابیں بن سکتی ہیں۔ اب ہم نے دھیرے دھیرے کھانسنا شروع کیا تو موصوفہ نے کتابوں کی تعداد میں کمی کا آغاز کر دیا۔ آخر میں طے پایا کہ ابھی صرف کالموں کی کتاب ترتیب دی جائے۔ عنوان بھی سوچ لیا گیا 'بات سے بات' کہ ہفت روزہ 'اخبارِ خواتین' میں یہ کالم اسی عنوان کے تحت لکھے گئے تھے۔ ہم نے ابتداً کالم کمپوزنگ کے بعد کچھ نظرِ ثانی کے انداز میں دیکھے تو کہیں کہیں دلچسپ لگے۔ ذرا مزید غور اور توجہ سے پڑھا تو اندازہ ہوا کہ اچھے خاصے ہیں۔ اب ہم نے سنجیدگی اختیار کی۔ کالموں کی نوک پلک سنواری گئی، ٹائٹل بنایا اور بالآخر حتمی شکل میں مسوّدہ تیار ہو گیا۔

اب جو مرحلہ آیا، وہ ہر کتابیے (ذرا شائستہ الفاظ میں کہا جائے تو ہر صاحبِ کتاب) کے لیے بڑا ہی کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے، یعنی اپنے جاننے (اور نہ جاننے) والے معروف ادبا اور شعرا کے تحریری تاثرات اور آراء شاملِ کتاب کرنے کا مرحلہ... تاکہ کتاب کچھ وزن دار ہو جائے۔ ویسے فی زمانہ ضروری نہیں کہ تاثرات اور آراء لکھنے والے پڑھے لکھے بھی ہوں، سو ہم دونوں نے ڈول ڈالنے شروع کیے کہ تاثرات کے لیے کسی ایسے 'بڑے صاحب' کو پکڑا جائے، جو سوا سیر ہوں۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں آ جائے۔ بقول کسے، زیادہ لوگوں کی ٹھوڑی میں ہاتھ نہ دینے پڑیں۔ پھر کالموں کا تعلق بھی فکاہت اور طنز و مزاح سے ہے اور طنز و مزاح لکھنے والے آج کل یوں بھی گِنے گِنائے ہیں۔ فکاہیہ کالم نگاری تو ناکوں چنے چبوا دیتی ہے۔ یہ ہماری ذاتی رائے ہو سکتی ہے۔ لکھنے والے تو اتنے ہیں کہ اَب پڑھنے والے کم پڑنے لگے ہیں۔ ایک روزنامہ ہم نے دیکھا، اُس میں روز اتنے کالم ہوتے ہیں کہ لگتا ہے ماسوائے چپراسی کے ہر ملازم کالم لکھنے اور چھپوانے میں جُتا ہوا ہے (سنا ہے اُس اخبار میں چپراسی ہی نہیں ہیں)۔ حتیٰ کہ اُن سب کی دیکھا دیکھی اب 'ایڈیٹر اخبارِ ہٰذا' نے بھی کالم نویسی کا آغاز کر دیا ہے۔

ہم نے بات کہاں سے شروع کی تھی اور 'بات سے بات' نکلتے نکلتے کہاں پہنچ گئی۔ سوچتے سوچتے خیال آیا کہ مشتاق احمد یوسفی صاحب سے کیوں نہ کہا جائے کہ ہاتھی کے پاؤں میں ہما سب کا پاؤں آ جائے۔ گو ہم اس خوش فہمی میں گلے گلے ڈوبے ہوئے تھے کہ یوسفی صاحب سے ہماری اچھی شناسائی ہے، پھر بھی ہم نے 'سفارشی بات' مسودے پہ رکھا اور طے شدہ وقت پر ڈیفنس میں اُن کے درِ دولت پہ حاضری دے دی۔ اُن کی 'زرگزشت' پڑھ کر (خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم کم و بیش چھ مرتبہ یہ کتاب بقول شخصے چاٹ چکے ہیں) اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مونا باؤ، پھر ٹنڈو آدم سے کراچی کی پی آئی بی کالونی اور پھر ڈیفنس تک، انگریزی اُردو، ہر دو زبانوں والا خاصا 'سفر' کیا ہے، لہٰذا 'غریب غرباؤں' کا کچھ خیال کر لیں گے۔ اُنہوں نے خیال کیا اور خوب کیا۔ وقت کے معاملے میں وہ پکے انگریز ہیں۔ کہنے لگے، "میں نے حال ہی میں آنکھوں کا آپریشن کرایا ہے۔ پڑھنا لکھنا محال ہے۔ آپ یوں کریں کچھ لکھ لائیں، میں دستخط کر دوں گا۔" اس حوالے سے اُنہوں نے ماہ قبل کا ایک واقعہ بھی سنایا، جس کا لُبِّ لُباب یہ تھا کہ وہ ایسا ہی ایک (یا کئی؟) دریائے شور عبور کر چکے ہیں۔ ہم پہلے تو 'ہکا' ہوئے پھر 'بکا' ہوئے۔ بصد مشکل اپنے حواس قابو میں لاتے

ہوئے عرضی گزاری کہ 'عوالی جاہ' (یوسفی صاحب نے اپنے ایک محبوب کردار کے کلّے میں گلوری دبوا کر عالی جاہ کو بڑے خوب صورت انداز میں 'عوالی جاہ' کہلوایا ہے) ہم اپنی تحریر میں کتنے بھی کلی پھندنے ٹانک لیں، اُس میں بلند شہر (بُلَن شے اور بوڑھا نیم کا پیڑ) تو لانے سے رہے۔ کیا یوسفی صاحب کی تحریر اتنی گئی گزری ہوگئی ہے کہ ہم لکھیں اور یوسفی صاحب اُس پہ دستخط کر دیں؟ تاڑنے والے تو قیامت کی نظر رکھتے ہیں، ڈھول کا پول کھول کے رکھ دیں گے۔ یا پھر یہ کہیں گے کہ ہم نے جعل سازی کی ہے۔ آپ ماشاء اللہ ازلی تو نہیں، ابدی بینکر ضرور ہیں۔ آپ کے دستخطوں کا کیا ہے، وہ تو اسکین کر کے کہیں بھی چپکائے جا سکتے ہیں۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ ہم ایک آدھ کالم کیسٹ پر ریکارڈ کر کے دے دیں۔ آپ بطور 'مُشتے نمونہ اَز خروارے' اُسے سن کر اپنے تاثرات ریکارڈ کر دیں۔ ہم وہ ٹرانسکرائب کر لیں گے۔ وِس پہ وِن نے تبسّم فرمایا اور کہا، ''اچھا آپ لوگ مسوّدہ چھوڑ جائیں۔ آنکھیں جوں ہی ذرا پڑھنے کے لائق ہوں گی، میں دیکھ کر اپنی رائے لکھ دوں گا، مگر مہینہ بھر لگ جائے گا۔'' ہم نے اِسی کو غنیمت جانا اور مسوّدہ اُن کے سپرد کر کے آ گئے۔ لگ بھگ ایک ماہ بعد ہم نے ایک 'روزِ محشر' اُنہیں فون کر دیا کہ سزا و جزا کا پتا چلے۔ کہنے لگے، ''پشاور سے ایک خاتون آئی تھیں، میں نے مسوّدہ اُنہیں دیا ہے کہ پڑھ کر رائے لکھ دیں۔'' ہمارا دم مسافر ہونے میں بس ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہو گی۔ مجنوں نظر آنے لگی، لیلیٰ نظر آنے لگا۔ یوسفی صاحب نے تو مارواڑی اہلِ زبان ہونے کے باوصف اُردو اہلِ زبان حضرات سے اپنی تحریروں پر اصلاح لے لی تھی، مگر ہم پشتو اہلِ زبان کے ہاتھوں اُردو کی اصلاح کس طور ہضم کر پائیں گے؟ یوسفی صاحب کے ہی ایک کردار 'خان سیف الملوک خان' بھی رہ رہ کے ہمارے اعصاب پر ہتھوڑے برساتے رہے اور ہم یہ سوچا کیے کہ پشتو اہلِ زبان کے 'تاثرات' ہمارے اعمال کے خانہ سزا میں جائیں گے، یا جزا میں؟ اسی عالمِ خستگی میں ہمیں غالبِ خستہ کے بارے میں ایک پُرانا لطیفہ بھی یاد آیا۔ موصوف جب تک زندہ رہے، اللہ تعالیٰ کے بارے میں شاعرانہ تعلّی ہی سے کام لیتے رہے۔ بیوی اُنہیں ماشاء اللہ 'جھن نجھن' ملی تھیں، اُس کے حوالے۔ سے بھی اللہ میاں سے شکوے شکایتوں کا دفتر عموماً کھلا رکھتے۔ اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھارے تو قرض خواہوں نے بھلے سے جاں بخشی کر دی ہو، فرشتوں نے اُنہیں پکڑ فوراً اللہ میاں کے حضور لا کھڑا کیا اور خود کھاتے کھول کے بیٹھ گئے۔ اللہ میاں 'فردِ جرائم' سنتے گئے اور اُن کا جلال دو آتشہ بلکہ چہار آتشہ ہوتا گیا۔ فردِ جرائم تھی کہ ختم

انور احمد علوی

ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ فرشتے بھی ہانپنے لگے تھے۔ اُن کے گلے خشک ہو رہے تھے۔ بارے خدا خدا کر کے فرد ختم ہوئی تو اللہ میاں گویا ہوئے، غالبؔ! میں نے تو تمہیں ایسا شاعر بنا کے دنیا میں بھیجا تھا کہ شروع شروع میں دوسرے بڑے شاعر کبھی باتوں کے کچوکے لگا کے تو کبھی کہنیاں مار کر تمہیں پیچھے دھکیلنے کی کوشش کریں گے، لیکن پھر ایسا وقت بھی آئے گا کہ تمہارے آگے کسی کا چراغ نہ جل پائے گا اور تم ہر دور کے شاعر جانے جاؤ گے، مگر تم نے تو دنیا میں میرے ہی لئے لینے شروع کر دیے۔ تمہیں مَیں نے نماز، روزے کی پابند بیوی دی تو تم اُس کا مذاق اُڑاتے رہے۔ اب مَیں تمہیں سزا بھی ایسی دوں گا کہ دنیا دیکھے گی۔ آج سے کوئی سو سال بعد ہندوستان میں تمہارے نام سے ایک فلم بنے گی، جس میں اس وقت کا ایک پھٹیچر ایکٹر بھرت بھوشن تمہارا کردار ادا کرے گا۔ اتنا سننا تھا کہ غالبؔ نے ہاہا کار مچا دی۔ اللہ میاں کو اللہ میاں ہی کی دہائی دینے لگے کہ اتنی کڑی سزا نہ دی جائے۔ اس پہ اللہ میاں بولے، سنو! ابھی تو میری بات بھی پوری نہیں ہوئی، کس نے تمہیں کہہ دیا کہ بس اتنی ہی سزا ہو گی؟ اس کے چند سال بعد پاکستان میں بھی تم پر ایک فلم بنے گی، جس میں ایک پاکستانی ایکٹر سدھیر، مرزا غالبؔ بنے گا۔ اور غالبؔ شاید پوری بات سنے بغیر ہی بے ہوش ہو گئے۔

یوسفی صاحب کو دریائے شور عبور کرنے سے ہم روک ہی چکے تھے۔ ہمارے بے ہوش ہونے کی نوبت بہر حال نہ آئی۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ اُس پشتو اہلِ زبان خاتون نے بھی یہ بھاری پتھر چوم کر چھوڑ دیا۔ ایک دن ٹی سی ایس کے ذریعے ہمیں ایک پیکٹ موصول ہوا۔ بھیجنے والے یوسفی صاحب تھے۔ لفافے میں وہ مسودہ رکھا تھا، جو ہم اُن کے سپرد کر آئے تھے... اور کچھ نہ تھا۔ عرصۂ واردات تین چار ماہ تو رہا ہو گا۔ اب ہمیں اچھی طرح یاد نہیں۔

چند روز ہوئے روزنامہ 'نوائے وقت' کے ایک سنڈے میگزین میں کتابوں پر تبصروں والا حصہ نظر سے گزرا۔ ایک خاتون نے اپنے اخباری اور غیر اخباری کالموں کا ایک ضخیم و جسیم 'انتخاب' شائع کیا ہے۔ پانچ سو سے زائد صفحات ہیں۔ تبصرے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ جناب مشتاق احمد یوسفی نے اِن خاتون کو 'خواتین کی پطرس بخاری' قرار دیا ہے۔ اب یہ ہم بالکل نہیں جانتے کہ یوسفی صاحب نے خاتون کو یہ اعزاز اُن کے کالم 'پڑھ' کر دیا ہے، یا صرف 'دستخط' کیے ہیں!!

ہم جانے کتنی 'صدیوں' سے یوسفی صاحب کے مداح ہیں اور رہیں گے کہ اُن کا لکھا پڑھ کر

رنگِ ادب دہلی گیٹ

رشید بٹ ...... قصہ یوسفی صاحب سے تاثرات لکھوانے کا

ہم نے جانے کب کب ذہنی آسودگی پائی۔ جانے کتنے دُکھوں اور اعصابی کھچاؤ کے عالم میں اُن کے الفاظ ہمارے لیے مسکراہٹیں بن کے آئے، مایوسیوں کی کڑی دھوپ کو حوصلوں کی خوشگوار بوندا باندی کا رنگ دیا۔ ہم ایسے جانے کتنے مداحوں کی مسکراہٹیں اُن کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں، اُن کے گرد محبتوں کا ہالہ بنائے رکھتی ہیں... لیکن کتاب پر تبصرے، رائے، یا تاثرات والی بات اپنی جگہ...

* * *

بڑھاپا اور کبریٰ بیگم

رشید قریشی

آئینہ ہمیں دیکھ کے حیران سا کیوں ہے؟
کیا کوئی نئی بات نظر آتی ہے ہم میں

آئینہ کو آئینہ دیکھنے والے میں نئی بات جو نظر آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ چہرہ کی جلد جگہ جگہ سے کٹ پھٹ کر جھریوں میں بدل گئی ہے اور سر کے بالوں کی چمکتی سیاہیاں بدرنگ بھوری پڑ گئی ہیں۔ جیسے بھونرے اُڑ گئے اور ان کی جگہ بگلے بیٹھ گئے۔

اُصولاً بوڑھوں کو آئینہ دیکھنا ہی نہیں چاہیے اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ حتی الامکان اس سے منہ چھپاتے ہی رہتے ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ خود آئینہ انہیں چوری چھپے دیکھتا اور اُن پر ٹھٹے لگاتا پھرتا ہے۔ اب ذرا اِسی واقعہ کو لیجیے۔

ایک بزرگ کی نظر اتفاقاً ایک دوشیزہ کے دمکتے چہرہ پر پڑ گئی۔ پہلی نظر چوں کہ جائز ہوتی ہے۔ اس لیے یہ نظر کچھ زیادہ دیر ٹھہری بس غضب ہو گیا! دوشیزہ کی آنکھوں پر لگی عینک کے رنگین شیشوں نے شور مچا دیا کہ لوگو دیکھو! یہ بڈھا بُری نظر سے گھور رہا ہے۔ اب وہ بزرگ کانپتے لرزتے یقین دلانا چاہتے ہیں کہ بوڑھی آنکھوں میں بُری نظر کی سکت ہی نہیں ہوتی اور یہ کہ وہ تو عینک کے شیشوں میں اپنی صورت کے ساتھ ساتھ جنت کی اُس حور کی جھلک دیکھ رہے تھے جو بہت جلد ان کے تصرف میں آنے والی ہے۔ لیکن ان کے بیان کو کسی نے بھی قبول نہیں کیا اور یہ فیصلہ سنا دیا گیا کہ بڑے میاں کا جسم تو بوڑھا ہو گیا، دل ابھی تک جوان ہے۔ بوڑھے جسم میں جوان دل کہاں؟ جسم بوڑھا تو دل بھی بوڑھا، البتہ جوانی کی یاد میں کبھی کوئی دھڑکن چنچل مچھلی کی طرح اچھل جاتی ہے اور پھر وہی بڑھاپے کا گندہ ٹھہرا ہوا پانی۔ اب اس اتفاقی، غیر محسوس، خیالی جواں مردی کو بھی موردِ الزام ٹھہرایا جائے تو مایوس و مجبور و معذور بوڑھے، ازسرِنو، جوان ہونے کے جتن نہ کریں تو کیا کریں؟ خود میں بھی اس بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں۔

ہوا یہ کہ میں ایک دن گھریلو فضا کی گھٹن سے گھبرا کر پھاٹک کے سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ بھینسوں، بکریوں اور کتوں کو ذہنی اذیتوں سے محفوظ خوش وخرم دنیاداری کرتے دیکھ کر یک گونہ سکون مجھے حاصل ہو رہا تھا کہ... ایک لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کو گھسیٹتی ہوئی میرے پاس پہنچ کر رُک گئی۔ غصہ سے اپنے دیدے پھاڑتی اس نے انگلی سے میری طرف اشارہ کیا اور چلائی۔ ”اب سیدھی طرح اسکول چل ورنہ... دیکھ... یہ... یہ بڈھا تجھے پکڑ لے گا“... یہ بڈھا... یہ... میں بڈھا... میں پوری طاقت سے کھنکھار اُٹھا اور وہ روتا، چنگھاڑتا، اڑیل بچہ... سہم کر یوں چپ ہو گیا جیسے میری کھنکھار نے اس کے سارے آنسو قبض کر لیے۔ میرا سر کرسی سے اُچھلا جیسے تلوار سے قلم ہو گیا! اور میں اپنے بغیر سر کے دھڑ کو گھسیٹتا ہوا گھر کے اندر چلا گیا۔ بستر پر گر کر میں نے وہ سارے آنسو تکیہ میں جذب کر دیے جو اس نٹ کھٹ بچے نے روک لیے تھے۔ یہ مقامِ فضیلت مبارک ہو... میں بڑبڑانے لگا... اب تجھے رونے والے ضدی بچوں کو ڈرانے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے... مبارک ہو۔

”کس سے باتیں کر رہے ہیں جی آپ؟“ بیگم نے پوچھا۔ میں نے جواب دیا، ”تمہارے کان بجنے لگے ہیں۔ یہاں کون ہے جس سے میں باتیں کروں گا؟“

بیگم سرہانے آ بیٹھیں اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے شفقت آمیز لہجہ میں کہنے لگیں... ”میں شرمندہ ہوں جی۔ ان نواسوں، نواسیوں، پوتروں، پوتریوں کو سنبھالنے میں آپ میرے ذہن سے بالکل اُتر جاتے ہیں... اور آپ اپنے سر کے بالوں پر استرا پھروا لیجیے، بہت سفید ہو گئے ہیں... میری بچپن کی ایک سہیلی نے آپ کو دیکھا تو مجھ سے پوچھا، یہ تمہارے مرحوم خسر ہیں نا؟ سن رہے ہیں نا آپ...؟ میں سب کچھ سن رہا تھا... لیکن میں رو رہا تھا... اور خشک آنسو رونے والا جواب دینے کی کوشش کرے تو چیخنے لگتا ہے اس لیے میں دبکی مار گیا... جیسے سو گیا۔

دوسرے دن بیگم نے مجھے علی الصبح جگا دیا۔ کہنے لگیں اب آپ روز چہل قدمی کے لیے جایا کیجیے۔ میں نے سنا ہے، ریس کورس کی طرف آپ کے جیسے کئی وظیفہ یاب بوڑھے چھڑیاں گھماتے... چہل قدمی کے لیے آتے ہیں... ان کی سنگت میں آپ کا وقت بھی دلچسپ گزرے گا اور صحت بھی اچھی ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے یہ نکما بڑھاپا بھی دور ہو جائے۔ میں نے بیگم کی بات مان لی کیوں کہ اس طرح ان سے چند گھنٹے تو چھٹکارا میسر آ سکتا تھا۔ ایک دن میں چہل قدمی کے

لیے نکلنے ہی والا تھا کہ بیگم نے رک جانے کو کہا، ”دیکھیے اِدھر بچوں کے لیے پتلا پانی دودھ ملتا ہے۔ وان مارکٹ کے پاس جو دودھ والا ہے وہ اچھا دودھ دیتا ہے۔ آپ یہ دودھ کا ٹین اپنے ساتھ لیے جائیں۔“ میں حیرت سے بیگم کو گھورنے لگا تو انہوں نے سمجھایا... ”اس میں مشکل ہی کیا ہے؟ جاتے کین دودھ والے کو دیتے گئے اور آتے آتے دودھ بھرا کین لیتے آگئے۔“ بچوں کے خیال سے میں اس مشورہ پر کاربند ہوگیا۔ چند دن بعد بیگم نے کہا، ”اب آپ تھیلی بھی ساتھ لے جایا کیجیے۔ اس طرح اصلی پوٹلے کا گوشت بھی آیا کرے گا۔“ اس مشورہ میں اپنے ذائقہ کا سامان تھا، اس لیے کین کے ساتھ تھیلی بھی میرے ہاتھ میں آگئی... اور دونوں ہاتھوں اور پاؤں سے میری چہل قدمی جاری ہوگئی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ایک ہاتھ میں کین اور دوسرے میں گوشت کی تھیلی لیے گھر لوٹ رہا تھا کہ میری ایک بہی خواہ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس نے میری یہ درگت دیکھی تو خبردار کیا کہ تھیلی اور کین کی خانگی ملازمت سے ہاتھ چھڑا لو... ورنہ... دیکھو... اِدھر ہی آٹے کی گرنی بھی ہے... لکڑیوں کی ٹال بھی... بات میری سمجھ میں آگئی اور میں نے بیگم سے کہہ دیا۔ اب میری چہل قدمی ختم ہوتی ہے کیوں کہ جس سڑک پر یہ چہل قدمی ہو رہی ہے اس پر میرے ایک تیز قدم ہمقدم کو ہارٹ اٹیک ہوگیا اور اس واردات کی بنا پر اس سڑک کا نام ہی ’دل بند روڈ‘ مشہور ہوگیا ہے۔

بوڑھے شوہر جن کی زندگی کا بیمہ نہیں ہوتا بہت احتیاط سے برتے جاتے ہیں۔ ان کی بیماریوں کے مبہم اشارے بھی دور اندیش بیویوں کے حواس باختہ کر دیتے ہیں۔ میں چہل قدمی کو موقوف کر کے گھر بیٹھ رہا تو بیگم نے حکیم قلع قمع کو بلوالیا۔

حکیم صاحب: آپ کیا بچپن سے بوڑھے ہیں؟

میں: جی نہیں۔ بچپن میں تو میں بچہ ہی تھا۔

حکیم صاحب: تو کیا جوانی میں بوڑھے ہوئے؟

میں: جی نہیں: جوانی میں تو بیگم صاحبہ لائق ہوئیں۔

حکیم صاحب: تو گویا بڑھاپے سے آپ بوڑھے ہوئے ہیں۔

میں: جی... وہ تو ٹھیک ہے لیکن طب نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ بڑھاپا، بڑھاپے میں بھی کیوں رہے؟

حکیم صاحب کچھ دیر سوچتے رہے اس کے بعد پوچھ بیٹھے، ”آپ علاج پر کتنا خرچ کرسکتے

ہیں۔"

میں نے جواب دیا، "اگر میرا بڑھاپا دور ہو گیا۔ میرے بال کالے ہو گئے تو میں گریجویٹی کی پوری رقم آپ کی نذر کر دوں گا۔" کہنے لگے، "میاں، قلع قمع کے معنی ہی ہیں۔ بڑھاپا دفع اور رہا بالوں کا کالا ہونا تو صرف اتنا کہوں گا کہ اگر میری دوا کسی سفید مرغ کو چالیس دن کھلائی جائے تو اکتالیسویں دن... ایک کالا کوا آپ کے سامنے حاضر ہو کر بانگ دینے لگے گا۔" میں اور ایک سفید مرغ... ہم دونوں ایک ساتھ حکیم صاحب کی گولیاں کھانے لگے۔

اس اثنا میں خبر ملی کہ میری ایک عزیزہ کبریٰ بیگم جو چالیس برس پہلے کراچی چلی گئی تھیں اب بیوہ ہو کر اکیلی واپس آ گئی ہیں۔ یہ کبریٰ بیگم وہی تھیں جن سے میری شروع شروع کی جوانی نے پہلی پہلی محبت کی تھی۔ اور ہو سکتا تھا کہ ہماری شادی بھی ہو جاتی لیکن میری بدقسمتی کہ محبت بھی ہوئی تو بخیل باپ کی بیٹی سے... اور آپ جانتے ہیں... پہلی محبت اندھیرا دوسری محبت ٹھوکر۔ اور تیسری محبت گڑھا... میں اندھیرے میں ٹٹولتا رہ گیا اور ایک پردیسی نے دو طرفہ شادی کا انتظام کر کے میری کبریٰ بیگم کو اغوا کر لیا۔ کبریٰ بیگم اب شاید میرے اغوا کے لیے آئی تھیں، کیوں کہ رات کے دس بجے چاے پینے کے لیے بلایا گیا تھا۔ میں نے سوچا اِس دعوت کو ٹال جاؤں، کیوں کہ حکیم صاحب کے علاج کو صرف تیس دن ہوئے تھے اور تکمیل کے لیے ابھی دس دن باقی تھے۔ لیکن پھر ایک ترکیب ذہن میں آئی کہ دس گولیوں کی ایک گولی بنالی جائے اور کبریٰ بیگم کے ساتھ چائے پی ہی لی جائے۔ مثل مشہور ہے، وقت مرد کی کمر توڑ ڈالتا ہے لیکن عورت کی صرف چوڑیاں توڑ سکتا ہے۔ کبریٰ بیگم دلہن تو نہ رہیں لیکن بیوہ بھی نظر نہ آئیں اور ایک خاص تبدیلی جو میں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ جن آنکھوں سے بات بے بات آنسو ڈھلک پڑتے تھے اب وہاں ایک ابر سا چھایا رہنے لگا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کبریٰ بیگم نے پوچھا، "یاد ہے... مولسری کے پاس کا وہ چھوٹا سا ویران کمرہ... آپ ایک رات وہاں مجھے شیطان دکھانے لے گئے تھے... یاد ہے۔" میرا حلق سوکھنے لگا، "یاد ہے..." کبریٰ بیگم کو پھر کچھ یاد آیا... "آپ مجھے کبو کہا کرتے تھے... اور میں آپ کو ابو۔" میں نے حسرت سے کبریٰ بیگم کی طرف دیکھا... اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ ان کی آنکھوں کا ابر ... جھکتا جھکتا... میری طرف بڑھ رہا تھا... عین اسی وقت گولی کا خیال آیا اور ایک جھٹکے سے میں نے اپنا منہ پھیر لیا۔ گولی کو منہ میں ڈال کر نگلنا چاہا تو... وہ کھسکتی کھسکتی حلق کے ابتدائی حصہ تک گئی

ہے۔ کیا جنگ اور محبت کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی سب کچھ جائز ہے۔ نیوٹرل امپائر سے قبل کا زمانہ آپ کو یقیناً یاد ہوگا۔ اللہ اللہ! کس کس انداز سے اس وقت کے بیشتر امپائر اپنے اپنے ملک و قوم کی خدمت کیا کرتے تھے۔ یا یوں کہیے خیال رکھا کرتے تھے۔ میں نے اس وقت کے ایک امپائر سے جب اس کی وضاحت چاہی تو انہوں نے کہا کہ جنگ جیتنے کے لیے جب ہمارے جاں نثار سپاہی سب کچھ کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں۔ جنگ جیتنے کے لیے یا یوں کہیے کہ ملک و قوم کے وقار کے لیے ہم مقدور بھر کوشش کیوں نہ کریں۔ میرے ایک دوست نے میری یہ بات سن کر ایک دن مجھ سے کہا، ”چلو یہ مانا کہ اپنی ٹیم کی جیت کے لیے یہ جواز موجود ہے کہ ایسے مواقع پر قومی جذبہ لو میں عود کر آتا ہے۔ لیکن پیسے لے کر جو ٹیم ہار جاتی ہے، اس کا کیا جواز ہے۔ میں دیر تک اس معصوم شخص کے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔ میرے اس دوست کا دھیان جیتنے والی ٹیم کی طرف نہیں گیا۔ اب انہیں کون بتائے کہ جب ایک ٹیم ہارتی ہے تو دوسری ٹیم جیتتی بھی ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس قسم کی ہار کے لیے جیتنے والی ٹیم کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

زیادہ تر صاحبِ اختیار لوگ بے اختیار لوگوں کا خیال رکھتے ہیں یا خیال رکھنے کی باتیں کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی بے اختیار لوگوں سے بھی صاحبِ اختیار لوگ خیال رکھنے کا تقاضا کرتے ہیں اور یہ بے اختیار لوگ اپنے آپ کو مزید بے اختیار و بے بس کرنے کے لیے اپنا ووٹ ان کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو ہماری پوری زندگی ہی طلسمِ خیال ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات اب تک نہیں آئی کہ ڈاکٹر مریض کا خیال رکھتے ہیں یا مریض ڈاکٹر کا۔ طالب علم درس گاہوں کا خیال رکھتے ہیں یا درس گاہیں طالب علموں کا۔ گویا خیال رکھنے کے عمل میں دونوں فریق لازم و ملزوم ہیں۔ ملزم کے بغیر عدالت، چور کے بغیر سپاہی، بالکل ایسے ہیں جیسے بارش اور دھوپ کے بغیر چھتری۔ مضمون کا حنوان ہے ’خیال رکھنا‘ سو مجھے پڑھنے والوں کے وقت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ لہٰذا خیال رکھنا والی سیکڑوں باتوں کو چھوڑتے ہوئے صرف دو واقعے بیان کرنے پر ہی اکتفا کروں گا۔

ایک صاحب سیمینار میں میری برابر والی کرسی سے اُٹھ کر کہیں جانے لگے۔ انہوں نے جاتے ہوئے اپنی کرسی پر ایک رومال رکھ دیا اور مجھ سے کہا۔

”ذرا خیال رکھیے گا۔“

جب وہ واپس لوٹے تو ان کی کرسی پر کوئی اور بیٹھا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔

"یہاں میں رومال رکھ کر گیا تھا۔"

وہ رومال میری جیب میں تھا۔ میں نے اسے ان کی طرف بڑھا دیا۔ غصّے سے ان کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ میرے ہاتھ سے رومال کھینچتے ہوئے انہوں نے تقریباً گالیاں بکنے والے انداز میں کہا۔

"میں نے آپ کو کرسی کا خیال رکھنے کے لیے کہا تھا... رومال کا نہیں۔"

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے خیال رکھنے کے لیے سوچنے اور دُور تک سمجھنے کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔ سوچ سمجھ کر خیال رکھنے کا یہ منظر تو بارہا آپ کی نظروں کے سامنے سے بھی گزرا ہوگا۔ نکاح کے کلمات مکمل ہونے کے بعد قاضی صاحبان عموماً بہت تفصیلی دعا مانگتے ہیں۔ دس، بارہ، پندرہ منٹوں کی دعا میں ہر قاضی صاحب دولہا دلہن کی زندگی کو پُرسکون اور خوش و خرم رہنے کی دعائیں دیتے ہیں۔ اپنی دعاؤں میں اہلِ محفل کو بھی شریک کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے تئیں فیض و رحمت کا ایک گوشہ نہیں چھوڑتے لیکن نہ جانے کیوں وہ اُس انتہائی ضروری مختصر سے جملے کو اپنی لمبی دعاؤں میں شامل نہیں کرتے۔ پتا نہیں کس کا خیال آڑے آ جاتا ہے۔ اپنا یا لڑکے اور لڑکی والوں کا۔ کاش ایک بار ہی سہی وہ اس جملے کا اضافہ بھی اپنی دعاؤں میں کر دیا کریں۔ دعا ختم کرتے ہوئے نہ سہی بیچ میں ہی کم سے کم ایک بار یہ کہہ دیں۔ "یا اللہ بہو کو ساس اور ساس کو بہو کے شر سے محفوظ رکھ، یا پھر دونوں کو ایک دوسرے کا خیال رکھنے کی توفیق عطا فرما۔

* * *

اچھے مرزا بنام مرزا پھویا مدظلہ العالے!

رئیس امروہوی

قبلہ ابا جان!

راقم السطور الحمد للہ بخیریت ہے اور خیریت آنجناب کی مع متعلقین بدرگاہ الٰہی نیک مطلوب دیگر احوال آنکہ کراچی میں ماہ مبارک شروع ہوگیا ہے اور آج الحمد للہ بندے کا پہلا روزہ ہے۔ افطار میں تیس منٹ سترہ سیکنڈ باقی ہیں۔ پریشان تھا کہ یہ طویل مدت کس طرح گزاردوں؟ اچانک خیال آیا کہ حضور ابا جانی کی خدمت میں نیاز نامہ بھیجے ہوئے کئی روز ہوگئے ہیں۔ لاؤ اتنی دیر میں خط ہی لکھ ڈالیں۔

قبلہ وکعبہ! کراچی کا دعویٰ ہے کہ وہ مرکز اسلام ہے اور بظاہر ہے بھی۔ لیکن اصل مرکز اسلام تو ارض حجاز ہے جہاں نور وہدایت کے سرچشمے اُبلے اور تکبیر کی پہلی صدا گونجی۔ ارض حجاز کے ہوتے، کراچی کا یہ دعویٰ کہ وہ اسلامی دار الخلافہ ہے صریحاً گستاخی تھا۔ چنانچہ اس سال کراچی کو اس گستاخی کی سزا مل گئی اور وہ اس طرح کہ کراچی کے مسلمانوں کو ہلال رمضان سرے سے نظر ہی نہ آیا۔ حجاز شریف میں رویت ہلال جمعہ کے روز ہوئی اور دنیا بھر کے مسلمانوں میں رویت ہلال کا شرف سب سے پہلے اہل حجاز کو حاصل ہوا مگر کراچی والے اتنے بدنصیب تھے کہ ہفتہ کے دن بھی وہ ہلال مبارک رمضان کی زیارت سے محروم رہے یعنی واللہ سر پیٹ لینے کا مقام ہے کہ حجاز شریف میں یاروں نے جمعہ کو چاند دیکھ کر مزے سے روزے شروع بھی کردیے اور ہم لوگ کہ قرارداد مقاصد پاس کر کے یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ہم نے اسلام، قرآن اور خدا پر معاذ اللہ نا قابل تلافی احسان کیا ہے۔ رویت ہلال کے چوبیس گھنٹے بعد بھی اس واقعہ سے بے خبر تھے کہ اس کرۂ ارض پر رمضان شروع ہوگیا ہے، بخدا کیا ستم ظریفی ہے؟ جب ہفتے کی شام کو بھی چاند نظر نہ آیا تو ہم سب گھبرا گئے۔ مولویوں نے میٹنگ کی، حکام شہر نے مشورے کیے اور آخر یہ طے پایا کہ زمین پر تو چاند کی

کوئی خبر نہ ملی، آؤ آسمان پر چل کر پوچھیں کہ بھئی آج ہلال رمضان نمودار ہوگا کہ نہ ہوگا؟ ہمارے مولوی ہمیشہ سے بلند پرواز واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس تجویز کو روبہ عمل لانے کی ذمہ داری بھی انہیں (نفوس قدسیہ) نے قبول کی۔ جرگہ علما میں سے چند مضبوط دل والے مولویوں کا انتخاب کیا گیا اور انہیں پاکستانی فضائیہ (پی آر اے ایف) کے ایک بار بردار طیارے میں سوار کر کے عالم بالا کی طرف ارسال کیا کہ جاؤ چاند کی خبر لاؤ! انجام کار حضرات علما کی یہ جماعت جو ابھی تک اہل زمین کے مسائل نہیں سلجھا سکی عالم بالا کے اسرار معلوم کرنے کے لیے آسمان کی طرف پرواز کر گئی۔

سبحان اللہ!

تو کار زمیں را نکو ساختی کہ بآسمان، نیز پرداختی

بندہ کو تحقیق نہ ہو سکا کہ جو علما اس طیارے میں سوار ہو کر چاند کا پیچھا کرنے گئے تھے انہوں نے آسمان پر کس سے یہ پوچھ گچھ کی؟ بہر حال تھوڑی دیر کے بعد علما کرام کا یہ مقدس طائفہ بذریعہ طیارہ زمین پر نازل ہوا اور یہ خبر لایا کہ عالم بالا میں سب خیریت ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت چاند کے بارے میں کیا خبر ہے؟ بعض مقدسین نے رویت ہلال کی تصدیق کی اور بعض نے سکوت اختیار کیا۔ بہر حال اس آسمانی رپورٹ کے نتیجے میں اعلان کر دیا گیا کہ رمضان کا چاند نظر آ گیا۔ چنانچہ قبلہ! آج پہلا روزہ ہے اور غلام یہ سطور اس عالم میں تحریر کر رہا ہے کہ روزہ کو توڑ دینے والا سائرن اپنی پوری بھیانک آواز کے ساتھ چیخ چیخ کر افطار صوم کا اعلان کر رہا ہے اور بندہ درگاہ ہیں کہ سائرن کے شور سے بے پروا قلم دوات سے مصروف ہیں۔

ابا جانی!

حجاز شریف میں شہر مبارک رمضان کا چاند جمعہ کو نظر آیا اور یہاں ہفتے کو بھی نظر نہ آیا، فدوی کے خیال ناقص میں قدرت کی طرف سے اہل کراچی کو ایک زبردست تنبیہ ہے اور وہ یہ کہ تم کتنی ہی 'اسلامی قرار دادیں' کیوں نہ پاس کر لو اور کتنے ہی اسلامستان کیوں نہ بنالو کارکنان عالم بالا کی نظر میں ان شعبدہ بازیوں کی کوئی وقعت نہیں قدرت عمل کو دیکھتی ہے قول کو نہیں دیکھتی۔ بندہ نے تو اس واقعے کے بعد سے فوراً کان پکڑ لیے کہ نہ کبھی قرار داد مقاصد کا نام لے گا اور نہ پاکستان کی 'اسلامیت' کا ڈھنڈورا پیٹے گا۔ قبلہ! پانی کے دو گھونٹ اور خرمے کا ایک دانہ کھا کر پھر عریضے کی

جانب متوجہ ہوا ہوں۔ جس مکان میں فدوی قیام پذیر ہے وہ ایک بہت بڑی کوٹھی کے زیر سایہ واقع ہے اس کوٹھی میں جو صاحب مقیم ہیں وہ ماشاء اللہ بہت بڑے عہدیدار اور سچے مسلمان ہیں۔ پاکستان کی سب سے بڑی اسلامی حکومت میں ممدوح کو بہت بڑا منصب حاصل ہے۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ ان کی داڑھی پاکستان کی اسلامیت کا مقیاس الوزن (تولنے کا آلہ) ہے۔ جب پاکستان قائم ہوا تو یہ مسلمان انڈر سیکریٹری 'صاحب' ہر طرح فارغ البال یعنی بے ریش و بروت تھے۔ چار ابرو کا صفایا کیا کرتے تھے۔ 14 اگست 1947ء کو قیام پاکستان کا پہلا سورج ان کے چہرے پر اس طرح طلوع ہوا کہ جن گالوں پر صفائی اور پاکیزگی کے سبب برفستان ٹنڈرا کا گمان ہوتا تھا ان پر روحانیت کی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ قیام پاکستان کے پہلے سال میں ان زمانہ شناس اور انڈر سیکریٹری کی داڑھی کی فصل بہت کمزور اور چھدری رہی۔ لیکن دوسرے سال ماشاء اللہ چشم بددور یہ کھیتی خوب پھلی پھولی اور جب 12 مارچ 1949ء کو پاکستان پارلیمنٹ نے قرارداد مقاصد پاس کر کے حکومت الٰہیہ کے قیام کا اعلان کیا تو ان بزرگ نے پوری قرارداد مقاصد مہندی اور خضاب کے طور پر گویا اپنی داڑھی کی افزائش کے لیے استعمال کر لی اور اَب ان حضرت کا ڈاڑھا (داڑھی کا مذکر) اپنے طول و عرض اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے سر سیّد احمد خاں مرحوم اور نواب محسن الملک کی تاریخی ڈاڑھیوں کا انتہائی کامیابی سے مقابلہ کرسکتا ہے ان کے مصاحبین کا خیال ہے کہ انشاء اللہ جوں جوں پاکستان ترقی کرتا جائے گا ان پاکستانی انڈر سیکریٹری صاحب کی داڑھی بھی گنجان ہوتی چلی جائے گی اور ایک روز وہ وقت آئے گا بہ عون الٰہی کہ اس داڑھی کے بال بال سے پاکستان کی ترقی کا استناد کیا جایا کرے گا اور تعجب نہیں کہ یاران طریقت جشن استقلال پاکستان کے ساتھ ہر سال اس 'داڑھی عظیم' کا بھی عرس منایا کریں۔ ابا جان!! ایسے بزرگوار کا ہمسایہ بن کر فدوی کو یقین تھا کہ اس سال ماہ مبارک خوب گزرے گا۔ چنانچہ آج جب کہ پہلا روزہ تھا... خادم علی الصباح (عم کا پارہ لے کر) حضرت کی کوٹھی پر حاضر ہوا تا کہ ہو سکے تو کلام پاک کی تفسیر کا درس لے۔ معلوم ہوا کہ موصوف ڈرائنگ روم میں تشریف فرما ہیں۔ نوکر نے کارڈ پہنچایا۔ طلبی کا حکم لایا۔ خادم کو سو فیصدی یقین تھا کہ آں ممدوح تلاوت کلام پاک میں مصروف ہوں گے۔ اندر گیا تو دیکھا کہ نورانی داڑھی سگریٹ کے پے بہ پے کشوں سے دھواں دھار ہے اور حضرت کے ہاتھ میں ہالی وڈ میگزین کا تازہ اخبار ہے اور وہ صفحہ زیر مطالعہ ہے جس پر ایکٹرسوں کی عریاں تصویریں چھپا کرتی

ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون... قبلہ! آپ بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس غیر متوقع منظر کو دیکھ کر فدوی کو کس قدر روحانی تکلیف ہوئی ہوگی۔ لیکن ان بزرگ کے مشفقانہ تبسم نے بندے کی ہمت بندھائی۔ انہوں نے ازراہِ خوش اخلاقی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تعمیل حکم کے بغیر چارہ نہ تھا۔ بندہ عاجزی کے ساتھ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اور کلام پاک بغل میں دبا لیا۔ خیر سلاّ کے بعد حضرت نے سگریٹ پیش کیا تو فدوی نے روزے کا عذر کیا حیرت سے کہنے لگے 'اخاہ! روزے شروع ہوگئے ایک عظیم الشان اسلامی داڑھی کے مالک کی زبان سے روزہ کے متعلق اجنبیت اور بے گانگی کے یہ کلام سن کر غلام شرم سے پانی پانی ہوگیا اور اپنی حماقت پر لاحول اور ان کی اسلامیت پر انا للہ پڑھتا ہوا ملاقات کے کمرے سے باہر نکلا۔ کوٹھی کے دروازے پر دیکھا کہ ایک بوڑھے پٹھان مونڈے پر بیٹھا قرآن پڑھ رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ غریب اس کوٹھی کا چوکیدار ہے۔ تب فدوی کو اندازہ ہوا کہ رمضان اس کوٹھی کے دروازے تک پہنچا ہے۔ انہیں آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی اور ہمت ہوتی بھی کیسے؟ ایک انڈر سیکریٹری کے گھر میں مداخلت آسان ہے؟ ابا جان! روزہ نماز کے سلسلے میں جو عالم ان بزرگ کا ہے۔ کراچی کے طبقہ حکام اور جماعت امراء کی اکثریت کا حال یہی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ سب سچے پاکستانی ہیں۔ انہوں نے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے دن رات کام کیا ہے۔ رہی اسلامیت اور خدا پرستی تو اچھا ہے کہ اس موضوع کو نہ چھیڑا جائے، نہ جانے مرزا داغ دہلوی کا شعر ہے یا حافظ شیرازی کا۔ بہر حال شعر ہے خوب اور اس موقع پر کس قدر برمحل۔ عرض کرتا ہوں:

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد وائے! گر در پس امروز بود فردائے

کراچی میں سرکاری طور پر رمضان آج سے شروع ہو چکا ہے۔ لیکن عملی طور پر مجھے یہ بزرگ بجز لیاری کوارٹر اور چاکیواڑہ کے کہیں نظر نہیں آئے۔ سید ہاشم رضا صاحب نے ہوٹل کے مالکوں کو حکم دیا تھا کہ وہ احترام ماہ صیام کو ملحوظ رکھیں۔ یہ احترام اس طرح سے ملحوظ رکھا گیا کہ آج سے تمام ہوٹل، تمام چائے خانے اور تمام ریستوران برقعہ پوش ہوگئے۔ مطلب یہ کہ ان کے صدر دروازوں پر چقیں اور پردے پڑے ہوئے ہیں اور اندر سب کام چالو ہیں۔ سیّد ہاشم رضا صاحب (ناظم کراچی) کے حکم کی تعمیل بھی ہوگئی اور گاہکوں کی خوشنودی کا سامان بھی مہیا کر دیا گیا۔ اب کسی کو

اعتراض کا کیا حق ہے؟

محتسب را درون خانہ چہ کار، آج فدوی ساری دوپہر شہر میں گھوما اور فدوی نے ہر جگہ اسی قسم کے مناظر دیکھے انشاء اللہ بہ شرط فرصت کسی آئندہ عریضے میں کراچی کے رمضان شریف کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی فی الحال یہ عریضہ ختم کرتا ہوں۔ فدوی۔ اچھے مرزا۔

* *

عاشقوں سے برادرانہ اپیل!

زاہد ملک

ہمارا ذاتی خیال تھا کہ عاشق حضرات دنیا کی واحد ایسی کمیونٹی ہے، جس میں ایثار، قربانی اور صبر کا 'صبر آزما جذبہ' دوسری تمام برادریوں سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک عاشق ہونے کا مطلب ہی یہی ہے کہ برخوردار، مرمر کے جینے، جی جی کے مرنے اور فلسفۂ عدمِ تشدّد کا پیروکار ہے۔ عاشقوں کے متعلق ہماری یہ ناقص رائے دراصل وہ قصّے کہانیاں اور عشقیہ شعر ہیں، جنہیں ہم بچپن سے سنتے اور پڑھتے آئے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں ہمارے اسکول کے ایک دوست نے ایک دن ہمیں اعتماد میں لے کر بڑے رازدارانہ لہجہ میں بتایا تھا کہ کل شام جب اُس کی محبوبہ اُس کے مکان کے سامنے سے گزر رہی تھی تو اُس نے اپنے مکان کی چھت سے خوشبو کی ایک بھری ہوئی شیشی محبوبہ پر انڈیل دی۔ اب ہمیں یاد نہیں کہ خوشبو کی وہ شیشی 'میڈ ورا آف لندن' کی تھی، یا کسی اور برانڈ کی، لیکن جو بات عشق کی اس معصوم مثال سے ہم واضح کرنا چاہتے ہیں، وہ ہے جذبۂ عشق، یعنی موصوف نہ جانے کب سے چھت پر کھڑے ہیں۔ ایک ہاتھ میں خوشبو کی شیشی ہے اور دوسرا ہاتھ شیشی کے کارک پر ہے کہ جونہی بچی اِدھر سے گزرے پوری کی پوری شیشی خالی کردی جائے۔ اسکول اور کالج کی زندگی میں اس طرح کے اور بہت سے سچے واقعات ہمارے علم میں لائے جاتے تھے۔ سنگدلی کی مرتکب ہونے والی محبوباؤں کو قدموں میں لانے کے لیے چلّے کاٹنے اور تعویذ ٹونے وغیرہ کرانے کے قصّے بھی ہمیں بتائے جاتے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم خود بھی عشق میں کچھ دینے کے، نہ کہ لینے کے قائل ہیں، لیکن آج کل ہم محسوس کر رہے ہیں کہ اس نئے دور میں دنیا کی ہر بدلی بدلی چیز کی طرح عاشق حضرات بھی بدل گئے ہیں۔ انھوں نے اس مشینی دور میں مادہ پرست (یہاں مادہ سے مراد مؤنث، عورت ذات یا اِستری نہیں) سوچ اپنالی ہے۔ پہلے عاشق صبر و تحمل سے کام لیتا تھا۔ اپنے امیر مینائی نے کہا تھا:

انور احمد علوی

کوئی میرے برابر کیا کرے گا ضبطِ اُلفت کو
نہیں آتا زباں تک میری حرفِ آرزو برسوں

اسی طرح ایک نامعلوم شاعر نے ایک دفعہ کہا تھا:

ستم کے جو تم عادی ہو تو ہم بھی خوگرِ غم ہیں
جفائیں جتنی ہوں تھوڑی، ستم جتنے ہوں سو کم ہیں

پرانے زمانہ میں عاشق حضرات کسی میلے ٹھیلے، مشاعرے، یا شادی بیاہ کی کسی تقریب میں کسی کو اتفاقیہ دل دے بیٹھتے تھے اور پھر ساری زندگی اِس آس میں بیٹھے رہتے تھے کہ شاید کہیں کسی طرح جانِ آرزو سے دوبارہ ملاقات ہو جائے۔ شاعر یاسؔ، یاسؔ عدم آبادی فرماتے ہیں:

دھوم سنتا رہا اب آتے ہیں، اب آتے ہیں
حشر تک میں یونہی کھولے ہوئے آغوش رہا

خیر، ہم یہ تو نہیں مانتے کہ یاسؔ صاحب دن رات آغوش کھولے بیٹھے رہتے ہوں گے۔ ظاہر ہے آغوش کھولنے اور بند کرنے کے علاوہ کوئی اور کام بھی کرتے ہوں گے، لیکن چوں کہ ہمارے پاس اُن کے بیان پر شک کرنے کی کوئی ٹھوس وجوہات نہیں، اس لیے ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ موصوف اکثر اوقات آغوش کھول کر ہی رکھتے ہوں گے۔ اُدھر مومنؔ صاحب ساری زندگی اپنی محبوبہ کی شکل ہی نہ دیکھ سکے۔ چنانچہ وہ اپنی بے وقت وفات کے بعد کہتے ہیں:

موت کے صدقے کہ وہ بے پردہ آئے لاش پر
جو نہ دیکھا تھا تماشہ عمر بھر، دکھلا دیا

جب کہ آج کل ہم محسوس کر رہے ہیں کہ عاشق ضبط و تحمل کا دامن چھوڑ کر محض کل کے وعدوں اور وصل کی موہوم اُمیدوں پر جینے کی بجائے، اُس محبوب کو جان سے مار دیں گے، جو اُن سے عملی تعاون نہ کرے۔ ہمارے نزدیک عاشقوں نے یہ **"Do or die"** کا جو خوفناک رویّہ اختیار کر لیا ہے، وہ محبوباؤں کے لیے بڑا خطرناک ہے۔ آخر عاشق اور شرپسند میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے! عاشقوں کے رویّہ میں اس ڈرامائی اور انقلابی تبدیلی کا احساس ہمیں آج کے مقبول فلمی گانے اور دوگانے سن کر ہوا ہے، جو ہم اکثر ریڈیو پاکستان سے سنتے رہتے ہیں۔ آج کے اکثر فلمی گانوں میں ہیرو، یا عاشق بات بات پر مرنے مارنے اور محبوبہ کو موت کے گھاٹ اُتار دینے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ ان گانوں میں ہم نے عاشقوں کی مجموعی صورتِ حال کا عکس دیکھ لیا ہے۔ مثلاً، ایک مقبول گانے کے بول یوں ہیں:

محبت کی ایسی قسم آج کھائیں   ہمیں موت آئے اگر بھول جائیں

ایک دوگانا یوں ہے:

لڑکا:

پیار کا وعدہ ایسے نبھائیں
میں بُھولوں تو میں مرجاؤں
تُو بُھولے تو تُو مرجائے

لڑکی:

جس دن تیری یاد نہ آئے
اُس دن مجھ کو موت آجائے

اب سچی بات یہ ہے کہ ہم موت اور مرنے مارنے کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ بھائی! آپ حضرات قومی اسمبلی میں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف تو ہیں نہیں کہ یوں ایک دوسرے سے جنگ کریں اور "نہ کھیلیں گے، نہ کھیلنے دیں گے" کی منفی سیاست کو اپنالیں۔ مندرجہ بالا گانے میں لڑکے کا کہنا کہ "میں بُھولوں تو میں مرجاؤں، تُو بھولے تو تُو مرجائے" ایک انتہائی کاروباری اور جارحانہ رویّہ ہے۔ میاں عاشق صاحب یوں کیوں نہیں کہتے کہ بی بی! میں اگر تمہیں بھول گیا تو پھر مَیں مَیں نہ رہوں گا اور میری موت واقع ہوجائے گی اور اگر تم ہی مجھے بھول گئیں تو پھر میں ویسے ہی زندہ نہ رہ سکوں گا۔ مقصد یہ کہ دونوں صورتوں میں مَیں ہی مروں گا۔ اب یہ شاعروں کا کام ہے کہ ہمارے اس نثرانہ جذبے کا اظہار غزلانہ انداز میں کریں۔ آخر عاشق اپنے آباواجداد، یعنی مجنوں، رانجھا، فرہاد وغیرہ کو کیوں بھولتے جارہے ہیں اور اُن کی سنت پر کیوں عمل پیرا نہیں ہوتے۔

ہمارے زمانے میں محبوب اگر مل بھی جاتا تھا اور بے پردہ سامنے آ بھی جاتا تھا تو اِس کا یہ مطلب نہ ہوتا تھا کہ وہ سنگدل عملی تعاون کے لیے بھی تیار ہوگیا ہے۔ وہ مسلسل نہ نہ ہی کرتا رہتا تھا۔ لیکن عاشق پھر بھی انتقامی کارروائی نہ کرتا تھا، صرف خاموش احتجاج ہی پر اکتفا کرتا تھا۔ اپنے حضرتِ داغ پھر کہتے ہیں:

اِس نہیں کا کوئی علاج نہیں   روز کہتے ہیں وہ کہ آج نہیں

ہوسکتا ہے بی بی نے محاورہ نہ سنا ہو کہ "آج کا کام کل پر نہ ڈالو" اس لیے وہ داغ صاحب کو

یہی سمجھاتی ہوگی کہ آج نہیں کل۔ اب یہ ہمارے علم میں نہیں، ورنہ ہم ضرور قارئین کو اعتماد میں لیتے کہ ہر روز کل کے لیے کیوں کہتی تھی۔ ممکن ہے، روزانہ ہی موسم خراب ہوتا ہوگا۔ شاید شدید گرمی ہوگی، یا ممکن ہے، ویسے ہی اُن دنوں اُس کی طبیعت ٹھیک نہ ہوتی ہو۔ بہرحال، مسلسل انکار کی وجہ کے متعلق شاعر بھی خاموش ہے، اور مؤرخین نے بھی اس موضوع پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ اس ہجر گزیدہ شاعر کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیں:

مانگتا ہوں جو دعا وصل کی اُن کے آگے
چپکے چپکے وہ یہ کہتے ہیں کہ ممکن ہی نہیں

اب خود حضرتِ اکبرؔ الٰہ آبادی جیسے بزرگ شاعر کو ہی دیکھ لیں، موصوف کی پرابلم تھی کہ:

یہ نہیں کہتے، یہیں رہ جاؤ اب تم رات کو
بس ان ہی باتوں سے اکبرؔ میرا جل جاتا ہے دل

اس شعر میں لفظ 'رات' پر بڑا زور ہے۔ ہم تفصیل میں نہیں جاتے کہ اس لفظ پر کیوں اور کس لیے زور ہے، لیکن ہم صرف واضح یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اکبرؔ صاحب کا بھی بس دل ہی جل جاتا تھا۔ وہ یہ نہیں فرماتے کہ اگر تم ہمیں رات کو اکموڈیٹ نہیں کر سکتیں تو ہم کسی وقت تمہیں دن ہی کو اکموڈیٹ کر دیں گے۔ اِدھر صفدر رام پوری کا معاملہ ہی الگ ہے۔ اُن کی محبوبہ رات کو کمپنی دینا تو چاہتی ہے، لیکن اُسے اعتبار نہیں:

میں نے جو کہا اُن سے کہ شب کو یہیں رہو
آنکھیں جُھکا کے بولے کہ کس اعتبار پر؟

آنکھیں جھکانا ظاہر ہے نیم رضامندی کی سی کیفیت ہے۔ لیکن بالآخر انھوں نے وہاں شب گزاری، یا نہیں، اس کے متعلق ہمیں کچھ علم نہیں اور نہ ہی ہمیں لوگوں کے ایسے نجی معاملات میں دلچسپی لینے کی عادت ہے۔

اب آپ چند منٹوں کے لیے زمانۂ حال میں آ جائیں اور ایک اور فلمی گانے میں ہیرو، ہیروئن کے خطرناک ارادے دیکھیے:

نیل گگن تلے ہم نے یہ وعدے کیے
تیرے بن میں نہ جیوں، میرے بن تُو نہ جیے

یعنی وہی دو اور دو چار والی بات۔ قبلہ عاشق صاحب! براہِ کرم صورتِ حال کا ازسرِ نو جائزہ لیں۔ یہ آپ میں ہلاکو اور چنگیز خان کی رُوح کہاں سے سرایت کر گئی۔ ٹھیک ہے، اگر آپ اپنی

محبوبہ دن نہیں جی سکتے تو یہ کیوں توقع رکھتے ہیں کہ موصوفہ بھی دن آپ کے نہیں جیے گی، بلکہ ممکن ہے کہ وہ آپ کی روانگی کے بعد ہی جی بھر کر جی سکے۔ اس لیے یہ 'اینٹی ہیروئن' رویہ چھوڑ دیں، صراطِ مستقیم اختیار کریں۔ اشارے کنائے میں بات کرلیا کریں اور بات بات میں قاچو (چاقو) کا بے دریغ استعمال امنِ عامہ کے وسیع مفاد میں بند کردیں۔

ہم نے اپنے ایک مضمون 'اسبابِ زوالِ اُمت' میں ثابت کیا ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ یہاں اُس مضمون کا حوالہ ہم اس لیے دے رہے ہیں کہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہیرو یا عاشق کی حرکات، یا عاشق کے متعلق مجموعی اپروچ سے ہیروئن یا محبوبہ بھی خاصی متاثر نظر آتی ہے، یعنی 'خربوزے' کو دیکھ کر 'خربوزی' بھی رنگ پکڑ رہی ہے۔ وہ بھی بعض اوقات سزائے موت وغیرہ سے کم سزا دینے کے حق میں نظر نہیں آتی، بلکہ خود اپنے لیے بھی اپنی چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر سزائے موت تجویز کرلیتی ہے۔ مثلاً، اُس کا کہنا:

جس دن تیری یاد نہ آئے   اُس دن مجھ کو موت آ جائے

اب ہمارا کہنا یہ ہے کہ انسان کی آج کی زندگی بہت مصروف ہے، ہوسکتا ہے کہ کام کے رش کی وجہ سے دوسرا فریق ایک دو دن یاد نہ آسکے، یا آپ کو کوئی ایسی اسائنمنٹ دے دی گئی ہو کہ آپ ہزار کوشش اور خواہش کے باوجود اپنے چاہنے والے کو یاد نہ رکھ سکیں اور پورے خلوص اور ایمانداری سے یہ سمجھتی ہوں کہ جونہی اِس کام سے فارغ ہوئی، عاشق صاحب سے رابطہ قائم کرلوں گی۔ اس لیے ہماری ناقص رائے میں یہ جو یہاں یاد نہ آنے کی مدت مقرر کی گئی ہے، یعنی 'جس دن'، مطلب یہ کہ اگر چوبیس گھنٹوں میں فریقِ ثانی کی اتفاقاً یاد نہ آئے تو موت آجائے۔ یہ مدت بڑھا دینی چاہیے۔ مثلاً، ہماری رائے میں یہ مدت ایک ہفتہ تک بڑھائی جاسکتی ہے۔ ویسے بھی اللہ تعالیٰ نے جو یہ سات دن بنائے ہیں، اس کی کوئی مصلحت تو ضرور ہوگی، لہٰذا ہمارے خیال میں اگر سات دن تک بھی اُس کی یاد نہ آئے تو پھر بھولنے والے، یا والی کو اتفاقِ رائے سے سزا کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہم اس صورت میں بھی سزائے موت کے حق میں نہیں ہیں۔ یہ سزا کم سے کم ہونی چاہیے، تاکہ ملزم یا ملزمہ کو اصلاح کا چانس مل سکے اور وہ سدھر کر راہِ راست پر آسکے۔ لیکن اگر اُسے فوراً ہی تارا مسیح کے حوالے کردیا گیا تو پھر تو یہ ایک انتقامی کارروائی ہوگی، اصلاحی کارروائی تو

نہ ہوئی، لہٰذا ہمارے خیال میں یہ شعر یوں بھی ہو سکتا ہے:

جس دن تیری یاد نہ آئے
اُس دن مجھ کو موج آ جائے!

یعنی سزاؤں کا مقصد اگر اصلاحی ہے تو محبوبہ کو موج آ جانے سے بھی اُس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ مقصد تو اُس کو یاد دہانی کرانا ہے کہ محترمہ آج آپ اپنے 'اُن' کو بھول گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اُسے موج آئے گی تو وہ فوراً اپنے عاشق کی طرف رجوع کرے گی، اور چپقلش آگے نہ بڑھ سکے گی۔ ہاں، اگر محبوبہ مسلسل بھول جانے کی عادی ہو جائے اور وہ ہر روز ہی بھول جایا کرے تو پھر سزا میں قدرے اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر شاعر کا اصرار ہو کہ مذکورہ شعر میں لفظ 'موج' سے شعر کا وزن بگڑ جائے گا اور یہاں لفظ 'موت' ہی موزوں ترین ہے تو پھر یوں کیا جا سکتا ہے کہ بیچاری ہیروئن کو موت سے بچانے کے لیے موت کے حرف 'م' پر پیش ڈال دی جائے!

ویسے ہم ذاتی طور پر لفظ مَوت کے ہر صورت میں خلاف ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، محبوب ساری زندگی بے وفائی کرتے رہتے تھے، لیکن عاشق حضرات پھر بھی مرنے مارنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ آپ نے حضرتِ داغؔ کے محبوب کا ذکر سن ہی لیا ہے کہ وہ بالآخر داغؔ صاحب کی موت پر تشریف لے ہی آئے تھے، لیکن حضرت ذوقؔ کی بدقسمتی ملاحظہ فرمائیں:

مر گئے پھر بھی تغافل ہی رہا آنے میں
بے وفا پوچھے ہے، کیا دیر ہے لے جانے میں

آپ نے ذوقؔ صاحب کی وسیع القلبی ملاحظہ فرمائی۔ محبوبہ کا یہ رویّہ ہے کہ وہ چاہتی ہے کہ مرحوم شاعر کی باڈی کو جلد از جلد ڈسپوز آف کر دیا جائے، تا کہ وہ مکمل فری ہو کر کوئی نیا اتحاد بنا سکے، لیکن شاعر پھر بھی اس سنگدل کو زیادہ سے زیادہ 'بے وفا' کہہ رہا ہے۔ آج کا عاشق ہوتا تو کہتا، ''اچھا بی بی، اب میں تو مر رہا ہوں، خدا کرے تم بھی مر جاؤ، بلکہ تمہارے اگلے پچھلے بھی مر جائیں، تا کہ تم لوگوں کو نصیحت ہو کہ دوسروں کو خراب کرنے کا کیا حشر ہوتا ہے۔'' ہو سکتا ہے کہ محبوبہ کے نابالغ بہن بھائی اور ہمسائے بھی عاشق کی بددُعا کی زد میں آ جائیں، بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ اگر آج کے عاشق کو اپنے مرنے کے وقت کا پہلے سے علم ہو جائے، یا مرنے سے پہلے اُسے چند منٹ کی مہلت مل جائے تو وہ مٹی کے تیل کا ایک ٹین لے کر سیدھا محبوبہ کے گھر پہنچے اور اُس کے مکان پر تیل چھڑک کر آگ لگا دے اور جوں جوں آگ کے شعلے اور محبوبہ کی چیخیں بلند ہوں توں توں

عاشق کے پاگلوں جیسے قہقہے بھی بلند ہوں۔ اِدھر ہمارے پرانے زمانے کے ایک عاشق جب عمر بھر محبوبہ کا انتظار کرتے کرتے قریب المرگ ہو جاتے ہیں تو اتفاق سے محبوب اُن کو دیکھنے آ جاتا ہے۔ دیکھیے شاعر کس شریفانہ انداز میں گلہ کرتا ہے:

نزع کے وقت دیکھنے آئے   جائیے آپ سے خفا ہیں ہم

لیکن آج کے فلمی گانوں کی روشنی میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگر موجودہ دور کا کوئی عاشق یا ہیرو نزع کے عالم میں کسی ہسپتال میں بسترِ مرگ پر پڑا ہو اور ہیروئن بیمار پرسی کے لیے آ جائے تو ہماری فلموں میں یہ سین کچھ اس طرح ہو گا:

ہیرو بستر مرگ پر لیٹا ہوا ہے، بیڈ کی ایک طرف اُس کی پریشان حال ماں کھڑی ہے، نرس مریض کو دوائی وغیرہ دے کر کمرے سے باہر جا رہی ہے کہ ہیروئن کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ کیمرہ ہیرو کے داڑھی بڑھے چہرے کا کلوز اَپ دکھاتا ہے۔ ہیرو چہرے پر غصّے اور نفرت کے تاثرات لیے ہوئے بڑی تیزی سے اپنا منہ دوسری طرف پلٹ لیتا ہے اور بلند آواز میں کہتا ہے، ”ماں! یہ میری قاتل ہے۔ اِس نے ہماری غربت کا مذاق اُڑایا ہے۔ اِسے کہو یہاں سے چلی جائے۔“ ہیروئن دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیتی ہے اور کمرے سے باہر چلی جاتی ہے۔

ہمارے پرانے زمانے میں تو محبوب اگر رقیبِ روسیاہ کے پاس چلا جاتا، تو عاشق جذبۂ رقابت کے تحت رقیب کو تو بُرا بھلا کہتا، لیکن محبوب کو پھر بھی جان سے مار دینے کی دھمکی نہ دیتا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے کہ ہمارے زمانے میں عاشق رقیب کو بھی کس طرح شرافت کے دائرے میں رہ کر بُرا بھلا کہتے تھے:

اے روسیہ رقیب تُو ڈر میری آہ سے   بجلی کو لاگ ہوتی ہے رنگِ سیاہ سے

ایک شاعر تو رقیبِ روسیاہ کو بھی دعا دیتا ہے:

تم سلامت رہو، گھر غیر کا آباد رہے   تم کو کیا، شاد رہے، یا کوئی ناشاد رہے

ہم اس موضوع پر اور بھی تفصیل میں جا سکتے ہیں، لیکن عقل مند کیلئے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ ہمارا مقصد صرف نئے عاشقوں کو آئینہ دکھلانا تھا، جس میں وہ ہمارے زمانے کے (یعنی پرانے) عاشقوں کے حوالے سے اپنا چہرہ دیکھ سکیں۔ بہر حال، عاشق حضرات کو ہمارا یہی مشورہ ہے کہ

براہِ کرم ’کچھ لو اور کچھ دو‘ کے سنہری اُصول پر عمل کریں اور یہ یک طرفہ (ہر وقت لینے ہی لینے کا) خود غرضانہ رویہ ترک کر دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قتل و غارت گری کا بازار مزید گرم نہ کریں، بلکہ اسے آہستہ آہستہ ٹھنڈا کریں اور خود بھی ٹھنڈے ہو جائیں۔ ہم سب کو کوئی نہ کوئی قیمتی مشورے دیتے رہتے ہیں، سو آپ کو بھی ہم نے چند ضروری ہدایات دے دی ہیں۔ اب اِن مشوروں پر عمل کرنا، یا نہ کرنا آپ کا اپنا کام ہے۔ دوسرے ہم نے محبوباؤں کے حق میں جو آواز اُٹھائی ہے اور خونخوار عاشقوں سے اُن کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے انھیں، یعنی عاشقوں کو اپنے انداز میں جو ڈانٹ ڈپٹ کی ہے، اس کا ہمیں کوئی صلہ نہیں چاہیے۔ ہم اس طرح کے تمام مشورے فی سبیل اللہ دیتے ہیں۔

✡ ✡

ترقی یافتہ قبرستان!؟

سعادت حسن منٹو

انگریزی تہذیب و تمدن کی خوبیاں کہاں تک گنوائی جائیں۔ اس نے ہم غیر مہذب ہندوستانیوں کو کیا کچھ عطا نہیں کیا۔ ہماری گنوار عورتوں کو اپنے نسوانی خطوط کی نمائش کے نت نئے طریقے بتائے۔ جسمانی خوبیوں کا مظاہرہ کرنے کے لیے بغیر آستینوں کے بلاوز پہننے سکھائے، مسی کاجل چھین کر ان کے سنگار دانوں میں لپ اسٹک، روج، پاؤڈر اور افزائش حسن کی اور چیزیں بھر دیں، پہلے ہمارے یہاں موچنے صرف ناک یا مونچھوں کے بال چننے کے کام آتے ہیں مگر تہذیب فرنگ نے ہماری عورتوں کو ان سے اپنی بھوؤں کے بال چننا سکھا دیا۔

یہ تہذیب ہی کی برکت ہے کہ اب جو عورت چاہے لائسنس لے کھلے بندوں اپنے جسم کی تجارت کرسکتی ہے، ترقی یافتہ مردوں اور عورتوں کے لیے سول میرج کا قانون موجود ہے، جب چاہے شادی کر لیجیے اور جب چاہے طلاق حاصل کر لیجیے۔ ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکری مگر رنگ چوکھا آتا ہے۔ ناچ گھر موجود ہیں جہاں آپ عورتوں کے ساتھ سینے ملا کر کئی قسم کے ناچوں میں شریک ہوسکتے ہیں۔ کلب گھر موجود ہیں جہاں آپ بڑے مہذب طریقے سے اپنی ساری دولت جوئے میں ہار سکتے ہیں۔ مجال ہے کہ آپ کبھی قانونی گرفت میں آئیں۔ شراب خانے موجود ہیں جہاں آپ غم غلط کرسکتے ہیں۔

انگریزی تہذیب و تمدن نے ہماری وطن کو بہت ترقی یافتہ بنا دیا ہے۔ اب ہماری عورتیں پتلونیں پہن کر بازاروں میں چلتی پھرتی ہیں۔ کچھ ایسی بھی ہیں جو قریب قریب کچھ بھی نہیں پہنتیں لیکن پھر بھی آزادانہ گھوم پھر سکتی ہیں... ہمارا ملک بہت ترقی یافتہ ہوگیا ہے کیوں کہ اب یہاں 'ننگا کلب' کھولنے کی تجویز بھی ہو رہی ہے۔

وہ لوگ سر پھرے ہیں جو اپنے محسن انگریزوں سے کہتے ہیں کہ ہندوستان چھوڑ چلے

جائیں۔ اگر یہ ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے تو ہمارا یہاں 'ننگا کلب' کون جاری کرے گا۔ یہ جو رقص خانے ہیں ان کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ ہم عورتوں کے ساتھ سینے سے سینہ ملا کر کیسے ناچ سکیں گے۔ ہمارے چکلے کیا ویران نہیں ہو جائیں گے۔ ہمیں ایک دوسرے سے لڑنا کون سکھائے گا۔ مانچسٹر سے جو کپڑے اب ہماری کپاس سے تیار ہو کر آتے ہیں پھر کون تیار کرے گا۔ یہ اچھے اچھے لذیذ بسکٹ جو ہم کھاتے ہیں، کون دے گا۔

جو ترقی ہمیں اور ہمارے ہندوستان کو انگریزوں کے عہد میں نصیب ہوئی ہے اور کسی کے عہد میں نصیب نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم آزاد بھی ہو جائیں تو ہمیں حکومت کرنے کی وہ چالیں نہیں آسکتیں جو ہمارے ان حاکموں کو آتی ہیں۔ ان حاکموں کی جن کے عہد میں نہ صرف ہمارے ہوٹلوں، کلبوں، رقص گاہوں اور سینماؤں کو بلکہ ہمارے قبرستانوں کو بھی کافی ترقی ہوئی ہے۔ مجھے اس ترقی کا احساس اس وقت ہوا جب بمبئی میں میری والدہ کا انتقال ہوا۔ میں چھوٹے چھوٹے نسبتاً غیر مہذب شہروں میں رہنے کا عادی تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ بڑے شہروں میں مردوں پر بھی حکومت کی طرف سے پابندیاں عائد ہیں۔

والدہ کی لاش دوسرے کمرے میں پڑی تھی۔ میں غم کا مارا سر نیہوڑائے ایک صوفے پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اتنے میں ایک صاحب نے جو عرصے سے بمبئی میں رہتے تھے، مجھ سے کہا، "بھئی اب تم لوگوں کو کچھ کفن دفن کی فکر کرنی چاہیے۔"

میں نے کہا، "سو یہ آپ ہی کریں گے کیوں کہ میں یہاں نو وارد ہوں۔"

انہوں نے جواب دیا، "میں سب کچھ کر دوں گا مگر پہلے تمہیں کسی کے ہاتھ اطلاع بھجوا دینی چاہیے کہ تمہاری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔" "کس کو؟"

یہاں پاس ہی میونسپلٹی دفتر ہے اس کو اطلاع دینی بہت ضروری ہے کیوں کہ جب تک وہاں سے سرٹیفکیٹ نہیں ملے گا، قبرستان میں دفنانے کی اجازت نہیں ملے گی۔"

اس دفتر کو اطلاع بھیج دی گئی۔ وہاں سے ایک آدمی آیا جس نے طرح طرح کے سوال کرنے شروع کیے۔ "کیا بیماری تھی، کتنے عرصے سے مرحومہ بیمار تھی، کس ڈاکٹر کا علاج ہو رہا تھا؟"

حقیقت یہ تھی کہ میری عدم موجودگی میں ہارٹ فیل ہو جانے کی وجہ سے میری والدہ کا انتقال ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی کے زیر علاج نہیں تھیں اور نہ مدت سے بیمار ہی تھیں چنانچہ میں نے اس

رنگِ ادب دہلی نمبر

آدمی سے جو سچی بات کہہ دی۔ اس کا اطمینان نہ ہوا اور کہنے لگا، ''آپ کو ڈاکٹری سرٹیفکیٹ دکھانا پڑے گا کہ موت واقعی ہارٹ فیل ہوجانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔''

میں سٹپٹا گیا کہ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کہاں سے حاصل کروں چنانچہ کچھ سخت کلمے میرے منہ سے نکل گئے لیکن میرے وہ دوست جو ایک عرصے سے بمبئی میں قیام پذیر تھے، اُٹھے اور اس آدمی کو ایک طرف لے گئے، کچھ دیر اس سے باتیں کرتے رہے پھر آئے اور میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے، ''یہ تو بالکل بے وقوف ہے، اس کو یہاں کی باتوں کا علم نہیں۔'' پھر انہوں نے میری جیب سے دو روپے نکال کر اس آدمی کو دیے جو ایک دم ٹھیک ہوگیا اور کہنے لگا، ''اب آپ ایسا کیجیے کہ دواؤں کی چند خالی بوتلیں مجھے دے دیجیے تاکہ بیماری کا کچھ تو ثبوت ہوجائے، پرانے نسخے وغیرہ پڑے ہوں تو وہ بھی مجھے دے دیجیے تاکہ بیماری کا کچھ تو ثبوت ہوجائے، پرانے نسخے وغیرہ پڑے ہوں تو وہ بھی مجھے دے دیجیے۔''

اس نے اس قسم کی باتیں کیں جن کو سن کر مجھے تھوڑی دیر کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنی والدہ کا قاتل ہوں اور یہ آدمی جو میرے سامنے بیٹھا ہے، مجھ پر ترس کھا کر راز کو اپنے تک ہی رکھنا چاہتا ہے اور مجھے ایسی ترکیبیں بتا رہا ہے جس سے قتل کے نشانات مٹ جائیں۔ اس وقت جی میں آیا کہ دھکے دے کر اس کو باہر نکال دوں اور گھر میں جتنی خالی بوتلیں پڑی ہیں ان سب کو ایک ایک کر کے اس کا بے مغز سر پھوڑتا چلا جاؤں لیکن اس تہذیب کا بھلا ہو کہ میں خاموش رہا اور اندر سے کچھ بوتلیں نکلوا کر اس کے حوالے کر دیں۔

دو روپے رشوت کے طور پر ادا کرنے کے بعد میونسپلٹی کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا گیا تھا۔ اب قبرستان کا دروازہ ہم پر کھلا تھا۔ لوہے کے بہت بڑے دروازے کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جیسا کہ سنیما کے ساتھ بکنگ آفس ہوتا ہے، اس کی کھڑکی میں سے ایک آدمی نے جھانک کر اندر جاتے ہوئے جنازے کو دیکھا اور کچھ کہنے کو ہی تھا کہ میرے دوست نے وہ پرچی جو میونسپلٹی کے دفتر سے ملی تھی، اس کے حوالے کر دی۔ قبرستان کے مینیجر کو اطمینان ہوگیا کہ جنازہ بغیر ٹکٹ کے اندر داخل نہیں ہوا۔

* *

بحث و تکرار

سرسیّد احمد خاں

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے پھر باچھیں چر کا کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عنیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں اس کا ہاتھ اُس کے گلے میں اور اُس کی ٹانگ اُس کی کمر میں، اُس کا کان اُس کے منہ میں اور اُس کا ٹینٹوا اُس کے جبڑے میں اس نے اُس کو کاٹا اور اُس نے اس کو پچھاڑ کر بھبوڑا جو کمزور رہا وہ دم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پر تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے۔ رُخ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں۔ باچھیں چر جاتی ہیں۔ دانت نکل پڑتے ہیں۔ تھوک اُڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک کف بھر آتے ہیں۔ سانس جلدی چلتا ہے رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ، ناک، بھوں، ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں نحیف نحیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا، ہاتھ پھیلا اُس کی گردن۔ اُس کے ہاتھ میں اور اُس کی داڑھی اُس کی مٹھی میں لپاڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک اِدھر چلا گیا اور ایک اُدھر اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اُسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہیں توں تکار تک نوبت آ جاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر زر جاتی ہے مگر ان سب میں کسیر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اُس کے پرکھنے کے لیے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہیے۔

پس اے میرے عزیز ہم وطنوں۔ جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت جانے دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دو بدو بات چیت کرتے ہو تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ، لہجہ، آواز، وضع، لفظ اس طرح رکھو جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو۔ مگر بناوٹ بھی نہ پائی جاوے۔ تردیدی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے لفظ استعمال کرو۔ مثلاً یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا شاید مجھے دھوکہ ہوا یا میں غلط سمجھا کوئی بات تو عجیب ہے مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں۔ جب دو تین دفعہ بات کا اُلٹ پھیر ہو اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ یہ کہہ کر کہ میں اس بات کو پھر سوچوں گا یا اس پر پھر خیال کروں گا۔ جھگڑے کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کرو۔ دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ اس دو تین دفعہ کی الٹ پھیر سے تمہارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے اور نہ تمہارا مطلب باتوں کی اُس الٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا کیوں کہ جھگڑا یا شبہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبت میں کمی ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے اور ایسی عزیز چیز (جیسے کہ دوستی) ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

جب کہ تم مجلس میں ہو۔ جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثہ کو آنے مت دو کیوں کہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو اُس کو جلد ختم کرو اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن اس بات پر غور کریں کہ ان کی مجلسوں میں آپس کے مباحثہ اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔

خاموشی

سلمان بٹ

عام خیال یہ ہے کہ کسی محفل میں بیٹھ کر بات کرنے کے لیے بڑے علم اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بنا پر ہم محفلوں میں اکثر خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ بچپن ہی میں والدین اور اساتذہ نے یہ بات ہمارے کان میں ڈال دی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے دو کان اور ایک زبان عطا فرمائی ہے اور حکمتِ باری تعالیٰ اس معاملے میں یہ ہے کہ انسان دو باتیں سننے کے بعد ایک بات کہے۔ اس کے علاوہ انہی والدین اور اساتذہ نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ پہلے بات کو تولنا چاہیے۔ پھر بولنا چاہیے۔ جب ہم نے پہلی بار یہ ضرب المثل سنی تو ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ بات کو تولا کیسے جاتا ہے۔ ہمارے ننھے منھے ذہن میں تولنے کا تصور ایک ترازو سے وابستہ تھا، کیوں کہ ہماری گلی کے ایک کونے پر ایک بنیے کی دکان تھی جو ہمیں نمک، مرچ وغیرہ تول کر دیا کرتا تھا۔ کئی بار ہمارے جی میں آئی کہ اس سے پوچھیں، بابا جی! بات کو تولتے کیسے ہیں؟ لیکن کبھی یہ بات پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی، کیوں کہ اس بات کو بھی منہ سے نکالنے سے پیشتر تولنا ضروری تھا۔ پرائمری اسکول سے ہم ہائی اسکول میں پہنچے تو ایک استاد نے بتایا، ”بات کرنے کی حیثیت اگر چاندی کی ہے تو خاموشی کی حیثیت سونے کی ہے۔“ یہ سننے کے بعد اگرچہ سونے پر ہمارا ایمان مزید پختہ ہو گیا، لیکن سوال برابر تنگ کرتا رہا کہ آخر بولنے میں نقصان کیا ہے اور خاموشی سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اور اگر خاموشی اتنی ہی مفید چیز ہے تو یہ ماسٹر صاحب کیوں پل بھر کے لیے بھی خاموشی اختیار نہیں کرتے؟ کلاس میں داخل ہوتے ہی بولنا شروع کرتے ہیں اور گھنٹی بج جانے کے بعد تک بولتے رہتے ہیں!

ہوتا یوں تھا کہ گھنٹی کی آواز کان میں پڑتے ہی ماسٹر صاحب کے چہرے پر عجیب ناگواری کے تاثرات اُبھرتے تھے۔ لگتا تھا کہ کلاس سے نکل کر یہ سیدھے گھنٹی بجانے والے کے پاس جائیں گے اور اُس کی مرمت کر ڈالیں گے کہ اس نے کیوں گفتگو کے دوران انہیں ڈسٹرب کیا۔

رنگِ ادب دہلی نمبر

ماسٹر صاحب کے طرزِ عمل میں قول و فعل کا یہ تضاد ایک معما بن کر ہمارے ذہن میں چپکا رہا۔ کبھی ہم یہ سوچتے کہ شاید یہ سونے کی نسبت چاندی کو زیادہ پسند کرتے ہوں، کیوں کہ وہ قناعت پسندی پر بھی بڑا زور دیا کرتے تھے۔ اور قناعت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان سونے کے پیچھے بھاگنے کی بجائے چاندی پر ہی اکتفا کرے۔

پھر جوں جوں ہم شعور کی منزلیں طے کرتے گئے، ہماری سمجھ میں بات کو تولنے کا مطلب بھی آ گیا۔ چنانچہ ہم منہ کھولنے سے پیشتر ہمیشہ بات کو تولنے کی کوشش کرتے، لیکن ذہنی ترازو میں کوئی فنی نقص ہونے کی بنا پر ہمیشہ بات کا وزن یا تو ضرورت سے کم نکلتا یا ضرورت سے زیادہ نکلتا۔ چنانچہ ہم مناسب الفاظ کی تلاش کرنے لگتے اور مخاطب اتنی دیر میں اپنی بات ختم کر کے رخصت بھی ہو جاتا۔

خاموشی کے ہاتھوں ہمیں کئی بار نقصان اُٹھانا پڑا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد نوکری کے لیے انٹرویو دینے کا سلسلہ شروع ہوا تو ہم تقریباً ہر بار بُری طرح ناکام ہوئے۔ بورڈ کا کوئی رکن سوال پوچھتا تو ہم سوچ کے گہرے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتے۔ سوال دہرایا جاتا تو گھبراہٹ میں اٹ شنٹ جواب منہ سے نکل جاتا۔

ہمارے ایک دوست نے ہماری اس ذہنی اُلجھن کو مدِ نظر رکھ کر ہمیں مشورہ دیا کہ ہم ریلوے یا ٹیلی فون کے ’انکوائری آفس‘ میں ملازمت کے لیے کوشش کریں، یا کہیں پی آر او، یعنی پبلک ریلیشنز آفیسر کے لیے درخواست دیں، کیوں کہ ان کے خیال میں ہمارے جیسا خاموش طبع انسان کسی ایسی ہی ملازمت کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔ ہم ان کے اس گہرے طنز پر تلملا کر رہ گئے اور انہیں دندان شکن جواب دینے کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب کر ہی رہے تھے کہ وہ صاحب اُٹھ کر چلے گئے۔

اسی قسم کا ایک مرحلہ ہمیں اُس وقت پیش آیا جب ہم انٹرویو کے لیے اپنے متوقع سسر صاحب کے سامنے پیش ہوئے۔ انہوں نے ہم سے کئی سوالات کیے اور جواب میں ہم ”ہوں، ہاں، جی، جناب“ کر کے رہ گئے۔ ہمارے سسر کے چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے اور وہ ہمیں چلتا کرنے کو ہی تھے کہ ہماری ہونے والی خوش دامن صاحبہ نے اُٹھ کر ہمارا منہ سر چوما اور فرمایا، ”ہائے! کتنا شریف، کم گو اور نیک لڑکا ہے۔“ چنانچہ ہماری شادی ہو گئی۔ رہی نوکری تو وہ ہمیں

انٹرویو کے بغیر ہی مل گئی۔

آہستہ آہستہ ہمیں احساس ہوا کہ خاموشی سونا نہیں، بلکہ تانبے سے بھی کمتر کوئی چیز ہے اور گفتگو چاندی تو کیا پلاٹینم ہے۔ لیکن افسوس اب وقت گزر چکا تھا۔ ہماری عادت اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ اسے بدلنا تقریباً ناممکن تھا۔ چنانچہ اب ہم لوگوں کو بغیر دم لیے گفتگو کرتے سنتے ہیں تو اُن پر رشک کرتے ہیں کہ کیسے یہ لوگ فقرہ پر فقرہ بولتے چلے جاتے ہیں اور مخاطب کی دو باتیں تو کیا ایک بات بھی سننے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ ہم نے تو عموماً دو چار آدمیوں کو مسلسل بولتے بھی دیکھا ہے، یعنی سب مقرّرین ہوتے ہیں اور سامع کوئی نہیں ہوتا (سوائے ہمارے)۔ لیکن ہمارے پلّے کوئی بات نہیں پڑتی، کیوں کہ جو آوازیں ہم تک پہنچتی ہیں، وہ کچھ اس قسم کی ہوتی ہیں، غور فرمائیے گا:

”آخر انسان نے صدیوں کا جو سفر طے کیا، یہ سب کچھ کرکٹ کی بدولت ہے۔ آپ کی بات کاٹ رہا ہوں۔ بنیادی مسئلہ افروایشیائی صورتِ حال کا ہے، جس نے کئی شاندار سنچریاں بنائی ہیں۔ ظہیر عباس کو ایک چانس اور مل جائے تو مڈل ایسٹ کا قضیہ طے ہو سکتا ہے۔ آپ بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ استحصالی قوتیں ہمیشہ وکٹ اپنی مرضی سے بناتی ہیں اور آج کل تو ویسے بھی موسم بدل رہا ہے، مچھر سونے نہیں دیتا، جس کے لیے قومی سطح پر منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔“ وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے زندگی میں کامیاب ترین لوگ وہ دیکھے ہیں، جو بولتے ہیں اور بے تحاشا بولتے ہیں۔ دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو کر لیتے ہیں، بات کو تولنے کا انہیں کبھی دھیان نہیں آتا۔ صحافت ہو یا سیاست، دکانداری ہو یا بینکنگ، غرض ہر میدان میں بولنے والوں کا بول بالا ہے اور ہم جیسے کم گو لوگ زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہیں!

* *

اَدبی مکاتبِ فکر

سلیم آغا

ہمارے ہاں ایسے ایسے ذہین اہلِ قلم موجود ہیں، جن کا وجود اُن کے قوی مشاہدے کی وجہ سے ایک نعمت معلوم ہوتا ہے۔ اس مضمون میں کچھ بھی تو غلط نہیں ہے۔ جو کچھ بیان کیا ہے، وہ ہو بہو، لفظ بہ لفظ صحیح ہے۔ ان کریہہ کرداروں سے ہمارا آپ کا روز واسطہ پڑتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے سرپرست آج ادب کے اُفق پر چھائے ہوئے نظر بھی آتے ہیں۔

یہ تو ممکن ہے کہ آپ شناختی کارڈ، راشن کارڈ اور ملاقاتی کارڈ کے بغیر کسی نہ کسی طرح اِس جہانِ رنگ و بو کو پار کر جائیں، مگر فی زمانہ یہ ناممکن ہے کہ کسی مکتبِ فکر کے جاری کردہ کارڈ کے بغیر آپ ایک میٹر کا فاصلہ بھی بے خطر طے کر سکیں۔ یوں تو کسی بھی معاشرے میں ہر وضع کے کالے گورے، چھوٹے موٹے، لمبے بے ڈھنگے، اونگھتے جاگتے مکاتبِ فکر بآسانی دستیاب ہوتے ہیں، مگر فی الحال مَیں صرف چند اہم ادبی مکاتبِ فکر کا احوال رقم کروں گا:

مکتبِ ستائشِ باہمی

اِس مکتب کے قلمکار اپنی برادری کے ادیب کی 'مدلل مداحی' میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے، بلکہ اِس مکتب کے پیروکار اُٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، ایک دوسرے کی ستائش کرتے رہتے ہیں۔ 'کر بھلا، سو ہو بھلا' کے مقولے پر سختی سے کاربند رہنا، اِن کا اُصولِ تحریر ہے۔ ایک دوسرے کی تعریف میں گل افشانیٔ گفتار کا مظاہرہ ملاحظہ کیجیے:

''حضرت کل مشاعرے میں جو غزل آپ نے پڑھی، وہ تازہ اور خوشبودار خیالات سے لبریز تھی۔ مَیں اُسے رات بارہ بجے سے صبح چار بجے تک گنگناتا رہا۔ پھر آپ کی بھابی کی آنکھ کھل گئی اور...''

"ذرہ نوازی ہے۔ دراصل میری یہ غزل عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ حیرت ہے کہ آپ کی سمجھ میں کیسے آ گئی؟"

"بجا فرمایا۔ آپ کی غزل تو واقعی پیچیدہ اور خوب صورت ہوتی ہے، غالب کی طرح۔"

"شکریہ جناب۔"

"ہاں، یاد آیا کل مَیں نے ریڈیو پر آپ کا افسانہ سنا۔ صاحب! آپ کا افسانہ سن کر لطف آ گیا۔ بڑی گہری باتیں کی ہیں، آپ نے اپنے افسانے میں۔"

"ریڈیو پر تو مَیں نے غالباً ایک مضمون پڑھا تھا!"

"جی ہاں، جی ہاں۔ دراصل موسم کی خرابی کے باعث آواز بالکل نہیں آ رہی تھی۔ یقیناً بڑے پتے کی باتیں کی ہوں گی، آپ نے اپنے مضمون میں۔"

"شکریہ جناب، لیکن وہ آپ کی غزل بے مثال تھی۔"

"حضور، مضمون آپ کا بھی کمال کا تھا۔"

مکتبِ ستائشِ باہمی کے لکھاریوں کا یہ اندازِ گفتگو مشکل حالت میں اُن کے بڑے کام آ ہے اور وہ اپنی اِس خوبی سے سرکاری عہدوں پر فائز ادیبوں کو موم کر کے رکھ دیتے ہیں اور پھر انعام واکرام سے مالا مال ہوتے ہیں۔ اپنی معاشی حالت کو سنوارنے کے لیے تمام معذور ادیبوں اور شاعروں کو فوری طور پر اِس مکتب کا ممبر بن جانا چاہیے۔

مکتبِ لایعنیّت

یہ مکتب اپنی شترِ بے مہاری کی بنا پر سب سے جدا ہے۔ اِس مکتب کے لکھنے والے غالباً ٹریفک پولیس مین کی طرح سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر لکھتے ہیں، اس لیے ہر وقت افراتفری کے عالم میں پائے جاتے ہیں۔ اس مکتبِ فکر کے پیروکار مطالب اور معانی کو معما بنا کر 'بوجھو تو جانیں' کی سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ قاری کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ اِن کے فرمودات عالیہ گہرائی اور عمق کے باعث ہر ایرے غیرے کی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ اِن فرمودات کو مزید بائیونک بنانے کے لیے وہ مغربی مفکرین کے اسمائے گرامی کا بے محابا استعمال جائز سمجھتے ہیں اور ایک ہی پیراگراف میں قاری کے علاوہ، کاتب کو بھی زمیں بوس ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ ہر اُس چیز کو مکھن لگانے

کی کوشش کرتے ہیں، جسے بے چاری عقل نگلنے سے انکار کردے۔ دراصل اِس مکتبِ فکر کے پجاری پاسبانِ عقل کے اصل بیری ہیں۔ وہ ہیولوں کو گرفت میں لینے اور معنی کی بے معنویت کو نمایاں کرنے کے لیے تیل مَل کر اَدب کے اکھاڑے میں اُترتے ہیں۔ اِن کی بدولت آج ادب کا ایک بڑا حصہ بین الاقوامی بے معنویت کا شکار ہو چکا ہے۔ اِن کا اندازِ تحریر بالعموم یوں ہوتا ہے:

”سارتر نے ’ایذرا پاؤنڈ‘ کے حوالے سے ’آئن سٹائن‘ کے افکار کو لسانی تشکیلات کے زمرے میں زیروزبر کرتے ہوئے جس وجودی پیکر کے مابعد الطبیعاتی مزاج کو ’برگساں‘ کے اسلوب سے ہم آہنگ کیا ہے، مجھے اِس سے اتفاق نہیں۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ ’مارکس‘ نے جب ’کافکا‘ سے اثرات قبول کر کے معاشی نشیب و فراز کو نثری شاعری کی کوکھ سے برآمد کر لیا، تو ’جیمز جوائس‘ کا سارا اندازِ تحریر اِس درجہ بے معنی نظر آنے لگا کہ وجودیوں تک کو ’پابلو نرودا‘ کی شاعری پر شکیبؔ جلالی کا اثر فوری طور پر محسوس ہو گیا۔ آخر آخر میں اِس مسئلے کو افتخار جالبؔ نے حل کیا۔ اب امن ہی امن ہے۔

مکتبِ لگائی بجھائی

یہ مکتب ’لڑاؤ اور موج کرو‘ کے مقولے کا زبردست حامی ہے۔ اس مکتب کے کارکن اپنے چہرے مہرے پر ایسی حالت ہر وقت طاری رکھتے ہیں، جس سے دوسرے مکاتبِ فکر کے ممبران کو یہ احساس ہوتا ہے کہ سارے جہاں کا درد انہی کے جگر میں ہے۔ مکتبِ لگائی بجھائی کے پیروکار دیگر مکاتبِ فکر کے اربابِ بست و کشاد کے پاس عموماً اُس وقت جاتے ہیں، جب وہ قیلولہ کرنے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔ پہلے یہ بے وقت آنے کی معذرت کرتے ہیں، اور پھر اپنی آواز میں رقت پیدا کر کے کہتے ہیں، ”جناب کچھ روز قبل ہم ٹی ہاؤس میں بیٹھے تھے کہ آپ کا وہ مریدِ قدیم، جسے آپ نے عاق کر دیا ہے، جناب کی شان میں بڑے نازیبا الفاظ استعمال کرنے لگا۔ میں تو حضور برداشت ہی نہ کر سکا۔ بِل ادا کیے بغیر ہی ٹی ہاؤس سے چلا آیا۔ سنا ہے، ٹی ہاؤس کے ایک بیرے نے میرا تعاقب بھی کیا۔ غالباً معذرت کرنے آیا ہوگا۔ تو جناب! بس اُسی روز سے طبیعت مکدر تھی۔ آج طبیعت سنبھلتے ہی آپ کی خدمت میں بہ نفسِ نفیس حاضر ہوا ہوں، تا کہ اپنا فرض ادا کر دوں۔ خدارا آپ اِس شخص سے ہوشیار رہیں، اور اِس کے خلاف کوئی باقاعدہ مہم شروع کریں، تا کہ اسے آئندہ ایسی لغویات کہنے کی جرأت نہ ہو سکے۔ مگر خیر چھوڑیں یہ لوگ چاند پر تھوکیں گے تو

اپنا چہرہ ہی خراب کریں گے۔ بہر حال، آپ فکر مند نہ ہوں، آئندہ اگر کبھی اِس نا ہنجار نے آپ کی شان میں گستاخی کی تو اِس سے نپٹ لیا جائے گا... اچھا حضور، کوئی نعت ہوئی ہو تو سنائیں۔"

جب میزبان معذرت کرے گا، تو یہ اصرار کریں گے۔ اتنے میں چائے کے ساتھ سموسے بھی آجائیں گے۔ میزبان نعت شروع کرے گا اور یہ خود چائے، سموسوں پر ہاتھ صاف کریں گے اور ساتھ ساتھ میزبان کو واہ واہ، سبحان اللہ، مکرر صاحب کہہ کر داد بھی دیتے رہیں گے۔ اس کے بعد میزبان بھی رسمی طور پر انہیں تازہ کلام سنانے کو کہے گا، جس پر پہلے یہ منحنی سی آواز میں معذرت کریں گے، مگر پھر یکدم بول اُٹھیں گے۔ ہاں یاد آیا۔ یہ کہہ کر اپنی جیب سے مونگ پھلی یا چلغوزے کے لفافے کی طرح کا ایک کاغذ نکالیں گے، جس پر میزبان کے خلاف باتیں کرنے والے قلمکاروں کے خلاف ہجویہ اشعار رقم ہوں گے۔ یہ اِن اشعار کو بڑے جوش وخروش سے پڑھ کر میزبان پر اپنی وفاداری ثابت کرنے کی کوشش کریں گے اور میزبان کو مشورہ دیں گے کہ انہیں سائیکلو اسٹائل کروا کے ادیبوں میں مفت تقسیم کرے۔ آخر میں روز بروز بڑھتی ہوئی گرانی کا ذکر کر کے میزبان سے دس پندرہ روپے بطور قرضہ حاصل کر کے یہ جا، وہ جا۔ لوہے کو گرم کرنا اور پھر اُس پر ضرب لگانا اِس مکتبِ فکر کے پیروکاروں کا آزمودہ گر ہے۔ دنیاوی طور پر بہت کامیاب سمجھے جاتے ہیں۔

مکتبِ دہشت گردی

یہ مکتب نومولود بے ادب نوجوان نقادوں کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اِس مکتب کے بیشتر لکھاری دیگر ادبی مکاتبِ فکر میں داخل اور خارج ہوتے رہتے ہیں، مگر اپنی دہشت گردی اور منہ پھٹ انداز گفتگو کے باعث ایک الگ مکتب کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ وہ شہر کے ہر ادبی حلقے میں حاضری دیتے ہیں اور ہر جگہ اپنی زبان درازی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اصل میں اِس مکتبِ فکر کے قلمکار دہشت گردی کا ایک باقاعدہ پلان مرتب کر کے مختلف ادبی حلقوں میں جاتے ہیں اور بزرگ ادیبوں کی شان میں بے ادبی کر کے بڑے خوش ہوتے ہیں۔ مزید برآں، اِس مکتب کے نام لیوا اپنے مخالفین سے زبانی کلامی ہی نہیں اُلجھتے، بلکہ عملی طور پر بھی اس کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ جب زبانی دلائل و براہین کے خود ساختہ گیلے کارتوس ختم ہو جاتے ہیں، تو پھر یہ گالی

گلوچ پر اُتر آتے ہیں اور آخر میں اپنی کہی اور اَن کہی باتوں کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے مخالف کے سر پر کرسی یا منہ پر تھپڑ بطور دلیل کے رسید کرتے ہیں اور پھر خوش ہو کر اَپنے (دودھ کے) دانتوں کی نمائش کرتے ہیں۔ بحیثیتِ مجموعی اِس مکتبِ فکر میں 'فکر' کم اور 'مکتب' زیادہ ہوتا ہے۔

اِن کا طریق کار یہ ہے:

"یار! آج کس کی باری ہے؟"

"بھول گئے کیا؟ آج خمیر پوٹھوہاری نے افسانہ پڑھنا ہے۔"

"ہاں یاد آیا، بھئی آج اُس کا دھڑن تختہ ضرور کرنا ہے۔"

"یار! پڑھا لکھا آدمی ہے، سوچ سمجھ کر چلنا ہوگا، ورنہ کہیں سبکی نہ ہو جائے۔"

"سبکی کی ایسی تیسی۔ سبکی تو اُس کی ہوتی ہے، جس کی پہلے کوئی عزت ہو۔ دیکھنا آج ایسا نکتہ پیدا کروں گا کہ موصوف کا سارا فلسفہ جغرافیہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔"

"پھر بھی کچھ تو بتایئے، آخر کرنا کیا ہوگا۔ معلوم بھی ہے، وہاں ہمارا مخالف گروپ آج پوری طرح لیس ہو کر آئے گا۔"

"آجائے، پروا نہیں، ہم بھی کافی ہیں۔ میرا خیال ہے دس کے قریب تو ہم سارے بھی ہو جائیں گے۔"

"اچھا، یہ بتاؤ آخر آج موصوف کو رگیدنا کیسے ہے۔ مجھے تو کچھ سوجھ نہیں رہا۔"

"ارے بھائی! رگیدنے کے لیے سوچ کی ضرورت نہیں ہوتی، بس... میرا خیال ہے خمیر پوٹھوہاری پر کلیہ نمبر دس استعمال کیا جائے، یعنی یہ کہ جو افسانہ پڑھا گیا ہے، وہ ایک انگریزی افسانے کا چربہ ہے۔"

"مگر یار، اگر مخالف گروپ کے کسی چمچے نے پوچھ لیا کہ کون سے انگریزی افسانہ نگار کے افسانے کا چربہ ہے، تو کیا جوب دیں گے۔"

"تُو تو بالکل گھامڑ ہے، لے لینا کسی مرے ہوئے انگریز کا نام، باقی جو ہوگا ہم سنبھال لیں گے۔"

مکتبِ اثر و رُسوخ

یہ مکتب دیگر تمام ادبی مکاتبِ فکر سے ایک علیٰحدہ اور منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اِس مکتب کے

قلم کار اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر متعدد سرکاری و غیر سرکاری اداروں پر چھائے رہتے ہیں۔ اس مکتب کے اربابِ بست و کشاد بے روزگار شاعروں اور ادیبوں کو مختلف اداروں میں ملازمتیں دلوا کر اپنا حلقہ بگوش بنا لیتے ہیں۔ یہ مکتبِ فکر ایسے اداروں میں اپنی قوت بڑھانے میں خصوصی دلچسپی رکھتا ہے، جہاں سے اس کے نظریے اور نصب العین کی مفت میں پبلسٹی ہو سکے۔ اگر کوئی قلم کار جو اس مکتب کے احسانات تلے پس چکا ہو، کبھی شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی دوسرے مکتب کے کسی قلم کار کا انٹرویو چھاپنے یا نشر کرنے کا مرتکب پایا جائے تو مکتب اثر و رسوخ اس باغی احسان فراموش کے درپے آزار ہو جاتا ہے اور ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت اس کے خلاف مناسب کارروائی شروع کر دیتا ہے، حتیٰ کہ اِس عاقبت نا اندیش کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر ہی دم لیتا ہے۔ اور پھر یوں ہوتا ہے کہ ایک روز یہ عاقبت نا اندیش شخص مکتبِ اثر و رسوخ کے دربار میں حاضر ہو کر اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے رندھی ہوئی آواز اور چھلکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگتا ہے اور آئندہ محتاط رہنے اور دوبارہ غلطی نہ کرنے کا پکا وعدہ کرتا ہے۔ اور یوں اس ستم زدہ کو بعض اوقات مناسب سرزنش کے بعد دوبارہ دربارِ اثر و رسوخ میں داخلے کا ٹکٹ جاری کر دیا جاتا ہے۔ اس مکتب کا ایک وصفِ خاص یہ ہے کہ جس طرح ایک کوّے کو کوئی تکلیف ہو، تو اُس کی کائیں کائیں سنتے ہی سارے کوّے اُس کی مدد کو پہنچ جاتے ہیں، بالکل اسی طرح مکتبِ اثر و رسوخ کا کوئی قلم کار اگر کسی مصیبت میں پھنس جائے تو دوسرے کا مرید فوراً اُس کی مدد کو آتے ہیں۔ یہ مکتبِ فکر اَدب سے زیادہ ادبی سیاست میں دلچسپی لیتا ہے۔ چنانچہ دیگر مکاتبِ فکر اس سے نفسیاتی طور پر خوف زدہ رہتے ہیں۔

مکتبِ مساکینِ ادب

تمام بنیادی ضروریاتِ زندگی حاصل کر لینے کے باوجود، اِس مکتب کے قلم کاروں کے چہروں پر اُکھڑے ہوئے لوگوں کی سی مسکینی ہر دم برستی رہتی ہے۔ اِن کے ہونٹ عموماً خشک ہوتے ہیں۔ شیو بڑھا ہوا، زلفیں خاک آلود اور ہاتھ میں تھیلا، جس میں ٹماٹر، لہسن، ادرک، ہلدی اور چائے کے ڈبے کے ہمراہ اِن کی غیر مطبوعہ تحریریں ٹھنسی ہوتی ہیں۔ بازار کا دو تین بار چکر لگانے کے بعد، یہ کسی ایڈیٹر کے کمرے میں پہنچ کر چپکے سے کسی بینچ یا کرسی پر ٹک جاتے ہیں، اور اپنا تھیلا

سلیم آغا ...... ادبی مکاتبِ فکر

ایڈیٹر کی میز پر رکھ دیتے ہیں۔ ایڈیٹر اگر اُس وقت سر جھکائے کوئی چیز لکھنے یا پڑھنے میں منہمک ہو تو بالآخر تھیلے میں پڑے لہسن کی بو کی وجہ سے چونک کر سر اُٹھاتا ہے اور اپنے سامنے مکتبِ مساکینِ ادب کے قلم کار کو دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے۔ تب وہ از راہِ اخلاق مزاج پُرسی کرتا ہے اور یہ مصافحے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ ایڈیٹر اُن کے میلے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ بچانے کی کوشش کرتا ہے، مگر یہ اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اُس پر اپنا پُرجوش بوسہ ثبت کر دیتے ہیں، جس کا نشان کئی روز تک ایڈیٹر کے ہاتھ پر موجود رہتا ہے۔ ایڈیٹر بے چارہ اس اچانک حملے سے گھبرا جاتا ہے اور اپنی خفت مٹانے کے لیے سلسلۂ گفتگو شروع کر دیتا ہے:

ایڈیٹر: ”اور سنائیے، کیسی گزر رہی ہے۔ سب خیریت تو ہے نا!“

قلمکار (رقت بھری آواز میں) ”پچھلے دنوں میری ساس فوت ہو گئیں، پھر چچیرے بھائی کے داماد کی دودھ پیتی بچی کو نمونیہ ہو گیا، پھر میری کمر پر پھوڑا نکل آیا، باقی سب خیریت ہے۔“

ایڈیٹر: ”مگر آپ اس وقت بھی کچھ پریشان سے نظر آتے ہیں، کسی سے لڑائی جھگڑا تو نہیں ہو گیا۔“

قلمکار: ”جناب! لڑائی جھگڑا تو اپنوں سے ہوا کرتا ہے، یہاں تو سب پرائے ہیں۔“

ایڈیٹر: ”پھر بھی کچھ تو بتائیے۔“

قلمکار: (رندھی ہوئی آواز میں) ”کس منہ سے اپنی بدنصیبی کی بپتا سناؤں۔ زمانے کی ناقدری نے مجھے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے، ورنہ میرے دیگر پرانے ہم جماعت ہٹے کٹے بابو بنے آج بھی دکانوں، ہوٹلوں، ملوں میں بیٹھے ہیں۔“

ایڈیٹر: (اپنے ہاتھ کو دباتے ہوئے) ”نہیں صاحب! آپ اتنے بوڑھے بھی نہیں، آج بھی آپ میں دم خم ہے۔“

قلمکار: ”یہ بوڑھی ہڈیوں میں آپ کو جو دم خم نظر آتا ہے، محض آپ جیسے چند قدر شناسوں اور مخلص کرم فرماؤں کی وجہ سے ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم۔“

ایڈیٹر: (نوکر کو چائے کا آرڈر دیتے ہوئے) ”خدارا ایسی دل آزاری کی باتیں نہ کیجیے، ابھی تو آدب

کو آپ کی بڑی ضرورت ہے۔‘‘

قلمکار: ’’اجی خاک ضرورت ہے، دیکھیے (تھیلے میں سے مسودات کا پلندہ نکالتے ہوئے) جریدہ ’فلاحِ مساکین‘ کے ایڈیٹر نے میرا مضمون آج مجھے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ صاحب اسے دوبارہ لکھیے۔ اِس میں کئی جگہ تضادات موجود ہیں۔‘‘

ایڈیٹر: (بیزاری سے) ’’زیادتی کی انہوں نے۔‘‘

قلمکار: صاحب! ’’زیادتی سی زیادتی! یعنی انہیں مطلق احساس نہ ہوا کہ کس سے بات کر رہے ہیں۔ میرے ادبی مقام کو ہی مدِ نظر رکھا ہوتا۔‘‘

ایڈیٹر: (خوش ہو کر) ’’اچھا تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ جریدہ ’فلاحِ مساکین‘ کے اگلے شمارے میں آپ کی کوئی چیز نہیں چھپ رہی ہے۔‘‘

قلمکار: ’’بس جناب یہی سمجھ لیجیے۔‘‘

ایڈیٹر: (چائے کی پیالی قلم کار کی طرف بڑھاتے ہوئے) خیر کوئی بات نہیں، ایسا بعض اوقات ہو جاتا ہے۔‘‘

قلمکار: (چائے کی بآوازِ بلند چسکی لیتے ہوئے) ’’جناب! جو بھی ہوا، سو ہوا، میری عزت اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔‘‘

ایڈیٹر: (گھبرا کر) ’’میرے ہاتھ میں، وہ کیسے؟‘‘

قلمکار: (مسودہ ایڈیٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے) ’’میرے اِس مضمون کو اپنے جریدے کے اگلے شمارے میں چھاپ دیجیے۔‘‘

ایڈیٹر: (جلدی سے مسودہ لے کر دراز میں رکھتے ہوئے) ’’ضرور، ضرور، پوری کوشش کروں گا کہ چھپ جائے۔‘‘

قلمکار: (بھرّائی ہوئی آواز میں) ’’نا صاحب! کوشش نہیں مجھ سے وعدہ کیجیے، ابھی اسی وقت، کیوں کہ یہ میری آبرو کا مسئلہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔‘‘

ایڈیٹر: (کرسی سے اُٹھتے ہوئے) ”ضرور ضرور! اچھا صاحب مجھے اجازت دیں، آج ایک انتہائی ضروری میٹنگ میں جانا ہے۔“

قلمکار: ”چلیے، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں، آپ میٹنگ کیجیے، میں باہر چپراسی سے گپ شپ لگاؤں گا۔“

مکتبِ خطوط نگاراں

اس مکتب کا کوچۂ چابک سواراں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے قلم کار اپنے راہوارِ قلم کی جولانیوں کو صرف رسائل اور اخبارات میں خط لکھنے تک محدود رکھتے ہیں۔ اکثر دیکھنے سننے میں آیا ہے کہ جو مدیرانِ رسائل کسی قلم کار کی تخلیقات کو مسترد کرتے ہیں، وہ اُس کے خطوط سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ وجہ یہ کہ خطوط نویسی کے بارے میں یہ مکتب انتہائی تربیت یافتہ ہے۔ وہ خط کا آغاز مدیر کے پاک نام سے کرتا ہے۔ اُس کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ اس کے بعد رسالے کے مندرجات پر اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے، اُن تمام ادباء کو مسترد کر دیتا ہے، جو اُس کے علم کے مطابق مدیر موصوف کو ناپسند ہوتے ہیں اور اُن تمام ادیبوں کی نگارشات کو حرفِ آخر سمجھتا ہے جو پرچے کو اشتہار دلانے اور اُس کی پبلسٹی کرنے کے باعث مدیر موصوف کو بہت بہت عزیز ہیں۔ چلتے چلتے وہ اپنی ذاتی رنجشوں اور شکر رنجیوں کا لشکارا بھی دے جاتا ہے۔ اگر حسنِ اتفاق سے اُن کا اور مدیر کا دشمن ایک ہی شخص ہو، تو پھر اور کیا چاہیے۔ ایسی صورت میں وہ اپنے خط میں دشنام طرازی اور کردار کشی کا ایسا مظاہرہ کرتا ہے کہ لوگ عش عش کر اُٹھتے ہیں، اور پرچے کو اپنی بہو بیٹیوں سے چھپائے چھپائے پھرتے ہیں۔ اس مکتب فکر کے جملہ خطوط نگاروں کی ایک خفیہ تنظیم بھی ہے، جس میں بعض اوقات پرچے کا مدیر خود بھی شامل ہوتا ہے۔

مکتبِ سپلائی گوریلاں

یہ مکتب معاشی و اقتصادی اعتبار سے فارغ البال ہیں۔ جس طرح شادی بیاہ کے مواقع پر بعض ادارے دریاں، کراکری، قناطیں، قالین وغیرہ کرائے پر سپلائی کرتے ہیں، بالکل اسی طرح یہ مکتبِ فکر ادبی جلوسوں اور مشاعروں میں مختلف مکاتبِ فکر سے منسلک شعرا و ادبا کے خلاف یا حق میں نعرے لگانے کے لیے تربیت یافتہ کارکن سپلائی کرتا ہے۔ ادبی جلسوں اور مشاعروں کے سیزن

کے دوران اس مکتبِ فکر کے گوریلوں کی بکنگ زور شور سے شروع ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات مانگ میں اتنا اضافہ ہو جاتا ہے کہ مکتبِ سپلائی گوریلاں کے کارکنوں کو تین تین چار چار ادبی مکاتبِ فکر کے شعرا کے حق میں نعرے لگانے اور داد دینے کے لیے بک کر لیا جاتا ہے۔ نعرے لگانے، داد دینے اور تالیاں بجانے کے مختلف ریٹ اس مکتبِ فکر نے مقرر کر رکھے ہیں، جو صرف ضرورت مندوں کو بتائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی مکتبِ فکر اپنے کسی مخالف مکتبِ فکر کے مشاعرے یا مجالس کی کارروائی میں باقاعدہ ہلڑ بازی کرنا یا اُسے مکمل طور پر درہم برہم کرنا چاہے، تو پھر مکتبِ سپلائی گوریلاں اپنے خاص گوریلے حاجت مند مکتب کو سپلائی کرتا ہے، مگر اِس قسم کے مشن کا معاوضہ عام اور درمیانے درجے کے مشنوں کے مقابلے میں دگنا ہوتا ہے۔ گرفتار ہونے، زخمی ہونے، یا راہیِ ملکِ عدم ہو جانے کی صورت میں گوریلے کے بیوی بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اس مکتبِ فکر کے ذمہ ہوتی ہے، جس نے اُسے کرائے پر حاصل کیا ہوتا ہے۔ اِس سے قطعِ نظر، ملک سے باہر ہونے والے مشاعروں اور جلسوں میں بھی مختلف مکاتبِ فکر کے شعرا و ادبا انہیں ہمراہ لے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں مکتبِ سپلائی گوریلان انہیں خصوصی رعایت دیتا ہے۔ المختصر اس مکتب کی مانگ سدا بہار ہے۔

* * *

سلیم آغا ...... ادبی مکاتبِ فکر

دولہا میاں کو سلامی

سید ابوظفر زین

لڑکے کا باپ: ہمیں یہ رشتہ منظور ہے۔ آپ کی لڑکی ماشاء اللہ صورت اور سیرت میں لاکھوں میں ایک ہے۔ اس پر علم اور عقل، تہذیب و شائستگی، خانگی شعور اور سلیقہ، سب ہی کچھ ہے۔ اور آپ نے بہت اچھا کیا کہ قرآن پاک کی قرأت اور تفسیر سکھائی۔ میری اہلیہ کو یہ رشتہ بہت پسند ہے۔ انہوں نے ایسے ہی سرسری طور پر دریافت کیا ہے کہ جہیز میں آپ سونے کے کون کون سے زیورات دے رہے ہیں۔

لڑکی کا باپ: جیسا کہ آپ جانتے ہیں، میں غریب آدمی ہوں۔ ایک تولہ سونے کی بالیاں دے دوں گا، اس کی مرحومہ ماں کی نشانی۔

لڑکے کا باپ: بہت ہے۔ اب کہاں اُس زمانے کی چیزیں نصیب ہوتی ہیں جب سونا خالص ہوتا تھا۔ مگر کانوں میں ایک تولہ سونے کی بالیاں اسی وقت بجتی ہیں، جب گلے میں دو تولے کا ہار بھی ہو۔

لڑکی کا باپ: میں کوشش کروں گا۔

لڑکے کا باپ: جی ہاں، دنیا میں سب کچھ کوشش ہی سے حاصل ہوتا ہے اور جب آپ ہار کے لیے کوشش کریں تو لگے ہاتھوں دو تولے کے کنگنوں کی بھی کوشش کر لیجیے گا۔ بھلا آپ کی لڑکی کانچ کی چوڑیاں پہن کر آئے گی؟ لوگ کیا کہیں گے؟

لڑکی کا باپ: کیا زیورِ علم کم ہے؟

لڑکے کا باپ: جی نہیں۔ ماشاء اللہ بہت ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ زیورِ علم کی قدر کرنے والے بہت کم ہیں اور وہ بھی مشرقی علم کی۔ اگر موجودہ معاشرے کو شکست دینی ہے تو طلائی زیوروں سے دیجیے۔ ایک تولہ کی بالیاں، دو کا ہار اور دو کا کنگن ٹھیک رہے گا۔ اللہ پر بھروسا کر کے آج ہی آرڈر دے دیجیے۔ رقم کا انتظام آپ کہیں نہ کہیں سے کر ہی لیں گے۔ اور ہاں، فرنیچر میں آپ کیا دے

رہے ہیں؟

لڑکی کا باپ: ایک مسہری کا بندوبست کیا ہے، بستر سمیت۔

لڑکے کا باپ: بہت بڑی بات ہے۔ اور ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ کتنی کرسیاں دے رہے ہیں؟

لڑکی کا باپ: ابھی اس کی گنجائش نہیں ہے۔

لڑکے کا باپ: ارے جناب! آج کل بیڈ روم، ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کے لیے فرنیچر کے درجنوں ڈیزائن نکل آئے ہیں۔ کوئی بات نہیں، وقت نکال کر میرے ساتھ چلیے۔ بازار میں مختلف نمونے دیکھ کر طے کرلیں گے۔ ہاں، ایک ڈریسنگ ٹیبل بھی لازمی ہے۔ آپ کی بیٹی کے ہی کام آئے گا۔

لڑکی کا باپ: معاف کیجیے گا۔ میں ایک غریب آدمی ہوں اور...

لڑکے کا باپ: بھئی، آج کل فرنیچر خریدنا بہت آسان ہوگیا ہے۔ قسطوں پر ہر قسم کا فرنیچر مل جاتا ہے۔ آپ صرف چوتھائی قیمت دے کر کاغذات پر دستخط کر دیجیے گا اور بس... آپ کا کام ختم۔ فرنیچر ہمارے گھر پہنچ جائے گا۔ آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

لڑکی کا باپ: وہ تو ٹھیک ہے، مگر میں یہ سب قسطیں کہاں سے چکاؤں گا۔ میرے بس سے باہر ہے۔

لڑکے کا باپ: اور ہاں! لڑکے کی ماں نے یہ بھی پوچھا ہے کہ دولہا کے جوتوں اور کپڑوں کے لیے آپ نے کتنی رقم رکھی ہے۔

لڑکی کا باپ: پانچ سو۔ اگر کم ہے تو سو پچاس اور دے دوں گا۔

لڑکے کا باپ: یہ تو بہت کم ہے۔ بہرکیف، آپ کو نقد روپے دینے کی کیا ضرورت ہے۔ لڑکے کو ساتھ لے جایئے گا، وہ اپنی پسند کے مطابق خریداری کرلے گا۔ اگر روپے کی ضرورت ہو تو میں آپ کے مکان پر بینک سے اوورڈرافٹ دلوادوں گا۔

لڑکی کا باپ: بھائی صاحب، میں ایک فقیر اور درویش آدمی ہوں اور آپ سے درویش نوازی کی توقع رکھتا ہوں۔

لڑکے کا باپ: حضور، ہمارے آباواجداد بھی درویش تھے، مگر اَب زمانہ بدل گیا ہے۔ آپ خود ہی عقلمند ہیں اور زمانے کو پہچانتے ہیں۔ اتنا کچھ تو کسی نہ کسی طرح سے کرنا ہی ہے۔ اور پھر جہیز میں

بڑا سجان دوعالم

ایک چھوٹی گاڑی، ٹی وی، فریج، برتن وغیرہ تو آپ دے ہی دیں گے۔ ایک ہی اولاد ہے ہماری۔

لڑکی کا باپ: محترم، آپ مجھ پر بہت زیادہ بوجھ ڈال رہے ہیں۔

لڑکے کا باپ: چلیے، یہ سب تو طے ہوا۔ بیگم نے پوچھا ہے کہ آپ دولہا کو کتنی سلامی دے رہے ہیں؟

لڑکی کا باپ: سلامی؟ ہاں یاد آیا۔ ضرور۔ آپ لوگوں کو عزت اور احترام سے ایک قطار میں کھڑا کر کے اکیس توپوں کی سلامی دے دی جائے گی۔ اللہ نے چاہا تو ایک نشانہ بھی خطا نہیں ہوگا۔ خدا حافظ۔

* * *

چچا چھکن نے ایک خط لکھا!

سیّد امتیاز علی تاج

وثوق سے یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ چچا چھکن جب کسی کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو اُس وقت اِن کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ خود نمائی کے شوق سے ناچار ہوتے ہیں، یا محض دستگیریِ خلق کا جذبہ دامن گیر ہوتا ہے۔ ذرا دیر کو مان لیا کہ دونوں ہی باتیں ہوتی ہیں، خود نمائی کا شوق بھی اور دستگیریِ خلق کا خیال بھی۔ تو میں یہ کہتا ہوں، ایک بار یہ ہونا ممکن ہے، دو بار ہونا ممکن ہے، ایک دو بار نہ سہی دس بیس بار سہی، پر آخر دنیا میں تجربہ بھی تو کوئی شے ہے۔ کبھی تو خیال آئے کہ اے شخص! بیٹھے بٹھائے تجھے جو ہُلہُلا اُٹھا کرتا ہے، تو تُو نے آج تک کوئی کام سلیقے سے نمٹایا بھی؟ کہیں حاصل بھی ہوئی سرخروئی؟ کسی نے داد بھی دی تیری کارروائی کی؟ چارہ گری کا دعویٰ وہ کرے، جسے اپنی تجربہ کاری پر تکیہ ہو اور جو یہ نہیں تو کیوں ایسی بات کرے، جس سے کالی ہانڈی سر پر دھری جائے۔

اب آج ہی کا واقعہ ہے کہ چچی کو ایک دعوت نامے کا جواب لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ اتفاق سے اُن کا ہاتھ تھارُ کا ہوا، چچا چھکن حسبِ معمول فارغ بیٹھے تھے۔ جواب مختصر سا لکھنا تھا، کام بھی جلدی کا تھا پھر کیا امر انہیں اپنی خدمات پیش کرنے میں مانع ہو سکتا تھا؟ چنانچہ لکھا آپ نے جواب۔ اس کے لیے کیا کچھ اہتمام ہوا، گھر میں کیسا ہلڑ مچا اور پھر کیا نتیجہ نکلا، اس کی داستان سننے سے تعلق رکھتی ہے۔

بات یوں ہوئی کہ صبح کے وقت چچی دالان میں چارپائی پر بیٹھی بچوں کو چائے پلا رہی تھیں۔ چچا چائے سے فارغ ہو کر صحن میں کرسی پر اُکڑوں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ایک گائے خریدنے کی ضرورت اور اس کے متوقع فوائد و نقصانات کے انفرادی اور اجتماعی نتائج و عواقب کے متعلق چچی کو معلومات بخشی جا رہی تھیں۔ اتنے میں باہر دروازے پر کسی نے آواز دی۔ بندو بھاگتا ہوا گیا اور ایک خط لے کر واپس آیا۔ چچی پرچ سے چھٹن کو چائے پلا رہی تھیں، خط لا کر اُن کے قریب رکھ دیا۔

اتنے پرچ کی چائے ختم ہو اور چچی خط اُٹھائیں، چچا نے دس مرتبہ پوچھ ڈالا، ''کس کا خط ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کس نے بھیجا ہے؟ کیا بات ہے؟'' چچی چڑ گئیں۔ ''توبہ ہے! کھولنے پائی نہیں اور سوالات کا تانتا باندھ دیا۔ مجھے غیب کا علم تو آتا نہیں کہ دیکھے بغیر بتادوں، کس کا خط ہے؟''

چچا کچھ خفیف سے ہو گئے۔ ''بھلا صاحب خطا ہوئی کہ پوچھا، ہماری بلا سے کسی کا ہو۔'' یہ کہہ کر بے نیازی سے سر موڑ جلد جلد حقے کے کش لینے لگے۔

بندو نے کہا، ''بیگم صاحب آدمی جواب کے انتظار میں کھڑا ہے۔'' یہ سن کر چچا سے نہ بیٹھا گیا، چار پانچ کش لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کرتے میں ہاتھ ڈال پیٹ کھجاتے رہے، پھر بے تکلفی کے انداز میں ٹہلتے ہوئے باہر نکل گئے۔

چند منٹ بعد واپس آئے۔ کچھ دیر بے ترتیبی سے صحن میں ٹہلے، منتظر تھے کہ شاید چچی مخاطب کریں، آخر نہ رہا گیا تو خود ہی پوچھا، ''کیا لکھا ہے منصرم صاحب کی بیوی نے؟''

چچی نے چائے کی پرچ چھٹن کے منہ سے لگاتے ہوئے بے پروائی سے کہا، ''رات کھانے پر بلایا ہے۔''

چچا کا احتراز و تامل رخصت ہو گیا۔ ''کیا بات ہے؟ کوئی تقریب؟''

چچی نے کسی قدر سرسری انداز میں کہا، ''بات کیا ہوتی، میر منشی صاحب کی بیوی مجھ سے ملنا چاہتی تھیں، انھیں اور مجھے دونوں کو کھانے پر بلا لیا ہے۔''

شاید مزید اطمینان حاصل کرنے کو چچا بولے، ''تو گویا زنانہ ضیافت ہے!'' پھر غالباً خیال آیا کہ بیوی کا کہیں مدعو کیا جانا، ایک طرح میاں ہی کی ہر دلعزیزی اور قدر و وقعت کا اعتراف ہے، چنانچہ اس جذبے کے ماتحت منصرم صاحب کی بیوی کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ ''بہت معقول بیوی ہیں، ایسی ملنسار بیویاں کہاں نظر آتی ہیں آج کل، ضرور جاؤ ضیافت میں، بلکہ کوئی موقع ہو تو انھیں بھی اپنے ہاں مدعو کرو۔'' ساتھ ہی ایک مشورہ بھی فیصلے کی صورت میں پیش کیا، ''بچے تو جائیں ہی گے ساتھ۔''

چچی نے کچھ بگڑ کر آہستہ سے کہا، ''ہمسائیوں کو بھی نہ لیتی جاؤں۔''

چچا کو یہ جواب ناگوار نہ گزرا۔ ایک تو چچی بولی آہستہ سے تھیں، دوسرے کچھ زیادہ عام فہم بات نہ تھی۔ بہر حال، پیٹ سہلاتے ہوئے مڑنے لگے۔ پھر رُک گئے۔ کہا، ''اُن کا ملازم جواب

کا تقاضا کر رہا تھا۔“

چچی نے جواب میں چھٹن کو مخاطب کیا، ”کم بخت خدا کے لیے کہیں ختم بھی کر چک چائے۔ کھیل کیے جا رہا ہے، کس وقت سے پرچ پیالی لیے بیٹھی ہوں۔ نہ خود پینی نصیب ہوئی ہے، نہ ابھی نوکروں کو ملی ہے۔ اِدھر چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے، اُدھر باہر سے جواب کا تقاضا چلا آ رہا ہے۔“

آپ جانیے، ایسا موقع ہو اور چچا اپنی خدمات پیش کرنے سے رُک جائیں۔ بولے، ”ہم لکھ دیں جواب؟“

چچی بولیں، ”نہ بس آپ معاف رکھیے۔ فارغ ہو کر میں آپ ہی لکھ لوں گی۔“

رو کے جانے کا باعث چچا کیوں کر بوجھیں، بولے، ”کیا معنی، ہم خط لکھنا نہیں جانتے؟“

چچی نے چپ ہی ہو رہنا مناسب سمجھا، چچا کی کچھ تسکین نہ ہوئی۔

”اب کوئی فارغ خطی تو لکھنی نہیں، دعوت منظور کرنے ہی کا خط لکھنا ہے؟ تو اِس کا لکھنا کیا کون سی جوئے شیر لانا ہے۔“

اتنے میں چھٹن نے جو جلدی سے چائے کا گھونٹ بھرا، اُسے اچھو آ گیا۔ چائے کی کلی چچی کے کپڑوں پر پڑی۔ وہ انڈیل رہی تھیں پرچ میں چائے، اُن کا ہاتھ ہل گیا، ساری کی ساری چائے کپڑوں پر آن پڑی۔ چچی ”ہانا مراد“! کہتی ہوئی تولیے سے کپڑے پونچھنے لگیں۔ اُدھر باہر سے آواز آئی، کیوں صاحب ملے گا جواب؟“ چچی نے گھبرا کر چچا سے کہہ دیا، ”اچھا پھر اَب تم ہی یہ لکھ دو کہ آ جاؤں گی۔“

اب کیا تھا، چچا کو منہ مانگی مراد ملی۔ خط و کتابت کے متعلق ضروری سامان فراہم کیے جانے کے احکام صادر ہونے لگے۔ ”بندو میرا بھائی! ذرا لانا تو خط لکھنے کا سامان جھپاک سے۔ کیا کیا لائے گا بھلا؟ قلم دوات اور کاغذ، شاباش! مگر کون سے کاغذ؟ آسمانی رنگ کے بڑھیا، رُول دار، وہ جن کی کاپی سی ہے۔ ہاں ذرا دکھانا تو اپنی چال اور سنیو... چلا گیا“؟ ”لفافہ بھی تو چاہیے ہوگا۔ ارے بھئی! کوئی لفافہ بھی تو لاؤ۔ تُو جا کر لائیو مُودے، پر نیلے ہی رنگ کا ہو لفافہ۔ صندوقچے میں رکھے ہیں، لکڑی کے صندوقچے میں۔ الماری میں ہو گا صندوقچہ، ہری الماری میں۔ سن لیا نا؟ ذرا پھرتی سے۔“

یہ تو چچا کی عادت ہی نہ ٹھہری کہ ایک مرتبہ یاد کر کے کہہ دیں، کیا کیا چیز چاہیے ہے۔ اِدھر مودا گیا، اُدھر جاذب یاد آ گیا، ”ارے ہاں، اور جاذب بھی تو لانا ہے۔ بھئی جاذب! جاذب! کوئی

نہیں سنتا۔ یہ امامی کہاں گیا؟ او امامی۔ اے او امامی! دیکھیں اس بدمعاش کی حرکتیں۔ بس کام نکلنے کی دیر ہے اور یہ غائب۔ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔ ذرا تم چلے جاتے میاں للّو۔ وہ جو ہری کاپی ہے نسخوں کی، وہ جس میں ہم نسخے نہیں لکھا کرتے؟ عجب کوڑھ مغز ہو، بھئی کیمیا کے نسخے، لاحول ولا، میاں کاپی، ہری کاپی، نسخوں والی۔ خیر اَب تم نے دیکھی ہے یا نہیں، وہ ہمارے تکیے کے نیچے رکھی ہے۔ اُس میں ایک جاذب ہے وہ نکال لاؤ۔ اور دیکھنا، اماں سنو! ارے بھئی للّو! ارے میاں للّو! او للّو کے بچے۔ عجب حالت ہے اِن لوگوں کی۔ بس ایسے گھبرا جاتے ہیں، جیسے ریل ہی تو پکڑنی ہے۔ دوڑ تم جا کر کہو جاذب نہ لائیں کاپی ہی لے آئیں۔ آخر خط بھی تو کسی چیز پر رکھ کر لکھا جائے گا۔ ہاتھ پر رکھ کر تو میں لکھنے سے رہا۔ اور سننا میری بات۔ وہ کہیں ہمارا چشمہ بھی رکھا ہوگا، وہ بھی ڈھونڈتے لانا۔"

لیجیے صاحب! ایک دو منٹ میں گھر کا گھر مصروف ہو گیا، ایک کو کوئی چیز مل گئی، دوسرا خالی ہاتھ چلا آ رہا ہے کہ فلاں چیز نہیں ملی۔ کوئی کہتا ہے کہ فلاں چیز مقفل ہے، کنجیوں کا گچھا ڈھونڈا جا رہا ہے، چچا بگڑ رہے ہیں۔ مونچھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔

"آنکھیں ہوں تو چیز سجھائی دے۔ اور پھر یہ بھی تو نہیں کہ ہم یہاں کھڑے ہیں۔ ہم سے آ کر کہیں کہ صاحب فلاں چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں ہے، کہاں ہوگی۔ سراغ رساں کے بچے خود تلاش کر کے رہیں گے۔ پوچھنے میں تو ان کی سبکی ہوتی ہے، آن پر حرف آتا ہے۔ پھر اَب کیوں آئے ہو؟ ڈھونڈو خود جا کر۔ اپنی جگہ پر چیز نہیں تو تم ہی بدمعاشوں نے کہیں کی ہوگی غائب۔"

خدا خدا کر کے تمام چیزیں جمع ہوئیں، چچا نے چشمہ لگایا، کرسی پر براجمان ہوئے، لڑکے چیزیں لیے اِردگرد کھڑے ہو گئے۔ کاغذ سنبھالا، کاپی نیچے رکھی، قلم ہاتھ میں لیا۔ اب دیکھتے ہیں تو اُس کا نب ندارد! "ہیں اور نب کہاں ہے؟ لاحول ولا قوۃ الا باللہ، اے اندھے اِس سے لکھوں گا خط؟ اس سے لکھنا ہوتا تو میں اپنی انگلی سے نہ لکھ لیتا، تجھے قلم لانے کو کیوں کہتا؟ مگر یہ اُتارا کس نے اس کا نب؟ اس بدتمیزی اور بدتہذیبی کے معنی کیا؟ میں آج معلوم کر کے رہوں گا، یہ حرکت کس نامعقول کی ہے۔"

باہر سے آواز آئی، "اجی صاحب! جواب کے لیے کھڑے ہیں۔"

چچی یہ سب کیفیت دیکھ رہی تھیں اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔ آواز سن کر نہ رہا

گیا، بولیں، ”خدا کے لیے اب تم اس جرح کو بند کرو اور لکھنا ہے تو لکھ دو۔ وہ غریب باہر کھڑا سوکھ رہا ہے، یہ قلم نہیں تو میرا قلم موجود ہے، جا بنو میرا قلم لا دے۔“

چچا اِس وقت جوش میں تھے اور بزعمِ خویش محض تکلیف پہنچنے کے خیال سے نہیں، بلکہ ایک اُصول کی خاطر بات کو طول دے رہے تھے، اس وقت چچی پر بھی برس پڑے۔

”تمہاری ہی شہ پا کر تو نوکروں اور بچوں کی عادتیں بگڑ رہی ہیں۔ یہ ضرور ان ہی میں سے کسی کی حرکت ہے۔ کوئی بچہ یا ملازم ہمارے اس قلم سے تفریح کرتا رہا ہے اور اُسی نے اس کا نب ضائع کیا ہے۔ قلم کو سب غور سے دیکھو اور سچ سچ بتاؤ کہ یہ حرکت کس کی ہے؟“

اتنے میں بنو چچی کا قلم لے آئی۔ چچا کا آخری فقرہ سن کر اُس نے قلم پر نگاہ ڈالی تو بولی، ”لال قلم! ابا میاں، کل آپ ہی نے تو اَزار بند ڈالنے کو اِس کا نب اُتارا تھا۔“

چچا نے گھور کر بنو کو دیکھا، قلم کو دیکھا، کچھ سوچا، کھنکار کر گلا صاف کیا، کرسی پر پینترا بدلا۔ کن انکھیوں سے چچی اماں پر نظر ڈالی، قلم بنو کے ہاتھ سے لے لیا، سر جھکا کر انگوٹھے کے ناخن پر اُس کا نب پرکھنے لگے۔ بولے، ”چلو اَب اسی سے کام چل جائے گا۔“

بمقابلہ پچھلی گفتگو کے، آواز کا سُر بہت مدھم تھا۔

جو لڑکا دوات لیے کھڑا تھا، اُسے آگے بڑھنے کا حکم دیا، خط لکھنا شروع کیا۔ القاب ہی لکھا ہوگا کہ بولے، ”ہبی ہے۔ یہ کیا لفظ لکھ گیا میں! خط کا کاغذ پھاڑ ڈالا، دوسرا منگوایا۔ ڈوبا لیا، لیکن لکھتے لکھتے رُک گئے۔ بہت دیر تک مضمون سوچتے رہے، آخر پھر لکھنا شروع کیا۔ نب اتنی دیر میں خشک ہو چکا تھا۔ آپ سمجھے دوات میں سیاہی کم ہے، قلم بے تکلف دوات میں ڈال دیا۔ تحریر شروع کرنے کی دیر تھی کہ سیاہی کا یہ بڑا دھبہ کاغذ پر! لاحول کہہ کر اُس کاغذ کو بھی پھاڑ ڈالا۔ تیسرا کاغذ منگوایا، اُس پر دو تین سطریں لکھ گئے۔ اس کے بعد قلم روکا، جو کچھ لکھا تھا پڑھا۔ چہرے پر کچھ قبض کی سی کیفیات نمودار ہوئیں۔ چچی کی طرف دیکھا، خط کو دیکھا، چپکے سے پھاڑ ڈالا۔ ہلکے سے مُودے سے کہا، ”خط کے کاغذوں کی کاپی ہی لے آ۔“

کاغذوں کی کاپی کی کاپی آ گئی اور رقعے کا جواب بے فکری سے لکھا جانا شروع ہو گیا۔ کبھی قلم کا شکوہ کہ نب درست نہیں، نیا نب ہے، کبھی دوات کی شکایت کہ سیاہی ٹھیک نہیں، پھیکی ہے، کبھی جاذب بُرا کہ یہ جاذب ہے یا پتنگ بنانے کا کاغذ۔ ہر شکوہ ایک نیا کاغذ ضائع کرنے کی

تمہید۔ اسی میں پون گھنٹہ ہونے آ گیا۔ باہر ملازم آوازوں پر آوازیں دے رہا ہے، اُدھر چچی فارغ ہو چکی ہیں اور یہ قصہ ختم کرنے کا تقاضا کر رہی ہیں۔ بار بار کہہ رہی ہیں کہ خدا کے لیے تم مجھے دو قلم دوات، میں ابھی دو منٹ میں لکھے دیتی ہوں خط، مگر چچا اپنی قابلیت کی یہ توہین کیوں کر برداشت کر لیں۔ سٹ پٹا گئے ہیں، مگر خط لکھنے سے باز نہیں آتے، پینترے پر پینترا بدل رہے ہیں اور کاغذ پر کاغذ رڈی کیے چلے جا رہے ہیں۔

”میں کیا کروں، نہ قلم ٹھکانے کا، نہ دوات درست، لکھوں اپنے سر سے؟ اِدھر یہ سب بلائیں میرے سر پر آن چڑھی ہیں۔ اوے کم بختو! خدا کے لیے پرے ہٹ کر کھڑے ہو، میرا دم اُلجھنے لگا ہے۔ بھان متی کا تماشا تو ہو نہیں رہا کہ پلے پڑ رہے ہو۔ کبھی دیکھا نہیں خط کیوں کر لکھا جاتا ہے...؟ اچھا بھئی سن لیا سن لیا، ذرا دم لو، خالی تو بیٹھے نہیں، جواب ہی لکھ رہے ہیں... ار بھئی خدا کے لیے دوات ورے لاؤ۔ اب میں ہر بار کرسی پر سے اُٹھ کر ڈوبا لوں...؟ اِنھوں نے اور میرے رہے سہے حواس غائب کر دیے ہیں۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتی ہیں۔ نہ جانے کہاں کی عرضی نویس ہیں کہ دو منٹ میں جواب لکھ لیں گی۔ آخر دعوت منظور کرنی ہے، کچھ ٹکا سا جواب تو دینا نہیں کہ دو حرف لکھ کر قصہ نمٹا دوں... ارے بھئی آ رہا ہے جواب۔ تجھے کام ہے تو ہمیں کام نہیں ہے...؟ ہئی ہے! اے لو، اب نیچے اپنا نام لکھ گیا۔ میری عمر جُروا کی طرف سے خطوں کا جواب لکھنے میں تو گزری نہیں کہ ان باتوں کا خیال رہے۔ میں تھپڑ ماروں گا، اگر پھر دوات پرے ہٹائی، ایک جگہ ہاتھ ہی نہیں رکھتا۔ نالائق، بے ہودہ کہیں کا، کام چور نوالہ حاضر۔“

اب تفصیل کہاں تک عرض کروں، پورے ڈیڑھ گھنٹے میں خط ختم ہوا اور اسے جلدی جلدی بند کر کے چچا نے باہر ملازم کے حوالے کیا۔ اسے بھی ایک مختصر سا لیکچر پلایا۔ ”یوں دوسروں کے گھروں پر توائی ڈالنا بڑی بدتمیزی کی بات ہے۔ خط لکھنا کوئی مذاق نہیں ہے۔ ایسا ہی سہل کام ہوتا تو تم سرگاڑی پیر پہیا کر کے روزی کیوں کماتے۔ آج کہیں منشی گیری نہ کر رہے ہوتے؟ خیر اب زیادہ بحث کی ضرورت نہیں، تمھیں کیا معلوم تمہارے میاں لکھنے سے پہلے گے گھنٹے سوچ بچار کرتے ہیں۔“

خط دے کر چچا گھر میں آئے۔ خوش تھے کہ دیر ہوئی تو کیا ہوا، خط لکھا تو گیا، اطمینان سے ہاتھ ملنے لگے۔ چچی بھری بیٹھی تھیں، بولیں، ”خالی ہاتھ ملنے سے کیا ہوگا۔ صابن ملو تو انگلیوں کی سیاہی چھوٹے۔“

چچا نے انگلیوں کو دیکھا تو واقعی کالی سیاہ ہو رہی تھیں۔ ابھی کچھ بولنے نہ پائے تھے کہ چچی نے ایک اور فقرہ کسا، ”خیریت گزری کہ بھنگن کے آنے سے پہلے خط لکھ لیا گیا، ورنہ اُسے بھی اطلاع دینی پڑتی کہ دوبارہ آئے، میاں نے آج ایک خط لکھا ہے۔“

چچا نے کن انکھیوں سے صحن کو دیکھا، جس کرسی پر بیٹھ کر خط لکھا تھا، اُس کے چاروں طرف ردّی کاغذوں کی پڑیاں بکھری پڑی تھیں۔ کچھ کہنا چاہا، مگر فقرہ منہ ہی میں رہ گیا۔ اَن سنی کر کے غسل خانے میں گھس گئے، ہاتھ دھو کر مردانے میں جا بیٹھے۔ بھنگن آ کر صحن صاف کر گئی تو اندر آئے، حقہ بھروایا، بیٹھ کر پینے لگے۔ چچی کی باتیں دل میں کھٹک رہی تھیں۔ اُن کی گوش گزاری کے لیے اپنے آپ کو مخاطب کر کے باتیں شروع کر دیں، ”اعتراض کرنے کو سب تیار ہیں۔ اس پھوہڑ گھر میں جہاں نہ کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر رہتی ہے، نہ کوئی تو کر سلیقے کا موجود ہے، کوئی اس سے جلدی خط لکھ کر مجھے دکھائے تو میں جانوں۔ اور خط لکھنے کا کیا ہے، خط چاہو تو منٹ بھر میں لکھ لو، مگر وہ کیا خط کہ جس کا نہ املا درست، نہ انشا صحیح۔ خط وہ کہ جسے لکھا جائے، وہ پڑھ کر جھومنے لگے اور اُسے یادگار کے طور پر سنبھال کر رکھے۔“

چچی خوب جانتی ہیں کیسے موقعوں پر جلد صلح صفائی کر لینی چاہیے۔ معلوم تھا کہ بات نہ بھلا دی تو تمام دن ایسی ہی جلی کٹی جاری رہیں گی۔ بولیں، ”تو یہ کب کہا میں نے کہ جواب اچھا نہ لکھا گیا ہوگا؟“ بس خوش ہو گئے چچا۔ ”وہ تو اُن کے نوکر کو جلدی پڑی تھی، ورنہ میں تمہیں پڑھ کر سناتا، تب تم داد دے سکتیں۔ رات کو دعوت پر منصرم صاحب کی بیوی خط کے متعلق کچھ کہیں تو مجھے بتا ضرور دینا۔ ویسے یہ چاہے اُن سے نہ کہنا کہ ہم نے لکھا تھا۔ بہر حال، تمہیں اختیار ہے۔“

لیکن لطف اُس وقت آیا جب دوپہر کو منصرم صاحب کی بیوی کے ہاں سے پھر ایک لفافہ آیا، جس میں چچا چھکن کا لکھا ہوا خط رکھا تھا اور ساتھ ہی اِس مضمون کا ایک رقعہ تھا، ”پیاری بہن! شاید غلطی سے کسی اور کے نام کا خط میرے نام کے لفافے میں رکھ دیا گیا، واپس بھیجتی ہوں۔ براہِ مہربانی اطلاع دیجیے کہ آپ رات کو تشریف لا سکیں گی یا نہیں؟“

چچی نے چچا کا لکھا ہوا خط پڑھا تو اس کی عبارت یہ تھی:

”جمیل المناقب عمیم الاحسان زاد عنایتکم! یہاں بفضلِ ایزدِ متعال ما لال خیریت ہے اور صحت و تندرستی آپ کی بدرگاہ مجیب الدعوات خمس الاوقات مستدعی ہوں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ

تلطف نامہ ساعت مسعود میں ورود ہوا۔ ارشادِ سامی و حکمِ گرامی کے امتثال میں عذر کرنا بندگان مروت فتوت سے کیوں کر ممکن ہے۔ طمانیت کلی ہو کہ وقت معین پر حاضری کے شرف وافتخار کا حصول مایۂ ناز متصور ہوگا:

الٰہی درجہاں باشی باقبال
جواں بخت و جواں دولت جواں سال

(نمیقہ حقیر پُر تقصیر)

یہ خط آنے کے بعد چچا چھکن بار بار مختلف پیرایوں میں اپنی اس رائے کا اظہار کر رہے ہیں کہ عورتیں عموماً اور منصرم صاحب کی بیوی خصوصاً، ناقص العقل اور نامعقول ہیں اور چچی کو اِن کی دعوت ہرگز قبول نہ کرنی چاہیے تھی۔

* * *

ایک 'ایم ایل اے' کی ڈائری کے چند ورق!

سیّد امجد حسین

توبہ آج گلوخلاصی ہوئی ہے۔ اتنے دن ڈائری بھی نہ لکھ سکا۔ یہ چار روز تو بس قید میں گزرے ہیں۔ جانے کہاں کہاں موٹر میں گھومتے رہے۔ میں نے تو وہ علاقہ بھی آج تک نہیں دیکھا۔ میں نے کہہ دیا تھا اور لیڈر کے سامنے کہہ دیا تھا کہ جسے آپ کہیں گے میں ووٹ دوں گا۔ میں تو ہمیشہ اس بات پر فخر کرتا رہا کہ میں لیڈر کی جیب میں ہوں جب لیڈر چاہے مجھے ہاتھ ڈال کے نکال لے۔ میں موم کی ناک ہوں۔ لیڈر جدھر چاہے موڑ لے۔ لیکن اس دفعہ لیڈر کو کچھ شبہ ہوگیا تھا۔ میں نے پوچھا آخر مجھ پر یہ شبہ کیوں! لیڈر کا نائب بولا۔ لیڈر کا نائب ہمیشہ نظریں جھکا کے کیوں بات کرتا ہے۔ مجھے آج تک معلوم نہ ہوسکا۔ بس ایسا لگتا ہے کہ ہروقت ندامت کے بوجھ تلے گردن جھکی پڑتی ہے اور ہر وقت دھوپ کا چشمہ کیوں لگائے رہتا ہے۔ شاید ایک سے باتیں کرنے اور دوسرے کو تاڑنے میں آسانی رہتی ہے۔ بہرحال مجھے لیڈر کے نائب یا اس کے بیٹر ہاف "Better half" سے کیا دلچسپی۔ لیڈر کا نائب بولا۔ عدم اعتماد کا سوال نہیں۔ حفظِ ماتقدم کا معاملہ ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ ماشاء اللہ ہمارے ہی گھڑے کی مچھلی ہیں۔ اب مجھے یقین ہے کہ انہیں پتا چل گیا تھا کہ میں نے دوسرے گروپ سے بھی بات چیت کی تھی۔ اور بات چیت کرنے میں کیا حرج ہے۔ ہم مجبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ ہمیں ہر طرح کی آزادی ہونی چاہیے۔ اور پھر میں نے بات تھوڑے ہی کی تھی، انہوں نے بات چھیڑی تھی۔ انہوں نے خود ہی مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں انہیں ووٹ دے دوں تو جنگ فیکٹری کے تمام حصے میرے اور میرے سالے اور میرے بہنوئی کے نام ہوجائیں گے۔ لیکن جنگ فیکٹری کسی کے باپ دادا کی جاگیر تھوڑے ہی ہے۔ قومی ملکیت ہے اور ہم چوں کہ قوم کی راہ چل نکلے ہیں، جنگ فیکٹری میں

حصہ لینا بھی قوم کی خدمت ہی ہوگا۔ رہا روٹ پرمٹ تو وہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر بس چلائیں گے کسی کی ذاتی زمین پر تھوڑے ہی چلیں گے۔ لیکن وہ تو سرسری سی بات ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے مجھے الگ ہی نہ ہونے دیا۔ یہ بڑی غلط بات تھی۔ رات تو میں نے بھاگ نکلنے کی کوشش کی لیکن لیڈر کا نائب اس وقت وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا پھر بیٹھ گئے۔ اگلے روز لیڈر کے نائب نے بھی جنگ فیکٹری اور روٹ پرمٹ کی بات کی اور ساتھ ہی خود بخود یہ بھی کہہ دیا کہ تھانے دار کا تبادلہ حسبِ ضرورت ہوتا رہے گا۔ اب انکار تو کفرانِ نعمت تھا۔ وہاں سے رات کو بند گاڑی میں پہاڑوں میں چلے گئے۔ شکار کھیلتے رہے۔ تین ایم ایل اے اور بھی تھے۔ ایک کے پاس حمائل شریف تھی، جس پر لیڈر نے ایک تحریر لکھ کر دی تھی وہ ایم ایل اے اس حمائل شریف کو تحریر کی وجہ سے سینے سے لگائے رکھتا۔ چوتھے دن کے بعد ہم دو سو میل کی مسافت طے کرنے کے بعد سیدھے سیشن جج کی عدالت میں پہنچے۔ مخالف گروہ کے لوگ آنکھوں آنکھوں میں اشارے کر رہے تھے میں نے ان کا اشارہ پالیا تھا اور سر ہلا دیا تھا۔ لیڈر کا نائب مجھ سے باتیں کرتے ہوئے اپنے دھوپ کے چشمہ میں سے کسی اور کو تاڑ رہا تھا۔ صرف دو ایک اخبار نویسوں نے اس اشارے کو دیکھ لیا تھا۔ جانے انہوں نے کیا سمجھا۔ اشارہ کرنے والا خود سنبھال لے گا۔ یہ جسم تھکن سے چور ہو رہا ہے اور کیا لکھوں۔

سخت مشکل میں ہوں۔ کیا کروں۔ آج کی رات ہی تو درمیان ہے۔ میں نے کہا بھی کہ میں تو جمہوریت پسند ہوں۔ اکثریت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔ جس طرف ایم ایل اے صاحبان کی اکثریت ہوگی۔ مجھے بھی اس طرف ہی سمجھیے۔ لیکن قبل از وقت مجھ سے غیر ذمہ دارانہ باتیں نہ کہلوایئے۔ جمہوری رُخ کا اندازہ لگائے بغیر میں اپنے رُخ کا کیسے فیصلہ کرلوں۔ اتنی سی اُصول کی بات ان کے ذہن میں نہیں آئی۔ میں نے ہمیشہ جمہوری قدروں کے مطابق اکثریت کا ساتھ دیا ہے۔ اگر کبھی اپنی کوتاہ بینی کے باعث اکثریت کا اندازہ نہ ہوسکا تو جونہی اکثریت واضح شکل میں سامنے آئی فوراً اپنے جملہ حقوق بحق اکثریت محفوظ کرا دیے اور مختار نامہ اکثریت کے سردار کے حوالے کر دیا اور سردار نے میرے حقوق کی خود حفاظت شروع کر دی۔ اب تک تو یہ ہوتا تھا کہ سردار جب خود کسی اور کی سرداری قبول کرتا تو مجھ سے بھی کہہ دیتا تم بھی اس کی سرداری قبول کرلو اور اس طرح نیا سردار چن لیا جاتا تھا۔ لیکن اس دفعہ عجیب مشکل ہے۔ اس چار دیواری میں

انور احمد علوی

کب تک چھپا بیٹھا رہوں گا۔ کب تک آنے والوں کو ٹالتا رہوں کہ میں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا۔ جانے اس مولوی کو کیسے پتا چل جاتا ہے کہ اکثریت کدھر ہے۔ اس کا پانسا سیدھا ہی پڑتا ہے اور اگر کبھی اُلٹا بھی پڑتا ہے تو جھٹ سے سیدھا کر لیتا ہے۔

جب بھی وزارت ڈانواں ڈول ہوتی ہے اس کی ایک نہ ایک الاٹ منٹ بڑھ جاتی ہے۔ میں کروں تو کیا کروں۔ جس کا ساتھ نہ دیا اکثریت اگر اس کے ساتھ گئی تو تین سال کی قومی خدمت پر پانی پھر جائے گا۔ جانے اب کے کیا ہو گیا ہے۔ میں نے ان سے بھی کہا بھئی مطمئن رہو میں آپ کے ساتھ ہوں۔ وہ تو نرے چور ہیں۔ نو سال میں ان کے لیے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے ہم نے کیا لیا ہے، لیکن ان نو دولتیوں کو یقین ہی نہیں آتا۔ اب ہر بات میں قرآن مجید درمیان میں لانا بھی تو ٹھیک نہیں۔ ان سے کہا ہے کہ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش بھلا اس طرح اقتدار سنبھلے ہیں۔ بلیک مارکیٹ کے روپے پر سیاسی جماعتیں چلی ہیں۔ کل کو منڈی میں مندا ہو جائے۔ بلیک مارکٹ نہ ہو، پارٹی دھڑام سے نیچے آ رہے گی۔ ہم تو اُصول کے آدمی ہیں۔ ہم اندھے ہیں اور اُصول ہماری لاٹھی ہے۔ لاٹھی جدھر جائے گی اندھا اُدھر ہی جائے گا۔ لاٹھی پر ہمارا کوئی اختیار نہیں، لیکن یہ عقل کے اندھے اسے بھینس والی لاٹھی سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ لاٹھی کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو بے آواز ہوتی ہے، جو خدا کبھی لیڈروں کے لیے عوام کے ہاتھوں میں بھی دے سکتا ہے۔ قصہ مختصر میں کہتا ہوں بھئی لاٹھی ان کے پاس سہی، لاٹھی مار کے کبھی پانی جدا ہو سکتا ہے۔ ہم اور آپ تو پانی ہیں، ان بجھارتوں سے کام نہ بنا۔ ان لوگوں نے کاغذ نکال کر سامنے رکھ دیا، دستخط کرو۔ دستخط کرنے میں ہمارا کیا جاتا ہے۔ اُدھر بھی دستخط کیے تھے، اِدھر بھی کر دیے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ بیٹھیں گے کہاں، دائیں یا بائیں؟ یہ لوگ سمجھوتا کیوں نہیں کر لیتے۔ ہماری آبرو بھی بچ جائے۔ ہمارے لیے تو دونوں برابر ہیں۔ ایک گائے ہے، دوسرا خر۔ مولوی قسمت کا دھنی ہے۔ اس کا رُخ دیکھیں گے۔

آج تو میں پانی پانی ہو گیا۔ مجھے تو ڈائری لکھتے ہوئے بھی جھجک محسوس ہو رہی ہے۔ بعض اوقات لیڈر بھی حد کر دیتا ہے۔ میں نے سرسری طور پر ذکر کیا تھا کہ کل کافی ہاؤس میں بڑی بحث رہی۔ لیڈر کو میرے بتلانے سے پہلے ہی پتا چل گیا ہوگا۔ وہ یہ بھی جان گیا ہوگا کہ کس اخبار نویس نے اس کے خلاف بات کہی تھی۔ لیڈر کو سب معلوم ہوگا، لیکن جب میں نے سرسری طور پر ذکر کیا تو

رنگِ ادب، دہلی نمبر

سید امجد حسین ...... ایک ایم ایل اے کی ڈائری کے چند ورق

لیڈر بہت خوش ہوا کہنے لگا۔ اچھا تم نے میری خاطر کافی ہاؤس میں لڑائی مول لی۔ گویا تم میری خاطر کافی ہاؤس جاتے ہو۔ کوئی کافی ہاؤس مفت تھوڑے ہی جاسکتا ہے۔ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ یہ بڑی زیادتی ہے۔ تم میری خاطر لڑائی مول لو اور ساٹھ روپے خرچ کرو۔ یہ سراسر زیادتی ہے یہ مجھ سے زیادتی ہے۔ میں نے کہا جناب یہ تو چند ٹکوں کا معاملہ ہے۔ ہم آپ کی خاطر جان تک دے دیں گے۔ آپ نے ہمیں ٹکٹ دلایا۔ الیکشن جتایا ہم سے اتنا بھی نہیں ہوتا۔ لیڈر بولا، ”نہیں لیڈر یہ نہ ہوگا۔ (لیڈر خود مجھے لیڈر کہتا ہے کیا اچھا لیڈر ہے، لیکن یہ تو اس کا تکیہ کلام ہے) میری حمایت کرنا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن تم اپنی جیب سے روپے کیوں خرچ کرو۔“ لیکن ہم تو جناب روز کافی ہاؤس جاتے ہی ہیں۔ لیڈر نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ نہیں تم میری خاطر جاتے ہو۔ تم اپنی جیب پر میری سیاست کا بوجھ مت ڈالو۔ یہ دلیل کی بات ہے لیڈر جب دلائل پر اُتر آئے تو اس کے سامنے کون ٹھہرے۔ سب کو ہتھیار ڈالنے پڑتے ہیں۔ لیڈر نے میری جیب میں ایک بند لفافہ ڈال دیا۔ میں نے انکار کیا، لیکن جیب سے لفافہ نہ نکالا۔ وہیں اسے ٹٹول لیا۔ لیڈر نے زیادتی کی تھی، لیکن اس میں میرا کیا قصور۔ لفافہ لوٹانا بھی بُری بات تھی۔ تکرار ہوتی بات نکلتی۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی تو تھے۔

لیڈر اس اعتبار سے خوب ہے۔ اس نے ایک ایم ایل اے کے ریوالور کے لائسنس کی فیس اپنی جیب سے ادا کی محض حفظِ ماتقدم کے لیے... ایک ایم ایل اے لیڈر کو پبلک میں گالی دیتا ہے اور کہتا ہے اس کا لیڈر بڑا بزدل ہے۔ یہ ایم ایل اے بھی خوب ہے۔ غیر رسمی طور پر گالی دیتا ہے اور رسمی طور پر اس کی حمایت کرتا ہے۔

عجیب بات ہے، لیڈر بڑے لیڈر کے حق میں بیان دیتا ہے۔ کہتا ہے، بڑے لیڈر کے ہاتھ میں ملک کی نجات ہے، لیکن ہم سے کہتا ہے بڑے لیڈر کے خلاف ووٹ دو، بڑا لیڈر ملک کا دشمن ہے۔ ابھی تک غدار ہے، لیکن ہمیں کیا۔ بڑا لیڈر جانے۔ وہ اپنا بچاؤ خود کرے۔ بڑا لیڈر بڑا لیڈر رہے گا تو ہم بھی ساتھ ہیں:

دوں گا ذرا سمجھ کے جواب اُن کی بات کا
رُخ دیکھتا ہوں سلسلۂ واقعات کا

* *

شرمیلے خطوط!

سیّد انیس

ازاعتکاف، جامعہ مسجد رحمانیہ 21 رمضان المبارک

عزیز چھٹن کی اماں... خدا تمہیں سکھی رکھے!

ذرا میرے سکھ کا بھی خیال کرلیا کرو۔ ہمیشہ ہر کام ادھورا ہی کرتی ہو۔ مجھے تو گمان ہوتا ہے کہ نکاح کے وقت تم نے 'ہاں' بھی ادھوری ہی کی ہوگی، تبھی تو ہر کام میں کوئی نہ کوئی نقص چھوڑ دی ہو۔ اب میں تمہاری طرح پچھلی باتیں تو یہ کرنے سے رہا اور ویسے بھی خدا کے گھر اعتکاف مم بیٹھا ہوں، دنیاوی باتوں کی طرف توجہ کرنے سے بھی شرم آتی ہے۔ بہرحال، یہاں سامان لاکر رکھا تو پتا چلا کہ پائجامے میں ازار بند نہیں، ٹوکری میں برش ہے تو ٹوتھ پیسٹ نہیں، ذرا جلدی ے چھٹن کے ہاتھ یہ چیزیں روانہ کردو اور کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو بتلا دوں گا۔

تم ذرا سرِ شام ہی بچوں کو اندر بلا لینا اور رات کو سوتے وقت دروازے کی چٹخنیاں خود چڑھانا۔ اچھا، اب مجھے اجازت دو۔ خدا حافظ

فقط تمہارا

مرزا لال بیگ

محلے کی مسجد میں اعتکاف میں بیٹھنے کے ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے بعد لالو چچا کا یہ پہلا خط تھا، جو انہوں نے اپنی اہلیہ کو لکھا۔

مجھ سمیت بہت سے لوگ اب تک اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے کہ اگر خدا لالو چچا کو پہلا لڑکا چھٹن کی صورت میں نہ دیتا تو وہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو کس نام سے پکارتے۔ چچا کو جب اپنی بیگم کو بلانا ہوتا تو زور سے پکارتے، "ارے چھٹن کی اماں سنتی ہو۔" اور اسی طرح جب چچی کو اپنے کسی مطلب کے لیے چچا 'مطلوب' ہوتے تو وہ زور سے ہانک لگاتیں، "ارے چھٹن کے ابا! رہیں۔ اب [illegible]

بنتے ہو۔“ آخر میں نے ہمت کر کے ایک دن چچا سے پوچھ ہی ڈالا کہ ”چچا! جب تک چھٹن پیدا نہیں ہوا تھا، آپ دونوں ایک دوسرے کو کس طرح بلاتے تھے۔“ چچا پہلے تو میری اس بے تکلفی پر ذرا برہم ہوئے، ”ارے میاں تم کون ہوتے ہو، ہمارے خانگی معاملات میں دخل دینے والے۔“ مگر جب ہم نے محلے داری اور دوستی کا واسطہ دیا اور وعدہ کیا کہ ہم یہ راز کسی کو نہیں بتائیں گے تو چچا نے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر نظریں چراتے ہوئے بڑے ہی شرمیلے لہجے میں بولے، ”میاں آج کل کے لونڈے اپنی بیویوں سے کیا محبت کریں گے، جو ہم نے کی تھی۔ نئی نئی شادی ہوئی تو ہم ہر وقت اتنے قریب رہتے تھے کہ ایک دوسرے کو کبھی آواز دینے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ یہ کہہ کر چچا کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگے اور مجبوراً مجھے بھی اُن کا ساتھ دینا پڑا۔

لالو چچا ہمارے محلے کی مشہور اور دلچسپ شخصیت تھے۔ اگرچہ انہیں محلے میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، مگر پھر بھی نئے آنے والے کو اُن کا مکان تلاش کرنے میں قطعاً دقت نہیں ہوتی تھی۔ چچا کی شہرت کی ایک وجہ تو اُن کے بچوں کی فوج ظفر موج تھی اور دوسری ان کی شخصیت۔ چچا کے موجود گیارہ بچے چچی سے محبت کا زندہ ثبوت تھے، جب کہ چھ عدد ثبوت چھ خطرناک بیماریوں کی نظر ہو کر رخصت ہو چکے تھے۔ اس پر چچا اکثر ایک مقولہ دہراتے، ”ابے گھر کے نہ مرتے تو فوج ہو جاتی!“

یعنی بچوں کی موجودہ تعداد اُن کے نزدیک کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔ محلے کے لوگ اکثر انہیں مشورہ دیا کرتے تھے کہ آپ ایک ٹیم بنا ڈالیں اور چچا بات کو مذاق میں ٹال دیتے۔ لیکن ایک دن کسی منچلے نے رات کو چچا کے گھر کے دروازے پر لکھ دیا:

”چچا الیون کرکٹ کلب“

بجائے اس کے کہ چچا خاموشی سے اسے مٹا دیتے صبح اُٹھ کر انہوں نے سارا محلّہ سر پر اُٹھا لیا۔ ایک ایک کو پکڑ پکڑ کر پوچھتے، ”ابے یہ کس نے لکھا ہے؟ مجھے ذرا معلوم پڑ جائے، چھوڑنے کا نہیں۔“ اس طرح جسے خبر نہیں تھی اُسے بھی پتا چل گیا۔

چچا تھے تو بالکل دھان پان سے، مگر آواز بڑی گرج دار پائی تھی۔ اپنے بچوں پر چیختے تو چار مکان پرے کا بچہ بھی سہم جاتا۔ نہ معلوم یہ ڈاک خانے میں کام کرنے کا اثر تھا، یا اُن کی فطرت کہ

[illegible]

چچا خط لکھنے کے بڑے رسیا تھے۔ کہیں کسی کی شادی ہو، خواہ وہ دعوت دے نہ دے، کسی کی مرگ ہو جائے، ہر ایک کے دُکھ درد میں بذریعہ خط ضرور شرکت کرتے۔ خاص طور پر شادی کارڈ پر لکھے ہوئے 'ج، س، م، ف' یعنی "جواب سے مطلع فرمائیں" کا تو وہ ضرور جواب دیتے۔

چچا کو اپنا لکھا ہوا خط سنانے کا بھی اتنا ہی شوق تھا، جتنا لکھنے کا۔ انہیں اس بات پر فخر تھا کہ وہ نہ صرف خط بہت اچھا لکھتے ہیں، بلکہ اس میں مزاح نگاری بھی بڑے پائے کی کرتے ہیں، لہٰذا کسی غیر معروف شاعر کی طرح اپنا لکھا ہوا طویل خط جب تک اپنی بیگم یا دو چار بچوں کو نہ سنا لیتے، پوسٹ نہ کرتے۔ آٹھ جماعت پڑھے ہونے کی وجہ سے چچا کی اُردو بھی کوئی ایسی خاص نہ تھی اور کچھ زیادہ بے خاص بھی نہ تھی، لیکن مرزا ہونے کے ناتے ہمیشہ اپنے آپ کو غالبؔ کا رشتہ دار ٹھہراتے اور رشتہ پوچھنے پر بتاتے کہ غالبؔ ان کے پردادا کے سگے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ چچا ایک اور بات پر بھی فخر کیا کرتے تھے کہ وہ دیوانِ غالبؔ کے مکمل حافظ ہیں۔ اپنی گفتگو میں جا بجا اشعار کو توڑ مروڑ کر زبردستی گھسیٹ لاتے، مگر اُن کے حافظے کی دسترس چار اشعار سے کبھی آگے نہ بڑھی تھی۔

چچا کی طبیعت میں انتہا پرستی کو بھی بہت دخل تھا، یہی وجہ تھی کہ انہیں سردی بھی بے حد لگتی تھی اور گرمی بھی۔ سردیوں میں صبح دفتر جاتے تو بلاشبہ تین سوئیٹر، دو کوٹ اور پھر اُن کے اوپر اوور کوٹ۔ اسی طرح نیچے گرم پاجامہ اور پھر پتلون۔ گلے میں مفلر اور سر پر گرم ٹوپی پہن کر نکلتے تو لگتا کہ لنڈے بازار میں گرم کپڑوں کی گانٹھ خود بخود چلی جا رہی ہے۔ گرمی ہوتی تو خالی نیکر پہن کر دروازے کے باہر چھڑکاؤ شروع کر دیتے۔ یوں معلوم ہوتا جیسے کسی نے مرغے کے پر نوچ کر دکان پر لٹکا دیا ہو اور چچا کے قریب ایک چھوٹے سے بورڈ کی شدید کمی محسوس ہوتی جس پر لکھا ہو "برائلر -/26 روپے کلو۔"

چچا ریٹائر ہوئے تو سوچا کہ بے کار رہنے سے بہتر ہے کوئی نہ کوئی کام کیا جائے، چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ جو تھوڑا بہت پیسہ ملا ہے، اس سے محلے میں جنرل اسٹور کھول لیا جائے، لہٰذا چند ہی روز بعد محلے میں ایک چھوٹی سی دکان کے اوپر ایک بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا:

"مرزا بیکرز، کنفیکشنرز اینڈ ڈیپارٹمنٹل اسٹور... پروپرائٹر: مرزا لال بیگ"

کچھ تو چچا کی شخصیت 'عجائبِ روزگار' کی سی تھی، رہی سہی کسر اُن کے نام نے پوری کر دی تھی، لہٰذا دن میں کئی مرتبہ کوئی نہ کوئی منچلا دو چار آوازیں ضرور لگا دیتا: "چچا ڈی ڈی ٹی ہے؟ [illegible]

ہے؟ ہمارے گھر میں لال بیگ بہت ہوگئے ہیں۔" اور چچا صرف تلملا کر رہ جاتے۔

محلے کے بے کار لڑکوں کو چچا اور اُن کی دکان کی صورت ایک اچھا خاصا اڈا اور مصروفیت مل گئی تھی۔ سارا دن چچا کی دکان پر لڑکوں کا رش لگا رہتا، جو کہ چچا کی کمزوری کو اچھی طرح تاڑ گئے تھے اور اُن کے عہدِ شباب کی رومانی داستانیں سن کر انہیں رومیو اور فرہاد سے بھی چار ہاتھ آگے پہنچا دیتے، جس کے بدلے میں انہیں سگریٹ آسانی سے اُدھار مل جاتے۔

ایک دفعہ ماہِ رمضان میں بیسویں روزے کی بات ہے، عصر کی نماز کے بعد مَیں کمرے میں آرام کر رہا تھا کہ گلی میں ایک بے ہنگم سا شور اُٹھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو چچا چیخ چیخ کر بچوں کو مختلف ہدایات دے رہے تھے اور چچا کے بچے سامان ہاتھ میں لیے دوڑے چلے جا رہے تھے۔ کسی نے لحاف اُٹھایا ہوا ہے، کسی نے تکیے، کوئی ٹیبل لیمپ اُٹھائے دوڑا جا رہا ہے تو کسی نے تھیلا لٹکایا ہوا ہے۔ میں نے سوچا شاید چچا مکان چھوڑ کر جا رہے ہیں، کیوں کہ وہ آئے بھی اسی طوفانِ بدتمیزی کے ساتھ تھے۔ سوچا، چل کر مصافحہ کر لیا جائے، مگر نیچے اُتر کر پتا چلا کہ چچا اعتکاف میں بیٹھنے جا رہے ہیں، لیکن ساز و سامان سے ایسا لگتا تھا کہ گویا قارون کا خزانہ کسی دوسری جگہ منتقل ہو رہا ہے! یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ چچا گھر سے باہر نکلے تو تمام بچے، چچی اور بے شمار عزیز و اقارب انہیں دروازے پر اِس طرح رخصت کرنے آئے، گویا وہ سفرِ آخرت پر روانہ ہو رہے ہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور مبارک باد دی تو عاجزی سے بولے، "ارے چھوڑو میاں!

عمر تو اپنی کٹ گئی عشقِ بتاں میں مرزا
آکھری وخت میں کیا کھاک مسلم ہوویں گے

مومنؔ کے شعر کی یہ درگت بنتی دیکھی تو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ بس دل ہی دل میں مومنؔ کی رُوح کے ایصالِ ثواب کے لیے فاتحہ خوانی کر ڈالی۔ چچا نے کسی نیم ملا سے یہ سن لیا تھا کہ اعتکاف میں بات بالکل نہیں کر سکتے، کوئی ضروری پیغام ہو تو لکھ کر دیا جا سکتا ہے۔ چہرے کو زیادہ سے زیادہ دنیا سے چھپایا جائے۔ لہٰذا یہ دو چار اُلٹے سیدھے مسئلے ذہن نشین کر لیے اور ایمان کو خطرے میں ڈال کر عازمِ اعتکاف ہو گئے۔

چچا کو جہاں اس بات پر ناز تھا کہ وہ خاندانِ غالبؔ کے ٹمٹماتے چراغِ سحر ہیں، وہاں اس

انور احمد علوی

بات پر بھی فخر تھا کہ انہوں نے انگریز سرکار کی براہِ راست ماتحتی کی ہے، لہٰذا جب چچی اور بچے ان کے ماتحت آئے تو اُنہوں نے ان کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھا جو کبھی انگریزوں نے چچا کے ساتھ کیا ہوگا۔ ٹھیک صبح سات بجے ناشتا میز پر۔ کرسی کی جگہ ہمیشہ چارپائی استعمال ہوتی۔ دوپہر کا کھانا ایک بجے اور آٹھ بجے رات کا۔ دفتر میں نہ ایک منٹ پہلے داخل ہوتے اور نہ دو منٹ بعد میں نکلتے۔ ایک مرتبہ پانچ منٹ پہلے دفتر پہنچ گئے تو برآمدے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ کسی نے پوچھا تو بولے، ''میاں! ابھی دفتر شروع ہونے میں پانچ منٹ ہیں۔'' اگر کسی وقت کھانا، یا اُن کا کوئی ماتحت لیٹ ہو جاتا تو چچا مصیبت کھڑی کر دیتے۔

چچا کا چھوٹے سے چھوٹا سفر گھر سے دفتر تک تھا جو کہ چالیس سال سے بھی زیادہ عرصہ رہا، مگر اِس سفر میں بھی وہ اپنا ساز و سامان ساتھ رکھتے۔ ایک چھوٹا سا بیگ ہمیشہ ان کے جسم کا حصہ ہوتا، جسے اکثر لوگ عمرو عیار کی زنبیل کہا کرتے تھے اور اُس میں نمک دانی سے لے کر چھوٹے چاقو کے علاوہ پینسل، ربڑ شاپنر، دوائیاں، گولیاں، سیرپ، سعالین، جوشاندہ اور نجانے کیا کیا ہوتا۔ لہٰذا چچا جب اعتکاف میں بیٹھنے کے لیے مسجد میں جانے لگے تو اُنہوں نے اپنی کسی بھی ایک چیز یا عادت کو گھر چھوڑنا مناسب نہ سمجھا، تاکہ عبادت میں خلل نہ پڑے۔ لیکن ڈیڑھ گھنٹے بعد جو اُنہوں نے پہلا خط اپنی بیگم کو لکھا تو پتا چلا کہ چچا جسمانی طور پر اعتکاف میں بیٹھ چکے ہیں۔

روزہ کھولنے کے بعد مغرب کی نماز کے لیے جب مسجد میں گیا تو چچا چادر تان کر روپوش ہو چکے تھے۔ نماز کی تکبیر ہو چکی تو منہ پر ڈھاٹا لپیٹے باہر نکلے۔ ناک کے پاس تھوڑا کپڑا اِس لیے کھلا رکھا گیا تھا کہ زندگی کی آس باقی رہے۔ اسی میں سے دیکھنے کا کام بھی لیا جا رہا تھا اور چچا بار بار چہرے کے رومال کو اِس طرح ٹھیک کر رہے تھے، جیسے بلوغت کے ابتدائی دور میں لڑکی دوپٹے کو سنبھالتی پھرتی ہے۔ سلام پھیرتے ہی بقیہ نماز کے لیے چچا اندر بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں نے پردے کا کونا سرکا کر دیکھا تو آنکھیں حیرت کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ آج تک تاریخ کی کتابوں میں سپہ سالاروں کے خیموں کی سجاوٹ کے متعلق پڑھا تھا اور آج پہلی مرتبہ دیکھ بھی رہا تھا۔

چچا نے جان بوجھ کر مسجد کا وہ کونا منتخب کیا تھا کہ ایک الماری بھی ان کے پردوں کی زد میں آ گئی تھی۔ صاف ستھرا نفیس بستر، ریشمی رضائی، گاؤ تکیہ، الماری میں سب سے اوپر قرآن اور رحل رکھی ہوئی تھی۔ نیچے والے خانے میں قطار اندر قطار اُودے اُودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے، دواؤں کے

رنگِ ادب پبلی کیشنز

ڈبے اور شیشیاں۔ اِس سے نیچے والے خانے میں گلوکوز اور اوولٹین کے ڈبے، چائے کا تھرماس، گلاس، چمچہ اور نجانے کیا کیا کچھ۔ ایک طرف کونے میں لوٹا اور خوشبودار صابن، الماری کی کنڈی سے تولیہ لٹک رہا تھا اور قرآن مجید پڑھنے کے لیے ٹیبل لیمپ اور گرم کپڑوں سے بھری ایک ٹوکری۔ کسی شخص کو بات کرنے یا اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ چھٹن کو بھی خاص ہدایت تھی کہ کھانے کی ٹرے بس پردہ اُٹھا کر اندر سرکا دے۔ کوئی بات کرنی ہو تو لکھ کر بھیج دے اور اسی طرح چچا بھی مختلف ہدایات لکھ کر ٹرے میں رکھ دیتے۔ اگلے دن صبح شامتِ اعمال چھٹن کو سحری لانے میں دیر ہو گئی۔ سحری ختم ہونے سے کوئی دس منٹ قبل چھٹن نے ٹرے اندر سرکائی تو چچا تو جیسے تاڑ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ زور سے ایک جوتی چھٹن کے ہاتھ پر دے ماری اور وہ بے چارہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ یہ غصے کا خاموش اظہارِ خیال تھا! جیسے تیسے سحری کھائی، نماز پڑھی اور بذریعہ چٹھی چھٹن کی ماں کی کھنچائی کر ڈالی:

اَز اعتکاف، جامعہ مسجد رحمانیہ
22 رمضان المبارک

عزیز چھٹن کی اماں... خدا تمہیں سکھی رکھے!

خدا ہی تمہارا سہاگ قائم رکھے تو رکھے، مگر تم اس سلسلے میں کوئی خاطر خواہ دلچسپی لیتی دکھائی نہیں پڑتیں۔ غضب خدا کا، ابھی گھر سے نکلے ایک روز بھی نہیں ہوا کہ تمہارے دیدوں میں ایسی ہوا گھسی کہ میرے کھانے پینے تک کا ہوش جاتا رہا۔ تمہیں پتا ہے کہ میں شوگر کا مریض ہوں۔ ذرا کھانے میں دیر ہو جائے تو دل بیٹھنے لگتا ہے۔ کیوں میری جان لینے پر تلی ہوئی ہو۔ اگر تمہاری نظروں میں اتنا ہی کھٹکنے لگا ہوں تو ویسے ہی بول دو، تھوڑا سا سنکھیا پھانک لوں گا۔ کان کھول کر سن لو! آخری بار کہے رہا ہوں، آئندہ ٹھیک وقت پر روٹی نہ بھجوائی تو میکے بھجوا دوں گا۔ پیٹ خالی ہو تو ٹھیک طرح سے عبادت بھی نہیں ہوتی۔ دھیان کمبخت معدے کی طرف ہی لگا رہتا ہے۔ اچھا میں طویل بات کرنے کا عادی نہیں ہوں، ویسے بھی حالتِ اعتکاف میں ہوں۔ خدا حافظ!

مرزا لال بیگ

چچی نے جو پرچہ پڑھا تو رو رو کر سارا محلہ سر پر اُٹھا لیا، ”ہائے ہائے، ساری زندگی کی خدمت کا یہ صلہ دیا ہے کہ ایک وقت کی روٹی کو دیر ہو گئی تو طلاق کی دھمکی دے دی۔ ارے میری حیثیت ہی

کیا ہے اس گھر میں، نوکروں کی بھی عزت ہوگی۔ مجھ قسمت کی ماری کو کون پوچھتا ہے۔" پھر جیسے تیسے یہ معاملہ رفع دفع ہوا اور اگلی صبح چھٹن سحری کے برتن واپس لینے گیا تو ٹرے میں ایک پرچہ پڑا تھا، جس کا مضمون اور انداز بتا رہا تھا کہ چچا کا غصہ ابھی دُور نہیں ہوا۔

از اعتکاف، جامعہ مسجد رحمانیہ

23 رمضان المبارک

بنام چھٹن کی اماں!

میں مرزا لال بیگ بذریعہ تحریر تمہیں مطلع کرتا ہوں کہ رات فرش پر سونے کی وجہ سے اور شدید سردی کے باعث میری کمر اکڑ گئی ہے اور کچھ حرارت بھی ہوگئی ہے، لہٰذا حکم دیا جاتا ہے کہ ایک عدد چارپائی، جو پچھلے دنوں میں نے نئی بنوائی تھی، بھجوا دی جائے۔ خیال رہے کہ اُس کی ادوائن اگر ڈھیلی ہو تو کسوا دی جائے۔ ایک عدد اینٹ بھی گرم کر کے بھجوا دی جائے، میں کمر کی سنکائی کروں گا۔ روزے کے بعد دو عدد پیرا سیٹا مول کی گولیاں کھا لوں گا۔ رات نماز کے بعد ایک کپ جوشاندہ بھجوا دیا جائے... اور ہاں، اپنے محلے میں ہیں ناں وہ ڈاکٹر فضل دین ہومیو پیتھک والے، چھوٹے کو اُن کے پاس بھجوا دو۔ ان سے میرا اسلام بولے، کہے کہ ابا اعتکاف میں بیٹھے ہیں، میری حالت بتا کر دوائی لے آئے۔ دوائی صرف ایک دن کی لائے۔ تین روپے کی دے گا، اس سے زیادہ پیسے ہرگز مت دینا۔ اچھا اب باقی باتیں لکھتے ہوئے مجھے حیا آتی ہے۔ خدا کے دربار میں دنیاوی باتیں کیا کرنا، تم خود ہی کچھ خیال کرو اور تھوڑے لکھے کو زیادہ سمجھو۔

فقط والسلام

مرزا لال بیگ

مسجد ابھی چوں کہ زیرِ تعمیر تھی، اس لیے وہاں رفع حاجت کا کوئی اچھا بندوبست نہ تھا۔ بذریعہ خط گھر یہ اطلاع دی گئی اور پروگرام طے پایا کہ صبح سحری سے پہلے چچا گھر آئیں گے اور بغیر کسی سے بات چیت کیے چپکے سے اوپر چلے جائیں گے اور اپنی حاجت روائی کے فوراً بعد خاموشی سے باہر نکل جائیں گے، لہٰذا تیسرے دن جب چچا رات دو بجے منہ اندھیرے منہ لپیٹے مسجد سے باہر نکلے تو گلی کے نکڑ پر چوکیدار سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ چوکیدار نے زور سے آواز لگائی، "او خوچہ کون ہے بھئی؟" چچا نے

چہرہ تولپیٹا ہوا تھا، منہ سے بھی کچھ نہ بولے تو چوکیدار بھی پیچھے چل پڑا اور پھر زوردار آواز میں رکنے کے لیے کہا۔ اس مرتبہ چچا نے اسے ہاتھ کے اشارے سے سمجھانے کی کوشش کی اور منہ سے اوں! اوں! کی آواز نکالی اور رفتار تیز کر دی۔ اُدھر چوکیدار غصّے میں آ گیا۔ اس نے جو اپنا ڈنڈا سیدھا کیا تو چچا نے دوڑ لگا دی۔ اُدھر چوکیدار نے بھی چور چور کا شور بلند کر کے بھاگنا شروع کر دیا۔ چچا نے زور زور سے اپنے گھر کا دروازہ پیٹنا شروع کیا تو چچی نے فوراً کنڈی کھول دی۔ اس اثنا میں بہت سے محلے والے بھی جاگ گئے اور چوکیدار بھی سر پر پہنچ گیا، جس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے ایک ڈنڈا جو گھمایا تو چچا چاروں شانے چت ڈیوڑھی میں یوں پڑے تھے، جیسے کسی نے کینچوے پر نمک ڈال دیا ہو۔ بڑی مشکل سے چوکیدار کو روکا اور چچی نے سب کو بتایا تو لوگوں کو اطمینان ہوا۔

چچا واپس چلے گئے، مگر چچی نے ازراہِ ہمدردی سحری میں دودھ کے ساتھ نمکین جلیبیاں بھجوا دیں اور ایک اینٹ بھی گرم کر کے رکھ دی کہ جہاں چوکیدار کا ڈنڈا لگا ہو سینک لیں۔ یہ دونوں چیزیں دیکھ کر چچا کی تکلیف، ناراضی اور غصہ تو جیسے کافور ہو گیا۔ سحری کے برتنوں کے ساتھ شکریے کا ایک جوابی پرچہ رکھا ہوا تھا۔

25 رمضان المبارک

اُز اعتکاف، جامعہ مسجد رحمانیہ

میرے پیارے چھٹن کی اچھی اماں... سدا سہاگن رہو!

بخدا تم اگر اس طرح میرا خیال نہ کرتیں تو کبھی کی بیوہ ہو چکی ہوتیں۔ تمہیں یاد ہے تم شروع شروع میں مجھے کس قدر تنگ کیا کرتی تھیں۔ خیر، ہم بھی آخر کو کھلاڑی تھے، تمہیں منا ہی لیا کرتے تھے۔ ارے لاحول ولا قوۃ میں بھی کن باتوں میں لگ گیا، خیال ہی نہ رہا کہ اعتکاف میں بیٹھا ہوں۔ دیکھ لو تمہارے تصور نے تو خدا سے بھی غافل کر دیا۔ اس کمبخت چوکیدار کو ذرا دن میں بلا کر دو چار سنا دینا اور دیکھنا، کہیں اتنا مت ڈانٹ دینا جتنا کہ مجھے... کیوں کہ ہر ایک میں اتنی ہمت کہاں ہوتی ہے۔ گرم اینٹ کا بہت شکریہ۔ کمبخت نے ایسا تاک کر نشانہ مارا کہ ابھی تک پڑ پڑی درد کر رہی ہے۔ شام کو دودھ گرم کر کے بھیج دینا۔ اوولٹین میرے پاس رکھا ہوا ہے۔ ماسٹر جی کو عید کے کپڑے سلنے کو دیے ہوئے ہیں، وہ منگوا لینا اور چوہدری صاحب میری دکان سے کافی سارا سودا

اور ادھار

ادھار لے گئے تھے۔ کہتے تھے ستائیسویں روزے کے بعد ادائیگی کریں گے۔ گڈو کو بھیجنا کر پیسے لے آئے۔ ان کے حساب کی کاپی میری الماری میں رکھی ہوئی ہے اور الماری کی تالی یا تو شیشے کے پیچھے ہوگی یا پھر تلے دانی کے اندر۔ کاپی نکالو تو گم مت کر دینا اور بھی بہت سوں کا حساب اس میں لکھا ہے۔ چھٹن سے بولنا کہ دکان تھوڑی دیر کے لیے کھول لیا کرے اور ”اُدھار قطعی بند ہے“ کا بورڈ ضرور لٹکا لے۔ چھوٹے سے کہہ دینا کہ زیادہ دنگا مت کیا کرے، ورنہ آ کر چمڑی اُدھیڑ دوں گا۔ میرا خیال ہے باقی کام تم خوب سنبھال لوگی۔ مجھے تو یہ باتیں لکھتے وقت غیرت آتی ہے کہ خدا کے گھر میں عبادت کی نیت سے بیٹھ کر دنیا کے متعلق سوچنا بھی گناہ ہے۔ اچھا تو آئندہ میں زیادہ نہیں لکھنے کا۔ بچوں کا خیال رکھنا۔ خدا حافظ۔

فقط تمہارا

مرزا لال بیگ

چچا روز خط کے اوپر تاریخ ڈال کر اعتکاف میں بیٹھے، ایک ایک دن گن رہے تھے۔ روزانہ کسی نہ کسی بہانے لمبا چوڑا خط لکھ ڈالتے۔ کبھی شکوہ شکایت، تو کبھی شکریہ اور پیار محبت، لیکن چچی کو محبت شاید راس ہی نہیں آئی تھی۔ ذرا چچا کا موڈ ٹھیک ہوتا اور اُن کے منہ سے کوئی نہ کوئی ایسی بات نکل جاتی کہ چچا خواہ مخواہ بگڑ جاتے۔ اٹھائیسویں روزے کو چچا کے کسی قریبی عزیز کے بچے کا روزہ رکھوایا جا رہا تھا۔ چچی کی جو شامت آئی تو اُنہوں نے چچا سے مشورے کا رُخ کیا اور ایک کاغذ پر مختصر سا جملہ لکھوا بھیجا کہ شمو کے لڑکے کی روزہ کشائی ہے، کیا دینا چاہیے؟ چچا نے جواب دیا تو چچی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

27 رمضان المبارک

از اعتکاف، جامعہ مسجد رحمانیہ

چھٹن کی ماں!

تم بھی کمال کرتی ہو۔ اوّل تو تم بالکل جاہل ہو اور اگر دو چار جماعت پڑھ لکھ بھی جاتیں تو تمہیں کون سی عقل آ جاتی۔ میں اعتکاف میں بیٹھا ہوں، بھلا یہ باتیں مجھ سے پوچھنے کی ہیں۔ مگر ہو تم بھی بہت ہوشیار۔ معاملہ میرے رشتہ داروں کو دینے کا آیا تو مجھ سے مشورہ کر رہی ہو اور وہ بھی

ایسے وقت جب میں خدا کے حضور سجدہ ریز ہوں۔ جب تمہاری بہن کی بیٹی کا بیاہ تھا، کیا مجھ سے پوچھا تھا؟ چھکواں چوری پیسے اِدھر سے اُدھر کردیے تھے اور جب شبن کے بیٹے کی مسلمانیاں ہوئی تھیں تو کیا مجھ سے مشورہ لیا تھا؟ خاموشی سے پچاس روپے دے کر مجھے پچیس کا غچہ دے دیا تھا، لیکن دیکھ لو ہماری بھی جاسوسی۔ آخر ہمیں پتا چل ہی گیا تھا۔

میں بات زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا۔ آج ستائیسویں رات ہے اور مجھے عبادت بھی کرنا ہے۔ تم تو خاصی زمانہ شناس اور چالاک عورت ہو۔ ماشاء اللہ حرفوں کی بنی ہوئی ہو۔ موقع محل تاڑ لینا اور جتنے کتنے لوگ دے رہے ہوں، تم بھی مناسب دے ڈالنا اور آئندہ مجھ سے ایسے سوالات مت کرنا۔ تمہیں پتا ہونا چاہیے میں حالتِ اعتکاف میں ہوں۔ اللہ سے لَو لگائی ہوئی ہے۔ مجھے تو دنیاوی بات کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ جب تارک الدنیا ہو گیا تو دنیاوی باتوں سے مجھے کیا مطلب؟

فقط تمہارا

مرزا لال بیگ

* * *

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ!

سیّد سجاد حیدر یلدرم

ایک دن میں دلّی کے چاندنی چوک سے گزر رہا تھا کہ میری نظر ایک فقیر پر پڑی، جو بڑے مؤثر طریقے سے اپنی حالتِ زار لوگوں سے بیان کرتا جا رہا تھا۔ دو تین منٹ کے وقفہ کے بعد یہ درد سے بھری اسپیچ اُنہی الفاظ اور اُسی پیرایہ میں دہرا دی جاتی تھی۔ یہ طرز کچھ مجھے ایسا خاص معلوم ہوا کہ میں اُس شخص کو دیکھنے اور اُس کے الفاظ سننے کے لیے ٹھہر گیا۔ اُس فقیر کا قد لمبا، جسم خوب ہٹا تازہ تھا۔ چہرہ ایک حد تک خوب صورت ہوتا، مگر بد معاشی اور بے حیائی نے صورت مسخ کر دی تھی۔ یہ تو اُس کی شکل تھی۔ رہی اُس کی صدا تو مَیں ایسا شقی القلب نہیں ہوں کہ صرف اُس کا مختصر سا خلاصہ لکھ دوں۔ وہ اِس قابل ہے کہ لفظ بلفظ لکھی جائے۔ چنانچہ وہ اسپیچ یا صدا جو کچھ کہیے یہ تھی:

’’اے بھائی مسلمانو خدا کے لیے مجھ بدنصیب کا حال سنو! میں آفت کا مارا، سات بچوں کا باپ ہوں، اب روٹیوں کو محتاج ہوں اور اپنی مصیبت ایک ایک سے کہتا ہوں۔ میں بھیک نہیں مانگتا، میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے وطن کو چلا جاؤں، مگر کوئی خدا کا پیارا مجھے گھر بھی نہیں پہنچاتا۔ بھائی مسلمانو! میں غریب الوطن ہوں، میرا کوئی دوست نہیں، ہائے میرا کوئی دوست نہیں! اے خدا کے بندو میری سنو! میں غریب الوطن ہوں۔

فقیر تو یہ کہتا ہوا اور جن پر اُس کے قصّے کا اثر ہوا، اُن کی خیرات لیتا ہوا آگے بڑھ گیا، لیکن میرے دل میں چند خیالات پیدا ہوئے اور میں نے اپنی حالت کا مقابلہ اُس سے کیا۔ مجھے خود تعجب ہوا کہ اکثر اُمور میں مَیں نے اُس کو اپنے سے اچھا پایا۔ یہ صحیح ہے کہ میں کام کرتا ہوں اور وہ مفت خوری سے دن گزارتا ہے۔ نیز یہ کہ میں نے تعلیم پائی ہے، وہ جاہل ہے۔ میں اچھے لباس میں رہتا ہوں، وہ پھٹے کپڑے پہنتا ہے۔ بس یہاں تک میں اُس سے بہتر ہوں۔ آگے بڑھ کر اُس کی حالت مجھ سے بدرجہا اچھی ہے۔ اُس کی صحت پر مجھے رشک کرنا چاہیے۔ میں رات دن فکر میں

گزارتا ہوں، وہ ایسے اطمینان سے بسر کرتا ہے کہ باوجود بسورنے اور رونے کی صورت بنانے کے، اُس کے چہرے سے بشاشت نمایاں تھی۔ بڑی دیر تک غور کرتا رہا کہ اُس کی یہ قابلِ رشک حالت کس وجہ سے ہے؟ آخر کار میں اِس (بظاہر عجیب) نتیجے پر پہنچا کہ جسے وہ مصیبت خیال کرتا ہے، وہی اُس کے حق میں نعمت ہے۔ وہ حسرت سے کہتا ہے کہ میرا کوئی دوست نہیں، میں حسرت سے کہتا ہوں، میرے اتنے دوست ہیں۔ اُس کا کوئی دوست نہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو اُسے مبارک باد دینی چاہیے۔ میں اپنے دل میں یہ باتیں کرتا ہوا مکان پر آیا۔ کیسا خوش قسمت آدمی ہے۔ کہتا ہے، میرا کوئی دوست نہیں۔ اے خوش نصیب شخص! یہیں تو تُو مجھ سے بڑھ گیا... لیکن کیا اُس کا یہ قول صحیح بھی ہے؟ یعنی کیا اصل میں اُس کا کوئی دوست نہیں، جو میرے دوستوں کی طرح اُسے دن میں پانچ منٹ کی بھی فرصت نہ دے۔ میں اپنے مکان پر ایک مضمون لکھنے جا رہا ہوں، مگر خبر نہیں کہ مجھے ذرا سا بھی وقت ایسا ملے گا کہ میں تخلیے اپنے خیالات جمع کرسکوں اور اُنہیں اطمینان سے قلمبند کرسکوں، یا جو اسپیچ مجھے کل دینی ہے، اُسے سوچ سکوں۔ کیا یہ فقیر دن دہاڑے اپنا روپیہ لے جاسکتا ہے اور اُس کا کوئی دوست راستہ میں نہ ملے گا اور یہ نہ کہے گا، بھائی جان! دیکھو پرانی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں، مجھے اِس وقت ضرورت ہے، تھوڑا سا روپیہ قرض دو۔ کیا اُس کے احباب وقت بے وقت اُسے دعوتوں اور جلسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے۔ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اُسے نیند کے جھونکے آرہے ہوں، مگر یار دوستوں کا مجمع ہے، جو قصے پر قصہ اور لطیفے پر لطیفہ کہہ رہے ہیں اور اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ کیا اُسے دوستوں کے خطوط کا جواب نہیں دینا پڑتا؟ کیا اُس کے پیارے دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب نہیں، جو اُسے خواہ مخواہ پڑھنی پڑے اور ریویو لکھنا پڑے؟ کیا اُسے احباب کی وجہ سے شور مچانا اور ہُوحق کرنا نہیں پڑتا؟ کیا دوستوں کے ہاں ملاقات کو اُسے جانا نہیں پڑتا اور اگر نہ جائے تو کوئی شکایت نہیں کرتا؟ اگر اِن سب باتوں سے وہ آزاد ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ ہٹا کٹا ہے اور میں نحیف و نزار ہوں۔ یا اللہ! کیا اِس پر بھی وہ شکر ادا نہیں کرتا۔ خدا جانے وہ اور کون سی نعمت چاہتا ہے؟ لوگ کہیں گے کہ اِس شخص کے کیسے بیہودہ خیالات ہیں! بغیر دوستوں کے زندگی دوبھر ہوتی ہے اور یہ اُن سے بھاگتا ہے۔ میں دوستوں کو بُرا نہیں کہتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے خوش کرنے کے لیے میرے پاس آتے ہیں اور میرے خیر طلب ہیں، مگر عملی نتیجہ یہ ہے کہ احباب کا ارادہ ہوتا ہے مجھے فائدہ پہنچانے کا اور ہو جاتا ہے مجھے نقصان۔ چاہے مجھ پر نفرین

کی جائے، مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج تک میرے سامنے کوئی یہ ثابت نہ کرسکا کہ احباب کا ایک جمِ غفیر رکھنے اور شناسائی کے دائرے کو وسیع کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر دنیا میں کچھ کام کرنا ہے اور باتوں ہی میں عمر نہیں گزارنی ہے تو بعض نہایت عزیز دوستوں کو چھوڑنا پڑے گا، چاہے اس سے میرے دل پر کیسا ہی صدمہ ہو۔ مثلاً،

میرے دوست احمد مرزا ہیں، جنہیں میں بھڑ بھڑیا دوست کہتا ہوں۔ یہ نہایت معقول آدمی ہیں اور میری اُن کی دوستی نہایت پرانی اور بے تکلفی کی ہے، مگر حضرت کی خلقت میں یہ داخل ہے کہ دو منٹ نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ جب آئیں گے شور مچاتے ہوئے، چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے۔ غرض کہ اُن کا آنا بھونچال کے آنے سے کم نہیں ہے۔ جب وہ آتے ہیں تو میں کہتا ہوں، کوئی آرہا ہے، قیامت نہیں ہے۔ اُن کے آنے کی مجھے دُور سے خبر ہو جاتی ہے، باوجود یہ کہ میرے لکھنے پڑھنے کا کمرہ چھت پر ہے۔ اگر میرا نوکر کہتا ہے کہ میاں اِس وقت کام میں بہت مشغول ہیں تو وہ فوراً چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ کم بخت کو اپنی صحت کا بھی تو کچھ خیال نہیں (نوکر کی طرف مخاطب ہو کر) خیراتی! کب سے کام کر رہے ہیں؟ بڑی دیر سے؟ توبہ توبہ! اچھا بس میں ایک منٹ اُن کے پاس بیٹھوں گا، مجھے خود جانا ہے۔ چھت پر ہوں گے نا، میں پہلے ہی سمجھتا تھا۔ یہ کہتے ہوئے وہ اُوپر آتے ہیں اور دروازہ اِس زور سے کھولتے ہیں کہ گویا کوئی گولہ آ کے لگا (آج تک اُنہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا نہیں) آندھی کی طرح داخل ہوتے ہیں:

”ہاہاہا! آخر تمہیں میں نے پکڑ لیا، مگر دیکھو، دیکھو، میری وجہ سے اپنا لکھنا بند مت کرو، میں حرج کرنے نہیں آیا۔ خدا کی پناہ، کس قدر لکھ ڈالا ہے۔ کہو طبیعت تو اچھی ہے؟ میں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا۔ واللہ مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے کہ میرے دوستوں میں ایک شخص ایسا ہے، جو مضمون نگار کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے۔ لو اب جاتا ہوں، میں بیٹھوں گا نہیں۔ ایک منٹ نہیں ٹھہرنے کا، تمہاری خیریت دریافت کرنی تھی، خدا حافظ۔“

یہ کہہ کے وہ نہایت محبت سے مصافحہ کرتے ہیں اور اپنے جوش میں میرے ہاتھ کو اِس قدر دبا دیتے ہیں کہ انگلیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور میں قلم نہیں پکڑ سکتا۔ یہ تو علیٰحدہ رہا، اپنے ساتھ میرے کُل خیالات کو بھی لے جاتے ہیں۔ خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر اب وہ کہاں؟ اور دیکھا جائے تو میرے کمرے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں رہے۔ تاہم، وہ اگر گھنٹوں

رہتے تو اِس سے زیادہ نقصان نہ کرتے۔ کیا میں اُنہیں چھوڑ سکتا ہوں؟ میں اِس سے انکار نہیں کرتا کہ میری اور اُن کی دوستی بہت پُرانی ہے اور وہ مجھ سے بھائیوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔ تاہم، میں اُنہیں چھوڑ دوں گا، ہاں چھوڑ دوں گا۔ اگرچہ کلیجے پر پتھر رکھنا پڑے۔

اور لیجیے، دوسرے دوست محمد تحسین ہیں۔ یہ بال بچوں والے صاحب ہیں اور رات دن اُنہی کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کبھی ملنے آتے ہیں تو تیسرے پہر کے قریب آتے ہیں، جب میں کام سے تو فارغ ہو چکتا ہوں، لیکن اس قدر تھکا ہوا ہوتا ہوں کہ دل یہی چاہتا ہے کہ ایک گھنٹہ آرام کرسی پر خاموش پڑا رہوں، مگر تحسین آئے ہیں اور اُن سے ملنا ضروری ہے۔ اُن کے پاس باتیں کرنے کے لیے سوائے اپنی بیوی بچوں کی بیماری کے اور کوئی مضمون ہی نہیں۔ میں کتنی ہی کوشش کروں، مگر وہ اس مضمون سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر میں موسم کا ذکر کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں، ہاں بڑا خراب موسم ہے، میرے چھوٹے بچے کو بخار آ گیا، منجھلی لڑکی کھانسی میں مبتلا ہے۔ اگر پالی ٹیکس یا لٹریچر کے متعلق گفتگو شروع کرتا ہوں تو تحسین صاحب فوراً معذرت پیش کرتے ہیں کہ بھائی آج کل گھر بھر بیمار ہے، مجھے اتنی فرصت کہاں کہ اخبار پڑھوں۔ اگر کسی عام جلسے میں آتے ہیں تو اپنے لڑکوں کو ضرور ساتھ لیے ہوتے ہیں اور ہر ایک سے بار بار پوچھتے رہتے ہیں کہ طبیعت تو نہیں گھبراتی، پیاس تو نہیں معلوم ہوتی،'' کبھی کبھی نبض بھی دیکھ لیتے ہیں۔ وہاں بھی کسی سے ملتے ہیں تو گھر کی بیماری ہی کا ذکر کرتے ہیں۔

ایک صاحب ہیں، جو مجھ سے کبھی نہیں ملتے، مگر جب آتے ہیں، میں اُن کا مطلب سمجھ جاتا ہوں۔ یہ حضرت ہمیشہ قرض مانگنے کے لیے آتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں، جو ہمیشہ ایسے وقت آتے ہیں جب میں باہر جانے والا ہوتا ہوں۔ ایک صاحب ہیں، جو جب مجھ سے ملتے ہیں کہتے ہیں، ''میاں! عرصہ سے میرا دل چاہتا ہے تمہاری دعوت کروں''، مگر کبھی اپنی خواہش کو پورا نہیں کرتے۔ ایک دوست ہیں، جو آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ جب میں جواب دیتا ہوں تو متوجہ ہو کر نہیں سنتے۔ یا تو اخبار اُٹھا کر پڑھنے لگتے ہیں، یا گانا گانے لگتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں، جو جب آتے ہیں اپنی ہی کہے جاتے ہیں، میری نہیں سنتے۔ اسی طرح میرے مقدمہ باز دوست ہیں، جن کے پاس اپنی ریاست کے جھگڑوں، اپنے فریق مخالف کی بُرائیوں اور جج صاحب کی تعریف یا مذمت کے سوا (تعریف اس حالت میں جب کہ انہوں نے مقدمہ جیتا

ہو) اور کوئی مضمون نہیں۔

اب چوں کہ میں نے یہ حال لکھنا شروع کر دیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور صاحب کے متعلق اپنے دلی خیالات ظاہر کروں۔ دروازے پر ایک گاڑی آ کے رُکی ہے، میں سمجھ گیا کہ کون صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ میں اُن کی شکایت نہیں کرنے کا، کیوں کہ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ تین گھنٹے سے میں یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ کسی کرم فرما نے کرم نہیں فرمایا، اس لیے اس کے شکریہ میں مَیں اس مضمون کو اِسی ناتمام حالت میں چھوڑتا ہوں اور اپنے دوست کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ دوست میری صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ جب آتے ہیں مجھ پر اِس وجہ سے ناراض ہوتے ہیں کہ تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔ میں جانتا ہوں کہ اِس وقت بھی یہ کسی نئے حکیم یا ڈاکٹر کا حال سنائیں گے، جو بڑا حاذق ہے، یا کوئی مجرب نسخہ میرے لیے کسی سے مانگ کر لائے ہوں گے۔

”آیئے آیئے،... مزاج عالی... بہت دن بعد تشریف لائے۔“

یہ سب میرے عنایت فرما اور خیر طلب ہیں، مگر اپنی طبیعت کو کیا کروں۔ صاف صاف کہتا ہوں کہ اِن میں سے ہر ایک سے کہہ سکتا ہوں:

مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا!

* *

دیوان صاحب

سیّد ضمیر جعفری

ہمارے سرشتہ کے نئے افسرِ اعلیٰ دیوان صاحب کا آج دفتر میں پہلا دن تھا وضع قطع تراش خراش، لباس وغیرہ ہر لحاظ سے وہ اعلیٰ درجے کے انگریز معلوم ہوتے تھے۔ البتہ ایک کان میں مہاراجہ گائیکواڑ کی طرح ایک چمکتا ہوا ہیرا اٹکا تھا۔ آنکھیں خوب صورت اور بڑی بڑی تھیں مگر کچھ خالی خالی، کچھ حیران حیران، جیسے آدمی بیٹھا کہیں ہو، دیکھ کہیں رہا ہو، جیسے دیکھتے ہوئے بھی کچھ دیر نہ دیکھتا ہو۔

سیکریٹری والی گھنٹی بجی تو میں حاضر ہوا:

”آپ کون ہیں؟“

”جناب میں آپ کا سیکریٹری ہوں۔“

”تو آپ سیکریٹری ہیں؟“

”جناب۔“

”تو آپ سیکریٹری ہیں۔“ دیوان صاحب نے پھر وہی جملہ دہرایا۔ مجھے سر سے لے کر پیر تک ایک تفصیلی نظر سے دیکھا... خیر! تو ٹھیک ہے مگر ایک بات آپ سن لیں کہ میرے ساتھ کام کرنا ایک مشکل کام ہے۔

”جناب! آپ ایسے خاندانی افسر کے ماتحت کام کرنا تو میری خوش نصیبی ہے!“

”آپ ایسا سمجھتے ہیں تو شکریہ۔“ وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگے، ”لیکن آپ مجھے عام آدمیوں سے بہت مختلف پائیں گے۔“

”جی۔“

”آپ کو میری طبیعت کو اچھی طرح سمجھنا ہوگا۔“

”جی! ہم تنخواہ ہی اس بات کی پاتے ہیں۔“

”سنیئے! جب میں بول رہا ہوں تو میں دوسرے کا بولنا پسند نہیں کرتا۔“

”چھٹی آپ اس روز جائیں گے جس روز ہم چھٹی پر ہوں گے۔ دفتر کی ساری مخلوق سے واسطہ رکھنا ہمیں پسند نہیں۔“

”بہت بہتر!“ مجھے خفیف سی کھانسی آ گئی۔

”میں لوگوں کے اس طرح کھانسنے کو سخت ناپسند کرتا ہوں اور دیکھیے آپ کو زکام بھی نہ ہونا چاہیے۔“

”بہت بہتر!“

”ہم صفائی، شائستگی، باقاعدگی اور خوش ذوقی کا اعلیٰ معیار چاہتے ہیں۔“

”جی۔“

”پھر سنیئے، صفائی! شائستگی! خوش ذوقی!... آپ نے بکنگھم پیلس تو دیکھا ہوگا۔“

”جی بس تصویریں ہی دیکھی ہیں۔“

”تو آپ انگلستان نہیں گئے۔“

”جی نہیں۔“

”اٹلی یا جرمنی۔“

”جی میں تو اسلامیہ کالج میں پڑھتا رہا ہوں۔ وہاں سے سیدھا اس دفتر میں آ گیا۔“

”اوہو! یہ تو بڑی کمی ہے حیرت ہے کہ آپ تیس برس سے اس ایک ملک میں پڑے رہے میں نہیں سمجھتا کہ آپ ہماری طبیعت کو سمجھ سکیں گے؟“

”جناب میں کوشش کروں گا کہ جناب کو مطمئن کروں۔“

”بہر حال صفائی اور باقاعدگی... دیوان صاحب ٹہلتے ہوئے دروازے کے پاس جا کھڑے ہوئے اور پردے کو گھورنے لگے... ادھر تو آیئے۔“

”جی۔“

”ہم تو اس دفتر میں بیٹھ ہی نہیں سکتے۔“

”ہم تو پاگل ہو جائیں گے۔“

دیوان صاحب واقعی پاگلوں کی طرح اُچھلنے لگے۔ پردے کے ایک مقام پر انگلی رکھ کر بولے۔

"یہ کیا ہے؟"

"پردہ ہے جناب۔"

"یہ پردہ ہے؟" دیوان صاحب نے ایک ذرا اُبھرے ہوئے دھاگے میں انگلی ڈالی اور ایک ہی جھٹکے میں تین چار گز دھاگہ گھسیٹ کر باہر نکال لائے۔

"یہ پردہ ہے؟"

دیوان صاحب اب واضح طور پر جنوں کی ایک کیفیت میں داخل ہو چکے تھے وہ چلا کر کہتے... "یہ پردہ ہے؟..." اور اُچھل کر کچھ دھاگہ گھسیٹ کر فرش پر ڈھیر کر دیتے، یہاں تک کہ تمام پردہ تار تار ہو کر زمین پر آ رہا۔

"یہ پردہ ہے؟" دیوان صاحب ہانپ رہے تھے۔

"جناب مجھے افسوس ہے آپ کو اتنی کوفت ہوئی۔"

"کوفت؟ یہ تکدر تو اب مہینوں چلے گا۔"

"جی واقعی میں نادم ہوں۔"

"نہیں تمہارا کوئی قصور نہیں... دیوان صاحب کرسی پر جا بیٹھے۔ "تمہارا کیا قصور" وہ جیسے کسی سوچ میں کھو گئے، تمہارا کیا قصور ہے" آج کی پوری دنیا ہی ایک ایسا پردہ ہے جس کے سب دھاگے نکلے ہوئے ہیں۔" اور وہ سوچ کے ایک طویل غوطے میں ڈوب گئے، تنگ آ کر میں نے پوچھا۔

"جناب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"کچھ نہیں، تم جا سکتے ہو۔" وہ بظاہر نارمل ہو گئے تھے "ایسے موقعوں پر آپ ہمیشہ چپ چاپ چلے جایا کریں!"

میں چپ چاپ جانے لگا تو بولے۔

"ٹھہریے! میں آج تمام اسٹاف کو ایڈریس کرنا چاہتا ہوں۔ تین بجے!"

بہت بہتر جناب!

عام طور پر ہر نئے افسر کی شہرت اس کی آمد سے پہلے ہی دفتر میں پہنچ جاتی ہے، دیوان صاحب

کی شہرت خاصی تشویش انگیز تھی... بیان کیا گیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے جاگیردار کے فرزند ہیں پورے تیس برس یورپ کی آٹھ دس مختلف یونیورسٹیوں میں فلسفہ پڑھتے رہے ہیں۔ جب تک ہوتے رہے ہیں، مسلسل شادیاں کرتے رہے پاس ہونے لگے تو بیویوں کو طلاق دیتے گ چنانچہ فلسفے اور طلاق کی بہت سی ڈگریاں ان کے پاس ہیں۔ یہ تو خیر ذاتی سی باتیں تھیں۔ اگر دفتر کے کہنہ مشق سپرنٹنڈنٹ مولوی نوشاد علی کی رائے میں یہ ذاتی باتیں بھی کچھ کم اہم نہ تھ بہر حال تشویش کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کی طبیعت میں نفاست اور فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ان ذات میں یہ دونوں چیزیں اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ ان کی ذات سرے سے گویا موجود ہی نہ تھ نفاست کے ہاتھوں وہ زندگی بھر کوئی کام نہ کر سکے اور فلسفے کے ہاتھوں دو مرتبہ پاگل ہو چکے ت اس کے علاوہ وہ اپنے آپ کو ذہنی طور سے اتنا بڑا آدمی سمجھتے تھے کہ دنیا کا ہر کام ان کے لیے ہو کر رہ گیا تھا۔ موجودہ منصب اگرچہ بہت بڑا تھا مگر لوگ حیران تھے کہ انہوں نے اس منص قبول کیسے کر لیا۔ لوگ یوں بھی حیران تھے کہ فولاد سازی کے کارخانے میں ایک فلسفی رئیس زاد کو لا بٹھانے میں آخر کیا تک تھی مگر خیر یہ تو رسوخ کی بات تھی اور ہمارے کارخانے میں رسوخ چلتا تھا کہ کارخانہ تقریباً بند ہی پڑا رہتا۔

دیوان صاحب جب تشریف نہیں لائے تھے ہم لوگ سوچتے تھے کہ یہ افواہیں غلط ہوں گ یار لوگ بڑھا بھی دیتے ہیں۔ کچھ زیبِ داستان کے لیے لیکن آج پہلے ہی سابقے نے واضح کر کہ ان کے بارے میں غلط سے غلط بات بھی درست تھی۔ بلکہ بعض معرکے کی غلط باتوں کا تو ہم ابھی علم ہی نہ تھا۔

"تین بجے دوسرا سانحہ پیش آ گیا۔ آپ لیکچر دینے آئے تو لیکچر نہ دے سکے، چشمہ جی سے نکالا، چڑھایا اُتارا، گھمایا۔ تین مرتبہ عمل کیا، تین چار زاویوں سے لوگوں کو دیکھا اور پھر ایک دم گھبرا گئے۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں اور تیر کی طرح کانفرنس روم سے نکل گ جاتے جاتے مجھ سے کہہ گئے۔

"یہ تو ناقابلِ برداشت ہے۔ آپ آئیے!"

دفتر میں فرمایا:

"وہ لمبی داڑھی والا آدمی کون تھا؟"

’’وہ جو پہلی قطار میں کرسی پر بیٹھے تھے؟‘‘

’’کرسی ورسی تو وہاں کہاں تھی، داڑھی ہی داڑھی تھی، مگر ہاں وہی۔‘‘

’’جناب وہ ہمارے دفتر کے سینیئر سپرنٹنڈنٹ مولوی نوشاد علی ہیں۔‘‘

’’تو گویا داڑھی بھی سینیارٹی کے حساب ہی سے چھوڑ رکھی ہے۔‘‘

’’جناب مذہبی شعائر واحساسات کے بارے میں...‘‘

’’اوہو ہم سمجھ گئے... مگران کی ناک بھی تو بڑی واہیات ہے۔‘‘

میں ہنس پڑا۔

’’تم ہنس رہے ہو؟‘‘

’’!‘‘

’’یہ رونے کا مقام ہے!... ناک ہی سے قوموں کی فراست اور عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔‘‘

’’جی۔‘‘

’’یہ فلسفے کا ایک طے شدہ اُصول ہے... کیا آپ نے فلسفہ پڑھا ہے!‘‘

’’جی نہیں۔‘‘

’’تاریخ؟‘‘

’’میں نے تاریخ ہی میں ایم۔ اے کیا ہے۔‘‘

’’گویا تاریخ بھی نہیں پڑھی۔ ایم۔ اے تک تاریخ نہیں، تاریخ کا کیلنڈر پڑھایا جاتا ہے۔ میں فلسفہ تاریخ کی بات کر رہا ہوں، جو بہت بعد کی چیز ہے بلکہ خود انسان کے اندر کی چیز ہے۔‘‘

’’جی۔‘‘

’’بہر حال ناک انسانی کردار کا بنیادی پتھر ہے۔‘‘

’’!‘‘

’’سیدھی ناک والی قومیں ہمیشہ فاتح ہوتی ہیں۔‘‘

’’جی۔‘‘

’’اور اوپر کو اُٹھی ہوئی ناک والی قومیں ہمیشہ اوپر کو جاتی ہیں۔‘‘

"بجا۔"

"چپٹی ناک بھی بری نہیں ہوتی۔ بلکہ جب تک ایک حد میں رہتی ہیں تفکر پیدا کرتی ہیں

"جیسے چینیوں کی ناک۔"

"بالکل۔" "میرا عقیدہ ہے کہ اگر کنفیوشس، چین میں نہ پیدا ہوتا تو شاید پیدا ہی نہ ہو آج کل ان کی ناک کچھ زیادہ پھیل گئی ہے تاہم وہ بھی پھیل ہی رہے ہیں۔

"تم دیکھ لو!"

"درست ارشاد فرمایا۔"

"مگر یہ نیچے کی طرف کو مڑی ہوئی ناک پھوہڑپن اور نگوں ساری کا سمبل ہے... تم ا مولوی صاحب سے کہہ دو کہ اپنی ناک سیدھی کرلیں۔"

"ناک سیدھی کرلیں؟" میں نے اپنی ناک پر رومال پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں بھئی ناک... سیدھی... بالکل سکندر یونان کی طرح... یا بے شک کچھ اوپر اُٹھالیں۔"

"حضور ناک کو..."

"یا تھوڑی سی چوڑی کرلیں۔"

"جی! جی!"

"کچھ کرلیں... مگر یہ قوس بنائی ہوئی اور گھوم پھر کر منہ میں داخل ہوتی ہوئی ناک... لاحول ولاقوۃ... سخت ناقابلِ برداشت چیز ہے۔"

"جی۔"

"یہ ناک نہیں دونالی بندوق ہے... آدمی ہی کے لیے نہیں آدمیت کے لیے بھی۔"

"!"

"تم نے دیکھا نہیں کہ میں اس نامعقول چیز کو دیکھ کر بول ہی نہ سکا... حالاں کہ مجھے بہت کچھ کہنا تھا... کل ہم سٹاف کو پھر ایڈریس کریں گے۔"

"مگر حضور..."

"مگر وگر کچھ نہیں، لوگوں سے کہہ دو کہ ناک درست کر کے آئیں۔ ہم اونچی اور سیدھی ناک

مانگتے ہیں ایک سرے سے دوسرے تک... سمجھ گئے!"

"لیکن جناب... ہمارے دفتر میں تو میرا مطلب ہے کہ بد قسمتی سے بہت سی ناکیں..."

"یعنی نیچے کو جھکی ہوئی ہیں۔"

"کچھ ایسا ہی اتفاق ہے جناب۔"

"اور گھومتی ہوئی بھی؟"

"جی جی، کچھ ایسی ہی۔"

"اور قوس بنا کر منہ میں داخل ہوتی ہوئیں؟"

"جی جناب۔"

"خاموش!"... دیوان صاحب یکبارگی گرج اُٹھے،... ہم یہ سب کچھ نہیں سن سکتے!... چلے جاؤ یہاں سے!... ہم پاگل ہو جائیں گے!... اور وہ صبح کی طرح سوچ کے ایک گہرے طویل غوطے میں ڈوب گئے۔

"اسٹاف کو جب یہ ماجرا معلوم ہوا تو لوگ ناک پکڑ کر بیٹھ گئے... گنتی کی چند ناکیں سیدھی ہوں تو ہوں ورنہ ہر ایک ناک میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور تھا، ہر شخص کو ڈر تھا کہ ناک رکھتے ہیں تو ملازمت جاتی ہے۔ لیکن قدرت کو لوگوں کی آزمائش شاید منظور نہ تھی۔ دوسرے دن دفتر میں آنے کے بجائے دیوان صاحب نے اپنا استعفیٰ دفتر میں بھیج دیا جس میں لکھا تھا۔"

"فولاد کے ستون بنانے سے پہلے لوگوں کی ناک بناؤ!"

✡ ✡

مرزا کی موٹر سائیکل

سیّد غلام حسین جعفری

یہ تقریباً 1964ء کی بات ہے۔ عبدالماجد مرحوم ریڈیو پاکستان کراچی کی سنہری آواز تھے
ان دنوں بقیدِ حیات تھے۔ ایک دن باتوں باتوں میں کہنے لگے:

''میں اپنی اسکوٹر بیچنا چاہتا ہوں خریدو گے؟''

اسکوٹر کا نام آتے ہی نہ جانے کیوں مجھے انجانی سی خوشی ہوئی۔ مدت سے سائیکل پر سوار کر رہا تھا یا پھر بس کے دھکے کھا رہا تھا۔ آج اسکوٹر کے نام سے ہی ہواؤں میں پرواز کرتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے خیالات میں گم ہو گیا۔ سوچ رہا تھا۔ ''کیا میں بھی اسکوٹر کا مالک ہو سکتا ہوں؟''

خیر، ماجد بھائی سے پوچھا، ''کتنے روپے مانگ رہے ہیں؟''

بولے، ''جو مرضی میں آئے دے دو۔ بہت سستی ہے۔ صرف تین سو روپے میں بکاؤ ہے۔''
میں سوچنے لگا زمانہ اتنا بھی سستا نہیں ہے۔ تین سو روپیہ اور اسکوٹر۔ کچھ غلط محسوس ہوا۔
لیکن جب انہوں نے وہ سائیکل جس کو وہ موٹر سائیکل کہہ رہے تھے، دکھائی تو مجھے یقین آ گیا۔

سائیکل بھی تھی اور موٹر سائیکل بھی۔ سائیکل اس لیے تھی کہ اس میں پیڈل لگے ہوئے تھے اور بوقتِ ضرورت استعمال ہو سکتے تھے اور موٹر سائیکل اس لیے تھی کہ پیٹرول سے بھی چلتی تھی، اور پھر پیٹرول کا خرچ بھی کچھ نہیں تھا۔ صرف سونگھتی تھی۔ اوّل تو پیٹرول کی ٹنکی ہی بہت چھوٹی تھی جس میں غالباً دو پائنٹ پیٹرول ڈالا جاتا تھا۔ دوسرے انجن کی ضعیفی کے سبب اکثر اوقات کیا بلکہ زیادہ تر اس کو پیڈل ہی سے چلایا جاتا تھا۔ ہزاروں خوبیوں سے آراستہ تھی۔ مثلاً انجن اگلے پہیے کے درمیان نصب تھا۔ جس کو باسانی پہیے سے حسبِ ضرورت علیحدہ کیا جا سکتا تھا۔ انجن اور پہیے

ایک نام نہاد فولادی رولر لگا ہوا تھا جس کا کام پہیے کو گھمانا تھا لیکن خود زمانے کی گردش کا شکار ہو چکا تھا اور اَب صرف پہیہ جام کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ جس کے اِرد گرد کیچڑ اور مٹی جم چکی تھی۔

ہارن کی جگہ ہینڈل کی ایک طرف کے ایک کرومیم کی زنگ آلود گھنٹی لگی ہوئی تھی، جس کا بجنا نہ بجنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ نہ ہی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ بریک ہینڈل میں ہی لگے ہوئے تھے۔ لیکن استعمال کم ہوتے تھے۔ اس لیے کہ موٹر سائیکل کا قد کچھ زیادہ نہیں تھا۔ پیر آسانی سے بوقتِ ضرورت زمین پر لگائے جا سکتے تھے۔ جو اکثر بریکوں کے فیل ہونے کی وجہ سے بریک کا کام دیتے تھے۔ جوتوں کا کیا تھا وہ تو ویسے بھی گھستے ہی تھے۔ ایکسیڈنٹ کا قطعی خطرہ نہیں تھا اور نہ انشورنس کی ضرورت تھی۔ بس سڑک کے کنارے آہستہ آہستہ چلتی تھی۔

پچھلے پہیے پر کیریئر لگا ہوا تھا جو کبھی کبھار کام آ سکتا تھا۔ لیکن ڈبل سواری کے لیے نہیں۔ میرے جیسے دُبلے پتلے اور ناتواں انسان کے علاوہ کوئی دوسرا اس پر نہیں بیٹھ سکتا تھا اور غالباً اس کے بکنے کا سبب بھی یہی تھا کہ ماجد بھائی کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ موٹر سائیکل محض موٹر سائیکل رہ گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی چوری چکاری کا ڈر بھی نہیں تھا۔ اس لیے کہ کراچی کی آب و ہوا نے اس کو قابل ہی کب چھوڑا تھا کہ کوئی چور اس کو نظر بھر کر دیکھ بھی سکے۔ ویسے ایک فولادی چین والا تالا بھی موجود تھا جو پیچھے کیریئر سے لٹکا ہوا تھا۔

ان تمام خوبیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے سوچا مہنگائی کا زمانہ ہے۔ ایسی نادر الوجود اور کار آمد چیزیں دستیاب نہیں اس لیے خرید لیا جائے۔ یقین مانیے جب انہوں نے وہ موٹر سائیکل مجھے آزمانے کے لیے دی تو بہت مزہ آیا۔

دراصل بات یہ تھی کہ ہمیشہ سائیکل پر سواری کرنے سے تھک جاتے تھے۔ آج بغیر پیڈل مارے سائیکل چل رہی تھی۔ میں نے آنے والی تکالیف کو بغیر ذہن میں لائے ہوئے سودا کر ڈالا۔ اب میں فخر سے سینہ تانے ہوئے موٹر سائیکل پر سواری کر رہا تھا۔

کچھ دن تک تو وہ سائیکل نما موٹر سائیکل چلتی رہی لیکن اپنی کم مائیگی کا احساس اس وقت ہوا جب میں ایک دن اس پر بیٹھا ہوا آفس آ رہا تھا۔ ہوا مخالف تھی۔ ویسے بھی زندگی میں زمانے کی مخالف ہوائیں چلتی ہی رہتی ہیں۔ میں بغیر پروا کیے ہوئے چل دیا۔ مگر وقت کب کسی کا ساتھ دیتا ہے۔ ہوا کی تندی تیزی محسوس ہونے لگی۔ موٹر سائیکل بے چاری قطعی طور پر سائیکل میں تبدیل

ہو چکی تھی۔ میں پیڈل مار رہا تھا۔ لیکن موٹر سائیکل بے چاری جواب دے چکی تھی۔ میں تھوڑی ہی دیر میں پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ غالباً میری اس کمزوری کو ایک گدھے گاڑی والے نے بھانپ لیا۔ جو عمر میں تقریباً بارہ تیرہ سال کا تھا۔ گاڑی کو میرے قریب لایا۔ اور وہ لوہے کا ڈبہ جس میں بہت سے کنکر بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ زور سے بجا کر بولا۔

"بابو جی۔ مقابلہ کرو گے؟"

یہ جملہ میرے کانوں میں ایسا محسوس ہوا جیسے ہائیڈروجن بم کہیں قریب ہی پھٹ گیا ہو۔ میں نے اپنے آپ کو اندر ہی اندر تحلیل ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ لیکن ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے خود کو سنبھالا اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ڈبے کی کھڑکھڑاہٹ سے گدھا مع بچے کے، ٹویوٹا کار بن چکا تھا۔ میں پیچھے رہ گیا تھا۔

وقت کو غنیمت سمجھا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ لیکن نہ جانے اس گدھے گاڑی والے کو کیا سوجھی کہ اس نے اپنی گاڑی کی رفتار آہستہ کی اور میرے دوسری طرف آ کر بولا۔

"بابو جی۔ آؤ نا۔ بس! ریس نہیں ہو رہی؟"

یہ دوسرا حملہ تھا۔ لیکن اثرات کچھ کم تھے۔ میں عادی ہو چکا تھا۔ اور پھر اس کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ذہنی طور پر تیار بھی تھا۔ ویسے بھی پیڈل مارتے مارتے تھک کر چور ہو چکا تھا۔ غصے سے کانپ گیا۔ لیکن وقت کی نزاکت کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔

"بھائی میاں جاؤ اپنا کام کرو۔"

لیکن میرے اتنا کہنے پر بھی اس لڑکے کو میرے اوپر بالکل ترس نہ آیا۔ اور اُس نے وہ کنکروں والا ڈبہ کچھ اس زور سے ہلایا، جیسے کوئی بندر والا ڈگڈگی بجاتا ہے۔

نہ جانے کیوں اس ڈگڈگی کا مجھ پر اثر ہو بھی گیا۔ شاید ڈارون صاحب کی تھیوری صحیح ہو۔ انسان کبھی نہ کبھی اپنے اصل روپ میں آ ہی جاتا ہے۔

میری موٹر سائیکل اس وقت سائیکل اور موٹر سائیکل دونوں کا کام دے رہی تھی۔ ریس زوروں پر تھی۔ لیکن میری بہت کوشش کے باوجود مجھ سے اصلی گدھا نہ بنا گیا۔ گدھے کے ساتھ مدد کے لیے بچے موجود تھا۔ لیکن میں کہ بے چارہ بے بس۔ کچھ بھی تو نہ کر سکا۔ اس کو چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ سامنے سگنل آ گیا۔

[illegible]

میں نے پہلے تو سوچا کہ سرخ بتی کی پروا کیے بغیر آگے نکل جاؤں لیکن میرے اندر کے انسان نے مجھے فوراً ٹوکا اور میں نے پورے زور سے بریک لگا دیے۔ لیکن گدھا پھر گدھا تھا۔ وہ بھلا کس کی پروا کرتا۔ سیدھا سگنل توڑتا ہوا آگے نکل آ گیا۔ لڑکا پیچھے مڑ کر طنزیہ انداز میں میری شکست پر ہنس رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کاش میں بھی گدھا ہوتا۔

* *

ہائے ری ڈگری!

سیّد مبشر منظور

کہتے ہیں گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے اور ڈگری ہولڈر طالب علم کی شامت آتی ہے تو وہ ڈگری لینے کے لیے اولڈ کیمپس کا رُخ کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ گیدڑ کو موت مل جاتی ہے، مگر طالب علم کو ڈگری نہیں ملتی۔ ہوا یوں کہ میں نے 1972ء میں بی اے پاس کرلیا، جس کی سزا میں آج تک بھگت رہا ہوں۔ ہندوستان کے ایٹمی دھماکے سے پھیلنے والے تابکاری اثرات بھی اب تک زائل ہو چکے ہوں گے، مگر 1972ء میں پاس کیے ہوئے بی اے کے امتحان کی ڈگری کی تلاش کے اثرات شاید کبھی بھی زائل نہ ہوں۔ میں جب بھی ڈگری لینے اولڈ کیمپس گیا، میرے اِرد گرد ایٹمی دھماکے ہوئے اور میں ڈگری کی بجائے، تابکاری اثرات لے کر واپس آ گیا۔ قصہ مختصر، میں اولڈ کیمپس گیا۔ تیس روپے ڈبل فیس جمع کروائی، تا کہ ڈگری اڑتالیس گھنٹے کے اندر مل جائے، کیوں کہ نوکری کے سلسلے میں باقی تمام لوازمات کے علاوہ ڈگری بھی ایک اہم جزو تھی۔ بہرحال، تمام مطلوبہ دستاویزات اکٹھی کر کے ڈگری سیکشن میں جمع کروا دیں۔ انہوں نے ایک کاغذ پر نمبر شمار لکھ کر مجھے دیا اور دو ہفتے بعد آنے کو کہا۔ میں احتیاطاً تین ہفتے بعد گیا کہ دفتر کا معاملہ ہے، دیر ہو جاتی ہے۔ چٹ پیش کی۔ چٹ دیکھنے والے نے مسکرا کر کہا، ”آپ کاغذات یہاں ہی جمع کروا گئے تھے؟“ میں نے کہا، ”جی ہاں، اسی جگہ۔“ اس نے اشاروں کنایوں میں رجسٹرار کے ساتھ والے کمرے کا پتا بتایا کہ وہاں جائیں، اب ڈگری سیکشن وہاں تبدیل ہو گیا ہے۔ میں وہاں گیا۔ چٹ پیش کی اور سوال دہرایا۔ جواب ملا، ”کس کو دے گئے تھے؟“ ڈائری لکھنے والوں کی اہمیت کا احساس مجھے اس لمحہ ہوا۔ اگر میں ڈائری لکھنے کا عادی ہوتا تو گھر واپس آ کر لکھا ہوا حلیہ پڑھ لیتا اور مسئلہ آسان ہو جاتا۔ میں نے ذہن پر بوجھ ڈالتے ہوئے اُس شخص کا حلیہ بتایا، جس کے پاس کاغذات جمع کروا گیا تھا۔ ”وہ صاحب تو یہاں کام نہیں کرتے۔“ حلیہ سن کر اُس نے

بے پروائی سے کہا اور جٹ میری طرف بڑھادی۔

میرے پُرسکون جسم میں اِس ایک جملے سے خوف کی لہریں لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگیں۔ جیسے گہرے پانی میں ایک کنکر پھینکنے سے ارتعاش کی لہریں پھیلتی جاتی ہیں، کچھ ایسی ہی سنسنی خیز لہریں مجھے اپنے جسم میں محسوس ہوئیں۔ اس سلسلے میں سنی ہوئی تمام باتیں، جنہیں میں افسانہ سمجھا کرتا تھا، حقیقت بن کر میرے سامنے آرہی تھیں۔ ایک مرتبہ پھر ہمت کرکے پوچھا، ''پھر؟'' ارشاد ہوا، ''آپ اوپر ٹائپ سیکشن میں چلے جائیں۔'' اوپر پہنچے۔ پوچھتے پوچھاتے ٹائپ سیکشن آیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اپنا سوال دہرایا۔ جواب ملا کہ آپ سامنے والے کونے میں جائیں۔ سامنے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ اب کوئی اس سے اگلے کونے یا اس سے آگے کسی اور کمرے میں نہیں بھیج سکے گا، کیوں کہ آگے دیوار ہے۔ اس لمبے سے برآمدے کو عبور کیا اور کونے میں پہنچا۔ کونے والے صاحب نے فرمایا، ''آپ اسی برآمدے کے شروع میں جائیں، آپ کی ڈگری کا تعلق اُن سے ہے۔'' میں نے عرض کی کہ انہوں نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ تحکمانہ سے لہجے میں بولے، ''نہیں نہیں، آپ وہیں جائیں۔'' واپس وہیں آیا تو پہلے صاحب لاپتا تھے۔ ایک اور سے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ بولے، ''آپ کی ڈگری یہیں ہے۔'' بخدا آنسو آنکھوں سے باہر آنے کی کوشش کرنے لگے، جن کے آگے ضبط کا بند باندھا۔ یہ آنسو خوشی کے تھے۔ میں نے بے صبری سے پوچھا، ''ڈگری ٹائپ ہوگئی ہے؟'' فرمانے لگے کہ اس وقت چھٹی ہونے والی ہے، آپ کل آجائیں۔ میں نے جرأت پیدا کرتے ہوئے کہا، ''چھٹی ہونے والی ضرور ہے، مگر ابھی ہوئی تو نہیں۔ آپ دیکھ لیں ڈگری ٹائپ ہوئی یا نہیں۔'' وہ ماتھے پر تیوری چڑھا کر اور ایک الماری کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگے، ''آپ کی ڈگری اس الماری میں ہے اور جس کے پاس چابیاں ہیں وہ کہیں گیا ہوا ہے۔'' میں نے اپنے آپ سے تسلی کی خاطر کہا، چلو تھوڑی دیر انتظار کر لیتے ہیں، لیکن وہ صاحب خود تو بیٹھے ہوئے تھے، مگر اُن کے کان کھڑے تھے، جھٹ بول اُٹھے، ''اب تو شاید ہی آئے گا، کیوں کہ چھٹی ہونے میں صرف آدھ پون گھنٹہ رہ گیا ہے۔'' میں نے بے بسی سے الماری کی طرف دیکھا تو تالا منہ چڑا رہا تھا۔

ایک ڈیڑھ ہفتے بعد پھر اولڈ کیمپس گیا۔ سیدھا ٹائپ سیکشن پہنچا۔ متعلقہ آدمی نے الماری میں ڈگریاں دیکھیں اور فاتحانہ انداز میں سر باہر نکال کر کہا کہ آپ نیچے ڈگری سیکشن سے معلوم

کریں۔ سیڑھیاں اُتر کر ایک مرتبہ پھر ڈگری سیکشن میں گیا۔ یہاں کے باسیوں نے کہا، ”آپ ایسا کریں، ٹائپ سیکشن میں چلے جائیں۔“ میں نے حیران و پریشان ہوتے ہوئے کہا کہ انہی نے تو آپ کے پاس بھیجا ہے۔ ”نہیں، نہیں۔ ڈگریاں ہمارے ہاں سے ٹائپ سیکشن میں جا چکی ہیں۔“ انہوں نے فیصلہ صادر کر دیا۔ پھر سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر گیا۔ اُسی آدمی سے کہا کہ جناب نے نیچے بھیجا تھا، انہوں نے پھر اُوپر بھیج دیا کہ ہماری ڈگریاں آپ کے پاس ہیں۔ اب کہاں جاؤں؟ سوچتے ہوئے وہ مجھ سے مخاطب ہوا، ”آپ ایسا کریں کہ اس کمرے سے باہر نکل کر سیدھے جائیں تو ایک برآمدہ آئے گا۔ وہاں سے دائیں ہاتھ ایک کمرہ آئے گا، وہاں فلاں صاحب سے معلوم کریں۔“ غصے کو ضبط کیا اور ایک مظلوم مسکراہٹ سے اُس کا شکریہ ادا کیا کہ پھر نیچے نہیں بھیج دیا۔ اگر بھیج بھی دیتا تو میں اُس کا کیا کر لیتا۔ اس شخص نے بھی ایک دلفریب، بلکہ پُرفریب مسکراہٹ کے ساتھ الوداع کہا، جس سے مجھے آگے پیش آنے والے حالات کی سنگینی کا احساس ہونے لگا۔ میں وہاں سے سیدھا گیا۔ آگے برآمدہ آیا، پھر دائیں ہاتھ والا کمرہ بھی آ گیا اور میں اُس میں داخل ہو گیا۔ وہاں فلاں شخص نے کاغذ پر کچھ لکھ دیا اور کہا کہ آپ لوہے کا جنگلا پار کر کے پہلے کمرے میں فلاں آدمی کے پاس جائیں۔ جب میں جنگلے پر پہنچا تو گیٹ کیپر نے اندر جانے سے روک دیا کہ اندر جانا منع ہے۔ لڑ میں سکتا نہیں تھا، مجبوراً باہر کھڑا ہو گیا اور آنکھ گیٹ کیپر پر رکھی۔ جونہی وہ اِدھر اُدھر ہوا، میں اندر چلا گیا۔ کمرے میں ایک صاحب بیٹھے تھے، جن کے چہرے کی اُڑی ہوئی رنگت بتا رہی تھی کہ یہاں کے اہلکار نہیں۔ میری قبیل کے معلوم ہوتے تھے۔ شاید وہ بھی فلاں صاحب کے انتظار میں تھے۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ آدھ پون گھنٹہ بعد ایک شخص آیا۔ میں نے فوراً اپنا مطلب بیان کیا۔ فرمانے لگے: ”صاحب اسسٹنٹ کنٹرولر کے پاس بیٹھے ہیں۔“ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ پوچھتا وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ جان لیوا انتظار کے بعد ایک اور صاحب اندر آئے۔ میز کے پیچھے پڑی ہوئی کرسی پر براجمان ہو کر عینک کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے بولے، ”فرمائیے!“ میں نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے اپنا مطلب بیان کیا۔ انہوں نے جھریوں سے بھرپور چہرے پر مزید جھریاں ڈالتے ہوئے کہا، ”آپ باہر گیٹ پر چلے جائیں۔ آپ کا کام وہاں سے ہو گا۔ یہ میرا کام نہیں۔“ باہر آ کر میں لوہے کے جنگلے کے پاس پڑی ہوئی میز کے قریب کھڑا ہو گیا۔ وہاں دو آدمی کھڑے تھے، مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ جب گھڑی پر نظر پڑی تو

میں کسی کے کہے بغیر ہی واپس چلا آیا کہ اب تو چھٹی ہونے میں صرف آدھ ہی گھنٹہ رہ گیا اور سرکاری دفتروں میں کام دفتر بند ہونے سے گھنٹہ پہلے ہی بند ہو جاتا ہے۔

دو تین ہفتے بعد تیسری مرتبہ گیا۔ گیٹ والے سے اپنا مدعا بیان کیا۔ اُس نے ایک اور آدمی کے حوالے کیا، جس نے اندر سے ڈگریاں دیکھ کر فرمایا، ”آپ کی ڈگری ہمارے پاس نہیں ہے۔ آپ نیچے ڈگری سیکشن میں جائیں۔“ میں یوں سیڑھیاں اُترا جیسے آہستہ آہستہ لڑھک رہا ہوں۔ ڈگری سیکشن میں گیا۔ جواب ملا، ”اب تو ہڑتال شروع ہو گئی ہے۔ دو گھنٹے کی ہڑتال ہے، اس لیے آپ بارہ بجے کے بعد آئیں۔“ دو گھنٹے آوارہ گائے کی طرح پھرتا رہا۔ بارہ بجے پھر وہاں پہنچا، لیکن ایک تالا میری بے بسی کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ پاس ہی اُس شعبے سے متعلق ایک شخص کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا کہ بھائی ہڑتال تو ختم ہو گئی ہے، مگر یہ تالا ابھی تک نہیں کھلا۔ اُس نے کہا کہ چابیوں والا کہیں گیا ہوا ہے۔ شاید ابھی آ جائے۔ میں نے کہا، ”آپ خود اُسے بلا لیں۔“ اُس نے کہا، ”ہمیں کیا معلوم وہ کہاں گیا ہے۔“ پندرہ منٹ بعد پھر پوچھا کہ چابیوں والا آئے گا بھی یا نہیں؟ کہنے لگا، ”بھئی آج جمعہ ہے۔ ساڑھے بارہ بجے دفتر بند ہو جاتا ہے۔ آپ کل آ جائیں۔“ یہ جواب سننے کے بعد بھی میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ شاید اُسے میری حالت پر رحم آ گیا تھا۔ خود ہی دوسرے ساتھی سے کہنے لگا، ”جا، اودھے کولوں چابی لے آ۔“ جتنے عرصے میں وہ چابی آئی، میں یہ سوچتا رہا کہ ابھی تو اِسے معلوم نہیں تھا کہ چابی والا کہاں ہے اور اَب چابی منگوا رہا ہے۔ بہر حال، دفتر کھلا، پھر رجسٹر کھلا۔ رجسٹر الٹ پلٹ کر کے کہنے لگے، ”آپ اوپر جنگلے کے ساتھ والے کمرے میں چلے جائیں۔ آپ کی ڈگری وہاں جا چکی ہے۔“

میں دو دو تین تین ہفتے بعد ڈگری کے لیے جاتا رہا تھا۔ اب مجھے اوپر جانے، نیچے آنے، سیدھا جانے، دائیں طرف مڑنے، واپس آنے، اوپر جانے، نیچے آنے اور پھر وہیں پہنچ جانے کی جہاں سے میرا اُوپر نیچے اور دائیں بائیں کا سفر شروع ہوتا تھا، اتنی مشق ہو گئی تھی کہ اب کسی کو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ فلاں طرف، فلاں کمرے میں، فلاں کے پاس جاؤ۔ وہ میری عرضداشت سن کر میری طرف دیکھتے تھے تو میں سدھائے ہوئے بندر کی طرح کمرے سے نکل کر کسی اوپر یا نیچے والے کمرے کی طرف چلا جاتا تھا۔ یہ الفاظ رات کو سوتے میں بھی مجھے سنائی دیتے رہتے تھے، ”آج ہڑتال ہے... ڈگری ٹائپ سیکشن میں ہے... سپرنٹنڈنٹ کے دستخط ہوں گے...

پھر ڈگری گورنر ہاؤس جائے گی۔"

اب اولڈ کیمپس جانا چھوڑ دیا ہے۔ کبھی سوچتا ہوں، مسجدوں میں دعا کراؤں۔ کبھی خیال آتا ہے، ڈگری کو بھول جاؤں۔ یہ ارادہ بھی ہے کہ اخبار میں تلاشِ گمشدہ کا اشتہار دوں گا، جس میں لکھوں گا، "اگر ڈگری خود پڑھے تو گھر آ جائے، اُسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔" مگر ڈرتا ہوں کہ گھر سے بھاگی ہوئی کسی گمشدہ بالغ لڑکی کی طرح ڈگری نے کہہ دیا کہ میں بالغ ہوں اور اپنی مرضی سے اولڈ کیمپس کے کسی صاحب کے پاس رہنا چاہتی ہوں تو پھر کیا کروں گا...؟!!!

* *

اسٹیل کا بکس

سیّد محبّ الحق محشرؔ

حلقۂ احباب میں مولوی محمد حسین اصدق کی ایک ذاتِ گرامی ایسی تھی، جن کی 'سولہ آنہ مولویت' کافی دلچسپ اور 'مُفرح' واقع ہوئی تھی۔ مولوی صاحب موصوف صوبۂ بہار کے رہنے والے ایک معزز اور شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ خاندان کے اکثر افراد 'پیرِ روشن ضمیر' ہوتے چلے آئے تھے، چنانچہ مولوی صاحب میں بھی وہ پیرانہ خصوصیات 'ولی عہدی' کے رنگ میں موجود تھیں، جسم فربہ، گول بدن، سرخ و سفید چہرہ، بھرپور داڑھی، لمبا کُرتہ، ٹخنوں سے اُونچا پائجامہ، تن و توش کے اعتبار سے کافی وجیہ معلوم ہوتے اور جب گول چکوٹوپی پہن لیتے تو بالکل 'شبیہ قُبہ و محراب و منبر' ہوجاتے تھے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ اپنے درس سے فارغ ہو کر کمرے میں لیٹا ہوا کسی ادبی رسالہ کو بڑے غور و انہماک سے دیکھ رہا تھا کہ یک لخت مولانا حسین اصدق نازل ہوگئے اور معمولی علیک سلیک کے بعد فرمانے لگے کہ بھئی راشد، ذرا میرے ساتھ چلے چلو صدر بازار۔ میں نے کہا، ''مولانا! خیریت تو؟ کیا آفت آن پڑی جو اِس مئی جون کی دوپہر میں چہل قدمی کی سوجھی ہے؟ چلنے کو چلیے۔ میں انکار نہیں کروں گا، مگر اتنا سمجھ لیجیے کہ صدر بازار تک پہونچتے پہونچتے طبیعت ہری ہوجائے گی اور آگے جو کچھ ہو، اُس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔''

مولانا: بھئی بات یہ ہے کہ آج والد صاحب قبلہ کا خط آیا ہے کہ پرسوں جمعہ کو حضرت پنج گنج رحمتہ اللہ علیہ کا عرس شریف ہے۔ اور چوں کہ میری شرکت ضروری ہے، اس لیے میں آج آٹھ بجے شب والی ٹرین سے روانہ ہو جاؤں گا۔

راشد: بہت بہتر۔ آپ 8 بجے شب والی تو نہیں، پانچ بجے شام والی ٹرین سے تشریف

لے جائیں۔ میں اسٹیشن پر آپ کو خدا حافظ کہنے آ جاؤں گا۔

مولانا: مگر اِس وقت بازار چلنا بہت ضروری ہے۔ ایک اسٹیل بکس خریدنا ہے۔

راشد: اسٹیل بکس... یعنی ٹرنک؟

مولانا: ٹرنک ورنک تو میں جانتا نہیں۔ ایک بکس خریدنا ہے۔ تم دیر نہ کرو، اُٹھو چلو۔

آخر کار سینہ پر پتھر رکھ کر اُٹھنا ہی پڑا۔ شیروانی اور چھتری لی، بازار کو روانہ ہوئے۔ قریب قریب چھ سات فرلانگ چلنا پڑا۔ دھوپ کی تمازت سے بدن کھول رہا تھا، مگر آئی ہوئی شامت ٹلتی کب ہے؟

بازار پہونچے۔ چہرے سیاہ، حواس باختہ، مگر مولانا پن چکی کی طرح، کام کے سچے دُھن کے پکّے تھے، چلے چل رہے تھے اور میں بھی پچھلے ڈبّے کی طرح گھسٹ رہا تھا۔ یکا یک ٹرنک کی دکانوں کی قطار سامنے آ گئی۔ اب صرف یہ انتخاب زیرِ غور تھا کہ کس دکان پر بیٹھ جایئے۔

یہ صرف اتفاقی امر تھا کہ ایک ایسی دکان بھی نظر پڑی، جس کے دکاندار صاحب پڑے سو رہے تھے اور ایک 'دیوی جی' بیٹھی ہوئی اُن کو پنکھا جھل رہی تھیں، بلا کسی ارادہ اور نیت کے اُس دکان پر بیٹھ گیا اور ایک اسٹول کھینچ کر مولانا کی طرف بھی بڑھا دیا۔

کچھ دیر تک تو سکوت و سکون کا عالم طاری رہا۔ میں اپنا پراگندہ ہوش و حواس اکٹھا کر رہا تھا اور مولانا معلوم نہیں، کیا مُنہ بنا بنا کر سوچ رہے تھے۔ دیوی جی بدستور اپنے کام میں مصروف تھیں، صرف یہ کہ ایک آدھ بار نو واردوں پر نگاہِ غلط انداز ڈال لیا کرتی تھیں۔ دکاندار صاحب، جو غالباً دیوی جی کے خوش نصیب شوہر رہے ہوں گے، وہ نیم برہنہ مُنہ پر ایک ہلکا سا شربتی رومال ڈالے ہوئے عالمِ بالا کی سیر میں مصروف تھے۔

دو چار منٹ میں جب میری حواس باختگی ختم ہو چکی تو میں نے ایک نظر میں دکان اور مالکان دکان سب کا بہ غور جائزہ لیا۔ دکان بہت قاعدہ اور خوب صورتی کے ساتھ سجائی ہوئی تھی۔ ٹرنک سلیقہ کے ساتھ الماریوں پر رکھے ہوئے تھے۔ نظر جب ہر طرف سے پلٹتی تو دیوی جی کے خوشنما چہرے پر آ کر جم جاتی۔ یہ دیوی جی کوئی بالکل نوخیز تو نہ تھیں، پھر بھی غالباً بیس بائیس کا سن رہا ہوگا۔ شکل و صورت بھی کافی دلکش پائی تھی۔ مختصر یہ کہ حسن و شباب کا ابھی بہت کافی سرمایہ اُن کے

[illegible] ان کے چہرے سے ایک قسم کا حزن ٹپک رہا تھا، آنکھیں ساحر ہونے کے باوصف بے حد محزون تھیں۔ پاس محفوظ تھا۔ بایں ہمہ اُن کے چہرے ... ساتھ ساتھ بہت ہی غمگین و سوگوار معلوم ہو رہی تھیں۔ میں اس کی توجیہ کرنے سے قاصر تھا۔ یہ کسی ہنگامی واقعہ کا اثر تھا، یا اُن کو قدرت ہی کی طرف سے اس طرح کا 'جمالِ محزوں' عطا ہوا تھا؟

میں نے دیوی جی کو مخاطب کرتے ہوئے دریافت کیا... "کیا یہی صاحب (دکاندار صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس دکان کے مالک ہیں؟"

دیوی جی نے ویسے ہی گردن جھکائے، بے اعتنائی کے ساتھ کہہ دیا، "جی ہاں۔"

میں: اِن کو جگا دینے میں کوئی مضائقہ تو نہیں ہوگا؟ معلوم نہیں کب سے سو رہے ہیں۔ اگر ابھی سوئے ہوں گے تو یقیناً کچی نیند میں جگا دینا ناگوار گزرے گا۔

دیوی جی: نہیں تو... آپ لوگ ذری دیر اور بیٹھیں، یہ ابھی اُٹھ جائیں گے۔ دیر کے تو نہیں سوئے ہیں، مگر اس سڑی ہوئی گرمی میں نیند کب کس کو ٹھکانے کی آتی ہے۔

ابھی دیوی جی اپنا آخری جملہ مکمل بھی نہ کرنے پائی تھیں کہ دکاندار صاحب نے نہایت تیزی کے ساتھ چہرے سے رومال سرکایا اور ہم لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔

دکاندار صاحب کا چہرہ دیکھنے کے بعد... دیوی جی سے ایک خاص قسم کی ہمدردی پیدا ہوگئی۔ اللہ اکبر... اس قدر گہری پالش، جس میں چمک پیدا ہوگئی تھی۔ سر ہمارے مولانا کے سر کی طرح گھٹا ہوا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مولانا کا سر فرخ آبادی تربوز کی طرح بالکل صاف چکنا، روغن دار تھا اور دکاندار صاحب کے سر کے بیچوں بیچ... تربُز کی ایک چھوٹی ڈنٹی بھی جمی ہوئی تھی۔ مگر دکاندار صاحب جتنے بدشکل اور بدصورت واقع ہوئے تھے، اتنے ہی خوش مزاج اور خوش اخلاق معلوم ہو رہے تھے۔ اُٹھتے اُٹھتے فرمایا، "معاف کیجئے گا، آپ لوگ دیر سے تو نہیں بیٹھے ہوئے ہیں؟"

میں: نہیں دیر سے تو نہیں بیٹھے ہیں۔ یہی کوئی دو چار منٹ ہوئے ہوں گے، آپ کوئی اندیشہ نہ فرمائیں۔

دکاندار کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ سیاہ سیاہ ہونٹوں کے بیچ سے سفید سفید دانت موتی کی طرح چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ میرے لطیف طنز کو سمجھ کر کہنے لگے، "فرمائیے، کیسے تکلیف فرمائی؟"

میں: آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کی دکان پر کوئی شخص کس غرض سے آئے گا اور وہ بھی اس جہنمی دھوپ میں، ایک اچھا سا ٹرنک چاہیے۔

دکاندار: نوازش آپ کی، شوق سے لیجیے۔ ایک دو کیا، ضرورت ہو تو دس بیس لے سکتے ہیں، فرمائیے، کیسا ٹرنک؟

میں: میں تو صرف یہی بتا سکتا ہوں کہ خوب صورت ٹرنک چاہیے۔ ہر خریدار خواہ وہ خود کتنا ہی بدصورت کیوں نہ ہو، اپنے لیے عمدہ اور خوب صورت ہی مال پسند کرتا ہے۔ کیوں میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟

دکاندار: (مسکرا کر) آپ بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کہہ کر دکاندار صاحب اُٹھے اور اندر کمرے میں جا کر خوب صورت ٹرنک نکالنے لگے۔ اِدھر میں نے دیکھا کہ دیوی جی پر بھی بعض جملوں کا خاصا اثر ہوا۔ اس لیے کہ وہ سر جھکائے ہوئے تھیں، لیکن ایک بہت ہی ہلکی سی نازک مسکراہٹ اُن کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔ ایک بار سر اُٹھایا اور یوں ہی کچھ لاپرواہی کے ساتھ ایک نگاہ غلط انداز کی زحمت گوارہ فرمائی اور پھر سر جھکا کر اپنی حنائی انگلیوں سے سامنے رکھے ہوئے پنکھے کو کریدنے لگیں۔ میں اپنی کاوش و کوشش کی داد پا چکا تھا۔ نظر پھیر کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں دکاندار صاحب نے ایک ٹرنک سامنے لا کر رکھا، پھر فوراً ہی دوسرا لائے، تیسرا لائے، غرض اللہ کے بندے نے تانتا باندھ دیا۔ جن میں کے سب کے سب تو نہیں، مگر دو چار تو واقعی خوب صورت تھے۔ اگر مجھ کو ذاتی طور پر ضرورت ہوتی تو یقیناً ایک لے لیتا، مگر معاملہ مولانا صاحب کا تھا۔ میں نے مولانا سے کہا، ”پسند کیجیے نا! اِن میں سے کوئی ایک۔“ مولانا نے میری طرف جھک کر انتہائی رازدارانہ طریقہ پر میرے کان میں فرمایا، ”یہ دکاندار تو مسلمان نہیں ہے۔ میں اس کے یہاں کا بکس نہیں خریدوں گا۔“ مولانا کے اس نظریہ کو معلوم کر کے کچھ دیر تک تو میں سکتے کی حالت میں خاموش رہا اور افسوس کرتا رہا کہ ناحق اِس احمق کے ساتھ مَیں اس دوپہر میں پریشان ہوا۔ مگر کرتا کیا، آ چکا تھا۔ اب میں اِس کشمکش میں تھا کہ آخر اِس ہندو، مگر خلیق دکاندار کو جواب کیا دوں؟ آخر کار میں نے بہت ہی ندامت آمیز لہجے میں کہا، ”جناب! معاف کیجیے گا، مولانا کو اِن ٹرنکوں میں سے کوئی سا بھی پسند نہیں ہے اور نہ اب دوسرے ٹرنکوں کے دکھلانے کی

زحمت ہی آپ گوارہ فرمائیں۔“

دکاندار: آخر کیا بات ہوئی؟ کیوں پسند نہیں آیا۔ میں کچھ دوسرے ٹرنک دکھلاؤں؟

میں: جی نہیں۔ میں نے عرض تو کیا... اب زحمت نہ گوارہ فرمائیں اور اَب تک جو زحمت اُٹھائی اُسے ہی معاف کر دیں تو عین نوازش ہوگی۔

دکاندار: واہ صاحب خوب، اِس میں معاف کرنے کی کیا بات ہوئی؟ اور زحمت ہی کیا ہوئی۔ یہ تو میرا کام ہی ٹھہرا دِن رات کا۔ آپ ہی کی دکان ہے۔ آپ دن بھر میں دس مرتبہ آئیں اور ساری دُکان اُلٹوا پلٹوا کر چلے جائیں، جب بھی گراں نہ گزرے گا۔ یہ تو پسند کی بات ہے، البتہ مجھے افسوس ہے کہ میری دکان کا مال آپ کو پسند نہ آ سکا۔ آپ دوسری دکانیں بھی دیکھ لیں۔ اگر کہیں سودا پٹ جائے تو خیر، ورنہ آپ کی یہ دکان خدمت کے لیے حاضر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ آپ کی باتوں سے کچھ دیر دلچسپی ضرور رہی۔

میں: جناب! آپ کی دکان پر ایسے مال موجود ہیں، جو انتہائی شوق کے ساتھ پسند کیے جا سکتے ہیں، مگر کیا کروں، مولانا کی نظر کو میں، جنھیں کچھ نظر ہی نہیں آتا ہے۔

یہ کہہ کر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ مولانا بھی میرے ساتھ ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔

میں خاموش دِل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ وہ دکاندار کیا کہتا ہوگا اور اُس دیوی نے کیا اثر لیا ہوگا کہ کس قدر نامعقول یہ لوگ آئے ہوئے تھے۔ میں نے جُھلاہٹ میں مولانا سے پوچھا، ”تو اَب کیا ہوگا؟“

فرمانے لگے، ”وہ دیکھو، سامنے مسلم تاجر کی دکان ہے، تہمد پہنے ہوئے بیٹھے ہیں۔ چلو اُن کی دکان سے خرید لیں۔ جانے دو اُس مردود کافر کو۔“

میں نے کہا، ”اور وہ دکاندار اپنے دل میں کہتا ہوگا کہ مارو گولی ایسے مردود خریداروں کو۔“

مولانا نے فرمایا، ”کہنے دو ملعون کو۔“

میں نے کہا، ”اچھا تو اَب اس مسلم دکان پر آپ ہی بات چیت کریں۔ بکس نکلوائیں، دیکھیں بھالیں، پسند کریں، خریدیں یا جہنم میں جائیں، میں تو اَب کی سانس ڈکار نہیں لوں گا۔

مولانا: وہ کیوں؟ میں تم کو ساتھ کس لیے لایا؟

میں: مجھ کو ذلیل کرنے کے لیے اور اپنی حماقتوں کا چشم دید گواہ بنانے کے لیے!

مولانا: نہیں جی راشد سنو! تم کو اس لیے ساتھ لایا کہ تم ذرا خرید و فروخت میں ہوشیار ہو اور میں...

میں: اور میں کیا...؟ احمق ہیں آپ؟ لطف یہ کہ آپ کو ازراہِ خاکساری اپنی حماقت کا اعتراف بھی ہے اور اِس پر طرّہ یہ کہ دوسروں کی عقل و فراست پر بھروسا بھی نہیں کرتے۔ شاید آپ میں حماقت کا سب سے بڑا عنصر اسی چیز کا ہے۔ میں چل کر دکاندار سے فرمایش کر کے بکس نکلواؤں گا، آپ خاموش بیٹھے ہوئے بجّو کی طرح تاکتے رہیے اور آخر میں جھک کر میرے کان میں کہہ دیجیے گا کہ یہ تاجر مسلمان نہیں ہے، اِس لیے میں اس کے یہاں سے سودا نہیں خریدوں گا... پھر میں کیا کر لوں گا آپ کا؟ معاف کرو مولانا مجھ کو اور خود ہی خرید و بیچو۔

مولانا نے معلوم نہیں میری باتوں کو سنا بھی، یا نہیں۔ ایک دکان کے سامنے رُکے اور پھر زینوں پر قدم رکھ کر اُوپر پہونچے۔ میں بھی پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ چڑھا۔ دو زینہ کا چڑھنا ہی کیا تھا، مگر میرے تو قدم نہیں اُٹھ رہے تھے۔ دل ہی دل میں مولانا کو کوس رہا تھا۔ خیر! کسی طرح میں بھی دکان کی سطح پر پہونچا۔ مولانا تو بلا تکلف لُدھیانوی جوتا اُتار کر فرش پر باقاعدہ اس طرح بیٹھ گئے، جیسے یہ اُن کے خالو کی دکان تھی، البتہ مجھ کو اپنے پاؤں سے بوٹ اُتارنے میں زحمت محسوس ہوئی اور یوں ہی پاؤں فرش کے باہر کی طرف پھیلا کر کے بیٹھ گیا۔ جیب سے سگریٹ کی ڈبیا اور دیا سلائی نکالی۔ سگریٹ جلایا اور سڑک کی طرف منہ کر کے لمبے لمبے کش کھینچنے لگا۔ ٹرامویے، موٹریں، تانگے، رکشے، اِدھر سے اُدھر دوڑ رہے تھے۔ سڑک پر ہنگامہ سا برپا تھا۔

اِدھر مولانا تھے اور وہ مسلم تاجر جو تہمد اور بنیائن پہنے بیٹھے ہوئے تھے۔ خوب موٹے تازے، گداز بدن، چھ فٹ کے لانبے قد آور جوان، داڑھی صاف، مونچھیں نیم برید، بٹر فلائی ٹائپ کی۔ آنکھیں غیر معمولی طور پر سرخ اور چڑھی ہوئی، جیسے کسی شرابی کی آنکھیں۔ شاید نیند سے ابھی اُٹھے تھے۔ مولانا صاحب نے اُن سے 'اسٹیل بکس' کی فرمایش کی۔

تاجر صاحب: (نہایت کرخت لہجے میں) کیسا بکس چاہیے؟

مولانا: اسٹیل بکس چاہیے کیسا کیا؟ دکھلائیے تو سہی۔

تاجر صاحب نے پاس ہی سے ایک بکس کھینچ کر مولانا کے آگے بڑھا دیا اور کہا دیکھیے!

مولانا: یہ تو چھوٹا بکس ہے! بائیس انچی، مجھ کو بڑا بکس چاہیے۔

تاجر: تو پہلے ہی کیوں نہیں بتا دیا کہ مجھ کو چوبیس انچی بکس لینا ہے۔ یہ کہہ کر اُٹھے اور اُوپر کی الماری سے ایک بکس اُتار کر مولانا کے سامنے ڈال دیا۔ مولانا نے شہادت کی انگلی سے بکس کی اُوپری سطح کوٹویا اور فرمانے لگے کہ اِس کی چادر تو کمزور معلوم ہوتی ہے۔

مولانا کا یہ جملہ بظاہر تو بہت سیدھا سادہ اور بے ضرر معلوم ہو رہا تھا، مگر خدا جانے کیوں تاجر صاحب کو یہ جُملہ غیر معمولی طور پر کُھل گیا۔ اُن کا چہرہ غصہ میں لال بھبھوکا ہو گیا، جیسے بارود کے میگزین کو آگ دکھا دی گئی ہو۔ فوراً کھڑے ہو کر بکس پر چڑھے اور چڑھ کر دو تین بار زور زور سے ہچ کر اُترے اور مولانا کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے، ”ایسے بکس کی چادر کو تم کمزور بتاتے ہو؟ تمہاری آنکھوں میں کچّا تو نہیں بیٹھ گیا ہے؟“

مولانا: بھئی تم کیسی باتیں کرتے ہو بدتمیزی کی۔ تمیز کے ساتھ بات چیت کرو۔ اتنا سننا تھا کہ تاجر صاحب کا ٹمپریچر تو اتنا ہائی ہو گیا، جس کی کسی طرح اُمید نہ تھی۔ فوراً ہی اُنھوں نے مولانا کے شاداب رخسار پر کھینچ کر ایک چانٹا رسید ہی تو کر دیا۔ مولانا کب برداشت کر سکتے تھے۔ مولانا نے بھی اُسی آن بان کے ساتھ تاجر صاحب کے صفاچٹ کلّے پر دوسرا چانٹا ”ارشاد فرما دیا۔“ مولانا کا چانٹا اتنے زناٹے کے ساتھ پڑا تھا کہ تاجر صاحب کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔ تاجر صاحب بِھر کر اُٹھے اور مولانا کا سر جُھکا کر گھونسوں سے خبر لینی شروع کر دی اور دھائیں دھائیں دس پندرہ گھونسے لگاتار گن دیے۔

میں یہ منظر دیکھ رہا تھا، لیکن بالکل بھوچکا سا ہو کر رہ گیا تھا۔ کچھ عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے اور مجھ کو کیا کرنا چاہیے۔ آخرکار جب مولانا کی یتیمی نہیں دیکھی گئی تو اُٹھ کر میں نے مولانا کا وہی لُدھیانوی جُوتا ایک اُٹھا لیا اور داہنی بغل سے ہو کر تاجر صاحب کا داہنا ہاتھ پکڑ لیا... اپنی پوری قوّت کے ساتھ۔ اور مولانا کا جوتا مولانا کو دے دیا۔ مولانا نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا سر اور گردن تاجر کی گرفت سے چُھڑا لیا اور اَب اُلٹے اُس کی گردن دبوچ لی۔ مولانا بھی

اچھے خاصے طاقتور تھے۔ تاجر نے بہتیری کوشش کی گردن چھوٹ جائے، مگر اُس کی ایک نہ پیش جا سکی۔ اِدھر مولانا نے بھی آموختہ دہرانا شروع کر دیا، ایک ۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات۔ تاجر کے سر پر جب مسلسل جوتوں کی بارش ہونے لگی تو اُس نے آخری بار اپنی پوری قوت سے جھٹکا دے کر وہ ہاتھ چھڑا لیا، جو میری گرفت میں تھا اور چھوٹتے ہی اُس نے مولانا کو تو چھوڑا اور میری پُشت شریف پر ایک مُکّہ ایسا کھینچ کر مارا کہ میرا تو بس انتقال ہی ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے پیٹھ میں لوہے کی سلاخ ڈال دی گئی ہو۔ اتنے میں اِدھر اُدھر والے بہت سارے دکاندار اکٹھا ہو گئے، جنھوں نے مِل جُل کر معاملہ کو درہم برہم کر دیا۔ اور ہم دونوں دکان سے اُتر کر واپس ہوئے۔

میں نے مولانا سے پوچھا... ”فرمایئے، کسی اور مسلم تاجر کی دکان دیکھ لی جائے، یا بس...؟“

* * *

نکتہ چیں

سیّد محمد جعفری

صبح سے شام تک نکتہ چینی کرتا ہوں، قینچی کی طرح زبان چلتی ہے، بحث اور مناظرہ کا بادشاہ ہوں، بلکہ شہنشاہ، نکتہ چینی کے میدان میں بڑے بڑے رستمِ زماں مقابلے میں آئے اور خون تھوک گئے، بڑے بڑے بولنے والوں کے ناطقے بند کر دیے، انسان کے عیب پر، چیزوں کے نقص پر، معاملات کی خرابی پر، کاموں کی خامیوں پر، جتنی جلد میری نظر جاتی ہے۔ شاید ہی کسی کی نظر جاتی ہوگی۔ خدا کے فضل سے کبھی کوئی روشن پہلو نہیں دیکھا۔ جب نظر آیا عیب ہی نظر آیا، جب ڈالی بری نظر ڈالی۔ ایسا ذہن رسا پایا ہے کہ کبھی دھوکا نہیں کھایا ہے۔ پہلی نظر میں تول لیتا ہوں بقول مرزا غالب:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک اِک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے۔

اور مرزا غالب کی بھی کیا حقیقت ہے۔ وہ تو کہیے ایک آدھ صدی پہلے انتقال فرما گئے۔ میرے زمانے میں ہوتے، میرے ہم عصر ہوتے اور یہاں کراچی میں کلفٹن پر ٹہلتے ہوئے مل جاتے، تو وہ نکتہ چینی کرتا، وہ نکتہ چینی کرتا کہ مرزا حیران ہو کر بے ساختہ میرے لیے کہتے کہ ”ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے۔“ مرزا کے کلام پر وہ نکتہ چینی کرتا کہ مرزا شعر گوئی سے توبہ کر لیتے۔ ’غمِ روزگار‘ اور ’غمِ دل‘ کا نام لیتے اور جہاں میرا ذکر آتا گھبرا کر کہتے کہ:

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

اور مرزا غالب پر کیا منحصر ہے، صبح سے شام تک نکتہ چینی کرتا ہوں، زبان کی تلوار سے معلوم نہیں کتنے ایسے فنکاروں کو موت کے گھاٹ اُتار چکا ہوں کہ جو زندہ رہتے تو موسیقی و مصوری و شاعری کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے۔ سالہا سال سے، صبح سے شام تک نکتہ چینی کرتا ہوں اب

حسن وخوبی ورعنائی کی بہاروں سے لطف حاصل کرنے کی قوتیں اور صلاحیتیں کھو چکا ہوں۔ میں خزاں کا پیغمبر ہوں، بربادی وخرابی دیکھ کر خوش ہو جاتا ہوں اور جہاں کوئی اچھی چیز نظر آئی میں نے ایک بھوں چڑھائی، مدتیں ہو چکیں کہ ہمدردی کا جذبہ میرے دل ودماغ سے رخصت ہو چکا، آدمی کی حقیقت میری نظر میں کچھ بھی نہیں:

مزے جہاں کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خون جگر، سو جگر میں خاک نہیں

نہ مجھے کسی سے ہمدردی ہے نہ کسی کو مجھ سے ہمدردی ہے۔ لوگ اپنے معاملات مجھ سے چھپاتے ہیں، رشتے دار اور عزیز مجھ سے کتراتے ہیں، دوست اپنے حالات مجھے نہیں سناتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ نکتہ چینی کروں گا، بنا بنایا کام بگڑ جائے گا، غضب ہو جائے گا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں نکتہ چینی ان کے بھلے کے لیے کرتا ہوں، اللہ نے مجھے یہ کمال عطا کیا ہے، یہ صلاحیت اور یہ استعداد بخشی ہے کہ ایک نظر میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے دکھا دوں، جب خدا نے مجھے یہ نکتہ چینی کی نعمت دی ہے تو اسے خلق خدا کے فائدے کے لیے کیوں نہ کام میں لاؤں۔ اب میری قسمت ہے کہ میں لوگوں کی خدمت کرتا ہوں اور لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں، میں نکتہ چینی کی بدولت ساری دنیا میں اکیلا ہوں، دنیا والے حسد کرتے ہیں، مجھ سے جلتے ہیں کہ یہ اتنا بڑا نکتہ چیں کیوں ہے۔ کوئی میرے پاس پھٹکتا بھی نہیں، میں تنہا ہوں، بالکل تنہا!

میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی، جو لوگ میری نکتہ چینی کے تختہ مشق رہ چکے ہیں، جو لوگ میری زبان کی تلوار سے گھائل ہو چکے ہیں، وہ مجھ سے بیزار ہو کر دُور دُور رہتے ہیں تو انہیں اس بات کا حق ہے اور وہ بالکل ٹھیک کرتے ہیں، لیکن اب تو ان لوگوں نے بھی ملنا ترک کر دیا ہے۔ جس پر میں نے ابھی تک وار نہیں کیا ہے، جن پر اپنے نکتہ چینی کے ہنر کو میں نے ابھی تک آزمایا نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اب میری شہرت مجھ سے آگے آگے چلتی ہے۔ میری نکتہ چینی کی شہرت اور مقامات پر جا پہنچی ہے جہاں میں ابھی تک نہیں پہنچ سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب شکار بڑی مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ کم از کم اس شہر کے لوگ تو خوب چوکنے ہو گئے ہیں۔ کوئی بھولا بھٹکا مسافر باہر سے آجائے تو لاعلمی میں پھنس جاتا ہے۔ میں صبح سے شام تک نکتہ چینی کرتا ہوں اور جب تک جی بھر کے نکتہ چینی نہ کر لوں کھانا ہضم نہیں ہوتا اور صحت خراب ہو جاتی ہے۔ اس لیے میں نے نکتہ چینی

بذلہ سنجوں اور عالم کے مختلف اسلوب ایجاد کرلیے ہیں۔ مجھے صرف نکتہ چینی کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر شخص اور ہر چیز پر نکتہ چینی کرنے کا ایک فارمولا یا اِک نسخہ ہے۔ جیسا آدمی ہوگا ویسا ہی فارمولا یا نسخہ نکتہ چینی استعمال ہوگا۔ کوئی تاجر ہوگا تو اس کے لیے کہوں گا، چور بازاری کرتا ہے، اپنے بھائیوں کا خون چوستا ہے، سماج دشمن عناصر میں سے ہے، اسے روپیہ سے الطفت ہے، روپیہ ہی اس کا دین ایمان ہے۔ کوئی وکیل ہوگا تو کہوں گا کہ یہ غریبوں میں مقدمہ بازی کی آگ بھڑکا کر خود ہاتھ سینکتا ہے، اپنی وکالت چمکانے کے لیے اس نے خاندانوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ کوئی سرکاری ملازم ہے تو کہتا ہوں کہ سفارش سے ملازم ہوگیا ہے، اپنے افسروں کی خوشامد کر کے اپنا اُلو سیدھا کرتا ہے، ورنہ کام سے بالکل ناواقف ہے۔ کوئی ڈاکٹر ہو تو کہتا ہوں کہ آدمیوں کی جانوں سے کھیلتا ہے، فیس کی شکل میں مریض کا خون چوس لیتا ہے جس کی موت کی گھڑی دُور ہو وہ تو اس کے ہاتھ سے بچ کر نکل بھاگتا ہے، ورنہ شہر کے قبرستان اسی ڈاکٹر نے آباد کیے ہیں۔

میں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ ہر طبقہ کے لوگوں میں اچھے آدمیوں کی تعداد بہت کافی ہوتی ہے، ورنہ عالم کا انتظام ایک دن نہ چل سکے۔

نکتہ چینی کرنے کے لیے بڑی سوجھ بوجھ، بڑی احتیاط اور بڑے سلیقہ کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر اگر نکتہ چیں غلط فارمولا یا نسخہ استعمال کرے تب بھی بات بگڑ جاتی ہے۔ اگر وکیل کے لیے کہا جائے کہ مریض کا خون چوس لیتا ہے یا اسکول کے طالب علم کے لیے کہا جائے کہ مقدمہ بازی کی آگ بھڑکاتا ہے یا تاجر کے لیے کہا جائے کہ سفارش سے ملازم ہوگیا ہے تو کون یقین کرے گا۔ تیر ہرگز نشانے پر نہیں بیٹھے گا۔ اس لیے نکتہ چیں کو ایک شاطر شکاری کی طرح جال بچھانا پڑتا ہے۔ اگر وار اچھا پڑے تو شکار زخمی ہوکر بھاگ جاتا ہے اور پھر اس وقت تک ہاتھ نہیں آتا کہ اس کا حافظہ بالکل ہی خراب نہ ہوجائے یا بالکل ہی بے وقوف نہ ہو۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ:

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

میں صبح سے شام تک نکتہ چینی کرتا ہوں، مجھے بڑی مشق ہے، میں نے بڑے بڑے ہزبروں کو مار گرایا ہے، لیکن بعض اناڑی نکتہ چینیوں کی وجہ سے اس شہر میں شکار آسانی سے نہیں ملتا، لوگ آسانی سے ہاتھ نہیں لگتے، پاس پھٹکنے نہیں دیتے، دُور سے ہی مجھے آتا دیکھ کر راہ فرار

اختیار کر لیتے ہیں، مجھے 'بور' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایک شاعر نے تو میری تعریف میں ایک قصیدہ کہہ ڈالا ہے، اس قصیدے میں مجھے 'بور' کے نام سے مخاطب کر کے یوں کہا گیا ہے کہ:

تو مرا دوست ہے اور دوست سے چلتا نہیں زور — میری تقدیر کی گردش نے بنایا تجھے 'بور'
'وقت' کہتے ہیں جسے لوگ کہ 'سرمایہ ہے' — کتنی افراط سے حصے میں تیرے آیا ہے
دُور سے دیکھ کر انساں تجھے گھبراتے ہیں — شاہ راہ چھوڑ کر گلیوں میں نکل جاتے ہیں
نکتہ چینی سے تیری بھاگتے ہیں خورد و کلاں — تو جو چاہے تو کراچی میں بھی خالی ہو مکاں

دیکھا آپ نے اب یہ صورت حالات ہو گئی ہے۔ اب کوئی فرد و بشر ہاتھ نہیں آتا اس لیے میں نے یہ طریقہ نکالا ہے کہ حکومت پر نکتہ چینی کرتا ہوں، حکومت پر نکتہ چینی کرنے کے لیے کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔ بہت سے فارمولے استعمال ہو سکتے ہیں، مثلاً اگر اب کے سال سردی کی لہر آئی تو میں کہوں گا کہ یہ حکومت کی سرد مہری کی وجہ سے آئی ہے، یہ باہر کے ملکوں سے جاڑا منگوا لیتے ہیں اور عوام کا خیال نہیں کرتے اور اگر بالفرض محال انہوں نے جاڑا نہیں منگوایا اور وہ بغیر ویزا کے چلا آیا ہے تو یہ سرحد پر بیٹھے ہوئے کیوں مکھیاں مار رہے تھے؟ اس نکتہ چینی میں تمام سابق سزا یافتہ لوگ وہ لوگ جو کسی الیکشن میں ہار چکے ہیں، یا وہ لوگ جو نام و نمود کے خواہشمند ہیں، یا کسی ٹھیکے کے حاصل کرنے میں ناکام رہے، یا جن پر کام نہ کرنے کی وجہ سے ان کے افسر نے سختی کی ہے، سب لوگ میرے، ہم آواز ہو جائیں گے۔

یہ ایک خاص فن ہے، اس کو نکتہ چینی برائے نکتہ چینی کہتے ہیں۔ اس سے قوم اور ملک کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ حکام اس کی وجہ سے بہرے ہو جاتے ہیں، پھر وہ سچی بات بھی نہیں سنتے۔ اس سے دنیا اور عاقبت دونوں سنورتی ہیں، اللہ مجھے معاف کرے میرا انجام کیا ہوگا۔

* *

بہوؤں میں ہے ایک!

سیّد معراج جامی

جانباز ہاشمی کے اعزاز میں پہلی بار سین ریو کا ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ جاپانی صنفِ سخن ہائیکو یا سین ریو کا کوئی اعزازی مشاعرہ منعقد ہوا ہو۔ ہم بھی گئے کہ ہاشمی کے پرزے اُڑتے دیکھیں گے۔ تقاریر کے بعد صاحبِ اعزاز کا نمبر آیا تو سامعین ہمہ تن گوش ہو گئے۔

صاحبِ اعزاز نے پہلے تو منتظم مشاعرہ کا شکریہ ادا کیا، کیوں کہ یہ بہت ضروری ہوتا ہے، اس سے آگے کی راہ کھلتی ہے۔ پھر انھوں نے تقریر کے انداز میں گفتگو کی۔ کہنے لگے کہ میں ایک مدت سے سین ریو کہہ رہا ہوں، مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری بہو، جو ماشاءاللہ تعلیم یافتہ ہے اور اسے ادب سے لگاؤ ہے، وہ بھی چپکے چپکے کچھ شعر موزوں کر لیتی ہے۔ یہ بھید اِس مشاعرے میں آنے سے چار پانچ دن پہلے کھلا۔ جس دن میری بیوی نے مجھے بہو کے لکھے ہوئے سین ریوز دیے۔ کہنے لگیں کہ بہو نے یہ کاغذ چپکے سے میرے سرہانے رکھ دیا اور جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے کاغذ کھول کر دیکھا تو جی خوش ہو گیا۔ اب یہ آپ کی نذر ہے۔ یہ کہہ کر بیوی نے وہ کاغذ مجھے تھما دیا۔

آج اپنے اعزاز میں ہونے والے اس سین ریو مشاعرے میں، مَیں چاہتا ہوں کہ اپنے سین ریو سنانے کی بجائے آپ کو اپنی بہو کے سین ریو سناؤں۔ یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو ان سین ریو سے زیادہ لطف اور خوشی حاصل ہو گی۔ دراصل یہ سین ریو میری بہو نے اپنے سسرالی رشتے داروں، یعنی ہم پر کہے ہیں۔ سسرال میں اس کا واسطہ جس جس سے پڑا، اُس نے اس کو سین ریو میں نظم کر دیا۔ سسرال میں سب سے پہلا واسطہ ایک بہو کا ساس سے پڑتا ہے۔ بہو اپنی ساس کے بارے میں اور اپنی ساس سے کیا کہتی ہے، ملاحظہ فرمائیے:

بہو بیاہ کر گھر آئی تو میری بیوی نے اس سے اپنا تعارف جب روایتی ساس کی طرح کروایا تو

بہو جھرجھری لے کر رہ گئی۔ وہ بے چارگی کے عالم میں بولی:

ٹیس سے بھر گیا ماس / جب بڑھیا نے مجھ سے کہا / میں ہوں تیری ساس!

بیٹے پر شادی کے بعد ماں کا حق ختم ہو جاتا ہے۔ بیوی کا حق غالب آ جاتا ہے۔ یہ فطرتِ بنتِ حوا ہے، مگر اِس حق کو حوا، یعنی ساس نہیں مانتی تو دوسری بنتِ حوا یعنی بہو یوں سمجھاتی ہے:

کیا سمجھی بڑھیا / اب یہ میرا شوہر ہے / تیرا تھا بیٹا!

ساس عموماً بہو کے ناروا سلوک پر اُسے سوکن لانے کی دھمکی دیتی ہے۔ میری بیوی بھی ایک روایتی ساس ہے، اس لیے وہ اس فریضے سے کیسے غافل رہ سکتی ہے۔ اپنی بہو کو ایک دھمکی دے دی، جس پر بیٹا بہت خوش ہوا اور اُس نے بھی ایک سین ریو کہہ کر شہیدوں میں نام لکھوالیا:

پھر قسمت چمکی / بیوی کو ماں دیتی ہے / سوکن کی دھمکی

اس پر میری بہو نے اپنی ساس کو بڑے پیار سے سمجھایا:

قبر کو بھر دوں گی / سوتن کا گر سوچا بھی / سوتن کر دوں گی

اس پر میری بیوی خاموش ہو گئی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر بہو کا مارے خوشی کے بُرا حال تھا۔ اللہ تعالیٰ سے دونوں ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنے لگی:

گونگی، بہری ہے / ایسی ساس ملے سب کو / جیسی میری ہے!

میں نے بیوی کو سمجھایا کہ تم ساس بن کر مت سوچو، کیوں کہ تم بھی کبھی بہو تھیں۔ یاد رکھو:

رشتہ نہیں کچا / مر کر بھی نہیں چھوٹے گا / میکے کا رستہ

نیز یہ بات بھی اپنے پلے سے باندھ لو:

بادِ صبا ہو گی / ناف گڑی ہے میکے میں / کیسے جدا ہو گی!

مگر یہ بات بیوی کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ ایک ظالم ساس بننے پر کمر بستہ ہو گئی، گرچہ اس نے ایسا کیا نہیں۔ مگر پیش قدمی کرنا تو عقل مندوں کی نشانی ہے اور میری بہو بہت عقل مند ہے، اس لیے اس نے ساس کے بیمار ہونے پر اطمینان کا سانس لیا:

بڑا مہربان دو عالم

بندھی ہے اب کچھ آس/ آنکھوں میں دم اٹکا ہے/ میری پیاری ساس!

گھر کے دیگر افراد کا حسنِ سلوک بھی اسے پسند تو ہے، مگر بات وہی پیش قدمی کی ہے کہ اس ے پہلے کہ کسی جانب سے حملہ ہو، خود کو تیار رکھو اور حملے سے پہلے زبانی طور پر اس قدر دھمکا دو کہ کوئی حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ جیٹھ کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کیا:

بالکل بنیا سیٹھ/ ڈمری کے پیچھے اپنی/ چمڑی دے دے جیٹھ

جیٹھانی کو بھی جتایا کہ:

جیٹھانی کا رعب/ چولھے میں جھونکوں گی اسے/ میرے لیے ہے چوب

نندوں کو بتا دیا تھا کہ:

میری ہر اک نند/ اب میں جھاڑو پھیروں گی/ صاف کروں گی گند

دیور کو سمجھایا کہ:

دیکھ مرے دیور/ خود سیدھا ہوتا ہے یا/ سیدھے کروں تیور

دیوانی کو خبردار کیا کہ:

شوخی، مستی، چال/ دیکھنا میں کیا کرتی ہوں/ دیورانی کا حال

یہ سب سن کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ مگر ایک افسوس بھی ہوا کہ میں اپنی بہو کو اتنا چاہتا ہوں، مگر اُس نے مجھے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ ایک سین ریو مجھ پر بھی کہتی تو میں بھی دوسروں کی نظروں میں سرخرو ہو جاتا۔ مگر میں یہ بات اس سے براہِ راست نہیں کہہ سکتا تھا، کیوں کہ اس کی اور میری حیا دونوں ایک دوسرے سے مانع تھیں۔ بالآخر میں نے بیوی سے اپنے دل کا ملال کہہ دیا۔ عورت ذات میں یہ کمال ہے کہ وہ کسی دوسرے کی بات کو اپنے جہنم کا ایندھن نہیں بناتی، فوراً دوسرے کو پاس آن کر دیتی ہے۔ یہی بیوی نے کیا۔ میری خواہش کو بہو تک پہنچا دیا۔ بیوی نے بتایا کہ یہ سن کر پہلے تو وہ شرمائی اور پھر گھنٹہ بھر بعد ایک کاغذ مجھے پکڑا کر مسکراتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بیوی نے کاغذ کھولا اور پڑھا۔ پھر جب میں گھر آیا تو مجھے مبارک باد دی کہ آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے بہو نے آپ کے لیے بھی سین ریو کہہ دی ہے۔ اب آپ بھی دوسروں کے

آگے سرخرو ہو جائیں گے۔ میں نے بہو کا دیا ہوا کاغذ کھولا اور اُس کی لکھی ہوئی سین ریو پڑھی تو دل باغ باغ ہو گیا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

سسر تو سسرا ہے / کہنے کو مونچھیں بھی ہیں / پھر بھی خسرا ہے

مجھے اپنی بہو کی سخن گوئی پر رشک آیا اور حیرت اس بات پر ہوئی کہ اس نے جاپانی صنفِ سخن ‘سین ریو’ میں اس قدر کمال حاصل کر لیا ہے۔ یہ خبر میرے لیے الیکٹرونک میڈیا کی زبان میں ‘بریکنگ نیوز’ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سین ریو پر میں نے اپنی بہو کو دعائیں دیں اور اُن لوگوں کے لیے بھی دعا کی جو اپنے گھر میں بہو لانے والے ہیں:

خدمت گار اور نیک / اللہ ایسی سب کو ملے / بہوؤں میں ہے ایک!

⁂

نشترِ طنز سلامت

شان الحق حقی

آخر فضلو سے میرا یہ معاہدہ طے پایا کہ جب بھی بیگم صاحب اسے سخت سُست کہیں گی، وہ مجھ سے چار آنے وصول کرے گا۔ یہ بطور تالیف قلب تھا۔ ذکر جب کا ہے کہ چونی چلتی تھی، بلکہ گول والی میں کچھ چاندی کی پٹھ بھی ہوتی اور روپیہ ٹھیکری نہ ہوا تھا۔

ڈانٹ اسے پڑتی اور ہول مجھے اُٹھتے کہ اب یہ نوکر بھی ہاتھ سے گیا۔ آئندہ آپ جانیں نوکر تو ہوں گے نہیں، روبوٹ ہوں تو ہوں اور اُن میں بھی ڈھٹائی کی بڑی موٹی رگ رکھنی پڑے گی۔

کچھ دن تو یہ سلسلہ خاصی طرح چلتا رہا، مگر وہی بات کہ ایک مسئلہ سلجھاؤ تو دس مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔ اوّل تو فضلو سے ڈانٹ کھانے کے شوق میں اور زیادہ قصور سرزد ہونے لگے، جنہیں بیگمات اپنی اصطلاح میں 'بدذاتیاں' کہتی ہیں اور زیادہ بڑے ہوں تو 'حرام زدگیاں'۔ واضح رہے کہ اصطلاحی اور لغوی معنی میں کوئی ربط لازمی نہیں۔ اصطلاح میں نئے معنی پھونکے جاتے ہیں۔ قول شاعر تو یہ بھی ہے کہ:

نہیں ہے چشمِ فطرت میں کوئی پھول
زمیں کی کوکھ کا جایا حرامی

خیر! تو بیگم نے جب یہ دیکھا یہ بھیگی بلی بنا سب کچھ سنتا ہے اور نہ اُلٹ کر جواب دیتا ہے، نہ بھاگ جانے کی دھمکی تو وہ اور بھی اُس پر برسنے لگیں اور اُس کا حساب مجھ پر چڑھتا چلا گیا۔

پھر ایک مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ آخر دو فضیحتوں کے درمیان کتنا وقفہ ہونا چاہیے کہ انہیں دو علاحدہ فضیحتے شمار کیا جائے۔ میرا کہنا تھا کہ دن بھر کی ڈانٹوں کا ایک ہی یکجائی مطالبہ کافی ہے۔ فضلو کا اصرار تھا کہ ڈانٹ خواہ چند گھنٹوں کے وقفے سے ہو یا چند منٹوں کے وقفے سے، بہرحال ڈانٹ ہے اور ہر ڈانٹ علاحدہ شمار ہوگی۔ گویا ایک سانس میں ڈانٹ کھلائی یا پلائی جائے، وہ ایک ڈانٹ

ہوئی اور دوسری سانس میں دوسری۔ یہ حساب میری استطاعت سے باہر تھا اور میں نے معاہدہ ختم کرنا چاہا۔ اس پر وہ کچھ پسیجا اور اِس بات پر راضی ہوا کہ صبح کی ڈانٹ صبح کے حساب میں لگے گی خواہ لمبی ہو یا بالتکرار۔ اِس کی مدّت ناشتے کے برخاست ہونے تک رہے گی۔ پھر ناشتے سے دوپہر کے کھانے تک دوسری مدّت، کھانے سے چائے تک تیسری، رات کے کھانے تک چوتھی اور اُس کے بعد پانچویں۔ مگر کوئی دن خالی نہ جاتا کہ مجھ پر اچھی خاصی چٹی نہ پڑ جائے۔ فضلو نے جہاں دیکھا کہ وقت نکلا جا رہا ہے، وہ چائے یا کھانا لگاتے لگاتے ایک آدھ واردات کر گزرتا اور میں منہ دیکھتا رہ جاتا۔

اس طرح بے تکان ڈانٹ کھانے پر میں نے اسے ایک بار ڈانٹا بھی۔ اس پر وہ اور بھی سر پر چڑھا۔ بولا، ”دام صرف بیگم صاحب کی ڈانٹوں کے نہیں، آپ کی ڈانٹوں کے بھی لگیں گے۔ اس کے علاوہ شام کے بعد جو ڈانٹ ہوگی اُس کے دام دگنے ہوں گے، بطور اوور ٹائم، ڈانٹ خواہ آپ کی ہو یا بیگم صاحب کی۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایک منٹ سے زیادہ دورانیے کی ڈانٹ کے دگنے دام ہونے چاہییں۔“ ریڈیو ٹی وی سنتے سنتے ان کے مخصوص الفاظ اسے اَزبر ہو گئے تھے۔

ایک جھگڑا اِس بات پر چلا کہ کون سے الفاظ ڈانٹ کی تعریف میں آتے ہیں کون سے نہیں۔ مثلاً ایک بار بیگم نے صرف اتنا کہا، ”شاباش تیری ڈھٹائی کو۔“ میرا کہنا تھا کہ یہ ڈانٹ نہیں، شاباش تھی۔ اس نے کہا، ”اِس میں صاف طنز ہے۔“ میں نے کہا، ”طنز کے معاوضے کا میں نے ذمہ نہیں لیا۔“ تصفیہ یہ ہوا کہ اس طرح کے طنز کے آدھے دام لگیں گے، کیوں کہ جان اس پر بھی تھوڑی بہت جلتی ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ زیادہ ہی جلتی ہے۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ ایک بار بیگم نے ایک ایسا فقرہ کہا کہ فضلو بے اختیار ہنس پڑا۔ میں نے کہا، ”اِس کو حساب میں نہیں لوں گا۔“ اُس نے کہا، ”یہ صاف طعنہ تھا۔“ میں نے کہا، ”جس کی جان جلے وہ ٹھٹھا نہیں مارتا۔ اس پر تو کچھ پیسے کم ہونے چاہییں کہ تیرا دل خوش ہوا۔“ خیر! وہ مشکل سے مانا، مگر مان گیا کہ جس فقرے پر اُسے ہنسی آجائے، وہ نہیں گِنا جائے گا۔

اب میں نے بیگم کے فقروں پر قہقہے لگانے شروع کیے کہ فضلو بھی ہنسے اور میرا بوجھ کم ہو، مگر کیا مجال جو اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل جائے۔ حد یہ کہ نہایت پُر لطف فقروں میں بھی اُس کی

رکھائی میں فرق نہ آتا کہ ناحق کچھ پیسے کم ہو جائیں گے۔ ایک دفعہ بیگم نے کہا، ”مسز احمد کو اللہ کی رحمت سے ’رحمت‘ ملا ہے۔ کیسا بھاگ بھاگ کے کام کرتا ہے۔ ہمیں فضلِ خدا سے ’فضلو‘ میسر آئے۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔“ میں نے اس برجستہ تلازمے پر زور کا قہقہہ لگایا، مگر فضلو ٹس سے مس نہ ہوا۔ ویسے ہی منہ لٹکائے کھڑا رہا۔ اِدھر بیگم مجھ سے اُلجھنے لگیں کہ تم میری ہر بات کو ہنسی میں اُڑاتے ہو، وہ بھی نوکر کے سامنے۔

ایک دفعہ بیگم نے مجھے فضلو سے کھسر پسر کرتے دیکھ لیا۔ جھگڑا ڈانٹوں کے حساب پر تھا۔ وہ کہتا تھا، ایک سو بیس روپے آٹھ آنے ہوئے۔ میرے حساب سے بمشکل چورانوے روپے بنتے تھے۔ بیگم صاحب کے کان کھڑے ہوئے۔ بولیں، ”یہ فضلو آپ سے روپے کاہے کے مانگ رہا تھا؟“ میں نہ کہا، ”یونہی اسے کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔“ پوچھا، ”کاہے کے لیے۔“ میں نے کہا، ”شاید جوتا وغیرہ خریدنا چاہتا ہے۔ کچھ دام کم پڑ رہے ہیں۔“ بولیں، ”واہ! ابھی تو میں نے اسے تنخواہ دی ہے اور ایک جوتا تو اِس نے پچھلی عید ہی پر خریدا ہے۔ دو ایک پہلے کے ہیں اور ایک پشاوری چپل اِن کے علاوہ ہے۔“ آخر مجھے سچ بولنا پڑا۔ اس پر اُن کا برہم ہونا لازمی تھا۔ کہنے لگیں، ”میں ہرگز اس نمک حرام کو کچھ نہیں لینے دوں گی۔“ میں نے کہا، ”ذرا آہستہ۔“ ان کی آواز اور تیز ہوگئی۔ ”کیسے پیسے، کہاں کے پیسے۔ سب گھروں میں نوکروں کو ڈانٹ پڑتی ہے۔ کوئی اس کے الگ سے دام نہیں دیتا۔“ گویا یہ تنخواہ میں شامل ہوتے ہیں۔ مجھے یہ نکتہ سوجھا ہی نہ تھا۔ خیر! میں نے کہا، ”میں قول دے چکا ہوں۔ ہم مغل بچے ہیں۔ قول سے نہیں پھر سکتے۔“ وہ بولیں، ”میں بھی پٹھانی ہوں اور میں نے کوئی قول وول نہیں ہارا ہے، بلکہ اس کا بہت لحاظ کیا ہے۔ جیسی اس نے میری جان جلائی ہے، میرا ہی دل جانتا ہے۔“ میں نے کہا، ”میں تمہاری ڈانٹوں کے دام تم سے نہیں دلوا رہا، خود ہی دوں گا تو پھر کیا ہے؟“ اِدھر وہ اَڑ گئیں، اُدھر وہ اُڑ گیا۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ دُھن کا پکا قول کا سچا ہے۔ دام دے گا، پَر دے گا۔

سو اَب ایسا ہے کہ انہیں طیش آتا ہے تو دانت پیس کے رہ جاتی ہیں۔ بچت ہی بچت ہو رہی ہے۔ فضلو نے پہلے تو انہیں ڈانٹوں پر بہت اُکسایا، مگر اَب اُسے صبر آ گیا ہے۔ مجبوری کا نام صبر۔ بے چارہ خطا کرتا ہے اور ڈانٹ نہیں کھا سکتا۔ چاہیں تو آپ بھی اپنے گھر میں یہ نسخہ آزمائیں۔ اس

پر پہلے کوئی سو سوا سو روپے کا خرچ ہے، یعنی اگر صحیح حساب کیا جائے اور کارِ ثواب تو ہے ہی، بلکہ ایک اخلاقی فرض، ”آدمیت کا احترام آدمی۔“ ہم تو کام چور افسروں اور نالائق وزیروں تک کا احترام کرتے آئے ہیں۔ ہماری بیگمات ان کی نگرانِ کار ہو جائیں تو مزا آجائے۔ خدا اُن کی حسِ تنقید کو تیز اور نشترِ طنز کو سلامت رکھے اور راہِ راست پر لگائے۔

* *

شیخ چاند

محمد شجاع الدین غوری

شیخ چاند ہمارے بچپن کے دوست ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ ہمارے پیدائشی دوست ہیں۔ شیخ چاند کی وجہ تسمیہ کافی دلچسپ ہے۔ شیخ چاند کے والد کا نام شیخ بدرالدین ہے۔ والدہ کا مہتاب بیگم، بڑی باجی کا قمر جہاں اور چھوٹی باجی کا ماہ منیر ہے، یعنی ایں خانہ ہمہ مہتاب است۔ دو لڑکیوں کے بعد جب شیخ بدرالدین صاحب کے ہاں اولادِ نرینہ کی ولادت باسعادت ہوئی تو لوگوں نے یوں بات پھیلائی کہ اس گھر کو پہلے ہی چار چاند لگے تھے، اب پانچواں بھی چڑھ آیا۔ یہ بات نہ صرف قبول خاص و عام ہوئی، بلکہ زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھتے ہوئے اہل شیخ کے دل میں بھی گھر کر گئی۔ بڑے شیخ صاحب کے کچھ بے تکلف دوستوں نے باپ بیٹے کو حسبِ مراتب 'فل مون' کے خطاب سے نواز رکھا ہے، جب کہ محلے کی چند من چلی لڑکیوں نے انہیں نوی کا چاند مشہور کر رکھا ہے۔

یہ بات یقینی طور پر کوئی نہیں جانتا کہ ہم دونوں میں چھوٹا کون ہے۔ شیخ چاند کی عمر حسبِ ضرورت چاند کی طرح گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اُن کی والدہ کا خیال ہے کہ وہ مجھ سے چھوٹے ہیں اور بڑی والدہ کا کہنا ہے کہ میں ان سے چھوٹا ہوں۔ انڈہ پہلے یا مرغی کے مخمصے کو یہیں رہنے دیجیے، کیوں کہ ہماری پریشانی کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ وقت بے وقت، موقع بے موقع، دن دھاڑے ہمارے گھر پر حملہ کرنا، رات کے کسی پہر شب خون مارنا، ان کی عادت بن چکی ہے۔ بچے چاند چاچا کو دیکھ کر بے حد خوش ہوتے اور تالیاں بجا بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ بیگم ان کی آمد پر ناک بھوں چڑھاتی ہیں اور ہاتھ پیر جھٹک کر اپنی ناراضی کا اظہار کرتی ہیں۔ ہم بے بس ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بارہا سمجھایا کہ شریفوں کے آنے جانے کے کچھ اوقات و آداب ہوتے ہیں، لیکن سب بے سود۔ چکنے اتنے کہ اچار کا گھڑا بھی مات کھا جائے، کسی

بات کا کوئی اثر نہیں لیتے، ایک کان سے سننا دوسرے سے اُڑا دینا، آپ کے لیے ایک محاورہ ہوگا، لیکن یہ بات ان پر صادق آتی ہے۔

اُن کا آنا جانا، دھمکنا دھمکانا، سب کچھ گوارا، مگر اس کا ہم کیا علاج کریں کہ وہ خود کو سقراط و بقراط سمجھتے ہیں۔ ہر مسئلہ کا حل اور ہر مرض کا علاج منٹوں سیکنڈوں میں پیش کر دیں۔ ہر بات میں دخل دینا، بات بات پر بحث کرنا اور اپنی بات پر اڑ جانا اُن کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ دنیا کا ایسا کوئی موضوع نہیں، جس پر موصوف کامل دست رس نہ رکھتے ہوں۔ اُردو زبان و اَدب پر تو آپ کی خاص نظرِ عنایت ہے۔ شاعری کی جملہ اصناف کا اپنے آپ کو استادِ کامل سمجھتے ہیں۔ عام گفتگو عموی انداز میں کرتے ہیں، لیکن اگر بات زبان و بیان پر ہو تو آپ کے منہ سے روز مرّہ، محاورے ضرب الامثال اور کہاوتوں کے موتی برسنے لگتے ہیں اور اگر ذکر شعر و شاعری کا ہو تو اشعار کے دریا بہا دیتے ہیں۔

کل ہی کی بات ہے، رات تقریباً دس بجے ہوں گے۔ بیگم بچوں کی دھما چوکڑی سے تنگ آئی بیٹھی تھیں۔ ایک دو کی پیٹھ بھی سہلا چکی تھیں، تیور انتہائی خطرناک تھے۔ باقی بچوں کے ساتھ ہم بھی جل تو جلال تو صاحب کمال تو آئی بلا کو ٹال تو کا ورد کرتے ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں دبک بیٹھے تھے کہ کہیں اس کے بعد ہماری کوتاہیوں اور بچوں کی طرف سے لاپرواہیوں کے دفتر نہ کھل جائیں۔ ہماری بیگم کے جلال کے چرچے دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ کبھی کوئی بے تکلف سہیلی اُن سے پوچھ بیٹھتی کہ ”تمہاری چنگیز خانی پر تمہارے شوہر کچھ نہیں کہتے؟“ تو وہ مسکرا کر مجاز کے سے انداز میں جواب دیتیں، ”لوگوں کی بیویاں سعادت مند ہوتی ہیں، لیکن خوش قسمتی سے میرے شوہر سعادت مند ہیں۔“

ایسے خطرناک لمحات میں جب کہ لحظہ لحظہ حرب و ضرب کے اندیشے بڑھ رہے تھے، اچانک شیخ چاند آ موجود ہوئے۔ حسبِ عادت انہوں نے اپنی آمد کا اعلان دروازہ پیٹ کر اور چائے کا مطالبہ گلا پھاڑ کر کیا جو کہ بیگم کو ہمیشہ سے ناپسندیدہ رہا ہے۔ اُن کی اس حرکت نے آگ پر تیل کا کام کیا۔

”چاند بھائی! چائے ختم ہوگئی۔ یہ تو بازار جاتے نہیں، رات کا وقت ہے، بچوں کو کہاں بازار بھیجوں۔ صبح ہوگی تو چائے آئے گی۔ اب آپ صبح تک تو انتظار کرنے سے رہے۔“ لہجہ نیم چڑھے کریلے سے بھی کڑوا اور انداز کاٹ کھانے والا تھا۔

ہم ابھی تک اپنے دفاعی مورچے میں دبکے ہوئے تھے۔ احتیاط کا تقاضا بھی یہی تھا کہ جب تک حالات امن اور صلح کا رُخ نہ اختیار کر لیں، ہمیں اپنا محاذ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ نہ جانے کس وقت حالات پلٹا کھائیں۔ شیخ چاند کی آمد سے جنگ بندی کی اُمید کم ہوگئی۔ بیگم کی بم باری اور شیخ چاند کی چاند ماری کے اندیشے بڑھ گئے تھے۔ بیگم کی کسی بات کا نہ اس سے پہلے کبھی ان پر اثر ہوا تھا نہ اب ہوا۔ ان کی بات سن کر پہلے تو وہ مسکرائے، پھر جیب سے چار عدد چائے کی تھیلیاں نکال کر بیگم کی جانب بڑھاتے ہوئے کہنے لگے:

”لیجیے دو اَب کام میں لائیے اور دو صبح کے لیے اُٹھا رکھیے۔“ بیگم ہکا بکا کبھی شیخ چاند کو، تو کبھی اُن کے ہاتھ میں جھولتی چائے کی تھیلیوں کو دیکھنے لگیں۔

ہم اپنے دفاعی مورچہ میں دبکے اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ رہے تھے، تاکہ بے اختیار نکلنے والے قہقہہ کا راستہ روک سکیں۔

”جب آپ کے پاس چائے موجود ہے تو پھر گھر سے پی کر کیوں نہیں آئے؟“ شرمندگی اور جھنجھلاہٹ کے باعث جب اُن سے کچھ بن نہ پڑا تو ایک عام سی بات کہہ ڈالی۔

”ہمیں کھانا اپنے گھر کا اور چائے دوسرے کے گھر کی پسند ہے۔“ وہ یہ بات ایک جھونک میں کہہ تو گئے، پھر فوراً ہی سنبھالا لیتے ہوئے کہنے لگے،

”بات دراصل یہ ہے بھابی! کہ آپ کے ہاتھ کی بنی چائے اتنی عمدہ اور لذیذ ہوتی ہے کہ باربار پینے کو جی چاہتا ہے۔ اللہ بخشے نانا مرحوم کہا کرتے تھے، میاں! چائے پینے کا لطف تب ہی آتا ہے، جب چائے لب ریز ہو، لب دوز ہو اور لب سوز ہو اور یہ تینوں خوبیاں آپ کی چائے میں بخوبی پائی جاتی ہیں۔“

اس چکنے چپڑے مکھن میں لتھڑے جواب کو سن کر ہم تصور ہی تصور میں بیگم کو آسمان غضب کی بلندیوں سے اُتر کر بحرِ ستائش کی اتھاہ گہرائیوں میں تیرتا دیکھ رہے تھے۔

وہ اپنی بات کو یوں جاری رکھے ہوئے تھے۔ ”بخدا اگر آپ کے ہاتھ کی بنی چائے کا مزہ اردو ادب کے شعرائے متقدین و متاخرین نے چکھا ہوتا تو یقین کیجیے، اُن کی شاعری سے چائے کا رنگ جھلکنے لگتا۔ وؔلی دکنی چائے کے مضمون پر شعر کہتے تو یوں کہتے:

اے وؔلی دردِ سر کبھو نہ رہے
گر ملے چائے اُن کے ہاتھوں سے

میر تقی میر کہتے تو یوں کہتے:

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی تک چائے پی کر سو گیا ہے

غالب کہتے تو یوں کہتے:

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
چائے ہر رنگ میں چلتی ہے سحر ہونے تک

مجاز کہتے تو یوں کہتے:

چھوڑ دے مطرب بس اب للہ مجھ کو چھوڑ دے
چائے کا یہ وقت ہے، کچھ چائے پینے دے مجھے

اور علامہ اقبال نے تو 'ساقی نامہ' کے بجائے چائے نامہ لکھا ہوتا:

وہ چا جس سے روشن ضمیر حیات
وہ چا جس سے ہے مستیِ کائنات
وہ چا جس میں ہے سوز و سازِ ازل
وہ چا جس سے کھلتا ہے رازِ ازل
اُٹھا ساقیا پردہ اس چائے سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

اس سے پہلے کہ شعرائے کرام کی فہرست طویل ہو کر ایک عظیم الشان مشاعرے کی شکل اختیار کر لیتی، ہم اپنی پناہ گاہ سے نکل آئے۔ شیخ کو بازو سے پکڑا اور ڈرائنگ روم کی جانب کھنچتے چلے گئے... اور بیگم اپنی تعریف میں سرشار چائے کی تھیلیوں کو دائیں بائیں ہلاتی باورچی خانے کی جانب چلی گئیں۔

* *

غالبؔ کے مصرعے

شفیع عقیل

جس طرح اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب شاعر تھے، اسی طرح اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب نے مصرعے پہلے کہے اور اشعار بعد میں۔ ہر شاعر (''آزاد شاعروں'' کو چھوڑ کر) پہلے مصرعہ کہتا ہے اور بعد میں شعر۔ وہ مصرعہ اولیٰ ہو یا مصرعہ ثانی۔ بعض اوقات یوں بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مصرعہ میں شاعر اپنا پورا مطلب بیان کر چکتا ہے، لیکن چوں کہ شعر کے لیے دو مصرعوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے، اس لیے وہ ایک مصرعہ بطور 'پخ' لگا دیتا ہے، تا کہ مصرعہ شعر بن جائے۔ بیشتر یوں بھی ہوتا ہے کہ شاعر مصرعہ ثانی پہلے کہہ لیتا ہے اور جب وہ شعر مکمل کرنے کے لیے دو مصرعے اکٹھا کرتا ہے تو چول چوکس نہیں بیٹھتی اور معانی میں کچھ 'گڑبڑ گھوٹالا' پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے کسی شاعر کے صحیح خیالات اور مطالب جاننے کے لیے ضروری ہے کہ شعر کی بجائے اس کے مصرعوں کی تشریح کی جائے۔ غالب کے اِن چند مصرعوں کی تشریح 'یارانِ نکتہ داں' کے لیے 'صلائے عام' کی حیثیت رکھتی ہے:

''کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک''

حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ نے اس مصرعہ میں کوزے میں دریا بند کر دیا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ غالبؔ کے محبوب نے اُسترے سے اپنا سر منڈوا رکھا ہے۔ غالبؔ اُس سے وصل کے لیے کہتے ہیں، محبوب پہلے تو حیلے بہانے کرتا ہے اور پھر کہتا ہے، چلو ہمیں منظور، مگر مطالبہ جب مانا جائے گا، جب اس 'چٹیل میدان' پر بال اُگ آئیں گے اور سر پر زلفیں ہو جائیں گی۔ اب ظاہر ہے بال اُگنے اور پھر زلفیں بننے کے لیے کم از کم دو تین برس درکار ہیں، اس لیے غالبؔ کہتے ہیں، جب تیرے زلفیں آئیں گی اُس وقت تک کون جیے گا!

"آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں"

غالب کا یہ مصرعہ پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت اگر علامہ مشرقی نہیں تو خاکسار تحریک ضرور موجود تھی اور غالب خود خاکساروں میں بھرتی ہو چکے تھے، چنانچہ اس مصرعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی میں اِن دنوں خاکساروں کا کوئی ہنگامی جلسہ ہو رہا تھا، اس لیے غالب کہتے ہیں کہ آج وہاں، یعنی جلسہ میں، تیغ باندھ کر جاتا ہوں۔ ہو سکتا ہے، اُس وقت خاکسار بیلچے کی جگہ تیغ، یعنی استرا رکھتے ہوں!

"لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں"

اس مصرعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب پنجابی زبان بھی جانتے تھے، کیوں کہ اس میں 'نالا' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور نالا پنجابی زبان میں اُزار بند کو کہتے ہیں۔ اس مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ جب لوگوں کے پاس پائجامہ یا شلوار میں ڈالنے کے لیے اُزار بند نہیں ہوتا تو وہ اُس کی جگہ رسا ڈال کر شلوار یا پائجامہ باندھ لیتے ہیں۔ غالب نے مصرعہ میں اُس وقت کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے۔ 'رسّا' مشدد تھا، لیکن 'ضرورت شعری' کے لیے 'رسا' استعمال کر لیا گیا ہے:

"نہیں نگار کو اُلفت نہ ہو، نگار تو ہے"

غالب بچپن ہی سے بڑے رنگین مزاج واقع ہوئے تھے اور جوانی میں دہلی کے بانکوں میں قدم رکھتے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے اس مصرعہ میں فلم ایکٹریس نگار سلطانہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ غالب کو مستقبل کا بھی علم تھا:

"جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے"

یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اُس وقت دہلی میں بسیں چلتی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ 'قریشی بسیں' نہ ہوں، مگر چلتی ضرور تھیں۔ چوں کہ بسوں میں آخری سیٹیں یا بعض بسوں میں اگلی سیٹیں 'شاہد نازک خیالاں' کے لیے مخصوص ہوتی ہیں، اس لیے ہر شخص اس طرف دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بس ڈرائیور بھی اپنے سامنے چھوٹا سا شیشہ لگا کر 'تقریب' کا سامان بنائے رکھتا ہے۔ غالب اس مصرعہ میں یہی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ بس کا جلوہ اتنا رنگین ہے کہ خود بخود

شفیع عقیل ...... غالب کے مصرعے

رنگِ ادب پبلی کیشنز

اپنی طرف دیکھنے کا تقاضا کرتا ہے:

"اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و غم نکلے"

بعض لوگ کہتے ہیں کہ غالبؔ کو اپنی بیوی امراؤ بیگم سے انتہائی محبت تھی۔ ہو سکتا ہے یہ بات اپنی جگہ درست ہو، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غالبؔ کو کسی سے محبت تھی... محبت کس سے تھی، اس کا جواب اسی مصرعہ میں موجود ہے۔ یہ مصرعہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا معشوق بھارت کی ایک کم گنتی والی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ جس کے 'جوڑے' میں بڑے پیچ و خم تھے۔ 'جوڑا' باندھنے سے وہ غیر معمولی طور پر لمبا ہو جاتا تھا۔ اس لیے غالبؔ کہتے ہیں کہ اگر تم اس طرح پر پیچ و خم، یعنی 'جوڑے' کو کھول دو تو تمہارے قد کی لمبائی کا سارا بھرم کھل جائے گا کہ تم کتنے لمبے ہو:

"اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے؟"

چوں کہ جگرؔ مراد آبادی کا رنگ سیاہ ہے اور چہرے پر گہرے داغ بھی ہیں، اس لیے غالبؔ نے 'جگر سوختہ' یعنی جلا ہوا جگر کہہ کر اُن کی طرف اشارہ کیا ہے اور اپنے نالے سے پوچھتے ہیں کہ یہ جگر سوختہ کے نشان کیسے ہیں، جب کہ وہ پہلے ہی سوختہ ہے۔ جگرؔ مراد آبادی کے متعلق اُنہوں نے کئی مصرعے لکھے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں:

"لذت ریش جگر، 'غرق نمک داں' ہونا"

چوں کہ جگرؔ صاحب کی داڑھی بھی ہے، اس لیے غالبؔ کہتے ہیں کہ جگرؔ مراد آبادی کی داڑھی کی لذت اُس وقت ہے جب وہ 'نمکدان' میں غرق ہو جائیں، ورنہ اُن کی داڑھی بے کار ہے۔ ایک جگہ غالبؔ نے جگرؔ مراد آبادی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے:

"کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ؟"

اس 'جگر' کے متعلق اُن کے کلام میں بہت سے مصرعے ملتے ہیں:

"رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے"

غالباً اُس وقت کسی مسجد کے لیے چندہ اکٹھا کیا جا رہا تھا اور چندہ اکٹھا کرنے والوں میں غالبؔ بھی شامل تھے۔ غالبؔ نے سوچا، چلو اپنے محبوب سے بھی چندہ لیں۔ چنانچہ محبوب کے پاس

پہنچے کہ مسجد کے لیے چندہ دو۔ اُس نے آگے سے ٹکا سا جواب دیا۔ اس پر غالبؔ ناراض ہو گئے اور اِسی کیفیت کا اظہار اُنہوں نے اپنے اس مصرعہ میں کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم چندے کے تکلف سے اس شوخ سے کئی روز تک ناراض رہے:

”جز قیس کوئی اور نہ آیا بروئے کار“

اس مصرعہ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُن دنوں قیس، یعنی مجنون، دہلی آیا ہوا تھا۔ دوسری یہ کہ غالبؔ نے کار کی سیر بھی کی ہے۔ گو اِس سیر کا ذکر اُنہوں نے کہیں نہیں کیا، مگر اس مصرعہ سے پتا چلتا ہے۔ چنانچہ مطلب یہ ہے کہ غالبؔ کسی کی کار میں (کیوں کہ ان کی اپنی کار نہیں تھی) بیٹھ کر کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں قیس اور کچھ آدمی ملے۔ ان میں شرط یہ لگی کہ دیکھیں غالبؔ صاحب کی کار کے آگے کون آتا ہے۔ جب کار قریب آئی تو سب ڈر گئے، مگر قیس، یعنی مجنوں، کار کے آگے آ گیا۔ تو اِسی واقعہ کو اُنہوں نے اس مصرعہ میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ قیس کے سوا بروئے کار، یعنی کار کے آگے کوئی نہ آ سکا:

”آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا“

سنا گیا ہے کہ غالبؔ کے وقت پالکیاں رائج تھیں اور عورتیں پالکیوں میں بیٹھ کر آتی جاتی تھیں۔ لیکن غالبؔ کے اس مصرعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت گھوڑے کی سواری عام تھی۔ عورتیں گھوڑوں پر سوار ہو کر آتی جاتی تھیں۔ اور غالبؔ کا معشوق بھی گھوڑے پر سوار ہو کر اُن سے ملنے آیا کرتا تھا۔ ایک روز اُن کا محبوب گھوڑے پر سوار آ رہا تھا کہ راستے میں دوسرے آشنا نے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور اُسے کچھ دیر کے لیے روک لیا۔ غالب کو اِس بات کا پتا چل گیا کہ یہ رقیب کے پاس ٹھہرا ہے۔ چنانچہ محبوب سے، طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ مانا کہ تم آ رہے تھے، مگر تمہارے گھوڑے کی باگ پکڑ کر تمہیں روکنے والا بھی کوئی وہاں موجود تھا!!

* *

مجبوریاں

شفیق الرحمٰن

ایک روز ایک اجنبی حضرت اپنا رومان انگیز افسانہ دکھانے لائے، تاکہ مَیں اسے پڑھ کر اپنی رائے دے سکوں، وہ افسانہ یوں شروع ہوتا تھا:

وہ دیر سے کھڑا نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے پاؤں تلے سبزہ مخمل کی طرح بچھا ہوا تھا، جس پر طرح طرح کے پھولوں نے سلمیٰ ستارے کا کام کر رکھا تھا۔ اس کے دل میں خیالات اس روانی کے ساتھ آ رہے تھے جیسے کوئی اعلیٰ درجے کی سنگر مشین بخیہ کر رہی ہو یا کوئی تیز قینچی کتر کتر چل رہی تھی۔ بعض اوقات کوئی پرندہ دفعتہً چیخ اُٹھتا اور اُس کے خیالات کا سلسلہ یوں منقطع ہو جاتا جیسے دھاگا ٹوٹ جائے یا یکا یک سوئی چبھ جائے وہ اپنی نگاہوں کے گزرے قدرت کا ناپ لے رہا تھا، سر پر آسمان نیلے رنگ کی واسکٹ پہنے ہوئے تھا، جس میں بادلوں کے چھوٹے ٹکڑے سفید بٹنوں کی طرح جڑے ہوئے تھے۔ نالے کا بہتا ہوا پانی سفید ململ کے کھلے ہوئے تھان کی طرح معلوم ہو رہا تھا، جس میں سورج کی نارنجی شعاعوں نے گوٹہ کناری کا کام۔

”معاف کیجیے۔“ مَیں نے پوچھا، ”آپ کہیں درزی تو نہیں ہیں؟“

”جی نہیں!“ وہ شرما کر بولے، ”مَیں ٹیلر ماسٹر ہوں۔“

میرے ایک دوست جو موٹروں کی ورکشاپ کے مالک تھے اور مدّت سے موٹروں کا علاج معالجہ کر رہے تھے۔ موٹریں اور پُرزے ان کے دماغ پر اس قدر چھا گئے تھے کہ بعض اوقات وہ سوتے سوتے چلّا کر کہتے، ”بریکیں لگاؤ۔ اسٹارٹ کرو۔“ ایک دفعہ ہم دونوں اونٹ پر سوار ہوئے۔ مَیں آگے تھا اور مہار میرے ہاتھ میں تھی۔ ہم ایسی جگہ سے گزر رہے تھے جہاں پانی ہی پانی تھا اونٹ کچھ تیز ہو گیا ایک جگہ تو وہ پھسلتے پھسلتے بچا۔ میرے دوست گھبرا کر بولے، ”میرا مطلب ہے ذرا آہستہ چلاؤ۔“

اس اونٹ کی طبیعت میں کچھ ایسی بے نیازی تھی کہ جو ہدایات میں اسے دیتا وہ ذرا پروا نہ کرتا۔ جب ہم اسے روکنا چاہتے تو وہ رُکتا ہی نہیں۔" اس اونٹ کی بریکیں خراب ہیں۔" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ جلدی سے بولے، "یعنی اسے روکنا چاہو تو بہت دیر میں رکتا ہے۔" اور ساتھ ہی ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں کہ میں مجبور ہوں، میں جانتا ہوں کہ اونٹ میں گیئر نہیں ہوتے نہ بریکیں ہی ہوتی ہیں، لیکن میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔"

ایک بے حد کفایت شعار حضرت جب کبھی مجھے تار دیتے تو ہمیشہ انتہائی اختصار سے کام لیتے۔ ان کے تار کچھ اس قسم کے ہوتے۔ "آجاؤ"۔ "آج سٹیشن۔" ٹھیک ہے:

ایسے تار لے کر مجھے کتنی کوفت ہوتی ہوگی۔ یہ ظاہر ہے جب وہ ملنے آتے اور صرف 'آج سٹیشن" لکھتے تو میں علی الصبح سٹیشن پر جا بیٹھتا اور آدھی رات تک جتنی گاڑیاں آتیں ان سب میں تلاش کرتا۔ اسی طرح جب وہ تار میں حرف 'نہیں' یا 'ہاں'، لکھتے تو میں سوچنے بیٹھ جاتا کہ ان کا مطلب کیا ہے اور مجھے ایک اور تار بھیجنا پڑتا، بعض اوقات تو میں خود جا کر ان سے ملتا، تاکہ سب کچھ اچھی طرح سمجھ سکوں۔ اس کے برعکس ایک بے حد فضول خرچ حضرت کچھ اس قسم کی تار بھیجا کرتے تھے:

"سناؤ بھئی کیا حال ہے، تم بھی کمال کرتے ہو، اتنے عرصے سے کوئی خط نہیں لکھا۔ اگر آج شام کو فرصت ہو تو براہِ کرم شام کی فورڈاؤن گاڑی پر ملو، جو چار نمبر پلیٹ فارم پر پونے سات بجے پہنچتی ہے۔ یہ یاد رکھنا کہ کبھی کبھی وہ لیٹ بھی ہو جاتی ہے۔ باقی باتیں ملنے پر ہوں گی اس تار کو ضروری سمجھنا، سب کو سلام۔"

کسی نے کہا ہے (غالباً شیکسپیئر نے، کیوں کہ عموماً وہی کہا کرتا ہے) کہ مجھے کسی شخص کے دوست دکھا دو اور میں بتا دوں گا کہ وہ شخص کتنے پانی میں ہے۔ ایک اور صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ کوئی شخص کسی فلم کمپنی کے فلم پسند کرتا ہے اور میں فوراً بتا دوں گا کہ وہ شخص کیسا ہے۔ کئی حضرات دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ٹائی کی گرہ، جوتوں کا سائز اور مونچھوں کی لمبائی دیکھتے ہی سب کچھ بتا دیں گے۔ یہ سب کچھ بجا سہی، لیکن بھلا اس قدر محنت کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اتنی چھان بین کاہے کو کرتے ہیں کہ ناپ لیتے پھریں یا اس کے دوستوں کے پیچھے خفیہ پولیس کی طرح پھریں۔ آپ محض چند منٹ خاموشی سے اس شخص کا مطالعہ کیجیے اور وہ خود سب کچھ بتا دے گا۔ وہ

مجبور ہے یا یوں کہیے کہ وہ اپنی عادت سے مجبور ہے ہم سب مجبور ہیں۔

طلبا کی سب سے بڑی کوشش یہی ہوتی ہے کہ ہر ممکن طریقے سے پڑھائی سے بچیں، ہشیار ے ہشیار طالب علم بھی پڑھائی لکھائی کو بیگار سے کم نہیں سمجھتا۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ چند طالب علم دیر سے بحث کر رہے تھے کہ پڑھا جائے یا باہر چلا جائے، جب وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے تو ایک بولا، ”میں ٹاس کرتا ہوں اگر چہرہ آیا تو سنیما چلیں گے، اگر پشت آئی تو سرکس دیکھیں گے اور اگر روپیہ کھڑا ہو گیا تو خوب پڑھیں گے۔

بچوں کے متعلق ایک دوست نے قصہ سنایا۔ ان کے وہ چھوٹے بچے حسبِ معمول اپنی ساری کوشش اس جدوجہد میں صرف کرتے تھے کہ کہیں انہیں کوئی پڑھا نہ دے حساب سے تو وہ خاص طور سے متنفر تھے۔ آخر میرے دوست عاجز آ گئے اور انہوں نے استاد کے لیے اخبار میں اشتہار نکلوا دیا۔ ایک استاد آئے اور بڑی استادی سے انہوں نے بچوں کی پسند اور ناپسند کا پتا چلایا۔ بچوں کو خرگوش بے حد پسند تھے چنانچہ وہ چھ خرگوش لے کر بچوں کے پاس پہنچے۔ خرگوش دیکھ کر بچے بہت خوش ہوئے اور ان سے کھیلنے لگے۔ استاد بولے، ”بچو! بھلا بتاؤ تو سہی یہ کتنے ہیں؟“ ایک بچے نے گن کر کہا، ”چھ۔“ انہوں نے تین خرگوش چھپا لیے، پھر پوچھا۔ اور اَب باقی کتنے رہ گئے؟“ بچے نے پھر گنا اور بولا، ”تین۔“ یکایک چھوٹا بچہ بڑے کو ایک طرف لے گیا اور اس کے کان میں کہنے لگا، ”خبردار! میرے دل میں شبہ سا ہے ذرا ہشیار رہنا، کہیں یہ آدمی باتوں باتوں میں حساب نہ پڑھا دے۔“

آج سے کئی سال پہلے ایک فلاسفی کے پروفیسر ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ میری ان کی جان پہچان تھی ایک روز ہم ریڈیو سن رہے تھے کوئی محترمہ گا رہی تھیں:

نیر بھرن کیسے جاؤں ری سکھی

گانے میں اُنہوں نے پنگھٹ پر جانے کے سلسلے میں معذوری ظاہر کی تھی اور شاید کوئی وجہ بھی پیش کی تھی، لیکن وہ بار بار یہی کہتی تھیں کہ ”نیر بھرن کیسے جاؤں ری سکھی۔“

پروفیسر صاحب سنتے رہے پھر چونک کر بولے، ”کیا لغویت ہے آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں۔ پنگھٹ پر کوئی سقے کیوں نہیں بھیج دیتے۔“

باتوں باتوں میں وہ بولے، ''کل میں نے عجیب خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جیسے میں کلاس میں ہوں اور لیکچر دے رہا ہوں اور جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ میں واقعی کلاس میں تھا اور لیکچر دے رہا تھا۔''

میں اچھی طرح نہ سمجھ سکا۔ میں نے پوچھا، ''ابھی آپ کیا فرما رہے تھے؟''

''معلوم نہیں کیا کہہ رہا تھا۔'' وہ بولے، ''میں متوجہ نہیں تھا۔''

ایک روز اُنہوں نے صبح صبح مجھے دوڑتے ہوئے دیکھ لیا شام کو ملے، پوچھنے لگے، میں نے کہا، ''ورزش کر رہا تھا۔'' بولے، ''لاحول ولا قوۃ! میں تو صرف اُس وقت دوڑتا ہوں جب کوئی میرے پیچھے دوڑتا ہے۔''

ایک اور بہت بڑے فلاسفر تھے جنہوں نے ایک کتب فروش کو یہ خط لکھا تھا۔

''جنابِ من!

اوّل تو میں نے یہ بیہودہ کتاب آپ سے ہرگز نہیں منگوائی۔ اگر منگوائی تھی، تو آپ نے ہرگز نہیں بھیجی اگر آپ نے بھیجی تھی تو مجھے بالکل نہیں ملی۔ اگر مجھے ملی تھی تو میں نے قیمت ادا کر دی تھی اور اگر میں نے قیمت ادا نہیں کی تو آپ سے جو کچھ بھی ہو سکتا ہے کر لیجیے۔ اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے فقط۔''

ایک مرتبہ وہ کسی حجام کی دکان پر حجامت کرا رہے تھے۔ دفعتہً کوئی سڑک پر چلایا، ''میاں عبدالقدوس صاحب! میاں عبدالقدوس صاحب!! آپ کے مکان کو آگ لگ گئی۔'' وہ تڑپ کر اُٹھے، حجام کو پرے دھکیلا، گلے کا سفید کپڑا ایک طرف دے مارا، چہرے کا صابن ایک اور صاحب پر پھینکا۔ وہ گاہکوں سے بُری طرح ٹکرائے سڑک پر کودے، پھسلے گرے، پھر اُٹھے۔ ایک دہی بڑے والے سے ٹکرائے، اُچھل کر بھاگے کچھ دُور جا کر رُک گئے اور سر کھجانے لگے، پھر شرمندہ ہو کر بولے، ''افوہ! میں بھی کیا ہوں، بھلا میرا نام عبدالقدوس کہاں ہے؟''

ڈاکٹروں کی گفتگو بھی بڑی عجیب ہوتی ہے ایسی کہ آدمی سنتے ہی کہہ دے کہ ڈاکٹر بول رہے ہیں، کوئی بھی موضوع ہو کیسا ہی موقع ہو، لیکن ان کی گفتگو میں بیماریوں اور دواؤں کے نام باقاعدہ آتے رہیں گے اور کچھ اس قسم کی باتیں آپ سنیں گے۔ ''مجھے اقبال کا کلام بے حد پسند ہے، ٹیگور بھی پسند ہے۔ یہ دونوں شاعر ہندوستان کی ناک ہیں اور بھلا اس نمونیے والے کیس کا کیا بنا۔''

شفیق الرحمٰن ...... مجبوریاں

بزرگوں، دو عالم

"آپ پُرانے شاعروں کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتے ہیں بھلا آپ غالب کو شعراء کی صف میں نال کیوں نہیں کرتے، شکر ہے کہ وہ مریض اب اچھا ہے اسے سلفانہ مائیڈ دے رہا ہوں۔ ڈاکٹر ن صاحب سمجھتے تھے کہ اکیوٹ برانکائیٹس ہے حالاں کہ صاف نمونیہ تھا۔

"لیکن جو جدت اور ندرت اقبال کے کلام میں ہے، جو سادگی و پُرکاری ٹیگور کی شاعری میں ہے، اس سے پُرانے شعراء محروم ہیں۔ پرانے شعراء کے موضوعِ سخن ایک جیسے ہیں، ایک حد تک زمرہ ہیں اور ملیریا والا مریض تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔ اسے ساتھ سے ٹانسلائیٹس بھی تھا۔ ن' ماحب اسے ڈپھتھیریا سمجھ رہے تھے۔"

"اگر آپ غالب کی عظمت سے منکر ہیں تو میں آپ کے مذاق پر افسوس ظاہر کرتا ہوں۔ آپ نے بجنوری مرحوم کا وہ فقرہ سنا ہوگا کہ ہندوستان میں آسمانی کتابیں دو ہیں ایک وید، دوسری دیوانِ غالب تپ دق کا مریض'... وغیرہ وغیرہ یا پھر اس طرح کی گفتگو ہوگی۔

"جب میں پیرس میں تھا تو میں نے ایک نہایت ہی لاجواب کیس دیکھا، کسی حادثے سے ایک شخص کی ساری ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔"

"میں نے لور پول میں نہایت ہی حسین کیس دیکھے تھے۔ ایک شخص کے کان چھ چھ انچ لمبے ہوگئے تھے اور ایک شخص کے ماتھے پر سینگ اُگ رہا تھا۔"

"اور لندن میں مَیں نے ایک خوب صورت کیس دیکھا تھا۔ جس کی ناک اس قدر موٹی ہوگئی کہ دُور سے بالکل گینڈا معلوم ہو رہا تھا۔"

آفیشل خط و کتابت بھی نہایت دلچسپ چیز ہے۔ اس میں خط و کتابت کے مقررہ آداب اور کاغذی کارروائی زیادہ ہوتی ہے۔ دماغی کام بہت کم ہوتا ہے۔

بعض اوقات عجیب و غریب خطوط دیکھنے میں آتے ہیں، جو کاروباری لحاظ سے بالکل مکمل ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک فرم نے دوسری فرم کو لکھا کہ ہمارا فلاں فلاں آرڈر منسوخ کر دو۔ جواب آیا کہ آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ جب آپ کی باری آئے گی۔ تب آرڈر منسوخ ہوگا۔

ایک بوڑھے پنشنر کی پنشن دفعتہً بند ہوگئی، جنوری سے جون تک کچھ نہ ملا۔ آخر تنگ آکر اُس نے اوپر خط لکھا، وہاں سے جواب آیا کہ کاغذات کی رُو سے آپ کا کئی ماہ سے انتقال ہو چکا ہے اس لیے پنشن بند کر دی گئی۔ اس نے لکھا کہ جنابِ من میں تو باقاعدہ زندہ ہوں، جواب آیا کہ آپ

انور احمد علوی

سرٹیفکیٹ بھیجے۔ یہ ضلع کے کمشنر کے پاس گئے کمشنر بڑا ہنسا اور سرٹیفکیٹ لکھ دیا، میں فلاں فلاں صاحب کو اپریل سے دیکھ رہا ہوں اور تصدیق کرتا ہوں کہ یہ زندہ ہیں، نیچے جون کی کوئی تاریخ لکھ دی۔ پنشنر نے وہ سرٹیفکیٹ اور ایک خط اوپر بھیج دیا۔ اگلے ہفتے تین ماہ کی پنشن آ گئی ساتھ ہی ایک خط جس میں لکھا تھا، ”جنابِ من! آپ کے سرٹیفکیٹ کے مطابق اپریل، مئی اور جون کی پنشن ارسال ہے، براہِ کرم ایک اور سرٹیفکیٹ ارسال فرمایئے کہ آپ اسی سال جنوری، فروری اور مارچ میں بھی زندہ تھے تاکہ آپ کی بقیہ پنشن بھی بھیج دی جائے۔“

قنوطیت ایک ایسی چیز ہے، جو کبھی چھپی نہیں رہتی۔ قنوطی صاحب گویا چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ ادھر دیکھو لوگو میں قنوطی ہوں۔

ایک قنوطی حضرت جب کبھی ملنے آتے تو کچھ اس طرح گفتگو شروع کرتے۔

”میں ستایا ہوا ہوں، بوکھلایا ہوا ہوں، رنجیدہ ہوں، غم دیدہ ہوں، غمگین ہوں، غمزدہ ہوں، غم کا مارا ہوں۔“

میں جواب دیتا، ”مجھے افسوس ہے، تاسف ہے، قلق ہے، فکر ہے، تشویش ہے۔“ اس کے بعد باتیں شروع ہوتیں، جن سے ظاہر ہوتا کہ قدرت خاص طور پر ان کے پیچھے لٹھ لے کے پڑی ہوئی ہے، فرشتے محض ان کو ستانے کے لیے اپنے پروگرام بدلتے ہیں، چاند، سورج، آندھی، مینہ سب ان کے دشمن ہیں۔ اگر یہ فٹ بال کا میچ دیکھنے جاتے ہیں تو ان کی محبوب ٹیم اس لیے ہار جاتی ہے کہ ان جیسا بدقسمت میچ دیکھ رہا ہے۔ اگر جیتتی ہے تو اُن کی موجودگی کی وجہ سے گول کم ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا ہوا بنا لیتے، فرماتے، ”میاں اگر قسمت اچھی ہوتی تو کل تاش کی بازی ہی کیوں ہارتے۔“ ”یا زندگی میں اگر کچھ ملنا ہوتا تو پرسوں سنیما کے ٹکٹ ہی کیوں نہ مل گئے۔“ اور... مجھ سا بدقسمت اس شہر میں آ گیا ہے تبھی تو یہاں ہر روز آندھیاں آتی ہیں، جھکڑ چلتے ہیں اور اتنی گرمی پڑتی ہے جیسے ان کے چلے جانے سے شہر کی آب و ہوا بدل جائے گی۔

آپ کسی کالج یا اسکول کے اسٹاف روم میں جا بیٹھے، پندرہ منٹ کے بعد بغیر کسی تعارف کے آپ ٹیچر یا پروفیسر کو پہچان لیں گے۔

ایک مرتبہ میں ایک تقریب میں گیا اور میں نے ذرا سی دیر میں سب کو پہچان لیا۔ باتیں ہو رہی تھیں جغرافیے کے پروفیسر نے کسی جگہ کے متعلق دریافت کیا جب انہیں اس جگہ کی آب و ہوا

شفیق الرحمٰن ...... مجبوریاں

بتائی گئی تو مسکرا کر بولے، ”تو یوں کیوں نہیں فرماتے کہ بحیرہ روم کے خطے جیسی آب و ہوا ہے۔“

تاریخ کے پروفیسر بولے، ”سلوک؟ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ یہاں وہی سلوک ہونا چاہیے، جو سکندر نے پورس کے ساتھ کیا تھا۔“

ریاضی کے پروفیسر فیصدی کے سوا، بات ہی نہ کرتے تھے۔ مثلاً، ہندوستان میں اسی فیصدی آدمی چڑچڑے ہیں۔ ”ہندوستان میں ساٹھ فیصدی آدمی چھینکیں مارتے رہتے ہیں۔“ عرب میں نوّے فیصدی آدمی بات بات پر لاحول پڑھتے ہیں۔“

انہوں نے فلاسفی کے پروفیسر پر چوٹ کی، وہ چڑ گئے بحث ہونے لگی۔ ریاضی کے پروفیسر بولے، ”ریاضی ایک سچا علم ہے۔ اس میں صداقت ہے۔ ہندسے کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ مثال کے طور پر اگر ایک آدمی ایک مکان دس روز میں بنا سکتا ہے تو دس آدمی اس مکان کو ایک روز میں بنا سکتے ہیں تو 240 آدمی ایک گھنٹے میں بنا سکتے ہیں۔ 14400 آدمی ایک منٹ اور 864000 آدمی اس مکان کو بخوبی ایک سیکنڈ میں بنا لیں گے؟“

”ہندوستان میں اسّی فیصدی آدمی چڑچڑے ہوتے ہیں۔“ ریاضی کے پروفیسر کھسیانے ہو کر بولے، ”ایک مرتبہ ایک لیڈر سے ملاقات ہوئی۔ وہ باتیں کرتے وقت بار بار کہتے تھے۔

”خواتین و حضرات! حالاں کہ محفل میں صرف حضرات تھے، ایک دو مرتبہ ان کی زبان سے ”بہنو، ربھائیو“ بھی نکل گیا۔ بعض اوقات وہ جوش میں آ کر میز پر مکہ بھی مار دیتے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ اپنی عادت سے مجبور ہیں۔

چند لڑکوں نے شرارتاً ان کو ایک آسیب زدہ کمرے میں سلا دیا جہاں سچ مچ بھوت رہتا تھا۔ رات کو جب بھوت نظر آیا تو یہ اسے دیکھ کر بولے۔

”تم جو کچھ بھی ہو اور جہاں کہیں بھی رہتے ہو، مجھے اُمید کامل ہے کہ تم انسانی ہمدردی اور اُخوت کا ثبوت دیتے ہوئے قصبہ سدھار کمیٹی کی ضرور مدد کرو گے اور دنیا اور عقبیٰ دونوں میں سرخرو ہو گے تو اپنا چندہ سیکریٹری صاحب کے نام بھیج سکتے ہو۔“

اور سنتے ہیں کہ بھوت وہاں سے ایسا غائب ہوا کہ آج تک لوٹ کر نہیں آیا۔

ہمارے کالج میں ایک ماہر اقتصادیات تھے۔ ایک دن ہم نے اُن کا اشتہار اخبار میں پڑھا، جو انہوں نے نوکر کے لیے دیا تھا۔ اشتہار کا ایک ایک لفظ چلّا چلّا کر اقتصادیات پنے کی شکایت

کر رہا تھا لکھا تھا۔

‘‘ضرورت ہے ایک نوجوان صالح و خوش خصال و نیک اطوار کی، جس پر پورا پورا بھروسا کیا جا سکے۔ اعلیٰ درجے کے اخلاق کا مالک ہو نہایت تندرست و توانا ہو، سگریٹ پینے والے ہرگز درخواست نہ دیں، اچھے خاندان والے کو ترجیح دی جائے گی۔ خوش خط ہو، پرندوں سے محبت کرتا ہو، زندہ دل ہو، مصیبت میں ہرگز نہ گھبرائے، کفایت شعار ہو۔ موٹر بھی چلا سکتا ہو۔ جوتوں کی مرمت بھی کر سکتا ہو۔ بندوق چلا سکتا ہو، چارپائیاں بن سکتا ہو، حساب کا ماہر ہو، ضرورت پر حجام کا کام بھی بخوبی کر سکتا ہو، کپڑے دھو سکتا ہو، تنخواہ پندرہ روپے ماہوار دی جائے گی پہلے چھ ماہ ملازمت عارضی ہوگی اس کے بعد ڈیڑھ روپیہ ماہوار الاؤنس ملے گا۔’’

کچھ عرصے کے بعد انہوں نے ہمیں چائے پر بلایا وہاں ہم نے ان کا نوکر دیکھا۔ عجب سُست الوجود نوکر تھا۔ اشتہار میں جتنی خوبیاں لکھی گئی تھیں غالباً ان میں سے ایک بھی اس نوکر میں نہیں تھی۔ اُسے جو حکم دیے جا رہے تھے وہ بھی اقتصادیات سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً، یہ کہ ‘‘سارے پلنگ چھت پر لے جاؤ، ان پر بستر کر دو، صحن میں چھڑکاؤ کر دو اور کرسیاں نکال دو۔ بس اس کے بعد آرام کرو۔’’ پندرہ منٹ کے بعد پھر اسے بلایا جاتا اور حکم ملتا۔ ‘‘شام کا کھانا ہم چھت پر کھائیں گے۔ باورچی خانے سے سارے لوازمات اوپر لے جاؤ۔ میلے کپڑے دھوبی کو دے آؤ۔ بازار سے دوڑ کر پھل لے آؤ، بجلی والے سے پنکھا لے آؤ، غالباً مرمت ہو چکی ہوگی۔ یہ خط بڑے ڈاک خانے میں فوراً ڈال دو، کہیں ڈاک نہ نکل جائے۔ اس کے بعد تمہاری چھٹی ہے۔’’

ذرا سی دیر کے بعد پھر ایک تازہ ارشاد ہوتا۔ ذرا دوڑ کر دیکھ آؤ کہ سینما میں کون سی پکچر لگی ہوئی ہے۔ بشیر صاحب سے پوچھنا کہ وہ آپ نے سینما کے پاس کا وعدہ کیا تھا کب تک انتظار کیا جائے اور ہاں پیٹرول کے کوپن لے جاؤ اور پیٹرول لے آؤ۔ بک سٹال سے دوڑ کر دیکلی کا نیا پرچہ لے آؤ۔ گیراج والے سے موٹر کے بارے میں پوچھنا۔ واپسی میں برف لیتے آنا۔ بس! فقط اتنا سا کام ہے تھک جاؤ گے اس کے بعد مزے سے آرام کرنا۔’’

ایک اور لفظ ہے، جس کا استعمال ہم ہر روز کرتے ہیں وہ ہے ’دیسی‘۔

قسم قسم کے بڑھیا آم ہیں۔ لفانسو، طوطا پری، سرولی، لنگڑا الولا، یہ اور وہ، لیکن جو آم بالکل فضول ہو، جس کی گٹھلی بڑی اور چھلکا موٹا ہو، جس میں رس نام کو نہ ہو اُسے ’دیسی آم‘ کہتے ہیں۔

اسی طرح سب سے گھٹیا کپڑے کو 'دیسی کپڑا' اور ہندوستانی افسروں کو 'دیسی صاحب' کہتے ہیں یہ بھی ایک مجبوری ہے۔"

بعض اوقات میں یہ سوچتا ہوں کہ میری ذاتی مجبوریاں کیا کیا ہیں؟ ایک تو مجھے آپ اور ڈاؤن ٹرین کی کبھی پہچان نہیں رہتی۔ کئی گاڑیاں تو ایسی ہیں، جن میں مَیں عرصے سے سفر کرتا رہا ہوں، لیکن مجھے نہ ان کا نمبر معلوم ہے نہ یہ علم ہے کہ وہ آپ ہیں یا ڈاؤن۔

بعض اوقات میرے دوست آپس میں کچھ ایسی باتیں کرتے ہیں۔

"تو آپ فورٹین اَپ سے تشریف لائیں گے، میں سٹیشن پر آپ کا انتظار کروں گا۔"

"جی ہاں! لیکن اگر وہ نہ مل سکی تو پھر سیون اَپ سے جاؤں گا۔ بعض اوقات فائن اَپ، تھری ڈاؤن کو لیٹ کرا دیتی ہے۔ جس سے سیون اَپ بھی لیٹ ہو جاتی ہے۔ بہر حال، آپ ٹو ٹی ڈاؤن نکلنے کے بعد ہی فورٹین آپ پر میرا انتظار کریں اگر اس سے نہ پہنچ سکا تو پھر۔"

اور میں حسرت بھری نگاہوں سے ان کے چہروں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ بعض اوقات اپنی حالت پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتا ہوں۔

دوسرے یہ کہ میرا حافظہ بہت کمزور ہے اور مَیں سب کچھ بھول جاتا ہوں ابھی سوچ رہا ہوں، ابھی بھول جاتا ہوں۔ بعض اوقات تو سوچنے سے پہلے ہی بھول جاتا ہوں اور اکثر اس قسم کے حادثے ہوتے رہتے ہیں۔

مجھے ایک صاحب سے ملایا جا رہا ہے ان کا نام خلیل صاحب ہے، وہ مجھ سے پہلے بھی کبھی ملے ہیں، لیکن میں حسبِ معمول بھول چکا ہوں وہ ملتے ہی کہتے ہیں، "میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔"

"ضرور دیکھا ہوگا۔" میں مسکرا کر کہتا ہوں۔

"بتاؤں کہاں دیکھا تھا؟"

"بتایئے!"

"آپ کرکٹ کا میچ کھیل رہے تھے۔"

اب میری باری آتی ہے اور اخلاقاً مجھے بھی کہنا پڑتا ہے کہ "اوہ! خوب یاد آیا، میں نے بھی آپ کو کہیں دیکھا ہے"۔ "کہاں دیکھا تھا؟"

’’وہ اس روز آپ وہاں۔‘‘ میں اس اُمید پر کہتا ہوں کہ شاید وہ خود فقرہ، مکمل کر دیں گے۔

’’ہاں ہاں!‘‘ وہ چہک کر کہتے ہیں۔

’’آپ فاختہ اُڑا رہے تھے۔‘‘ میں تنگ آ کر کہتا ہوں۔

بہر حال تین چیزیں تو میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں، یہ مجھے کبھی یاد نہیں رہتیں۔ ایک تو مجھے ٹیلی فون کے نمبر یاد نہیں رہتے۔ دوسرے دوستوں کے پتے ہمیشہ بھول جاتا ہوں اور میرے تیسرے... لا... دیکھنے میں پھر بھول گیا۔ میں وہ تیسری چیز بھول گیا ہوں، جو اکثر بھول جاتا ہوں۔

* *

بینک گزیدہ

شفیق زادہ

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں   رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

پیارے میاں اُن دنوں بہت حساس ہو رہے تھے، خاص طور سے اسٹیٹس کے معاملے میں۔ جس دن اُن کو پتا چلا کہ غیر ملکی بینک کا اکاؤنٹ ہولڈر ہونا کسی اثاثے سے کم نہیں تو معلومات کی خاطر فون گھمانے شروع کر دیے۔ اُن کے ایک سالے بہادر 'اے جی ایم اینگرو بینک' میں کسی اُونچی پوزیشن پہ تھے۔ اُن سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ اُونچی پوزیشن سے مراد کوئی اعلیٰ عہدہ نہیں، بلکہ دفتر کی سب سے اُونچی منزل پر واقع ٹیلی مارکٹنگ والے کال سینٹر سے ہے! اس انفارمیشن کو سسرال والوں میں کس طرح مزے لے لے کے استعمال کرنا ہے، اُس کی منصوبہ بندی اُنہوں نے سالے کے کسی آنے والے بُرے وقت پہ مؤخر کر دی، جو یقیناً مستقبل قریب میں تھا۔ فی الوقت بڑے ہی بُراثر لوگوں کی سات عادات میں سے ایک، یعنی 'فرسٹ تھنک فرسٹ' کے مصداق اکاؤنٹ کھولنے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں۔ جو کچھ بھی پتا چلا، اُس کے مطابق کم اَز کم پانچ لاکھ روپے ہوں تو اکاؤنٹ کھولنے کے بارے میں سوچا جائے۔ شوقیہ قرض داری کا یہ جہاز تو ٹیک آف کرنے سے پہلے ہی زمین پہ آ گرا۔ اب کس طرح اپنے بٹوے سے بہانے بہانے سے اے ٹی ایم کارڈ نکالیں گے، تا کہ لوگوں کو پتا چلے کہ اتنے مشہور بینک میں اپنا بھی اکاؤنٹ ہے۔ سارے کا سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ سالے صاحب نے اپنی نام نہاد ساکھ بچانے کے لیے مشورہ دیا کہ میری نظر میں نسبتاً کم بڑھیا ایک اور بینک ہے، جس میں میرے کچھ دوست ہیں۔ چپڑ قنات ہی ہوں گے۔ ہمارے میاں نے تبصرہ کیا۔ ہم چُپ رہے کہ اگر کچھ کہا تو وہ اپنے سالے کو چھوڑ کر ہمارے سالے کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ سالے بہادر کہہ رہے تھے، "آپ فکر مت کریں، آپ کا کام ہو جائے گا۔" اس طرح دو دن کے بعد ہی 'نان اسٹینڈرڈ آن چارٹرڈ بینک' کی پارک ہل والی برانچ سے

ایک نمونہ، جو کہ خود کو سیلز ایگزیکٹو کہتا تھا، ہمارے دفتر میں آ دھمکا۔ ہم نے موصوف کے لیے ’نمونہ‘ کا لفظ کسی ہجو کی نیت سے نہیں، بلکہ اُن کی ماڈل یعنی نمونہ نظر آتی شخصیت سے متاثر ہو کے استعمال کیا تھا۔ سرخ پینٹ، گلابی شرٹ اور بڑے سموسے جیسی ٹائی ناٹ باندھے، موصوف بہت ’کھل رہے تھے۔ پیارے میاں نے اُن کے جانے کے بعد فرمایا کہ ’کھل نہیں گھل رہے تھے۔ زیر کو زبر کرنے میں اُن کو ملکہ حاصل ہے، مگر ہمیں ہمیشہ زیر ہی رکھا۔ گہری رنگت پہ تو یہ امتزاج ناقابلِ فراموش تاثر قائم کر رہا تھا۔ ہم دونوں ہی متفق تھے کہ واقعی اِس ذوقِ بدلباسی کو بروقت انجوائے نہ کر سکنے کو زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ آداب حائل تھے، ورنہ کٹاری جیسے کئی فقرے چست ہونے کو بالکل تیار تھے۔ مگر افسوس! آج کل یہ سب ہی اِن تھا، مگر اتنا اِن ہو گا، ہم جیسے "Out-dated" نہیں جانتے تھے۔ اس مختصر سی میٹنگ کے لیے کانفرنس روم کھلوایا گیا اور ہم تینوں وہاں براجمان ہوئے۔ موصوف نے پہلے پُر اعتماد فراخدلانہ انداز میں مذکورہ بینک کی خوبیاں اور اپنے صارفین کے ساتھ تعاون کے کچھ قصے بیان کیے۔ یہ قصے دراصل قضیے کی صورت ہمارے چند بینک گزیدہ دوستوں کے ذریعے سے ہمارے کانوں تک بھی پہنچے تھے، مگر ہم نے ہمیشہ اپنا گمان اچھا ہی رکھا۔ طویل تمہیدی تعریف کے بعد ڈپلومیسی کا سہارا لیتے ہوئے کچھ ضروری اور کچھ غیر ضروری پوچھ گچھ کی۔ غیر ضروری پوچھ گچھ اس لیے کہا کہ ”ہماری فیملی میں اضافہ کیوں رُک گیا؟“ جیسے سوالات سے بینک سے قرضہ لینے کا کیا تعلق؟ تمام مطلوبہ اور ممنوعہ معلومات جمع کر لینے کے بعد لہجہ بدلتے ہوئے پہلے تو ہماری اور پھر پیارے میاں کی کم آمدنی پہ مایوسی کا اظہار کیا اور سر کو نفی میں دائیں بائیں ہلا ہلا کر اور ہونٹ سکوڑ کے اس مایوسی کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ فرمانے لگے، دیکھیے! ہمارے بینک کو بہت خوشی ہے کہ آپ جیسے معززین نے یاد کیا، مگر کچھ تکنیکی وجوہ کی بنا پر ہم اِس وقت آپ کا اکاؤنٹ نہیں کھول سکتے، لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں کہ بینک نے آپ کو نا اہل قرار دیا ہے، آئندہ چھ مہینے میں اگر آپ کے حالات میں کوئی بہتری ہوئی تو ہمیں آپ کا اکاؤنٹ کھولنے کے لیے نظر ثانی کرنے میں بڑی خوشی ہو گی۔ پیارے میاں بھونٹ ہو کے رہ گئے اور ہم نے اپنی نظر کا ڈبل فوکس چشمہ اُتار لیا۔ پیارے میاں کے سر پر دو سینگ بالکل صاف نظر آ رہے تھے، ’اوینڈاٹی دی‘ کے ماڈل کی طرح! جیب سے پان کی پڑیا نکال کر آہستگی سے اُس کی تہیں کھولنے لگے اور ساتھ ہی ملائمت سے فرمایا کہ میاں صاحبزادے! ہم سمجھ گئے کہ اب میاں صاحبزادے کی خیر نہیں۔

پیارے میاں جب کسی کی خبر لینے کا تہیہ کر لیتے ہیں، تو عجز و انکساری کا نشان نظر آتے ہیں اور گفتگو میں اتنی شیرینی بھر جاتی ہے۔ فرمانے لگے، ”یہ جو آدھے شہر کی سڑکوں پہ اور اتنی ہی تعداد میں عمارات پر، آپ کے بینک کے ہورڈنگز اور سائن بورڈز ہمارے کھڑوس کرایہ دار کی طرح چپکے ہوئے ہیں، کیا صرف دکھاوے کے لیے ہیں؟ یہ تو ایسا ہی جیسے کہ پُرانے بادشاہ نہایت تندوتوانا خواجہ سرا غلام رکھتے تھے، جو کہ دیکھنے میں فولاد، مگر کارکردگی کے حوالے سے اولاد کے بھی قابل نہیں ہوتے تھے! ہمیں تو تمہارے بینک کے چپڑ قنات دعووں میں اور مغل بادشاہوں کے خواجہ سراؤں میں کوئی غیر واضح فرق بھی دکھائی نہیں دیتا۔ آدھے گھنٹے سے آپ مستقل اُمید کے دامن سے ہمارا پاؤں بھاری کیے ہوئے تھے اور اَب اچانک ساتویں بحری بیڑے کی طرح اِس اُمید کو غائب کر دیا۔ یہاں ہم نے آپ سے بینک کی پالیسیوں پہ راگ درباری سننے کی درخواست نہیں کی، بلکہ بینک میں اکاؤنٹ کھولنے کا عندیہ ظاہر کیا ہے، آپ ہیں کہ جمعے کے بعد برقعہ پہنے پیشہ ور جوان بھکارنوں کی طرح ہم سے پیش آ رہے ہیں، یعنی ہم سے دل لگی بھی کر رہے ہیں اور ہماری خواہش بھی پوری نہیں کر رہے۔ اس ایئر کنڈیشنڈ کمرے کی ٹھنڈک اور اِس کلوٹے مشروب (کولا) سے لطف اندوز بھی ہو رہے ہیں، مگر ہمارا رضاکارانہ قرض دار ہونے کا مقصد بھی پورا نہیں کر رہے۔“

پیارے میاں درست فرما رہے تھے، خود ہم نے بھی اِس طرح کی بھکارنوں کے حجاب میں اِس کثرت سے جسمانی خوبصورتی محسوس کی ہے کہ خود کو فقیر فقیر سے لگے۔ ہمیشہ اپنی جیب اور اُن کے برقعے تنگ ہی محسوس کیے۔ ڈر کے مارے بھی بھیک دینے کی کوشش نہیں کی کہ کہیں ہمارا ہاتھ اُن کے ہاتھ سے مَس بھی ہو گیا تو ہمیں ٹھنڈا گرم نہ ہو جائے۔ موسم کی تبدیلی اور بدبختی ہم پہ ہمیشہ اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ اکثر بھیک دینے کے بعد اُن بھکارنوں کے کان میں دُعا کی سرگوشی نما حاجت پورا کرنے کی درخواست کرتے ہم نے بہت لوگوں کو دیکھا ہے۔ ہمارے یہاں کا مرد، عورت کے معاملے میں خود کو سخاوت میں حاتم طائی سے کم نہیں سمجھتا۔ وطنِ عزیز کی آبادی اس تیز رفتاری سے اَز خود نہیں بڑھ رہی! پیارے میاں کی گفتگو کے چڑھاؤ سے میاں صاحبزادے کے ماتھے پہ پسینے کی بوندیں نمودار ہونا شروع ہو گئیں۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ اگر پیارے میاں اسی طرح جاری رہے تو میاں صاحبزادے دفتر واپس جانے کے بھی قابل نہیں رہیں گے۔ ہم نے یہ سوچ کر کہ اِن کے سائز کا ہیمپر اب کہاں ڈھونڈتے پھریں گے، بعد میں پچھتانے سے بہتر ہے کہ

ابھی سے پیمپر (دلاسا) کا سہارا لے لیں، لہٰذا درمیان میں دخل اندازی کی اور دریافت کیا کہ یہ بتایئے کہ کوئی طریقہ ہے کہ آپ کے بینک میں اکاؤنٹ بھی کھل جائے اور ہمارے محترم ساتھی کو اے ٹی ایم کارڈ بھی مل جائے؟ اس دخل اندازی کو غیبی امداد سمجھتے ہوئے فوراً بولے، ''ہاں کیوں نہیں، بالکل ہے، ضرور ہے، یقیناً ہے۔''

''وہ کیا؟'' ہم دونوں ہم آواز ہو کر بولے۔

''آپ ہمارے بینک سے قرضہ لے لیں۔''

''قرضہ لے لیں... ؟'' ہم دوبارہ بولے۔

اس دفعہ اُس نے صرف سر ہلایا۔ اتنا بڑا سر ہلتے دیکھ کر ہم حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ "Pumkin" کی کہانی تو بچپن میں آپ نے پڑھی ہی ہو گی!

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز   تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ

اگلے دن ہم اور محترم پیارے میاں 'نان اسٹینڈرڈ، اَن چارٹرڈ بینک' کی پارک ہل والی برانچ کے باہر ہاتھ اُوپر، نظریں نیچی اور ٹانگیں کھولے سیکیورٹی کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا تھا، وہ ہم شرم کے مارے بیگم کو بھی نہیں بتا سکیں گے۔ خیر! جامہ تلاشی اور اِس سے متعلق تمام عمل مذموم سے گزرنے اور یہ پختہ ارادہ کر لینے کے بعد کہ اِس کا حساب تو ہم بعد میں کر لیں گے، میں اور پیارے میاں بینک کے اندر داخل ہوئے۔ سرد ماحول میں داخل ہوتے ہی ہماری تو گھگی بندھ گئی، اتنا ٹھنڈا کہ چند ہی لمحوں میں ہمیں لگنے لگا کہ ہمارے دماغ پہ جمود طاری ہو گیا ہے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت منجمد ہو گئی ہے۔ چند قدم آگے بڑھ کر استقبالیہ تک پہنچے تو دمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ ایک دوشیزہ کو میز پر تقریباً آدھا ڈھے کر ایک گاہک سے سوال جواب میں مصروف پایا۔ اُن کے اس انداز کو دیکھ کر نہ جانے کیوں ہمیں یونانی دیومالا کی وہ کہانی یاد آ گئی، جس کے مطابق ایک گائے نے اپنے سینگوں پہ دنیا کو اُٹھا رکھا تھا اور مصنف کا دعویٰ تھا کہ دنیا کے سارے زلزلوں اور مصائب کی جڑ اِس گائے کا ایک سینگ سے دوسرے سینگ پہ وزن کو منتقل کرنا ہوتا ہے۔ ویسے اِن خاتون کی گاہک سے وابستگی اور سامان دلبستگی کی نمائش سے ہمیں کچھ شک نہ رہا کہ دنیا کے تمام مصائب اور مصیبتوں کے منبع یہیں سے شروع ہوتے ہیں۔ ہمارا مقصد بینکار

سے نہیں، بلکہ بینک سے ہے۔ چوں کہ ہم صبح کا اخبار گاڑی میں ہی چھوڑ آئے تھے، اس لیے کھلا نہ چھپانے کو کچھ نہ پایا۔ چمکیلے فرش پہ اپنی مانگ دیکھنے لگے کہ شاید کچھ مشکل وقت کاٹنے میں آسانی ہو۔ پیارے میاں البتہ آس پاس کے دعوتی ماحول سے متاثر نہ لگتے تھے اور قطار میں کھڑے ہو کے بھی اُن کی نگاہیں ساکت نہ تھیں۔ ہم فرش پر نظریں جمائے کھڑے تھے کہ ہمارے کانوں میں اُن کی شوخ آواز ٹکرائی، ”بڑی شاندار چیز ہے۔“ اور ہم تصور میں استقبالیہ والی خاتون کو پا کے سر کو جھکائے ہوئے صرف ”آپ ٹھیک فرماتے ہیں“ کہہ سکے۔ کچھ دیر کے بعد ہم نے دوبارہ سنا، وہ کہہ رہے تھے کہ بس تھوڑا سا اور نیچی ہو جائے تو دیکھنے کے ساتھ اِس کی بات بھی بہتر سمجھ میں بھی آ سکتی ہے۔

اب ہم نے چونک کر نگاہ اُوپر کی تو پیارے میاں کو استقبالیہ کے ساتھ والی دیوار پہ کئی فٹ اُونچی پینٹنگ کو دیکھتے ہوئے پایا۔ جو اُونچائی پہ نصب ہونے کی وجہ سے واضح نہیں ہو پا رہی تھی۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ ویسے پیارے میاں کے ساتھ وقت گزارنا مستقل دھچکے اور ہچکولوں کی صورت زندگی گزارنا ہے۔ وہ کس وقت کس کو دیکھ کے کیا کہہ رہے ہیں، اُس کو سمجھنے اور مطالب کا تعاقب کرنے کے لیے جمناسٹک کا کھلاڑی ہونا ضروری ہے، اس سے کم مستعدی والا اِن کی سنگت میں مختصر عرصے میں معذور ہو سکتا ہے (ذہن و جسم دونوں سے)۔ ہم فی الحال صرف ذہن بندی پر ہی موقوف تھے کہ ہماری ذہنی صلاحیتوں کو لگام تو اُنہوں نے شروع دن سے ہی دے کر ہمیں اپنا مطیع اور تابعدار بنا رکھا تھا۔ اگر جناب کی متنوع مزاجی اور اِس سے وابستہ مستقل حرکت پذیر پیرائے پہ نظر جمانے کی کوشش کی جائے تو بھینگا ہونے میں کوئی وقت نہیں لگتا۔ عرصہ دراز سے ہم اُن کے ساتھ ایک معمول کی طرح بندھے چلے آ رہے تھے۔ اور اَب تو کیفیت یہ ہے کہ ہمیں اپنی یادداشت کے گوشوں میں صرف وہ لمحات یاد رہتے ہیں، جو اُن کی سنگت کے بغیر گزرتے ہیں۔ بیگم اُن کے ساتھ ہمارے تعلق کو ہمارے غیر فعال رہنے کا متبادل سمجھتی ہیں، لہٰذا اُن سے کچھ کہنا مزید پابندیوں کو دعوت دینے کے برابر ہوتا۔ ہمیں بیگم کی نظروں میں رائی کرنے میں پیارے میاں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

بالآخر ہماری باری آ گئی اور بینکار مہ جبین نے ہماری طرف مسکرا کے دیکھا تو ہم جھینپ کے رہ گئے۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ پتلون کی زِپ کھلی رہ جانے کی وجہ سے اسی قسم کی بے ہودہ

مسکراہٹوں سے پالا پڑ چکا تھا۔ اس بھرے مجمع میں زِپ چیک کرنے کی ہمت نہ پڑی، مگر کان کی سرخ ہوتی لَو کی تپش کنپٹیوں کے اندر تک محسوس ہو رہی تھی۔ بھلا ہو پیارے میاں کا کہ وہ ہم سے آدھا فٹ آگے اور بینک والی مہ جبین سے آدھا فٹ قریب تھے۔ اپنی مسکراہٹ سے ہمارا کچرا کرنے کے بعد اُنہوں نے پیارے میاں کے سپاٹ چہرہ کی طرف نگاہ کی۔ ہمیں بھی اپنی ہمت مجتمع کرنے کا موقع مل گیا اور ہم خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے میں مصروف ہو گئے۔ بڑی شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ کوئی کونا یا میز کی آڑ ملے تو زِپ کی خبر لیں۔ پیارے میاں نجانے کیوں بعض اوقات چہرے پہ ایسے تاثرات حاوی کر لیتے کہ مخاطب خود بخود محتاط ہو جاتا۔ اگر مخاطب مرد ہے تو صرف احتیاط پر ہی اکتفا کرتا ہے اور خاتون ہو تو حفظِ ماتقدم کے طور پر دو قدم پیچھے بھی ہٹ جاتی ہے۔ کیوں کہ زنانہ بینکار پلی پلائی تھی، اس لیے بڑے اعتماد کے ساتھ صرف محتاط ہو جانے کو ہی کافی جانا، پیچھے ہونے کو غالباً بزدلی سمجھتی تھی۔ پیارے میاں ملٹی نیشنل کمپنیوں کی عشوہ طراز فرنٹ لائن زنانہ اسٹاف کے لیے بہت سی اصلاحات گفتگو میں استعمال کرتے ہیں اور 'پلی پلائی ٹرینڈ' کہنے کا اُن کا انداز تھا۔ ویسے بھی ملٹی نیشنل کمپنیوں میں ترقی کرنے کے لیے دوشیزاؤں کا باہمت اور بولڈ ہونا اُن کی جاب ڈسکرپشن کا حصہ ہے۔ یہاں نوکری کاروبار کو مسلسل ترقی زدہ دکھانے کے لیے کافی جانچ پڑتال اور ٹھوک بجا کے بالکل صحیح اور مناسب بلکہ متناسب اُمیدوار کو دی جاتی ہے۔ اُمیدوار کی بقیہ زندگی، اگر وہ بہ قائمی ہوش و حواس اِسی کمپنی کا نمک خوار رہا تو نوکری صارفین کی مسلسل جانچ پڑتال اور ٹھوک بجانے میں ہی گزرتی ہے۔ اس عمل کو بینک کی زبان میں 'کریڈٹ ہسٹری چیک' (اپنے صارف کو جانیے) کہتے ہیں، جو کہ شرافت کے زمانے میں یعنی ہمارے بزرگوں کے دَور میں کسی خلیفن یا نائن کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ اس سارے عمل کا ایک مزہ ہم پچھلے مہینے اپنے کریڈٹ کارڈ کے لیے دی گئی درخواست کے سلسلے میں بھگت چکے تھے۔ ہماری جانچ پڑتال اور اُدھار دینے کی موزونیت (کریڈٹ ہسٹری) کو اتنی دفعہ ٹھوک بجا کے دیکھا گیا کہ گھر میں بیگم اور دفتر میں باس دونوں ہی ہماری تفتیش کے لیے کی گئی کالیں ریسیو کرتے کرتے ہم سے نالاں ہو گئے۔ کافی عرصے تک ہم خود کو پھٹا ڈھول سمجھتے رہے، جس کو بجانا سب اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں، کیوں کہ دفتر کے تقریباً سب ہی لوگوں سے ہمارے بارے میں انتہائی ناموزوں سوالات پوچھے گئے تھے۔ بالآخر پیارے میاں کی 'فیڈ بیک' پر ہمیں کریڈٹ کارڈ کمیٹی۔ نے کارڈ جاری کرنے

ے صاف انکار کر دیا۔

چہرے پہ مستقلاً نصب پتلے ہونٹ اور اُن ہونٹوں پہ مستقل چپکی ہوئی وہی بیہودہ مسکراہٹ لیے (جس کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں) اُس نے پیارے میاں کے چشمے کے اندر آنکھوں میں جھانکا اور پیشہ وارنہ خوش مزاجی سے دریافت کیا، ”فرمایئے! میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔“

پیارے میاں نے خاتون کے نین، نقش اور نخرے سے متاثر ہوئے بغیر اپنی سپاٹ شخصیت کو برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا، ”مجھے ’پرسنل لون‘ لینا ہے۔“ خاتون کی آنکھوں سے چمک تو فوراً ہی غائب ہوگئی، مگر چہرے پہ بیزاری نمودار ہونے میں چند سیکنڈ لگے۔ لگتا تھا کہ قرضہ حاصل کرنے کی خواہش کا علم ہوتے ہی بینک والی مہ جبین کی شخصیت مکمل طور پر بدل گئی۔ اب اُس نے تکلم کی بھی زحمت گوارا نہیں کی اور کرکٹ کے ایمپائر کی طرح اپنے بائیں ہاتھ کو اُوپر اُٹھا کر درمیانی انگلی کے اشارے سے ہمیں اُوپری منزل پہ جانے کا اشارہ کیا۔ پیارے میاں نے ہمیں اور ہم نے اُن کو حیرانی سے دیکھا اور پھر ہماری نظریں خاتون کے چہرے سے ہوتے ہوئے اُن کے سلیولیس چست جمپر کے بائیں جانب سے باہر نکلے ہوئے سڈول بازو کے انتہائی سرے پہ موجود انگوٹھیوں ے بھرے ہاتھ میں بارہ بجے کی سوئی کی مانند اُٹھی ہوئی انگلی پہ گئیں۔ ہم دونوں نے دوبارہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اِس بار ہمیں کھلا منہ چھپانے کے لیے کسی اخبار کی ضرورت نہ تھی۔ ہماری نظر خود بہ خود ہی اُس خاتون کی پشت والی دیوار پہ نصب پروموشن بینر پہ ٹک گئی، جس پہ رنگ رنگے حروف سے لکھا ہوا تھا، ’کسٹمر فرسٹ‘، جسے ہم نے اپنی بوکھلاہٹ کی وجہ سے ’کشٹ مر فرسٹ‘ پڑھا! پیارے میاں نے لیفٹ ٹرن کیا اور اُن سے چپکے روبوٹ کی مانند ہم خاتون کی درمیانی انگلی کے اشارے کو فالو کرتے ہوئے اپنے غصے کو انرجی ڈرنک کی طرح غٹاغٹ پیتے ہوئے، نابیناؤں کی طرح پیروں سے ٹٹول ٹٹول کر زینے پر چڑھنے لگے، کیوں کہ ہماری نظر میں تو خاتون خانہ خراب کا اشارہ بسا ہوا تھا...؟

* *

ماسٹر صاحب

شوکت تھانوی

''آخر یہ کب تک یوں ہی گلی ڈنڈا اُڑاتا پھرے گا؟ تم کو تو جیسے کوئی فکر ہی نہیں ہے، تعلیم کا زمانہ نکلا جا رہا ہے۔'' والدہ صاحبہ نے اس خاکسار کے متعلق یہ الفاظ والد صاحب سے اس وقت کہے جب وہ بے چارے دن بھر کے تھکے ماندے رات کو حقہ پیتے پیتے سو جانے کے قریب تھے۔ چنانچہ انہوں نے گویا چونک کر جواب دیا، ''ایں کیا کہا؟ تعلیم کا زمانہ نکلا جا رہا ہے؟ حالاں کہ اب تعلیم کا زمانہ آیا ہے۔ بہر حال میں خود اس فکر میں ہوں کہ کوئی معقول سا ماسٹر مل جائے تو اس کو پڑھنے بٹھا دوں۔''

اس واقعہ کے تین یا چار دن کے بعد ایک ادھیڑ عمر انسان، بحثیت ماسٹر کے، والد صاحب خدا جانے کہاں سے پکڑ لائے اور ہم کو ان حضرت کے سپرد کر دیا۔ لہٰذا ہم نے ان سے شرف تلمذ حاصل کرنا شروع کر دیا اور مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی اُردو ریڈر کے علاوہ کنگ پرائمر کا سبق بھی لینے لگے۔ اگر استاد قابل اور شاگرد ذہین ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ تعلیم کامیاب نہ ہو۔ چنانچہ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ چار پانچ مہینہ کے اندر ہم نے اُردو ریڈر بھی بفضلہٖ ختم کر دی اور کنگ پرائمر کے پندرہ سولہ صفحے پڑھ ڈالے۔ اس کے علاوہ اے، بی، سی، ڈی مختلف طریقوں پر لکھنا سیکھ گئے اور سو تک کے ہندسے اُردو اور انگریزی میں لکھنا سیکھ لیے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ چار پانچ مہینہ میں اس سے زیادہ ایک ماسٹر اور کیا پڑھا سکتا تھا اور ایک ذہین شاگرد اور کیا پڑھ سکتا تھا؟ مگر باوجود ماسٹر صاحب کی اس محنت اور ہماری ذہانت کے، والدہ صاحبہ کو ہمیشہ یہ شکایت رہتی تھی کہ ماسٹر صاحب کچھ پڑھاتے وڑھاتے نہیں ہیں اور ہمیشہ جلدی چھٹی دے دیا کرتے ہیں۔

قصہ اصل میں یہ تھا کہ ماسٹر صاحب بے چارے ہم کو دو گھنٹہ روز پڑھانے پر ملازم تھے، مگر ہم کو یاد نہیں پڑتا کہ کبھی آدھ گھنٹہ سے زیادہ پڑھایا ہو۔ پہلے تو آتے ہی ہم کو اُردو ریڈر کا سبق ان

طرح پڑھایا کہ خود پڑھتے گئے اور ہم سے کہا کہ آواز ملا کر تم بھی پڑھتے جاؤ۔ چنانچہ ماسٹر صاحب کتاب دیکھ کر پڑھاتے تھے اور ہم ماسٹر صاحب کو دیکھ کر ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ دہراتے تھے۔ اس کے بعد کل کا سبق اس طرح سنتے تھے کہ ہمارے آگے کتاب رکھ دی اور کہا سناؤ سبق۔ ہم کبھی کتاب دیکھتے اور کبھی ماسٹر صاحب کا منہ۔ اس کے بعد وہ خود ہی کہتے:

”رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی“

ماسٹر صاحب خوش ہو کر کہتے تھے، ”شاباش! ہاں اور آگے۔“

”اس مالک کو کیوں نہ پکاریں
جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں“

ہم ماسٹر صاحب کی آواز سے آواز ملا کر یہ شعر بھی پڑھ دیتے۔ لیجیے قصہ ختم، گویا سبق یاد ہے۔

اس کے بعد اسی طرح کنگ پرائمر کا سبق پڑھایا اور سنا جاتا تھا۔ پھر ماسٹر صاحب سلیٹ ہمارے سامنے رکھ کر ہمارا ہاتھ جس میں سلیٹ کی پنسل ہوتی تھی، قلم کی طرح اپنے ہاتھ میں لے کر گنتی لکھنا شروع کرتے تھے اور کوئی پانچ ہی منٹ میں یہ کام بھی ختم ہو جاتا۔ مختصر یہ کہ آدھ گھنٹے کے اندر اردو، انگریزی اور حساب کی مکمل تعلیم ہو جاتی اور یہی بات والدہ صاحبہ کو ناگوار ہوتی تھی۔

بہر حال ہماری تعلیم جاری تھی اور ہم فاضل ہو جانے کے قریب ہی تھے کہ ایک دن والد صاحب کو بھی ذرا ہماری تعلیم کا خیال آیا اور انہوں نے ہم کو پاس بلا کر پوچھا، ”تم نے انگریزی کہاں تک پڑھ لی؟“ ہم نے کہا، ”آدھی کتاب پڑھ چکے ہیں۔“ والد صاحب نے اپنا انگریزی اخبار اٹھا کر ایک موٹے سے حرف پر انگلی رکھتے ہوئے کہا، ”یہ کون سا حرف ہے؟“ ہم نے اس حرف کو گھور کر دیکھا اور غور کرنا شروع کیا کہ یہ کون سا حرف ہو سکتا ہے؟ مگر کافی غور کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ خواہ کوئی بھی حرف ہو بہر حال ہماری کتاب میں نہیں ہے۔ والد صاحب نے کہا، ”بتاؤ یہ کون سا حرف ہے؟“ ہم نے جواب دیا، ”یہ حرف تو ہم نے نہیں پڑھا۔“ والد صاحب نے کہا، ”ایں کیا کہا؟ یہ حرف تم نے نہیں پڑھا اور آدھی کتاب پڑھ گئے؟ اچھا یہ کون سا حرف ہے؟ ایک اوپر کے حرف پر والد صاحب کی انگلی رکھی ہوئی تھی۔ یہ حرف بھی کچھ عجیب قسم کا تھا گویا چائے

کی پیالی کا ٹوٹا ہوا کنڈا۔ ہم نے اسے غور سے دیکھ کر گردن ہلاتے ہوئے کہا، “ہمیں نہیں معلوم۔” ایک تیسرے حرف پر والد صاحب نے انگلی رکھ دی۔ یہ حرف بالکل ڈلی کاٹنے کے سروتے کی طرح تھا اور غالباً حرف نہیں تھا، بلکہ سروتا ہی تھا۔ لہٰذا ہم نے کہا، “سروتا ہے۔” والد صاحب نے حیرت سے کہا، “کیا کہا، سروتا ہے، سروتا کیا؟” ہم نے والد صاحب کی محدود معلومات پر ہنستے ہوئے کہا، “آپ کو معلوم نہیں سروتا کس کو کہتے ہیں؟ جس سے ڈلی کاٹی جاتی ہے۔” والد صاحب نے ہم کو اور اس حرف کو یکے بعد دیگرے غور سے دیکھتے ہوئے کہا، “یہ ڈلی کاٹنے کا سروتا ہے؟ کیا تمہارے ماسٹر نے یہی تم کو بتایا ہے؟” ہم نے کہا، “نہیں ماسٹر صاحب نے تو نہیں بتایا میں خود ہی کہہ رہا ہوں۔” والد صاحب نے کہا، “اچھا اپنی سب کتابیں لاؤ۔” ہم اپنی کتابیں لے آئے اور والد صاحب نے کنگ پرائمر لے کر پوچھنا شروع کیا، “ریٹ معنی؟” ہم نے جلدی سے کہا، “ایم اے این ریٹ معنی آدمی۔” والد صاحب نے ذرا تیز آواز میں پوچھا، “ایم اے این ریٹ ہوا؟” ہم نے گھبرا کر “جی، جی نہیں۔ ایم اے این شاید کیٹ ہوا۔ کیٹ معنی بلی۔” والد صاحب نے کنگ پرائمر رکھ کر کہا، “ماشاء اللہ! خوب ان ماسٹر صاحب نے پڑھایا ہے اور خوب آپ نے پڑھا ہے۔ اچھا ذرا اُردو کی کتاب تو لائیے، جو آپ ختم کر چکے ہیں۔”

ہم نے کتاب دے دی اور والد صاحب نے کتاب کھول کر ہمارے سامنے رکھ دی کہ پڑھو۔ مگر آپ ہی بتائیے کہ یہ بھی پڑھنے کا کوئی طریقہ تھا کہ ہم خود بخود پڑھنے لگیں۔ ہم انتظار کرنے لگے کہ اب والد صاحب پڑھیں گے اور ہم کو آواز سے آواز ملا کر پڑھنا پڑے گا، مگر بجائے اس کے کہ وہ پڑھتے، انہوں نے پھر کہا، “پڑھو بھائی پڑھتے کیوں نہیں؟ یہ کتاب تو تم ختم کر چکے ہو۔” ہم نے کہا، “جی ہاں، یہ تو بہت دن ہوئے ختم ہو گئی۔ آپ پڑھیے تو میں بھی پڑھوں۔” والد صاحب نے کہا، “میں پڑھوں... یعنی میں؟ کیا مطلب اس سے؟” ہم نے کہا، “جی ہاں آپ پڑھیے گا، جب ہی تو ہم پڑھیں گے۔” والد صاحب نے انتہائی حیرت سے کہا، “میں پڑھوں گا، جب تم پڑھو گے؟ یہ کیا؟ تو کیا تم کو اسی طرح پڑھایا گیا ہے؟” ہم نے کہا، “جی ہاں ہم کو ماسٹر صاحب نے اسی طرح...” اتنے میں ماسٹر صاحب نے باہر سے آواز دی اور والد صاحب نے ہم سے کہا کہ “جاؤ ماسٹر صاحب آ گئے ہیں پڑھو جا کر۔”

ہم نے باہر جاتے ہی ماسٹر صاحب سے آج کے امتحان کا ذکر کیا اور اس کے بعد کل کا سبق

سنانے بیٹھ گئے۔ ماسٹر صاحب نے کہا، ”ہاں کل کا سبق سناؤ۔“

”رات گزری نور کا تڑکا ہوا“

ہم نے کہا، ”رات گزری نور کا تڑکا ہوا“

ماسٹر صاحب نے پڑھا:

”ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا“

ہم نے آواز ملا کر پڑھا

”ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا“

چوں کہ کل کا سبق ہم کو یاد تھا لہٰذا ہم کو نیا سبق دیا گیا اور پھر انگریزی کا سبق شروع ہوا۔ انگریزی کے بعد حساب اسی طرح سکھایا گیا۔ گنتی ختم ہونے کے بعد ہی ہم نے ماسٹر صاحب سے کہا، ”اچھا اب جائیں۔“ ماسٹر صاحب نے کہا، ”ابھی بیس ہی منٹ ہوئے ہیں اور پڑھو۔“ ہم کتابیں چھوڑ کر ماسٹر صاحب کی گردن میں لٹک گئے۔ ”آپ بڑے اچھے ہیں چھٹی دے دیجیے۔“ ماسٹر صاحب نے کہا، ”اچھا جاؤ!“ اور خود بھی جانے کے لیے اُٹھے ہی تھے کہ آواز آئی، ”ماسٹر صاحب! ذرا ٹھہریے گا۔“

والد صاحب اوپر کی کھڑکی سے جھانک رہے تھے۔ ماسٹر صاحب ان کو دیکھ کر ٹھہر گئے اور والد صاحب نے کوٹھے کے اوپر سے اُتر کر ماسٹر صاحب کو پانچ روپے کا ایک نوٹ دیتے ہوئے کہا، ”آپ کل سے زحمت نہ کیجیے گا۔“

ہم کو ان ماسٹر صاحب کی جدائی کا تو چنداں افسوس نہیں ہوا، مگر تین چار دن کے بعد ہی ایک دیوزاد ماسٹر صاحب ہم کو پڑھانے کے لیے مقرّر کر دیے گئے، جن سے والد صاحب اور والدہ صاحبہ دونوں محض اس لیے خوش تھے کہ وہ ہم کو گھونٹا کرتے تھے سوا تین گھنٹہ تک اور وہ بھی خالی ہاتھ نہیں، بلکہ قمچی کی مدد سے۔ بہر حال ان کی ان جفا کاریوں کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ہم چائے کی پیالی کے کنڈے کو ”پی“ اور سروتے کو ”آر“ کہنے لگے۔

* *

کھل گیا جھاکا

شوکت جمال

پنجابی زبان برِصغیر کی اُن چند زبانوں میں سے ہے، جن کے الفاظ میں شیرینی اور ادائیگی میں روانی ہے۔ بعض لوگوں، خاص طور پر پنجابی فلموں کے اداکاروں خصوصاً ولن کے لہجے سے سننے والوں کو اِس زبان میں کھردرے پن اور کرختگی کا احساس ہوسکتا ہے، لیکن مجموعی طور پر اس زبان کی چاشنی اور مقبولیت مسلّم ہے۔ اس زبان میں کئی الفاظ ایسے بھی ہیں، جو اُردو اور دوسری زبانوں میں پائے جاتے ہیں، مگر مطلب میں اکثر زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ یہ چار مصرعے دیکھیے:

یہ کیسا عشق ہے؟ عاشق پڑا دن رات سوتا ہے نہ آہِ سرد بھرتا ہے، نہ گاتا ہے نہ روتا ہے
کہاوت ہے یہ اُردو اور پنجابی زبانوں میں جو جاگے ہے سو پاوے ہے، جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے

پنجابی زبان کے کئی الفاظ ایسے ہیں، جن کو صحیح طور پر ادا کرنا ایک فن ہے اور بقول شخصے، عشق بن یہ ہنر نہیں آتا۔ سو، جب تک آپ اس زبان یا کسی صاحبِ زبان سے عشق نہیں کریں گے، آپ کی پنجابی ایسی ہی رہے گی، جیسے اکثر و بیشتر مصریوں کی انگریزی! میرے ایک کرم فرما نے پنجابی زبان اور تہذیب سے میرے والہانہ لگاؤ کو دیکھ کر مجھے ایک مشہور محاورہ 'جو کرے گھیو، نہ کرے ماں نہ کرے پیو' آج سے تقریباً پچیس سال پہلے رٹایا تھا۔ وہ اکثر ملتے ہیں اور یہ محاورہ مجھ سے ضرور سنتے ہیں، لیکن انگلی تو انگلی، زبان ٹیڑھی کرنے کے باوجود میرے حلق سے ویسا 'گھیو' نہیں نکلتا، جیسا انہیں چاہیے۔

پنجابی کے کئی الفاظ ایسے بھی ہیں، جن کا نعم البدل کسی اور زبان میں نہیں ملتا۔ مثال کے طور پر دلتوئی، چرغہ، قتلمہ، کھرا، وغیرہ۔ آئیے، کیوں نہ یہاں کھرے کا کچھ بیاں ہو جائے۔ کھرا سطحِ زمین سے چند انچ نیچے ہوتا ہے۔ اس کے ایک سرے پر کارپوریشن کا نلکا لگا ہوتا ہے یا ہینڈ پمپ، جس کے منہ پر ایک لمبا سا کپڑا لٹکا ہوتا ہے۔ اس کپڑے کو عرفِ عام میں ٹاکی کہتے ہیں۔ یہی ٹاکی پانی کی دھار کو کنٹرول کرتی ہے۔ حسبِ ضرورت آپ اس سے دھار کو لمبی یا چھوٹی کرسکتے ہیں۔ فلیٹوں

میں رہنے والے گھرے کی افادیت سے محروم ہیں، چوں کہ گھرے کے لیے گھر میں ویہڑہ یعنی صحن ہونا بہت ضروری ہے۔ گھر بھر کے برتن، دال، چاول، گوشت، سبزی، خاص طور پر ساگ، اور اوجھڑی کی دھلائی گھرے ہی میں تسلی بخش طور پر ہو سکتی ہے۔ صبح کو آپ ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتے ہوں، مسواک کرتے ہوں، منجن ملتے ہوں، یا کوئلے کے سفوف سے ہی کام چلاتے ہوں، کلی کرنے کے لیے گھرا مناسب ترین جگہ ہے۔ آپ باہر سے آئیں، پاؤں اور جوتے کیچڑ میں لپٹے ہوں تو پہلے گھرے کا رُخ کیجیے۔ وضو کرنے، نہانے اور بچوں کو نہلانے کے لیے بھی اسے ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ خود نہانا ہو تو بہتر ہے کہ گھرے کے اوپر ایک چادر تان لیں، تاکہ پاس پڑوس سے جھاکی نہ پڑے، ویسے یہ آپ کے جھاکے پر منحصر ہے! ایمرجنسی میں گھرے پر ہی چھوٹے بچوں کو ضروریات سے فارغ بھی کرایا جا سکتا ہے۔ دیکھا آپ نے، کتنا کثیر المقاصد مقام ہے یہ گھرا!

آمدم برسرِ مطلب۔ آج آپ کو جس عدیم المثال پنجابی محاورے سے متعارف کروا رہا ہوں وہ ہے جھاکا کھلنا۔ جھاکا کھولنے سے پہلے جھاکا کا صحیح تلفظ آنا بہت ضروری ہے۔ یہ لفظ ڈھاکا، ٹھاکا، یا دھاگا کا ہم وزن تو ہو سکتا ہے، مگر ہم آواز نہیں ہے۔ اس میں جھاکا کا جیم، جیم اور چے کی درمیانی آواز میں نکالنا پڑتا ہے، جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اسی طرح اس میں جو دو چشمی ھ ہے اس کی آواز بھی آدھی نکالی جاتی ہے اور بقیہ آدھی حلق میں ہی تحلیل کرنی پڑتی ہے۔ یہ ہے جھاکا بولنے کا صحیح طریقہ۔ آگے پڑھنے سے پہلے چاہیں تو اِس کی مشق کر لیجیے۔

شاعری میں شرم، جھجک، ہچکچاہٹ جیسے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، یا کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے، قسم کے جو مصرعے کہے گئے ہیں، ان سب کو جمع کیجیے تو جو حاصل نکلے گا وہی جھاکا کہلاتا ہے۔ دیکھا آپ نے، پنجابی کا ایک ہی لفظ اپنے اندر الفاظ اور معانی کا کتنا بڑا سمندر سموئے ہوئے ہے! ایک دفعہ جھاکا کھل جائے تو بہت سے راستے کھل جاتے ہیں اور دُور تک روشنی ہی روشنی نظر آتی ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔ کمپنی کی ملازمت میں بہت عرصے تک مجھے اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ اپنے باس سے کنٹریکٹ (یہاں کی زبان میں عقد) سے زیادہ کچھ مانگ سکوں۔ ایک دفعہ حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ عقد کی حدود سے تجاوز کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ رہا، چنانچہ میں نے خوف اور جھجک کو بالائے طاق رکھ کے باس سے حرفِ مطلب بیان کر ہی دیا۔ کام کیا نکلا، میرا تو جھاکا ہی کھل گیا۔ اب مجھے کوئی چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ بھی درپیش

ہوتا ہے تو میں تکلف نہیں کرتا۔

اسی طرح پہلے پہل قرض کے لیے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا بھی کارے دارد تھا۔ اس کے لیے جھاکا بڑی مشکل سے کھلتا ہے، لیکن اگر ایک دفعہ کام بن جائے تو پھر چل سو چل۔ قرض کے معاملے میں ہمارے حکمرانوں کا کارنامہ ہی دیکھ لیجیے، جھاکا کیا کھلا کہ دیکھتے ہی دیکھتے قرض دینے والے تمام بین الاقوامی اداروں کے ہاں ہمارا کھاتہ کھل گیا۔

شاعر اور ادیب بھی جب نئے نئے میدان میں اُترتے ہیں تو اُن کا جھاکا کھلنے میں ذرا وقت لگتا ہے۔ خاص طور پر شاعر کا جب تک اچھی طرح سے جھاکا کھل نہ جائے، وہ مشاعرے میں اپنا کلام بے دھڑک نہیں پڑھ سکتا۔ ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں، زبان لڑکھڑانے لگتی ہے، سر پر ہوٹنگ کا خوف سوار ہو جاتا ہے۔ نئے آنے والوں کو چھوڑیے، ایک بہت ہی مشہور اور منجھے ہوئے ادیب اور شاعر، جن کا شمار اپنے ملک کے ممتاز لکھاریوں میں ہوتا تھا، سعودی عرب آ کر بہت عرصے تک گوشہ نشیں رہے اور اپنے احباب کے سامنے بھی کھلنے سے پرہیز کرتے رہے۔ جھاکا تھا کہ کُھلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ بہر حال، جب خدا خدا کر کے کفر ٹوٹا تو الامان والحفیظ۔ آپس کی بات ہے، مجھے بھی ایک شاعر کی حیثیت سے جھاکا کھولنے میں بیس سال کا عرصہ لگ گیا۔ سچ پوچھیے تو میرا دیوان پہلے چھپا اور جھاکا بعد میں کھلا۔

جسے عشق کا تیرِ کاری لگے، اُس کے لیے تو جھاکا کھولنا بہت ضروری ہو جاتا ہے، ورنہ عین ممکن ہے کہ وہ بیچارا جھاکا ہی کھولتا رہ جائے اور محبوبہ کی منگنی کہیں اور ہو جائے۔ جھاکا ایک پیراشوٹ کی طرح ہے۔ جہاز سے کودتے ہوئے اگر وقت پر پیراشوٹ نہیں کھلا تو نیچے لیموزین کی جگہ ایمبولینس ہی ملے گی۔ جھاکا نہ کھل سکنے کی وجہ سے نجانے اُس شاعر کی محبت کا کیا انجام ہوا ہوگا، جس نے یہ کہا ہے:

ابھی تو رعبِ جمال سے ہم، زباں بریدہ سے ہو رہے ہیں
دیا سہارا جو ہمتوں نے تو اُن سے کچھ التجا کریں گے

اور حضرت آبروؔ کو تو جھاکا کھولنے کے کئی مواقع ملے، مگر بقول ان کے:

یوں آبرو بناوے دل میں ہزار باتاں جب تیرے آگے آوے گفتار بھول جاوے

پرانے زمانے کے عاشق بھی کیا عاشق ہوتے تھے۔ اُن کا جھاکا پیدائشی طور پر کھلا ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر مجنوں، فرہاد اور رانجھا کو ہی لے لیجیے۔ بالترتیب لیلیٰ، شیریں اور ہیر کے علاوہ وہ ان

خواتین کے والدین اور عزیز و اقارب کے سامنے بھی حالِ دل ڈنکے کی چوٹ پر کہتے رہے:

اذاں دی کعبہ میں، ناقوس دَیر میں پھونکا   کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

آج کل مشترک درسگاہوں، دفتروں اور کاروباری اداروں میں شانہ بشانہ کام کرنے اور دوسری سماجی سہولیات کی وجہ سے محبت کے ماروں کا جھاکا بھی جلد ہی کھل جاتا ہے، اگرچہ جھاکا کھولنے کے لیے فلمی طریقے زیادہ استعمال کیے جاتے ہیں، مثلاً رومال گرا کر، کرایے کے غنڈوں سے محبوبہ کو 'چھڑوا' کر، بیوی کا پکایا ہوا کھانا اپنی سیکریٹریوں کو کھلا کر، وغیرہ وغیرہ۔ جھاکا کھولنے کے لیے بعض دفعہ بڑی صاف گوئی سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً محبوبہ کو سڑک پر ہی روک کر کہا جاتا ہے 'آجا نی بے جا سائکل تے' یا 'چل چلیے دنیا دے اُس نکڑے'۔ بعض منچلے تو 'قمیض تیری کالی...' گا کر محبوبہ کے ذاتی اور اندرونی معاملات میں بھی دخل انداز ہونے سے نہیں چوکتے۔ تجربہ کی بنیاد پر میری اپنی رائے یہ ہے کہ جس محبت میں جھاکا جلدی کھل جائے، یا جان بوجھ کر کھول لیا جائے، وہ عشق، الحاق یا تعلق پائیدار نہیں ہوتا۔ کئی فلمی، سماجی اور سیاسی شخصیتوں کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔ جھٹ منگنی، پٹ بیاہ، کھٹ طلاق...!

سنا ہے کہ پرانے زمانے میں بہت سی بیویاں ایسی بھی گزری ہیں، جن کا اپنے شوہروں سے تمام عمر جھاکا نہیں کھل سکا۔ دروغ برگردنِ راوی، بعض ایسی خواتین کو تو برسوں تک ان کا حلیہ بھی نہیں معلوم ہو سکا، جن کے ساتھ ان کی قسمت جوڑی یا پھوڑی گئی۔ بعد میں بچوں کی شکل دیکھ کر کچھ اندازہ ہوا۔ اس دور میں ایسی بیویاں تو شاید نہ مل سکیں، لیکن ایسے شوہر حضرات ضرور پائے جاتے ہیں، جن کو دیکھ کر یوں لگتا ہے، جیسے طویل رفاقت کے باوجود بیگم سے ان کا جھاکا نہ کھلا ہو۔ ایسے ہی ایک صاحب کسی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ ایک دن شام کو گھر آئے، بھوک لگی ہوئی تھی، کھانا کھانے کے لیے منہ ہاتھ دھونے لگے۔ بیگم نے پوچھ لیا کہ یہ ہاتھ کس خوشی میں دھوئے جا رہے ہیں۔ فوراً کھسیا کر بولے، "ایسے ہی، ذرا بچے کو گود میں اُٹھانا تھا!" ویسے ان جیسے شوہروں پر پنجابی کا ایک اور دلچسپ محاورہ صادق آتا ہے اور وہ ہے، 'جھلے لگنا'۔ اس محاورے کے بارے میں پھر کبھی بات ہوگی۔

* * *

زنبیل

شوکت علی مظفر

عمرو عیار سے ہمارا واسطہ چوتھی جماعت میں پڑ گیا تھا۔ اُس کے پاس زنبیل دیکھ کر ہم سوچے کہ کسی طرح ہمارا بستہ بھی زنبیل کا روپ دھار لے اور ہمیں جو چیز درکار ہو، اس میں ہاتھ ڈال کر نکال لیا کریں۔ بچپن کی خواہش تھی، اُدھوری رہ گئی۔ نہ زنبیل دیکھی، نہ عمرو عیار سے آٹوگراف لے سکے۔ البتہ کہیں سے ماں جی کے ہتھے یہ زنبیل لگ گئی۔ ماں جی بیر بازار سے واپس آئیں تو ایک جہازی سائز کا پرس ان کے پاس تھا۔

''اس کا فائدہ؟'' ہم نے ایک نظر بیگ پر ڈالی۔

''فائدہ پوچھنے کا فائدہ؟'' ماں جی نے بیگ کو دیوار کی کیل سے ٹانگتے ہوئے کہا۔

ہم خاموش ہو گئے۔

کچھ ہی دنوں میں اس چمکدار فرنگی شولڈر بیگ کے فوائد نمایاں ہونا شروع ہو گئے، کیوں کہ اس کا پیٹ پھول چکا تھا۔ ایک دن بہن آئیں تو اپنے بچے کی بیماری کا تذکرہ کرنے لگیں۔ ساتھ ہی یہ انکشاف بھی کیا کہ کئی ڈاکٹر بدل لیے، مگر آرام نہیں آ رہا۔ ماں جی نے آرام سے اپنا بیگ کیل سے اُتارا، اس میں سے ایک تھیلی برآمد کی اور ایک خوراک اپنے نواسے، یعنی ہمارے بھانجے کو کھلا دی۔ شام تک اسی بھانجے نے اپنی شرارتوں سے ہماری ناک میں دَم کر دیا۔

کچھ دن بعد والد صاحب نے عمرے کی تیاری کی غرض سے اپنا تمام سامان کھنگال ڈالا، مگر پاسپورٹ غائب تھا۔ ماں جی سے پوچھا، تو انہوں نے چھوٹی بہن زینب سے بیگ لانے کو کہا اور پتا نہیں بیگ کے کس خانے سے پاسپورٹ نکال کر ابو کے ہاتھ پر دھر دیا۔

اسی اثنا میں ایک محلے دار خاتون آئیں، جنہیں مُردے کو نہلانے کے لیے بیری کے پتے نہیں مل رہے تھے۔ ماں جی نے بیگ اُتارا اور اُس میں سے بیری کے پتے نکال کر اُنہیں تھما دیے۔

اُس دن ہم نے یقین کر لیا کہ ہو نہ ہو، یہ جہازی بیگ عمرو عیار کی زنبیل ہے، جس میں میڈیکل اسٹور کھلا ہوا ہے، پاسپورٹ آفس بنا ہوا ہے، بیری کے درخت اُگے ہوئے ہیں، بلکہ میٹرک بورڈ آفس بھی موجود ہے، کیوں کہ بعد میں بھائی کے گمشدہ تعلیمی کاغذات یہیں سے برآمد ہوئے تھے!

اڑوس پڑوس کی عورتیں ڈاکٹروں سے تنگ آجائیں تو والدہ سے دوا لینے آجاتی ہیں۔ معلوم نہیں، ماں جی کو کیسے پتا چل جاتا ہے کہ کس دوا کی ضرورت ہے، مگر ہمیں یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ یہ دوا ماں جی کی زنبیل میں موجود ہے، جسے وہ مسکراتے ہوئے برآمد کرتی ہیں۔ اگلے دن وہ خاتون ہشاش بشاش ہمارے گھر میں چائے پیتی نظر آتی ہیں۔ غرض ماں جی کی زنبیل میں دنیا بھر کا خزانہ پایا جاتا ہے، ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ہماری شادی کی بات طے کر کے آئیں تو خوشخبری سناتے ہوئے زیورات کے باکس زنبیل سے نکال کر ہمیں دکھانے لگیں۔

کل ایک بڑا سانحہ ہو گیا۔ زنبیل کسی نے چوری کر لی۔ اس بات کا علم ایسے ہوا کہ بیگم نے بُری خبر دی کہ اس مرتبہ بجلی کا بل چار ہزار کا آیا ہے۔ ہم نے بل دکھانے کی فرمائش کی، تا کہ واپڈا والوں کا ظلم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ بجلی تو آتی نہیں، بل کیسے اتنا زیادہ آ گیا؟ بیگم نے ماں جی سے کہا، ماں جی نے حکم دیا، ”بہو! میرا بیگ لانا۔“ بہو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی، ہر جگہ تلاش کر لیا، مگر بیگ غائب تھا۔ کسی کو علم ہو چکا تھا کہ اس بیگ میں خزانے بھرے رہتے ہیں۔ سو اُڑا لیا گیا۔ قیاس یہی تھا کہ کل رات جب بجلی گئی تو سب گھر والے چھت پر چلے گئے اور نیچے کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ کوئی چور اُچکا آیا اور بیگ اُٹھا کر چلتا بنا۔ یہ کوئی پہلا واقعہ نہ تھا، اس سے پہلے تیار سالن کی دیگچی بھی غائب ہو چکی تھی۔ اس دن کے بعد سے احتیاط برتی جاتی تھی کہ دروازہ کھلا نہ رہ جائے، مگر ہونی ہو کر رہتی ہے۔ زنبیل غائب ہو چکی تھی۔ ہم پریشان تھے۔ والدہ کو صرف اتنا افسوس ہوا کہ پتا نہیں اب دوبارہ اُس جیسا بیگ ملتا بھی ہے کہ نہیں۔

”مگر اُس میں جو اتنا سارا سامان تھا، اُس کا کیا ہو گا؟“ ہم نے پوچھا۔

”میرا شناختی کارڈ فارم بھی اُسی میں تھا۔“ چھوٹے بھائی نے یاد کرایا۔

”بھائی کے کمرے کی چابیاں بھی اسی میں ہیں۔“ چھوٹی زینب بولی۔

”اس کا مطلب ہے، میرا پاس[illegible] ، اور شناخ[illegible] بھی چوری ہو گیا۔“ ابو چونکے۔

”میں تو قصیٰ کی دوا لینے آئی تھی، اب کیا ڈاکٹر کے پاس جاؤں۔“ بہن نے اپنی بچی کے ماتھے کو چھوا۔

”بیگ میں کچھ نہیں تھا، دو چار پرچیاں تھیں، باقی سب کچھ میں نے صبح ہی نکال لیا تھا۔“ ماں جی نے بتایا۔

”تو پھر بجلی کا بل کہاں ہے؟“ ہم نے بے ساختہ پوچھا، کیوں کہ معاملہ یہیں سے شروع ہوا تھا۔

”وہ شاید بیگ میں ہی تھا، کیوں کہ میں نے لائٹ جانے سے پہلے اُسی میں رکھ دیا تھا۔“ ماں نے بتایا۔

”اس کا مطلب ہے چور ہمارا دشمن نہیں، ہمدرد اور مہربان ہے۔“ ہمارے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

سب گھر والے اس بے تکی بات پر، حیرانی سے ہماری طرف دیکھنے لگے۔

”وہ کیسے؟“ ماں جی نے پوچھا۔

”وہ ہمارا ہزاروں روپے والا بجلی کا بل جو لے گیا ہے۔“ ہم نے توجہ دلائی تو سب چوری کا غم بھول گئے۔

اب چور صاحب کی حالت پر ہمیں ترس آ رہا ہے، وہ جب بیگ کھولیں گے تو اندر سے ایک جان لیوا کاغذی سانپ برآمد ہوگا، جس کا زہر آنکھوں کے آگے اندھیرا لے آتا ہے۔ بہر حال، اس تحریر کے ذریعے ہم چور کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ محترم چور صاحب! برائے مہربانی آپ بل بھر دیں، آپ تو چور ہیں، کہیں اور سے بھی مال پار کر لیں گے۔ ملک نے ٹوکا، ”بجلی والوں نے بھی تو یہی سوچ کر تمہیں بل بھیجا تھا!“ واقعی، اکیلے ہم ہی نہیں، ہم سب چور ہیں، کیوں کہ بڑے بڑے معاملات میں بھی ایک دوسرے سے اتفاق کرنے کی بجائے نظریں چرا کر گزر جاتے ہیں!!

❖ ❖

در مدحِ افسرانِ بالا

صبیح محسن

کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں بندھے ہوئے افراد عموماً ایک دوسرے سے ویسے ہی نالاں اور شاکی نظر آتے ہیں، جیسے اُردو شاعری میں شاعر رقیب سے اور ہماری فلموں میں بے چارہ ہیرو سماج سے! پرانے زمانے میں اس قسم کے رشتوں میں سرِفہرست ساس، بہو اور نند، بھاوج کے رشتے ہوا کرتے تھے۔ نئے دور نے ایسے ہی کئی اور رشتوں کو جنم دیا ہے یا پھر کچھ پرانے رشتوں کو اسی رنگ میں رنگ دیا ہے۔ مثال کے طور پر مالک مکان اور کرایہ دار کا رشتہ، نئی نسل اور پرانی نسل کا رشتہ ٹیلی وژن دیکھنے والوں اور ٹیلی وژن دِکھانے والوں کا رشتہ۔

ایسا ہی ایک رشتہ اور بھی ہے۔ لیکن نام اس کا لینے سے پہلے ہم یہ واضح کر دیں کہ منظور اِس سے قطعِ محبت نہیں ہمیں۔ یہ ہے افسر اور ماتحت کا رشتہ۔ اُنہیں اِن میں ساری برائیاں نظر آتی ہیں اور اِنہیں ان میں کوئی بھلائی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اُنہیں کام چور سمجھتے ہیں اور یہ اُنہیں نا اہل۔ دونوں ایک دوسرے کو دفتری تعلق کے رنگین شیشوں سے دیکھتے ہیں۔ ہم نے بھی اس رشتے کو رنگین عینک سے ہی دیکھا ہے، ماتحت کی عینک سے۔ آیئے آپ کو بھی دکھائیں کہ کیا کچھ دیکھا۔ ہم نے جب ملازمت کے خاردار میدان میں قدم رکھا تو آتش جوان تھا، بڑے بڑے ارادے تھے۔ خیال یہ تھا کہ ہم نئی نسل سے ہیں۔ نیا ذہن، نئے خیالات، ان سے اپنے دفتر کی کارکردگی کہیں سے کہیں پہنچا دیں گے اور دیکھنے والے بآوازِ بلند کہیں گے، عش عش!

عہدہ سنبھالتے ہی ہم نے کچھ تجاویز تیار کیں اور انہیں منظوری کے لیے اپنے افسرانِ بالا کے پاس بھیج دیا۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ ان تجاویز کو پڑھ کر ہمارے افسرانِ بالا پھڑک اُٹھیں گے۔ خود آئیں گے یا ہمیں بلائیں گے، ہمارے گال تھپتھپائیں گے۔ پیٹھ ٹھونکیں گے اور پھر جھوم کر کہیں

گے، ’’منظور! منظور! ان تجاویز پر عملدر آمد فوراً شروع کر دیا جائے۔‘‘

لیکن ہوا یوں کہ کئی دن گزر گئے۔ نہ تو ہمارے افسر بالا نے ہمیں بلایا، نہ فائل ہی واپس آئی۔ آخر جب ایک ہفتہ یوں ہی نکل گیا تو ہم ان کے پاس گئے۔ وہ مصروف تھے۔ نظریں ایک فائل پر جمی ہوئی تھیں۔ ہم نے دروازے پر ہلکے سے دستک دی، تاکہ وہ متوجہ ہوں۔ ان کی نظریں اُٹھیں، ہمیں دیکھا، آنکھوں کے اشارے سے خالی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ ہم بیٹھ گئے، پھر اُسی فائل میں غرق ہو گئے۔

ہم نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میز اور ریک پر فائلیں ہی فائلیں تھیں۔ ان میں ایک ڈھیر کے اوپر وہ فائل نظر آئی، جس میں ہماری بھیجی ہوئی تجاویز تھیں۔ ہمارا جائزہ ختم ہو گیا، لیکن ان کا فائل کا مطالعہ ختم نہ ہوا۔

ماحول اتنا مرعوب کن تھا کہ ہم سے کچھ کہا بھی نہ جاتا تھا۔ آخر بڑی کوشش سے دل کڑا کر کے کہا، ’’جی، وہ ایک گزارش تھی۔‘‘

انہوں نے نظریں اُٹھائیں۔ ’’فرمائیے۔‘‘

’’کافی عرصہ ہوا ایک فائل آپ کو بھیجی تھی۔‘‘ ہم نے کہا۔

’’کافی عرصہ ہوا؟ کتنا عرصہ ہوا؟‘‘ انہوں نے پوچھا۔

’’جی یہی کوئی ایک ہفتہ‘‘ ہم نے کہا۔

’’ایک ہفتہ؟‘‘ انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

ہم یہ سمجھے کہ اب وہ معذرت کریں گے کہ فائل ان کے پاس ایک ہفتے تک یوں ہی پڑی رہی۔

’’ایک ہفتے کو آپ کافی عرصہ کہتے ہیں؟‘‘ انہوں نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ ’’برخوردار! یہاں تو چھ چھ مہینے سے فائلیں رکھی ہیں جنہیں دیکھنے کا مجھے موقع نہیں ملا۔ آخر میرے پاس صرف آپ ہی کا کیس نہیں ہے، دوسرے افسروں کے بھیجے ہوئے کیس بھی ہیں اور میں آدمی ہوں مشین تو نہیں۔‘‘

اس کے آگے کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہ تھی، ہم اُٹھ کر چلے آئے۔ کئی دن بعد ہمیں اپنی فائل واپس ملی۔ ہماری تحریر پر جگہ جگہ سرخ دائرے اور سوالیہ نشان لگے ہوئے تھے۔ آخر میں

ہمارے افسر صاحب نے لکھا تھا کہ تجاویز نہ صرف مہمل اور نا قابلِ عمل ہیں، بلکہ ضابطے نمبر فلاں اور قاعدے نمبر فلاں کے خلاف بھی ہیں۔ مزید یہ کہ اس فائل سے ظاہر ہوتا ہے کہ افسرِ متعلقہ ہمارے ادارے کے ضوابط اور قاعدوں سے ناواقف ہیں، وہ پہلے ان کا مطالعہ کریں۔

ہمارے دوسرے افسرِ بالا بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے، دفتر کے کام کو بھی عبادت جانتے تھے۔ چنانچہ دفتری اوقات کے بعد بیٹھنا ان کا روز کا معمول تھا اور جب جانے لگتے تو فائلوں کا ایک گٹھڑ گاڑی پر لد کر اُن کے ساتھ گھر جاتا، تاکہ وہاں بھی وظیفہ جاری رہے۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اتنی محنت اور جانفشانی کے باوجود ہر معاملہ جو اُن کے ہاتھوں میں پڑتا، وہیں کا وہیں رہ جاتا۔ کبھی کوئی فیصلہ نہ ہو پاتا۔

ایک عادت ان میں اور تھی۔ وہ یہ کہ خود تو بندۂ مومن تھے، لیکن اوروں کو گنہگارِ محض گردانتے تھے۔ کبھی اپنے کسی ماتحت پر اعتبار نہ کرتے اور اُس کے کام سے اس کی پہلی کوشش پر مطمئن ہونا تو جانتے ہی نہیں تھے۔ ہم جب بھی کسی خط کا مسودہ ان کے پاس بھیجتے یا دفتری زبان میں یوں کہیے کہ "Draft put up" کرتے تو 'غیر اطمینان بخش' لکھ کر لوٹا دیتے۔ پہلے پہل تو ہم بڑے پریشان ہوئے۔ اپنی ساری علمیت گھول ڈالی۔ آکسفورڈ ڈکشنری سے لے کر 'کنگز انگلش' تک تمام ہی کتابیں کھنگال ڈالیں، تب بھی کبھی ہماری تحریر پہلی ہی بار میں اطمینان بخش ثابت نہ ہو سکی۔ آخر ہمیں ان کو بھگتانے کا گُر آ ہی گیا۔ پہلے ہم مسودہ اِس انداز میں لکھتے جو ہمارے نزدیک صحیح ہوتا۔ پھر اُس کے ابتدائی پیراگراف بیچ میں، بیچ کے آخر میں اور آخر کے شروع میں لکھ کر افسرِ بالا کے پاس بھیج دیتے۔ وہ اس پر 'غیر اطمینان بخش' لکھ کر لوٹا دیتے۔ ہم اسے پھر اُس کی اصل ترتیب میں لکھ کر دوبارہ ان کے پاس بھیج دیتے اور وہ اسے منظور کر دیتے۔

ان کے بعد ہمیں جو افسر ملے وہ ان بزرگ کے بالکل برعکس تھے۔ وہ دفتری کام کو عبادت سمجھتے تھے تو یہ بدعت۔ وہ گھر پر بھی فائلیں لے جاتے، یہ دفتر میں بھی اپنی میز پر کوئی فائل دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ یار باش آدمی تھے۔ عموماً دوستوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ جاسوسی ناولوں کے بھی بڑے رسیا تھے۔ میز کی درازوں میں عمران سیریز سے لے کر پیری میسن سیریز تک کی سب ہی کتابیں موجود ہوتیں۔ جب یار دوست نہ ہوتے تو وہ ان میں مگن رہتے۔ ماتحت بھی خوش تھے کہ نہ تو وہ ان پر خواہ مخواہ رعب ڈالتے اور نہ ان کے کام میں کیڑے نکالتے۔ دفتر کے کام سے نبٹنے کا [illegible] ......

انہوں نے بڑا سیدھا سادہ طریقہ نکالا تھا۔ جو خطوط یا کاغذات باہر سے یا ان کے افسر بالا کے یہاں سے آتے، انہیں وہ ہمیں اور دوسرے ماتحت افسروں کو بھیج دیتے۔ ہم متعلقہ کیس کا مطالعہ کر کے جواب تیار کرتے۔ یہی جواب وہ اپنے افسر بالا کو روانہ کر دیتے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ اوپر سے کوئی کاغذ آیا تو فوراً نیچے بھیج دیا۔ نیچے سے آیا تو اوپر۔ ڈاک خانے کی طرح۔ میز بالکل صاف رہتی اور موصوف ارل اسٹینلے گارڈنر یا ابنِ صفی کی جاسوسی دنیا میں گم۔

اس کے بعد ہمیں جو ملازمت ملی، اس میں سلسلہ کچھ ایسا تھا کہ اکثر ہمیں اپنے افسرِ بالا کے ساتھ ان کے افسرِ بالا کے حضور پیش ہونا پڑتا تھا۔ ہمارے افسرِ بالا کے افسرِ بالا دورِ انگلشیہ کی تبرکات میں سے تھے۔ ان کی شان ہی اور تھی۔ ہم نے گئے وقتوں کے شاہوں کی داد و دہش کا حال اور اُن کے جلال و دبدبے کا ذکر کتابوں میں پڑھا تھا، آنکھوں سے اس کی جھلک ان میں دیکھی۔ جب کرم گستری پر آتے تو میٹرک فیل کو سینیر کلاس وَن افسر بنا دیتے اور جب جلال میں آتے تو بڑے بڑے غیر ملکی سند یافتہ افسروں کو یوں چشم زدن میں برطرف کرتے کہ افسرِ موصوف لنچ کے وقفے کے بعد دفتر لوٹتے تو بلا سان وگمان! اپنے کمرے کا دروازہ مقفل پاتے اور جب چوکیدار سے پوچھتے تو وہ برطرفی کا حکم نامہ تھما کر بتاتا کہ بڑے صاحب کا یہی حکم ہے۔ ان کے دربار میں محمود و ایاز کی کوئی تفریق نہ تھی۔ سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے، بلکہ یوں کہیے کہ ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے۔

ہمارے افسرِ بالا ماشاءاللہ خاصا صحت مند جسم رکھتے تھے، ذہن کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ان کا کمرہ بالائی منزل پر تھا اور اُن کے افسرِ بالا کا گراؤنڈ فلور پر۔ ان کی طلبی کچھ اس انداز سے ہوتی کہ پہلے تو انٹرکام پر کچھ کھڑکھڑاہٹ سی ہوتی۔ وہ اسے سن کر چونک پڑتے۔ رنگ پیلا پڑ جاتا۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو جاتیں اور وہ مجسم کان بن کر انٹرکام کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ اُدھر سے شاہانہ کی آواز آتی، **"Roll down fatty!"** (موٹے نیچے لڑھک آؤ)۔ ہمارے افسرِ بالا لیس سر کہتے اور ہڑبڑا کر ایک ہاتھ سے ڈائری اور دوسرے سے پتلون سنبھالتے اُٹھ کھڑے ہوتے اور پھر ہم سے گلوگیر آواز میں کہتے کہ ساتھ چلو۔

ہم دونوں شاہ کے دربار میں پہنچ کر دم بخود کھڑے رہتے اور سوچتے کہ اب نہ جانے کیا اُفتاد پڑنے والی ہے۔ وہ کچھ دیر تک تو ہمارا نوٹس ہی نہ لیتے۔ پھر اشارے سے بیٹھنے کو کہتے۔ چند لمحوں کے بعد وہ ہمارے افسرِ بالا کی (اور کبھی کبھی ہماری) شان میں قصیدہ گوئی شروع کرتے اور زبان وبیان

کے وہ معرکۃ الآرا نمونے سامنے آتے کہ اگر کہیں مرزا رفیع سوداؔ سن پاتے تو غنچہ سے کہتے کہ قلمدان کہیں دفن کر آئے۔ اس ساری کارروائی کے دوران ہمارے افسرِ بالا بھیگی بلی بنے کبھی اپنی ڈائری میں کچھ نوٹ کرتے، کبھی منہ ہی منہ میں لیس سر کہتے اور کبھی پیشانی سے پسینہ پونچھتے۔ آخر یہ جان لیوا عمل ختم ہوتا۔ ہم دونوں شاہ کے کمرے سے باہر آتے اور پھر ہمارے افسرِ بالا کے تیور اچانک بدل جاتے۔ خمیدہ کمر تن جاتی۔ سینہ اُبھر آتا اور وہ ہم سے بڑے بارعب انداز میں وہیں کھڑے کھڑے اس مسئلے پر جواب طلب کرتے، جس کے سلسلے میں کمرے کے اندر اُن کی گوشمالی ہو چکی ہوتی تھی۔

آیئے، اب ہم آپ کو اپنے موجودہ افسرِ بالا کے بارے میں کچھ بتائیں۔ لیکن ٹھہریئے، پہلے ہم کسی اور ملازمت کا بندوبست کر لیں۔ برائے مہربانی اس وقت تک انتظار فرمائیں!

* *

ماڈرن تعزیت نامہ!

صدیق سالک

420، بیچ لگژری، کراچی نمبر 10

مائی ڈیئر نانی!

میں پچھلے ہفتے یورپ کے بزنس ٹرپ سے واپس آیا تو ڈیڈی کا خط ملا، جس میں لکھا تھا کہ آپ کے "Husband"... "Expire" ہو گئے ہیں۔ مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ وہ ٹی بی جیسی غریبانہ بیماری کا شکار ہوئے۔ اگر انھیں مرنا ہی تھا تو کسی اچھی سی بیماری سے مرتے۔ لیکن وہ غریب تھے اور آخری وقت تک انھوں نے بیماری سمیت اپنے غریب ساتھیوں کا ساتھ دیا، جو اپنی جگہ بہت بڑی کوالٹی ہے۔

ڈیڈی نے مجھے یہ مشورہ دیا ہے کہ میں افسوس کے لیے خود آؤں۔ اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے نہ آسکوں تو کم از کم اپنے ہاتھ سے آپ کو ایک "Letter of condolence" لکھ بھیجوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اب کرسمس بالکل قریب ہے اور خوشی کے اس موقع پر میں نے بہت سے دوستوں کو پارٹی دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ کرسمس کے فوراً بعد ہم مری میں اسنوفال دیکھنے جا رہے ہیں۔ اب یہ پروگرام "Finalise" ہو چکا ہے، اس لیے اسے "Cancel" کرنے سے سب کا موڈ آف ہونے کا خطرہ ہے۔ ان مصروفیات کی وجہ سے میں خود آنے سے مجبور ہوں، البتہ اگر آپ ضروری سمجھیں تو اپنی ذاتی نمائندگی کے لیے اپنے سیکرٹری کو بھیج سکتا ہوں۔

مجھے آپ کے غم کا پورا پورا احساس ہے، کیوں کہ پچھلے دنوں جب ہمارے ایک بزنس پارٹنر کا انتقال ہو گیا تو ہم سب کو بہت صدمہ ہوا۔ مرحوم تو آپ کے لائف پارٹنر تھے اور ہر نفع و نقصان میں آپ کے ساتھ رہے۔ ایسے ساتھی کا بچھڑ جانا واقعی آپ کے لیے بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔

پچھلے سال ممی کی سالگرہ پر مرحوم سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بڑے اسمارٹ اور

"Well-read" آدمی تھے۔ ان کے پاجامے کی موری، موڈرن کٹ کی پتلون کی موری سے بھی تنگ تھی اور اُن کی داڑھی کا خضاب اور جوتوں کی پالش کبھی مدھم نہیں پڑی تھی۔ لٹریچر کی مختلف برانچوں کے متعلق اٹل رائے رکھتے تھے۔ مثلاً، وہ اُردو شاعری اور رومانی ناولوں کو ہمیشہ برا بھلا کہتے تھے، البتہ اسلامی ناولوں کی اکثر تعریف کیا کرتے تھے۔ اُن کی "Popularity" کا یہ حال تھا کہ ہر مقدمے میں شہادت دینے کے لیے انھیں ہی "Approach" کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنی "Qualification" والا "Husband" آپ کو اِس "Age" میں اب کہاں ملے گا۔

مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ میں اُن کے مرنے کے وقت وہاں موجود نہ تھا، ورنہ انھیں اس حالت میں اور اِس بیماری سے قطعاً نہ مرنے دیتا۔ اگر وہ مر بھی جاتے تو اُن کے کفن دفن کے لیے کسی ایسی فرم کو ٹھیکہ دیتا کہ لوگ یہ بھول جاتے کہ وہ ٹی بی سے مرے ہیں۔ بلکہ میرا تو ارادہ یہ تھا کہ اُن کی قبر کا ڈیزائن بھی کسی "Well known architect" سے بنوایا جاتا۔ جس آرکیٹکٹ نے میری گلبرگ والی کوٹھی کا ڈیزائن بنایا ہے، وہ بھی آج کل خاصا پاپولر ہے۔ میرے اُس کے "Terms" بھی اتنے "Friendly" ہیں کہ آپ اگر ڈیزائن کی قیمت قسطوں میں بھی ادا کرنا چاہتیں تو اُسے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ بہر حال "Offer" اب بھی موجود ہے۔ اور اگر آپ نے پہلے ہی اُن کا مقبرہ تیار کرا لیا ہو تو اُس کی ایک عمدہ سی تصویر یا "Colour negative" بھیج دیں تا کہ پاپا کو دکھا سکوں۔

آخر میں مَیں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ اُن کے مرنے سے متعلق جتنے بھی فنکشن کریں، اُن میں کھلے دل سے خرچ کریں، کیوں کہ اِس سے مرنے والے کا "Social status" بلند ہوتا ہے۔ میری تجویز ہے کہ آپ مولوی صاحب کو کاٹن کا جوڑا دینے کی بجائے اعلیٰ قسم کا سوٹ دیں اور غریبوں اور مسکینوں کو انگریزی کھانا کھلائیں، تا کہ یہ لوگ جہاں جائیں آپ کی تعریف کریں۔ جب اس جہاں میں ہر آدمی کے ساتھ اُس کے سوشل اسٹیٹس کے مطابق سلوک کیا جاتا ہے تو عین ممکن ہے کہ اگلے جہاں میں بھی سوشل اسٹیٹس کو اہمیت دی جاتی ہو!

میں اور بھی اچھی اچھی باتیں آپ کو لکھنا چاہتا تھا، لیکن ابھی میری پرسنل سیکریٹری نے برلن سے آیا ہوا ایک تار میرے سامنے رکھا ہے، جس میں "Shares" کی قیمت گرنے کا

اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے، لہٰذا یہ "Letter of condolence" یہیں ختم کرتا ہوں۔ آپ میرے ڈیڈی اور ممی کو اِس خط کی اطلاع دے دیں، تاکہ انھیں بھی پتا چل جائے کہ میں نے انتہائی مصروفیات کے باوجود اُن کے مشورے پر عمل کیا ہے۔

یورز گریٹ سن
آئی۔ یو۔ سعادت

* *

نائٹ کلب

صولت رضا

مارننگ پریڈ کو فال ان ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک آوارہ مچھر ہوا خوری کے لیے ادھر آنکلا۔ پہلے روایتی انداز میں رجز پڑھے اور پھر بے چارے کیڈٹ کو ملکہ کے بت کی مانند گم سم پا کر بڑکیں مارنی شروع کر دیں۔ کیڈٹ اس اشتعال انگیزی کے باوجود پُرامن رہا۔ مچھر کا حوصلہ بڑھا اور وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیڈٹ کے رخساروں پر حملہ آور ہوا۔ کیڈٹ مچھر سے خوفزدہ نہیں تھا، بلکہ اصل بات یہ تھی کہ ڈرل انسٹرکٹر کو دعوت شجاعت دینے کے مترادف ہے۔ اور یہ بات سب کے علم میں تھی کہ دعوت پر مدعو کرنا آسان ہے، لیکن انسٹرکٹر کی داد شجاعت وصول کرنا مہنگا سودا ہے۔ لہٰذا ہم نے پوری کوشش کی کہ دعوت ریز رو ہی رہے۔ اس روز مچھر کی اشتعال انگیزی نے پورا ریکارڈ تباہ کر دیا اور ہمارا شمار بھی ان کیڈٹوں میں ہونے لگا جو پریڈ کے علاوہ بھی 'کچھ' کرتے اور سوچتے ہیں۔ یہ 'کچھ' کرنے کا حادثہ مچھر کی اشتعال انگیزی کا نتیجہ تھا۔ وہ کیڈٹ کے خون سے جب اپنے لب تر کر رہا تھا تو ہم نے اسے اڑانے کا جدید طریقہ اختیار کیا۔ سب سے پہلے پیٹ بھر کر سانس لی، اپنے ہونٹوں کو باریک سوراخ کی شکل دی، اس سوراخ کو اندازاً مچھر پر فٹ کیا اور پوری قوت سے سانس کی ہوا نکال دی۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ طوفان مچھر کو اُڑا دے گا اور ہم اطمینان کے ساتھ پریڈ پر دھیان دے سکیں گے، لیکن مچھر شاید زیادہ مدہوش تھا اور یہ وار ناکام ثابت ہوا۔ ہم نے دوبارہ سانس کے ذریعے حملہ کیا۔ اس مرتبہ ہوا کی رفتار اور مقدار پہلے سے زیادہ رکھی۔ یہی احتیاط لے ڈوبی۔ جب راکٹ کی مانند ہوا منہ سے نکلی تو مچھر اُڑ گیا، لیکن پریڈ کی صفوں میں سیٹی کی گونج سنائی دی۔

ہماری سیٹی کمان سے نکلے تیر کی طرح تھی، جسے اب دنیا کی کوئی طاقت خاموش نہیں کر سکتی تھی۔ اس گناہِ کبیرہ کی آواز جب انسٹرکٹر کے کانوں سے ٹکرائی تو اُس کا ردِ عمل ایسا ہولناک تھا کہ

ہر کیڈٹ کے کان میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ "Fall Out" کا کاشن، سٹاف نے پوری طرح ادا نہیں کیا تھا کہ میں پریڈ سے باہر نکل آیا اور سٹاف کے قدرتی غصّے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے خود بخود زمین پر اُردو حساب کا بڑا سا '۸' بن گیا۔ سٹاف نے فوراً پیش قدمی کی۔ اُردو کا یہ '۸' دُور سے کبھی '۱۸' اور کبھی '۸۱' نظر آنے لگا (اکیڈمی میں ڈرل اور پی ٹی انسٹرکٹروں کا مودبانہ تخلص")۔

"آپ نے سیٹی بجائی؟" اسٹاف نے پوچھا۔

"اسٹاف! دراصل مچھر اُڑا یا ہے۔"

"پریڈ میں مچھر کی طرف دھیان کیوں دیا؟"

"تنگ کر رہا تھا، مجبوری تھی۔"

"ٹھیک ہے، شاؤٹ یور نمبر"

سٹاف، نمبر نوٹ کر کے پلاٹون کے قریب ہو گئے '۸' اکیلا رہ گیا۔ تاہم اس عرصے میں پلاٹون نے جی بھر کر مچھر مارے، مکھیاں اُڑائیں اور خوب کھجلی کی۔ کسی طور دن کٹا، لنچ بریک میں سب مبارک باد دے رہے تھے کہ آج اسٹاف نے تمہارا نمبر نوٹ کر لیا ہے اور اب نائٹ کلب میں خوب گزرے گی۔

نائٹ کلب کا نام پہلے بھی سنا تھا۔ یہ ہمارے کمروں کے پچھواڑے واقع تھا۔ رات کے پہلے پہر میں یہاں سے بلند ہونے والی آوازیں خواب میں بھی کیڈٹوں کا پیچھا کرتی تھیں۔ کچھ کیڈٹ نائٹ کلب کے مستقل ممبر تھے۔ یہ بات ہمارے کورس میں بھی کسی کو معلوم نہیں تھی کہ اس جگہ کا نام نائٹ کلب کس نے رکھا ہے۔ کیڈٹ کے پاس اس قسم کے تاریخی حقائق کا کھوج لگانے کے لیے وقت بھی نہیں تھا، لہٰذا ہر ایک نے نائٹ کلب کی ممبر شپ کو اس کی تاریخ پر ترجیح دی۔

رات کو ڈنر سے فارغ ہو کر سینیئر بستروں میں گھس جاتے اور جونیئر رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ کر اونگھنا شروع کرتے تو کچھ کمروں سے چھن چھن چھنا چھن کی آواز سنائی دیتی۔ یہ نائٹ کلب کے ممبروں کی تیاری تھی۔ مخصوص لباس زیب تن کیا۔ دنیا کے ہر کلب کی طرح یہاں داخلے کے لیے خاص لباس پہننا ضروری ہے۔ لباس کے ساتھ جملہ زیورات اور مقررہ سامان بھی لے جانا لازم تھا۔ نائٹ کلب میں لباس اور سامان کے ساتھ ساتھ وقت کی پابندی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ رہائشی بلاک سے تقریباً ایک ہی وقت میں ممبروں کی ٹولیاں برآمد ہوتیں اور طویل برآمدہ آوازوں

بذلہ سنجی دو عالم

سے گونج اٹھتا۔

نائٹ کلب کی ممبر شپ حاصل کرنے کے بعد ہم دعوت نامے کا بہت اشتیاق سے انتظار کرنے لگے۔ اسٹاف کو شاید ہماری بے تابی کا علم تھا، لہٰذا اُنہوں نے بھی دیر نہ لگائی اور واردات کے چند گھنٹے بعد ہمارا نام ان بے شمار خوش نصیبوں کی فہرست میں جگمگا رہا تھا، جنہیں اس روز اسٹاف کی نگاہوں نے اندیشۂ نقصِ نظم وضبط کے الزام میں چیک کیا۔ ہم صرف 'ایکسٹرا رول کال' کے حقدار پائے گئے، کیوں کہ کیڈٹ اگر بدھ یا ہفتے کے دن ''چیک ہو جائے تو ایکسٹرا رول کال کے ساتھ ساتھ 'ایکسٹرا ڈرل' کا اسپیشل دعوت نامہ مل جاتا ہے۔ ایکسٹرا ڈرل کو نائٹ کلب کی دعوتِ عصرانہ سمجھ لیجیے۔ 'ایکسٹرا رول کال' نام کے اعتبار سے حسین قسم کی چیز لگتی ہے۔ روزمرّہ کی تفریحی سرگرمیوں میں یہ نام انفرادی طور پر اکثر سننے میں آتے ہیں اور اِس لفظ کے دائیں بائیں کچھ لفظوں کا اضافہ کر دیا جائے تو حسن اور نکھر جاتا ہے۔ سچی بات ہے کہ پی ایم اے کے نائٹ کلب سے ہمیں حسن کے نکھار کی توقع کم تھی، بلکہ اپنے خون پسینے کے زیاں کا زیادہ دھڑکا لگا ہوا تھا۔

شام چار بجے کے قریب اردلی چائے لایا اور چائے تھرماس سے کپ میں انڈیلتے ہوئے کہنے لگا، ''صاحب! سنا ہے رات آپ **"Punishment Parade"** پر جا رہے ہیں۔ (نائٹ کلب کا اصلی اور سرکاری نام، جسے عرفِ عام میں پٹھو پریڈ بھی کہتے ہیں) کتنی ایکسٹرا رول کال ملی ہیں؟'' یہ سوال سن کر یوں لگا، جیسے چائے کا درجۂ حرارت سوا نیزے پر پہنچ گیا ہو۔

''صاحب! فکر نہ کریں، ایک دم فسٹ کلاس چمڑا تیار کر کے دوں گا اور 'چھبی آئیٹم' بھی پورے کرنے ہیں۔'' وہ مسلسل بولے جا رہا تھا (چھبیس اشیاء: یہ ہر کیڈٹ کے پاس موجود ہوتی ہیں)۔

''ہاں ہاں بھئی، جیسے مرضی ہے کرو۔ مجھے سامان مکمل ملنا چاہیے۔ فی الحال دو رول کال ملی ہیں۔''

میں نے بات ختم کی اور کھڑکی سے دور سرسبز پہاڑیوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ خاموش پہاڑیاں جن کی چوٹیوں پر برف کا ملبہ کئی روز سے گر رہا تھا۔ ایبٹ آباد کی وادی اور اردگرد کے پہاڑوں پر برفباری کا منظر بے حد حسین لگتا ہے، تاہم نائٹ کلب کے لان میں برفباری سے خود کو محفوظ کرنا کیڈٹ کے دل گردے ہی کا کام ہے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ روزمرّہ کی ڈرل بن گئی۔

برفباری تو کیا، نائٹ کلب کو گرجتی برستی بارشیں اور موسم سرما کی ٹھٹھرتی سرد ہوائیں ویران نہیں کرسکیں۔ اس کے عارضی اور مستقل، ممبر دُور دُور سے کھچے چلے آتے تھے۔

پہلے روز نائٹ کلب پہنچے، تو ابھی کارروائی شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ ممبر مختلف ٹولیوں میں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ایک دو سب سے الگ تھلگ نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ نائٹ کلب کا لان اس طریقے سے بنایا گیا ہے کہ اس نے گھاس یا کسی اور قسم کے خودرو پودے کی پیدائش کے تمام امکانات ختم کر دیے ہیں۔ ایبٹ آباد کے ندی نالوں کی تہہ میں بیٹھے ہوئے پتھروں کی طرح کنکریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دو طرف کڑوی بیل کی باڑ ہے، جسے صرف کود کر پار کیا جاسکتا ہے۔ لان کے سامنے پانچ کمروں پر مشتمل ایک بیرک ہے، جو دفتر کا کام دیتی ہے۔ رات کے وقت ایک کمرے میں اداس قسم کا بلب ٹمٹمایا کرتا تھا۔ بلب کی روشنی دیکھ کر شک گزرا کہ شاید اسے بھی کوئی ایکسٹرا رول کال پر پکڑ لایا ہے۔ البتہ سورج کی روشنی میں باقی کمرے بھی دمک اُٹھتے اور اردگرد کے ماحول سے ہر وقت معصومیت ٹپکتی، جیسے رات کو یہاں کچھ ہوتا ہی نہیں۔ ادھ جلے بلب کی روشنی ممبروں کی شناخت اور حاضری لگانے کے کام آیا کرتی تھی۔

حاضری وغیرہ لگانے کا مرحلہ بہت تیزی سے مکمل ہوا۔ ہماری دلی خواہش اس تیزی کے خلاف تھی۔ تجربہ کار ممبروں کا خیال تھا کہ نائٹ کلب میں حاضری لگوانے کو خاص اہمیت دینی چاہیے۔ حاضری کے بعد نائٹ کلب کی اصل کارروائی شروع ہوئی۔ ڈیوٹی اسٹاف نے گزشتہ روز کی کارروائی سنائی، جس میں بعض ممبروں کی غلطیوں اور خطاؤں کا پردہ چاک کیا گیا تھا۔ نیز یہ مژدہ بھی سنایا گیا کہ جو ممبر ایمان داری اور خلوص کا مظاہرہ کرتے ہوئے آج کی کارروائی میں بھرپور حصہ لیں گے، انہیں بطور انعام کل تشریف لانے کی زحمت نہیں دی جائے گی، یعنی بالفاظ دیگر ایک ایکسٹرا رول کال کمرے میں بیٹھے ہوئے ختم ہو جائے گا۔ مجھے دو ایکسٹرا رول کال ملی تھیں، لہٰذا یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہ اعلان میری فلاح و بہبود کے لیے کیا جا رہا ہے۔ نائٹ کلب کی کارروائی میں کوئی خاص نئی بات نہیں تھی۔ بس ڈیوٹی اسٹاف کی مرضی پر منحصر تھا۔ وہ جب چاہتے پی ٹی کا پیریڈ شروع کر دیتے اور جونہی ان کی طبیعت ایک ہی طرح کی اچھل کود دیکھ کر اکتا جاتی تو ڈرل کے کاشن سنائی دینے لگتے۔ پی ٹی کی اچھل کود میں ڈنٹر بیٹھک کے ساتھ ساتھ مینڈک چال، بیرک کے چکر، فرنٹ رول، بیک رول کے علاوہ کئی اور قسم کے رول بھی تھے۔ اس موقع پر صبح کا پی ٹی

پریڈ عیاشی معلوم ہوتا۔ وہاں صرف نیکر اور بنیان کے ساتھ رول ملتے تھے۔ ادھر پشت پر کئی اشیا مع اجزائے خصوصی کے براجمان تھیں۔ ہر قسم کی اچھل کود میں وہ ہماری آواز کے ساتھ ساتھ اپنا ساز ملانے کی بھرپور کوشش کرتیں۔ ساز اور آواز کے اس حسین سُر سنگیت میں کیڈٹ کا پیلا مگ شور مچاتا۔ کبھی کبھار کسی کونے سے دھڑام سے گرنے کی بھاری آواز آتی تو ذاتی پشت پر ہلکا سا درد شروع ہو جاتا۔ یہ دھڑام سے زمین پر آنا کسی کیڈٹ کا حکم کی تعمیل میں کارنامہ تھا۔ ایک ایسا ہی حکم مجھے ملا۔ تعمیل کی۔ تعمیلِ حکم میں کچھ زیادہ ہی چستی دکھائی۔ جس کے نتیجہ میں چھوٹا پیک کھل گیا اور شیور جیسی چیزیں تتر بتر ہو گئیں۔ یہ حرکت ناقابلِ برداشت تھی۔ متاثرہ افراد کے غصّے کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا، جیسے میں نے کسی دعوت میں سالن کی دیگ اُلٹ دی ہو۔ صبح کی پریڈ میں سیٹی کا گونجنا اور رات کو چھوٹے پیک کا عہدِ وفا توڑنا ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں، لہٰذا نام نمبر دوبارہ نوٹ ہو گیا اور ہماری ایکسٹرا رول کالیں دو سے چھ ہو گئیں۔ یہ سلسلہ دراز ہی ہوتا گیا۔ اس کے بعد شاید ہی کوئی ایسا دن گزرا ہو گا کہ ہم نے نائٹ کلب میں بنفسِ نفیس شرکت نہ کی ہو۔ رات کے علاوہ دعوت عصرانہ (ایکسٹرا ڈرل) میں شمولیت بھی لازمی ہو گئی۔

نائٹ کلب کے کئی اور بھی مستقل ممبر تھے۔ چند ایک تو دعوت نامے میں فہرست دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کرتے تھے، بلکہ ہر دعوت میں دعوت نامے کے بغیر ہی تشریف لے آتے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ کلب میں مہمانوں کی تعداد فہرست سے بھی بڑھ گئی۔ جب پوچھا گیا کہ جن کا نام نہیں پکارا گیا وہ باہر آ جائیں۔ ایک صاحب برآمد ہوئے۔ اسٹاف نے کہا، ”آپ کا نام نہیں تھا تو آنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیڈٹ نے حیران ہو کر پوچھا، ”کمال ہے، میرا نام نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے آپ سے رہ گیا ہو، دوبارہ اپنی ڈائری چیک کر لیں۔“

رات کی "Punishment Parade" جسے کیڈٹوں نے ازراہ مذاق نائٹ کلب کا نام اسے رکھا تھا، ملٹری اکیڈمی کے عجائبات میں سے ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اکیڈمی والوں نے پاسنگ آؤٹ کا دن بھی رکھا ہوا ہے، ورنہ اگر نائٹ کلب والے حساب سے چلتے تو آج تک ہم نائٹ کلب ہی کا قرضہ چکا رہے ہوتے!

* *

قیامت کی چال!

ضیاء الحق قاسمی

کیا آپ نے کبھی کوئی انڈین فلم دیکھی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ ضرور دیکھی ہوگی۔ اس میں سیاست دانوں کی جتنی کردار کشی کی جاتی ہے اتنی کردار کشی تو 'خفیہ' والوں کے اشارے پر ہمارے ہاں لکھی جانے والی کتابوں میں ہمارے سیاست دانوں کی بھی نہیں ہوتی۔ انڈین فلموں میں سیاست دانوں کو ایک ولن کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ وہ انڈر ورلڈ کے ڈان ہیں۔ انڈیا کی سلامتی کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ معصوم اور بے گناہ لوگوں کو قتل کرواتے ہیں۔ جوئے کے اڈے چلاتے ہیں۔ اسمگلنگ کرتے ہیں۔ اور اللہ جانے انہیں کیا کیا کچھ کرتے دکھایا جاتا ہے۔ مختصراً یہ کہ انہیں شیطان کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔

کیا آپ نے انڈین اخبارات کا کبھی مطالعہ کیا ہے؟ میرے خیال میں آپ کو اس کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ مجھے انڈین اخبارات پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ ان میں بھی ہر برائی کا منبع سیاست دانوں ہی کو دکھایا جاتا ہے ان پر شدید تنقید کی جاتی ہے۔ اور ان کے اسکینڈلز کو اتنا اچھالا جاتا ہے کہ ان پر ترس آنے لگتا ہے۔

کیا آپ کی ملاقات کبھی کسی انڈین سے ہوئی ہے؟ ممکن ہے ہوئی ہو۔ آئندہ اگر کبھی ایسا موقع آئے تو اسے ذرا سیاست دانوں کے بارے میں کرید کر دیکھیں۔ بس اس کے بعد وہ پھٹ پڑے گا۔ وہ ان کی اتنی برائیاں بیان کرے گا کہ آپ کو اپنے ہاں کے سیاست دان فرشتے لگنے لگیں گے۔ وہ آپ کو بتائے گا کہ ہندو مسلم تصادم کے پیچھے ان کا ہاتھ ہوتا ہے۔ منشیات فروشی یہ کرتے ہیں، غنڈے انہوں نے پال رکھے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

کیا اتنے برے سیاست دان بھارت میں مارشل لا کے نفاذ کا جواز مہیا نہیں کرتے؟ یقیناً کرتے ہیں کیوں کہ تھرڈ ورلڈ کنٹریز میں فوج تو ہوتی ہی عوام کو کرپٹ سیاست دانوں سے بچانے

بڑا سچ ہر دو عالم کے لیے ہے مگر ایمرجنسی کے نفاذ کے دنوں میں بھارت کے آرمی چیف کی طرف سے ایک بیان شائع ہوا کہ فوج حکومت کے ساتھ مکمل تعاون کرے گی۔ وزیراعظم اندرا گاندھی نے اسے اپنے دفتر میں طلب کیا، دو گھنٹے باہر بٹھائے رکھا اور پھر اندر بلا کر اس کی برطرفی کا آرڈر اس کے ہاتھ میں تھما دیا کہ آپ کون ہوتے ہیں اس طرح کے بیان دینے والے۔ آپ ایک سیاسی حکومت کے تابع ہیں، آپ کا کام حکم کی تعمیل کرنا ہے، اس تعمیل کو آپ تعاون کا نام دے رہے ہیں۔

لیکن سیاست دانوں کی تمام تر کردار کشی کے باوجود یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ہندوستان ترقی کرتے کرتے ایک سپر پاور بننے کے قریب جا پہنچا ہے۔ جس ملک کے مقدر میں اتنے کرپٹ سیاست دان ہوں اس کا ترقی کرنا ایک آٹھواں عجوبہ ہے مگر لوگوں کا خیال ہے کہ بھارت کی ترقی کا راز اس کے جمہوری نظام میں ہے۔ اس کے تمام ادارے اپنا اپنا کام کرتے ہیں، ایک دوسرے کے کام میں دخل نہیں دیتے۔ ایک سسٹم ہے جس کی موجودگی میں کرپشن اور لوٹ مار بھی ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ کرپٹ سیاست دانوں کا احتساب باقاعدگی کے ساتھ منعقد ہونے والے انتخابات اور عدالتی نظام کے ذریعے ہوتا رہتا ہے۔ وہاں دو دو سال بعد حکومتیں تبدیل نہیں کی جاتیں اور نہ ہی خفیہ ہاتھ حکومت سے باہر رہتے ہوئے بھی داخلہ اور خارجہ پالیسیاں بناتے ہیں۔

تاہم سچی بات یہ ہے کہ میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔ میرے پاس اختلاف کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے اس پر میرا دل یہ کہتا ہے کہ حکومت سیاست دانوں کے سپرد نہیں کرنی چاہیے۔ سیاست دانوں کا کام سیاست کرنا ہے وہ سیاست کرتے رہیں طاقت سب سے بڑی سچائی ہے چنانچہ جن کے پاس طاقت ہے حکومت پر ان ہی کا حق ہے۔ باقی رہا پاکستان کی پسماندگی اور انڈیا کی ترقی کا معاملہ تو انڈیا ہمارا دشمن ہے اور دشمن کی ہر بات کو شک کی نظروں سے دیکھنا چاہیے، ممکن ہے اس کی ترقی بھی ہمارے خلاف کوئی چال ہی ہو!

* *

ہدایت نامہ افسانہ نویسی

ظفر اقبال کھوکھر

مطلع ابر آلود ہے۔ صبح سے تیز ہوائیں چل رہی ہیں۔ بارش کی آمد کے امکانات ہیں... گرج چمک جاری ہے۔ درجۂ حرارت تیزی سے گر رہا ہے ایسے میں...

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موسمیات کا کوئی ماہر موسم کا حال بتا رہا ہے لیکن دراصل یہ ہمارے ہاں لکھے جانے والے پچاس فیصد افسانوں کی تمہید ہے۔ ایسے افسانوں کو آپ موسمی افسانے کہہ سکتے ہیں۔ موسم افسانہ پر بہت اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر مطلع ابر آلود ہے تو سمجھ لیں کہ حالات ٹھیک نہیں۔ سرد ہواؤں کا ذکر افسانہ میں کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ زور کی بارش کشمکش کا اظہار ہے یعنی موسمی حالات سے آپ افسانہ کا مزاج معلوم کر سکتے ہیں۔

ایک اچھے افسانہ نگار کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ پہاڑی مقامات سے واقف ہو۔ مری، ایبٹ آباد، کاغان اور سوات سے شناسائی واجب ہے کیوں کہ ہیرو اور ہیروئین کا تعارف ان ہی مقامات پر ہوگا اور پھر جب ظالم سماج اپنا کام دکھائے گا تو تنہائی کے لمحات میں ان ہی مقامات کے ڈاک بنگلہ میں لوٹ کر آنا ہے اور بھولی یادوں کو وہیں تازہ کرنا ہے۔ بعض سمجھ دار ہیرو جنگل کے کسی درخت پر نام بھی لکھ جاتے ہیں تاکہ سَند رہے۔ اگر ہیروئین غریب اور حساس ہے تو اس کو ٹی بی ہوگی اور وہ مری کے سالمی سینیٹوریم میں داخل ہوگی۔ اس لیے ابتدائی تعارف کے لیے مری ہی مناسب مقام ہے۔ ویسے آج کل کینسر زیادہ 'اچھی بیماری' تصور کی گئی ہے۔

ہیرو صاحب کے لیے ہجر کے صدمے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بہت سے ذرائع ہیں۔ اگر جلدی میں ہیں تو شراب کی عادت ڈال دیں، لیکن یہ رواج فلموں میں زیادہ ہے! یوں بھی پابندی لگ جانے کے باعث اس کا ذکر مناسب نہیں۔ اس سلسلہ میں کچھ افسانہ نگاروں کو پریشانی بھی رہی، لیکن منشیات نے کافی آسانیاں مہیا کر دی ہیں۔ آپ ہیرو کے معاشی رتبے کے لحاظ سے

بزم جہان دو عالم کسی مناسب نشے کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ کلب میں جانا بھی ایک ترکیب ہے، لیکن اس پر اَب فلم والوں کی اجارہ داری ہے۔ عام لوگ جب کلب تلاش کرتے ہیں تو انہیں مایوسی ہوتی ہے۔ اس طرح افسانہ پر بُرا اثر پڑتا ہے۔

ہیرو کے پیشے کا انتخاب افسانے کا اہم ترین حصہ ہے، کیوں کہ واقعات براہِ راست اس کے پیشے سے متعلق ہوتے ہیں۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد سیدھے سادے اسکول ماسٹر یا کلرک سے بھی کام چل جاتا تھا۔ لیکن جوں جوں تعلیمی اور معاشی ترقی ہوتی گئی معیار بدلتا گیا۔ ڈاکٹر اور انجینیئر بہت کامیاب ثابت ہوئے۔ کافی عرصے تک یہ لوگ میدان میں چھائے رہے۔ 1965ء کی جنگ کے بعد فوجی افسروں نے یہ بازی جیت لی۔ ہر دوسرے افسانے کا ہیرو کیپٹن یا میجر ہوتا۔ 1971ء کی جنگ نے فوجی افسران کو منظر سے ہٹا دیا اور یہ مالا سی۔ ایس۔ پی حضرات کے گلے میں ڈالی گئی چنانچہ ڈپٹی کمشنر۔ ایس پی اور کسٹم کے افسران ہمارے افسانوی ادب پر راج کرتے رہے۔ سیاستدانوں نے بھی قلیل مدّت کے لیے کوشش کی لیکن ان کی دیگر دلچسپیاں اس محاذ پر آڑے آئیں۔

اس کے بعد لندن اور امریکا پلٹ کزنوں (چچازاد) نے کارہائے نمایاں انجام دیے یہاں تک کہ ٹیلیفون پر ہی انہیں اپنی من پسند ہیروئن مل جاتی، لیکن انہوں نے غلط بیانی اور متعدد شادیاں کر کے اپنی مارکیٹ خود خراب کر لی۔ دبئی، کویت اور سعودی عرب میں ”بیس ہزار روپے ماہوار“ کمانے والوں نے بھی بڑی مقبولیت حاصل کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہر طرف چھا گئے۔ عملی طور پر ان لوگوں نے بہت متاثر کیا۔ اکثر معاملے تو "Accompanied baggage" دیکھ کر ہی طے ہو جاتے۔ لیکن انہوں نے بھی سمجھداری کا مظاہرہ نہیں کیا اور بہت سے رقیب پیدا کر لیے۔ کچھ قصور خلیجی ممالک کے "Immigration department" کا بھی ہے۔ فیملی ویزوں اور اقامہ کے قانون نے بہت سے لوگوں کا پول کھول دیا۔ اس وقت خلیجی ممالک کے لوگ مقبولیت کے گراف میں سب سے نیچے ہیں، بلکہ کویت کے حالیہ واقعات نے مستقبل خاصا مخدوش کر دیا ہے۔ ہیرو کی کرسی اس وقت کاروباری حضرات یا پھر قومی اور صوبائی اسمبلی کے ارکان کے پاس ہے، جن کے پاس اپنا کارخانہ، ڈیفنس، ماڈل ٹاؤن یا گارڈن ٹاؤن میں دو کنال کا گھر اور صرف کروڑوں کا بینک بیلنس ہو۔

افسانے میں ہیرو اور ہیروئن کیلئے ایک اہم مسئلہ "Transportation" (آمد و رفت) کا بھی رہا ہے۔ اس کا آسان حل یہ ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کو امیر رکھا جائے۔ پہلے تو اُن کے استعمال میں کیڈلک، بیوک، مرسیڈیز یا شیورلیٹ گاڑی ہوتی تھی، لیکن جب سے پیٹرول مہنگا ہوا ہے اور کسٹم نے بھی سختی کی ہے، جاپانی گاڑیوں کو پسند کیا گیا ہے۔ آج کل تو سوزوکی بھی برداشت کی جا رہی ہے لیکن خیال رہے کوئی بھی گاڑی 1000CC سے کم نہ ہو۔

خط و کتابت کا مرحلہ بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ کبوتروں نے اس سلسلے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ وہ آج بھی یہ کردار کرنے کو تیار ہیں، لیکن نہ جانے کیوں ان کی خدمات سے استفادہ نہیں کیا جاتا۔ چوں کہ آج کل مراسلت کے بے شمار وسائل موجود ہیں اس لیے اپنے ذہن رسا سے کام لے سکتے ہیں اور سچویشن کے مطابق حل تلاش کر سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ، موبائل، ٹیلیفون اور فیکس نے اگرچہ صورتِ حال تبدیل کر دی ہے ورنہ محکمۂ ڈاک نے اس سلسلے میں بہت خدمات انجام دی ہیں۔ کسی دور میں ڈاکیا بڑا اہم ہوتا تھا۔ یہ بڑا مؤثر پیغام بر تھا، لیکن بعض نے رقیب کا کام بھی کیا، اس لیے منظر سے غائب ہو گئے۔

حالات نے ثابت کیا کہ مراسلت بڑا خطرناک ذریعہ ہے۔ اکثر خط کسی غیر متعلق فرد کے ہاتھ لگ جاتا اور افسانے میں ایک زبردست موڑ آ جاتا۔ یوں بھی خط ایک ناقابلِ تردید ثبوت ہونے کی وجہ سے مشکلات کا باعث بنا۔

گزشتہ دور میں تبادلۂ خطوط کی ترتیب سے ہی افسانہ پڑھ لیتے تھے۔ لیکن یہ بڑا 'منشیانہ' انداز ثابت ہوا۔ یوں بھی لوگوں کو سیاق و سباق سمجھنے میں کافی اُلجھن ہوئی اس لیے یہ انداز مقبول نہ ہو سکا۔

ہیرو اور ہیروئین کا نام بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ لوگ تو بچوں کے نام رکھنے کے لیے بھی افسانے کو 'استعمال' کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ افسانے میں ہیرو کے لیے مولا بخش، کرم داد یا اللہ بچائیو جیسے نام نہیں رکھ سکتے۔ ہیروئین بھی اللہ رکھی، سکینہ بی بی اور بشیراں نہیں ہو سکتی۔ ہمارے افسانے میں اس بات کا امکان نہیں کہ اللہ رکھی کے دل پر کیوپڈ کا وار ہو۔ اسی طرح کرم داد کے دل میں محبت کا جذبہ ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا!

بڑی کوشش کے باوجود یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکی کہ یوکلپٹس ہمارے افسانہ نگاروں کا پسندیدہ

درخت کیوں ہے۔ اپنی کم علمی کا اعتراف کرنے میں حرج نہیں۔ بہت عرصہ تک یہ پتا ہی نہ چل سکا کہ یہ درخت کیسا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ خصوصی انتظام کے ذریعہ اس درخت کی زیارت کی۔ بہر حال، جو لوگ افسانہ لکھنا چاہیں انہیں اس درخت سے ضرور واقفیت حاصل کرنی چاہیے۔ وطن پرست افسانہ نگار چنار کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ اگر چہ مقامی درخت پیپل، بڑ اور شیشم یہ کمی پوری کر سکتے ہیں لیکن افسانے میں فیشن کا خصوصی خیال رکھنا پڑتا ہے۔

ایثار اور قربانی کو ہمارے افسانوں کی حد تک بہت عمل دخل رہا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے افسانوں کی شاندار خدمات ہیں۔ قربانی جتنی ہنگامہ خیز اور جذباتی ہوگی افسانہ اتنا موثر کہلائے گا۔ لیکن اب لوگوں نے افسانوی قربانیوں پر نکتہ چینی شروع کر دی ہے۔ ایسی ہی ایک قربانی پر نکتہ چینی یاد آ رہی ہے جس نے افسانہ کا سارا مزہ کرکرا کر دیا۔

ایک افسانہ نگار نے دو دوستوں کی لازول دوستی کی داستان تحریر کی۔ ایک دوست پیدائشی اندھا ہوتا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ جوان ہوتے ہیں اور ایک جذباتی موقع پر آنکھوں والا دوست قربانی کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی دونوں آنکھیں اپنے نابینا دوست کی نذر کر دیتا ہے۔ کامیاب آپریشن کے بعد جب بینائی حاصل کرنے والا دوست 'نئے نابینا' کا شکریہ ادا کرتا ہے تو قارئین عش عش کر اُٹھتے ہیں۔

ایک نقاد نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ قربانی نہیں بیوقوفی ہے۔ اگر یہ دوست ایک آنکھ کی قربانی دیتا تو دونوں دیکھ سکتے۔ ایک انجینیئر نے اُٹھ کر کہا۔ یہ حماقت ہے یہ تو "No work done" ہوا۔ ایک فرد تو بہر حال اندھا رہا۔ محفل میں ایک ڈاکٹر صاحب کہنے لگے ایسے بے معنی آپریشن پر تو ڈاکٹر کی رجسٹریشن کینسل کر دینی چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے افسانہ نگاروں کو اس قسم کی قربانیاں پیش کرتے وقت محتاط رہنا چاہیے اور عوامی جذبات کا خیال رکھنا چاہیے۔

اُمید ہے یہ ہدایت نامہ، افسانہ لکھنے والوں کے لیے مددگار ثابت ہوگا۔

* *

ہٹ لسٹ

ظفر عمر زبیری

ہمارے محلّہ میں ایک بڑا پارک ہے، جس میں صبح کے وقت خاصی رونق رہتی ہے کچھ حضرات قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں، کچھ چہل قدمی فرماتے ہیں اور کچھ دبلے مرد اور موٹی خواتین پارک کے باہر اُس کے اِرد گرد تیز تیز قدموں سے چلتی یا دوڑتی نظر آتی ہیں۔ ہم بھی کچھ عرصہ پہلے ایسے ہی دبلے مردوں میں شامل تھے، لیکن جب موٹی خواتین کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوا تو خواتین کی چست خرامی بجائے پسندیدگی کے ہمیں ناپسندیدگی میں تبدیل ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اور ہم نے پارک جانا ترک کر دیا۔

صبح ہی صبح ہم نہ صرف اپنا ناشتا تیار کرنے لگے، بلکہ کچھ لکھنے پڑھنے کا بھی اہتمام ہونے لگا۔ ایک دن کیا ہوا کہ ہمارے محلے اور پارک کے دلدادہ بھائی نفیس عالم نے ٹھیک سات بجے ہمارا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ دروازہ کھول کر جب ان کا دیدار ہوا تو علیک سلیک کے بعد ہم نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے صبح دَم تشریف آوری کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگے، ”ایک ناول آئیڈیا میں آیا ہے۔“ ہم نے دریافت کیا، ”ناول آپ اُردو میں لکھیں گے یا انگریزی میں؟“ کہنے لگے، ”نہیں یار، ذہن میں ایک اسکیم آئی ہے، سوچا آپ سے پہلے مسئلے پر گفتگو ہو جائے۔“ ہمیں اپنی صلاحیتوں پر شک ہونا لازمی تھا۔ پوچھنے لگے، ”بھابی جاگ رہی ہیں یا سو رہی ہیں۔“ عرض کیا، ”وہ فجر کی نماز پڑھ کے دوبارہ سو جاتی ہیں، پھر آٹھ بجے سے پہلے نہیں اُٹھتیں۔“ بولے، ”میں اندر آ جاؤں، تفصیل سے بات ہوگی۔“

کمرے میں آرام سے بیٹھ کر بھائی نفیس عالم نے کہا کہ ”کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیں۔ مسئلہ اتنا نازک ہے کہ فی الحال کسی کو اس کی خبر نہیں ہونی چاہیے، ورنہ بعد میں تو پورے شہر کو معلوم ہو ہی جائے گا۔“

ہم کو حیرت تھے کہ نفیس عالم کو کیا ہو گیا ہے۔ ہم نے اپنا ایک کان بھائی نفیس عالم کے بالکل منہ کے سامنے کر دیا کہ کہیں بات سنی اَن سنی نہ ہو جائے۔ ہماری مستعدی پر تبسم فرماتے ہوئے کہا کہ آپ نے ایک دن تذکرہ کیا تھا کہ آپ کے ایک دوست روزنامہ 'بھنگ' میں چیف رپورٹر ہیں۔ ہم نے ان کی یادداشت پر صاد کیا اور کہا کہ اُن کا نام شہریار خان ہے۔ اُن سے آپ کو کیا کام آن پڑا ہے۔

جیب سے ایک پرچہ نکالتے ہوئے کہا کہ یہ خبر پہلے صفحہ پر چھپوانی ہے۔ وہ پرچہ جب ہمارے ہاتھ میں آیا تو ہم پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

نفیس عالم صاحب تھوڑی دیر تک خاموش رہے، پھر گویا ہوئے، ''زبیری صاحب! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے، لگتا ہے آپ تو کوچ کرنے والے ہیں۔'' ہم نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو کھول کر سر کو دو تین جھٹکے دیے اور عرض کیا، ''حضور یہ کیا لکھ لائے ہیں آپ؟'' کہنے لگے، ''بہت اہم بات ہے، آپ کی سمجھ میں مشکل سے آئے گی۔ قارئین، نفیس عالم کے پرچے میں تحریر تھا کہ:

''مشہور سماجی کارکن نفیس عالم، ہٹ لسٹ پر! ایک سیاسی جماعت نے اپنے حالیہ بیان میں کہا ہے کہ اُس نے مشہور سماجی کارکن نفیس عالم کا نام اپنی ہٹ لسٹ پر لگا دیا ہے۔ وہ یا تو سماجی کاموں سے فوری طور پر دستبردار ہو جائیں، یا اپنی قبر کا انتظام کر لیں۔''

ہم نے یہ تحریر بآوازِ بلند پڑھ کر نفیس عالم صاحب سے کہا کہ پہلے ہمارے چند سوالات کے جوابات عنایت فرمائیے:

کہنے لگے، ''ضرور ضرور۔''

پہلا سوال: ''آپ مشہور سماجی کارکن کب سے بن گئے ہیں؟''

جواب: ''ہم تقریباً ہر روز سڑک پر پڑی ہوئی ایک دو اینٹیں ضرور ہٹاتے ہیں۔ ترکاری بیچنے والے کو روز ڈانٹتے ہیں کہ اتنی زور سے چیخ کر اپنی سبزی مت فروخت کرو، محلّہ کا سکون برباد کر دیتے ہو اور تیسرے یہ کہ ہم ایک تنظیم بنانے والے ہیں، جس کا نام ہوگا، کارکنان سماجی تحریک وطن عزیز۔

دوسرا سوال: ''اُس سیاسی تحریک کا نام بتایئے، جو آپ کو قبرستان کا راستہ دکھانا چاہتی ہے۔''

جواب: ”ایسی کوئی سیاسی تحریک نہیں ہے، لیکن محلہ میں اپنی دہشت بٹھانے کے لیے سیاسی جماعت لکھنا ضروری ہے۔“

ہم نے عرض کیا، ”کہ اوّل تو آپ کوئی مشہور سماجی کارکن نہیں ہیں، دوسرے کوئی ایسی سیاسی جماعت نہیں ہے، جو آپ کو راہِ عدم دکھانا پسند کرتی ہو، آپ کیوں اپنی بیوی کو اس قدر جلد بیوہ بنانے پر مصر ہو گئے ہیں۔“

کہنے لگے، ”آپ اس خبر کا مطلب ہی نہیں سمجھے۔ بات یہ ہے کہ جب یہ خبر شائع ہوگی اور ہم خود اسے پڑھ کر دوسروں کو سنائیں گے تو کیا ان پر ہمارا رعب و دبدبہ طاری نہیں ہو جائے گا۔ ہٹ لسٹ پر عام آدمی کا نام تو نہیں آتا ہے، جاں بازوں کے نام ہی ہوتے ہیں۔ ہمیں قتل کرنے والا تو کوئی ہے نہیں، خواہ مخواہ کون کسے قتل کرتا ہے۔“

عرض کیا، ”اس شہر میں شوقین قاتل بھی بستے ہیں، ان کا کام قتل کر دینا ہے۔ کسی کو معلوم ہو گیا کہ آپ ہٹ لسٹ پر آ گئے ہیں تو دو آدمی اسکوٹر پر آپ کا پتا پوچھتے ہوئے آئیں گے، آپ گھر سے باہر نکلیں گے، کئی گولیاں آپ کے سینے میں پیوست کر کے وہ رفو چکر ہو جائیں گے، ان کا شوق پورا ہو جائے گا، اہلِ محلہ سناٹے میں آ جائیں گے۔“

کہنے لگے، ”آپ کمال کرتے ہیں، ہم کوئی مرنے کے لیے تھوڑی ہی یہ خبر چھپوانا چاہتے ہیں، بس ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ یہ جو محلہ کا جمعدار ہے، یہ ہمیں دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہے، سلام تک نہیں کرتا اور یہ جو ترکاری والا ہے، یہ ہمارے گھر کے سامنے کچھ زیادہ ہی شور مچاتا ہے اور یہ جو لائن مین ہے جمال، اس نے دس دن سے ہمارا فون ٹھیک نہیں کیا ہے۔ ہٹ لسٹ پر ہمارا نام سن کر سب اپنے ہوشوں میں آ جائیں گے۔ کیا سمجھے آپ...؟“

ہم نے کہا، ”ہم بالکل سمجھ گئے، سارا قصہ جمال کا ہے۔“

کہنے لگے، ”کل میں نے اسے پکڑ لیا تھا تو کہنے لگا، آپ کا کمپلینٹ نمبر تو ایک سو ستائیسواں ہے، ایک ہفتہ اور لگے گا۔ میں نے کہا، بکواس بند کرو، ستائیسواں نمبر ہے، سمجھ گئے، میں تمہیں ایک پیسہ نہیں دوں گا۔“

ہم نے کہا، ”وہ رشوت کب مانگتا ہے، وہ تو قرض مانگتا ہے کہ تنخواہ ملتے ہی قرض ادا کر دوں گا۔“

فرمایا، ”مجھے معلوم ہے، آج تک اس نے کسی کا قرض ادا نہیں کیا ہے، جو میرا ادا کرے گا۔“

ہم نے پوچھا، ”قرضہ میں کتنی رقم مانگ رہا ہے؟“ بولے، ”پورے ایک ہزار روپوں کا مطالبہ ہے کہ بچوں کے اسکول کی کتابیں خریدنی ہیں۔ یہ خبر پڑھتے ہی وہ خود بخود ہمارا فون درست کردے گا۔“

ہم نے کہا، ”یہ خبر اتنی آسانی سے شائع نہیں ہوسکتی، بلکہ ہمارے خیال میں ناممکن ہے۔“

کہنے لگے، ”پھر آپ کی دوستی کا فائدہ! اچھا اب ہمیں اجازت دیں۔“ یہ جملہ اس قدر درد انگیز انداز میں کہا گیا کہ ہم نے کہا، ”نفیس صاحب ہم کو کم اَز کم دو دن تو دیں کہ ہم 'بھنگ' اخبار کے چیف رپورٹر سے بات کرلیں، جمال لائن مین کو سمجھا بجھالیں۔“ کہنے لگے، ”آج بدھ کا دن ہے میں ہفتہ کی صبح حاضر ہوں گا۔“

ہفتہ کی صبح کو ٹھیک سات بجے نفیس عالم صاحب نے ہمیں ہلکی سی آواز دی۔ ہم نے فوراً دروازہ کھول کر انہیں کمرے کے اندر آرام سے بٹھا دیا۔ وہ ہمیں اُمید بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔

عرض کیا کہ ”چیف رپورٹر صاحب نے آپ کا پرچہ پڑھ کر پہلے تو کچھ مغلظات سنائی تھیں، جو ہم دوہرا نہیں سکتے۔ ہمارے بے حد اصرار پر انہوں نے فرمایا کہ اسے ایک خصوصی اشتہار کی صورت میں شائع کرسکتے ہیں، جس کا ہدیہ دس ہزار روپے سے کم نہیں ہوگا۔“

”دس ہزار روپے، اس دوسطری اشتہار کے؟ 'نا بابا نا' ہم اس محبت سے باز آئے۔ یہ کیسے دوست ہیں آپ کے کہ گلا کاٹنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔“ تھوڑے وقفہ کے بعد جمال کے متعلق دریافت کیا تو ہم نے کہا کہ اُس کو ہم نے پانچ سو روپے پر تیار کرلیا ہے اور اُس نے یہ پکا وعدہ کیا ہے کہ چھ ماہ کے اندر وہ آپ کا قرضہ اُتار دے گا۔

نفیس صاحب کہنے لگے، ”میں جمال کو ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا۔“ ہم نے کہا، ”آپ نہ دیں، ہم دیے دیتے ہیں، بعد میں آپ ہم کو ادا کردیجیے گا۔“ وہ کوئی جواب دیے بغیر اُٹھ کر چلے گئے۔ ہم نے ان کی خاموشی کو رضامندی سمجھا اور جمال کو قرضہ کی رقم دے دی۔

اگلے دن ان کا فون درست ہوگیا تو انہوں نے ہمیں فون کر کے خوشخبری سنائی کہ فون خود بخود درست ہوگیا۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم نے ان کی طرف سے پانچ سو روپے جمال کو کل دے

دیے تھے تو وہ ناراض ہوتے ہوئے بولے کہ میں نے تو آپ سے صاف کہہ دیا تھا کہ میں ایک پیسہ دینے والا نہیں ہوں۔

اس طرح ہم خود بھائی نفیس کی مالیاتی ہٹ لسٹ پر نمودار ہو گئے۔ بیوی نے سارا قصہ سن کر صرف اتنا کہا، ”نیکی کرو اور لیاری ندی میں ڈالو“۔

نوٹ:

(راقم الحروف کے علاوہ باقی نام فرضی ہیں)

* *

اقبآل کی برکتیں

عاصی کرنالی

مولوی عبدالصمد خان نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا، ”میاں! خدا تمہاری خیر کرے، علم و فضل کی ناقدری جیسی اِس زمانے میں دیکھی، کبھی کاہے کو ہوگی۔ نوکری چاکری کا ہر دروازہ بند ہوگیا۔ سفارش کہاں سے لاتا۔ کام نکالنے کے لیے چاہیے تھا پیسا، وہ میرے پاس کہاں۔ کسی مسجد کی امامت تک نہ مل سکی۔ میں بھوکوں مرنے لگا۔ آخر میں نے سوچا، علم کو تین طلاق دوں اور اَدب کو اپنے حبالۂ عقد میں لے آؤں۔ تم جانو بدقسمت ہونا اور بات ہے، کند ذہن ہونا اور چیز۔ میں نے ذہانت کی تیز چھری سے بدقسمتی کی رسیاں کاٹنی شروع کردیں اور آج خدا تمہاری خیر کرے میاں! کوٹھی ہے، کار ہے، جائیداد ہے، عزت ہے، شہرت ہے، خدا کا دیا سب کچھ ہے۔“

”مولوی صاحب! آپ کو شاید الہ دین کا چراغ مل گیا، جو چٹکی بجاتے یہ کایا پلٹ ہوگئی۔“ میں نے ازراہِ تحیّر پوچھا۔

مولوی عبدالصمد خان نے اسکوائش کا گلاس مجھے تھماتے ہوئے کہا، ”بتاتا ہوں، سب کچھ بتاتا ہوں۔ میاں خدا تمہاری خیر کرے، تم جانو میں مکار نہیں ہوں۔ کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ ہر معاملے میں سونے کی طرح کھرا ہوں۔ یہ سب ہوت جوت جو تم دیکھ رہے ہو، یہ نیت کا پھل ہے۔ میری نیت اور ذہانت دونوں، گویا جڑواں بچے ہیں۔ میں اُڑتی چڑیا کے پَر گنتا ہوں۔ زمانے کی ہوا پہچانتا ہوں۔“

”مولوی صاحب پہیلیاں نہ بجھوایئے۔ دولت مند بننے کا گُر بتایئے۔“ میں نے گلاس ختم کرتے ہوئے کہا۔

”بتاتا ہوں۔ میاں خدا تمہاری خیر کرے، تم جانو ہماری قوم مُردہ پرست ہے۔“

”مُردہ پرست یعنی چہ؟“ میں نے تعجب کا اظہار کیا۔

انور احمد علوی

”مُردہ پرست، یعنی مرنے کے بعد قدر کرنے والی، یعنی... خیر چھوڑو اِس بات کو، بس یوں سمجھو کہ جب تک اقبالؔ زندہ رہے، میں اُن کے مخالفین میں شامل رہا، اُن کے خلاف جن علما نے کفر کا فتویٰ دیا، اُن میں یہ حقیر پُرتقصیر بھی شامل تھا۔ توبہ ہے، توبہ....“ مولوی عبدالصمد خان نے اپنے دونوں رخساروں پر ہلکے ہلکے چپت لگائے، جیسے خود کو سزا دے رہے ہوں۔

”توبہ ہے، توبہ!... خیر یہ بحث بھی چھوڑو۔ پھر اقبالؔ مر گئے۔ میں پھر بھی مخالف رہا۔ پھر جس مسجد میں، میں امامت کا خواستگار تھا، وہاں مولوی غلام غوث، خدا اُس کا بیڑا غرق کرے، قابض ہو گیا۔ میں بھوکا مرنے لگا تو میاں، خدا تمھاری خیر کرے، میں اقبال پرست بن گیا۔ یہ اَدب میں میری پہلی مداخلت تھی۔ میں نے چند دل والوں اور دولت والوں کو جمع کیا اور کہا،

”اقبالؔ ہمارا شاعر، ہمارا محسن، پاکستان کے تصوّر کا خالق اور ہم اُسے زندہ رکھنے کے لیے کچھ نہیں کر رہے ہیں، لعنت ہے ہم پر....“

”ہمیں کیا کرنا چاہیے مولوی صاحب؟..“ ایک دوسرے امیر کبیر نے کہا، ”آپ جو چاہیں کریں۔ پیسا ہم سے لے لیں۔ ہم آپ کو کنوینیئر بناتے ہیں۔“

”منظور ہے، منظور ہے۔“ سب نے ایک آواز ہو کر کہا۔

”تو میاں خدا تمھاری خیر کرے، یہ لو پیو اسکوائش، لو نا بھئی، ایک گلاس اور میری خاطر۔ اچھا چلو اقبالؔ کے صدقے میں، ہاں شاباش پیو، پی لو۔ تو میاں! میں نے ایک بڑا بھاری جلسہ کیا۔ خرچ اخراجات کے لیے ایک ہی سیٹھ نے دس ہزار تھما دیے۔ بھئی لوگ بڑے اہلِ دل ہیں۔ جلسہ کامیاب رہا۔ اخباروں میں بڑی دھوم ہوئی۔ میری اور سیٹھ عبدالسلام کی تصویریں خوب خوب چھپیں۔ چار ہزار روپیا بچا، جسے حقِ محنت کے طور پر اِس خادم نے اپنے ہی پاس رہنے دیا۔“

”سب نیت کا پھل ہے مولوی صاحب!“ میں نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں تو میاں! جلسہ کامیاب رہا۔ میرا دل کھل گیا۔ چھ ماہ بعد میں نے مشاعرے کی تجویز رکھی۔ مجلسِ عاملہ نے قبول کی۔ مجھی کو پھر کنوینیئر بنا دیا۔ ارکانِ عاملہ نے حسبِ توفیق چندہ جمع کیا۔ دو سو روپے اِس حقیر پُرتقصیر، خادم اقبال نے بھی پیش کیے۔ اِسی نشست میں پانچ ہزار اکٹھے ہو گئے۔ پھر میں نے عطیہ مُہم شروع کی، پھر خیرات مُہم، پھر چندہ مُہم اور آخر میں ٹکٹ مُہم۔ ایک مہینے کی محنتِ شاقہ سے پچاس ہزار کی ڈھیری لگ گئی۔ رُوحِ اقبالؔ کے فیض کے قربان جائیے۔ پھر میں

رنگِ ادب پبلی کیشنز

نے شعرا کو دعوت نامے لکھے۔ پہلے اُن شاعروں کو مدعو کیا جن سے دوستی، یا جان پہچان تھی، بدیں مضمون کہ چند سوختہ ساماں قلندروں نے اپنی اپنی کشتیاں جلا کر اقبالؔ کو زندہ رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کارِ خیر میں آپ بھی جذبہ قربانی سے کام لیتے ہوئے ازراہِ اقبالؔ نوازی بلا معاوضہ تشریف لائیے۔ کھانا اور چائے بہ ذمہ منتظمین۔ دس شاعروں کی طرف سے قبولیت نامے وصول ہو گئے۔ بعض شاعروں کو دعوت نامے اِس انداز میں لکھے گئے، گویا یہ بزمِ اقبالؔ نہیں، یتیم خانہ ہے۔ مقامِ عبرت ہے ازراہِ کرم معاوضے کی بجائے حقیر سا نذرانہ قبول کیجیے۔ (نذرانے کی رقم پچاس روپے سے سو روپے تک کے درمیان لکھ دی گئی) پندرہ شاعروں نے دعوت قبول کر لی۔

”اب بڑے شاعروں کی باری تھی۔ بعض منتظمین چاہتے تھے کہ حضرت غیظ اور جناب احمد قسیم نادی اور جناب خروش ملیح آبادی اور حضرت حافظ جالندھری جیسی بڑی توپوں کو بلوائیں۔ میں نے اِس موقع پر حکمتِ عملی لڑائی۔ میں نے عرض کیا، ایک صاحب تو نام کے بڑے ہیں، درشن تھوڑے۔ ڈھول ہی ڈھول ہیں، اندر سے خالی۔ زبان اور گرامر تک کی غلطیاں کرتے ہیں۔ ایک اور صاحب بیمار رہتے ہیں۔ پچھلے ہفتے سے تبخیرِ معدہ میں مبتلا ہیں اور ابھی دو تین ماہ اِن شاء اللہ مبتلا رہیں گے۔ ایک صاحب ساری دنیا کو مے خانہ سمجھتے ہیں۔ آئیں گے اور مشاعرے کو غرقِ شراب کر دیں گے اور اقبالؔ جیسے مردِ مومن کے مشاعرے میں ایسوں کو بلانا گناہِ کبیرہ ہے۔ پھر اِن لوگوں کے معاوضے بہت لمبے چوڑے ہیں۔ ہم سب نیلام بھی ہو جائیں تو اِن کا پیٹ نہیں بھر سکتے۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ اِن اوّل درجے کے نمائشی ہاتھیوں کی بجائے متوسط درجے کے محنتی اور معقول شعرا کو بلوائیے، جن میں اخلاص بھی ہے، ایثار بھی۔“

”آہو جی، پیسے کا کھیال رکھنا جروری ہے...“ ایک رکن نے کہا، ”مساعرہ کرانا ہے کوئی ساعروں کا مکابلہ حسن تو نہیں کرانا ہے۔“

اِس اخلاقی تائید کے بعد میں نے کہا، ”اب یوں دیکھیے حضرات! ایک بڑا شاعر فرض کیجیے ایک ہزار لیتا ہے، دو سیکنڈ کلاس شاعر پانچ پانچ سو پر راضی ہو جائیں گے۔ پانچ تھرڈ کلاس شاعر دو دو سو پر خوش ہو کر آئیں گے۔ دس شاعر، جن کی مارکیٹ ویلیو ابھی مقرر نہیں ہوئی سو سو پر آ کر زندگی بھر ہمارے ممنون رہیں گے۔ دیکھیے، اس طرح خرچ وہی ہزار رہا، آ گئے ایک کی بجائے دس۔ سب نے میری ذہانت کو داد دی۔ ایک رکن نے جوش میں آ کر کہا، آفرین ہے مولوی

عبدالصمد خان پر... یہ نہ ہوتے تو اقبالؔ بھی نہ ہوتا... الغرض بڑے دھوم دھڑکے سے مشاعرہ ہوا۔ تیسرے اور چوتھے اور پانچویں اور چھٹے درجے کے تمام شاعروں نے وہ تانتا باندھا کہ مشاعرہ ساری رات جاری رہا۔ میرا اعتقاد ہے کہ رُوحِ اقبال تمام رات قبر میں خوش ہوتی رہی ہوگی۔ تبھی تو رُوحِ اقبال کی برکت سے اُس مشاعرے میں مجھے تیس ہزار روپے ساڑھے تیرہ آنے حقِ محنت اور حق الخدمت کے طور پر بچے۔

''میاں خدا تمہاری خیر کرے، زیادہ کیا کان کھاؤں، مختصر یوں سمجھو کہ خدمتِ اقبال کے سبب کیا عزت اور کیا شہرت اور کیا پبلسٹی نہ تھی، جو اُس حقیر فقیر، کمترین خادمِ اقبال کو نصیب نہ ہوئی اور خدا نے میرے حسنِ نیت کے صلے میں وہ خوش حالی دی، وہ فارغ البالی دی کہ دو لڑکیوں کے جہیز تیار کرلیے۔ دو لڑکے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر گئے ہیں۔ پری خانم (یہ میری بیوی ہیں، اصل نام غفورن بی بی ہے، میں اِنہیں پیار سے پری خانم کہتا ہوں) ہاں تو پری خانم کو خدا نے اتنا زر دیا کہ سر سے پیر تک لدی پھندی رہتی ہے۔

''ہاں تو میاں! خدا تمہاری خیر کرے، پھر میں نے اقبالؔ کو زندہ رکھنے کے لیے اور کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اقبال میموریل لائبریری میں نے قائم کی۔ اقبالؔ پبلک اسکول میں نے جاری کیا۔ اقبالؔ عرس فنڈ میں نے کھولا۔ ایک مسجد بنوادی۔ اوپر لکھوادیا 'یہ یادگارِ اقبال بنا شد'... الغرض بہت کچھ کیا اور کررہا ہوں۔ اللہ بہت کچھ دے رہا ہے اور دے گا۔ سبحان اللہ! کیا تھے علامہ اقبالؔ، جیسے تب فیض، مرے تب فیض۔ گویا فیض کا سمندر موج زن ہے...''

''ارے میاں ضربِ کلیم! بھئی کہاں ہو ضربِ کلیم؟''

ایک لڑکا آ کھڑا ہوا۔ ''جی ابا جی۔''

''میاں ضربِ کلیم! ابھی تک زبورِ عجم کو اسکول لے کر نہیں گئے؟ جاؤ جلدی جاؤ اور ذرا 'پیامِ مشرق' کو میرے پاس بھیج دو۔''

''مولوی صاحب یہ کیا؟'' میں نے حیرت زدگی کے عالم میں پوچھا، یہ 'ضربِ کلیم'، یہ 'زبورِ عجم'۔

''ہاں ہاں...'' مولوی عبدالصمد خان نے فخر سے اپنی گنجی چندیا کھجاتے ہوئے کہا، ''مجھے اقبالؔ سے بڑی عقیدت ہے۔ وہ میرے محسن ہیں۔ میرے رازق ہیں۔ اُنہوں نے میرا گھر بھر

میں اُن کا معتقد ہوں میاں! میں نے اظہارِ عقیدت کے طور پر اپنے سب بچوں کے نام اُن کی تصانیف پر رکھ دیے ہیں۔ 'ضربِ کلیم' چھٹی میں پڑھتا ہے۔ بی بی 'زبورِ عجم' دوسری کی طالبہ ہے۔ 'پیامِ مشرق' گھڑی ساز کی دکان پر کام سیکھ رہا ہے۔ 'بالِ جبریل' قرآنِ کریم حفظ کر رہا ہے۔ 'اسرارِ خودی' کالج میں زیرِ تعلیم ہے، بلکہ میں نے پری خانم یعنی غفورن بی بی کا نام 'بانگِ درا' رکھ چھوڑا ہے۔"

اندر سے دستک ہوئی۔ "ذرا سننا مولوی صاحب!"

مولوی صاحب دروازے کی طرف لپکے۔

"ہاں پھوپھی فاطمہ، کوئی خوشخبری ہے کیا؟"

"ہاں مولوی صاحب! مبارک ہو۔ خدا نے آپ کو جڑواں بچے دیے ہیں۔ دونوں لڑکے ہیں۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔ اللہ پاک تیرا شکر ہے۔"

مولوی صاحب آ کر بیٹھ گئے۔ خوشی سے اُن کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

"خدا نے جڑواں بچے عطا کیے ہیں میاں!"

"مبارک باد قبول کیجیے مولوی صاحب۔"

"ہاں میاں، خدا کا احسان ہے۔ اچھا میاں! خدا تمہاری خیر کرے۔ اِن کے نام تو بتاؤ۔ اقبال کی کتابوں کے نام تو قریب قریب ختم ہو گئے۔ تاہم دماغ لڑاؤ۔ اچھے سے دو نام سوچو۔"

"سوچ لیے مولوی صاحب! سوچ لیے۔"

"ہاں ہاں بتاؤ۔"

"شکوہ، جوابِ شکوہ۔"

* * *

الفاظ کا جادو

عبدالماجد دریا آبادی

اگر آپ کا تعلق اُونچے طبقہ سے ہے ’تو کسی سرا‘ میں ٹھہرنا آپ کے لیے باعث توہین، لیکن کسی ’ہوٹل‘ میں قیام کرنا ذرا بھی باعثِ شرم نہیں۔ حالاں کہ دونوں میں کیا فرق بجز اس کے ہے کہ ’سرا‘ مشرقی ہے۔ ہندوستانی ہے، دیسی ہے اور ہوٹل مغربی ہے، انگریزی ہے، ولایتی ہے۔ کوئی اگر یہ کہہ دے کہ سرا کے فلاں بھٹیارے سے آپ کا یارانہ ہے تو آپ اُس کا منہ نوچ لینے کو تیار ہو جائیں، لیکن فلاں ہوٹل کے مینیجر سے آپ کا بڑا ربط وضبط ہے اسے آپ فخریہ تسلیم کرتے رہے ہیں۔ حالاں کہ سرا کے بھٹیارے اور ہوٹل کے مینیجر کے درمیان بجز ایک کے دیسی اور دوسرے کے ولایتی ہونے کے اور کوئی فرق نہیں؟ کسی مدرسہ میں آپ مدرس ہیں تو بس کچھ معمولی ہی سے، لیکن کسی کالج میں اگر آپ لیکچرار یا پروفیسر ہیں تو معزز ہیں۔ صاحبِ وجاہت ہیں، حالاں کہ اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے مدرس اور پروفیسر بالکل ایک چیز ہیں۔

ندوہ کے دارالاقامہ میں اگر قیام پذیر ہیں تو آپ کا دل خوش نہیں ہوتا۔ لیکن اسی دارالاقامہ کا نام جب آپ شبلی ہوٹل سنتے ہیں تو آپ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا ہے۔ مدرسہ میں اگر آپ پڑھتے ہیں یا پڑھاتے ہیں تو خود اپنی نظروں میں آپ بے قیمت ہیں۔ لیکن اگر آپ کا تعلق کسی کالج سے ہے تو آپ سے زیادہ معزز کون ہے؟ اب ہر مدرسہ طبیہ، طبیہ اسکول ہے اور مدرسہ تکمیل الطب اور مدرسہ منبع الطب اب تکمیل الطب کالج اور منبع الطب کالج ہیں۔ مدرسہ طبیہ وہاجیہ کا زمانہ گیا۔ اب اس کا صحیح نام ’طبیہ وہاجیہ کالج‘ ہے۔ طبی درسگاہوں کو چھوڑیے، خود دینی درس گاہوں کا کیا حال ہے؟ وہ دن گئے جب زبانوں پر مدرسہ چشمۂ رحمت کا تذکرہ تھا۔ اب وہ ’چشمۂ رحمت کالج‘ ہے۔ اور وہاں کے صدر مدرس ’پرنسپل‘ صاحب ہیں۔ فرنگی محل کے مدرسۂ نظامیہ کے سب سے بڑے استاد کو ’صدر مدرس‘ ذرا کہہ کر تو دیکھیے، فوراً آپ کی غلطی کی تصحیح کی جائے گی کہ ان کا عہدہ

اب صدر مدرس کا نہیں پرنسپل کا ہے۔

کوئی آپ سے کہے کہ آپ گلی میں کھڑے ہو کے گلی ڈنڈا کا تماشا دیکھ رہے ہیں تو آپ شرما جائیں گے۔ لیکن جب آپ کرکٹ یا فٹ بال یا ہاکی کا میچ کھلے میدان میں کھڑے دیکھ رہے ہوں گے۔ تو آپ اپنے بڑوں سے شرمائیں گے نہ چھوٹوں سے۔ مینڈھے لڑاتے ہوئے یا بٹیر بازی یا مرغ بازی کرتے ہوئے۔ اگر آپ کہیں پکڑ لیے گئے تو آپ اپنے کو کسی کے سامنے اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ سمجھیں گے۔ لیکن جب آپ کے شہر میں باکسنگ (مکے بازی) کا مقابلہ ہوگا یا ہیوی ویٹ چیمپئن آجائیں گے تو ان کے کمالاتِ تماشا دیکھنا روشن خیالی میں داخل! کہیں چوری چھپے ڈنگی دیکھنے کھڑے ہو جایئے تو خود آپ کی ثقافت اور وضعداری آپ پر لاحول پڑھنے لگے، لیکن تھیٹر میں آدھی آدھی رات بے تکلف بسر کیجیے کہ ڈراما جیسے فن شریف کی شرافت و عظمت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ اپنے دیس کے کسی بھانڈ، کسی سازندہ، کسی ڈھاڑی سے اگر آپ کی شناسائی ہو گئی ہے تو اُس کا ذکر آپ اپنے دوستوں اور بے تکلف اپنے ہم عمروں کے سامنے بھی کچھ جھینپ کر ہی کرتے ہیں۔ لیکن چارلی چپلن اور میری پکفرڈ کے کمالات فن اور آرٹ کی جتنی داد جی چاہے دیجیے۔ بھری محفل میں بزرگوں اور استادوں کے مجمع میں اور اخبارات کے صفحات میں آپ کی نقادی ہی کی داد ملتی چلی جائے گی۔ نٹوں کا پیشہ بھی بھلا کوئی عزت کا پیشہ ہے اور خدانخواستہ آپ کی کسی نٹ یا نٹنی سے ملاقات کیوں ہونے لگی۔ لیکن وہی قلابازیاں کھانے والے جب سرکس والے اور سرکس والیاں بن کر آپ کے سامنے آتے ہیں تو نہ آپ ان سے ملنے میں شرماتے ہیں نہ ان سے تعلقات بڑھانے میں!

جوئے یا جواریوں سے ظاہر ہے، ہماری شرافت کو کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ کوئی ہمیں جواری کہہ کر دیکھے، اپنی جان اور اُس کی جان ایک کر دیں۔ لیکن گھوڑ دوڑ کے دنوں میں اور کارنیوال کی راتوں میں، دن دہاڑے اور بجلی کی روشنی میں، یہی ذلت ہمارے لیے عین عزت بن جاتی ہے۔ اور بڑے بڑے شریف و معزز نہ جوئے کی بازی لگاتے شرماتے ہیں اور نہ اپنے کو ریس باز کہلاتے، نخاس میں کسی کباڑیے کی دکان پر مول تول کرنا ہماری عزت و شرافت کے لیے باعث ننگ، لیکن مال روڈ پر پیک ایلن کی کوٹھی پر گشت لگانے میں کوئی عار ہے نہ شرم، اس لیے کہ پیک ایلن کوئی کباڑیے تھوڑے ہی ہیں آکشنر اور نیلامیے ہیں!

انور احمد علوی

چوک اور امین آباد میں کسی حلوائی کی دکان سے پوری مٹھائی اپنے ہاتھ سے خریدیے تو جاننے والوں کی نظریں بچا بچا کر، لیکن حضرت گنج میں ڈیلیریو کی دکان کے سامنے اپنا موٹر بلا تکلف روکیے اور کیک پیسٹری کی خریداری بہ نفسِ نفیس بے جھجک فرمائیے۔ اس لیے کہ ڈیلیریو حلوائی نہیں، کنفکشنر ہے!

نظیر آباد کے چوراہے پر کسی شربت والے کی دکان سے فالودہ کا گلاس خریدنا آپ کی خودداری کے منافی ہے۔ لیکن حضرت گنج میں صاحب کی جگمگاتی ہوئی دکان پر بیٹھ کر آئس کریم نوش فرمانا آپ کی عزت اور شان کے عین مطابق، کسی نانبائی کی دکان کا نام اگر ’ریسٹران‘ پڑ جائے تو وہی عار، فخر میں تبدیل ہو جائے! ’نائی‘ بے چارہ جب تک محض نائی ہے یا حجام، اُس کے اُسترے اور کسبت کے آگے سر جھکانا آپ کیوں کر گوارا فرما سکتے ہیں۔ لیکن وہی نائی جب اپنے کو "Hair Dresser" کہلانے لگے اور اپنی چوراہے کی دکان پر ’ہیر کٹنگ سیلون‘ کا سائن بورڈ لگا دے تو وہی ناگوار آپ کے لیے بہ طیبِ خاطر گوارا و پسندیدہ بن جائے۔

عدالت کا پیادہ جب تک ’چپراسی‘ یا مذکوری ہے حقیر و ذلیل ہے، لیکن وہی پیادہ اگر ’بیلف‘ کہہ کر پکارا جاتا ہے تو معزز ہے اور آپ کی زبان پر محض بیلف نہیں بلکہ ’بیلف صاحب‘ ہے۔ کوئی چمار یا موچی اس قابل کب ہوتا ہے کہ آپ اسے منہ لگائیں، لیکن وہی ذلیل اگر کسی "Tannery" کا مالک کہلانے لگے۔ تو معاً اس کی ذلت آپ کی نگاہ میں عزت و شرافت سے بدل جاتی ہے۔ اور دنیا کے سب سے بڑے موچی باٹا "Bata" کی قوم سے تعلق رکھتا ہو تو عین دلیلِ اعزاز! بستی کا ساہوکار یا مہاجن بڑے سے بڑا ہو۔ آپ کی نظر میں محض ’بنیا‘ ہے لیکن وہی بنیا اگر کسی بینک کا مینیجر ہو جائے یا اپنے کو بینکر کہلانے لگے، تو دیکھیے اس کا مرتبہ دم بھر میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ کسی رئیس کا ’مصاحب‘ آپ کی نظر میں، اخلاقی حیثیت بے عملی، خوشامد، چاپلوسی اور خود فروشی کا مجسمہ ہے لیکن صاحب کے ’پرائیویٹ سیکریٹری‘ اور اے ڈی سی کا نام اِدھر آیا اور اُدھر معاً آپ کی نظروں میں وسعت و مستعدی رعب و دبدبہ کی تصویر پھر گئی! پنچایت کا نام آیا! اور آپ کے ذہن نے قصائیوں اور کنجڑوں، نائیوں اور دھوبیوں اور دوسری نیچ قوموں کا تصور شروع کر دیا۔ لیکن ادھر پنچایت کی بجائے پارلیمنٹ اور اسمبلی، کونسل اور میونسپل بورڈ کے الفاظ بولے گئے اور آپ کا ذہن، ان فرنگی پنچایتوں کی بلندی پر رشک کرنے لگا۔

رنگِ ادب دہلی کیلنڈر

عبدالماجد دریا آبادی ...... الفاظ کا جادو

کوئی مولوی غریب، اگر عالگیری اور شامی کے جزئیات فقہی کا حافظ ہے، تو غبی ہے، کودن ہے، کندۂ ناتراش ہے۔ محض ملاٹا ہے۔ لیکن اگر کسی ایڈووکیٹ یا بیرسٹر صاحب کو ہائی کورٹ اور پریوی کونسل کے نظائر ازبر ہیں تو ان کی قابلیت خوش دماغی اور ذہانت کے اعتراف میں سب سے آگے آپ ہی ہیں۔ فسانۂ عجائب اور طلسم ہوشربا کے نام، آج محال ہے کہ کوئی زبان پر لا سکے۔ لیکن لنڈن اور برلن پیرس ادر نیویارک سے کتنے ہی نئے نئے عجائب، افسانے اور کتنے ہی ہوشربا طلسمات، ناولوں کے نام سے، سراغ رسانی کے افسانوں کے نام سے، سنسنی خیز خبروں کے نام سے، رعشہ انگیز افتتاحوں کے نام سے صاعقہ اثر ڈراموں کے نام سے اور خدا معلوم کن کن ناموں سے ہر سال اور ہر ماہ ہر ہفتہ اور ہر روز ہر صبح اور ہر شام شائع ہوا کریں۔ ان سے باخبر رہنا اور پوری دلچسپی وانہماک کے ساتھ ان کے نشر واشاعت میں، ان کے پڑھنے پڑھانے میں لگے رہنا روشن خیالی کی دلیل اور تہذیب وتعلیم یافتہ ہونے کی سند ہے! کوئی آپ کو صلاح دے کہ ‘لوہاری’ کا پیشہ اختیار کیجیے تو آپ اسے گالی سمجھیں لیکن میکینکل انجینیری کے عہدہ کی طرف آپ خود لپک لپک کر بڑھ رہے ہیں۔ جراح کے لفظ سے جو تخیل آپ کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے، وہ کس درجہ پست ہے۔ لیکن سرجن کے نام لینے سے اُس پستی میں کتنی بلندی آجاتی ہے۔ محلہ اور پڑوس کے ‘جلاہے’ آپ کے خیال میں پست وادنی لیکن کپڑا بننے والے اگر لنکا شائر کے ہیں تو کیا اُن کی بابت بھی آپ کا یہ خیال ہے؟ بزاز گز ہاتھ میں لیے اور مزدور کے سر پر گٹھڑی اُٹھائے شہر میں پھیری کرتے پھرتے ہیں۔ ان کی کوئی عزت ووقعت یقیناً نگاہ میں نہیں، لیکن وہی کپڑا بیچنے والے اگر مانچسٹر کے باشندے ہیں تو بس معززینِ بلند ہیں۔ بزرگوں کے سالانہ فاتحے منانا دلیل احمق وعلامت توہم پرستی، لیکن فلاں ادارہ کے احاطہ میں ‘فاؤنڈرس ڈے یا یومِ تاسیس’ دھوم دھام سے منانا، دلیلِ دانش، برہانِ روشن خیالی۔

لکھنو کے چوک یا دہلی کی چاوڑی کی کسی پیشہ ور کا نام آپ بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ اپنے کسی بزرگ کے سامنے نہ لیں گے۔ نہ کسی کا ناچ مجرا دیکھنے کھلم کھلا تشریف لے جائیں گے۔ کسی ڈرائنگ روم میں گھر کے سب مردوں اور عورتوں کے سامنے ریڈیو ہے بے تکلف آپ فلاں بائی جی اور فلاں بیگم صاحبہ کے نغموں سے لطف اُٹھائیں گے! اور فلم ایکٹرس جو بھی آپ کے دل میں جگہ کر لے گی۔ پوری بیباکی سے آپ اُس کے چرچے ہر چھوٹے بڑے کے سامنے کریں گے۔

کوئی کہاں تک گنائے اور ناموں اور لفظوں کی کتنی لمبی فہرست تیار کرے۔ نمود کے لیے یہ بھی کافی ہی نہیں کافی سے زیادہ ہیں۔ اپنی واقفیت کی دنیا میں خود نظر دوڑائیے اور دیکھ لیجیے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں، معاشرت و معاملت کے ہر گوشہ میں فرنگیت کا کتنا دماغی رعب ہم پر اور آپ پر چھایا ہے۔ حقیقت ایک ہوتی ہے۔ معنی و مفہوم متحد ہوتے ہیں لیکن جو لفظ اور جو نام، فرنگیت کے راستہ سے ‘صاحب’ کے رشتہ میں سے آپ کے کانوں تک پہنچے ہیں ان میں اُن کے دیسی مترادفات سے زیادہ کتنی زیادہ عظمت، کتنی زیادہ اہمیت، کتنی زیادہ بلندی ہمارے دلوں اور دماغوں نے غیر محسوس طور پر قبول کر لی ہے۔ اگلوں نے بہت کیا تو یہی کیا تھا کہ ملک فتح کر لیے، قلعے سر کر ڈالے، فوجوں کو میدانِ جنگ میں شکست دے دی۔ اس سے زیادہ نہ چنگیز سے کچھ بن پڑا۔ نہ ہلاکو سے، نہ دارا سے نہ سکندر سے، یہ شرفِ مخصوص صرف اسی دَورِ یاجوجی کے لیے اُٹھ رہا تھا کہ جسم کے ساتھ ساتھ دل و دماغ فتح کر لیے جاتے ہیں، اور ہاتھوں پیروں کے علاوہ عقلوں، دماغوں اور بصیرتوں سے بھی خطِ غلامی لکھ لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ غریب محکوموں کے پاس، خیر و شر، حسن و قبح، ہنر و عیب کا معیار لے دے کے بس یہی ایک رہ جاتا ہے کہ ‘صاحب’ کی چشمِ التفات کدھر ہے۔ عزت بھی ‘صاحب’ کی دی ہوئی اور دولت بھی سرکار کی مرحمت کی ہوئی۔ دین بھی وہیں کا عطیہ اور دنیا بھی وہیں کی بخشش۔

* *

اُردو کی آخری مکمل کتاب !؟

عرفان احمد خان

منشور

منشور، سائنسی اصطلاح میں شفاف شیشے کا وہ تکونا ٹکڑا ہوتا ہے، جو روشنی کے حوالے سے تجربات کرنے کے کام آتا ہے، جب کہ سیاست میں 'منشور' عوام کی توجہ منعطف کرنے اور اُن کے جذبات سے کھیلنے کے کام آتا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ سیاست دان جاہل ہونے کے باوجود سائنس کی نہ صرف شُدھ بُدھ رکھتے ہیں، بلکہ سائنس کے دل سے قائل بھی ہیں، جب کہ اُن کی اہلیت کا عالم یہ ہوتا ہے کہ صرف حجام کی کرسی پر بیٹھنے کا استحقاق رکھتے ہیں۔

لازمی سوال

کسی ایسی سیاسی جماعت کا نام بتاؤ، جس نے اپنے یا کسی دوسری جماعت کے منشور پر عمل کر کے "**Passing Marks**" حاصل کیے ہوں!

تمغۂ حسنِ کارکردگی

تمغۂ حسنِ کارکردگی واحد تمغہ ہے، جو سینے کی بجائے منہ پر لگتا ہے، کیوں کہ آج تک تمغۂ حسنِ کارکردگی پانے والے کسی بھی فرد کو دوبارہ حکومت کے خلاف بولتے نہیں دیکھا گیا۔ اگر کوئی بفرضِ محال ایسا کر بھی گزرے تو اُسے 'نمک حرام' کے اضافی خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ اس نسخے کو تیر بہدف جانتے ہوئے یار لوگوں نے 'پرائیڈ آف پرفارمنس میڈل' برانڈ چوسنی بھی بنا ڈالی ہے۔ اگر کسی کا منہ مُستقلاً بند کروانا ہو تو اُسے الیکشن کمیشن کا چیئرمین بنا دیا جاتا ہے، یا اکادمی ادبیات پاکستان کا صدر نشین!

چند عنوانات برائے تھیس پی ایچ ڈی اُردو

- سرسری سماعت کی اَدبی عدالت۔
- فروغِ ادب میں منہ بولی بیٹی کا کردار۔
- فروغِ ادب میں عاق شدہ بیٹوں کی کھڑی کردہ رکاوٹیں۔
- پی ایچ ڈی کرنا آخر کیوں ضروری ہے؟
- تھیس جمع کرنے کے شوقین ایگزامینر اور نگراں حضرات۔
- اساتذہ کے معاشی استحکام میں پی ایچ ڈی کا کردار۔
- بے وزن شاعری اور ہماری زندگی۔

سرکاری و نیم سرکاری نیز پرائیویٹ ملازمین کی چھٹیوں کے لیے سکہ بند بہانوں کا زبردست پیکیج:

تفصیلِ بہانہ	کتنے یوم کی رخصت مل سکتی ہے؟
ہمسائی کو شاپنگ کروانی ہے۔	زیادہ سے زیادہ ایک دن
وی سی آر کا ہیڈ صاف کروانا ہے۔	ایک تا تین یوم
صدرِ مملکت کے جلسے میں جانا ہے۔ (تیاری، شرکت، تھکاوٹ)	تین یوم
کُتے کی نظر ٹیسٹ کروانی ہے۔	ایک یوم
محلے کا ٹرانسفارمر ٹرپ کر گیا ہے۔	ایک یوم
ڈونکی پمپ کی بُوگی ڈلوانی ہے۔	ایک یوم
سائیکل کے کتے فیل ہو گئے، انھیں پاس کروانا ہے۔	ایک تا تین یوم
ہمسائے کی مخبری کرنے کے بعد رُوپوشی۔	ایک تا تین ماہ
جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے۔	تا حیات!

ہم خبریں اور تبصرے... ''80 سالہ مائی، نائنٹی کے ساتھ بھاگ گئی!''

تبصرہ

بظاہر یہ خبر لوگوں کے ذہن پر ایک منفی تاثر اُبھارنے کے لیے لگائی گئی ہے، لیکن عاقبت نااندیش رپورٹر یہ بات بھول گیا ہے کہ اُس نے بھی کبھی بوڑھا ہونا ہے۔ اُسے معمر جوڑے کی ہمت کی داد دینی چاہیے تھی اور اِس کوشش کو سراہنا چاہیے تھا۔ اس عمر میں دونوں کا بھاگ دوڑ کرنا قابلِ مذمت نہیں، قابلِ ستائش ہے۔

اَزلی خواہش

اُردو بازار کے ہر پبلشر کی اَزلی خواہش ہوتی ہے کہ ہر رائٹر انھیں اپنی تخلیق شرعی حق مہر کے عوض سونپ کر، عمر بھر کے لیے علیٰحدگی اختیار کر لے۔

آج کا گیت

اللہ ہی اللہ کیا کرو   کچھ نہ کسی کو دیا کرو
جو 'کرسی' پر قابض ہے   نام اُسی کا لیا کرو

* *

طُرفہ تماشا

عزیز جبرانؔ انصاری

چلے ہیں گھر سے تو جی بھر کے دیکھ لیجے ہمیں   کسے خبر ہے کہ واپس بھی آئیں گے کہ نہیں!

”چور چور... چور چور... و و... جانے نہ پائے...“

”یار تم لاہور والے بھی عجیب ہو، بے چارہ ایک معمولی پرس چھین کر ہی تو بھاگا ہے۔ تم تو پنجے جھاڑ کر اُس کے پیچھے پڑ گئے ہو۔“

”ناں تہڈا کی مطلب ہے۔ اسیں اونوں جان دیاں۔“

”میرے یار! کوئی ضرورت مند ہوگا، بھوک سے مجبور ہو کر یہ حرکت کر بیٹھا ہوگا۔“

”واہ بادشاہو! یہ خوب منطق ہے تہاڈی۔ ہور جس بے چاری دا پرس چھینا گیا او کوئی ساہوکار ہے۔“

”ساہوکارنی نہ سہی، کم اَز کم اس کی طرح مجبور تو نہیں ہوگی۔ ہمارے یہاں کراچی میں ایسی وارداتیں روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں ہوتی ہیں اور ہم در گزر کر دیتے ہیں۔ ہم تو ایسے ضرورت مندوں کو اس حد تک چھوٹ دے دیتے ہیں کہ آئے دن بسوں میں دو چار ضرورت مند نوجوان ٹی ٹی لے کر چڑھ آتے ہیں اور مسافروں کو موبائل فون اور نقدی سے محروم کر کے بس رکوا کر آرام سے اُتر کر خراماں خراماں چلے جاتے ہیں۔ مجال ہے، جو بس کا کوئی مسافر اُنہیں روکنے کی کوشش کرے، یا کوئی پولیس والا روک ٹوک کرے۔ ہمارے یہاں کی پولیس تو اتنی خدا ترس ہے کہ اگر کبھی کسی بھولے بھٹکے گمراہ شخص نے اِن ضرورت مندوں کو (جنہیں موبائل چوروں کا فضول سا نام دے کر اُن کی غربت کا مذاق اُڑایا جاتا ہے) اپنے طور پر سزا دینے کی کوشش کی بھی تو اُس گم کردہ راہ شخص کی اچھی طرح خبر لی جاتی ہے۔ اگر اُس بے چارے کو غلطی کا احساس ہو جائے تو نذر و نیاز کے ذریعے سے اپنی جان کی امان حاصل کر لیتا ہے، ورنہ دو چار دن پولیس لاک اَپ میں گزارنے

پڑتے ہیں۔ اور جب تک معزز ایس ایچ او کے حضور بھاری نذریں نہ گزارے، جان نہیں چھڑا سکتا۔ اس کے باوجود یار لوگ ہماری پولیس کو بدنام کرتے ہیں کہ یہ جرائم پیشہ لوگوں سے ملی ہوتی ہے، یہ خود جرائم کراتی ہے۔ یار سچ بتاؤ، یہ ہماری جفاکش پولیس پر بہتان نہیں ہے؟ ہماری پولیس تو چوبیس چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر رہتی ہے۔ دن کو وردی میں اور رات کو...! ذرا یہ تو بتاؤ تمہارے صوبے میں پولیس پر کام کا اتنا بوجھ ہے؟ نہیں ناں! پھر اس پر ستم یہ کہ ہماری پولیس کے مقابلے میں تمہارے یہاں کی پولیس کی تنخواہ دگنی ہے۔ اس مہنگائی کے دور میں اب اگر ہماری پولیس چائے پانی کے لیے کسی موٹر سائیکل سوار، یا کار والے سے چند روپے (وہ بھی غلط ڈرائیونگ کرنے پر) لے لیتی ہے تو فوراً اُس پر راشی ہونے کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ اگر وہ چالان کر دے تو وقت کے ضیاع کے ساتھ ساتھ ڈرائیور کو بھاری جرمانہ بھی ادا کرنا پڑے۔ یہ پولیس کی مہربانی نہیں ہے کہ موقع پر دس بیس روپے لے کر مک مکا کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح دونوں کا بھلا ہو جاتا ہے۔"

"واہ یار واہ! تہاڈا شہر وی خوب ہے۔ مَیں نے پچھلے دنوں اخبار میں ایسی ہی دو چار دلچسپ خبریں پڑھیں تھیں کہ چند نوجوانوں نے بھری بس میں لوٹ مار شروع کی تو کچھ لوگوں نے ہمت کر کے ان میں سے دو کو پکڑ لیا اور پھر اُنھیں زندہ جلا دیا..."

"ہاں اب دیکھو نا، ان بے چاروں کو زندہ جلانا کہاں کی شرافت ہے؟ اگر اُنھوں نے چند مسافروں سے ان کی دن بھر کی کمائی چھین لی تو اِس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ انہیں زندگی سے ہی محروم کر دیا جائے اور وہ بھی اتنے وحشیانہ انداز میں... خدا کی پناہ لوگوں میں انسانیت اور ہمدردی نام کی تو کوئی چیز باقی ہی نہیں رہی..."

"یار تساں عجیب آدمی ہو۔ اس بس میں کتنے ایسے لوگ بھی ہوں گے، جن کے گھروں میں کئی کئی دنوں سے فاقے ہو رہے ہوں گے اور وہ آس لگائے بیٹھے ہوں گے کہ آج ان کے ابا، یا بھائی مزدوری کر کے ان کی بھوک مٹانے کا سامان لا رہے ہوں گے... مگر اُنھیں یہ خبر نہیں ہوگی کہ ان کے سرپرستوں کی دن بھر کی کمائی کو چند اوباش لڑکوں نے اپنی عیاشی کرنے کے لیے ٹی ٹی کے زور پر چھین کر انہیں پھر فاقوں پر مجبور کر دیا ہے۔"

"واہ میرے دانشور! تم نے لایعنی مفروضوں پر عمارت کھڑی کر کے ان ضرورت مند نوجوانوں کو زندہ جلانے والوں کی خوب وکالت کی ہے۔ ہمارا قانون اندھا نہیں ہے کہ تمہاری اس

منطق کو مان لے گا۔ ہماری انتظامیہ نے سخت ایکشن لیا ہے اور ایسے وحشیانہ جرم کے مرتکب لوگوں کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے اور اِن مجرموں سے اُن کے ساتھیوں کے نام پوچھے جا رہے ہیں، تاکہ انہیں بھی گرفتار کیا جا سکے۔"

"میرے دوست! اب تم بے پر کی اُڑا رہے ہو، کیوں کہ ابھی مَیں نے کل ہی اخبار میں مشیر داخلہ کی ایک ہدایت پڑھی تھی، جو اُنہوں نے انتظامیہ کے اہل کاروں کے لیے جاری کی تھی کہ موبائل چوروں کو دیکھتے ہی گولی مار دی جائے۔"

"اچھا! میری نظر سے ایسی کوئی خبر نہیں گزری۔ کیا واقعی کسی موبائل چور کو گولی ماردی گئی ہے، یا لوگوں کو گولی دی گئی ہے؟"

"نہیں یار! ہمارے مشیرِ داخلہ جو کہتے ہیں، وہ کرتے بھی ہیں۔ تم دیکھنا، اب موبائل چور تمہارے شہر سے گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو جائیں گے..."

"یا وہ سینگ پولیس کے سروں پر آجائیں گے؟"

"چھوڑو یار! تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ چلو 'کیفے اَدب' میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ اب اَدب و شاعری پر بات کریں گے۔"

"کیوں، کیا اَب میرا جی اور ن م راشد کی نظموں کے بخیے اُدھیڑنے کا ارادہ ہے؟"

دونوں گفتار کے بادشاہ کیفے میں داخل ہو گئے اور پرس چور اور موبائل چور دونوں کہیں سڑک پر ہی رہ گئے۔

* *

لاہور کا تاریک جغرافیہ!

عطاء الحق قاسمی

لاہور کے شادی گھر

یوں تو لاہور میں بہت سے شادی گھر ہیں تاہم ان میں سے مشہور ترین شادی گھر لاہور کے فائیو اسٹار ہوٹل ہیں۔ دوپہر اور رات کے اوقات میں یہاں بہت رش ہوتا ہے۔ یہاں باراتیوں کے علاوہ بھی دوسرے لوگ زرق برق کپڑے پہنے آتے ہیں اور کھانا کھا کر چلے جاتے ہیں۔ لڑکے والے سمجھتے ہیں کہ یہ لڑکی والوں کے مہمان تھے اور لڑکی والے انہیں باراتی سمجھ کر ان کی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ داتا دربار کے بعد یہ دوسری جگہ ہے جس کے لنگر سے روزانہ بیسیوں مسکین اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں۔ ان کی شادی گھروں میں ریستوران، ڈائنگ ہال اور رہائشی کمرے بھی ہیں اور یوں ان کی حیثیت ہوٹل کی بھی ہے تاہم زیادہ تر یہ بطور شادی گھر استعمال ہوتے ہیں!

فلم اسٹوڈیوز

لاہور پاکستان کا ثقافتی مرکز ہے۔ یہاں بہت سے فلم اسٹوڈیوز ہیں جن میں بیک وقت ایک ہی فلم بنتی ہے۔ اس فلم کی کاسٹ بھی عموماً تبدیل نہیں ہوتی۔ دس پندرہ برس بعد ہیروئن بدل جاتی ہے البتہ ہیرو ایک ہی رہتا ہے۔ جس کا نام سلطان راہی ہے۔ سلطان راہی ایک خوبرو ہیرو کا رول بھی ادا کرتا ہے، کالج اسٹوڈنٹ کا بھی اور ڈریکولا کا بھی۔ وہ یہ دونوں کردار بغیر کسی میک اَپ کے کرتا ہے اور ہر کردار میں سپرہٹ جاتا ہے۔ اس میں اس کا کوئی کمال نہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ ناظرین کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے ہیں مسلسل ‘نظر بندی’ کی وجہ سے یہ ناظرین سیاست میں بھی ہیرو اور ولن کے فرق کو بھول گئے ہیں!

سیاسی رہنما

لاہور سیاست کا گڑھ ہے۔ لیکن یہاں سیاست دان دوسرے صوبوں یا شہروں سے منگوائے

جاتے ہیں اور ان کی بہت آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ یہاں بہت عرصے سے کوئی مقامی سیاست دان پیدا نہیں ہوا جو ماڑے موٹے سیاست دان ہیں بھی ان کا دائرہ اثر لاہور کارپوریشن کی حدود تک ہے۔ لاہور نے بہت عرصے کے بعد ایک مقامی سیاست دان پیدا کیا ہے جس کا نام میاں نواز شریف ہے اور جس کا دائرہ اثر چاروں صوبوں میں موجودہ ہے مگر یہ سیاست دان بھی ہر ہفتے لاہور دوڑ آتا ہے۔ باقی صوبے والے اس کی راہ دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ وہاں صرف اس وقت جاتا ہے جب وہاں کسی خاتون کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔

اخبارات

اخبارات کی تعداد اور ان کی سرکولیشن کے لحاظ سے لاہور پاکستان کے تمام شہروں سے آگے ہے۔ لاہور سے جو اخبارات نکلتے ہیں ان میں سے اہم خبر کی پہلی سطر صفحہ اوّل اور باقی ساری خبریں صفحہ سات پر بقیوں والے حصے میں شائع ہوتی ہے۔ چنانچہ قاری سارا وقت پہلے اور ساتویں صفحے کا پینڈا طے کرنے میں ہی مشغول رہتا ہے اور یوں اخبار والے خبر میں چھپی خبر سے اس کا دھیان ہٹانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لاہور سے شائع ہونے والے اخباروں میں کالی ریورسیں بہت نکالی جاتی ہیں۔ ریورسوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کسی اخبار کو پیلی صحافت کی طعنہ دینا ممکن نہیں رہتا، اسے زیادہ سے زیادہ کالی صحافت کہا جا سکتا ہے۔ اخباروں کی شہ سرخیاں دو مادم مست قلندر، جبرأ آ گیا میدان میں، ہے جمالو، اوئے تیری لاش نوں مچھیاں ای کھان گیا۔ قسم کی ہوتی ہیں جو بہت پسند کی جاتی ہیں۔ پولیس، کسٹم، ایف آئی اے، انکم ٹیکس، ایکسائز اور فضل ربی والے دوسرے محکموں کی طرح اخبار میں کام کرنے والوں کی تنخواہیں بھی کم ہوتی ہیں۔ البتہ کچھ عرصے سے بلیک منی کو وائٹ کرنے کے لیے بھی اخبارات نکالے جا رہے ہیں۔ جس سے کارکنوں کو بھی بہت فائدہ پہنچ رہا ہے۔

مذہبی جماعتیں

لاہور میں تمام مذہبی جماعتوں کے دفاتر موجود ہیں۔ ان جماعتوں کا عہدیدار کوئی بھی باریش شخص ہو سکتا ہے۔ مذہبی جماعتیں لوگوں کی مذہبی تربیت کی طرف بہت توجہ دیتی ہیں۔ چنانچہ مختلف اسٹکرز چھپوا کر کاروں پر اُن کے مالکوں سے پوچھے بغیر چسپاں کرا دیے جاتے ہیں۔ ان

بڑے بڑے [illegible] عالم
اسٹکروں پر 'یارسول اللہ'، 'یا علی مدد' اور 'یا اللہ مدد' لکھا ہوتا ہے۔ دراصل ان اسٹکروں سے مختلف فرقوں کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے۔ مذہبی جماعتیں مذہب کے فروغ کے علاوہ باقی سب خدمات انجام دیتی ہیں!

مساجد

استنبول کے بعد لاہور دوسرا شہر ہے جسے مساجد کا شہر کہا جاسکتا ہے۔ مسجد کسی بھی خالی پلاٹ پر اس کے مالک کی مرضی کے بغیر بنائی جاسکتی ہے۔ اور جب ایک دفعہ مسجد بن جائے تو کوئی مائی کا لال اس کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارے میں لب کشائی نہیں کرسکتا۔ ان مسجدوں میں اہل محلہ کے اعصاب کو مضبوط بنانے کے لیے چاروں طرف لاؤڈ اسپیکر لگا دیے جاتے ہیں تاکہ کسی کافر ملک سے جہاد کی صورت میں عوام بموں کے دھماکوں سے پریشان نہ ہوں۔ ان لاؤڈ اسپیکروں سے چندہ بھی طلب کیا جاتا ہے۔ اور چندہ دینے والوں کے ناموں کا بھی اعلان ہوتا ہے۔ جو لوگ چندہ نہیں دیتے باقی تینوں لاؤڈ اسپیکروں کا رُخ ان کے گھر کی طرف کردیا جاتا ہے۔

پبلشنگ کے ادارے

لاہور میں بے شمار پبلشنگ کے ادارے ہیں۔ چنانچہ کوئی بھی مصنف بآسانی اپنی کتاب شائع کراسکتا ہے پبلشر حضرات نے اس کے لیے بہت آسان طریقہ کار رکھا ہے۔ یعنی مصنف کتاب کی اشاعت کے تمام اخراجات پبلشر کو ادا کردیتا۔ چنانچہ اس کی کتاب شائع ہوکر مارکیٹ میں آجاتی ہے۔ یہ پبلشر حضرات مصنف کو باقاعدہ رائلٹی بھی ادا کرتے ہیں اور یہ رائلٹی دس کتابوں کی صورت میں ہوتی ہے جو مصنف کی رقم سے شائع شدہ کتابوں میں سے دس کتابوں کا پیکٹ بنا کر اسے پیش کردی جاتی ہے۔

احتجاجی جلوس

لاہور میں احتجاجی جلوس بہت نکلتے ہیں۔ ان جلوسوں کے لیے حکومت نے شاہراہ قائداعظم کو مخصوص کیا ہوا ہے جہاں چند تاجر حضرات ناجائز طور پر اپنی دکانیں سجائے بیٹھے ہیں جو ان جلوسوں کے موقع پر عموماً لوٹ لی جاتی ہیں یا جلادی جاتی ہے۔ جلوس کے شرکا قومی سلامتی کے تحفظ

کے لیے بھی اگر کوئی جلوس نکالیں تو قومی املاک کو ضرور نذر آتش کرتے ہیں۔ شاہرہ قائداعظم پر جب کوئی احتجاجی جلوس نمودار ہوتا ہے ٹریفک پولیس ٹریفک کا رُخ اردگرد کی گلیوں میں موڑ دیتی ہے اور اس کے بعد بیلٹ ڈھیلی کر کے ٹوپی اُتار کر بھنگیوں کے توپ پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور سگریٹ کے کش لگانے لگتی ہے۔ البتہ امریکا کے خلاف نکالے جانے والے جلوسوں کو منتشر کرنا بہت آسان ہے۔ اس کے لیے ٹریفک کو گلیوں میں موڑنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اس موقع پر اگر میگا فون کے ذریعے صرف یہ اعلان کر دیا جائے کہ جو حضرات امریکا ویزہ لینے کے خواہش مند ہوں وہ ایک طرف ہو جائیں تو اس کے بعد جلوس میں جو چیز نظر آئے گی اسے آسان اُردو میں بھگدڑ کہا جاتا ہے۔

* *

شفیق شفیق اور مزید شفیق الرحمٰن

عطاء اللہ عالی

شفیق الرحمٰن 1920ء میں مشرقی پنجاب کے مردم خیز علاقے کلانور ضلع روہتک میں پیدا ہوئے جو لوگ شفیق الرحمٰن سے مل چکے ہیں وہ اس کا یقین نہیں کرتے۔

ان کا خیال ہے کہ اگر شفیق الرحمٰن کلانور میں پیدا ہوئے تو باقی کلانوری کہاں پیدا ہوئے... حلیے اور جثے سے تو لگتا ہے کہ آپ اسکاٹ لینڈ، آئر لینڈ، یا میونخ میں پیدا ہو کر اُردو مزاح کی افزائش کی خاطر کلانور تشریف لائے... گھر میں والدہ نے تختی اور سلیٹ پر آسان حساب اور اُردو املا سکھایا آپ کو ساری عمر اس سے زیادہ حساب نہ آیا... چوتھی پانچویں جماعت آپ نے کلانور کے سینٹرل راجپوت مسلم ہائی اسکول سے پاس کی۔ ان دنوں یہ کلانور میں اعلیٰ تعلیمی قابلیت سمجھی جاتی تھی۔

آپ نے اپنی اسی تعلیمی قابلیت کی بنا پر آگے پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ آپ کا خاندان شروع ہی سے فوجی پس منظر کا حامل رہا ہے، کلانور میں رہ کر فوج سے دُور رہنا ایسے ہی ہے جیسے دریا میں رہ کر پانی سے بچے رہنا۔ ان کے دادا حاجی مردان خاں اور بڑے دادا احسان علی خاں نے بھی بہت سی قابل ذکر جنگیں لڑیں اور تمغے حاصل کیے یہ انگریزوں کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے کلانوریوں کو فوج میں بھرتی کر کے دشمن سے لڑنے کا موقع فراہم کیا ورنہ وہ آپس میں لڑلڑ کے مرجاتے۔ ان کے دادا جب فوج سے ریٹائرڈ ہو کر گھر واپس ہوئے تو انہوں نے اپنی جمع پونجی سے زمین خریدنا چاہی آج کل یہ کام لوگ فوج میں رہتے ہوئے ہی کر لیتے ہیں سوان کے دادا نے بھاولپور ریاست میں کچھ زمین خرید لی شریف آدمی تھے ورنہ آج کل کے لوگوں کی طرح ہوتے تو پورا چولستان ہی الاٹ کروا لیتے اس وقت تو یہ بالکل خالی پڑا تھا... پاکستان میں شفیق الرحمٰن کا آبائی گاؤں چک 73/4-R ہارون آباد ہے پاکستان بننے کے بعد بہت سے لوگوں کو اپنا آبائی گھر بدل کر نیا آبائی گھر

انور احمد علوی

بنانا پڑا لیکن شفیق الرحمٰن کے بڑوں نے تقسیم سے بہت پہلے یہاں ڈیرے ڈال دیے تھے جن دنوں ان کے والد بھاولنگر میں اریگیشن انجینیئر تھے آپ بہاولپور کے صادق ڈین ہائی اسکول میں چھٹی جماعت میں پڑھ رہے تھے ان ہی دنوں احمد ندیم قاسمی آپ سے آگے کی کلاسوں میں زیرِ تعلیم تھے... ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ اسکول میں قاسمی گروپ کی شروعات ہو چکی تھیں یا نہیں۔ گورنمنٹ کالج روہتک سے ایف ایس سی کرتے ہی آپ نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں داخلہ لے لیا ان دنوں ایف ایس سی میں قیام کرنے کا رواج عام نہ ہوا تھا... ڈاکٹری پاس کر کے آپ نے میو اسپتال سے سروس کا آغاز کیا مگر یہ آغاز ابھی چل ہی رہا تھا کہ آپ کے کچھ دوست فوج میں چلے گئے آپ بھی ان کی دیکھا دیکھی فوج میں آ گئے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ دوستوں کے پیچھے پیچھے جانے کے عادی تھے یہ نہیں پتا چل سکا کہ آپ کے دوست اور کہاں کہاں جاتے ہیں۔

ملازمت کے دوران انہیں دنیا کے بہت سے ممالک میں رہنے کا اتفاق ہوا فوجی جہاں بھی ہوں رہتے چھاؤنی میں ہی ہیں، اس لیے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی بندہ ایک دن بھی فوج میں رہ آئے وہ ساری عمر فوجی رہتا ہے حیرت تو ان لوگوں پر ہوتی ہے جو فوج میں جائے بغیر ہر کسی سے لڑتے پھرتے ہیں کہتے ہیں شادی کچھ تاخیر سے سینتیس برس میں کی۔ یہ کچھ تاخیر بھی اگر یہ ذرا زیادہ ہوتی تو غالباً اب بھی کنوارے ہوتے حالاں کہ اس عمر میں شادی محض ایک رسمی کارروائی ہی رہ جاتی ہے۔ بہر حال آپ نے یہ رسمی کارروائی خوب نبھائی... آپ کی شادی میں جنرل واجد علی برکی اور جنرل ایوب خاں نے شرکت کی۔

تھوڑی دیر اور کرتے تو چرچل اور آئزن ہاور بھی یہ اعزاز حاصل کر سکتے تھے... عمر اور عہدے کے لحاظ سے آپ کی شادی اس وقت ہوئی جب یار لوگ دوسری شادی کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں... اپنی ملازمت کے دوران آپ فیلڈ یونٹ کے ساتھ رہے اس کی وجہ یہ تھی کہ برٹش دور میں نوجوان ڈاکٹروں کو چھاؤنی میں کم رکھا جاتا تھا ظاہر ہے وہاں گوریوں نے بھی تو رہنا ہوتا تھا۔ شفیق الرحمٰن طب کی اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹی آف ایڈنبرا اور یونیورسٹی آف لندن میں ڈھائی برس تک رہے اور وہاں تعلیم بھی حاصل کی۔ جنگِ عظیم کے کئی فرنٹ تھے آپ نے ہر فرنٹ پر خدمات سرانجام دیں ایسے تو اسے جنگِ عظیم نہیں کہتے۔

رنگِ ادب جبلی ایڈیشن

عطاء اللہ عالی ...... شفیق شفیق اور مزید شفیق الرحمٰن

1965ء میں آپ چونڈا کے محاذ پر تھے جسے بھارتی ٹینکوں کا قبرستان کہا جاتا ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ جہاں ڈاکٹر ہوں اور وہاں کوئی قبرستان نہ بنے۔

اس سے پہلے کہ خشکی پہ رہ کر آپ کے مزاج میں بھی خشکی پیدا ہو جاتی آپ پانی میں یعنی نیوی میں آگئے... نیوی میں آپ نے تقریباً تین برس کراچی اور کچھ عرصہ اسلام آباد میں کام کیا... اسلام آباد میں اس لیے کہ نیوی کا ہیڈ کوارٹر اسلام آباد میں ہے... پہلے مرحلے میں نیوی والے ہیڈ کوارٹر اسلام آباد لے گئے سمندر شاید بعد میں لے جائیں۔ یہیں آپ کی اڑتیس سالہ سروس کا خاتمہ ہوا یہ ایسے ہی تھا جیسے آپ کی ہنستی بستی 37 سالہ زندگی کا خاتمہ شادی پر ہوا تھا شاید اسی لیے آپ نے اٹھارہ سو ستاون کی یاد مناتے ہوئے 1957ء میں شادی کی... کہ یہ بھی کسی غدر سے کم نہیں...

نیوی میں آپ کو ہلال امتیاز دیا گیا اس لیے نہیں کہ آپ نے پانی کی نوکری خشکی پر کی یقیناً اس کی اور ٹھوس وجوہ ہوں گی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ سال بھر ستاتے رہے... بعد ازاں آپ کو پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ اس طرح پہلی دفعہ ادیبوں کو پتا چلا کہ گروپ بنانے کا نقصان بھی ہوتا ہے... یہاں آپ نے پانچ سال تک اکادمی کو چلایا... آج کل اکادمی لوگوں کو چلاتی ہے... اس کے بعد خلاف روایت توسیع نہ لے کر گھر بیٹھ گئے...

یہ ہم نے محاورتاً کہا ہے... آپ ان کے گھر جائیں تو آپ کو کبھی بیٹھے ہوئے نہیں ملیں گے... بلکہ آپ تو بیٹھ کر کرنے والے کام بھی کھڑے ہو کر کرتے ہیں...

آپ پیدل اتنا چلتے ہیں کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس گاڑی نہیں ہے۔ کئی کم فہم آپ کو اس دور کا انسان سمجھتے ہیں جب گاڑی ایجاد نہیں ہوئی تھی آپ کو ترکی بہت پسند ہے... اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہیں... اٹلی بھی بہت پسند ہے... جہاں ان کا دوست کمولا مقیم ہے... اگر کمولا کہیں اور رہتا تو شاید آپ کو وہ ملک پسند ہوتا... آپ کی کہانیاں دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں مگر ابھی تک کسی ملک کے لوگوں کی طرف سے احتجاج سامنے نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مترجم کا ترجمہ صحیح نہیں تھا بلکہ آپ کی تخلیقات ہی اتنی شاندار ہوتی ہیں۔

آپ کی تخلیقات میں درجن بھر کتابیں اور تین لڑکے شامل ہیں جن میں سے دو لڑکوں نے

بینکوں میں نوکری کر کے اپنی مالی حالت بہتر کی اور کتابوں سے پبلشروں نے۔

ان دنوں آپ کو ویسٹرج 26 راولپنڈی میں لکھتے پڑھتے اور دوڑتے بھاگتے دیکھا جا سکتا ہے...

شفیق الرحمٰن اپنے معمولات میں نظم وضبط کے اس قدر قائل ہیں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتی یعنی ان کی بیگم بھی۔

آپ کی ذاتی دلچسپیاں کم ہوتے ہوتے اب ورزش، مطالعہ اور لکھنے تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ دلچسپیوں نے اپنی صحت کا شفیق الرحمٰن کی طرح خیال نہیں رکھا۔ آپ کا ہر لمحہ گھڑی کی سوئیوں سے منضبط ہوتا ہے حالاں کہ زندگی سی خوب صورت چیز، گھڑی جیسی حقیر چیز کے تابع کرنا کہاں کی عقلمندی ہے ہمیں دیکھیں ہم تو کیلنڈر تک کو خاطر میں نہیں لاتے ویسے بھی ادیبوں شاعروں کی تو اپنی ذاتی تقویم ہوتی ہے۔

شفیق الرحمٰن ان لوگوں میں سے ہیں جن سے عشق کرنے سے پہلے فوجی تربیت سے گزرنا پڑتا ہے، کسی اعلیٰ نسل کے انگریز میں جتنی خوبیاں ہو سکتی ہیں وہ سب کی سب آپ میں پائی جاتی ہیں چوں کہ آپ خالص انگریز نہیں ہیں اس لیے برائی ایک بھی نہیں ہے اور فی زمانہ یہ بہت بڑی برائی ہے۔ کھانا ایک وقت کھاتے ہیں ان سے زیادہ تو ہمارے ہاں کی خواتین نمک چکھتے چکھتے کھا جاتی ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ انگریزی کے 'میل' کو اُردو کے 'میل' پر ترجیح دی۔ کھانا نہ کھانے کے باوجود ایکسر سائز کے ذریعے جانے کیا ہضم کرتے رہتے ہیں مطالعے سے جنون کی حد تک شغف ہے، دن بھر کھڑے ہو کر پڑھتے رہتے ہیں تھک جائیں تو ستانے کے لیے ورزش شروع کر دیتے ہیں۔

عظیم ادیبوں اور دانشوروں کی عادت کے برعکس ہر ہفتے حجامت کرواتے ہیں۔ آپ کو اُردو کی کلاسیکی شاعری کے ہزاروں اشعار اسی طرح یاد ہیں جیسے پرائمری کلاسز کے بچوں کو پہاڑے یاد ہوتے ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ یہ اشعار سمجھتے بھی ہیں۔

کئی اشعار تو پہاڑوں سے بھی زیادہ مشکل یاد کیے ہوئے ہیں۔ آپ نے اپنے طویل کیریئر میں بہت کم انٹرویو دیے ان میں اکثر کچھ یوں تھے۔

س: آپ کا موجودہ دور کے ادبی انحطاط کے بارے میں کیا خیال ہے۔

ج: کوئی نہیں۔

س: آپ آج کل کچھ لکھ رہے ہیں۔

ج: جی!

س: ادب میں گروپ بندی کے بڑھتے ہوئے رجحانات نے ادب کو نقصان پہنچایا ہے یا فائدہ۔

ج: پتا نہیں۔

س: آپ نے فلاں فلاں موضوع پر لکھا تو اَب فلاں فلاں موضوع پر کیوں نہیں لکھتے۔

ج: لکھوں گا۔

لیجیے انٹرویو ختم ہو گیا۔

اب یہ انٹرویو لینے والا دیوار میں سر نہیں مارے گا تو کیا کرے گا اس میں سے نہ چیختی چنگھاڑتی سرخیاں نکل سکتی ہیں نہ کوئی فتنہ و فساد کھڑا ہو سکتا ہے۔ ہم نے ایک بار ان سے گفتگو کے لیے طویل نشستیں کیں جس میں ان کا حکم تھا کہ پن استعمال ہو گا نہ آواز محفوظ کرنے کا کوئی آلہ۔ چنانچہ ہم نے اپنی یادداشت کے بل بوتے پر ہی ساٹھ ستر صفحے کالے کر لیے۔ شفیق الرحمٰن طبعاً درویش آدمی ہیں سوائے بھنگ پینے کے ان میں تمام خوبیاں ملنگوں والی ہیں۔ بہاولپور کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے سرائیکی اشعار بھی سناتے ہیں جو ان کے منہ سے بھلی لگتی ہے جیسے کوئی انگریز اردو میں بات کر رہا ہو۔

ایک بہت خوب صورت بھرے پُرے گھر کا ایک چھوٹا سا کمرا ان کی کل کائنات ہے باقی گھر انھوں نے اس چھوٹے سے کمرے کو اس گھر میں رکھنے کے لیے بنوایا ہے۔ ان کا کمرا اپنی سادگی میں کمرا کم اور حجرہ زیادہ لگتا ہے سوائے مولوی، صف اور لاؤڈ اسپیکر کے پورا ماحول حجروں والا ہے۔ کوئی فالتو چیز نظر نہیں آتی حتیٰ کہ ان کے فوجی تمغے اور اعزازات بھی کمرے سے باہر ایک میز پر سجے اس طرح رکھے ہوئے ہیں، جیسے انہیں کمرے میں داخلے کی اجازت نہ مل سکی ہو۔

بارش کے باعث باہر جا کر نہ دوڑ سکیں تو گھر میں ہی بھاگ دوڑ کر لیتے ہیں اپنے پورچ کو انھوں نے پہلے ہی ماپ رکھا ہے کہ کتنے چکر کا ایک میل بنتا ہے۔ اور کتنے میلوں کے بعد چکر شروع ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کا تعلق ادب سے کم اور ریاضی سے زیادہ ہے، آپ نے پوری

زندگی ہر کام ناپ تول کر حساب کتاب سے کیا حتی کہ کتاب بھی حساب سے پڑھتے ہیں پتا نہیں حساب کی کتاب کے ساتھ کیا کرتے ہوں گے۔ آپ کی آؤٹ ڈور سرگرمیوں میں سب سے اہم پنڈی صدر کے ہفتہ وار کتاب بازار سے ہفتے بھر کے لیے کتابیں خریدنا ہے، کتابیں آپ اتنی باقاعدگی سے ایسے خرید کرلاتے ہیں جیسے لوگ باگ سبزی ترکاری، پھر وہ کتاب پڑھ کر اپنے خرچ پر دوستوں کو بھجوا دیتے ہیں اگر وہ سب کتابیں ان کے ہاں ہوتیں تو یہ کہیں اور ہوتے۔ راولپنڈی اسلام آباد میں کوئی کتب فروش ایسا نہیں جسے آپ نے کتاب خریدنے کے اعزاز سے محروم رکھا ہو۔ ان میں سے بہت سے کتابیں بیچ بیچ کر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ مگر ایک آپ ہیں کہ کتابیں ہی خریدے جا رہے ہیں۔ آپ کی شاندار صحت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ ٹی وی کسی بھی حال میں نہیں دیکھتے۔ اپنی قسم کے شفیق الرحمٰن میں سے ایک ہی رہ گئے ہیں۔

* *

اگر شیطان مرجائے!

عطاء اللہ سجاد

میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ زمانہ مردہ پرست واقع ہوا ہے۔ جب تک کوئی شخص زندہ رہتا ہے، اُس کے خلاف ہزاروں زبانیں زہر اُگلتی ہیں۔ وہ اپنی بدکاریوں، غداریوں اور بے ایمانیوں کے لیے انگشت نمار ہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اِن الزامات کی صداقت اور عدمِ صداقت کا امتحان نہ لیا جائے۔ لیکن موت اُس کے تمام عیبوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اُس کے مخالفین جب یہ سنتے ہیں کہ وہ دنیا کی فضا میں آخری سانس لے چکا ہے تو اُن کا لب ولہجہ فوراً بدل جاتا ہے۔ اور وہی شخص جو کچھ عرصہ پہلے اُن کی نظر میں دنیا جہان کی بُرائیوں کا منبع ہوتا ہے، دفعتاً حُسنِ اخلاق اور دیانت کا دلکش پیکر بن جاتا ہے۔ اس دلچسپ تمثیل کا ایک پہلو یہ ہے کہ مرنے والا خود اِس مدحت سرائی سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ اور شاید اُس کے دشمن دل ہی دل میں کہتے ہوں کہ وہ ایک ایسے جہان میں پہنچ گیا ہے، جہاں ہماری آواز اُس تک نہیں پہنچ سکتی، اس لیے ہمیں اس بات کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے منہ سے اپنی تعریفیں سُن کر غرور سے سربلند کر سکے۔

آپ اور آپ کے دوست کسی شخص کو تمام عمر حد درجہ کا بخیل اور کنجوس مشہور کرتے رہیں گے، لیکن جب وہ موت سے ہم کنار ہو جائے گا تو آپ ہی میں سے کوئی شخص کہہ اُٹھے گا، ”حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا۔“ دوسرے صاحب فلسفیانہ انداز میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہیں گے، ”بھائی وہ آدمی بڑا دانا تھا، شہدوں کی طرح دولت لٹاتا نہیں تھا۔ اُس کا اُصول تھا کہ دولت کی نمائش کم ظرفوں کا کام ہے۔“ تیسرے صاحب کہتے ہیں، ”لوگ کہتے ہیں، وہ دل کا بڑا سخی تھا۔ آج تک کوئی سائل دروازے سے واپس نہیں گیا۔“ اور اِس موقع پر وہ اپنی طباعی سے فائدہ اُٹھا کر مرحوم کی سخاوت کے دو تین قصے ارتجالاً گھڑ دیتے ہیں۔ اور لوگ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ دنیا اپنا بہترین انسان کھو چکی ہے۔

محلّہ کے مولوی صاحب تمام عمر کسی آدمی کو کرستان، بے ایمان اور دوزخی کہتے رہیں۔ اُن کی زبان اُس کے خلاف سالہا سال تک تکفیر اُگلتی رہے، لیکن وہ مرجاتا ہے تو مولوی صاحب خود اُسے غسل دیتے ہیں، اُسے کفناتے ہیں اور اُس کے بعد اپنے مقتدیوں کے سامنے مہینوں اُس کا ذکر کرتے ہیں۔ ”واللہ! کیا مسلمان تھا۔ موت کے بعد چہرے پر جلال اور انوار کی بارش ہوتی رہی۔ مرتے وقت زبان پر کلمۂ شہادت تھا۔ مجھ سے کہنے لگے، مولوی صاحب میرے کلمے کے گواہ رہیو۔“

سیاسی لیڈر اپنے مخالفین سے ہمیشہ لفظی جنگ میں مصروف رہتے ہیں۔ اُسے ملک کا غدار اور ملت کا دشمن بتاتے ہیں، لیکن جب وہ مرجاتا ہے تو ایک عظیم الشان جلسہ، جس میں انسانی سروں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا ہے، منعقد کیا جاتا ہے۔ اُس میں مرحوم کی مِلّی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے، پسماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا مانگی جاتی ہے اور عوام کو بتایا جاتا ہے کہ قصرِ قومیت کا ایک بہت بڑا ستون گر پڑا۔

اِنہی حقائق کے پیشِ نظر میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر شیطان آج مرجائے تو دنیا والوں کا ردِ عمل کیا ہو۔ شیطان ہی ایک ہستی ہے، جسے خدا، اُس کے فرشتوں اور کائناتِ انسانی نے ہمیشہ ملعون و مغضوب قرار دیا ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں کے لغات میں جس قدر ملامت کے الفاظ ہیں، وہ تمام شیطان پر صرف کیے جاتے ہیں۔ شیطان اگر آج فنا کا جام پی لے تو اُس کے متعلق دنیا کا نقطۂ نظر یقیناً بدل جائے گا۔ آج جس قدر برائیاں شیطان کے سر تھوپی جارہی ہیں، تقریباً اُس سے دوگنی نیکیوں کا سہرا اُس کی لاش پر باندھا جائے گا۔ دنیا کے اِس سرے سے اُس سرے تک ایک جوش پھیل جائے گا۔ بڑے بڑے اخبار نویس، شاعر، فلسفی، عالم اور سیاسی لیڈر شیطان کو خراجِ تحسین ادا کریں گے۔ عوام ایک دوسرے سے اُس کی صفات بیان کریں گے:

”اجی کیسا دل گردے والا تھا۔ خدا اور اُس کے سارے فرشتوں کے مقابلے میں آخر تک ڈٹا رہا۔ وہ تو عزرائیل نے موقع پا کر دبوچ لیا، ورنہ یوں مرسکتا تھا؟!“

”آدم کو سجدہ کرنے کی بات ہی کیا تھی۔ اتنی سی بات پر خدا سے بگڑ گئی۔ وہ دن اور یہ دن، یہ خدا کی مخالفت سے باز نہیں آیا۔“

ایک فلسفی اخبار کے نمائندے کو بیان دیتے ہوئے فرمائیں گے:

”دنیا ایک ایسی قوت سے محروم ہوگئی ہے، جس نے کائنات کا توازن برقرار رکھا ہوا تھا۔

رنگِ ادب دہلی

شیطان کی عظمت کا اِس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اُس نے آدم کو جنت کی بے عمل اور بے کیف زندگی سے نکال کر اُسے حیات کی لذتوں اور اور رنگینیوں سے روشناس کرایا، اُس کی موت سے زندگی پھر نیکیوں کا گہوارہ بن جائے گی۔ اگر ہم نے شیطان کی رُوح کو برقرار نہ رکھا تو مجھے ڈر ہے کہ دنیا ہنگاموں سے خالی ہو جائے گی اور ہم جمود اور بے حسی کے اُسی جال میں گرفتار ہو جائیں گے، جس سے ابتدائے آفرینش میں حضرتِ شیطان نے ہمیں نجات دلائی تھی۔"

ایک اخبار نویس اُس کی موت پر یوں تبصرہ کریں گے:

"حضرت عزازیل سے ہمیں ذاتی تعارف حاصل تھا، اُن کی موت کی خبر قارئین کو پہنچاتے وقت ہمارا دل غم سے فگار ہو رہا ہے۔ وہ دنیا کے سب سے پہلے اخبار نویس تھے اور پروپیگنڈا کا فن اُن کی طباعی کا مرہونِ منت تھا۔ انہوں نے حوّا کو بہکا کر آدم اور حوّا کے خلاف جو کامیاب پروپیگنڈا کیا، اُس کا نتیجہ آج آپ کو اور ہمیں اس وسیع و عریض کائنات کی صورت میں نظر آرہا ہے۔ حضرت عزازیل کی تمام عمر اِدھر اُدھر پروپیگنڈا کرتے گزری۔ وہ اخبار نویسوں کے لیے منبع الہام تھے۔ اُن کی وفات صحافتی برادری کے لیے ایک صدمۂ جانکاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔"

بذلہ سنج شاعر اُس پر دل سوز نظمیں لکھیں گے۔ اور تو اور علماء کے طبقے میں بھی ہلچل مچ جائے گی اور وہ کہیں گے:

"شیطان لوگوں کو گمراہ کر کے ہمیں اس بات کا موقع دیتا تھا کہ ہم کفر کے فتووں کے لٹھ سے اُن کی اصلاح کریں، لیکن اُس کی موت نے ہم سے یہ مؤثر طریقہ چھین لیا ہے۔ وہ مر چکا ہے، اب دنیا میں حکومت نیکی کی ہوگی۔ افسوس کہ اب تقریریں کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی موضوع نہیں رہا۔"

سیاسی لیڈروں کو یہ خیال ستائے گا کہ شیطان کی موت سے سیاست کا بازار سرد پڑ جائے گا اور اس بات کا اثر لازمی طور پر ہماری اقتصادی حالت پر ہوگا۔ دنیا کے جنگجو ڈکٹیٹر اس بات پر افسوس کریں گے کہ اب جنگ کے لیے بہانے تراشنے کا فن انھیں کون سکھائے گا۔ وہ حسرت سے اپنے آلاتِ حرب پر نظر کریں گے اور 'ہائے شیطان' پکار کر خاموش ہو جائیں گے۔ البتہ فرشتے ضرور اس واقعہ پر مسرور ہوں گے اور سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے کہیں گے، "اچھا ہوا مر گیا۔ کم بخت نے بہت پریشان کر رکھا تھا۔ اب جب تک خدا کوئی نیا شیطان نہیں بناتا، ہم آرام کریں گے۔"

کرنا نظامت مشاعروں کی!

عظیم اختر

قارئین کرام! آپ میں سے اکثر حضرات کی طرح ایک زمانے میں ہم بھی مشاعروں کی نظامت کو ہلکا پھلکا کام سمجھتے تھے اور شاعری کی اصطلاح میں اسے سہلِ ممتنع کہا کرتے تھے... لیکن جب اونٹ پہاڑ کے نیچے سے گزرا اور ایک بار بیٹھے بٹھائے ایک مشاعرے کی نظامت کا بار ہمارے کاندھوں پر آپڑا، تو اندازہ ہوا کہ یہ کام کٹھن اور دشوار گزار ہی نہیں، بلکہ بحرِ متدارک میں شعر کہنے کے برابر ہے۔ اور اِسے خوش اسلوبی سے نباہنا تلوار کی دھار پر چلنے اور جوئے شیر لانے کے برابر ہے، کیوں کہ آج کے عوامی ذوق کے پیشِ نظر نظامت کا بار اُٹھانے کے لیے نہ لائق وفائق ہونا ضروری ہے اور نہ شاعری پر گہری نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے، بلکہ شاعر اور سامعین کے درمیان تال میل پیدا کرنے کے لیے بس حاضر دماغی اور ذرا عوامی ذوق کے نچلے پائیدان پر کھڑے ہونے کی صلاحیت درکار ہے۔

بہر حال، زندگی میں جب پہلی بار ہمیں ایک مشاعرے کی نظامت کرنے کا تجربہ ہوا تو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ ہوا یوں کہ مغربی یوپی کے ایک قصبے میں (جہاں کے انٹر کالج میں بھی پروفیسر ہوا کرتے ہیں) ایک کل ہند مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا، جس میں ہندوستان بھر کے سکہ بند قسم کے تمام مشاعرہ باز شعرا موجود تھے۔ سُریلی آواز کے کیل کانٹوں سے لیس، ایک سے ایک مترنم اور خوش گلو شاعر، جن کے سامنے فلمی گیت گانے والوں کے چراغ ماند پڑ جائیں۔ اُردو والوں نے چوں کہ مشاعروں اور ہر قسم کے مذہبی جلسوں کی صدارت کے لیے وزیروں اور سیاسی رہنماؤں کو بلانا اپنا اوّلین فرض بنا رکھا ہے (ممکن ہے کسی ڈاکٹر یا حکیم نے نسخے میں لکھ دیا ہو) اس لیے اِس مشاعرے کی صدارت کا فریضہ بھی ایک سیاسی رہنما کو ادا کرنا تھا۔ تمام چھوٹے بڑے شاعروں کو گھیر گھار کر مشاعرہ گاہ میں لایا گیا۔ صدرِ محترم تشریف لائے۔ اُن کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور

سانس پھولا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کہیں سے رسّی تڑا کر بھاگے ہیں۔ آتے ہی بولے، "عظیم صاحب، مشاعرے کی نظامت آپ کریں گے۔" یہ درخواست، جو بلائے ناگہانی سے کچھ کم نہ تھی، سن کر ہم گھبرا گئے اور اپنی جان بچانے کے لیے مشورہ دیا کہ یہ خدمت کسی اور بہتر شاعر کو سونپ دیں، لیکن وہ بضد تھے کہ نظامت ہم ہی کریں۔ اُن کا خیال تھا کہ شاعروں کے اس مجمع میں مشاعرہ چلانے کے لیے ہم سے بہتر کوئی اور نہیں، کیوں کہ ہم اچھے خاصے شاعر ہیں، ڈاکٹر ہیں، یونیورسٹی میں لڑکوں کو پڑھاتے ہیں اور سامعین پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اپنی تعریف اور واہ واہ کے جنم جنم سے بھوکے، اپنی تعریف سن کر کون نہیں پھولتا، ہم تو ٹھہرے شاعر۔

کنوینر نے مشاعرے کے آغاز کا اعلان کرتے ہوئے نظامت کے لیے ہم سے باقاعدہ درخواست کی۔ ہم اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے مائیک پر آئے، منتظمینِ مشاعرہ کا شکریہ ادا کیا اور گوٹے کا چمکیلا ہار، جو غالباً اس سے پہلے بھی بہت سے صدروں کے گلے کا ہار بن چکا تھا، سامعین، شعرائے کرام اور منتظمین کی جانب سے صدر صاحب کے گلے میں ڈالا گیا۔ تالیاں بجیں، روشنی کے جھپاکے ہوئے اور فوٹو کھنچے۔

صدرِ محترم اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد ہم نے صدرِ محترم اور اہلِ قصبہ کی ادب دوستی، شعر فہمی، شاعر نوازی اور علم و فضل کی بیکرانی کی تعریف کی اور منتظمینِ مشاعرہ کے ذوق و شوق اور لگن کو بھرپور الفاظ میں سراہا، حالاں کہ حقیقت تو یہ تھی کہ ہم اس قصبے میں پہلی بار گئے تھے، صدرِ محترم کا نام بھی پہلی بار سنا تھا، لیکن ہمیں آئندہ کے مشاعروں میں بلائے جانے کے لیے بھی تو میدان ہموار کرنا تھا۔ ان روایتی کارروائیوں کے بعد ہم نے دل پر جبر کر کے تقدیم و تاخیر کو خیرباد کہا اور اپنی غزل سے مشاعرہ کا آغاز کیا (ویسے ناظمِ مشاعرہ کو ایسا ہی کرنا چاہیے، کیوں کہ اس وقت سامعین مشاعرہ گاہ میں آنے اور بیٹھنے میں مشغول ہوتے ہیں اور بیداد سے بآسانی محفوظ رہا جا سکتا ہے)۔ مشاعرہ کا باقاعدہ آغاز کر کے ابھی دو تین شاعروں کو ہی پڑھوایا تھا کہ ہمیں احساس ہوا کہ مشاعرہ جم نہیں رہا ہے اور سامعین بے کیفی کا شکار ہو رہے ہیں۔ چنانچہ مشاعرہ کو اُٹھانے کی خاطر ہم نے ترپ کا ایک پتا پھینکا اور ایک نہایت ہی مترنم اور خوش گلو شاعر کو زحمتِ سخن دی۔ شاعر موصوف نہایت ہی بے نیازانہ انداز سے مائیک پر آئے، بالوں میں انگلیاں پھیریں اور کمر پر ہاتھ رکھا۔ آنکھیں بند کر کے پہلے تو دھیمے سُروں میں گنگنائے اور پھر جو پانچویں سُر میں مصرعہ اُٹھایا تو

نجانے کیا ہوا، کمبخت گلے کی غراریوں نے ساتھ چھوڑ دیا، آواز سُر تال سے بے نیاز ہوگئی۔ سیٹیاں بجنے لگیں اور بیداد کی ایک تیز لہر ہال میں دوڑ گئی اور یہ حضرت جھینپ کر مائیک سے سرک گئے۔ ہم نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اعلان کیا کہ حضرات، چوں کہ ہمارے دوست ایک لمبا سفر کر کے آئے ہیں، اس لیے ابھی تھکے ہوئے ہیں۔ ابھی ہم یہ اعلان کر ہی رہے تھے کہ بیک وقت کئی آوازیں آئیں، ''لطیفہ... لطیفہ''۔ ہم نے یہ سوچا کہ ماچس، سگار، پیکاں اور شوہر کی طرح یہ حضرت بھی کوئی شاعر ہوں گے، جن سے ہم واقف نہیں، اس لیے فوراً ہی حضرتِ لطیفہ کے نام کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان ہونا تھا کہ شامیانے میں فلک شگاف قہقہے بلند ہوئے، تالیاں بجنے لگیں، ایک افراتفری کا عالم برپا ہوگیا اور ہم ٹپٹا کر رہ گئے۔ ہمارے قریب بیٹھے ہوئے کنوینر مشاعرہ ہمارے کانوں میں پھسپھسائے، ''اوہ! یہ کیا غضب کر ڈالا آپ نے۔ حضرت لطیفہ سنایئے، لطیفہ، ارے بھائی چٹکلہ۔''

''لطیفہ؟ کیسا لطیفہ؟'' ہم نے بے چارگی سے کہا۔

''ارے لطیفہ، لطیفہ ہوتا ہے۔ کوئی دلچسپ سا جوک۔ یہاں مشاعروں میں لطیفے بھی سنائے جاتے ہیں۔'' وہ بولے۔

''بھئی ہمیں لطیفے وطیفے نہیں آتے۔'' ہم منمنائے۔

''ارے آپ یونیورسٹی میں کیا پڑھاتے ہیں، آپ کو لطیفے بھی نہیں آتے۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد تو نظامت کے دوران بڑے دلچسپ لطیفے سناتے ہیں۔ پچھلے سال بشیر بدر نے بھی لطیفے سنا کر مشاعرہ جما دیا تھا۔''

صاحبِ صدر خاموشی سے ہم دونوں کی گفتگو سن رہے تھے۔ شور بڑھتا جا رہا تھا کہ اچانک وہ اُٹھے اور مائیک پر پہنچ کر سامعین کو خاموش رہنے کی تلقین کرتے ہوئے مختصر سی تقریر کی اور دورانِ تقریر دو تین لطیفے جھاڑ دیے۔ صدرِ محترم کی اس بروقت تقریر سے نہ صرف مجمع شانت ہوگیا، بلکہ ہم بھی اپنے حواس کو مجتمع کر کے ذہن کے گوشوں سے چند گم گشتہ لطیفوں کو باہر نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔ ہماری یہ کامیابی سراسر صدر صاحب کی ذہانت اور موقع شناسی کی رہینِ منت تھی، حالاں کہ سیاست میں موقع شناسی تو عام ہے، لیکن ذہانت کہاں ہوتی ہے۔ خدا اُن کو سلامت رکھے اور ہر چھوٹے بڑے الیکشن میں کامیاب کروائے، تا کہ وہ اسی طرح مشاعروں کی

صدارتیں کرتے رہیں۔

بہر حال، قارئین کرام، لطیفوں اور چٹکلوں کی بدولت سامعین کی بیداد بڑی حد تک کنٹرول میں آ چکی تھی اور اب سامعین لطیفوں کے ساتھ ساتھ اشعار بھی دلچسپی سے سننے لگے تھے۔ ابھی بمشکل دو تین شاعر ہی پڑھ پائے تھے کہ صاحبِ صدر نے جھک کر ہمارے کان میں کہا، ”شاعر جی! فکر مت کرو، مشاعرہ جمنے لگا ہے۔ تم بس شاعروں کے نام پکارتے رہو، میں بیچ بیچ میں لطیفے سناتا رہوں گا۔“ لطیفہ گوئی میں صدرِ محترم کے کمال کی جھلک تو ہم دیکھ ہی چکے تھے، اس فرمان نے دل و حواس کو مزید تقویت پہنچائی اور پھر اُس کے بعد تو یہ ہوا کہ اِدھر ہم نے شاعر کے نام کا اعلان کیا اور اُدھر شاعر کے مائیک تک پہنچتے پہنچتے صدر صاحب نے لطیفہ داغا۔ اس بیچ ہمارے ذہنِ زرخیز نے بھی فی البدیہہ لطیفے گھڑے اور سامعین کو خوب ہنسایا۔ اس طرح صدرِ محترم کے تعاون کے ساتھ ہم نہایت کامیابی سے مشاعرہ چلاتے رہے اور جب مشاعرہ ختم ہوا تو سامعین پر لطیفوں کا خمار طاری تھا۔

خبریں اور خوشبو پَر لگا کر اُڑتی ہیں۔ اسی طرح ہماری نظامت کی کامیابی کی خبر بھی پَر لگا کر اُڑی اور اس طرح اُڑی کہ ہم تھوڑے ہی عرصے میں ایک اچھے ناظمِ مشاعرہ کی حیثیت سے شہرت پا گئے۔ گو اس میں ہمارے سیلف پبلسٹی کے طریقوں کو بھی دخل حاصل ہے۔ بہر حال، اب ہم ناظمِ مشاعرہ کی حیثیت سے بھی مشاعروں میں بلائے جانے لگے ہیں۔ چوں کہ نظامت کے پیسے الگ سے دیے جاتے ہیں، اس لیے اس مالی منفعت کو برقرار رکھنے کے لیے اب ہم اپنی شاعری سے زیادہ لطیفوں کے کلیکشن اور سلیکشن پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور اخبارات و رسائل میں لطیفوں کا کالم بڑے غور سے پڑھتے ہیں۔ اچھے لطیفوں کے لیے خواتین اور بچوں کے رسائل بالخصوص زیرِ مطالعہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ لطائف کی نئی نئی کتابیں بھی ڈھونڈتے ہیں اور اُن پر بھوکوں کی طرح لپکتے ہیں۔ لطیفوں کی کتابوں کی تلاش کے دوران ہم کو ایک نہایت ہی معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے محترم دوست ملک زادہ منظور احمد اور برادرم بشیر بدر بھی لطیفوں کی کتابیں باقاعدگی سے خریدتے ہیں۔ گمانِ غالب ہے، یہ حضرات اپنے بچوں کے لیے یہ کتابیں خریدتے ہیں، ممکن ہے فرصت کے اوقات میں تفریحِ طبع کے لیے خود بھی پڑھ لیتے ہوں۔ ویسے ہم ان حضرات کی بذلہ سنجی کے قائل ہیں، کیوں کہ ہم نے اُن کی نظامت میں بہت سے مشاعرے پڑھے ہیں اور سامعین کو

اُن کے لطائف پر دل کھول کر ہنستے ہوئے دیکھا ہے۔

بہر حال، ہم اچھے اور دلچسپ لطائف تلاش کر کے ایک بیاض میں نقل کر لیتے ہیں اور مشاعروں میں شرکت کے لیے جاتے ہیں تو خواہ غزلوں کی بیاض بھول جائیں، لطائف کی بیاض لے جانا ہرگز نہیں بھولتے، کیوں کہ ہماری کامیابی کا دارومدار تو صرف اسی بیاض پر ہے۔ ویسے بھی مشاعروں کے منتظمین دوسروں کے مقابلے میں ہم کو اِسی لیے ترجیح دیتے ہیں کہ ہمارے پاس لطیفوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ ہم پرانی غزل پڑھنا معیوب نہیں سمجھتے، لیکن ایک مشاعرے میں سنائے ہوئے لطیفے، دوسرے مشاعرے میں سنانا معیوب اور اخلاقی جرم سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے مشہور لطیفہ گو عمر شریف کی طرح ہماری شہرت اور مقبولیت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن ہم کبھی کبھی سوچتے ہیں کہ خدانخواستہ اگر عمر شریف ہندوستان میں ہوتا تو شاید ہندوستان کے چھوٹے بڑے تمام مشاعروں کی نظامت اُسی کے حصے میں آتی۔ اُس وقت ہمارا اور ہمارے دوستوں کا کیا حال ہوتا۔ ممکن ہے ہمیں اس سے مقابلہ کرنے کے لیے ایکٹنگ کا سہارا لینا پڑتا۔ ویسے سامعین کے شعری ذوق اور معیار کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ دن دور نہیں، جب آپ ہم لوگوں کو مشاعروں کی نظامت کے دوران لطیفے سناتے ہوئے اور ایکٹنگ کرتے ہوئے بھی دیکھیں گے!

* *

میں خودکشی کرنے چلا!

عظیم سرور

خودکشی کے بارے میں یہ بات بہت مشہور ہے کہ یہ وہ فعل ہے کہ اس کا کرنے والا کامیاب ہوجائے تو اُسے کچھ نہیں کہا جاسکتا اور ناکام ہوجائے تو مجرم قرار پاتا ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اقدامِ خودکشی کے جرم کا مرتکب ہوا؛ لہٰذا اسے سزا دی جائے۔ بظاہر بات یونہی نظر آتی ہے، لیکن ہم کبھی اس قسم کی سزا پر غور کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ایک ہی بات آتی ہے کہ اس شخص کو مجرم اس بات پر ٹھہرایا گیا ہے کہ اے شخص تُو نے ہمارا پیچھا کیوں نہ چھوڑا۔

ناکامِ خودکشی کو ایک سزا یہ بھی ملتی ہے کہ اُس کی پبلسٹی خاطر خواہ نہیں ہوتی۔ عوام الناس گزرے ہوئے لوگوں کے سکنڈل زیادہ دلچسپی سے سنتے اور پڑھتے ہیں اور اخبار والے ایسے شخص کے بارے میں سوچتے ہیں کہ ابھی تو یہ زندہ ہے اور زندگی ہے تو ابھی اور پشیمان ہوگا۔

کچھ لوگ خودکُشی کا تلفظ رستہ گشی، نقشہ گشی کی طرح خودکشی ادا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے ہماری اکثر نوک جھونک ہوجاتی ہے۔ ایک صاحب نے یہی لفظ رسہ گشی کی طرح کہا تو ہم نے اُن سے پوچھا۔

”یہ خودگشی کیا ہوتا ہے۔“

بولے، ”سوسائڈ۔“

ہم نے کہا، ”سوسائڈ کو تو خودگشی کہتے ہیں۔“

کہنے لگے، ”پھر خودگشی کے کیا معنی ہیں؟“

ہم نے بتایا، ”اپنے آپ کو کھینچنا۔“

بہت حیران ہوکر بولے، ”اپنے آپ کو کھینچنا؟ کیا معنی ہوئے اس کے؟“

ہم نے ان کی حیرانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تفصیل سے سمجھایا کہ دیکھو جس طرح ایک

گدھا، گدھا گاڑی کو کھینچتا ہے نا اسی طرح اگر آدمی اپنے آپ کو کھینچتا ہے تو اس کو خودکشی کہتے ہیں۔"

یہ ہماری تمثیل کی خوبی تھی یا گدھے کا تذکرہ بات، اُن کی سمجھ میں فوراً آ گئی اور اُن کی باچھیں بھی کھل گئیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خودکشی کا اقدام کرنے والوں میں زیادہ تر لوگوں کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ وہ بچا لیے جائیں گے۔ ایسے لوگ اقدامِ خودکشی کے ذریعے ہمدردی، تھوڑی بہت پبلسٹی اور اپنے رشتے داروں کی پریشانی کا لطف اُٹھانا چاہتے ہیں۔ بعض لوگوں کی تحریروں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ ایسے اشخاص 'خودکشی کرنے سے پہلے' کے عنوان سے ایک خط لکھتے ہیں اور اُسے اِس یقین کے ساتھ سرہانے رکھ کر اقدامِ خودکشی کر لیتے ہیں کہ کم از کم یہ ایک تحریر تو ایسی ہے کہ اسے پوری دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ رہی جان کی بات تو اُس کے بارے میں وہ سوچتے ہیں۔ یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں۔

ہمارے ایک دوست ہیں جو اقدامِ خودکشی کے دائمی مریض ہیں۔ دس پندرہ مرتبہ کوچہ خودکشی کے چکر لگا چکے ہیں، لیکن روایتی عاشقوں کی طرح اتنے بدقسمت واقع ہوئے ہیں کہ سوائے چند دوستوں کے جن کو اُنہوں نے فرداً فرداً یہ اطلاع خود بہم پہنچائی، کسی اور کو اُن کی خودکشی کی خبر تک نہ ہوئی۔

ایک مرتبہ رات کو ہمارے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا، گیلے کپڑے پہنے کھڑے ہیں۔ ہم ابھی حال پوچھنے کے لیے ذہن میں سوال مرتب کر ہی رہے تھے کہ بولے:

"لو پیارے! سمندر نے بھی ہمیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔"

ہم نے پوچھا، "کیا مطلب؟"

بولے، "اندر چلو تو بتاتا ہوں۔"

کمرے میں بیٹھ کر اُنہوں نے کوچہ 'خودکشی سے جہاں وہ سر کے بل گئے تھے ناکام پلٹنے کا قصہ بیان کیا، کہنے لگے:

"میں بہت اُداس تھا۔ پریشان تھا۔ میں ظالم سماج سے دُور بہت دُور سکھ کے گاؤں میں چلا جانا چاہتا تھا۔ میں ایک کشتی میں بیٹھ کر منوڑے کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کشتی ڈوب

جائے گی، لیکن اُس کے چاروں ملاح بہت ماہر تھے۔ منوڑے پر میں اِدھر اُدھر گھومتا ہوا اپنی بدقسمتی کا ماتم کرتا رہا۔ ایک جگہ سے میں نے پکوڑے خرید کر کھائے کہ شاید انہی کے کھانے سے مر جاؤں لیکن ہائے بدقسمتی... شام ہوگئی تھی، سایہ بھی میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ واپسی پر میں پھر بڑی اُمیدوں کے ساتھ کشتی میں بیٹھا، لیکن ساحل قریب سے قریب تر آ رہا تھا اور کوئی طوفان نہ اُٹھ رہا تھا۔ کوئی گرداب نہ تھا۔ آخر جب کیماڑی کی گودی چالیس پچاس گز ہی رہ گئی، تو مجھ سے صبر نہ ہوا۔ میں نے جلدی جلدی تسمے کھولے، جوتے اُتارے، جرابیں اُتاریں۔ جیب سے پین اور بٹوہ نکال کر ایک جوتے میں رکھا۔ پھر میں نے آنکھیں بند کیں اور آہستہ سے ”خدا حافظ اے ظالم دنیا!“ کہہ کر سمندر میں چھلانگ لگا دی، لیکن آہ... میرے پیچھے ہی کشتی کا ایک ملاح سمندر میں کود پڑا اور مجھے گردن سے پکڑ کر اوپر اُٹھا لایا۔ باقی دو ملاحوں نے مجھے کشتی میں کھینچ لیا۔ جب میرے ہوش بجا ہوئے، تو وہ سب بولے:

”تم کو کیا ہوگیا تھا۔ یہ کوئی نہانے کا جگہ ہے؟“

”میں نے اُن سے کہا کہ بھائی میں تو اس ظالم دنیا سے بہت دُور جانا چاہتا تھا۔“ ایک ملاح بولا، ”دُور جانا چاہتا ہے تو جہاز میں جاؤ نا۔ کشتی تو اتنا دُور نہیں لے جا سکتی۔“

میں اپنی بدقسمتی پر تڑپ کر رہ گیا۔ ہائے یہ کم بخت، یہ بھی نہیں جانتے کہ میں نے خودکشی کے ارادے سے سمندر میں چھلانگ لگائی تھی۔ تو بھائی، میں نے جرابیں پہنیں، جوتے پہنے اور سیدھا تمہارے ہاں آ گیا۔ تم ہی میرے ایک غمگسار ہو۔“

ہمارے اِن دوست کی خودکشیوں کی اگر فلمیں بنائی جائیں تو کئی سیریز بن سکتی ہیں۔ مثلاً سمندر والے سانحے کو "Suicide by SEA" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ان کی ایک کوشش پر مبنی "Suicide by Road" فلم بھی بن سکتی ہے۔ اس کا کلائمکس وہ منظر ہو سکتا ہے جس میں یہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ پھر جب پچاس ساٹھ میل تک گھوم لیے تو ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا:

”صاحب، آپ کو جانا کہاں ہے؟“

بہت غمزدہ لہجے میں بولے، ”دیکھو! ٹیکسی کو کسی اونچی جگہ لے جا کر کھڈ میں گرا دو۔ میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں۔“

خودکشی کرنے والے، ہمارے ان دوست سے بھی زیادہ دلچسپ کردار ہو گزرے ہیں۔ ایک صاحب کسی ویران علاقے میں ایک پوٹلی لیے ریل کی پٹڑی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی راہ گیر کا وہاں سے گزر ہوا۔ اُس نے پوچھا، ’’یہاں کیوں بیٹھے ہو؟‘‘ جواب ملا، ’’خودکشی کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

راہ گیر نے پوچھا، ’’اور یہ پوٹلی میں کیا ہے؟‘‘

بولے، ’’روٹی ہے۔‘‘

راہ گیر حیران ہوا، ’’روٹی کس لیے لائے ہو۔‘‘

بگڑ کر بولے، ’’اگر ٹرین لیٹ ہو گئی، تو روٹی تمہارا باپ کھلائے گا؟‘‘

خودکشی کے لیے بے شمار چیزیں ہیں۔ مینار، عمارتیں سمندر، دریا، ریل، پیرس میں نوجوان ایفل ٹاور سے چھلانگ لگانا عین فیشن سمجھتے ہیں۔ لاہور میں لوگ بادشاہی مسجد کے مینار کو یہ سعادت بخشتے رہے ہیں۔ نئے زمانے کے پڑھے لکھے لوگ اس مقصد کے لیے خواب آور گولیاں استعمال کرتے ہیں۔ کچھ لوگ جو اپنے دل میں آگ سی سلگتی محسوس کرتے ہیں، مٹی کا تیل پی کر اس آگ کو بھڑکانا چاہتے ہیں۔ کچھ ڈی، ڈی ٹی پی لیتے ہیں کہ چلو مر گئے تو کیا کہنا اور زندہ رہے تو اندر کے جراثیم تو مر ہی جائیں گے۔ بعض دقیانوسی لوگ نیلا تھوتھا بھی کھا گزرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی چند ایسے بھی روایت پسند ہیں جو اب بھی خودکشی کے لیے رسی کا پھندا استعمال کرتے ہیں۔

ایک صاحب کو دیکھا کہ رسی کا پھندا پیروں میں ڈال کر کمرے میں کھڑے ہیں۔ پوچھا، ’’یہ کیا ہو رہا ہے جناب؟‘‘

بولے، ’’خودکشی کر رہا ہوں۔‘‘

عرض کیا، ’’خودکشی کرنی ہے، تو پھندا گلے میں ڈالو۔‘‘

بڑی معصومیت سے بولے، ’’پہلے گلے ہی میں ڈالا تھا، لیکن ذرا تکلیف ہو رہی تھی۔‘‘

ہمارے ایک بہت ہی پیارے دوست ہیں اُن کے منہ سے ہم نے آج تک خودکشی کا لفظ نہیں سنا۔ جانے کیوں وہ خودکشی کو خوشخطی کہتے ہیں۔ کئی بار ہم نے اُن سے سنا ہے، کہتے ہیں، ’’عظیم! کل جی چاہا کہ نیٹی جیٹی کے پل سے چھلانگ لگا کر خوش خطی کر لوں۔‘‘

خودکشی کے اور بھی کئی دلچسپ نام رکھے جا سکتے ہیں، بلکہ ہم آپ سے اپیل کریں گے کہ ضرور ایسے ہی نئے نام تلاش کیجیے تا کہ اس خودکشی سے چھٹکارا ملے اور ڈاکٹروں، حکیموں وغیرہ تم

خودکشی کرنے والے شخص سے ڈاکٹر حضرات بہت ناراض ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ''صاحب آخر ہم کس لیے یہاں بیٹھے ہیں؟!'' ہمارے ایک دوست تو یہاں تک کہتے ہیں کہ پوسٹ مارٹم وغیرہ تو نام ہے اصل میں اس کے ذریعے تو خودکشی کرنے والے سے انتقام لیا جاتا ہے!

* * *

ہم نے پہلی فلم دیکھی !

علی سفیان آفاقی

ہوش سنبھالنے کے بعد ہم نے جو پہلی فلم دیکھی اس کا نام 'کنگن' تھا۔ یہ نام ہمیں آج بھی یاد ہے بلکہ اس فلم کی تھوڑی بہت کہانی بھی یاد ہے۔ فلم کا ہیرو (جس کا نام ہمیں بعد میں پتا چلا کہ اشوک کمار تھا) فلم کی ہیروئن کے لیے کنگن لے کر آیا تھا مگر جب کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی یا کوئی اور مشکل پڑی تو ہیروئن یہ کنگن کمرے میں ایک میز پر رکھ کر خودکشی کرنے کے لیے سمندر پر چلی گئی۔ وہ ایک ساڑھی پہنے ہوئے تھی اور ساڑھی سمیت ہی سمندر کی طرف آگے ہی آگے بڑھتی رہی۔ ادھر ہیرو نے جب کنگن میز پر رکھے ہوئے دیکھے تو وہ بے تحاشا بھاگتا ہوا سمندر کی طرف گیا۔ نہ جانے اسے کس نے بتایا تھا کہ ہیروئن کنگن رکھ کر سیدھی سمندر میں جا کر ڈوب جائے گی۔ بہر حال ادھر وہ بھاگتا ہوا سمندر کی طرف جا رہا تھا، اُدھر ہیروئن ایک خواب میں چلنے والی ہستی کی مانند سمندر کی طرف جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ سمندر کے ساحل پر پہنچ کر بھی اس نے اپنا چلنا بند نہیں کیا اور اسی طرح آگے بڑھتی رہی۔ ہمیں ہیروئن کے ڈوب جانے کے خیال سے بہت ڈر لگ رہا تھا اور رونا بھی آ رہا تھا۔ ہم نے یہ فلم زنانہ کلاس میں کھڑے ہو کر دیکھی تھی کیوں کہ وہاں بیٹھنے کی تو کیا تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ یہ ایک بڑا سا باکس تھا جس میں لکڑی کی بینچیں بچھی ہوئی تھیں۔ اس باکس میں خواتین کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں اور ان ہی کے درمیان میں سے سر گھسا کر ہم فلم دیکھنے میں مصروف تھے۔ عورتیں مختلف اوقات میں مختلف قسم کے تبصرے بھی کر رہی تھیں۔ خصوصاً آخری سین میں تو سب کا غم اور فکر کے مارے بُرا حال تھا۔ اِدھر اسکرین پر یہ منظر تھا کہ کبھی ہیرو کو اندھا دھند بھاگتے ہوئے دکھایا جاتا تھا اور کبھی ہیروئن پر کیمرہ جاتا تھا جو پہلے پنڈلیوں تک، پھر گھٹنوں تک، اس کے بعد کمر تک، میں ڈوب چکی تھی مگر اس کے باوجود مسلسل آگے بڑھے جا رہی تھی۔ کئی لڑکیوں کا یہ خیال تھا کہ اچھی قیمتی ساڑھی خراب ہو رہی ہے مگر زیادہ تر خواتین بلکہ نیچے ہال میں مرد

تماشائی بھی سخت فکر مند تھے۔ عورتیں ہیرو پر ناراض ہو رہی تھیں۔ ”ارے کم بخت۔ جلدی کر۔ اب پہنچ بھی چک۔ ورنہ وہ بے چاری ڈوب جائے گی۔“

دوسری صاحبہ ہیروئن کو ڈانٹ رہی تھیں۔ ”ذرا صبر کر۔ آہستہ چل۔ وہ تجھے بچانے کے لیے بھاگا ہوا آرہا ہے۔“

تیسری آواز آتی، ”کیسی بہادر لڑکی ہے کہ سمندر سے نہیں ڈرتی۔ ڈوبے چلی جا رہی ہے۔“

لیکن جب ہیروئن کی گردن تک سمندر کا پانی پہنچ گیا تو سارے ہال میں خاموشی چھا گئی۔ زیرِ لب دعاؤں یا آہوں اور سسکیوں کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ آوازیں بھی بند ہو گئیں اور سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ہر ایک کی نگاہیں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں اور دلوں کی دھڑکن بند ہونے کے قریب تھی۔

ہیرو تھا کہ کسی طرح سمندر تک پہنچنے ہی نہیں پا رہا تھا اور ہیروئن تھی کہ مستقل آگے بڑھے جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کا سر بھی سمندر کے پانی میں ڈوب گیا۔ اب اس کی ساڑھی کا ایک اُبھرا ہوا پلو ہی رہ گیا تھا جو بڑے سے غبارے کی طرح سطحِ سمندر پر نظر آرہا تھا۔ دوسروں کا جو حال تھا وہ تو ہمیں معلوم نہیں کیوں کہ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی لیکن خود ہمارے دل کی دھڑکن بند ہونے کے قریب تھی اور جب ہیروئن کا صرف آنچل ہی پانی کے اوپر رہ گیا تو ہماری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ ہمارے آس پاس تمام خواتین کا بھی یہی حال تھا بلکہ ایک خاتون نے تو ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ پڑھ کر ہیروئن کی رُوح کو ایصالِ ثواب بھی پہنچا دیا حالاں کہ سب کو معلوم تھا کہ فلم کی کہانی کے مطابق بھی ہیروئن ہندو تھی اور اصل زندگی میں بھی ہندو تھی۔ (یہ ہمیں بعد میں پتا چلا تھا)۔

عین اسی وقت جب کہ ہیروئن کا آنچل سطحِ سمندر پر تیرتا ہوا نظر آرہا تھا، فلم کا ہیرو سمندر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہال میں مختلف آوازوں نے اسے مطلع کیا کہ ”وہ رہا آنچل۔ بائیں جانب، جلدی کرو، جان کی بازی لگا دو۔“

ہیرو بھی آخر کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ آخر ایک ہیرو تھا۔ اس نے بھی ہیروئن کا آنچل دیکھ لیا تھا اور سمندر میں کودنے کے بعد بہت تیزی سے اس طرف بڑھ رہا تھا۔ چند عورتوں نے پھر ایک بار دعائیں پڑھنی شروع کر دی تھیں۔ یہاں تک کہ ہیرو آنچل کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ایک غوطہ

لگایا اور پھر جب باہر نکلا تو ہیروئن اس کے بازوؤں میں تھی۔ فلم بینوں نے اطمینان کی سانس لی اور سارے ہال میں خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن ابھی پوری طرح یہ اطمینان نہیں ہوا تھا کہ ہیروئن زندہ بھی ہے یا مر گئی؟

ہیرو اسے اُٹھائے سمندر کے ساحل تک پہنچ گیا اور پھر اسے ریت پر ڈال کر اسے مخاطب کر کے مختلف مکالمے بولنے لگا۔

ایک آواز آئی، ”ارے کم بخت، یہ تو دیکھ لے کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر گئی؟“

نیچے سے ایک مردانہ آواز نے مشورہ دیا ”اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔ فوراً۔“

لیکن چند ہی لمحوں کے بعد ہیروئن نے آنکھیں کھول دیں اور ہیرو کو سامنے دیکھ کر بہت حیرت کا اظہار کیا۔ شاید اس قسم کے مکالمے بھی بولے کہ ”میں کہاں ہوں؟ مجھے تم نے کیوں بچایا ہے۔ مجھے مرنے کیوں نہیں دیا؟“

ان سب باتوں کے جواب میں ہیرو نے اپنی جیب میں سے کنگن نکالے اور ہیروئن کی کلائیوں میں پہنا دیے تو ہیروئن نے شرما کر ہیرو کے بازوؤں میں سر چھپا لیا اور فلم دیکھنے والوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ خواتین نے بآوازِ بلند خدا کا شکر ادا کیا ”شکر ہے کہ عین وقت پر پہنچ گیا ورنہ وہ بے چاری تو بے موت مر جاتی۔“

ہم نے اپنی آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھ لیے مگر آنسو پھر بھی جاری تھے۔ جب ہم بڑے ہوئے تو پتا چلا کہ یہ خوشی کے آنسو تھے۔

فلم ختم ہو گئی۔ فلم کے اندر ہیرو، ہیروئن خوش تھے اور سینما گھر میں دیکھنے والے بھی خوش و خرم تھے۔ اس کو فلمی زبان میں ’ہیپی اینڈنگ‘ کہا جاتا ہے۔ فلم ختم ہوتے ہی باہر نکلنے کے لیے دھکم پیل شروع ہو گئی۔ ہم اپنی جن کزنز وغیرہ کے ساتھ فلم دیکھنے گئے تھے وہ ہم سے بچھڑ گئی تھیں مگر فلم کے ختم ہوتے ہی انہیں ہماری یاد آ گئی اور انہوں نے ہمیں پکارنا شروع کر دیا۔ ہم بھی خواتین کی ٹانگوں کے نیچے سے راستہ تلاش کرتے ہوئے ان تک پہنچ گئے اور پھر گھر کی راہ لی۔

* *

غزل اور پاپ گانے والوں سے التماس!

علیم خان فلکی

اچھا ہوا ہم کوئی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نہیں، ورنہ تمام کلاسیکل گانے والوں کو بند کر دیتے اور اُس وقت تک بند رکھتے، جب تک کہ وہ یہ لکھ کر نہ دیں کہ آئندہ وہ کبھی غزل کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ اگر کسی شعر کا پہلا مصرعہ اچھا لگے تو ہم اِدھر دوسرا مصرعہ سننے کے لیے بے تاب ہوتے رہتے ہیں اور وہ کم بخت پہلے مصرعے کی ٹانگ ہی نہیں چھوڑتے۔ اکھاڑے میں جس طرح ایک طاقتور پہلوان اپنی دھاک بٹھانے کے لیے کمزور پہلوان کو لڑا لڑا کر اُس وقت تک مارتا رہتا ہے، جب تک وہ کمزور اور اُدھ مُرا نہ ہو جائے، یہ ظالم بھی اسی طرح ایک ہی مصرعے سے مسلسل کشتی کرتے رہتے ہیں اور ہم اُدھ مُرے ہو جاتے ہیں۔ جونہی ایک سُر ختم ہوتا ہے، ہم کو امید بندھ جاتی ہے کہ اب یہ دوسرا مصرعہ سنا دیں گے مگر یہ دوسرے سُر میں شروع ہو جاتے ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ بیچ بیچ میں "آ آ آ آ" اور "اوں ں ں ں ں ں" کی ایسی لمبی لمبی، اُونچی نیچی، پتلی اور موٹی آوازوں میں مصرعے کو نچاتے ہیں کہ مصرعہ بھی ان کے پاؤں پکڑنے لگتا ہے۔ کبھی ایسے لگتا ہے، ان کے گلے میں کچھ اٹک گیا ہے اور کبھی لگتا ہے سردی کی وجہ سے ان کی آواز ٹھہر گئی ہے۔ کبھی ناک سے، کبھی نیچے کے جبڑے سے، کبھی اوپر کے جبڑے سے، ایک ہی مصرعے کی مسلسل جگالی کر کے ہمیں آخر کار گالی دینے پر مجبور کر ڈالتے ہیں!

ابھی پچھلے ہفتے ہمیں ایک غزل کی محفل میں بادل ناخواستہ جانا پڑا۔ ہم حتی الامکان ان محفلوں سے دُور رہتے ہیں، کیوں کہ عام طور پر یہ حضرات وہی پرانی غزلیں، جو ہمارے دوست شریف اسلم صاحب کی شادی میں سنا چکے تھے، وہی اُن کے بیٹے کے ولیمے میں بھی سناتے ہیں۔ دوسروں کی گائی ہوئی غزلوں کو گانا ایسا ہی ہے، جیسے کسی کے اُتارے ہوئے کپڑے پہن کر شان دکھانا، مگر اس بار ہندوستان سے دو کلاسیکل گانے والے استاد خان برادران آئے ہوئے تھے، ہم کو

انور احمد علوی

برادری کی خاطر جانا پڑا۔ وہ اپنے بھانجوں اور بھتیجوں کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ پہلے تو بھانجوں اور بھتیجوں نے محمد رفیع مرحوم کی گائی ہوئی غزلیں پیش کیں اور یہ بتایا کہ محمد رفیع صاحب نے تال اور سُر کی کتنی غلطیاں کی تھیں! پھر استاد صاحبان نے غزل نہیں چھیڑی، بلکہ ایک نازک اندام حسین غزل کو سرِ عام کئی راگوں کو ساتھ لے کر چھیڑنا شروع کر دیا اور ہماری آنکھوں کے سامنے غزل کا وہی حشر ہوا، جو کسی رضیہ کے بارے میں سنا تھا!

غزل فارسی میں، ہرنی کی خوف میں ڈوبی ہوئی اُس کانپتی آواز کو کہتے ہیں، جو وہ شکاری جانوروں کے بیچ گھِر جانے پر نکالتی ہے۔ یہاں غزل کے مصرعے بھی خطرناک راگوں کے بیچ گھِر کر کبھی لرز رہے تھے اور کبھی گڑگڑا رہے تھے۔ اِدھر چھوٹے بھائی دوسرے مصرعے کی طرف بڑھنے لگتے کہ فوراً بڑے بھائی ”آآآآآآ“ کی ڈانٹ پلا کر پھر پہلے مصرعے پر کھینچ لاتے۔ دونوں بھائیوں کی اس دھینگا مشتی میں ہم کبھی پہلا مصرعہ بھول جاتے اور کبھی دوسرا۔ اُدھر بڑے خاں صاحب جب شعر مکمل کرتے تو مسکراتے اور فاتحانہ انداز میں آداب بجالاتے، جیسے کہ شعر بھی انہی نے کہا ہو! ہم جونہی تالیاں بجا کر اگلے شعر کی طرف بڑھنے کی خواہش کرتے، وہ ہماری داد کو طلبِ مکرر سمجھ کر پھر اُسی مصرعے پر لوٹ جاتے۔

ہم غزل کے چاہنے والے ہیں۔ جگجیت سنگھ اور منی بیگم ہمیں اس لیے پسند ہیں کہ وہ غزل کو ایک امانت کی طرح سامعین تک پہنچاتے ہیں، ورنہ کلاسیکی گانے والے اپنی عادت سے مجبور ہیں۔ مصرعہ تو مصرعہ، وہ لفظوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔ بعض اوقات ایک لفظ سے دشمنی پکڑ لیتے ہیں، جب تک وہ لفظ آکر معافی نہ مانگے، اُسے نہیں چھوڑتے۔ کلی کو اتنا کھینچتے ہیں کہ وہ پھول بن جاتی ہے اور پتھر کو اتنے راگوں میں کھینچتے ہیں کہ وہ چٹان بن جاتا ہے!

خان صاحبان نے بھی ”یہ نہ تھی ہماری قسمت“ چھیڑی۔ چوں کہ غالبؔ بھی خان تھے اور یہ بھی خان ہیں، اس لیے ہمیں اعتراض نہیں ہوا۔ برادری والے ایک دوسرے کا مال جیسے چاہیں استعمال کرنے کا حق تو رکھتے ہیں، لیکن جب اُن لوگوں نے ”یہ نہ تھی... یہ نہ تھی“ کی رٹ لگانی شروع کی، تو ہم نے زِچ ہو کر کاتبِ تقدیر سے درخواست کرنی چاہی کہ کرم فرمائیں اور ان کی قسمت پلٹ دیں، ورنہ یہ ساری رات ”یہ نہ تھی... یہ نہ تھی“ کرتے رہیں گے۔ قسمت پلٹی یا نہیں، پتا نہیں، لیکن ہم تنگ آکر گھر کی طرف پلٹ گئے۔

علیم خان فلکی ...... غزل اور پاپ گانے والوں سے التماس

رنگِ ادب دہلی کلکشن

غزل گانے والوں کی سب سے اونچی ذات کلاسیکل گانے والوں کی سمجھی جاتی ہے۔ انہیں غزل سے کوئی مطلب نہیں ہوتا، سُروں کو پیش کرنے کے لیے صرف ایسے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے، جو اُن کے راگ میں فٹ ہوسکیں۔ پتا نہیں غزل کیسے ان کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس ناتواں کو جب یہ راگ ملہار اور راگ پہاڑی پر چڑھاتے ہیں، تو سننے والوں کو بھی بے دَم کر ڈالتے ہیں۔ ایک مصرعہ پکڑ لیتے ہیں تو اُسی پر گراموفون کی ٹوٹی ہوئی سوئی کی طرح اٹکے رہتے ہیں۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ کلاسیکی فنکاروں کو غزل کی نہیں، بلکہ اچھے اور موزوں جملوں کی ضرورت ہوتی ہے، جو کسی بھی اخبار یار سالے سے مل سکتے ہیں۔ اگر یہ حضرات کالم پڑھ کر گایا کریں، تو زیادہ بہتر ہو۔ بعض کالم تو شعری شگفتگی سے بھرپور ہوتے ہیں، لگتا ہے نثری نظم پڑھ رہے ہیں، جیسے جمیل الدین عالی کے کالم!

چوں کہ کلاسیکی موسیقی آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی، صرف غزل سننے کے شوق میں اسے ہم نے برداشت کیا ہے، اس لیے آوازوں میں چھپے راگ اور سُر سے ہمیں بڑی الرجی ہے۔ یہ ہمیں کبھی قبض کے شکار کسی بچے کی تکلیف معلوم ہوتی ہے، کبھی آپریشن کے بعد رفتہ رفتہ ہوش میں آنے والے مریض کی کراہ اور کبھی کمزور بیٹری پر چلنے والے ٹیپ ریکارڈر پر کے ایل سہگل کا گانا۔

پتا نہیں، ان حضرات کو غزل سے کیا دشمنی ہے... اپنے فن کے اظہار کے لیے کچھ شعری نوعیت کے الفاظ ہی درکار ہوں تو آزاد نظمیں گالیا کریں۔ یوں بھی آزاد نظموں کا مصرف آج تک دریافت نہیں ہوسکا ہے۔ یہ کیوں پیدا ہوئیں، ان کا طریقہ استعمال کیا ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ اگر کلاسیکل گانے والے ان کو اپنالیں تو تمام آزاد نظموں اور آزاد غزلوں کا وجود کام میں آجائے گا۔ چوں کہ اس میں بڑی، منجھلی اور چھوٹی، ہر سائز کی بحریں ہوتی ہیں، اس لیے یہ کلاسیکل راگوں میں پوری طرح فٹ بھی ہوسکتی ہیں۔ جہاں کھینچنا ہوا، طویل مصرعے کو اُٹھالیا، جہاں بھینچنا ہوا، چھوٹی لائن کو گالیا۔ اس طرح آزاد شاعروں کو بھی زندگی مل جائے گی اور نثری نظموں کی افادیت بھی طے ہوجائے گی۔

عہدِ حاضر میں اچھی غزل اور بُری غزل کا تعین اس کے اچھے، یا بُرے گائے جانے پر ہے۔ اگر اچھے طبلے اور آرکسٹرا کے ساتھ گائی جائیں تو ندا فاضلی کی غزلیں بھی چل پڑتی ہیں اور میر کی غزلیں منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ لوگ شاعر کا نام نہیں جانتے بلکہ نور جہاں یا سلمیٰ آغا والی غزل کے

نام سے غزل کو یاد رکھتے ہیں۔ خود گانے والے، اپنے سازندوں سے کہتے ہیں ”وہ بارہ سو والی غزل کی تیاری کرو“، یعنی وہ غزل، جسے ایک پروگرام میں سن کر حاضرین نے بارہ سو روپے دیے تھے۔

اگر آپ پاپ سنگر ہیں تو جان لیجیے کہ ہم بھی پاپ موسیقی کے شیدائی ہیں۔ اس کی گھن گرج سے ہم ہی نہیں، ہمارے گھر کے بچے بھی جھومتے ہیں۔ اس میں سُر کی ضرورت ہے، نہ تال کی، غزل کی ضرورت ہے، نہ شاعری کی۔ صرف کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آوازوں کی ضرورت ہوتی ہے! جب سے ہم نے پاکستانی پاپ گروپ ’جنون‘ کا گایا ہوا علامہ اقبالؔ کا نغمہ ”مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ“ سنا ہے، ہم کو محلے کی مسجد کی اذان پھیکی لگنے لگی ہے۔ اگر پاپ گانے والے بجائے غزلوں کے، اپوزیشن لیڈروں کے بیانات گایا کریں، تو قومی شعور بیدار ہو سکتا ہے۔ پاپ گانوں میں صدائے فریاد و احتجاج اور انقلاب زندہ باد والے جلوس کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ ایسا جلوس، جس میں کئی نعرے مل کر خود بخود ایک سُر بن جاتے ہیں۔ اس میں کوئی بینڈ بجا رہا ہے، تو کوئی تالی اور کسی کو بجانے کے لیے کچھ نہ ملے تو سڑک کے کنارے ٹین کا خالی ڈبہ لے کر بجا رہا ہے۔ ایک عجیب عالمِ کیف و مستی میں ہر کوئی جھومتا نظر آتا ہے۔ اس لیے پاپ گانے والوں سے ہماری درخواست ہے کہ وہ سیاسی رہنماؤں کے بیانات گایا کریں۔

غزل، پاپ گانوں میں بالکل نہیں بجتی۔ غزل محبوب سے سرگوشی کرنے کا نام ہے، نہ کہ اُسے دروازے پیٹ کر نیند سے بیدار کرنے کا۔ اس طرح تو نازک مزاج غزل کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ غزل میں نہاں محبوب کا تصوّر تو اتنا حسین و پاکیزہ ہے، جیسے چودھویں شب میں، دریا کی لہروں پر پڑنے والا تاج محل کا دلنشیں عکس۔ آپ لوگ اس حسین و باحیا تصوّر کو ٹیلی ویژن کے پردے پر نیم برہنہ کر کے غزل کی آبرو برباد کر ڈالتے ہیں۔ اگر اپوزیشن کے بیانات نہیں، تو گیت یا دوہے ہی گا لیا کریں۔ مشاعروں کو گیت آلود کرنے والے شعراء کی بھی بن آئے گی۔

اگر آپ کو یہ بھی پسند نہیں، تو اشتہارات گایا کریں۔ آمدنی بھی دوگنی ہو گی، ملکی صنعت بھی ترقی کرے گی اور آپ کو نت نئی غزلوں پر ہفتوں محنت سے نجات بھی مل جائے گی۔

غزل گانے والوں سے یہ بھی درخواست ہے کہ ایک تو آپ فیس وصول کرتے ہیں، پھر سامعین کی طرف سے لٹائی گئی رقم کو بھی آپس میں پولیس والوں کی طرح تقسیم کر لیتے ہیں۔ اس کمائی سے شاعر کا حصہ بھی نکالا کریں۔ بے چارے خستہ حال شاعر کیسی کیسی عظیم غزلیں چھوڑ گئے۔

بذلہ سنجان درد عالم
تنگ دستی کے عالم میں خونِ جگر جلاتے رہے، راتوں کو جاگ کر دنیا کو غزلوں کا عظیم ورثہ دیا اور گھر والوں کے لیے بغیر کوئی ورثہ چھوڑے دنیا سے گزر گئے۔ ان کے پسماندگان اپنے باپ کے ورثے پر غیروں کی کمائی کو حسرت سے دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اگلی نسل تک اُردو اور غزل باقی رہے، تو اپنی کمائی سے ان کا حصہ بھی نکالیے!!

* *

ماں کا دعا... ساس کا بددعا!

غفور اسد

شام کا وقت تھا۔ دفتر سے نکل کر ابھی سڑک پار ہی کی تھی کہ سامنے سے ایک ٹیکسی آتی نظر آئی۔ ہم نے اشارہ کیا، مگر اُس نے کنارہ کیا۔ پھر ہمارے سامنے سے کچھ اس طرح یوٹرن لیا، جس طرح ہمارے سیاستدان لیا کرتے ہیں۔ ہم نے پہلے آگے کی طرف دیکھا، جس طرف ٹیکسی گئی تھی، وہاں سرخ کپڑوں میں ملبوس کوئی لڑکی کھڑی تھی، پھر ٹیکسی کے پیچھے کی طرف دیکھا، جہاں سرخ رنگ میں لکھا تھا "ماں کا دعا... ساس کا بددعا!" اور تب ہم یہ سوچ کر رہ گئے کہ اِن سرخ لفظوں اور اِن سرخ کپڑوں میں کس قسم کا تعلق ہوسکتا ہے۔

مگر یہ کیا؟ تھوڑی ہی دیر بعد ٹیکسی الٹے ٹائروں ہماری طرف پلٹ آئی۔ "جی صیب کیدر جانا مانگتا ہے؟" ٹیکسی ڈرائیور نے سر کے ساتھ ہی آدھا دھڑ بھی باہر نکالتے ہوئے کہا۔

ہم نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، اس لیے نہیں کہ اس نے ہمارے اشارے پر رکنے کی بجائے اُس خاتون کی طرف دوڑ لگادی تھی (کہ یہ اس کا جمہوری حق تھا) بلکہ اس لیے کہ ہم مانگنے والے نہیں تھے (حکمرانوں کی بات دوسری ہے!)۔

"او۔ صیب! آپ تو ناراض ہوگیا۔ اَم تو سمجھا تھا اللہ قسم وہ کوئی لیڈیس اے۔ اور پھر لیڈیس تو فرسٹ" ہوتا ہے نا صیب، لیکن خدا قسم وہ تو ہیجڑا نکلا، جو کسی اور کو اشارہ کر رہا تھا۔"

"ہیجڑا... نہیں، خواجہ سرا بولو۔" ہم جلدی سے بولے، "کیا تم اخبار نہیں پڑھتے۔ کورٹ نے کہا ہے، ان کو عزت و احترام دیا جائے۔"

"اَم پڑھا لیکھا نئیں اے صیب۔" وہ ٹیکسی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا، "اَم کو کیا پتا کہ اُدس کو 'سرا' بولنا ہے کہ 'سری'۔"

"سری، یہ کیا ہوتی ہے؟" ہم نے حیرت سے کہا اور اُس کے ساتھ ہی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

”آپ ’سری دیوی‘ کو نہیں جانتا ہے۔“ اس مرتبہ وہ حیرت سے بولا، ”آپ تو شکل سے پڑا لکھا مالوم ہوتا ہے صیب۔ آپ نے اس کا فلم نہیں دیکھا؟“

اور ہم نے مارے شرمندگی کے سر جھکا لیا۔

”صیب! اب یہ بتاؤ۔ آپ کو جانا کیدر ہے؟“ وہ ٹیکسی کا انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا، ”جیدھر بولو گے پہنچا دیں گا۔ اس لیے کہ آپ بھی ہم کو اچھا آدمی لگتا ہے۔“

اُس کی اِس بات پر ہم نے اپنا سر جو ’سری دیوی‘ کی وجہ سے جھک گیا تھا، اوپر اُٹھاتے ہوئے کہا، ”گرو مندر۔“

یکا یک اس نے ٹیکسی روک دی اور حیرت سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا، ”آپ تو مسلمان لگتا ہے صیب!“

”ہاں ہاں“ ہم جلدی سے بولے، ”ٹی وی چینل پر کام ضرور کرتے ہیں، چہرے پر داڑھی نہیں ہے، جھوٹ بھی خوب بولتے ہیں، مگر ہیں مسلمان۔“

”سچ سچ آپ مسلمان ہو؟“

”ہاں ہاں، بھائی۔ خیر سگالی کے طور پر رات کو انڈین فلمیں دیکھتے ہیں، جس کی وجہ سے آنکھ دیر سے کھلتی ہے اور صبح کی نماز رہ جاتی ہے۔ باقی نمازیں کام کی زیادتی کی وجہ سے چھوٹ جاتی ہیں، لیکن بھائی عید کی نماز بڑی پابندی سے پڑھتے ہیں۔“

”تو آپ سچ سچ مسلمان ہو!“ وہ بااعتبار لہجے میں خوشی سے بولا اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ ڈر تھا کہ وہ کہیں ہمیں غیر مسلم سمجھتے ہوئے ٹیکسی کو دھماکے سے اُڑا کر ہمیں جہنم اور خود کو جنت کا حق دار نہ بنا بیٹھے۔

”صیب! جب آپ سچ مچ مسلمان ہے تو ’مندر‘ کیوں جاتا اے؟“

”ارے بھائی، یہ اسٹاپ کا نام ہے، جو قائداعظم کے مزار سے آگے ہے۔“

”ام کو مالوم ہے صیب۔ لیکن یہ گرو مندر پہلے تھا، اب نہیں اے۔“ وہ قدرے ناگواری سے بولا، ”اب اس کا نام ’بابری مسجد چوک‘ ہے۔ بھارت میں شہید ہونے والا بابری مسجد کے نام پر۔“

”ہاں۔ ہاں یاد آیا... یہ وہی بابری چوک ہے نا، جہاں گزشتہ دنوں ایک عالمِ دین کو اُن کے کئی شاگردوں کے ساتھ شہید کر دیا گیا تھا۔“

ہمارے اس تلخ جملے کو پتا نہیں اس نے محسوس کیا یا نہیں، البتہ قدرے فتح مندی کے احساس سے سر کو اوپر نیچے جنبش دیتا ہوا بولا، ”صیب! آپ کا مالومات بوت اچھا ہے۔“

اس سے قبل کہ گفتگو کسی اور سمت چلتی، ہمیں یکا یک ٹیکسی کے پیچھے لکھے ہوئے جملے ’ماں کا دعا، ساس کا بد دعا‘ کا خیال آ گیا۔ ”خاں صاحب، آپ نے جو اپنی ٹیکسی کے پیچھے یہ جملہ لکھا ہے کہ ’ماں کا دعا، ساس کا بد دعا‘، اس کا کیا مطلب ہے؟“

”اس کا مطلب اے ماں کا دعا۔ کیا آپ ماں کا دعا کا مطلب نہیں سمجھتا؟“

”سمجھتے تو ہیں، مگر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ماں نے آپ کو کیا دعا دی تھی؟ کیا یہی کہ آپ ٹیکسی چلاتے رہیں؟“

”نہیں صیب! ماں نے ام کو بولا تھا او صوبہ خان، خو چہ تیرا خانہ خراب۔“

”ہائیں۔ یہ دعا تھی یا بد دعا“۔ ہم نے حیرت سے کہا۔

”خو چہ تیرا خانہ خراب۔ امارا ماں کا کلام تکیہ تھا۔“

”کلام تکیہ نہیں، تکیہ کلام۔“ ہم بولے بغیر نہ رہ سکے۔

”چلو یہی سہی۔ ماں تو امارے باپ کو بھی یہی بولتا تھا۔ صوبہ خان کا ابا، خو چہ تیرا خانہ خراب۔“

”اوہ پھر تو اُن کا خانہ خراب ہی ہوا ہوگا۔“

”ان کا تو نہیں۔ ہاں، امارا ماں کا خانہ ضرور خراب ہو گیا تھا۔ ابا نے تیسرا شادی جو کر لیا تھا۔“

”تیسری نہیں، دوسری۔“ ہم نے پھر تصحیح کی کوشش کی۔

وہ یکدم غصے میں آ گیا۔ ”ابا تمہارا تھا، یا امارا۔ ابا نے تیسرا شادی کیا تھا۔ دوسرا شادی تو امارا ماں سے کیا تھا۔“

”اوہ بڑا افسوس ہوا۔“ ہم نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ویسے اصل مقصد اُس کے غصے کو ٹھنڈا کرنا تھا۔

”کوئی بات نہیں صیب!“ اس نے قدرے تحمل سے کہا۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر نسوار کی ڈبی نکالی، ڈبی سے نسوار نکالی۔ پھر اُسے منہ میں ڈالا اور اُس کی ایک پچکاری باہر کی طرف نکال کر

دانت نکال دیے۔

ہم نے جلدی سے باہر کی طرف دیکھا۔ خان صاحب کی نسوار نے موٹر سائیکل پر گزرتے ہوئے ایک شخص کی قمیص کے پچھلے حصے پر کچھ گل بوٹے سے بنا دیے تھے۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ یہ کام اس کی پیٹھ پیچھے ہوا تھا۔ اگر یہ گل بوٹے آگے کی طرف بن جاتے تو یقیناً نقضِ امن کا خطرہ پیش آسکتا تھا۔

”ارے چوڑو صیب! آپ کیا دیکھتا ہے۔ ام آپ کو اپنی ماں کا دعا بتا رہا تھا۔ ماں ام کو بولا، صوبہ خان۔“

”ایک منٹ۔ ایک منٹ“... خان صاحب۔ ہم جلدی سے بولے۔

”آپ کا نام صوبہ خان کچھ عجیب سا نہیں ہے۔“

”کوئی عجیب سا نئیں ہے۔ امارا نام صوبہ خان بالکل ٹھیک اے، کیوں کہ جب ہم پیدا ہوا اُس وقت امارے صوبہ کا کوئی نام نہ تھا۔ ابھی آپ بولو نئیں۔ امارا ماں ام کو بولا، صوبہ خان! خدائے ذوالجلال تیرے کو موٹر کار میں گھمائے۔ تبھی سے ام موٹر کار میں گھومتا ہے، یہ ماں کا دعا ہے۔ اس کو بھاڑے پر چلاتا ہے، اس کو ٹیکسی بنا لیا ہے، یہ امارا کاروبار ہے۔“

”اور یہ ساس کا بد دعا کیا ہے۔“ ہم جلدی سے بول پڑے، کیوں کہ گرومندر آنے والا تھا۔

”او نئیں صیب! یہ والا بات بھی آپ اطمینان سے سنو۔ وہ بڑی سنجیدگی بولا، ”ساس نے شادی کے ٹیم پر امارا بی بی کو بولا...“

”ایک منٹ... ایک منٹ خان صاحب... یہ بی بی سے مراد بیوی ہے نا؟

”ہاں صیب! ہم اپنا چوزہ کو بی بی بولتا ہے۔“

”چوزہ نہیں... زوجہ۔ ویسے یہاں شہر کا لوگ دوسرے کی زوجہ کو بھی بی بی بولتا ہے۔ ہاں تو کیا بد دعا دی تھی تمہاری ساس نے۔“ ہم نے اطمینان سے کہا، کیوں کہ ٹیکسی اب ایک سگنل پر رُک چکی تھی۔

”امارا ساس نے امارا بی بی سے بولا، کچھ بی ہو گل بدخشانی، اس کا زندگانی میں اس کا ساتھ کبھی نئیں چوڑنا۔“

”یہ بد دعا تھی۔“ ہم نے حیرت سے کہا۔

’’ہاں صیب!‘‘ وہ رونی سی صورت بنا کر بولا، ’’امارا دوستوں نے دودو شادی بنایا، مگر آ بی گل بدخشانی!‘‘

’’مگر یہ آپ کا بی بی ’گل بدخشانی‘ ہے کہاں؟‘‘ اچانک کسی ہولناک خیال کے تحت ہماری زبان سے نکل گیا۔

’’ڈیفنس قبرستان، فیز تری (تھری) میں۔‘‘

’’اوہ...‘‘ ہمارے لبوں سے بے ساختہ آہ نکل گئی۔ تو ہمارا خیال درست نکلا۔

’’آپ کو چھوڑ کر ام اُدھر ہی جائے گا۔‘‘

’’فاتحہ پڑھنے؟‘‘ بے ساختہ ہمارے لبوں سے نکلا۔

’’نیئں صیب! ام اتنا خوش قسمت نیئں۔‘‘ اس نے یکایک دانت نکال دیے۔ قبرستان کے ایک کونے میں دو کمروں کا مکان بنالیا ہے۔ ام بی بی گل بدخشانی کے ساتھ اُدر اِی رہتا اے۔‘‘

’’اوہ۔‘‘ یہ دوسری آہ تھی، جو ہمارے لبوں سے نکلی، مگر اُس پہلی اور اس دوسری آہ میں وہی فرق تھا، جو آئس کریم کے دھویں اور سگریٹ کے دھویں میں ہوتا ہے! ’’مگر تم تو ٹیکسی ڈرائیور ہو شاید؟‘‘

’’ہاں صیب! مگر پارٹ ٹائم... اصل میں تو ام گورکنی کا کام کرتا اے۔ کبھی کوئی کام ہو تو بولو۔ ام رعایت کر دے گا۔‘‘

’’بس بس... کافی ہے۔‘‘ ہم نے جلدی سے کہا۔

وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ پھر اپنی ہنسی اور ٹیکسی کو بریک لگاتے ہوئے بولا۔ ’’ویسے صیب! کیا آپ کا بی بی زندہ ہے؟‘‘

’’ہاں ہاں، اُس سے ملنے ہی تو جا رہے ہیں۔‘‘ ہم نے جلدی سے کہا۔

’’کیدر؟‘‘ وہ بولا۔

’’ہسپتال میں۔‘‘

’’کیا بوت بیمار اے؟‘‘ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

’’نہیں۔ بالکل نہیں۔‘‘

’’اوہ! ام سمجھا تھا، شاید ایک چانس۔‘‘

"نو چانس۔ بس یہیں روک دو۔" ہم نے اسے پچاس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

"مگر صیب! ایک بات۔" اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولتے ہوئے اُلجھن بھرے لہجے میں کہا، "آپ کا بی بی بیمار بھی نہیں ہے، پھر بھی آپ اُس سے ملنے ہسپتال جاتا اے۔"

"ہاں۔" ہم نے مسکراتے ہوئے کہا، "کیوں کہ وہ وہاں نرس ہے!"

* * *

سردار جی کا خط!

فاروق قیصر

ہمیں اپنی ای میل میں ایک ایسا خط موصول ہوا، جو کسی سردار جی نے غلطی سے ہمارے پتے پر میل کر دیا ہے۔

پیارے بیٹے جگجیت سنگھ!

خوش رہو!

میں، یعنی تمہارا ابا پودل چیر سنگھ اور تمہاری ماں بسنت کور یہاں بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ اُمید ہے تم بھی وہاں ٹھیک ٹھاک ہو گے۔ میں تمہیں آج تک اس لیے خط نہ لکھ سکا کہ آج تک ہمیں یہ نہیں پتا چلا کہ تمہارا پتا کیا ہے؟ ہم بھی اب اُس گھر میں نہیں رہتے، جس گھر سے تم امریکا گئے تھے۔ چوں کہ تمہاری ماں کو گاڑی چلانی نہیں آتی، اس لیے ہم نے ایکسیڈنٹ سے بچنے کے لیے احتیاطاً شہر سے باہر اُس علاقے میں گھر لے لیا ہے، جہاں دُور دُور تک کوئی آبادی نہیں۔ آبادی نہ ہونے کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اب ہماری گاڑی کے نیچے کوئی نہیں آتا۔

ہم اپنے نئے گھر کا پتا تمہیں فی الحال نہیں دے سکتے، کیوں کہ جس گھر میں ہم شفٹ ہوئے ہیں، اس گھر کی نیم پلیٹ اور ایڈریس والی تختی، اِس گھر میں پہلے رہنے والے سردار جی اُتار کر اپنے ساتھ لے گئے ہیں، جس کی وجہ سے ہمیں اب خود معلوم نہیں کہ ہمارے گھر کا ایڈریس کیا ہے۔ اُمید ہے کہ ہم اپنے نئے گھر کا ایڈریس کسی سے معلوم کر کے، اِس کی نئی تختی بنوا کر تمہیں اطلاع کر دیں گے، تاکہ تم اِس ایڈریس پر ہمیں خط لکھ سکو۔ میں جانتا ہوں کہ تم تیز تیز نہیں پڑھ سکتے، اس لیے میں یہ خط تمہیں آہستہ آہستہ لکھ رہا ہوں!

جس گھر میں ہم شفٹ ہوئے ہیں، یہ بڑا اچھا گھر ہے۔ اِس میں وہ ساری سہولتیں میسر ہیں، جو ہمارے پہلے گھر میں نہیں تھیں۔ سہولتوں کے ساتھ ساتھ اِس گھر میں کچھ خامیاں بھی ہیں۔ مثلاً

اس گھر میں ہر کمرے کے ساتھ باتھ روم تو ہے، مگر اُس میں ٹائلٹ بنانا مالک مکان بھول گیا ہے، جس کی وجہ سے ہمیں ٹائلٹ کے لیے روزانہ کسی ریسٹورنٹ میں جانا پڑتا ہے، جہاں ہم چائے پینے کے بہانے ٹائلٹ بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ باتھ روم میں جہاں ٹائلٹ نہ ہونے کی ہمیں تکلیف ہے، وہاں ایک سہولت یہ ہے کہ ہر باتھ روم میں ایک آٹومیٹک واشنگ مشین لگی ہوئی ہے۔ کچھ دن پہلے تمہاری ماں نے میری تین قمیصیں دھونے کے لیے واشنگ مشین میں ڈال کر زنجیر کھینچی تو قمیصیں پانی میں تیرنے کے بعد غائب ہوگئیں۔ بسنت کور کا خیال تھا کہ تھوڑی دیر بعد قمیصیں دُھل کر خود بخود باہر نکل آئیں گی، مگر کافی گھنٹے انتظار کے بعد جب واشنگ مشین میں سے قمیصیں باہر نہ آئیں تو میں سمجھ گیا کہ مشین میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے قمیصیں مشین میں پھنس گئی ہیں۔ اس کے بعد تمہاری ماں نے دوسرے اور پھر تیسرے باتھ روم میں جا کر وہاں لگی ہوئی واشنگ مشینوں میں میری باقی قمیصیں ڈال کر زنجیر کھینچی تو اُن کا بھی یہی حشر ہوا۔ دیسی ملکوں کا یہی تو مسئلہ ہے کہ یہاں ولایت کی نقل میں مشین بنا تو لی جاتی ہے، مگر وہ ٹھیک طرح سے کام نہیں کرتی! اب میں کافی دنوں سے بنیان اور دھوتی میں ہی پھرتا ہوں، لہٰذا ہو سکے تو کسی آتے جاتے کے ہاتھ میرے لیے دو چار ایسی قمیصیں بھجوا دینا، جنہیں دھونے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

باقی یہاں کا موسم ٹھنڈا ہونا شروع ہوگیا ہے۔ پچھلے ہفتے یہاں ایک ہفتے میں دو دفعہ بارش ہوئی۔ پہلے لگاتار تین دن اور اِس کے فوراً بعد لگاتار چار دن بارش ہوتی رہی۔ تمہارے تائے بیکار سنگھ کو پچھلے ہفتے ایک بہت اچھی ملازمت مل گئی۔ جہاں وہ کام کرتا ہے، وہاں اُس کے انڈر پانچ سو بندے ہوتے ہیں۔ اُسے قبرستان میں گھاس کاٹنے کی ملازمت ملی ہے!

تمہاری بیوی یعنی ہماری بہو بالکل ٹھیک ہے اور تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔ پچھلے مہینے جب وہ اُداس ہوئی تو ہم اُس کا دل بہلانے کے لیے سوئمنگ پول لے گئے، مگر وہاں جب وہ سوئمنگ کرنے لگی تو سوئمنگ پول کے مینیجر نے اُسے یہ کہہ کر روک دیا کہ سوئمنگ پول میں پانی نہیں ہے۔ ہم نے اُسے لاکھ سمجھایا کہ تالاب میں پانی نہیں تو کیا ہوا؟ یہ اور بھی اچھی بات ہے، اس لیے کہ ہماری بہو کو تیرنا نہیں آتا۔

تمہارے لیے ایک بُری خبر یہ ہے کہ تمہارا بچپن کا کلاس فیلو اُمرناتھ پچھلے دنوں کنویں میں ڈوب کر مر گیا۔ اُس کے مرنے سے اُس کے گھر والوں کو بڑی تکلیف اُٹھانا پڑی اور وہ یوں کہ لاش

گیلی ہونے کی وجہ سے اُسے جلانے میں تین دن لگ گئے۔ اِس کے علاوہ ایک اور خبر یہ ہے کہ ہمارا ایک اور دوست ہربجن سنگھ اپنے پتا کرن سنگھ کی آخری خواہش پوری کرتے ہوئے مر گیا۔ اُس کے پتا کرن سنگھ نے مرتے مرتے خواہش کی تھی کہ اُس کی لاش کو سمندر میں دفنایا جائے۔ ہربجن سنگھ اپنے باپ کی خواہش پوری کرنے کے لیے سمندر میں قبر کھود رہا تھا کہ شارک مچھلی نے حملہ کر کے مار ڈالا۔ باقی یہاں سب خیریت ہے۔

سنا ہے تم نے اپنی داڑھی صاف کرا دی ہے؟ یہ تم نے اچھا کیا، ورنہ امریکا میں گیارہ ستمبر کے بعد سے امریکیوں نے سکھوں کو پاکستانی مولوی سمجھ کر پکڑنا شروع کر دیا تھا! داڑھی منڈوانے سے تمہارے خرچے میں اضافہ بھی ہو گیا ہوگا کہ امریکا میں شیو بنوانے اور بال کٹوانے پر بیس ڈالر خرچہ آتا ہے۔ میری مانو تو داڑھی واپس رکھ لو اور اُس پر بھارتی جھنڈے کا رنگ کروالو۔

باقی کوئی خاص خبر نہیں، سوائے اس کے کہ ہمارے پڑوسی ملک پاکستان میں پچھلے تین سال سے جمہوریت لگی ہوئی ہے۔ ہمیں فکر ہے کہ اِن کی یہ جمہوریت کہیں ہماری بھارتی فلم ''ہم آپ کے ہیں کون؟'' کا پانچ سال لگاتار لگے رہنے کا ریکارڈ نہ توڑ ڈالے۔ اس کے علاوہ پاکستان نے بھارتی ٹی وی چینلز پر پابندی لگا دی ہے، جس سے ہماری فلموں کی ویڈیو کیسٹس کی مانگ میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

نوٹ: میں نے تمہیں اس خط میں پانچ سو ڈالرز ڈال کر بھجوانے تھے، مگر بھول گیا اور اس کا خیال مجھے اُس وقت آیا، جب میں یہ خط تمہیں پوسٹ کر چکا تھا۔

* * *

ڈیٹ!

فخرالدین کیفی

یہ اُس زمانے کی بات ہے، جب ہم دواؤں کی ایک کمپنی میں سیلز اینڈ مارکٹنگ مینیجر تھے۔ وہاں کا ماحول بڑا ہی کنزرویٹیو "Conservative" اور دلچسپیوں سے خالی تھا۔ ظاہر ہے، سہما سہما سا ماحول ہو تو کیا خاک دلچسپی ہوگی، لیکن پھر بھی ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہو ہی گیا۔ جسے غلط فہمی کی بہترین مثال بھی کہا جا سکتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ ہماری کمپنی میں ایک کاسمیٹک ڈویژن بھی تھا، جس میں خواتین کی عملداری پروڈکٹس کی مناسبت سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ اور چوں کہ یہ پروڈکٹس بڑی ہائی فائی تھیں، اس لیے لڑکیاں بھی بہت موڈ "Mod" اور ایڈوانس قسم کی رکھی جاتی تھیں۔ اُن میں شوقیہ کام کرنے والیوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اُن کا ٹرن اوور "Turnover" زیادہ تھا۔ ہر تین چار ماہ بعد چہرے بدل جاتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے بتایا کہ ماحول بڑا ہی گھٹا گھٹا سا تھا، اس لیے لوگ آپس میں مشکل ہی سے گھلتے ملتے تھے۔ ایک دوسرے سے سلام دُعا کے بھی قائل نہیں تھے۔

مردوں کا یہ حال تھا تو پھر خواتین سے گفتگو کا تو کوئی سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہم چوں کہ ملٹی نیشنل کمپنیوں میں کام کر کے آئے تھے، جہاں اس قسم کی پابندیوں کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ کھلا ڈھلا ماحول تھا، ہر ایک بلا تکلف ملتا تھا۔ ایک دوسرے کو نام سے مخاطب کرتے وقت مس یا مسٹر، سر یا صاحب کے لاحقے کو غیر ضروری تصور کیا جاتا تھا۔ اس لیے ہم ہر ایک سے ملنے میں پہل کرنے سے نہیں گھبراتے تھے۔

ایک دن ہم اٹینڈنس مشین پر اپنا کارڈ پاس کر کے ہٹے، تو دیکھا ایک خاتون اپنے پرس میں کچھ تلاش کر رہی ہیں۔ ہم نے اُن کی بے چینی دیکھتے ہوئے پوچھا، ''کیا کچھ کھو گیا ہے؟''

کہنے لگیں، ''جی ہاں، ہمارا کارڈ نہیں مل رہا۔''

ہم نے فوراً کہا، ”تو ہمارا کارڈ لے لیجیے۔“

یہ سن کر ہنستے ہوئے بولیں، ”آپ کے کارڈ سے میری اٹینڈنس کیسے لگے گی۔“

ہم نے کہا، ”یہ الگ بات ہے، ورنہ ہمارا کارڈ حاضر ہے۔“

اس کے بعد ہماری علیک سلیک ہوگئی، جو دوسروں کے لیے تعجب خیز تھی۔ یہ خاتون کاسمیٹک ڈویژن میں پراڈکٹ مینیجر تھیں اور کچھ زیادہ ہی موڈرن تھیں۔ این لائٹنڈ اسلام کی پیروکار نظر آتی تھیں۔ حدود اربعہ یہ کہ خوب صورت ہی نہیں، خوش لباس بھی تھیں۔ ویسے لباس کے معاملہ میں کافی کفایت شعار تھیں، اتنی کہ دوپٹے کو فضول خرچی سمجھتی تھیں، قمیض میں کفایت سلیولیس نس "Sleevelessness" سے پوری ہو جاتی تھی اور مزید کفایت شرعی شلوار سے۔

اس واقعے کے بعد روزانہ ہی 'ہائی کیفی' اور جواباً 'ہائے صبا' کا تبادلہ ہونے لگا۔ ابھی ہماری واقفیت اس سے زیادہ نہیں بڑھی تھی کہ وہ اچانک غائب ہوگئیں۔ گمان گزرا کہ شاید مستعفی ہوگئی ہیں۔ تقریباً آٹھ دس دن کے بعد ہم نے ایک خاتون کو، جو پوری طرح ایک چادر میں ملفوف تھیں، صبا کے کمرے میں جاتے دیکھا۔ ہم نے چپراسی سے پوچھا،

”کیا یہ کوئی نئی خاتون مس صبا کی جگہ آئی ہیں؟“

جواب ملا، ”نہیں سر، یہ مس صبا ہی تو ہیں۔ عمرہ کر کے آئی ہیں۔“

اس تبدیلی پر حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ کچھ دیر بعد کاریڈور میں آمنا سامنا ہوا، تو انہوں نے ہاتھ پیشانی سے چھو کر بجائے ہائے ہیلو کہنے کہ بڑے ادب سے سلام کیا۔ اس طرح سلام کرنے پر ہماری رگِ ظرافت پھڑک اُٹھی اور ہم نے وعلیکم السلام کہتے ہوئے کہا،

”جیتی رہو، اللہ عمر دراز کرے، قد دراز کرے، زبان دراز کرے۔“

یہ سن کر ہنس پڑیں، ”کیفی آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ مذاق اُڑانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔“

ہم نے کوئی جواب دینے کی بجائے عمرے کی سعادت نصیب ہونے کی مبارک باد دی۔ انہوں نے شکریہ ادا کیا اور ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

دوسرے دن اتفاق سے وہ ہمیں لفٹ میں مل گئیں۔ سلام دُعا کے بعد ہم نے بات بڑھانے کی خاطر کہا،

’بھئی آپ نے اب تک ہمیں "Dates" (کھجوریں) وغیرہ نہیں دیں۔“

سن کر کوئی جواب نہیں دیا اور سر جھکا لیا۔ ہم بہت خفیف ہوئے کہ مانگنے کی کیا ضرورت تھی، لیکن آفس میں داخل ہونے سے پہلے خفت مٹانے کے لیے ہم نے دوبارہ پوچھ ہی لیا،

"بھئی آپ نے جواب نہیں دیا۔"

شرماتے ہوئے بولیں،

"اب ڈیٹ مانگ رہے ہیں، عمرے پر جانے سے پہلے تو کبھی نہیں کہا!!"

یہ کہہ کر وہ تو اپنے کمرے میں چلی گئیں، لیکن ہم آج تک یہ ہی سوچ رہے ہیں کہ کیا کھجور اور زمزم کے لیے بھی عمرے پہ جانے سے پہلے فرمائش کرنا ضروری ہوتا ہے...؟؟!!

* *

پگلا کہیں کا!

فرید بھٹہ

'یوکلپٹس' کا نام تو ہم نے بارہا سنا تھا، مگر اِسے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ یورپین ادیبوں کی دیکھا دیکھی ہمارے ادیب بھی شیشم، برگد، کیکر، پیپل وغیرہ کو چھوڑ کر 'یوکلپٹس' کی طرف ہی آ گئے۔ نئے لکھنے والوں کے لیے تو یہ لازم ہی ہو گیا اور پھر مبالغہ آرائی کی تمام حدوں کو پھلانگتا چلا گیا۔ بعض اوقات تو پڑھتے پڑھتے دل میں گدگدی ہونے لگتی تھی ... آسمان کو چھوتا ہوا قد، ہوا کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتا، جھومتا لہراتا، اِس کے پھولوں کی بھینی بھینی مہک اور پتوں کی سحر انگیز سرسراہٹ۔ کچھ یوں محسوس ہوتا تھا 'یوکلپٹس' کے بغیر محبت ممکن ہی نہیں۔ مستقبل کے عہد و پیمان، میٹھی میٹھی باتیں کہیں اور ہو ہی نہیں سکتیں۔ ہم بڑے حیران ہوتے کہ برگد، شیشم، کیکر، پیپل جیسے درختوں کے نیچے یہ سب کچھ کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیکر میں کانٹے ہوتے ہیں اور محبت کے راستے تو پہلے ہی سے کانٹوں بھرے ہوتے ہیں، اس لیے کیکر سے خوف سمجھ میں آ گیا۔ برگد اور پیپل کی گومڑیں پتھروں کی طرح لگتی ہوں گی اور عاشق پتھروں سے ویسے ہی کچھ خوفزدہ رہتے ہیں۔ لیکن شیشم تو خاصا معقول درخت ہے، چھاؤں بھی گھنی اور ٹھنڈی ہوتی ہے، پھر 'یوکلپٹس' ہی محبت کے لیے کیوں اتنا ضروری ٹھہرا؟

ہم بھی اِس شوق میں تھے کہ اگر 'یوکلپٹس' نظر آ جائے تو کوئی حسن کی دیوی ہمیں بھی وہاں کو انتظار مل جائے۔ شومئی قسمت نہ تو 'یوکلپٹس' نظر آیا، نہ کوئی دیوی۔

نصابی کتب میں درختوں کا واجبی سا تعارف ہوتا ہے، وہ بھی اُن درختوں کا جن سے کچھ کھانے کو میسر آ سکے، جیسے آم، مالٹا، سنگترہ، شہتوت وغیرہ، جب کہ 'یوکلپٹس' کا سب سے بڑا فائدہ اِس کی چھاؤں اور محبت ہے، تو پھر بھلا نصابی کتب میں اس کا ذکر کیسے آتا؟ یونہی دبے پاؤں مہ و سال گزر گئے، ہم 'یوکلپٹس' کو دیکھنے کی تمنا لیے وطن سے بے وطن ہوئے اور پھر 'تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے' مطالعہ ختم۔ 'یوکلپٹس' یادِ ماضی بن گیا اور پھر ہماری شادی ہو گئی۔ اپنی بیوی

کے ساتھ ’یوکلپٹس‘ کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ دیگر ضروریات سے ہی فرصت نہیں ملتی۔

ہم سطحِ آب کی طرح پُرسکون ہو چکے تھے کہ اچانک ہمارے امریکن آقا نے یہ حکم اِس پُرسکون سطح پر ایک کنکر کی طرح پھینکا کہ جاؤ ’یوکلپٹس‘ کے دس پودے لے آؤ۔ ہماری کمپنی آرائشِ گلشن بھی کرتی تھی۔ شوق بے لگام ہو گیا، مدّتوں سے دبی ہوئی حسرت، چنگاری سے شعلہ بن گئی۔ لیکن ایک خلش تھی کہ آخر یہ اکیلا دس ’یوکلپٹس‘ کے پودوں کا کیا کرے گا، اس کے لیے تو ایک ہی کافی ہے۔ آخر یہ خلش سوال بن کر زبان پر آ گئی کہ دس پودے کیا کرو گے۔ کہنے لگا، ایک کمپاؤنڈ میں لگوانے ہیں، جہاں یورپین یا یوروپین نما آباد ہیں۔ بات واضح تھی، ہماری سمجھ میں آ گئی کہ واقعی ایسے کمپاؤنڈ میں جہاں یوروپین یا یوروپین نما لوگ آباد ہوں ’یوکلپٹس‘ انتہائی ضروری ٹھہرا کہ اِس کے بغیر وہ بے چارے تو مجبور و لاچار ہوں گے۔ ہمیں احساس ہوا کہ یہ تو کارِ ثواب بھی ہے، اس لیے ہم اور بھی تیزی کے ساتھ اِس مُہم پر روانہ ہوئے۔ اس کے ساتھ یہ فکر بھی تھی کہ آخر یہ اتنا کومل، سندر پودا، اتنی گرم آب و ہوا میں کیسے پنپتا ہوگا؟ پھر سوچا کہ جو پودا محبت کی گرمی کا عادی ہو، اُس کے لیے یہ گرمی چہ معنی دارد؟ شاید یہاں بھی دستیاب ہو۔ ویسے ہم نے تو یہاں کھجور کا درخت ہی دیکھا اور جہاں بھی عرب کا ذکر پڑھا کھجور کے ساتھ۔ یہاں جو کچھ بھی کرنا ہو کھجور کے سایے میں ہی ہوتا ہے۔ اُمید و بیم کی اِس کیفیت میں ہم نے سوچا کہ جب ہم برگد، شیشم، کیکر اور پیپل جیسے درخت چھوڑ کر ’یوکلپٹس‘ کو اپنا سکتے ہیں تو پھر یہاں بھی یہ ممکن ہے، جدید دَور کے اپنے تقاضے ہیں۔ ہم نے کئی نرسریاں کھنگال ڈالیں، لیکن کوئی کوشش بار آور نہ ہو سکی۔ سب کے سب نالائق نکلے، اتنی اہمیت کے حامل درخت سے کوئی واقف نہیں تھا، محبت سے ناواقف، بے وقوف لوگ!

کافی غور کرنے کے بعد ہم ایک دوست کے پاس پہنچے، جو تھے تو عربی ہیں، لیکن انگریزی میں مہارت رکھتے ہیں۔ بڑے تپاک سے ملے۔ پوچھا، ’’چائے یا ٹھنڈا؟‘‘ ہم نے بوکھلاہٹ میں کہا، ’’صرف یوکلپٹس!‘‘ کہنے لگے، ’’بھئی یہ کیا جواب ہوا۔‘‘ ہم نے کہا، ’’ہم ایک مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں، ہماری مدد کیجیے۔‘‘ کہنے لگے، ’’فرمائیے۔‘‘ ہم نے پوچھا، ’’کچھ درختوں کے بارے میں بھی علم ہے؟‘‘ کہنے لگے، ’’پوچھو۔‘‘ ہم نے کہا، ’’یوکلپٹس کے متعلق بتائیے۔‘‘ کہنے لگے، ’’بڑا خوب صورت درخت ہوتا ہے۔‘‘ ہم نے کہا، ’’یہ تو ہمیں بھی علم ہے، آپ اِس کا عربی نام بتا دیں تو بڑی نوازش ہوگی۔ ہم صبح سے ڈھونڈ رہے ہیں، کوئی بتاتا ہی نہیں۔‘‘ اُنہوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ہمیں بُرا لگا۔

ہم نے کہا، ”بھئی اِس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ ہم نے کوئی لطیفہ تو گوش گزار نہیں کیا۔“ کہنے لگے، ”بھئی تمہاری حالت پر ہنسی آئی۔ ارے کسی بھی نرسری میں جا کر کہو، مجھے 'کافور' چاہیے!“

یہ سن کر تو ہمارا رنگ اُڑ گیا۔ ہمارے ہاں تو کافور کا استعمال ہی خاصا خوفناک ہے! یہ کیسا محبت کا دشمن ہے، جسے موت اور محبت کا فرق معلوم نہیں۔ گو دونوں کا آغاز بھی ایک ہے اور انجام بھی، لیکن بہر حال درمیان میں فرق ہے۔

ہم نے کہا، ”یار مذاق پھر کبھی سہی، اِس وقت تو ہم نے یہ سوال سنجیدگی سے کیا ہے اور آپ سے بھی سنجیدگی کی توقع ہی رکھتے ہیں۔“ کہنے لگے، ”میں بالکل سنجیدہ ہوں 'کافور' یوکلپٹس کا ہی عربی نام ہے، تم بلا جھجک کسی بھی نرسری میں جا کر کہو۔“

ہم اعتبار و بے اعتباری کی کیفیت سے دو چار، ایک نرسری میں جا پہنچے اور ڈرتے جھجکتے کافور کے طالب ہوئے۔ انہوں نے کہا مل جائیں گے۔ بس پھر ہماری حالت دیدنی تھی، ہمارا تو اَنگ اَنگ مسرور تھا۔

ہم نے بھاؤ تاؤ کیا ہی نہیں، دس پودوں کا آرڈر دے دیا، جب تک ہم دفتری کارروائیوں میں مصروف رہے، ہماری گاڑی میں 'یوکلپٹس' کے دس پودے رکھے جا چکے تھے۔ ہم سرخوشی کے عالم میں دوڑنے کی حد تک تیز چلتے ہوئے گاڑی کے پاس پہنچے۔ حیرت کا ایک شدید جھٹکا سا لگا۔ کبھی ہم پودوں کو کبھی رکھنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ہماری کیفیت بھانپ گئے اور پوچھا، کیا بات ہے؟ ہم نے کہا، بھائی! ہم نے کافور مانگا تھا، یہ کیا ہے؟ وہ بولے، صاحب یہ کافور ہی ہے۔

آگہی اور نا آگہی میں کتنا فرق ہوتا ہے، یہ پودے ہم نے پاکستان میں اپنے گھر کے سامنے خود لگائے تھے، جو ہمارے سامنے ہی تناور درخت بن گئے تھے۔ ہمارے ساتھ تو افسانوں والی کوئی حرکت نہ ہوئی۔ نہ ہی کیوپڈ نے تیر چلایا، نہ ہی کبھی کوئی مہ جبیں ہمیں اُن کے نیچے کھڑی ملی۔ ہمیں یوں محسوس ہوا، جیسے 'سفیدے' کے دس پودے مسکراتے ہوئے ہمیں کہہ رہے ہوں:

پگلا کہیں کا!

ہم نے اپنے مینیجر کو وہ پودے دکھائے، اُس کی خوشی نے ہمارے شک کو یقین میں بدل دیا... واقعی آج ہم نے 'یوکلپٹس' ہی دیکھا تھا۔

* * *

میرؔ بیمار ہوئے

فکر تونسوی

میں بے حد پریشان بلکہ شرمندہ تھا...

شرمندگی کا باعث میرا نصیب تھا کہ مجھے کوئی سیریس بیماری لاحق نہیں ہوتی تھی۔ جب بھی کوئی بیماری آتی وہ نزلہ زکام میں بدل جاتی۔ زیادہ سے زیادہ سر کا درد، پیٹ کا درد، یا کوئی پھوڑا اُبھرتا اور مجھے جُل دے کر نو دو گیارہ ہو جاتا۔ احباب اور رشتے دار زیرِ ناف قسم کا طعنہ دیا کرتے کہ ان غیر ضروری بیماریوں پر کوئی آپ سے کیا ہمدردی کرے، میری بیوی تو کن اکھیوں سے کئی بار اشارے بھی کر چکی تھی کہ میں آپ کی خاطر مر مٹنے کے لیے تیار ہوں، لیکن اس مر مٹنے کی کوئی ٹھوس بنیاد بھی تو پیدا کیجیے۔

اور نہ جانے میرے کس پیارے کی دعا قبول ہوئی کہ ایک دن میں صبح کو شیو کر کے اُٹھا تو میری ایک لغزشِ پا نے پکارا، ’لینا کہ چلا میں!‘ میری بیوی جو شاید اسی نادر لمحے کے انتظار میں اَدھیڑ ہو گئی تھی فوراً ڈاکٹر کو بلا لائی۔ ڈاکٹر نے کہا، ”یہ لغزشِ پا ہی نہیں ہے، سیریس بیماری ہے۔“

بیوی کی زبان سے بے ساختہ نکلا، ”ہائے اللہ! یہ سیریس بیماری اِن کی بجائے مجھے لگ جائے۔“

ڈاکٹر نے رولنگ دی، ”یہ فیصلہ اسپتال میں جا کر ہوگا کہ بیماری کس جسم کے لیے موزوں ہے، یہ متنازعہ مسئلہ ہے۔“

اتنے میں میرے بہت سے احباب اور رشتے دار جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر سے ڈُلس موز کہا اور باری تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا کہ آخر میں تھرڈ ریٹ بیماریوں کے چنگل سے نکل آیا اور اَب راہِ راست پر چل پڑا ہوں۔ اُن کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو بھر گئے۔ انھوں نے تالیاں بجائیں، کئی ایک فرطِ انبساط سے رقص کرنے لگے۔ میری بیوی نے جذبات سے کانپتے

لفظوں میں اعلان کیا کہ وہ میرے غسلِ صحت پر یتیموں کو کھانا کھلائے گی۔ اسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے سرگوشی میں ایک دوست کو بتایا کہ نروس بریک ڈاؤن کی بیماری ہے۔ ہوسکتا ہے، کئی سال لگ جائیں۔

کئی سال؟ مجھے یتیموں کا مستقبل خطرے میں نظر آیا۔

اسپتال کے بیڈ پر لیٹتے ہی مجھے بے حد اطمینان ہوا۔ نہ پریشانی باقی رہی تھی، نہ شرمندگی ہی، بلکہ فخر سے پھولا نہ سماتا تھا کہ اب اس سیریس بیماری کی بدولت کئی لوگوں کو "Oblige" کرسکوں گا۔ میرے احباب خلوص اور ہمدردی کا فراخ دلانہ استعمال کرسکیں گے۔ رشتے داروں کو ٹھنڈی آہیں بھرنے اور آنسو تھرتھرانے کا موقع نصیب ہوگا۔ میری ایک جنبشِ لب پر وہ اپنی گردنیں کٹوانے کے لیے تیار ہوجائیں گے۔ میری آنکھ کا ایک ہلکا سا اشارہ اُن کی زنگ آلود رُوح کے بھی بند دروازے کھول دے گا۔ میرے بدن میں ایک چھوٹی سی ٹیس اُٹھے گی تو احباب مرغِ بسمل کی طرح اسپتال کی سڑک پر تڑپتے ہوئے نظر آئیں گے۔ میری بیوی ہر پُرسانِ حال کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہہ سکے گی:

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

غرض مَیں اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھتا تھا کہ زندگی میں کسی کے کام تو آیا! دوسروں کی خوشنودی کے چند لمحے بھی میسر آجائیں تو وہ سنبل و ریحان اور لعل و یاقوت وغیرہ سے کم نہیں ہوتے، ورنہ اس سے پہلے تو زندگی جیسے بے برگ و گیاہ ریگستان میں گزر رہی تھی۔ نہ کسی کے آنسو، نہ تبسّم، نہ جذبات سے چور چور ہونٹ، نہ کسی کی ہمدردی، نہ کسی کا خلوص، نہ کسی کا امتحان، نہ کوئی ممتحن۔

اسپتال میں جاتے ہی سب سے پہلے تو میرے ایک منسٹر دوست نے میرے ریگستان میں ایک پھول کھلا دیا، یعنی ایک دوست کے ٹیلی فون پر میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سے کہہ دیا کہ اس مریض کو فوراً ایک بیڈ عطا کیا جائے! اسپتال میں بیڈ میسر آنے کا مطلب ہوتا ہے، جیسے کسی بے روزگار کو اپائنٹمنٹ لیٹر مل جائے۔ میرے ایک پروفیسر دوست نے میری ہوا باندھتے ہوئے کہا، ”جی! بیڈ کیوں نہ ملتا، ان کی رسائی تو منسٹروں تک ہے۔“ مجھے منسٹروں کی اس پستی پر رحم کھانا چاہیے تھا،

لیکن منسٹری کی خوشی مجھے بیڈ مل جانے میں مضمر تھی۔ اس لیے میں اس پستی کو شہد کا گھونٹ سمجھ کر پی گیا۔

بیڈ مل جانے کے بعد میں تین چار دن تک یہ دیکھتا رہا کہ احباب اور رشتے دار نہایت سرگرم ہو گئے ہیں۔ چاروں طرف بھاگے بھاگے پھرتے ہیں۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اپنی دوڑ دھوپ کی رپورٹ لے آتے اور میرے حلق میں انڈیل دیتے۔ کوئی بتاتا اسپتال کا ہارٹ اسپیشلسٹ میرے کالج کا ساتھی ہے اور مجھ سے میتھمیٹکس کی گائیڈ بک لے جایا کرتا تھا۔ کوئی انکشاف کرتا، بلڈ بینک کے انچارج سے میں نے کہہ دیا ہے کہ آپ کی خوش نصیبی ہے، آپ کے اسپتال میں ایک عظیم مریض داخل ہوا ہے۔ یہ انچارج میری خالہ کا چوتھا بیٹا ہے۔ اگرچہ خالہ نے اُسے جائیداد سے عاق کر دیا ہے، لیکن اس کی لَو میرج سے پہلے کے بھی لَو لیٹر میں نے ہی قلم بند کر کے دیے تھے۔ ایک دوست نے تین اخباروں میں میری فوٹو اور بیماری کی خبر بے حد ولولہ انگیز انداز میں شائع کروا کے مسرت حاصل کی، جیسے اُس نے مجھے مرنے کے بعد جنت کی سیٹ دلوادی ہو! چار پانچ دوستوں نے کافی ہاؤس میں ایک ریزولیشن پاس کروا دیا کہ خدانخواستہ اگر فکر تونسوی کی موت واقع ہو گئی تو پورے کافی ہاؤس کے ممبران نہ صرف باجماعت شمشان بھومی تک جائیں گے، بلکہ پسماندگان کے لیے چندہ بھی اکٹھا کریں گے۔

یہ جان توڑ سرگرمیاں دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے سارا ہندوستان میری بیماری کی خاطر زندہ ہے، ورنہ درگور ہو گیا ہوتا! ہر روز کئی ڈاکٹر باری باری آتے اور مجھے لیبارٹری سمجھ کر تجربے شروع کر دیتے، جیسے یہ ڈاکٹر نہ ہوں، اسکول کے طالب علم ہوں اور میں ایک کاپی ہوں، جس پر وہ ہوم ورک کر رہے ہوں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ وہ میرے مرض سے خوش ہونے کی وجہ سے سرگرم ہیں، لیکن ایک بار میں نے ان کی خوشی سے بور ہو کر ایک ڈاکٹر سے پوچھا، ”جناب! کیا آپ کو مریض سے محبت ہے، یا مرض سے؟“

وہ بولا، ”مرض سے! کیوں کہ ہم مریض پر ریسرچ کر کے مرض تک پہنچتے ہیں۔ آپ پر ریسرچ کرنے سے بنی نوعِ انسان کو بھی فائدہ پہنچے گا۔“

”اور اگر میں نہ آتا تو بنی نوعِ انسان کا کیا بنتا؟“

اس کے جواب میں ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کو حکم دیا۔ اس مریض کی بی سی جی بھی کرائی جائے، دماغ میں توقع سے زیادہ خلل معلوم ہوتا ہے۔“

فکر تونسوی ...... جب ہم بیمار ہوئے

لیکن میں جانتا تھا کہ میرے دماغ کے خلل کا سبب میری بے پناہ مسرت ہے، جو مریض بن کر مجھے حاصل ہو رہی ہے۔ میں یہ سوچ کر جھوم اُٹھا کہ اسپتال میں مجھے بے حد رومانک ماحول ملے گا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ کئی آرٹسٹ لوگ اسپتال میں جا کر ناول تک لکھتے ہیں اور بیماری کو ادبِ عالیہ میں اصناف کا باعث بناتے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک نرسوں سے پیار بھی کرنے لگتے ہیں، بلکہ کئی نرسیں تو نوکری پر لات مار دیتی ہیں، اور ناول نگار کی رُوح کے نرم گوشے میں دلہن بن کر گھس جاتی ہیں۔

دوسرے دن جب میں چھم سے کسی نرس کی آمد کی انتظار میں آنکھیں بند کیے پڑا تھا، کسی نے میرا کندھا جھنجھوڑا۔ یہ واقعی نرس تھی، میرے متوقع ناول کی متوقع ہیروئن۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا نرس خوب صورت نہ تھی، خوب صورت دنیا کے جسم پر ایک چیتھڑا تھی۔ اُس نے پہلے مجھے سونگھا، پھر ماحول کو سونگھا، اور جیسے اُسے احساس ہوا کہ ماحول نامکمل ہے۔ اِس لیے اُس نے میرے بیڈ کے سرہانے ایک میلے سے گتے پر میڈیکل چارٹ لٹکا کر ماحول کو مکمل کر دیا۔

اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے میری قبر پر دِیا جلا دیا ہو!

میری بیماری اُچھلتی کودتی، چھلانگیں لگاتی ہوئی جب کئی ہفتے عبور کر گئی، تو مجھے شک ہونے لگا کہ ڈاکٹر حضرات کو خدمتِ خلق سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اِن کی حالت اُس عورت سے بہتر نہیں ہے، جو شوہر کے لیے کھانا تیار کرتی ہے، شام کو سبزی وغیرہ لاتی ہے اور صبح دودھ کے ڈپو کی لمبی قطار میں دو بوتلیں لانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرتی ہے۔ عام اصطلاح میں اسے گرہست کی خدمت کہا جاتا ہے، لیکن گرہستن سے پوچھا جائے تو وہ اِسے اُکتا دینے والی روٹین کا نام دیتی ہے۔

میرا خیال تھا اور افسوس ناک حد تک غلط خیال تھا کہ ڈاکٹر جب مریض کی خدمت کرتے ہیں تو اِسے انسانیت کا عروج سمجھتے ہیں، لیکن جب میں نے ذرا قریب ہو کر دیکھا تو یوں محسوس ہوا کہ وہ انسانیت سے اکتا چکے ہیں۔ وہ جب مریض کا بلڈ پریشر دیکھتے ہیں، یا اُس کے ہارٹ اور جگر اور پھیپھڑے کی رپورٹ کا مطالعہ کرتے ہیں تو انھیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آلو چھیل رہے ہوں، یا سبزی میں نمک مرچ مسالے کا تناسب پیدا کر رہے ہوں۔ ڈاکٹر سچ مچ ایک انار ہوتے ہیں، جس کے ایک سو نہیں، ہزار بیمار ہوتے ہیں۔ ہر بیمار سمجھتا ہے، یہ انار میرے ہی کھانے کے لیے ہے

اور ڈاکٹر کی بے بسی یہ ہے کہ وہ کسی مریض سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ ''دوست! انار کے متعلق تم جو بھی نقطۂ نگاہ بنالو، میں دخل نہ دوں گا، لیکن ظالم مجھے پانچ منٹ کی تنہائی تو عطا کردو، تاکہ میں خدمتِ خلق ے بلند ہو کر ایک سگریٹ پی سکوں۔''

ایک دن میں نے ایک ڈاکٹر سے پوچھ لیا، ''ڈاکٹر صاحب! آپ کے اندر خدمتِ خلق کا جذبہ کیوں مرگیا؟''

وہ جیسے دو دونی چار کا پہاڑا پڑھتے ہوئے بولا، ''وہ تو اُسی دن مرگیا تھا جب میں نے اِس اسپتال میں نوکری کے لیے برسوں اپنے گھٹنے اور ماتھا رگڑا۔ ایک نہایت ہی بھونڈے، غیر انسانی شکل کے ڈپٹی منسٹر کو وقت کا جہانگیر اور یوسف کہا تھا۔ انسانیت تو اِس سماج کے لیے اچھوت کا درجہ رکھتی ہے۔''

یہ سن کر مجھے شک ہوا کہ میرے جذبے اچھوت ہیں۔ ڈاکٹر میرے جذبوں کو ہاتھ لگانا نہیں چاہتا۔ وہ صرف اسپتال کے مردہ قاعدے قانون کے چوکھٹے میں گھومے جارہا ہے۔ اس چوکھٹے کے باہر کی دنیا اچھوتوں کی دنیا ہے۔ اس چوکھٹے میں انسانیت داخل نہیں ہوسکتی۔ ڈاکٹر اِس چوکھٹے ے باہر آکر اچھوتوں کو چھونا نہیں چاہتا۔ جو مریض اسپتال میں اِس خیال سے داخل ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اُس کا انتظار کر رہا ہے اور لپک کر مریض کے جسم میں خدمتِ خلق کا انجکشن دے دے گا اور ناچ اُٹھے گا، ایسے مریض کو چاہیے کہ وہ اچھوت ہی رہے تو اچھا ہے۔ ڈاکٹر کے لیے سب مریض برابر ہیں، سب بور ہیں، سب اچھوت ہیں۔

بھونڈے ڈپٹی منسٹر نے ڈاکٹر سے انسانیت چھین لی۔ اب تو وہ کسی لیڈی ڈاکٹر سے بھی پیار کرنے سے پہلے دیکھ لیتا ہے کہ اُس کی تنخواہ کتنی ہے؟

احباب اور رشتے داروں تک میرے وارڈ اور بیڈ نمبر کی باقاعدہ اطلاع پہنچادی گئی تھی۔ ایک دوست نے خلوص کی بلندیوں پر کھڑے ہوکر مشورہ دیا کہ بیڈ نمبر اخباروں میں چھپوادیا جائے۔ چھپ جانے کے بعد وہ اپنے فرضِ منصبی سے چھٹکارا پاگئے اور کبھی اسپتال میں نہ آئے۔ باقاعدہ اطلاع کے باوجود (سنا ہے) یار دوست ایک دوسرے سے پوچھتے پھرتے، ''بھائی! فکر صاحب کا بیڈ نمبر کون سا ہے؟''

شروع شروع میں خلوص کے ماروں کی آمد زور پر رہی۔ اُن کی آمد پر میرا دل بلیوں اُچھلتا

اور میں بھول جاتا کہ میں بیمار ہوں۔ ہر ملاقاتی یہ جھوٹ بول کر بہت خوش ہوتا، ''اجی آپ تو بالکل بھلے چنگے ہیں، ورنہ ایسے اعصابی امراض میں تو انسان ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جاتا ہے!''

جوں جوں وہ میرا دل بڑھاتے، میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتا چلا جاتا، لیکن پھر بھی میرا جی چاہتا، میری ہڈیوں کی مزید تعداد نمایاں ہوتی چلی جائے، تاکہ میں پُرسانِ حال کی محبت کے لذیذ جام لنڈھاتا رہا ہوں۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ میری اس سازشی پلاننگ کا علم احباب اور رشتے داروں کو ہوگیا ہے۔ آہستہ آہستہ ان کی تعداد کم ہوتی گئی، یہاں تک کہ ایک دن نظروں سے بالکل اوجھل ہوگئی اور میرے بیڈ کے پاس صرف چند شیشیاں، ایک میڈیکل چارٹ اور ایک بیوی رہ گئی! شاید پُرسانِ حال نے میرے مرض کی بو سونگھ لی کہ یہ مرض طولِ شبِ فراق کی مانند بڑھ گیا ہے اور زندگی صرف مریض کے گرد تو نہیں گھومتی، کئی اور اہم کام بھی ہیں۔ مثلاً، پتنگ اُڑانا ہے، بلیک مارکٹنگ کرنی ہے، لڑکیوں سے چھیڑ کرنی ہے، پڑوسیوں سے لڑائی جھگڑا کرنا ہے۔ غرض سیکڑوں ضروری کام ہیں۔ فکر تونسوی کا مرض زندگی کا ایک حقیر سا حصہ ہے۔ ایک گھٹیا سی روٹین ہے ہنھ!

سیکڑوں مریض ہر روز صبح اسپتال کی او پی ڈی کی کھڑکی کے سامنے کیو بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بھلا بیمار ہونا بھی انسان کی کوئی بنیادی ضرورت ہے!

اور یوں آہستہ آہستہ میں غیر دلچسپ ہوگیا۔ ہمدردی اور خلوص کا سیلاب ایک دم تیزی سے شام کے سورج کی طرح ڈوب گیا، یہاں تک کہ ڈوبتی شعاعوں کی سرخی بھی نظروں سے اوجھل ہوگئی اور میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ مرض کو عادت نہ بنانا چاہیے۔ اتنی بڑی کائنات ہے اور ایک انسان اس میں ایک بے حد مدھم ہوتا ہوا نقطہ ہے، جس سے کوئی لفظ نہیں بنتا، کوئی لکیر نہیں بنتی۔ اس نقطے پر انسانیت اور محبت اور خلوص وغیرہ وغیرہ چیزوں کی بنیاد رکھنا خالی خولی جذباتی پن ہے۔

بمبئی سے ایک افسانہ نگار دوست نے خط لکھا:

''تم بڑے خوش قسمت ہو کہ دہلی میں بیمار پڑے ہو۔ اور (سنا ہے) تمھارے پُرسانِ حال تمھاری اس بیماری کو غنیمت سمجھ کر جوق در جوق تمھیں پوچھنے کے لیے بھی آتے رہتے ہیں، لیکن میری بدبختی کہ میں بمبئی میں بیمار ہوں، جہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں کہ کس حال میں ہے؟ یہاں کا ہر فرد اپنے بدن کی مختصر سی دنیا کے باہر دیکھ ہی نہیں سکتا! میں سمجھتا تھا، ان کے پاس جذبات کی کمی ہے، لیکن اب معلوم ہوا، فرصت کی کمی ہے۔ جتنے وقت میں وہ مجھے پوچھنے کے لیے آئیں، اتنے

وقت میں وہ اپنے مالک مکان سے تُو تُو میں میں کر سکتے ہیں، جو میری بیماری کی خاطر ملتوی نہیں کی جا سکتی۔ چھ ماہ سے اپنے گھر میں پڑا ہوں اور کسی پُرسانِ حال کو ترس گیا ہوں۔ کل کسی نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو میں بے حد جذباتی ہو گیا کہ آخر کسی پُرسانِ حال کے دل میں خلوص جاگا۔ میں اٹنشن ہو گیا اور مریضوں کی طرح ہائے ہائے کرنے لگا۔ نو وارد نے پوچھا، ”صاحب! کیا بات ہے۔ آپ تو کچھ بیمار معلوم ہوتے ہیں۔ کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج کرائیے۔ جلدی تندرست ہو جائیے، کیوں کہ ہندوستانی ادب کو ابھی آپ سے بہت اُمیدیں ہیں۔ میں آج بائی دی وے آپ کے گھر میں ایک ضروری ٹیلی فون کرنے آیا تھا، اجازت ہو تو کر لوں؟“

بمبئی کے اس دوست کے خط سے مجھے آبدیدہ ہو جانا چاہیے تھا، لیکن میرے پاس تھیٹر کے ایک پروڈیوسر دوست بیٹھے تھے، اس لیے میں نے جذباتی ہونا مناسب نہ سمجھا، کیوں کہ وہ کہہ رہے تھے، ”فکر صاحب! آپ تو بیماری سے چمٹ ہی گئے ہیں۔ میں پوچھنے آیا تھا کہ وہ ڈراما، جس کے ابھی تین منظر قلمبند کرنا باقی ہیں، ان کا کیا بنے گا؟ ڈرامے کا مکمل ہونا تو بے حد ضروری ہے۔

”جنابِ من! ڈرامے سے زیادہ میری بیماری ضروری ہے۔ میں تو غسلِ صحت کے بعد ہی وہ سین لکھ سکوں گا۔“ میں نے کہا۔

”آپ جلد از جلد تندرست ہو جائیے۔ ہمارا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ یہ لیجیے، آپ کے لیے آلو بخارا لایا ہوں۔ کھائیے اور سوچیے کہ کیا دورانِ مرض آپ ڈراما مکمل نہیں کر سکتے؟“

دنیا ستمگر نہیں ہے، بلکہ اُس کی مجبوری ہے، کیوں کہ اُسے مرض سے زیادہ اپنے ڈرامے سے محبت ہے اور محبت کے بغیر وہ سانس نہیں لے سکتی۔

ایک نزدیکی رشتے دار (کم از کم وہ بدستور مجھے رشتے دار کہتے تھے) بہت سنجیدہ غم اپنی پلکوں پر تھرتھراتے ہوئے میرے بیڈ کے پاس آئے، میڈیکل چارٹ اُٹھا کر آنکھوں سے لگایا اور بولے، ”خدا چاہے گا تو آپ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔“

میں نے عرض کیا، ”آپ کو اتنی جلدی کیا ہے؟“

وہ روہانسے ہو کر بولے، ”آپ بیماری میں بھی مذاق سے باز نہیں آتے۔ آپ کی بھتیجی کے بیاہ کا مسئلہ تھا۔ آپ کی بیماری کے باعث اٹکا ہوا ہے۔ تاریخ مقرر کرنا ہے، لڑکے والے بہت پریشان کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کَل جگ ہے، کسی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔“

میں نے ان سے ہمدردی کرتے ہوئے کہا، ”غلطی میری تھی کہ کل جگ میں بیمار ہوا۔ آپ بیاہ کر دیجیے، میری بیماری پر بھروسا مت کیجیے۔“

چند دن بعد معلوم ہوا، انھوں نے بیاہ کر دیا ہے۔ میری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکل سکا، جسے میں اُن کے دعوتی کارڈ پر گرا سکتا، البتہ میں نے ایک دانشمندانہ قدم ضرور اُٹھایا کہ اسپتال کے قواعد توڑ کر گھر آ گیا۔ پُرسانِ حال پر بھروسا کر کے بیمار رہتے چلا جانا مجھے غیر ضروری معلوم ہوا۔

گھر آ کر ایک اور قریبی رشتے دار کا پیغام ملا کہ میرا بڑا لڑکا جوئے میں گرفتار ہو گیا تھا، اس پریشانی میں آپ کو پوچھنے کے لیے حاضر نہ ہو سکا۔ ایک دس سالہ پرانے دوست کو کاغذ کی ایک چٹ لکھ کر بھجوائی کہ میں تمھارے ہجر میں تڑپ رہا ہوں، اسپتال میں نہیں آئے تو گھر پر ہی آ جاؤ۔ اس نے اسی چٹ کی پشت پر جواب دیا، ”اب تم نے مجھے شرمندہ کرنے کی ٹھانی ہے، اس لیے میں تمھیں شکل نہیں دکھا سکتا۔ میں تمھیں نارمل حالت ہی میں دیکھ سکتا ہوں۔ بیمار حالت میں تمھیں دیکھنا میری قوتِ برداشت سے باہر ہے۔“

ایک اور دوست سے کافی ہاؤس میں ملاقات ہوئی۔ ہنس کر بولے، ”میں نے سنا تو ضرور تھا کہ تم بیمار ہو، لیکن میں نے سوچا مذاق کرنا تمھاری عادت ہے۔ شاید تم نے بیماری سے بھی مذاق کیا ہوگا۔ اب کیسے ہو؟“

اس کے بعد ہر رشتے دار اور دوست کے گھر جا کر اطلاع دے آیا کہ میں اب بھی بیمار ہوں۔ اس لیے موقع غنیمت ہے، آ کر میری پرسشِ حال کر جاؤ۔ ایک صاحب اُلٹے مجھ سے شکایت کرنے لگے، ”واہ فکر صاحب! آپ نے بھی کمال کر دیا! میں اسپتال میں آپ کی صورتِ حالات پوچھنے کو پہنچا تو معلوم ہوا، آپ ڈسچارج ہو کر گھر چلے گئے۔ آخر اتنی بھی کیا جلدی تھی؟“ ایک دوسرے رشتے دار کو دوسری شکایت تھی کہ میں اسپتال میں دو گھنٹے تک ہڈیاں جوڑنے والے وارڈ میں آپ کو ڈھونڈتا پھرا، لیکن ناکام لوٹ آیا۔ کم از کم یہ بتا دینا تو آپ کا فرض تھا کہ آپ کی ہڈی نہیں ٹوٹی، بلکہ اعصابی نظام ٹوٹا ہے۔

میں نے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ موقع ملا تو ہڈی ہی تڑواؤں گا۔

اسپتال سے باہر آ کر میں نے محسوس کیا کہ دنیا ویسی کی ویسی ہی ہے، کسی کو کسی سے دلچسپی نہیں۔ ہر آدمی ایک دوسرے کے ساتھ قہقہے لگانے میں مصروف ہے۔ ان کی محفل میں کون آیا، کون

گیا، کون مر گیا، کس کی ہڈی ٹوٹ گئی، کس کی آنکھ پھوٹ گئی، کون دیوالیہ ہو گیا، کس کی لاٹری نکل آئی؟ ان تمام تبدیلیوں سے بے نیاز اِس دنیا کا ہر آدمی اپنے ہی چند سانسوں میں مگن ہے اور مجھے بھی اپنی ان محفلوں میں انھوں نے یوں کھپالیا، جیسے میں کبھی بیمار نہ ہوا تھا اور جیسے کہ میں ان کی خاطر بیمار نہیں ہوا تھا، بلکہ اپنے بدن کی آزمائش کرنے کے لیے بیمار ہوا تھا۔

البتہ پُرسانِ حال اب بھی شاید خلوص و محبت کے مارے مجھ سے میری صحت کے بارے میں پوچھ لیتے ہیں اور اِس بات پر بہت افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ میں نہایت غلط دوائیں لیتا رہا۔ وہ مجھے مشورہ دیتے ہیں، مختلف نسخے بتاتے ہیں کہ میں ان پر عمل کروں تو بالکل تندرست ہو جاؤں گا، بلکہ ایک دوست تو مجھے اپنے گھر لے گئے اور میرے ہاتھ میں دوا کی ایک شیشی تھماتے ہوئے بولے، ”اسے استعمال کیجیے، تیر بہدف ہے!“

”آپ نے ڈاکٹری کا یہ فن کہاں سے سیکھا؟“ میں نے ان سے پوچھا۔

وہ گردن پھلا کر بولے، ”اجی میرے والد صاحب عطار تھے۔“

اور میں گردن جھکا کر گنگنانے لگا:

میر کیا سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

* *

ڈاکیا

قاسم بن نظر

ڈاکیا ہمارے معاشرے کی اتنی نابغۂ روزگار شخصیت ہے کہ اس کا تعارف ہمارے نصاب کی ایک کتاب میں ملتا ہے۔ ڈاکیے کی وجہ سے ہمیں اپنے عزیز و اقارب کو خطوط بھیجنے پڑتے ہیں۔ ڈاکیوں کے نقشِ قدم پر اُڑ کر کسی زمانے میں کبوتروں نے بھی یہی روزگار اپنایا۔ وہ البتہ ٹکٹ کے پیسے وصول نہیں کرتے تھے۔ دانہ دنکا یا اجرہ وصول کرتے تھے، ڈاکیا یہ نہیں کر سکتا۔

زمانۂ جنگ میں خط سنسر ہو کر پہنچائے جاتے ہیں (زمانۂ امن میں یہ دونوں کام نہیں ہوتے)۔ ڈاکیے کی نظریں اتنی تیز ہوتی ہیں، جتنی کہ شکرے یا عقاب کی بھی نہیں ہوتیں۔ وہ لفافے کے اندر خط کی حساسیت کا پتا چلا لیتا ہے کہ یہ کہیں قومی مفاد کے خلاف تو نہیں۔ کسی ڈاکیے نے کیا خوب کہا ہے:

خط کا مضموں بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر

ڈاک کا نظام کافی سُست ہے۔ اگر بل تقسیم کرنے کا نظام ڈاکیے کے پاس ہوتا تو آپ اپنا بل سالانہ بنیادوں پر جمع کراتے۔ ڈاکیا قارئین کے خطوط اور انعامی مقابلوں کے جوابات تاریخ گزر جانے کے بعد پہنچاتا ہے۔ مزید ستم یہ ہے کہ وہ غیر معیاری کہانیاں مدیر تک پہنچا دیتا ہے اور معیاری اور دلچسپ کہانیاں گُم کر دیتا ہے (شاید اپنے بچوں کو پڑھوا دیتا ہو)۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ڈاکیا کتنا بڑا نقاد ہے۔ تحفے تحائف کے بارے میں بھی ہم کچھ ایسا ہی قیاس کر سکتے ہیں، اس لیے ہمیشہ 'رجسٹرڈ پروڈکٹس' ہی تحفے میں بھیجنی چاہئیں!

ڈاکیا کبھی کبھی مہینوں تک اپنی شکل نہیں دکھاتا (اس میں شکل کا کوئی قصور نہیں)۔ پھر اچانک کسی دن کوئی ایک آدھ خط آپ کے گھر پہنچاتا ہے اور واپس اس وقت تک نہیں جاتا، جب تک آپ اسے دس روپے ٹپ کے طور پر نہ دے دیں۔ ڈاکیے کی اسی ادا کا نقشہ مرزا غالبؔ نے کتنے

خوب صورت انداز میں کھینچا ہے:

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر!

اربابِ اختیار کے یہ دعوے ہم کئی سالوں سے سن رہے ہیں کہ ڈاک کا نظام بہتر بنایا جائے گا، مگر:

کوئی امید بر نہیں آتی

خطوط پہنچانے کے نظام کو جدید خطوط پر استوار کیا جانا چاہیے۔ کوریئر سروس کی افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے، مگر ڈاکیا کی سروس ایک چیپ سروس ہے۔ یہاں ہم نے چیپ سے مراد سُستی ہونے لی ہے، شاید اسی لیے ڈاکیے پر سُستی کا عنصر غالب رہتا ہے۔ ڈاک پہنچانے کی رفتار کا اندازہ ڈاک خانوں کے پنکھوں کی رفتار سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ وہ بھی ڈاکیے کو دیکھ دیکھ کر سُست رفتار ہو چکے ہوتے ہیں، یا شاید ڈاکیے کا حال اِن پنکھوں کی وجہ سے خراب ہوتا ہو۔

ڈاک میں تار کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی تھی۔ ایک گاؤں سے ہمارے کسی بزرگ نے شکایتی خط بھیجا، جس میں ہمیں کم اَز کم تار بھیجنے کی نصیحت کی گئی تھی۔ ہم سمجھے کہ ان کے گاؤں میں بجلی کے اتصال کا کوئی معقول بندوبست نہیں، لہٰذا ہم فوراً بذریعہ ٹرین عمدہ کوالٹی کے تار لے کر گاؤں پہنچ گئے! وہاں جا کر تار بھیجنے کا مطلب سمجھ میں آیا۔

ڈاک کے ذریعے سے رقوم بھی بھیجی جا سکتی ہیں۔ ڈاکیا زیادہ بڑی رقم نہیں لے جا سکتا (کیوں کہ لالچ بُری بلا ہوتی ہے)۔ ایک ارجنٹ مَیل سروس "UMS" بھی ہوتی ہے۔ ایک بھلے مانس اسے "**Urgent Meal Service**" پڑھتے ہیں اور اِس کا تعلق پیزا اور برگر ڈیلیور کرنے والی کمپنیوں سے جوڑتے ہیں۔

ڈاک خانے سے کچھ فاصلے پر ایک لیٹر بکس ہوتا ہے۔ اس میں ہر وقت تالا پڑا رہتا ہے۔ اس میں ایک سوراخ ہوتا ہے، جو خط ڈالنے کے لیے ہوتا ہے (ہاتھ ڈالنے کے لیے نہیں) اسی لیے لیٹر بکس میں ڈالے گئے خط ہمیشہ اسی میں پڑے رہتے ہیں۔

آپ ڈاک خانے میں لفافہ گوند سے چپکائیں، لفافہ خشک کرتے کرتے آپ پسینے میں نہا جائیں گے اور آئندہ ڈاک خانے نہ جانے کا تہیہ کر لیں گے۔ وہاں گوند کو پانی میں ملا کر رکھا جاتا ہے، کیوں کہ خشک گوند تو اَب لفافے کے کناروں پر لگی ہوتی ہے۔ لوگ گوند کو اتنی فضول خرچی سے

ضائع کرتے ہیں، جیسے وہ ڈاک خانے میں نہیں، گوند کی فیکٹری میں کھڑے ہوں۔ نتیجتاً لفافے کے اندر موجود خط بھی لفافے سے چپک جاتا ہے۔ لفافہ بند کرنے کے لیے چیونگم کا استعمال بھی کیا جاسکتا ہے، ایسے چیونگم بند لفافوں کا منہ برف ٹکور کر کھولا جاسکتا ہے۔

ڈاک کا نظام کب وجود میں آیا؟ تاریخ اس بارے میں کوئی ٹھوس شواہد پیش نہیں کرتی۔ ڈاک کا نظام آنے سے پہلے ڈاکیے کیا کیا کرتے تھے؟ یہ بھی تاریخ کا ایک اہم راز ہے (ہوسکتا ہے، کوئی اچھا کام کرتے ہوں)۔

ڈاکیے سائیکل پر آیا جایا کرتے تھے۔ پھر ذرائع آمدورفت نے ترقی کی، کاریں اور موٹر سائیکلیں ایجاد ہوئیں، مگر ڈاکیے سائیکل سے بھی محروم ہوگئے! لگتا ہے، ڈاک خانے والوں کو اس ترقی کی ہوا نہیں لگی۔ شاید اسی لیے وہ اپنے آپ کو اطلاعات رسانی کا ستون گردانتے ہیں! ستون زیرِ زمین ہوتا ہے، شاید اسی لیے پوسٹ آفس میں گرمی زیادہ ہوتی ہے۔

ہم نے ڈاک کے نظام کی خامیوں اور ڈاکیے کی فلاح سے متعلق شکایات دو مرتبہ ایک موقر روزنامے میں بھیجیں، مگر وہ شائع نہ ہوسکیں۔ تیسری مرتبہ ڈاکیے کی ترقی کی تجاویز بھیجیں تو وہ جلدی شائع ہوگئیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

- ڈاکیے کی تنخواہ بیس سے پچیس ہزار روپے مقرر کی جائے۔
- خطوط پہنچانے کے لیے ریس میں استعمال ہونے والی کاریں فراہم کی جائیں۔
- سب سے زیادہ خطوط پہنچانے والے کو انعام دیا جائے۔
- ادبی جرائد بروقت پہنچانے والے کو اَدبی خطابات سے نوازا جائے، جیسے 'اَدب دوست'، 'اَدب پرست'، 'محسنِ اَدب'، 'بااَدب بانصیب' وغیرہ۔
- ڈاکیے کا معاشرے میں اہم مقام ہے اور وہ مقام ہے پوسٹ آفس، لہٰذا پوسٹ آفس کو خوش نما اور دیدہ زیب بنایا جائے۔ ممکن ہو تو اُنھیں ایئر کنڈیشنر سے بھی آراستہ کیا جائے۔

شاعر حضرات بھی ڈاکیے سے خاصے نالاں اور شاکی نظر آتے ہیں، جیسے ڈاکیے نے ان کا اُدھار کھا رکھا ہو۔ میر دردؔ نے تو یہاں تک کہہ دیا:

قاصد ترا یہ کام نہیں اپنی راہ لے
اُس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

ڈاکیے اب خاکی رنگ کی وردی نہیں پہنتے کہ یہ فیشن اب متروک ہو چکا ہے۔

کیا لکھوں، کیا نہ لکھوں؟

قدرت اللہ شہاب

“نیم حکیم خطرہ جان اور نیم ملا خطرہ ایمان” ہو یا نہ ہو لیکن نیم ادیب ضرور خطرہ زبان و بیان ہوتا ہے اور اگر یہ سچ ہے کہ ہر ادیب میں کوئی نہ کوئی صفت کریلے کی ہوتی ہے تو نیم ادیب بجا طور پر نیم چڑھا کریلا کہلانے کا حق رکھتا ہے۔

چوں کہ میں بھی اپنا شمار نہایت سنجیدگی سے نیم ادیبوں کے زمرے میں کرتا ہوں لہٰذا اگر میری تحریر میں کڑوا کسیلا پن آجائے تو عین متضائے طبیعت ہے۔

کسی نیم ادیب سے یہ کہنا کہ تم اپنے فن کے بارے میں اپنے نظریات بیان کرو، تقریباً تقریباً ایسا ہی ہے جیسے کہ ایک عورت ہو۔ اس کی منگنی تو طے پا گئی ہو لیکن شادی کی رسم ابھی ادا نہ ہوئی ہو۔ اور پھر اس سے فرمائش کی جائے کہ وہ بھری محفل میں بیٹھ کر اپنے شب عروسی کے تجربات کھول کھول کر بیان کرے۔

جب کبھی مجھے اپنے فن کے بارے میں کسی سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو معاً میری زبان پر یہ سکہ بند جواب آتا ہے کہ ارے صاحب! من آنم کہ من دانم۔ میں کیا اور میرا فن کیا۔ لیکن اگر سوال پوچھنے والا پُرزور اصرار شروع کر دے تو نہایت معنی خیز اور قدرے درویشانہ لہجے میں جواب دیتا ہوں کہ جناب! آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں! اور اما بعد انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا۔ لیکن اس قسم کے جور غیر ادیبوں کی دکھتی ہوئی رگ تحقیق کو سنبھالنے کے لیے تراشنے پڑتے ہیں۔ ورنہ آپ صاحبوں سے کیا پردہ۔ خدا لگتی بات یہ ہے کہ مجھ پر تادم تحریر انسانوں کی وحی یا مضامین کا من و سلویٰ کبھی غیب سے نازل نہیں ہوا۔ اسے میری بد نصیبی سمجھیے یا فنی کمزوری یا ادبی صلاحیت کا فقدان۔ سچ تو بہر حال یہی ہے۔ مثلاً آج تک میرے افسانوں کا کوئی کردار اپنے آپ، بیٹھے بٹھائے، بلا اشتعال، بہ نفسِ نفیس میرے پاس نہیں آیا کہ افسانہ نگار صاحب السلام علیکم! بندہ حاضرِ خدمت

ہے۔ اب آپ مجھے سامنے بٹھا کر کہانی لکھیے یا جوتے ماریے۔ اور نہ کبھی یوں ہوا ہے کہ اچانک راہ چلتے یا سوتے، یا جاگتے کوئی پلاٹ پکے ہوئے آم کی طرح ٹپک کر جھولی میں آ گرے۔ اس کے برعکس ہوتا عموماً یہی ہے کہ کرداروں کا تعاقب اور مضامین کی جستجو کرنی پڑتی ہے۔ اس تلاش میں ایسی ایسی گھاٹیوں میں سرگرداں رہنا پڑتا ہے کہ حق کی بات اُٹھائے تو کفِ دردِ دشمن مسلمان ہونے کا جرم عائد ہو جاتا ہے۔ باطل کا ذکر چھیڑیے تو کفر کے فتوے کا خطرہ دامن گیر ہوتا ہے۔ صراطِ مستقیم کو پکڑیے تو ملائیت کا الزام۔ داہنی طرف جا بھٹکیے تو رجعت پسندی کا جنگل۔ بائیں جانب گھومیے تو ترقی پسندی کا صحرا اور اگر ان بھول بھلیوں میں بھٹکتے بھٹکتے پریشان ہو کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہیے تو ادب میں جمود کی قلفیاں جمانے کی ذمہ داری بھی اپنی ہی گردن پر سوار رہتی ہے۔ گویا ایک نہیں ہزاروں بکھیڑے ہیں لکھے تو کیا لکھے اور نہ لکھے تو کیا نہ لکھے۔

* * *

پرہیز

کرشن چندر

میں نے دیکھا ہے کہ قدرت ہر حال میں اپنا توازن برقرار رکھتی ہے۔ ہم نے زکام، نزلہ، بخار اور نمونیا کے لیے پینسلین ایجاد کی تو قدرت نے پینسلین ہی کو مہلک بنا دیا۔ اب اتنے لوگ نمونیے سے نہیں مرتے، جتنے پینسلین سے مرتے ہیں! ہم نے اربوں روپے خرچ کر کے عالمگیر پیمانے پر ملیریا کو ختم کر دیا تو کینسر کا مرض وبائی صورت اختیار کر گیا۔ ہم نے تپ دق کا شافی علاج دریافت کر لیا تو دل کا عارضہ عام ہو گیا۔ جسے دیکھیے اپنے سینے کے بائیں طرف ہاتھ رکھے متوحش نگاہوں سے ڈرا سہما دکھائی دیتا ہے۔ میرے دوستوں میں ہر چوتھا دوست دل کا مریض ہے۔ پہلے دل کی بیماری میں صرف آہ و بکا کی جاتی تھی۔ اب جان بھی جاتی ہے۔

دل کا عارضہ رنج و غم کرنے سے بڑھتا ہے، اسی لیے ساری دنیا کے ہارٹ اسپیشلسٹ یہی کہتے ہیں کہ اگر دل کے عارضے سے محفوظ رہنا چاہتے ہو اور لمبی عمر پانا چاہتے ہو تو رنج و محن کو کبھی اپنے قریب پھٹکنے نہ دو۔ ہمیشہ خوش رہا کرو، اس لیے اب میں ہمیشہ خوش رہتا ہوں۔ گزشتہ سال میرے والد کا انتقال ہو گیا تو میں برابر مسکراتا رہا۔ احباب تعزیت کو آتے رہے، مگر میں مسکراتا رہا۔ نجانے انہوں نے کیا سمجھا، مگر میں تو ڈاکٹر کے کہنے پر عمل کر رہا تھا۔ پھر جب چھ ماہ بعد میری خالہؒ محترمہ کا انتقال ہوا تو میں خوش رہنے کے لیے ایک پکچر ہاؤس میں ایک طربیہ فلم دیکھنے چلا گیا۔ پرسوں میرے گھر میں آگ لگ گئی تو میں خوشی سے قہقہے لگانے لگا۔ میری بیوی نے سمجھا شاید میں پاگل ہو چکا ہوں، مگر جب میں نے اُسے سمجھایا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔ محض خوش ہوں اور خوش بھی اس لیے ہوں کہ اس سے عمر بڑھتی ہے تو اس نے پاگل خانے لے جانے والی ایمبولینس واپس کر دی، مگر میں دیکھ رہا تھا وہ ایمبولینس واپس کر دینے پر کچھ خوش نظر نہیں آتی۔

فکر کو دور رکھنے اور دل کو ہمیشہ خوش رکھنے کے علاوہ آج کل ڈاکٹر لوگ اور خصوصاً ہارٹ

انور احمد علوی

اسپیشلسٹ دل کی بیماری کے مریضوں یا ہونے والے مریضوں کو وزن گھٹانے کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی رائے میں طویل عمر پانے کا ایک ہی نسخہ ہے۔ اپنا وزن گھٹا دو۔ مجھے اس دلیل میں وزن نظر آتا ہے۔ کیوں کہ میں نے سنا ہے، مجنوں لیلیٰ کے مرجانے کے بعد بھی پچھتر برس زندہ رہا! میں نے سنا ہے اور فلموں میں بھی دیکھا ہے کہ اس کا وزن اتنا کم تھا کہ جب اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوتا تو اس کے دوست اور احباب محض ایک پھونک مار کر اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتے تھے۔ ایک بار زور کی پھونک لگ جانے سے وہ اپنی منزل سے کچھ دُور دریا میں گر پڑا، مگر ڈوب نہ سکا، کیوں کہ اس کا وزن پانی سے بھی کم تھا۔ پھر ایک مچھلی نے پھونک ماری اور وہ واپس اپنے احباب کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا گریبان ہمیشہ چاک رہتا تھا، کیوں کہ اس کا تن ناتواں کپڑوں کا بوجھ نہ سہار سکتا تھا۔ لیلیٰ کے مرنے کے بعد مجنوں نے کئی بار مرنے کی کوشش کی، مگر ہمیشہ ناکام رہا۔ ڈوب وہ نہ سکا۔ زہر کھایا تو زہر سیال بن کر اس کے جسم سے نکل گیا، اس لیے کہ زہر کا وزن مجنوں کے وزن سے زیادہ تھا۔ ایک بار مجنوں نے ایک کانٹے سے ایک پتلا دھاگا لٹکا کر پھانسی گلے میں لگا کر مرجانے کی سوچی۔ دس سال تک وہ اس دھاگے سے بندھا کانٹے سے لگا لٹکتا رہا، مگر اس کی جان نہ نکلی، کیوں کہ اس کا وزن دھاگے اور کانٹوں دونوں سے کم تھا۔ پھر ایک دن ایک لڑکے نے اس دھاگے کو مچھلی پکڑنے کا دھاگا سمجھ کر پانی میں لٹکا دیا۔ جہاں مجنوں کو ایک مچھلی نے نگل لیا، لیکن وہ اُسے ہضم نہ کر سکی، کیوں کہ ہضم کرنے کے لیے بھی وزن چاہیے، اس لیے مجنوں پھر پانی کی سطح پر اُگل دیا گیا۔ لوگ باگ کہتے ہیں، مگر میں نہیں جانتا۔ خدا جانے کہاں تک سچ ہے، مگر سبھی دیوانے اور فرزانے بھی کہتے ہیں کہ مجنوں آج بھی زندہ ہے۔ کچھ لوگوں کو دیکھ کر تو یہی گمان ہوتا ہے۔ اس کہانی میں اور کوئی صداقت ہو نہ ہو، اتنا ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ آدمی وزن گھٹانے سے دل کی بیماری سے محفوظ رہتا ہے۔ دوسرے عوارض اُس پر اس لیے حملہ نہیں کرتے کہ انہیں حملہ کر کے ملے گا کیا؟ اس لیے درازیِ عمر کی دعا کرنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اپنا وزن گھٹا لیا جائے۔

وزن گھٹانے سے پہلے یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ وزن بڑھتا کیسے ہے؟ پہلے یہ خیال عام تھا کہ وزن آپ ہی آپ بڑھتا ہے اور بچپن سے بڑھاپے تک ایک خاص مقدار اور رفتار سے بڑھتا رہتا ہے۔ پہلے یہ خیال عام تھا اب یہ خیال خام ہے۔ اب ڈاکٹروں نے یہ ثابت کر دیا؟

رہبر ادب پبلی کیشنز

کرشن چندر ...... پرہیز

کہ وزن خود بخود نہیں بڑھتا، زیادہ اور عمدہ کھانوں سے بڑھتا ہے۔ جس گھر میں اچھا باورچی یا اچھا کھانا پکانے والی بیوی ہوگی اس کے گھر کے مالک کو دل کا عارضہ کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔ یہ لازم ہے کہ اگر آپ دل کے عارضے میں مبتلا نہیں ہونا چاہتے تو ایسا باورچی یا ایسی بیوی لائیے جو کھانا پکانا نہ جانتی ہوں۔ اس لیے آج کل طلاق عام ہو رہی ہے۔ پھوہڑ بیویوں کو ترجیح دی جانے لگی ہے اور اچھا کھانا پکانا اور اصلی گھی استعمال کر کے اپنے شوہر کو کھلانا بیویوں کی خامی اور نقائص میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ پرسوں میں نے اخبار میں ایک مقدمے کی رُوداد پڑھی، جس میں شوہر نے اپنی بیوی پر زہر دینے کا الزام لگایا تھا۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ بیوی اپنے شوہر کو اصلی گھی میں کڑے مصالحے کا قورمہ تیار کر کے کھلاتی تھی! عدالت نے مجرمہ کو چھ سال قید بامشقت کی سزا دی ہے، کیوں کہ ملزمہ اپنے شوہر کو اصلی گھی ہی نہیں کھلاتی تھی صبح ناشتا میں ایک گلاس اصلی دودھ بھی زبردستی پلاتی تھی، تاکہ اس کے شوہر کا وزن بڑھ جائے اور وہ وزن بڑھ جانے سے دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر جلدی مر جائے۔ لیکن آج کل جج عاقل اور دانشمند ہوتے جا رہے ہیں پہلے پوسٹ مارٹم پر ڈاکٹروں کی رائے طلب کی جاتی تھی اب سنا ہے عدالت فیصلہ سنانے سے پہلے اس قسم کے وزن بڑھانے والے کیس پر ڈاکٹر کی رائے بھی لیتی ہے اور اسے ناطق سمجھا جاتا ہے۔ سنا ہے کہ آل انڈیا میڈیکل ایسوسی ایشن نے ایک ایسی تجویز حکومت کے سامنے رکھی ہے کہ جو عورت اپنے شوہر کو اصلی گھی کھلائے، اصلی دودھ پلائے اور مرغن کھانے کھلائے اسے فوراً پھانسی دے دی جائے! لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ وزن صرف اصلی گھی کھانے اور اصلی دودھ پینے اور گوشت کے مرغن کھانوں ہی سے نہیں بڑھتا وزن دراصل غذا میں نشاستہ کی زیادتی سے بڑھتا ہے اور نشاستہ آلو میں سب سے زیادہ ہوتا ہے، جوں جوں لوگ آلو زیادہ کھاتے جاتے ہیں وزن میں بھالو بنتے جاتے ہیں، اس لیے اگر وزن کم کرنا ہے تو آلو مت کھائیے۔ نشاستہ روٹی میں بھی ہوتا ہے اور ڈبل روٹی میں تو اصلی روٹی سے بھی ڈبل ہوتا ہے، اسی لیے تو اسے ڈبل روٹی کہا جاتا ہے، اس لیے جہاں تک ہو سکے روٹی سے اجتناب کیجیے پہلے زمانے میں لوگ روزی روٹی کے لیے تگ و دو کرتے تھے اور دونوں کو حاصل کر کے موٹے ہو ہو کر مر جاتے تھے۔ اب صرف روزی کے لیے تگ و دو کیجیے اور روٹی کو بالکل ہی بھول جائیے۔ نشاستہ اس لیے بھی بُرا ہے کہ یہ انسان کے جسم میں پہنچ کر ایک خاص کیمیاوی عمل سے شکر میں تبدیل ہو جاتا ہے اور شکر کی زیادتی سے ذیابیطس ہوتی ہے، جس

سے اکثر قلب کا دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ نشاستہ انسان کے جسم میں پہنچ کر اس قدر ناشائستہ ہوگا اس کا مجھے علم نہ تھا۔ آج سے چائے میں شکر بند، مٹھائی بند اور آئس کریم بھی ختم!

پروٹین بھی انسان کو موٹا کرتی ہے، کیوں کہ اس میں وہ اجزا ہوتے ہیں، جو گوشت بناتے ہیں اس لیے زندہ رہنے کے لیے پروٹین کو بھی کم کرنا ہوگا۔ گندم میں پروٹین ہوتی ہے۔ سرخ گوشت میں پروٹین ہوتی ہے۔ سفید گوشت میں البتہ پروٹین کم ہوتی ہے۔ جیسے مرغی کا گوشت یا مچھلی۔ آج کل اچھی مرغی آٹھ روپے سے کم میں نہیں آتی، اس لیے اگر آپ کی تنخواہ دو سو پچاس روپے ہے۔ تو اس میں سے دو سو چالیس روپے مرغی پر صرف کیجیے۔ اور دس روپے ہر ماہ بچا لیجیے اور جناب مہینے میں دس روپے کی بچت کچھ کم نہیں ہوتی۔ فرض کیجیے کہ آپ اس طرح سو سال زندہ رہیں اور ہر ماہ دس روپے بچاتے رہیں تو ذرا سوچیے کہ آپ کے مرنے کے بعد آپ کے کتنے رشتہ داروں کا بھلا ہوگا۔

گٹھیا بھی دل کا دشمن ہے۔ گٹھیا جس میں جوڑوں میں درد ہوتا ہے اور وہ سوج جاتے ہیں، یہ ابتدا ہے دل کے دورے کی اور گٹھیا یورک ایسڈ کی زیادتی سے پیدا ہوتا ہے، یعنی جسم کا اندرونی نظام، جسے انگریزی میں مٹابولزم کہتے ہیں۔ آپ ہی آپ یورک ایسڈ زیادہ پیدا کرتا ہے اور جو چیزیں یورک ایسڈ پیدا کرتی ہیں۔ وہ ہیں دالیں، مٹر، پھلیاں، سرخ گوشت وغیرہ۔ یہ یاد رکھیے کہ آپ شکر بند کر چکے ہیں، دودھ مکھن آپ پر حرام ہے۔ اب سب کی طرح دالیں مع مٹر بند ہو چکیں تو آپ کیا کھائیں گے؟ بات غم کھانے کی نہیں ہے، آرام اور اطمینان سے سوچیے کہ غم کھانے سے بھی عمر کم ہوتی ہے۔ اور آپ لمبی عمر پانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹروں کی رائے یہ ہے کہ آپ دن کو لوکی کھائیے اور رات کو پالک کا ساگ اور اصلی گھی کی جگہ سورج مکھی کے بیجوں کا تیل استعمال کیجیے۔ بہتر یہ ہوگا کہ سورج کو بھی چھوڑ دیجیے صرف مکھی کا تیل استعمال کیجیے۔ دن کو لوکی رات کو ساگ، اے میری موت دُور بھاگ! اور اگر آپ کو لوکی اور پالک کے ساگ اور سورج مکھی کے بیج کے تیل سے نفرت ہے تو صرف پانی پیجیے۔ اس میں تھوڑا سا سنگترے کا رس ملا لیجیے۔ دل کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے، اس لیے نمک بھی مت کھائیے، اس کی جگہ صرف سنگترے کا رس پانی میں ملا کر پیجیے۔ ہر اکیس دن کے فاقے کے بعد گاندھی جی بھی کرتے تھے پانی اور سنگترے کا رس۔ بس!

لمبی عمر پانے کا مجھے بھی بچپن سے شوق رہا ہے اور اچھے کھانے کا بھی بچپن سے شوق، لیکن دونوں شوق ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے، اس لیے میں نے وزن گھٹانے کے لیے نشاستہ بند کر دیا اور وہ تمام روٹیاں اور سبزیاں بھی، جن میں نشاستہ ہوتا ہے پھر میں نے مٹھائی کھانا بند کر دیا، آئس کریم کو چھونے سے انکار کر دیا، سرخ گوشت سے پرہیز کیا۔ آلو، مٹر، پھلی والی بھاجی آہستہ آہستہ خوراک کم کرتے کرتے میں صرف پانی اور دو چمچے اورنج جوس پر آ گیا۔

دو ہفتے اس خوراک پر کسی نہ کسی طرح زندہ رہ کر جب میں ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے وزن تولنے والی مشین پر لا کھڑا کیا۔ معلوم ہوا اس پرہیز کے بعد بھی میرا وزن دس پونڈ بڑھ چکا تھا۔

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک خطرناک سنجیدگی کی لہر آئی اسٹیتھسکوپ کو میرے دل پر رکھتے ہوئے بولا، ”کیا کھاتے رہتے ہو؟“

میں نے کہا، ”پانی میں تھوڑا سا اورنج جوس ڈال کے پیتا رہا ہوں۔“

یہی تو خرابی ہے تم میں“ ڈاکٹر میرے سینے کو اپنے انگوٹھے سے ٹھونکتے ہوئے بولا، ”وزن بڑھ گیا ہے۔ سنگترے کے رس میں بڑے قوی اجزا ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں تم صرف پانی پیو! ایک ہفتے میں تمہارا وزن کم ہو جائے گا۔ موجودہ حالت اور صحت بے حد خطرناک ہے۔ تمہیں کسی وقت بھی دل کا دورہ پڑ سکتا ہے! اگلے ہفتے آنا!“

گھر آ کر میں نے بیوی سے کہا کہ آئندہ سے میں صرف پانی پیا کروں گا اور محض پانی پی کر جیا کروں گا۔ صبح ناشتے میں ایک کپ پانی، لنچ پر ایک گلاس پانی، رات میں دو گلاس پانی۔ ایک ہفتے میں وزن آپ ہی آپ کم ہو جائے گا۔ بیوی نے بھی خوش ہو کر اس پر صاد کیا، کیوں کہ اس طریقے پر عمل کرنے سے کچن کا خرچ بہت کم ہو گیا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد جب میں پھر ڈاکٹر کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ محض پانی پینے سے میرا وزن دو پونڈ اور بڑھ چکا ہے! ڈاکٹر حیرت میں پڑ گیا۔ بولا، ”تم نے کچھ اور تو نہیں کھایا پیا۔ سچ سچ بتاؤ؟“

”مطلق نہیں ڈاکٹر صاحب! آپ فون کر کے میری بیوی سے پوچھ سکتے ہیں۔“

”پانی پینے کا گلاس صاف ستھرا تھا؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ سوڈے سے دھلوایا تھا۔'' میں نے کہا، ''ہمیشہ دھلواتا ہوں اور اپنے سامنے نل کا پانی نکلوا کر پیتا ہوں۔''

''پھر وزن کیوں بڑھ گیا؟'' ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا، ''جب آپ جانتے ہیں بمبئی کے پانی میں پانی کے سوا سب کچھ ہوتا ہے۔ نل کھولیے تو کبھی پانی کی پتلی دھار کے ساتھ مچھلی چلی آ رہی ہے، کبھی گھونگھے، کبھی چوہے، کبھی کیکڑے، ایسی ایسی مقویات پائی جاتی ہیں کہ آدمی اگر اس پانی کو پیے تو ناممکن ہے کہ موٹا نہ ہو۔''

''تو آئندہ سے پانی چھان کر پیو۔'' ڈاکٹر نے بڑی سختی سے کہا، ''سولہ روپے نکالو میری فیس کے!''

میں نے سولہ روپے جیب سے نکال کے ڈاکٹر کی ہتھیلی پر رکھے اور گھر چلا آیا اور گھر آ کر بیوی سے کہا کہ وہ میرے لیے کھڑے مصالحے کا گوشت تیار کرے۔ چکن، ریشمی کباب، تیتر کے تکے، قیمے بھرے پراٹھے اور آخر میں ایک پاؤ آئس کریم! رات کو سونے سے پہلے بالائی والے دودھ کا ایک گلاس بھرا ہوا جس میں بادام اور کشمش اور چھوارے بھی پڑے ہوں اور پستہ بھی۔ بیوی نے گھبرا کر کہا، ''تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اپنی جان دینے کا؟ بارہ پونڈ وزن تمہارا پہلے سے بڑھ چکا ہے۔ اب صرف چھنا ہوا پانی پیو، بلکہ اُبال کر پیو!''

میں نے کہا، ''مرنا تو ہر حال میں ہے۔ میں جیسے کہتا ہوں تم ویسے کرو۔''

دوسرے دن میں نے اس سے کہا، ''آج کے مینو میں تندوری مرغ، تلی ہوئی پام فریٹ، چکن بریانی اور لہسن سے بگھارا ہوا دہی کا رائیتہ اور آلو کے پراٹھے اور بعد میں بنارسی حلوائی والے کے ہاں سے موہن بھوگ کی ایک پلیٹ! اِدھر کھانے میں اصلی گھی استعمال ہو۔ ورنہ تازہ مکھن۔''

سات دن میں نے اسی طرح کا پرہیز رکھا اور خوب ڈٹ کر کھایا۔ بیوی مسلسل احتجاج کرتی رہی۔ اس نے اپنے میکے والوں کو خط لکھ دیا کہ وہ جلد کوئی بُری خبر سننے کے لیے تیار رہیں! اور میرے تمام دوستوں کو خبردار کر دیا کہ انہوں نے مجھے جو قرضے دے رکھے ہیں وہ جلد سے جلد اس کا چکتا کر لیں، ورنہ بعد میں وہ اس کی ذمہ دار نہ ہوگی!

سات دن مرغن غذائیں کھانے کے بعد جب میں نے ڈاکٹر کے کہنے پر وزن تولنے والی مشین پر پاؤں رکھا تو میرا وزن بارہ پونڈ کم ہو گیا تھا۔

کرشن چندر ...... پرہیز

رنگِ ادب پبلی کیشنز

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک مطمئن تبسم نظر آیا، ”میں نہ کہتا تھا، موٹا کرنے والی، وزن بڑھانے والی تمام اشیا چھوڑ دو۔ تمہارا وزن خود بخود کم ہو جائے گا۔ دیکھا، آج وزن بارہ پونڈ کم ہے اور چہرے پر بھی رونق ہے، جو احتیاط پرہیز اور ڈاکٹر کا کہا ماننے سے آتی ہے۔ نکالو بتیس روپے!“

* * *

بڑے لوگ

کرنل محمد خان

کبھی آپ نے غور فرمایا کہ عہدہ بڑھنے کے ساتھ ایک عام پاکستانی میں کیا تبدیلیاں آتی ہیں؟ سب سے پہلے تو اسے دوسری شادی کی سوجھتی ہے۔ اچانک اس پر منکشف ہوتا ہے کہ وہ جو ایک مدت سے رفیقۂ حیات چلی آ رہی تھی یک لخت رفاقت کے قابل نہیں رہی! بے چاری کی وضع کی سادگی جناب کے مشاغل کی رنگینی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اب وہ ایسی بیوی کے خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے، جو پروردگارِ حسن ہو اور پیغمبرِ جمال اور کوئی ایسی جنس نظر آ جائے تو مزید جستجو میں رہتا ہے کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں؟

شروع شروع میں تو ایسی یزداں شکار بیویاں فرنگ سے آتی تھیں، لیکن بعد میں کچھ دنوں کے لیے بناتِ عرب و دخترانِ عجم کی درآمد بھی فیشن بن گیا کہ اس طرح ایک اچھی خاصی میم بھی جبالۂ عقد میں آ جاتی تھی اور اسلامی اُخوّت کا تقاضا بھی پورا ہو جاتا تھا۔ یعنی خاصا رنگین ثوابِ دارین حاصل ہو جاتا تھا، لیکن بحمد اللہ اب پاکستان ماڈرن بیویوں میں خاصی حد تک خود کفیل ہو گیا ہے، لہٰذا اب نئے عہدے کے اعلان ہونے کے ساتھ ہی ایک نئی بیوی کی پاکستان گیر تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ تلاش اس لیے کہ ہر پاکستانی لڑکی بڑے صاحب کی دلہن بننے کی اہل نہیں۔ اس مرتبے پر فائز ہونے کے لیے... سپریر سروسز کی شرائط کی طرح... چند کوالیفکیشنز کی ضرورت ہے اور اس ضمن میں پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ رنگ گورا ہو۔ کسی سانولے رنگ کی لڑکی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اوّل درجے کے افسر کے ساتھ شادی کا خیال دل میں لائے۔ یہ قواعد کی رُو سے غلط اور آداب کی رُو سے گستاخی ہے۔

گورا رنگ اس لیے لازم ہے کہ میم نہ سہی، میم کا دھوکا ہوتا رہے۔ نیز چوں کہ دھوکا اسی صورت میں کھایا جا سکتا ہے کہ گورا رنگ مستور نہ ہو، لہٰذا دوسری لازمی شرط یہ ہے کہ پردہ نہ کرتی ہو،

لیکن یہ جزوی اور جامد سی بے پردگی نہیں، جو برقع ترک کرنے سے پیدا ہوتی ہے، بلکہ یہ وہ فعال بے پردگی ہے، جس میں دوپٹا اور آستینیں کم ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہیں اور باقی ماندہ پیرہن کی تنگی تو رنگی خطوط بدن کی اس وضاحت سے غمازی کرتی ہیں کہ تماشائی کو تصور کا بوجھ ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

سر کے بال دراز ہوں یا کوتاہ کوئی مضائقہ نہیں، مگر ایسے نہ ہوں۔ جیسے خدا نے لگا کر بھیجے تھے، بلکہ قدرت کی تمام غلطیوں کی کسی چابکدست مشاطہ (مشاط ہو تو بہتر ہے) نے مو بمو اصلاح کی ہو۔

تیسری شرط یہ ہے کہ دلہن سوشل ہو۔ سوشل ہونا بڑی جامع اصطلاح ہے۔ اس میں مخلوط کھانوں اور کھیلوں میں شامل ہونے سے لے کر ناچنے تک سب کچھ آتا ہے۔ یا یوں کہیں کہ اگر کچھ باقی رہ جاتا ہے تو برائے نام ہی رہ جاتا ہے اور آخر میں متوقع بیوی کو انگریزی بولنا اور موٹر چلانا بھی آتا ہو تو دیگر شرائط کو ذرا نرم بھی کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً اگر موٹر جہیز میں لائی گئی ہو۔

عہدہ بڑھنے کے ساتھ دوسری تبدیلی یہ آتی ہے کہ جناب عالی انسان سے ’صاحب‘ بن جاتے ہیں۔ انہیں کوئی شیخ یا میاں کے لقب سے پکارے تو اس طرف دیکھتے ہی نہیں۔ صرف زیرلب بلانے والے کے حق میں کچھ بدزبانی کر دیتے ہیں، لیکن کوئی خدا کا بندہ انہیں ’صاحب‘ سے مخاطب کر دے تو اسی انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ پھر کب ’صاحب‘ کہہ کر پکارے گا۔ جب نوکر کو دھوبی سے یہ کہتے سنتے ہیں کہ ’نالائق آدمی‘ تم نے ’صاحب‘ کا سوٹ خراب کر دیا۔” تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے خواہ سوٹ کا واقعی ستیاناس ہو گیا ہو۔ اگر بیرا کسی ملنے والے سے کہہ دے کہ “صاحب سو رہے ہیں۔” تو یہ قیامت تک سوئے رہیں گے کہ ان کی صاحبی کا تذکرہ جاری رہے۔

لیکن جہاں دوسروں کے لیے یہ صاحب بہادر اور بیگم صاحبہ ہیں، خود آپس میں ایک دوسرے کو خاصے لغو اور بے معنی ناموں سے پکارتے ہیں۔ کوشش حتی الوسع یہ ہوتی ہے کہ یہ ’نک نام‘ انگریزی نما ہو۔ مثلاً، صاحب کا نام جمیل ہے تو بیگم جمی بلائیں گی اور بیگم صاحبہ شادی سے پہلے شمیم تھیں تو اب شیمی کہلاتی ہیں۔ میاں بیوی بالاتفاق اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ ان ننھے منے ناموں سے پکارنا ماڈرن ہونے کی علامت ہے ثبوت یہ کہ انگریز اور تمام بڑے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔

کرنل محمد خان ...... بڑے لوگ

نیز ان ناموں سے بلانے سے باہمی پیار بڑھتا ہے، چنانچہ آپس میں لڑائی ہو جائے تو پھر ایک دوسرے کے نام نہایت سنوار کر بلاتے ہیں اور معاملہ زیادہ گرم ہو جائے تو وہ اسے مسٹر کہے گی اور یہ اسے محترمہ سے خطاب کریں گے، ناراضگی بڑھ جائے تو اَب وہ پہلی بیوی والی بات نہیں کہ ''جب تک آپ راضی نہ ہوں گے یا کھانا نہ کھائیں گے، میں روٹی کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔'' اب تو ابتدائی گالی گلوچ کے بعد بیگم صاحبہ سینما کو چل دیتی ہیں اور صاحب کلب کی راہ لیتے ہیں اور اس وقت تک باہم راضی نہیں ہوتے جب تک بیرے، خانسامے اور جملہ ہمسائے ان کی خانہ جنگی سے تنگ آ کر صلح نہ کرا دیں، وہ شرفا بھی کوئی شرفا تھے، جن کے گھر کی بات حویلی سے باہر نہ جاتی تھی؟ بے چارے اگلے وقتوں کے لوگ تھے۔

یہ گھر کے اندر اور باہر کی تمیز بھی اگلے وقتوں کی بات ہے وہ چھوٹے آدمی ہوتے تھے، جن کے گھر کے دو واضح حصے ہوتے تھے۔ سامنے صحن اور بیٹھک یعنی مردانہ اور پیچھے زنانہ، لیکن صاحب بنتے ہی زنانہ منسوخ ہو جاتا ہے۔ اب اس طرف فرصت کے وقت نوکر لوگ بیٹھ کر صاحب کی ''کوئی ہے۔'' کا انتظار کرتے ہیں۔ مردانہ میں اب زنانہ التفات کی بدولت ہر وقت رونق رہتی ہے۔ بیٹھک وہی ہے، مگر گول کمرا کہلاتا ہے اور کسی زمانے میں اگرچہ مردوں کے لیے مخصوص تھی، مگر اَب اس کے استعمال میں تذکرہ تانیث کی تمیز نہیں، بلکہ اپنے اور غیر کا امتیاز بھی نہیں رہا۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے۔

عہدہ بڑھنے کے ساتھ صاحب کے فرائض میں بھی اضافہ ہونا چاہیے، لیکن ہوتا نہیں۔ البتہ صاحب کے آرام کے اوقات میں نمایاں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اس آرام میں صبح کی بیداری اب عذاب معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ جب تک ''خدامِ ادب دس بارہ مرتبہ یاد نہ دلائیں کہ آج جمعہ نہیں،'' آپ اس وقت تک نہیں اُٹھتے اور اُٹھیں بھی تو پورے اُٹھتے کہاں ہیں، پہلے تو ذرا نیم دراز ہو کر بستر ہی میں مارننگ ٹی پیتے ہیں۔ پھر غسل خانے میں داخل ہوتے ہیں تو اس وقت تک خارج نہیں ہوتے جب تک بیگم صاحبہ بزور برآمد نہ کریں کہ ناشتا کے لیے ایک معینہ مدت سے زیادہ وہ بھی انتظار نہیں کر سکتیں۔

پھر جناب دفتر میں جاتے ہیں۔ بہت دیر سے جاتے ہیں اور قصداً کہ صحیح وقت پر دفتر پہنچنا ہتک سمجھتے ہیں۔ پابندیٔ وقت افسر کی شان نہیں، کلرک کی پہچان ہے اور جب دفتر کے دروازے

کرنل محمد خان ...... بڑے لوگ

کے قریب پہنچتے ہیں تو اندر داخل ہونے سے پہلے ایک عمل لازمی اور لابدی ہے وہ یہ کہ کوئی چپراسی اور چپراسی نہیں تو کوئی جن یا بشر دروازے کی چق اُٹھائے تا کہ صاحب اندر قدم رکھ سکیں۔ اگر سچ مچ صاحب کو اپنے ہاتھ سے چق اُٹھانا پڑ گئی تو دفتر میں قیامت آ جائے گی اور چند نچلے درجے کے پاکستانیوں کا روزگار خطرے میں پڑ جائے گا، لیکن پاکستانی چپراسی کہ اپنے صاحبان کی مزاج شناسی کے اسپیشلسٹ ہیں، بروقت چق اُٹھانے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ اس لیے ملک کا کاروبار چل رہا ہے۔ اب دفتر کا کام شروع ہوتا ہے۔ صاحب بہادر پہلے تو وہ نوٹ بک کھولتے ہیں، جس میں گھر سے چند اہم گھریلو پوائنٹ لکھ کر لائے۔ ان پوائنٹس کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہے۔

رحمٰن اینڈ سنز کو فون کرنا کہ بیگم صاحبہ کو لپ اسٹک پسند نہیں۔ ذرا گہرے شیڈ کی بھیجو۔

پلازہ سینما پر آخری شو کے لیے دو فری پاسوں کا انتظام۔

مری جانے کے لیے چھٹی کی درخواست، لیکن ہو سکے تو ڈیوٹی بناؤ۔

شمی کے میکے والوں کو خط اور مری آنے کی دعوت۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ اہم کام یکے بعد دیگرے ہونے شروع ہوتے ہیں۔ صاحب کے قریب فائلوں کا انبار لگ رہا ہے۔ جب آخری گھریلو پوائنٹ پر ٹک (✓) لگ جاتی ہے تو صاحب دل کڑا کر کے فائل کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے، لیکن اسی لمحے اچانک کوئی دروازے پر دستک دیتا ہے اور ایک اور ہنستا، گنگناتا صاحب اندر داخل ہوتا ہے۔ وہ ہاتھ جو فائل کی طرف بڑھ رہا تھا، مہمان کے مصافحے کو بڑھتا ہے، تخلیہ ہو جاتا ہے۔ سرکاری کام دھک سے رُک جاتا ہے۔ چائے آ جاتی ہے، قہقہے لگتے ہیں، سگریٹ جلتے ہیں، گپیں چلتی ہیں۔ موضوع ایک تیسرا صاحب اور اس کی بیگم ہے۔...

کلرک بے چارہ ہر پانچ دس منٹ کے بعد جھانکتا ہے۔ لیکن صاحبانہ قہقہے اسے پیچھے دھکیل دیتے ہیں۔ خدا خدا کر کے مہمان رخصت ہوتا ہے تو کلرک فائلوں کا پلندہ صاحب کے قریب سرکا دیتا ہے، لیکن عین اسی لمحے ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ یہ بیگم صاحبہ کا فون ہے۔ کچھ اس طرح کی گفتگو ظہور میں آتی ہے۔

"تم ہو جمی؟"

"ہیلو شمی۔"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اچھا، ابھی آتا ہوں۔ ذرا یہ فائل..."

"فائل جائے بھاڑ میں۔"

"ضرور جائے۔"

اور صاحب نوٹ بک اُٹھائے موٹر کار میں بیٹھ کر یہ جا، وہ جا۔ رہیں فائلیں، تو وہ ایک مدّت سے جمع ہو رہی ہیں، ہوتی رہیں۔ کوئی نئی بات نہیں۔ کارِ جہاں اگر اتنا ہی دراز ہے تو صاحب، انتظار کیا جا سکتا ہے۔

* *

گردانِ گردن

کلیم چغتائی

کہتے ہیں جذبوں اور رویّوں کے اظہار میں سب سے مؤثر کردار انسانی آنکھ ادا کرتی ہے۔ اظہارِ رائے کے وکٹری اسٹینڈ پر کھڑے ہونے والا اپنی انگلیوں کے علاوہ آنکھوں سے بھی وی کا نشان بناتا ہے۔ لیکن جذبوں اور رویّوں کے اظہار میں ایک اور اہم عضو بھی پیش پیش رہتا ہے۔ یہ ہماری گردن ہے۔

انکسار اور استکبار، دونوں کیفیات کو اُجاگر کرنے میں گردن بخوبی کام آتی ہے۔ اوّل الذکر کیفیت کو مفت اختیار کرنے کی اجازت خواص نے عوام کو فراخ دلی سے دے دی ہے۔ آخر الذکر کیفیت خواص نے اپنے لیے مخصوص کر لی ہے، گو کہ بالائے خواص ہستیوں کے سامنے ہمارے خواص بھی اپنی گردنوں پر اوّل الذکر کیفیت طاری کر لیتے ہیں۔ ہمارے دوست مخدوم علی ممتاز اس صورتِ حال پر منظوم تبصرہ یوں کرتے ہیں:

اعدا کے سامنے تو یہ گردن جھکی رہی　　تلوار بھائیوں کے لیے بے نیام کی

تکبر اور رعونت جیسی صفاتِ اشرافیہ کا مسلسل اظہار کرنا اور پائے گردن میں لغزش نہ آنے دینا قدرے دشوار کام ہے چنانچہ اس کیفیت میں استقلال اور دوام لانے کی غرض سے غیر مرئی کلف اور سریوں کی مدد حاصل کی جاتی ہے۔ اس قسم کی گردن عموماً نوابوں، جاگیرداروں، وزراء، ارکانِ اسمبلی اور بیوروکریسی کے اہلکاروں میں پائی جاتی ہے۔ ایسی گردن ہمیشہ گردُوں کی طرف اٹھی رہتی ہے۔ رہے عوام تو ان کی گردنیں، نچلے جسم کے ساتھ چوبیس گھنٹے، چوبیس کا زاویہ بنائے رکھتی ہیں۔ عوام اور قربانی کے جانوروں میں فرق صرف اتنا ہے کہ جانور قربان ہونے کے بعد گردن ڈال دیتے ہیں جب کہ عوام، تسلیم و رضا کا یہ مظاہرہ محض چھریاں دیکھ کر ہی شروع کر دیتے

ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ عوام کو حکمرانوں کے تیز دھار فیصلوں نے اتنا گھائل کر دیا ہے کہ اب انہیں خوابوں میں بھی چھریاں نظر آتی ہیں۔

خواص و عوام کی گردنوں کا موازنہ اس غیر متوازن معاشرے میں کسی بھی وقت کیا جا سکتا ہے، خصوصاً اُس وقت جب خواص کے نمائندے پولیس والے یا چپڑاسی عوام کی گردنوں میں ہاتھ دے کر انہیں تھانے یا سرکاری دفتر سے دھکے دے کر نکالتے ہیں۔

گردن، انکار یا اقرار میں بھی کام آتی ہے۔ حکم سن کر انکار میں سر ہلانا ہم عرصہ ہوا بھول چکے تھے، لیکن حال ہی میں ہمارے چیف جسٹس نے انکار میں گردن ہلا کر ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے؟ چنانچہ مدتِ مدید کے بعد حکمرانوں کو شدید دھچکا لگا ہے کہ انہیں عوام کی گردنیں نفی میں ہلتی نظر آ رہی ہیں، گویا دل کے آئینے میں تصویرِ یار جھک کر دیکھنے کے علاوہ، گردن حکمرانوں کو اشتعال دلانے کے لیے بھی استعمال ہو سکتی ہے۔

گردن کو طوق پہنانے کے لیے بھی موزوں سمجھا جاتا رہا ہے۔ قدیم زمانے میں غلاموں کی گردنوں میں طوق یعنی آہنی حلقے پہنائے جاتے تھے۔ بعد میں نہ غلام رہے نہ ان کے طوق لیکن غلامانہ ذہنیت اتنی پختہ ہو گئی کہ طوق غلامی بدستور گلے میں آویزاں رہا اور آج بھی کیا عوام اور کیا خواص، سب ہی کے گلوں سے وابستہ نظر آتا ہے۔ آقاؤں کی زبان بولنا، آقاؤں کا لباس پہننا، آقاؤں کے طرز بود و باش کو اختیار کرنا اور اِن پر فخر محسوس کرنا، غلامی کے مختلف طوق ہیں۔

گردن، ہار ماننے کے بعد طوق غلامی ڈالنے کے علاوہ حُسنِ زن میں مزید حُسن پیدا کرنے یعنی ہار ڈالنے میں بھی کام آتی ہے۔ کچھ لوگوں کو سُوئے ظن ہے کہ گلوئے زن میں ہار ڈالنے کا مقصد خواتین کو یہ باور کروانا ہے کہ غلامی ان کا مقدر ہے۔

بعض جانوروں کی وجہ شہرت ان کی گردنیں ہیں، مثلاً طوطے کی گردن کا کنٹھا مشہور ہے۔ زرافے اور اونٹ کی گردنیں اپنی طوالت اور رسائی کے باعث معروف ہیں۔ شتر مرغ کی گردن، خطرے کے وقت ریت میں سر دینے میں مدد دیتی ہے۔ اونٹ کی گردن بوقتِ ضرورت اس میں بلی باندھنے کے بھی کام آتی ہے۔ بلی کی گردن گھنٹی باندھنے کے حوالے سے قابلِ ذکر ہے اور کچھوے کی گردن، کچھوے کو محض ایک سنگِ راہ بنانے میں کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ کچھوے کی اس قابلِ اختصار گردن کے بارے میں اقبال شانہ یوں رشک میں مبتلا ہوئے ہیں:

ہم سے اچھا ہے دوستو کچھوا
جب بھی چاہا سکیڑ لی گردن

قدرت نے گردن مرغیوں کو بھی عطا کی ہے لیکن خوش خوراک لوگ مرغی کے تمام اعضاء میں اِس کی گردن کو کمترین گردانتے ہیں، لہٰذا تقریبات میں اکثر یہی منظر دیکھنے کو ملتا ہے کہ جوں ی طبل جنگ بجتا ہے یعنی قابوں پر سے آہنی ڈھکنے ہٹائے جانے کی پُر شور آواز بلند ہوتی ہے، لوگ چچوں، کانٹوں کے ہتھیاروں اور پلیٹوں کی ڈھالوں سے مسلح ہو کر میزوں پر دھاوا بول دیتے ہیں۔ چند لمحوں بعد رزم گاہ کا منظر واضح ہوتا ہے تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قابوں میں پڑی، مرغیوں کی گردنیں ہلہ شب گیر بلند کر رہی ہوتی ہیں، اسی لیے تو سرفراز شاہد نے قبل اَز وقت خبردار کر دیا ہے کہ:

مرغ پر فوراً جھپٹ دعوت میں ورنہ بعد میں
شوربہ اور گردنوں کی ہڈیاں رہ جائیں گی

گردن میں ہار، مالا ڈالنے اور گلو بند باندھنے کے علاوہ بوقتِ ضرورت پھانسی کا پھندا بھی ڈالا جاتا ہے۔ تاہم ایک علامتی پھانسی ہم خود ہی برضا و رغبت اپنے آپ کو دیتے رہتے ہیں۔ ہماری مراد ٹائی سے ہے۔ ٹائی، عموماً سوٹ کے ساتھ باندھی جاتی ہے اور سوٹ زیب تن کرنے والا خود کو جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے لیکن ایٹی کیٹ کی خاطر بھیگی بلی بن جاتا ہے، گو کہ سوٹ پہن کر اس کی چال میں طنطنہ اور گردن میں دبدبہ آ جاتا ہے۔ نذیر احمد شیخ نے سُوٹ کی شان میں کیا سوٹیبل "Suitable" شعر کہا ہے:

جس کو بھی تو نے جکڑا، ہر بند اُس کا جکڑا
گردن میں تو نے سب کی، پھندا پھنسا کے چھوڑا

ایک دوسرے کی گردن میں باہیں حمائل کرنا، اُلفت اور گہری دوستی کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ موجودہ نفرت زدہ معاشرے میں، باہمی محبت اور مودّت پیدا کرنے میں ہماری بسیں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ خصوصاً کراچی کی کھچا کھچ بھری ہوئی بسوں میں لوگ ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے بادل ناخواستہ باہمی محبت کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ بغل گیری اور کمر گیری کے اس عالم میں بقول سیّد ضمیر جعفری ایسا بھی ہوتا ہے کہ:

جو گردن میں کالر تھا 'نژ' رہ گیا ہے
ٹماٹر کے تھیلے میں 'نژ' رہ گیا ہے

ایک گردن ایسی بھی ہے جو ہمیں جھوٹ بولنے میں مدد دیتی ہے۔ ہم جب بھی جھوٹ بولنا

چاہتے ہیں، تو 'دروغ برگردنِ راوی' کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور پھر دروغ گوئی سے ذرا بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس روایتی راوی کی گردن نہ جانے کس ناقابلِ تسخیر مادّے سے بنی ہوئی ہے کہ صدیاں بیت جانے کے باوجود اس کا کچھ نہیں بگڑا۔ ہمیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ دروغ گوئی کو فروغ دینے میں اسی نامعلوم راوی کا بہت بڑا حصہ ہے۔

* *

مس چنبیلی

کنہیالال کپور

برسوں ادبی رسائل میں مضامین لکھتے رہے، مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ ہم بھی ادیب ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ دو چار ایڈیٹروں سے واقفیت ہو گئی اور اُن کے تقاضوں نے ناک میں دَم کر دیا۔ یا کچھ ادبی قسم کے لوگ جو ہمیں پہلے ہی سے جانتے تھے، اب ذرا اچھی طرح جان گئے کہ اگر کسی ایسی مجلس میں مدعو کیے گئے جہاں شہر کے شرفا و رؤسا بھی موجود تھے اور کسی شخص نے ازراہِ ہمدردی ہمارا تعارف ان سے کرایا تو استقبال اس کلمات سے کیا گیا:

”مرزا اُزبک… ! کون اُزبک! کہیں وہی تو نہیں، جن کے پان بہت مشہور ہیں۔ اچھا، کبھی چونامنڈی سے گزرنے کا اتفاق ہوا تو ضرور اِن کے پان بھی کھائیں گے۔“

”اچھا، تو یہ ہیں مرزا اُزبک! بخدا! شکل و صورت سے بالکل اُزبک ہی نظر آتے ہیں۔“

”مشہور ادیب ہیں، ہم نے تو اِن کا نام پہلی بار سُنا ہے۔“

آخر ایک دن جو اپنی گم نامی کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ قصور اپنا ہی ہے۔ ادبی رسائل میں لکھنا پرلے درجے کی حماقت تھی۔ اوّل تو اَدبی رسائل کی اشاعت ہی کتنی ہوتی ہے اور پھر انھیں خریدتا اور پڑھتا کون ہے؟ چند شعرا اور اُدبا جنھیں رسالہ مفت بھجوایا جاتا ہے، یا کالج کے کچھ ذہین طلبہ جنھیں غزلیں اور نظمیں پڑھنے کا شوق ہوتا ہے۔ دراصل ادبی مضامین خشک بھی تو اتنے ہوتے ہیں کہ ان کے عنوانات پڑھنے کے بعد لاحول پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ فیصلہ کیا کہ آئندہ صرف عوامی رسائل ہی میں لکھا کریں گے۔

اتفاق سے پتا چلا کہ بمبئی کا مشہور فلمی رسالہ 'فلم باز' اپنا ایکٹرس نمبر نکال رہا ہے۔ ہم نے فوراً ایک مضمون لکھا۔ عنوان تھا، 'مس چنبیلی سے ایک ملاقات'۔ چند دنوں کے بعد ایڈیٹر صاحب کا خط آیا:

انور احمد علوی

”مضمون بہت پسند آیا۔ مبلغ پچاس روپے کا چیک بطورِ معاوضہ بھجوا رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ آئندہ بھی ’فلم باز‘ کی سرپرستی فرماتے رہیں گے۔ ہاں، اپنی فوٹو بھی ضرور عنایت کیجیے گا۔“

چیک کو دیکھ کر باچھیں کھل گئیں اور بے اختیار منہ سے نکلا، ”واللہ ہم بھی کتنے سادہ لوح تھے کہ ادبی رسائل میں لکھتے رہے۔ اگر شروع سے ہی ’فلم باز‘ میں لکھتے تو آج خاصے مالدار ہوتے۔“ ادبی مضامین کا اس فلمی مضمون سے موازنہ کیا تو پتا چلا کہ جہاں ایک ادبی مضمون کے لیے گھنٹوں مغز پچی کرنا پڑتا ہے، وہاں ایک فلمی مضمون منٹوں میں لکھا جا سکتا ہے... ’مس چنبیلی سے ایک ملاقات‘ کو ہی لیجیے۔ لکھا ہی کیا تھا ہم نے اس میں... یہی کہ...

”بوٹا سا قد، چھریرا بدن، خوب صورت ناک نقشہ، مس چنبیلی واقعی مس چنبیلی ہے... وہ ایک نہایت پُر اسرار ایکٹرس ہے۔ اسے کالی بلیوں اور بھورے رنگ کے خرگوشوں سے والہانہ محبت ہے۔ وہ اپنی جلد کی خوب صورتی برقرار رکھنے کے لیے دیسی صابن استعمال کرتی ہے۔ اس کے دانت موتیوں کی طرح سفید ہیں، کیوں کہ وہ ایک تیز چاقو سے انہیں ہر وقت کھرچتی رہتی ہے۔ اسے عطرِ حنا بالکل پسند نہیں۔ ایک دفعہ اُس نے غلطی سے عطرِ حنا سونگھ لیا تھا اور وہ بیہوش ہو گئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اُسے پتا چلا کہ عطرِ حنا نہیں تھا، کلوروفارم تھا۔

مس چنبیلی عموماً شام کا کھانا صبح اور صبح کا کھانا شام کے وقت کھاتی ہے۔ آلو، ٹماٹر، گوبھی اور بیگن کے علاوہ اسے کوئی ترکاری پسند نہیں۔ اسے ہوائی جہاز چلانا بالکل نہیں آتا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اِس شخص سے شادی کرے گی جو بہت اچھا ہوا باز ہو۔ کھوٹے سکے، خالی بوتلیں اور مٹی کے لوٹے اکٹھا کرنے کا اُسے بے حد شوق ہے۔ وغیرہ وغیرہ...“

اس مضمون کا چھپنا تھا کہ سارے شہر میں تہلکہ سا مچ گیا۔ جسے دیکھو ’فلم باز‘ کا ایکٹرس نمبر ہاتھ میں لیے مبارک باد دینے چلا آ رہا ہے۔ ”واہ، اُزبک صاحب واہ! خوب مضمون لکھا ہے۔ واللہ لطف آ گیا۔ کیا انکشاف فرماتے ہیں۔ سبحان اللہ، مضمون کیا لکھا ہے، قلم توڑ کر رکھ دیا ہے۔“

اُنہی دنوں کی بات ہے کہ ایک شام ہم پان کھانے کے لیے کتھامل چونامل کی دکان پر رُکے۔ ہم نے دیکھا کہ دونوں پنواڑی ہمیں دیکھ کر آپس میں کھُسر پھُسر کر رہے ہیں۔ ایک آدھ منٹ کے بعد کتھامل نے ذرا اُونچی آواز میں کہا، ”تو تم ہی پوچھ لو نا۔ شرماتے کیوں ہو؟“

ہم نے پوچھا، ”کیا بات ہے بھئی؟“

رنگِ ادب دہلی

چوتامل نے ڈرتے ڈرتے کہا، ”جی ایک بات پوچھنا تھی۔“

”کہیے۔“

”آپ مرجا اُجبک ہیں نا؟“

”جی ہاں، میں مرزا اُزبک ہوں۔“

”ہی ہی ہی۔ آپ کی فوٹو ’فلم باج‘ میں دیکھی تھی۔ وہ مجمون... چنبیلی پر... آپ نے لکھا تھا؟“

”ہاں صاحب، ہم نے لکھا تھا۔“

”ہی ہی ہی، بہت اچھا مجمون ہے۔ ہم نے اسے پڑھا تھا۔ چنبیلی بہت اچھا کام کرتی ہے۔ ہم نے اپنی دکان میں چنبیلی ہی کی تصویریں لگا رکھی ہیں۔“

ہم نے دیکھا کہ اس کی دکان میں واقعی چنبیلی ہی چنبیلی نظر آتی ہے۔ پیسے دینے کے لیے بٹوا نکالا ہی تھا کہ کتھامل نے ہمیں منع کرتے ہوئے کہا، ”نا صاحب نا... ایسا نہ کیجیے... ہم آپ سے پیسے نہیں لے سکتے۔“

”لیکن کیوں؟“ ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اجی رہنے دیجیے۔ آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔ مس چنبیلی کو جانتے ہیں۔ آپ سے بھلا کیسے...“

بہت اصرار کیا، لیکن وہ نہ مانا بلکہ کہنے لگا، ”آئندہ بھی جب کبھی پان کھانے کا شوق فرمانا ہو، ہمیں یاد فرمایئے گا۔“

پان چباتے ہوئے سڑک پر جا رہے تھے کہ اچانک ایک حوالدار نے ہمیں پکار کر کہا، ”اجی اُزبک صاحب! ذرا ٹھہریے تو۔“

حوالدار کو دیکھ کر ہمارا کلیجا دھک سے ہو گیا۔ خدا خیر کرے، کہیں اس کے پاس ہماری گرفتاری کا وارنٹ تو نہیں ہے۔ کہیں اسے ہم پر جیل سے بھاگے ہوئے کسی مجرم کا شبہ تو نہیں ہوا۔

حوالدار صاحب نے کہا، ”میں پرسوں سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔ اچھا ہوا آپ اتفاقاً مل گئے۔“

”لیکن حوالدار صاحب ہم نے... ہمارا مطلب ہے... کہ...“

"اجی اُزبک صاحب" حوالدار صاحب نے ہماری بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا، "آپ نے تو کمال کر دیا۔ وہ مضمون جو آپ نے لکھا ہے چنبیلی پر، بخدا چار دفعہ پڑھ چکا ہوں اور اتنی ہی بار اور پڑھنے کا ارادہ ہے۔"

مضمون کا ذکر سن کر جان میں جان آئی۔ وہ فرمانے لگے، "آیئے نا، ذرا غریب خانے تک، چائے پئیں گے اور ساتھ ہی آپ سے مس چنبیلی کے بارے میں کچھ اور تفاصیل سنیں گے۔"

میرے انکار کے باوجود وہ مجھے اپنے ہاں لے گئے۔ چائے پینے کے دوران میں پوچھنے لگے۔ "اُزبک صاحب! یہ جو آپ نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ایک بار مس چنبیلی نے ایک چور پکڑا تھا۔ کیا یہ درست ہے؟"

"جی ہاں! بالکل درست۔"

"لیکن وہ چور کون تھا؟"

"چور کہاں تھا قبلہ، وہ تو ایک فاقہ زدہ شاعر تھا۔"

"فاقہ زدہ شاعر؟"

"جی ہاں، بے چارا گھر سے بمبئی آیا تھا کہ فلموں کے گانے لکھے گا، لیکن آپ جانتے ہیں کہ بمبئی میں واقفیت کے بغیر کام کہاں ملتا ہے۔ وہ ایک مہینے اسٹوڈیو کی خاک چھانتا رہا۔ اس اثنا میں جو پونجی گھر سے لایا تھا، ختم ہو گئی۔ آخر ایک دن اس نے چوری کرنے کی ٹھانی... ایک کند سی تلوار لے کر رات کے ایک بجے مس چنبیلی کے کمرے میں داخل ہوا۔"

"پھر...؟"

اچانک مس چنبیلی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور شاعر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی، "آپ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں، شوق سے کیجیے:

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

دراصل یہ ایک فلم کا ڈائیلاگ تھا جو مس چنبیلی کو بروقت یاد آ گیا۔ بس صاحب، شاعر نے جب یہ ڈائیلاگ سنا تو عش عش کرنے لگا۔ تلوار اُس کے ہاتھ سے گر پڑی اور اُس کے منہ سے نکلا:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

مس چنبیلی نے کمال صفائی سے وہ کند تلوار اُٹھائی اور شاعر پر وار کیا۔ بھوک سے تو وہ پہلے ہی نڈھال ہو رہا تھا، فوراً زمین پر آ رہا۔ مس چنبیلی نے گھنٹی بجائی اور اُس کے ملازم نے شاعر کی مشکیں کس دیں۔ صبح اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔"

"خوب... خوب... کمال کی دلیری دکھائی مس چنبیلی نے۔"

"جی ہاں۔"

"اچھا، آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دفعہ مس چنبیلی نے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دی تھی، وہ کیا قصہ تھا؟"

"صاحب یہ قصہ ذرا طویل ہے، پھر کبھی عرض کروں گا۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔"

رات کے وقت جب گھر لوٹے تو ہمارے ہمسائے ڈاکٹر منوہر لال صاحب تشریف لائے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے، "قبلہ اُزبک صاحب! آپ تو چُھپے رستم نکلے۔ یہ آپ نے لکھنا کب شروع کر دیا؟ ہم تو سمجھے تھے کہ آپ محض معلم ہیں، لیکن آپ تو اچھے خاصے ادیب بھی ہیں۔"

"قدر افزائی کا بہت بہت شکریہ۔ ادیب تو کیا ہوں، یوں ہی مشغلے کے طور پر کبھی کبھار لکھا کرتا ہوں۔"

اچھا اُزبک صاحب، یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ مس چنبیلی صبح کا کھانا شام کو اور شام کا کھانا صبح میں کھاتی ہے۔ اس سے مس چنبیلی کو بدہضمی کی شکایات نہیں ہو جاتی ہے۔"

"قبلہ، یہ سب عادت پہ منحصر ہے، عادت اور مشق پر... ہمارا تو خیال ہے کہ اگر کوئی شخص تھوڑی سی مشق کر لے تو کچھ عرصے کے بعد اُسے صبح شام امتیاز کرنا مشکل ہو جائے گا۔"

"بہر حال میڈیکل نقطۂ نگاہ سے..."

"میڈیکل نقطۂ نگاہ کو رہنے دیجیے۔ یہ فلم لائن ہے۔ اس میں سب کچھ چلتا ہے۔"

چند دنوں کے بعد ایک عطار کی دکان پر جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آداب بجا لانے کے بعد کرسی پیش کی اور کہنے لگے، "اُزبک صاحب ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ اتنے بڑے ادیب ہیں، ورنہ گستاخی کبھی نہ ہوتی۔"

"کون سی گستاخی قبلہ؟"

"پچھلے دنوں آپ شربتِ بنفشہ لینے آئے تھے اور ہم نے آپ سے پیسے لے لیے تھے۔"

”اس میں تو کوئی گستاخی نہیں۔ آخر پیسے تو آپ...“

”نہیں صاحب! یہ بہت بڑی گستاخی ہے۔ خیر اس کی تلافی آج کر دی جائی گی۔ شربت بنفشہ ہی چاہیے نہ آپ کو؟“

”جی ہاں! چار تولے دے دیجیے۔“

”تولوں کا حساب چھوڑیے اُزبک صاحب، آپ بوتل ہی لے لیجیے... ارے بھئی خیراتی لال، ”اُزبک صاحب کو شربتِ بنفشہ درجہ خاص کی ایک خاص بوتل لا دو۔“

”لیکن قبلہ مجھے بوتل نہیں چاہیے۔“

”اجی صاحب ہماری طرف سے ناچیز تحفہ سمجھ کر لے جایئے۔ واہ واہ کیا مضمون لکھا آپ نے۔“

بوتل پیش کرنے کے بعد انھوں نے بتایا کہ مِس چنبیلی کے غائبانہ مداح ہیں۔ ”فلم باز“ کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں اور صرف یہی ایک رسالہ ہے جسے ان کی دکان میں پڑیا باندھنے کے کام میں نہیں لایا جاتا۔

اُن کا شکریہ ادا کر کے گھر پہنچا تو فلم زدہ لڑکیاں وارد ہوئیں۔ بے چاری بے حد پریشان تھیں اور میری رہنمائی چاہتی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ دریافت کرنے آئی تھی کہ اگر میں ایک کالی بلی مِس چنبیلی کو بھجوا دوں تو کیا وہ اِسے قبول کر لے گی...؟ دوسری کے پاس کھوٹے سکوں کا ذخیرہ تھا، وہ اسے مِس چنبیلی کی نذر کرنا چاہتی تھی... تیسری یہ جاننے کی خواہش مند تھی کہ مِس چنبیلی کون سا دیسی صابن استعمال کرتی ہے؟ ان سب کو مناسب مشورے دیے گئے اور وہ خوش و خرم رخصت ہوئیں۔

اُسی دن کے مشہور اَدبی رسالے کے ایڈیٹر صاحب کا خط ملا کہ وہ فانؔی بدیوانی پر ایک نمبر نکال رہے ہیں، اس لیے ہم انہیں ایک مضمون بعنوان ’فانؔی کی شاعری پر شوپن ہار کا اثر“ لکھ کر بہ واپسی ڈاک بھجوائیں۔ ہم نے انھیں جواب میں جو خط لکھا وہ سننے کے قابل ہے:

محترمی... غالباً آپ کو معلوم نہیں کہ ادبی مضامین سے مدت سے تائب ہو چکا ہوں۔ میرے خیال میں یہ سراسر تضیعِ اوقات ہے، نیز مالی لحاظ سے سخت خسارے کا سودا ہے۔ اگر میں آپ کے رسالے کے لیے مضمون لکھوں گا تو زیادہ سے زیادہ آپ یہ کریں گے کہ مجھے رسالہ

بھجوادیں گے، یا یہ سمجھتے ہوئے کہ اگر مجھے اپنا مضمون پڑھنے کا شوق ہوا تو میں خود ہی خرید لوں گا، رسالہ بھی نہیں بھجوائیں گے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں صرف فلمی مضامین لکھا کروں گا۔ پچاس روپے معاوضہ ملتا ہے، کھانے کو پان اور پینے کو شربتِ بنفشہ مفت مل جاتا ہے۔ نیز ہمسائے سمجھتے ہیں کہ ہم واقعی بہت بڑے ادیب ہیں۔ صاف گوئی کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو میری طرف سے اپنے رسالے میں یہ اعلان شائع فرمادیں کہ آئندہ کوئی ادبی رسالہ مجھ سے ادبی مضمون کا تقاضا نہیں کرے۔ فقط

* * *

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

کرسی

کوثر چاند پوری

کرسی کا رشتہ ماورائی دنیا سے ملایا جائے تو وہ آدم و حوّا سے زیادہ قدیم قرار پائے گی یہاں اُس کرسی پر گفتگو نہیں کی جائے گی نہ اس کرسی کا ذکر ہوگا جہاں کے لوگ اپنی سکونت بتاتے ہوئے شرمایا کرتے ہیں اور جسم کو عریاں کرنے سے اتنا نہیں جھجکتے جتنا جائے پیدائش بتانے میں جھجکا کرتے ہیں جس کرسی کے یہاں اوصاف بیان کیے جارہے ہیں، وہ بہت ہی دلچسپ حسین اور خوش آئند خیال کی جاتی ہے۔ اس کا تصور ذہن میں آتے ہی فکر و خیال میں سورج طلوع ہونے لگتے ہیں۔ آدمی اس پر بیٹھ کر بغیر پیے مخمور اور سرشار ہو جاتا ہے۔ کرسی زیادہ اُونچی نہیں ہوتی، لیکن بیٹھنے والے کا دماغ اتنا اُونچا ہو جاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز سرنگوں ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ نشّلی چیزوں کی فہرست تیار کی جائے تو سب پہلا نمبر کرسی کو دینا ہوگا۔ اس میں بڑا کیف، سُرور اور خمار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالقِ کائنات نے عرش کے ساتھ کرسی کی تخلیق ضروری سمجھی۔ دنیائے آب و گل میں کرسی نہ صرف جرعۂ کیف آور کا کام کرتی ہے، بلکہ اُسے عشق و محبت کا مرکز بھی سمجھا جاتا ہے۔ ایسے سرپھروں کی تعداد کم نہیں، جو کرسی سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں، وہ اسے حاصل کرنے کے لیے وقت سے کر دولت، بلکہ خون کا آخری قطرہ تک قربان کرنے سے دریغ نہیں کیا کرتے۔ دنیا کے بہت سے فرمانرواؤں اور سپہ سالاروں نے کرسی کے لیے بڑی سرفروشیاں کی ہیں۔ عرصۂ کارزار کو رنگین کیا ہے۔ خون کی نہریں بہائی ہیں۔ کرسی میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں، جو کسی نازک اندام محبوبہ اور اس کے خوب صورت خدوخال میں ہوا کرتی ہیں۔ بیوفائی میں کرسی اس سے بھی آگے ہے۔ کتنا ہی گوند لگا کر بیٹھے اس کی نگاہِ خون آشام بدل جاتی ہے، تو آدمی کو اس طرح نیچے گرا دیتی ہے کہ سنبھلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کے عشق میں خطرناک رقیبوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ لیلائے کرسی کے فریفتہ جب کسی رقیب سے دست و گریباں ہو جاتے ہیں تو صلح کا

امکان نہیں رہتا۔ انہیں سمجھوتے پر یقین نہیں۔ وہ سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اُترا کرتے ہیں، ماضی میں کرسیوں کی تعداد اتنی نہ تھی جتنی اب ہے۔ اقسام بھی محدود تھیں۔ صدارت اور ممبری کی چند کرسیاں ہی تھیں، جو میونسپل بورڈ اور جلسہ گاہوں میں یوسفِ بے کارواں کی طرح اکیلی پڑی رہا کرتی تھیں، پھر بھی دل ربائی کا یہ عالم تھا کہ اُن کے حصول میں بڑے ہنگامے ہوا کرتے تھے، دولت لٹائی جاتی تھی، کبھی زمین کو قطراتِ خوں سے لالہ زار بنا دیا جاتا تھا۔ طالبانِ کرسی میں سے کسی کو خریدنے کی نوبت بھی آجایا کرتی تھی۔ موجودہ زمانے میں کرسیوں کی تعداد اور اقسام میں جتنا اضافہ ہوا ہے، اتنی ہی صفِ عشاق طویل ہوگئی ہے۔ وہ کیو بنائے یوں کھڑے رہتے ہیں کہ کان صدائے تکبیر پر لگے ہوئے ہیں اور آنکھیں اشارۂ ابرو کی منتظر ہیں۔ ذرا آواز فضا میں گونجے اور نمازِ عشق پڑھنا شروع کر دیں۔ کیفیت بالکل وہی ہوتی ہے، جس کی عکاسی اس شعر میں کی گئی ہے:

باندھ کے صف ہوں سب کھڑے تیغ کے ساتھ سر جھکے
آج تو قتل گاہ میں دھوم سے ہو نمازِ عشق

آج کل وہ روایتی مجنوں پیدا نہیں ہوتے، جو ناقۂ لیلیٰ کے ساتھ میلوں دوڑے چلے جایا کرتے تھے۔ اُن کی جگہ ایسے دلدادگانِ کرسی عالمِ وجود میں آرہے ہیں، جو اس کی زلفِ گرہ گیر میں اسیر ہو کر بھاگتے نہیں بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔ اپنی جگہ تڑپتے ہیں۔ رومانی غزلیں کہتے ہیں، کہانیاں لکھتے ہیں، اسی طرح ہجر و فراق کی کڑی منزلیں طے ہو جاتی ہیں اور شربتِ وصل پینے کی مسرّت حاصل ہو جاتی ہے۔ تو عالمِ سرخوشی میں کرسی کے علاوہ ہر چیز کو فراموش کر دیتے ہیں۔ دن رات اسی کے خالِ رخسار کی پرستش میں مصروف رہتے ہیں۔ دل کی ساخت بدل جاتی ہے۔ خون میں بھی کیمیاوی تغیرات ہو جاتے ہیں۔ سرخی کم ہو کر سفیدی بڑھ جاتی ہے۔ اس حقیقت کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے کہ کرسی کے اَن گنت فریفتہ ہیں وہ ان میں سے کسی کو بھی مرکزِ التفات بنا سکتی ہے۔ نئے چہروں کی تلاش کرسی کی تاریخی روایت ہے۔ وہ تو گرفتارانِ بلا پر زیادہ مہربان رہتی ہے۔ اُن کے ہجر و فراق کی مصیبتوں پر اُسے رحم بھی آجاتا ہے۔ حالاں کہ سنگدلی محبوبیت کا خاص وصف ہے۔ تاہم کبھی معشوق کی نگاہِ مشکل پسندی میں رحم کے جذبات بھی جھلک آتے ہیں۔ کرسی

کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ اس پر جلوہ فرما ہوتے ہی کائنات قدموں پر جھکی محسوس ہوا کرتی ہے۔ زمین سورج کے گرد گھومنا بھول کر اُسی کے محور پر رقص کرنے لگتی ہے جب کوئی ضرورت مند پوچھتا ہے:

اندر آ سکتا ہوں؟

تو ہوا موجِ شراب کی شکل اختیار کرنے لگتی ہے۔ فضا نشاط انگیز نغموں سے بھر جاتی ہے اور وہ اپنے وجود کو سب سے زیادہ سربلند سمجھنے لگتا ہے۔ کرسی نیچے سے کھسک جاتی ہے تو آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ہر طرف کُہر کی گاڑھی چادر تن جاتی ہے۔ وہ کرسی کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر عہد کرتا ہے کہ زندگی میں ایک بار پھر تجھے آغوشِ شوق کی زینت بناؤں گا۔ کرسی کی سیاہ اور چمکدار زلفیں ہر لحظہ تصور میں لہراتی رہتی ہیں۔ کرسی زبانِ حال سے کہتی سنائی دیتی ہے۔ مجھ سے وہی جاں فروش ہمکنار ہو سکتا ہے، جو شمشیرِ آبدار کی دھار پر بوسہ دینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ کرسی کی نگاہیں ایک ہی آن میں پھر جاتی ہیں، وہ کسی اور کی گردن میں نقرئی بانہیں حمائل کر دیتی ہے۔ کرسی کا ٹھکرایا ہوا بدنصیب ہر وقت اُسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے بیتاب رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ فرقت کی کالی اور لمبی رات جلد سے جلد صبحِ وصل میں تبدیل ہو جائے، افقِ مشرق پر وہ ستارا چمکنے لگے، جو مسرتوں کا نقیب بن کر نکلا کرتا ہے کرسی کا حصول اور ترک اختیاری نہیں۔ اس کے کچھ اصول ہیں، مگر محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ کرسی کے شیدائی ساری رکاوٹیں دُور کر کے چاہتے ہیں کہ جس طرح ہو سکے جلد اس پر قابض ہو جائیں، لیکن وقت اتنا ظالم اور سنگ دل ہے کہ آرزوؤں کے آبگینوں کو توڑ کر ہی دم لیتا ہے۔ ملک میں کروڑوں صاحبانِ دل آباد ہیں، ان کے سینہ میں دھڑکتے ہوئے قلوب کا جائزہ لیا جائے تو سویدائے دل میں جو چنگاری شعلہ بن جانے کی دُھن میں چمک رہی ہوگی، وہ کرسی کے اشتیاقِ بے پایاں ہی کی ہوگی، کرسی کا حسن لازوال ہے اس کی کشش مکان و زمان کی پابند نہیں۔ ہر کرسی میں دل ربائی کا وصف نہیں ہوتا۔ گھر میں کتنی ہی نازک اور آراستہ کرسی پر بیٹھ جایئے اس میں جلوہ افروزی کا وہ لطف نہیں ہوگا، جو کسی جلسہ کی کرسیِ صدارت میں ہوا کرتا ہے۔ ہزاروں فرہاد طلائی و نقرئی تیشے لیے کرسی کی خاطر جوئے شیر لانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، یہ تگ و دَو کبھی کم نہیں ہوتی۔ کرسی اور بڑی آنکھوں والی شوخ و شنگ معشوقہ میں کوئی فرق نہیں، بلکہ کرسی ہی کو امتیاز حاصل ہے۔ وہ زیادہ موقع پرست طالبِ زر، ہرجائی اور

تبدیلی پسند ہے۔ نئے نئے عشاق کو نوازتی رہتی ہے۔ یہ تمنا دانشوری کی علامت ہے کہ قدرت عشق دے تو کسی عشوہ طراز اور ناز آفریں حسینہ کا دے، جو پہلوئے رقیب میں بیٹھ کر بھی عاشقِ نامراد کو دیکھ کر طنزیہ انداز سے مسکرا تو دیتی ہے۔ اس زہریلے تبسّم میں طنز کی کتنی ہی کاٹ ہو، ایک ناز بردار اُسے معشوق کی اس ادا کو ادائے بے نام ہی سے تشبیہ دیتا ہے، جس کا حسن و عشق کی ڈکشنری میں کوئی ذکر نہیں۔ کرسی کی تاریخ اوّل سے آخر تک بے نیازی اور تغافل شعاری کا دل شکن افسانہ ہے۔ کرسی کی انقلاب انگیز تبدیلیوں کے پیشِ نظر کرسی نشینوں کو دیدہ وری سے کام لینا چاہیے اور اُسے بدلگام گھوڑے کی طرح قابو میں رکھنا چاہیے۔ اس عاشقانہ جذباتی رویّے سے شدید نقصان ہوتا ہے، جس میں باگ ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے اور پاؤں رکاب سے نکل جاتے ہیں اور کرسی نشین چیخ اُٹھتا ہے کہ:

رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

* * *

مَیں... بقلم خود!

گلِ نوخیز اختر

میرا نام گلِ نوخیز اختر ہے۔ لوگ اسے لڑکیوں والا نام سمجھتے ہیں۔ کاش! وہ نام کی بجائے 'کام' پر غور کریں۔ میرا یہ نام میری نانی نے رکھا تھا، جو وائٹ اَن پڑھ تھیں۔ بقول بانو قدسیہ ایسا نام کوئی اَن پڑھ عورت ہی رکھ سکتی تھی۔ لکھنے لکھانے کا سلسلہ میں نے ضیاء الحق کے ریفرنڈم کے بعد شروع کیا۔ اُس وقت میری عمر اتنی ہو چکی تھی کہ گھر سے باہر کھڑا ہوتا تو لوگ مجھے گھور کر گزرتے تھے۔ میرا قد سات فٹ سے کچھ کم ہے، یعنی پانچ فٹ نو انچ۔ شکل ایسی ہے کہ ٹنڈ کروالوں تو منہ سے اچھا سر نکل آتا ہے۔ لفظی اعتبار سے 1972ء اور معنوی اعتبار سے 1987ء میں پیدا ہوا، کیوں کہ میں نے پہلی بار لاہور 1987ء میں دیکھا تھا۔ ملتان میں پیدا ہونے کی وجہ سے میرے مزاج میں قدرے گرمی ہے، اتنی زیادہ کہ غصّے میں کچا انڈہ بھی منہ میں ڈال لوں تو وہ بوائل ہو جاتا ہے۔ آواز بھاری، چہرہ لمبوترہ، آنکھیں چھوٹی اور جسم درمیانہ ہے (درمیانہ سے کوئی غلط مراد نہ لی جائے)۔ نئے کپڑوں سے زیادہ نئی بنیان پہننے کا شوقین ہوں، اتنا زیادہ کہ بعض اوقات بنیان بھی پہنی ہو تو نیچے بنیان پہن لیتا ہوں۔ رنگ ایسا ہے گویا کالا ہوتے ہوتے بچا ہوں، تعلق اُس ذات سے ہے، جن کے بارے میں مشہور ہے کہ گٹر میں پانچ روپے گر جائیں تو دس روپے دے کر نکلوا لیتے ہیں۔ فلموں کا کوئی خاص شوق نہیں، ویسے بھی مار دھاڑ اور شور شرابے والی فلموں سے میری جان جاتی ہے، اس لیے کوشش کرتا ہوں کہ ایسی فلمیں دیکھوں، جنہیں دیکھتے وقت آواز کھولنے کی ضرورت نہ پڑے۔ گنگنانے کا بھی شوق ہے، لیکن یہ کام اُس وقت کرتا ہوں، جب پوری تسلی ہو جائے کہ باتھ روم کی کنڈی سختی سے بند ہے۔ اپنی بات منوانے کے سلسلے میں بہت ضدی واقع ہوا ہوں۔ اندازہ اِس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ ایک لڑکی سے کہا تھا کہ میں تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا، اُس کے بعد کم از کم اُسے ہاتھ واقعی نہیں لگایا۔ ویسے بھی میں لڑکیوں سے دُوری

رہتا ہوں، اس لیے کہ وہ مجھے قریب ہی نہیں آنے دیتیں۔ میں روتا بہت کم ہوں، اس لیے نہیں کہ مجھے رونا نہیں آتا، بلکہ اس لیے کہ مجھے روتے دیکھ کر دوسروں کی ہنسی نکل جاتی ہے۔ لباس میں پینٹ شرٹ کا اسیر ہوں۔ شلوار قمیص سے اس لیے پرہیز کرتا ہوں کہ باوجود اسکاؤٹنگ سیکھنے کے، ابھی تک زار بند کی گرہ نہیں لگانی آئی۔ ٹائی میں بھی سنگل ناٹ یا ڈبل ناٹ کی بجائے ڈوناٹ "Do Not" اور ڈس ناٹ "Does Not" زیادہ پسند کرتا ہوں۔ اب تک چھ کتابیں پیدا کر چکا ہوں، تین کا طباعتی نکاح ہو چکا ہے، باقی تین کے لیے اچھے رشتے (پبلشر) کی تلاش میں ہوں۔ دعا کیجیے کہ اللہ مجھے اس کام میں سرخرو کرے۔ آمین!

ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے میری بغاوتوں کو سراہا، مجھے ان کے غصّے اور جثّے سے بہت خوف آتا ہے۔ وہ تو گھور کر بھی دیکھیں تو سامنے والے کا وعلیکم السلام نکل جاتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی بھی اس جرم میں شریک ہوئے۔ اِس سے یہ مراد نہ لیا جائے کہ وہ انعام الحق کے گواہ ہیں، بلکہ وہ تو مزاح نگاروں کی رُوحانی ماں ہیں۔ اللہ انہیں زندگی دے، اتنا ہنساتے ہیں کہ انسان کو ہنسی روکنے کے لیے بھی ہنسی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یونس بٹ نے اپنے محبت بھرے جذبات سے نوازا۔ میں اُن کی 'بٹ اخلاقی' کو سلام پیش کرتا ہوں۔ واجب القتل... گلِ نوخیز اختر

* * *

زرعی تحقیق

محمد اصغر خان

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تحقیق کیا ہے؟ لغوی معنوں کے لحاظ سے مطلب ہوا، حق کی تلاش۔ انگریزی بھی کیا زبان ہے، اس میں تحقیق کو ریسرچ کہتے ہیں۔ "Re" کا مطلب پھر سے اور "Search" کا مطلب تلاش، یعنی پھر سے تلاش۔ گویا انگریزی میں ہر چیز کے بارے میں 'پھر سے تلاش' کو 'تحقیق' کہتے ہیں۔ بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن ہم نے "Research" کو مشرف بہ اُردو کرتے ہوئے اِسے صرف حق کی تلاش تک محدود کر دیا ہے۔ آپ کو مزے کی بات بتلاؤں، اپنے تک محدود رکھیے گا کہ میں محکمۂ زراعت کے شعبۂ تحقیق سے 36 برس وابستہ رہا ہوں۔ 20 کے قریب تحقیقی مقالات کا مصنف بھی ہوں، جو باقاعدہ سائنسی مجلّوں میں شائع ہوئے ہیں۔ بے شمار کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی، جو تمام انگریزی زبان میں ہوتے تھے۔ اس 36 سال کے عرصے میں جو تحقیق میں نے کی ہے، اُس کا ذکر تو خودستائی کے زمرے میں آجائے گا، لہٰذا میں اس سے گریز کرنے کی سعیِ ناکام ضرور کروں گا، البتہ چند تحقیقات آپ لوگوں کے گوش گزار کروں گا، تاکہ آپ لوگ کم اَز کم اپنے سائنسدانوں کی اتنی بے قدری نہ کریں، جس کے وہ مستحق ہیں!

فیلڈ مارشل ایوب خان کا زمانہ تھا۔ پاکستان کی زراعت رُوبہ ترقی تھی۔ زراعت کی ترقی میں کیمیاوی کھادوں کا ایک اہم کردار ہوتا ہے۔ فاسفورسی کھادوں، جن کی ہماری زمینوں کو اشد ضرورت تھی اُن کے لیے ہم خام مال اُردن سے درآمد کیا کرتے تھے، جو کہ زرِ مبادلہ پر ایک بوجھ تھا۔ جیالوجکل سروے آف پاکستان کا صدر دفتر کوئٹہ میں تھا۔ اس محکمے کا کام پاکستان کے لامتناہی سلسلۂ کوہ میں معدنیات تلاش کرنا تھا۔ کروڑوں ڈالر کی غیر ملکی امداد سے اس محکمے کا قیام عمل میں آیا تھا۔ بے انتہا خرچ سے شاندار دفاتر اور تجربہ گاہیں بنائی گئیں تھیں اور بے شمار سائنسدان بھرتی کیے

گئے تھے۔

ایک دن ہم اپنی زرعی تحقیق کی لیبارٹری میں کام کر رہے تھے، یعنی سب مل کر بیت بازی کر رہے تھے، افسرِ بالا نے مجھے طلب کیا، چوں کہ میں ماتحتوں میں سب سے سینئر تھا۔ افسر نے بڑی احتیاط سے ایک تھیلی میں بند پتھر کے چند ٹکڑے اس ہدایت کے ساتھ میرے حوالے کیے کہ اِن میں فاسفورس کی مقدار معلوم کروں اور شام تک اِن کا کیمیاوی تجزیہ کر کے اُن کی رپورٹ دوں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ تاکید کی کہ کام بہت احتیاط سے ہونا چاہیے۔ میں نے حسبِ معمول تجربہ گاہ میں آ کر وہ کام اپنے ماتحت کے سپرد کر دیا اور اُس کو وہی ہدایات دیں جو کہ میرے افسر نے مجھے دی تھیں۔ چار گھنٹے بعد میرا ماتحت رپورٹ مطلوبہ فارم پر لے آیا، جس کے مطابق اُن پتھروں میں فاسفورس بقدر اشکِ بلبل تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ تجزیہ ٹھیک سے کیا ہے نا؟ اور اُس کا جواب اثبات میں پا کر افسر کے مقرر کردہ ہدف سے ایک گھنٹہ قبل اُسے اپنی رپورٹ بڑے فخر سے پیش کر دی۔ رپورٹ پڑھ کر افسر کی بھویں تن گئیں اور حکم صادر ہوا کہ اوور ٹائم لگا کر تمام کیمیکلز دوبارہ سے بنا کر اُن پتھروں کا پھر تجزیہ کیا جائے۔ میں نے تجربہ گاہ میں آ کر اپنے ماتحتوں کو دوبارہ وہی حکم دے دیا۔ شام کے سات بج گئے، لیکن اُن پتھروں میں فاسفورس کی مقدار پھر وہی نکلی۔ ہمارے کیمسٹ صاحب نے وہ رپورٹ دیکھی تو بہت ناراض ہوئے۔ اب حکم صادر ہوا کہ صبح وہ خود آ کر اُن کا تجزیہ کریں گے۔ دوسری صبح وہ خود تجربہ گاہ میں تشریف لائے اور اُن کی زیرِ نگرانی تمام عمل دہرائے گئے، لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات! ہمارے افسر بہت پریشان نظر آتے تھے۔ میں نے اُن کے دفتر میں جا کر اُن کی پریشانی کا سبب پوچھا، تو وہ کچھ سوچنے کے بعد بڑی رازداری کے لہجے میں بولے، ”میاں، ڈائریکٹر جنرل جیالوجیکل سروے آف پاکستان سے یہ **"Rock Phosphate"** کا نمونہ آیا ہے کہ اس میں فاسفورس کی مقدار معلوم کی جائے۔“ میں نے عرض کی، ”جناب یہ کام وہ خود کیوں نہیں کرتے، ہمارا اس تحقیق سے کیا تعلق اور آپ کیوں پریشان ہیں۔“ کہنے لگے، ”ڈائریکٹر جنرل میرا دوست ہے اور اُس نے مجھ سے درخواست کی تھی۔ اُن کی تجربہ گاہوں کا سامان ابھی تک کسٹم سے کلیئر نہیں ہوا ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ فکر نہ کریں، دو تین دن کا وقت لے لیں، میں کوشش کرتا ہوں۔

صاحب کی پریشانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے اگلے دن اپنے ماتحتوں کے ساتھ مل کرتے

انور احمد علوی

سروے سے سارے عمل دہرائے، لیکن نتیجہ وہی رہا۔ یہ تجزیہ ہماری تجربہ گاہ کا معمول تھا، اس لیے میں نے دل میں ٹھانی کہ جیالوجیکل سروے آف پاکستان میں جا کر اِس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کروں گا، جہاں میرے کچھ شناسا تھے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ جنرل ایوب صاحب تجربہ گاہ کے معائنے کے لیے کوئٹہ تشریف لائے تھے، تجربہ گاہیں دکھانے کے بعد ڈائریکٹر جنرل نے جنرل صاحب کے لیے مارخور (پہاڑی بکرے) کے شکار کا اہتمام کیا تھا۔ ڈائریکٹر جنرل کے آفس میں دورانِ گفتگو جنرل صاحب بڑے ناراض تھے کہ اتنے بڑے سلسلۂ کوہ کے ہوتے ہوئے بھی ہم راک فاسفیٹ اُردن سے درآمد کرتے ہیں۔ ڈائریکٹر جنرل نے انہیں یقین دلایا کہ سروے بہت تیزی سے ہو رہا ہے اور انشاءاللہ آپ دیکھیں گے کہ پاکستان معدنیات کے معاملات میں خودکفیل ہو جائے گا۔ اِس کا سہرا انہوں نے جنرل صاحب کے سر باندھا کہ یہ سب دراصل اُن مساعیِ جمیلہ کے نتیجے میں ممکن ہوگا، جو جنرل صاحب نے اِس ادارے کے قیام کے لیے کی ہیں۔ دورانِ شکار جنرل صاحب اچانک ایک پتھر سے ٹکرا کر لڑکھڑا گئے اور ٹخنے پر معمولی سی چوٹ آئی۔ ڈاکٹر وہاں موجود تھے، انہوں نے فوراً مرہم پٹی کی۔ ڈائریکٹر جنرل نے جنرل صاحب سے بصد اَدب دریافت کیا کہ جنابِ والا جس پتھر سے آپ کا پاؤں ٹکرایا ہے، آپ کو معلوم ہے کہ وہ کون سا پتھر تھا؟ جنرل صاحب نے کہا، مجھے کیا معلوم۔ ڈائریکٹر جنرل نے کہا کہ جنابِ والا وہ راک فاسفیٹ کا ایک پتھر تھا اور یہ پہاڑ راک فاسفیٹ کا ہے۔ یہ آپ کا مبارک قدم ہے، جس کی بدولت ہمیں پہلی کامیابی ہوئی ہے اور جنرل صاحب کے زخمی ٹخنے کو چوم لیا۔ جنرل صاحب زیرِ لب مسکرائے۔ دوسرے دن اخبارات میں سرخی لگی کہ پاکستان میں راک فاسفیٹ دستیاب ہو گیا ہے اور اِس کے ذخائر اتنے زیادہ ہیں کہ پاکستان اپنی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ اِسے برآمد بھی کر سکتا ہے۔ جیالوجیکل سروے آف پاکستان ایک مہینے کے اندر اِس پتھر کی کھدائی کی "Feasibility" بنالے گا۔ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میں خوش خوش اپنے آفیسر کے پاس پہنچا اور عرض کیا کہ جناب آپ وہ رپورٹ اطمینان سے بھجوا سکتے ہیں، لیکن اُن میں اتنی ہمت نہ تھی۔ واضح رہے کہ راک فاسفیٹ ہم آج بھی اُردن سے درآمد کرتے ہیں۔

محمد اصغر خان ...... زرعی تحقیق

پاکستان کے ایک بیوروکریٹ ہیں، بڑی اچھی انگریزی لکھتے بھی ہیں بولتے بھی ہیں۔ ایک بریفنگ کے دوران وزیراعظم نے اُس وقت کے سیکریٹری زراعت سے (جو ایک رینکر تھے)

رنگِ ادب پبلی کیشنز

کپاس کے بارے میں ایک سوال پوچھا۔ سوال چوں کہ انگریزی میں تھا، سیکریٹری صاحب کی گھگی بندھ گئی۔ جس بیوروکریٹ کا میں ذکر کر رہا ہوں انہوں نے "No risk no gain" کا فارمولا استعمال کرتے ہوئے وزیر اعظم صاحب کے "Bluff" سوال کا اُس سے بڑا "Bluff" جواب دیا، وہ بھی شدھ انگریزی میں۔ وزیر اعظم صاحب نے بریفنگ کے بعد حکم صادر کیا کہ بیوروکریٹ موصوف کو سیکریٹری بنادیا جائے، تاکہ کرکٹ ٹیم کی تباہی کے بعد اَب کپاس کا بھی ستیاناس کیا جائے (یہ صاحب کرکٹ سلیکشن بورڈ کے ممبر بھی رہ چکے تھے)۔ داد دینی چاہیے وزیر اعظم صاحب کی "Choice" کی کہ صاحب موصوف نے جس دن قلمدان سنبھالا، اُس دن سے کپاس کی پیداوار رُو بہ زوال ہے، جس کا ذمہ دار کاٹن وائرس ٹھہرا۔ پھر کاٹن وائرس کو ختم کرنے کا سہرا بھی اُن کے اور اُن کے حواریوں کے سر بندھا اور اِن خدمات کے عوض انہیں بڑے بڑے تمغے بھی عطا ہوئے۔ لیکن موجودہ سال کی کپاس کی پیداوار 1991-92ء کے مقابلے میں، جو کہ پاکستان کی تاریخ میں کپاس کی پیداوار کا سنہرا سال تھا، بہت کم رہ گئی ہے۔ 1991-92ء میں پاکستان میں کپاس کی زیادہ پیداوار سائنسدانوں کی تحقیق، محکمۂ زراعت کی حکمتِ عملی، زمینداروں کی محنت شاقہ اور رحمتِ خداوندی کا نتیجہ تھی۔ اور اِس سال کی کمی موسم کی خرابی، وائرس کے حملے، کیڑوں کی قوتِ مدافعت اور ہماری بداعمالیوں کے صلے میں عذابِ الٰہی کا نتیجہ تھی!

* *

کراچی کا جغرافیہ

محمد خالد اختر

ساتھ دیے ہوئے نقشہ نمبر 1 میں دیکھو (ہمیں افسوس ہے کہ نقشہ وقت پر تیار نہ ہو سکا۔ اگلے ایڈیشن میں اِن شاءاللہ ضرور شامل ہوگا۔ نہ ایڈیٹر نہ مصنف) کراچی کے مشرق کی طرف حیدر آباد سندھ ہے۔ مغرب میں دریائے لیاری اور شمال میں شمالی پہاڑیاں اس کی حد بندی کرتی ہیں۔ جنوب میں سمندر ہے، لیکن کراچی اتنی تیزی سے پھیل رہا ہے کہ کچھ ہی مدت میں کراچی کے مشرق، مغرب اور شمال میں کراچی ہی ہوگا۔ قیاس غالب ہے کہ کافی عرصے تک جنوب میں سمندر ہی رہے گا۔ اگرچہ اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک سروے پارٹی پچھلے تین سال سے اس شہر کا رقبہ ماپنے پر لگی ہوئی ہے، جس کی رپورٹ کا انتظار ہے ویسے رقبہ کراچی کے لیے کافی ہے۔

کراچی کی اہمیت

کراچی کی اہمیت سے انکار کرنا فضول ہے۔ تم انکار بھی کرو تو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لاکھوں ہی آدمی اس شہر میں رہتے ہیں۔ کراچی نہ ہوتا تو ان کو بڑی مشکل درپیش ہوتی۔ ہمارے ملک کے نوّے فیصدی لیڈر، بڑے آدمی، امپورٹر ایکسپورٹر، ایڈیٹر، فلم ڈائریکٹر اور جیب تراش کراچی میں آباد ہیں، بلکہ اس پر چھائے ہوئے ہیں۔ بقیہ دس فیصدی جو لاہور اور دوسرے شہروں میں رہ گئے ہیں، رفتہ رفتہ کراچی کی سمت ہجرت کر رہے ہیں، کیوں کہ یہاں انہیں اپنی صلاحیتوں کو اُجالنے اور چمکانے کے لیے وسیع میدان نظر آتا ہے۔ حسنِ اتفاق سے ساحلِ بحر پر واقع ہونے سے کراچی کی اہمیت بحیثیت بندرگاہ کے بھی ہے۔ پریذیڈنٹ ہاؤس، ہوٹل میٹروپول اور ریس کورس نے کراچی کو اور بھی اہم بنا دیا ہے۔

آب و ہوا

کراچی کی اپنی آب و ہوا نہیں ہے۔ آب تیس چالیس میل دُور سے لوہے کے نلوں کے ذریعے سے کراچی لایا جاتا ہے۔ اسے چائے کے ساتھ ایرانی کیفوں میں نوش کیا جاتا ہے۔ ورنہ ہضم نہیں ہوتا۔ ہوا کے لیے اہلیانِ کراچی سمندر کے رحم و کرم پر ہیں۔ کراچی میں ایک ایسا موسم بھی آتا ہے جب ہوا سونے کے تول بھی نہیں ہل سکتی۔ بجلی کے پنکھے کے نیچے بھی ہوا نہیں ہوتی۔ بیشتر اہلِ کراچی جو مکانوں اور عمارتوں کی تیسری اور چوتھی منزلوں سے چھلانگ لگا کر خودکشی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے اسی موسم کو پسند کرتے ہیں۔

دریا

کراچی کے مشرق میں دریائے ملیر اور مغرب میں دریائے لیاری ہے۔ دریائے لیاری برسات کے دنوں میں بہتا ہے۔ ایک اور دریا جس کا نام ابھی بلدیہ کے زیرِ تجویز ہے، ناگہانی بارشیں پڑتے ہی کراچی کے گلی کوچوں اور نشیبی حصوں میں نمودار ہو جاتا ہے اور خوب تباہی مچاتا ہے۔

نباتات

نقشہ نباتات دیکھو (برادرم سخاوت حسین ڈرافسٹ مین کی گمشدگی کی وجہ سے نقشہ نہیں بن سکا۔ اگلے ایڈیشن میں اس کو شامل کرنے کی کوشش کی جائے گی) کراچی کی زمین عموماً نباتات کے لیے غیر مفید ہے۔ فریئر ہال، جہانگیر پارک اور آرام باغ میں کچھ نباتات اُگتی ہیں۔ گاندھی گارڈن میں جسے عرفِ عام میں بغیچا کہا جاتا ہے کچھ گھاس ہوتی ہے۔ باقی نباتات مثلاً کھانے کی سبزیاں، پھل پھول وغیرہ سب باہر سے آتی ہیں۔ جن کا بولٹن مارکیٹ اور ایمپریس مارکیٹ میں کسی وقت بھی معائنہ کیا جا سکتا ہے۔ چند متمول اصحاب ان کو خرید کر کھاتے بھی ہیں۔ لیکن بیشتر باشندے ان کی دید سے ہی ثوابِ دارین حاصل کر لیتے ہیں۔ پھلوں میں پپیتا بے حد رغبت سے کھایا جاتا ہے۔ اطباء اسے معدے کی کل بیماریوں کے لیے اکسیر بتاتے ہیں۔

پیداوار

گیہوں، مکئی، جوار، باجرہ، نیشکر میں سے کسی کی کاشت بھی اس شہر میں نہیں ہوتی۔ اس کی

انور احمد علوی

ایک وجہ تو عمارتوں اور سڑکوں کے باعث مزروعہ زمین کی قلت ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں کے لوگ کھیتی باڑی کے کام سے نابلد ہیں اور ہل کی صورت سے بھی ناآشنا ہیں۔ راجہ ہل کو سمجھتے ہیں کہ کسی راجہ کا نام ہوگا۔ گیہوں آج کل امریکا سے آتا ہے۔ اسے ڈبل روٹی بنانے کے استعمال میں لاتے ہیں نیشکر یا گنا کھاتے نہیں، بلکہ اسے لوہے کی ایک چرخی میں پیڑ کر اس کا رس پیتے ہیں۔ رس پینے کا رواج بڑھ رہا ہے۔

معدنی پیداوار

یہاں کی واحد معدنی پیداوار عمارت سازی کا پتھر ہے، جسے آس پاس کی پہاڑیوں کو ہموار کر کے اور کھود کر حاصل کرتے ہیں۔ اہلِ کراچی کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے تصرف میں یہ پہاڑیاں ہیں، ورنہ انہیں اینٹوں کے مکانوں میں رہنا پڑتا۔

حیوانات

انسان کو چھوڑ کر جو بعض مصلحتوں کی بنا پر خود کو اِس زمرے سے خارج رکھنے پر مصر ہے۔ کراچی میں مختلف قسم کے حیوانات پائے جاتے ہیں۔ گھوڑا اور اونٹ یہاں بکثرت ملتا ہے۔ گھوڑا یوں تو ریس کورس کے خطے میں بھی ہوتا ہے اور اہلِ ذوق و استطاعت کے نزدیک بڑی قدر و منزلت پاتا ہے، لیکن زیادہ تر اسے وکٹوریا کے آگے آنکھوں پر چمڑے کے کھپرے چڑھا کر جوتتے ہیں۔ اونٹ باربرداری کے چھکڑوں کے آگے جُتا ہوا ملتا ہے۔ یہ حیوان نہایت مطمئن اور آسودہ مزاج نظر آتا ہے اور انسانوں کی کارگزاریوں اور بھاگ دوڑ کو ایک عجیب بے نیازانہ شان سے دیکھنے کا عادی ہے، جس سے بڑی اُلجھن ہوتی ہے۔ ملک کا سارا سرپلس اونٹ کراچی میں چھکڑے کھینچنے کی خاطر لایا جاتا ہے۔ بڑا گدھا اور چھوٹا گدھا بھی اکثر گدھا گاڑیوں کے آگے بھاگتا نظر آ جاتا ہے۔ کتا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے ہاں بلی بافراط ہوتی ہے۔ بلی جو اکثر دیسی اور گھٹیا نسل کی ہوتی ہے ہر ریستوران، کیفے اور ہیر کٹنگ سیلون میں ملتی ہے۔ اہلِ کراچی میں سے بعض کا خیال ہے کہ اس کی موجودگی سے کاروبار میں برکت ہوتی ہے۔ ایرانی یا بغدادی بلیاں شہر کے مشرقی خطے میں سمور و سنجاف میں ملبوس رہتی ہیں اور بہت کم باہر نکلتی ہیں۔ کراچی کے بعض خطوں میں بھینس بھی ملتی ہے۔ لوگ ان کو دوہ کر دودھ حاصل کرتے ہیں اور اس میں حسبِ ضرورت پانی

رحیمی ادب پبلی کیشنز

محمد خالد اختر ...... کراچی کا جغرافیہ

لا کر فروخت کرتے ہیں۔ گاندھی گارڈنز یعنی بغیچے میں بھی چند حیوانات از قسم شیر، چیتا، بندر، لنگور، کنگرو، آسٹریلین طوطے وغیرہ۔ پنجروں میں رہتے ہیں، لیکن وہ دراصل کراچی کے باشندے نہیں، تقریباً سب کے سب غیر ملکی ہیں اور چڑیا گھر کے منتظمین نے ان کے آباواجداد کو گھومنے والی سرکس کمپنیوں سے بیس پچیس سال پہلے خرید کیا تھا۔ چرند پرند میں کوا، چیل اور گدھ عام ہیں۔ ہاں بلبل نہیں ہوتا۔ فارن افیرس منسٹری کے پاس بھی کئی سو سفید فاختائیں ہیں، جن کو جالی دار پنجروں میں رکھا جاتا ہے۔ کسی غیر ملکی بڑے آدمی کی آمد پر انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ منسٹری کا وہ محکمہ جو پرندے پکڑتا ہے ان فاختاؤں کو دوبارہ پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

قابلِ دید مقامات

قابلِ دید مقامات میں میری ویدر کلاک ٹاور، عبدالحنان سویٹ میٹ شاپ اور قائداعظم کا مزار مشہور و معروف ہیں... میری ویدر کلاک ٹاور کو دیکھ لینا ہی ہفت اقلیم کی بادشاہت پا لینا ہے۔ اس کے اوپر چڑھنا سود مند نہیں، اس کے اوپر کلاک ہے... عبدالحنان سویٹ میٹ شاپ کا نام کراچی کی اکثر دیواروں پر لکھا ہوا ہے۔ لیکن دراصل شاپ صدر کے محلے میں ہے۔ کراچی کی واحد سوغات کراچی حلوہ یا حبشی حلوہ یہاں سے دستیاب ہو سکتا ہے، وہ لوگ جن کے معدے کمزور ہیں ان کو یہ حلوہ کھانے کا مشورہ نہیں دیا جا سکتا۔ کئی لوگ عبدالحنان سویٹ میٹ شاپ میں جانے کے بعد پھر نہیں دیکھے گئے۔

قابلِ شنید مقامات

اوپر درج کیے ہوئے قابلِ دید مقامات کے علاوہ کراچی میں کئی ایک ایسے مقامات ہیں، جو صرف قابلِ شنید مقامات ہیں۔ انہیں دیکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ان مقامات میں گورنمنٹ ہاؤس اور میٹروپول بہت معروف ہیں۔ ہر چند کہ ان میں جانا اور انہیں دیکھنا چند خوش نصیبوں کو ہی میسر ہے۔ کراچی کے بعض اخبار اور موقر جریدے ان مقامات کی رُوح پرور سرگرمیوں سے اہلیانِ کراچی کو باخبر رکھتے ہیں۔ یہاں کا مشہور اخبار ہر صبح اپنے کورٹ سرکلر میں تاج کے نشان کے نیچے ان چیدہ ہستیوں کے نام چھاپتا ہے جنہیں گورنمنٹ ہاؤس میں پریذیڈنٹ کے ساتھ لنچ یا ڈنر کھانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ موقر رسالوں میں گورنمنٹ ہاؤس اور ہوٹل میٹرو

[illegible]

پول کی ضیافتوں، سالگرہ پارٹیوں اور عشائیوں کی تصویریں دیکھ کر روح وجد کرنے لگتی ہے۔

مشہور سڑکیں

سب سے مشہور سڑک بندر روڈ ہے۔ قیاس غالب ہے کہ کسی زمانے میں یہاں بندر ہوتے ہوں گے، جس کی وجہ سے سڑک کا نام بندر روڈ پڑ گیا۔ آج کل بندر نہیں ہیں۔ فریئر روڈ اور میکلوڈ روڈ بھی مشہور سڑکیں ہیں۔ تینوں سڑکیں اتنی نزدیک ہیں کہ آدمی ایک پر چلتا چلتا اُکتا جائے تو تین چار منٹ میں دوسری پر پہنچ سکتا ہے۔ الفنسٹن سٹریٹ میں شام کو تماشائیوں کا نظارہ قابلِ دید ہوتا ہے۔ اور انسان قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے۔ وکٹوریہ روڈ پر سیسل بار ہے۔

پیشہ و صنعت و حرفت

لوگوں کی زیادہ تر گزر بسر وزارت، لیڈری، درآمد برآمد، گھڑ دوڑ، ملازمت، فلم ڈائریکٹری اور بوٹ پالش پر ہے۔ ایسے لوگ بہت ملتے ہیں، جو بظاہر کوئی کام کرتے معلوم نہیں ہوتے اور کیفوں میں دن گزارتے ہیں۔

زبانیں

مختلف زبانیں کراچی میں بولی جاتی ہیں، جن میں زیادہ مروّج سندھی اُردو، حیدرآبادی اُردو، پنجابی اُردو، بنگالی اُردو وغیرہ ہیں۔ خالص ٹکسالی اُردو انجمن ترقیِ اُردو کے کالج کے احاطے میں سنی جا سکتی ہے۔

مذہب

لوگوں کی زیادہ تعداد مسلمان کہلاتی ہے۔ اہلِ اسلام میں تین اہم فرقے ہیں۔ ایک مخلوط انتخابات کا حامی ہے۔ دوسرا غیر مخلوط انتخاب کو عین دین قرار دیتا ہے۔ تیسرا فرقہ کسی قسم کے انتخابات کا قائل نہیں۔ پہلے دو فرقوں کے باہمی مباحثوں اور مناظروں نے کافی گرمی پیدا کر رکھی ہے۔ اہلِ اسلام کے علاوہ نصرانی اور زرتشتی بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

لوگ

کراچی کی کل آبادی کے متعلق مختلف آراء ہیں۔ بعض لوگوں کا اندازہ ہے کہ کراچی میں اٹھارہ انیس لاکھ انسان بستے ہیں۔ دوسرے کہتے ہیں کہ انسانوں کا شمار پینتیس لاکھ سے اوپر ہے۔

رنگیلا ادب ہی کیا کہنے

محمد خالد اختر ...... کراچی کا جغرافیہ

واللہ اعلم بالصواب۔ بہر حال، کراچی میں اتنے آدمی ہیں کہ کارخانہ قدرت پر حیرت ہوتی ہے، لیکن یہ آدمی کراچی کے اصلی باشندے نہیں، بیرونی حملہ آور ہیں۔ اصلی باشندے سب کے سب روٹھ کر جزیرہ بابا میں اُٹھ گئے ہیں۔ موجودہ لوگ خوش گفتار، خوش رفتار اور خوش دل ہیں، لیکن کسی کو پھٹے پر ہاتھ دھرنے نہیں دیتے۔ اُلو سیدھا کرنے کے فن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ہر ایک کو اپنے کام سے کام ہے، بلکہ دوسروں کے کام سے بھی، جب اپنا مطلب نکلتا ہو۔ سماجی اور معاشی اعتبار سے ان کی متعدد تقسیمیں ہوسکتی ہیں، جن کا یہاں ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ امتحان کے لیے یہی ایک تقسیم یاد کرلو:

بہت بڑے لوگ

ا... رہائش: مشرقی خطے میں رفیع الشان کوٹھیوں اور ہوٹلوں میں رہتے ہیں۔

ب... عادات: ہمیشہ موٹر میں چلتے ہیں۔ پیدل صرف ہوٹل میٹروپول کے عشائیوں میں چلتے ہیں۔ سال میں کئی مہینے کراچی سے باہر بیرونی ممالک میں رہتے ہیں۔ کراچی میں ہوں بھی تو نظر نہیں آتے۔ ان کا حال ڈان یا موقر رسالوں سے معلوم ہوتا رہتا ہے۔

ج... لباس: اگر موقر رسالوں کی تصویریں سچ کہتی ہیں تو اکثر سیاہ پتلون، سیاہ بو اور سفید مایا سے اکڑے کالر کی قمیص میں ملبوس رہتے ہیں۔ گنجے پن کو چھپانے کے لیے بعض موقعوں پر سٹرانسلیٹ بھی اوڑھتے ہیں۔

د... خوراک: چار پانچ کورس کا ناشتا، لنچ عموماً گھر پر کھاتے ہیں۔ شام کا ڈنر ہوٹل میٹروپول یا کسی اور پارٹی میں تناول فرماتے ہیں۔ ڈنر کے دام کوئی اور ادا کرتا ہے۔ سادہ پانی اور چائے شاذ و نادر ہی پیتے ہیں۔ ان کی بجائے بڑھیا انگریزی اور امریکن وسکی پیتے ہیں، جس سے بھوک تیز ہوتی ہو۔

ذ... تفریح: برج، ریس کورس، ڈانس بالکل نہیں، بس لائف میگزین اور مقامی موقر رسالوں کی تصاویر دیکھ لیتے ہیں۔

عام بڑے لوگ

(ا) رہائش: عموماً جمشید روڈ اور دوسرے فیشن ایبل خطوں میں عالیشان کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔

(ب) عادات: کبھی کبھار پیدل بھی چلتے ہیں۔ دس گیارہ بجے صبح تک پورے طور پر بیدار

ہو جاتے ہیں۔

(ج) لباس: اپنے اپنے مذاق کے مطابق لاؤنج سوٹ یا شیروانی اور جناح کیپ میں تن زیب رہتے ہیں۔ عشائیوں کے لیے ایک ایوننگ سوٹ بھی رکھتے ہیں یا اپنے بہترین دوستوں سے رات کی رات ادھار لے لیتے ہیں۔

(د) خوراک: اکثر گھر پر دو کورس کا ناشتا، لنچ اور ڈنر کھاتے ہیں۔ کاک ٹیل ہفتہ میں ایک دو بار پی لیتے ہیں، جب کوئی اور پلا رہا ہو۔

(ذ) تفریح: ڈان اور موقر رسالے پڑھتے ہیں۔ شام کو الفنسٹن اسٹریٹ یا ہوا بندر گاہ کی طرف بیگم بچوں سمیت نکل جاتے ہیں۔ پکچر ہفتہ میں دو بار پیراڈائز یا اوڈین میں، ہمیشہ تین روپے چھ آنے کی ریزرو کلاس میں بیٹھتے ہیں۔

متوسط الحال لوگ

(ا) رہائش: پگڑی پر حاصل کیے ہوئے کسی فلیٹ میں یا نئے کوارٹرز میں۔

(ب) عادات: دن کو دفتر میں کام کرتے ہیں۔ شام کو کسی ایرانی کیفے میں احباب کے جھرمٹ میں بیٹھ کر چہکتے ہیں۔ ڈیڑھ روپے سے زیادہ رقم جیب میں نہیں رکھتے۔

(ج) لباس: اپنے اپنے مذاق کے مطابق عموماً سفید قمیص، بوشرٹ پہنتے ہیں۔ بوشرٹ نئی بالا سات روپے پندرہ آنے میں خرید کرتے ہیں۔

(د) خوراک: ناشتے میں چائے اور مکھن توس، کھانا گوشت روٹی، چائے پینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

(ذ) تفریح: شمع، رومان اور نقاد کے معمے باقاعدگی سے حل کرتے ہیں۔ پکچر ہفتہ میں ایک آدھ بار ایک روپیہ بارہ آنے کلاس میں۔ ہوا بندر پر بھی اتوار کو جاتے ہیں۔ نہانے کے لیے پانی میں نہیں اُترتے۔ کنارے پر سیر کرتے ہیں۔

پرول

یہ لوگ سڑک کی پیومنٹ پر سوتے ہیں۔ پاجامہ پہنتے ہیں، جس میں سوراخ ہوتے ہیں۔ جو

کچھ بچا کھچا سڑا پڑا مل جائے اُٹھا کے کھا لیتے ہیں۔ چھلکے اور بیج ان کی مرغوب خوراک ہیں۔ تفریح کے لیے پیے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے اکھٹے کر لیتے ہیں اور رات کو تاروں کے نیچے پیومنٹ پر بیٹھ کر پیتے ہیں۔

کھوئے ہوئے لوگ

کراچی میں کثیر تعداد ایسے کھوئے ہوئے لوگوں کی نظر آتی ہے۔ یہ کیفوں میں ایک گلاس پانی لیے کسی گہری سوچ میں مستغرق بیٹھے ملتے ہیں۔ وہاں سے اُٹھ کر کسی اور کیفے میں جا بیٹھیں گے۔ ان سے کوئی بات نہیں کرتا۔ کراچی کے کم اَز کم سات آٹھ لاکھ لوگ اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا عارضہ غم بیشتر حالتوں میں غمِ روزگار اور بعض میں غمِ عشق ہوتا ہے۔

کراچی کا مستقبل

مندرجہ بالا معلومات سے اظہر من الشمس ہے کہ کراچی کا مستقبل شاندار ہے۔ حکومت کا خیال ہے کہ کراچی کو اَب شہر کی بجائے صوبہ بنا دیا جائے۔ کراچی صوبہ بن گیا تو میری ویدر کلاک ٹاور، بولٹن مارکیٹ، جونا بازار، چاکی واڑا، لالوکھیت سب شہر کہلانے لگیں گے۔ اس سے بڑا فائدہ ہوگا۔ بولٹن مارکیٹ سے لوگ صدر میں جائیں گے تو اس اہتمام سے جائیں گے گویا کہ ایک شہر سے دوسرے شہر جا رہے ہیں۔

نوواردوں کے لیے چند کارآمد باتیں

کراچی سے حتیٰ الامکان دُور رہنے میں فائدہ ہے۔ اگر تمہارا کراچی جانا بہت ہی ضروری ہو تو ذیل میں دی ہوئی ہدایات کو نہ صرف غور سے پڑھو، بلکہ گرہ سے باندھ لو:

ا۔ بیشتر گاڑیاں کراچی ہی جاتی ہیں۔ پھر بھی گاڑی میں چڑھنے سے پہلے اطمینان کر لو کہ گاڑی کراچی ہی جاتی ہے۔ ہم ایک دفعہ ایک گاڑی میں سوار ہوئے تھے اور دوسرے دن آنکھ کھلی تو کراچی کی بجائے خود کو شکار پور سندھ میں پایا۔

۲۔ کراچی میں اگر ہوٹل میں ٹھہرو تو بہتر ہے کہ قیام وطعام کے پیشگی کرائے اور واپسی ریل کے تھرڈ کلاس کے کرائے کی رقم مینیجر کے پاس جمع کرا دو اور باقاعدہ رسید لے لو۔ کئی لوگ کراچی میں اسی لیے ہیں کہ انہوں نے یہ احتیاط نہیں برتی۔

۳۔ بندر روڈ اور الفنسٹن اسٹریٹ کی دکانوں کی کھڑکیوں میں سجے سجائے مال کو بے شک دیکھو لیکن دکانوں کے اندر جانا سخت نادانی ہے۔

۴۔ پپیتا کھاؤ۔

۵۔ عبدالحنان سویٹ میٹ شاپ سے کراچی کا حلوہ بطور سوغات کے احباب کے لیے لے جاؤ۔ احباب تمہیں ساری عمر یاد رکھیں گے۔

۶۔ چاکی واڑہ میں جانے سے پہلے جیب میں کوئی چاقو یا تیز دھات کی چیز رکھ لو۔ ممکن ہے ضرورت پیش آ جائے۔ جیب میں نقدی قطعاً نہیں ہونی چاہیے۔

۷۔ جلد از جلد کراچی سے واپس لوٹنے کی کوشش کرو ورنہ وہیں کے ہو رہو گے۔ ہوٹل والے اپنے بل کی ادائیگی کے بغیر اسباب نہیں اُٹھانے دیتے۔

سوالات

۱۔ کراچی میں آب و ہوا کہاں سے آتی ہے۔ آب و ہوا کے لیے کیا کوئی اور انتظام ممکن ہے؟

۲۔ کراچی کے مشہور دریا کون کون سے ہیں۔ ان سے کراچی کو کیا فائدہ ہے؟

۳۔ نقشہ حیوانات بناؤ۔ چھوڑی ہوئی فاختاؤں کے دوبارہ پکڑنے کی کوئی ترکیب تمہیں معلوم ہو تو لکھو!

۴۔ کراچی کے اصل باشندے کہاں رہتے ہیں۔ کیا ان کے واپس آنے کا امکان ہے؟

۵۔ کراچی کا مستقبل کیوں شاندار ہے۔ کراچی میں کن کن باتوں کا خیال رکھنا لازم ہے۔ کھوئے ہوئے لوگ کیوں کھو جاتے ہیں۔ آخر کیوں؟

* * *

سائنسی اُصول

مرزا حیدر عباس

میرا نام کرم دین ہے۔ باپ کا نام رحیم دین تھا۔ میں ”تسلی بخش کنسٹرکشن کمپنی“ میں مستری ہوں۔ تعلیم تو کچھ نہ ہونے کے برابر ہے، لیکن تجربہ کافی ہے... پورے تین مہینے کا۔ جس انجینیئر کے ساتھ بھی میں کام کرتا ہوں، اُس سے کوئی نہ کوئی سائنسی اُصول ضرور سیکھتا ہوں۔ اور جب وہ نہیں ہوتا تو اِس سائنسی اُصول کو استعمال کرتا ہوں۔ سائنسی اُصول برتنے سے عموماً کام آسان بھی ہو جاتا ہے اور دلچسپ بھی۔ لیکن ایک بات مجھے آج ہی پتا چلی ہے وہ یہ کہ سائنسی اُصول کو ذرا احتیاط سے استعمال کرنا چاہیے، یعنی تھوڑا، تھوڑا۔ اگر سائنسی اُصول زیادہ استعمال ہو جائے تو آدمی کو اسپتال جانا پڑتا ہے۔ واضح ہو کہ میں اس وقت اسپتال ہی میں ہوں۔ میرے بستر کا نمبر 99 ہے۔ آپ چاہیں تو مجھ سے مل بھی سکتے ہیں۔

پہلے تو میں آپ کو وہ سائنسی اُصول بتا دوں جس پر عمل کرنے کی وجہ سے میں شعبۂ حادثات کے بستر نمبر 99 پر پڑا ہوں۔ یہ تو مجھے آپ سے ہی پوچھنا ہے کہ میں نے وہ سائنسی اُصول برتنے میں بداحتیاطی کہاں کی تھی۔ ویسے پوچھنا تو مجھے اُن انجینیئر صاحب سے چاہیے تھا، جن سے میں نے یہ اُصول معلوم کیا تھا، لیکن وہ ایک مہینہ ہوئے امریکا جا چکے ہیں۔ شاید وہاں کے مستریوں کو وہ سائنسی اُصول بتانے کے لیے۔

تو جناب، وہ اُصول یہ ہے کہ ”اگر ہم چرخی سے ایک رسّی لٹکا دیں اور اُس کے دونوں سروں سے دو چیزیں باندھ دیں تو جو چیز بھاری ہوگی وہ نیچے چلی آئے گی اور ہلکی چیز اُوپر چلی جائے گی۔“ جب ہمیں کسی اُونچی عمارت پر کوئی سامان پہنچانا ہو تو ہم اِس سائنسی اُصول کو استعمال کرتے ہیں۔ اُونچائی سے کسی سامان کو آسانی سے نیچے لانے کے لیے بھی یہی اُصول استعمال ہو سکتا ہے۔

آج صبح نو بجے جب میں ”تسلی بخش کنسٹرکشن کمپنی“ کے آفس میں اپنی ڈیوٹی پر پہنچا تو مینیجر صاحب

[illegible]

نے مجھے بلڈنگ نمبر 19 کی مرمت کے لیے جانے کا حکم دیا۔ بلڈنگ نمبر 19 کا جائزہ لیا تو میں نے دیکھا کہ حالیہ شدید بارشوں کی وجہ سے اِس چار منزلہ بلڈنگ کی چھت کے ٹائل جگہ جگہ سے اُکھڑ گئے ہیں۔ میں نے چھت پر بیم ڈالی اور ایک لوہے کی چرخی نصب کر کے اُس پر رسّی لٹکا دی۔ نیچے سے مزدوروں نے کنستر میں ٹائل بھرے اور کنستر کو رسّی سے باندھ دیا۔ پھر رسّی کا دوسرا سرا کھینچنا شروع کیا۔ کنستر اُوپر آ گیا۔ اس طرح سے دو کنستر بھر کے ٹائل میں نے اُوپر منگوائے اور چھت کی مرمت کر دی۔

کام ختم ہو چکا تو میں نے دیکھا کہ بہت سے ٹائل باقی بچ رہے ہیں۔ میں نے اُن سب ٹائلوں کو سمیٹ کر ایک کنستر میں ڈالا اور کنستر کو رسّی سے باندھ دیا۔ پھر اطمینان سے ہاتھ ہلاتا ہوا نیچے چلا گیا۔ رسّی کا دوسرا سرا مزدوروں نے ایک کھڑکی کی لوہے کی جالیوں سے باندھ دیا تھا۔ میں نے رسّی کھولی۔ اور ذرا سی ڈھیل دی۔ کنستر بھاری تھا، لہٰذا سائنسی اُصول کے مطابق نیچے آنے لگا۔ لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ رسّی کے دوسرے سرے پر مَیں تھا اور میں ٹائل بھرے کنستر سے ہلکا تھا، لہٰذا سائنسی اُصول کے مطابق میں اُوپر جانے لگا۔ جب تک میری سمجھ میں آئے کہ کیا ہو رہا ہے، میں دوسری منزل تک پہنچ چکا تھا۔ یہاں میری ملاقات نیچے جاتے ہوئے بھاری کنستر سے ہوئی جو میرے شانے کو رگڑ کر گزر گیا۔ جتنی تیزی سے کنستر نیچے گیا، اُتنی ہی تیزی سے میں اُوپر آیا۔ چنانچہ میرا سر بیم سے ٹکرایا اور انگلیاں چرخی میں پھنس گئیں۔ کنستر چوں کہ نیچے تیزی سے گیا تھا، اس لیے زور سے زمین پر جا کر پڑا۔ اُس کا تلا پھٹ گیا اور سارے ٹائل نکل گئے۔ اب کنستر ہلکا ہو گیا اور میں بھاری، لہٰذا سائنسی اُصول کے مطابق میں تیزی سے نیچے جانے لگا۔ راستے میں ٹوٹے ہوئے کنستر سے پھر ملاقات ہوئی جو میرے گھٹنوں کو چھیلتا ہوا گزر گیا۔ میں نیچے گیا تو زمین پر زور سے گرا۔ بکھرے ہوئے ٹائلوں کے نوکیلے ٹکڑے میرے بدن میں چبھ گئے اور کمر سے خون بہنے لگا۔ اتنی تکلیف ہوئی کہ میں نے رسّی چھوڑ دی۔ اب کنستر سائنسی اُصول کے مطابق نیچے آنے لگا کیوں کہ وہ رسّی کے دوسرے خالی جھولتے ہوئے سرے سے بھاری تھا۔ کنستر آ کر میرے سر پر گرا اور اُس کے ٹین نے میرے سر کی مضبوط جلد پھاڑ دی۔

مجھے علاج کروانے کے لیے دفتر کی طرف سے ایک ہفتے کی چھٹی مل گئی ہے۔ میرے خیال میں اتنا عرصہ اس بات پر غور کرنے کے لیے کافی ہے کہ اس سائنسی اُصول سے آئندہ کیوں کر محفوظ رہا جائے۔

رنگِ ادب پبلی کیشنز

مرزا حیدر عباس ...... سائنسی اُصول

میر صاحب

مرزا فرحت اللہ بیگ

میاں نالاں نے پڑھنا ختم کیا تھا کہ شمع میر صاحب کے سامنے پہنچ گئی۔ شمع کا رکھنا تھا کہ ہر شخص سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بعض نے انگلیوں سے آنکھیں مل ڈالیں، بعض نے کُرتے کے دامن سے رگڑیں۔ بعض اُٹھے اور پانی کا چھپکا منہ پر مار کر آ بیٹھے۔ کیسی نیند، کہاں کا سونا۔ میر صاحب کے نام نے سب کو چاق و چوبند کر دیا۔ مرزا فخرو اَب تک ایک پہلو پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے بھی پہلو بدلا۔ استادانِ فن کے چہروں پر مسکراہٹ آئی۔ نوجوانوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ میر صاحب بھی صف سے کچھ آگے نکل آئے۔

مرزا فخرو نے کہا، ”میر صاحب یہ ٹھیک نہیں ہے، آپ تو بیچ میں آ کر پڑھیے۔“ یہ کہہ کر چوب دار کو اشارہ کیا، اُس نے دو شمعیں اُٹھا کر وسط صحن میں رکھ دیں۔ میر صاحب بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر شامیانہ کے عین سامنے آ بیٹھے۔ بھلا دہلی میں کون ہے، جو میر صاحب کو نہیں جانتا۔ کون سا شاعر ہے، جو اِن کی وجہ سے چمک نہیں اُٹھا۔ کون سی محفل ہے، جہاں اُن کے قدم کی برکت سے رونق نہیں آ جاتی۔ ان کا نام تو شاید گنتی کے چند لوگ جانتے ہوں۔ ہم نے تو جب سنا۔ ان کا نام میر صاحب ہی سنا۔ کوئی ستر برس کی عمر ہے۔ بڑے سوکھے سے آدمی ہیں۔ غلافی آنکھیں، طوطے کی چونچ جیسی ناک، بڑا دہانہ، لمبی داڑھی، بٹیا سا سر، خشخشی بال، گوری رنگت، اُونچا قد۔ غرض اُن کے حلیے کو دہلی کے کسی بچہ سے بھی پوچھیے تو پورا پتا دے۔ نہایت صاف ستھرا لباس، ایک بَرکا، سفید پائجامہ، سفید کرتا، اُس پر سفید انگرکھا۔ سر پر باریک ململ کی ٹوپی۔ چہرے پر بلا کی متانت، مگر جب غصہ آتا تھا تو پھر کسی کے سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ چھوٹا ہو یا بڑا، کوئی ان سے بغیر مذاق کے بات نہیں کرتا اور یہ بھی تڑ سے وہ جواب دیتے تھے کہ منہ پھر جائے۔ اس سے ان کو غرض نہ تھی کہ جواب بھی ہو گیا یا نہیں۔ مشاعرے میں میاں تمکین سے لے کر بادشاہ تک ان کو چھیڑتے تھے۔ انہوں

نے نہ اُن کا بُرا مانا، نہ ان کو جواب دینے میں رکتے۔ غزل ہمیشہ فی البدیہہ پڑھتے تھے۔ لکھ کر لانے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کی۔ غزل میں مصرعوں کے توازن کی ضرورت ہی نہ تھی۔ صرف قافیہ اور ردیف سے کام تھا۔ جو کچھ کہنا ہوتا، نہایت اطمینان سے نثر میں بیان کرنا شروع کیا۔ بیچ میں دوسروں کے اعتراضوں کے جواب بھی دیتے۔ جب کہتے کہتے تھک گئے تو ردیف قافیہ لا کر شعر کو ختم کر دیا۔ انہوں نے شعر پڑھنا شروع کیا اور چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ یہ بھلا کب دبنے والی آسامی ہیں، چوکھیا لڑتے۔ جب زبان سے نہ دبا سکتے تو زور میں آ کھڑے ہو جاتے۔ یہ کھڑے ہوئے اور کسی نہ کسی نے ان کو بٹھا دیا۔ معترض کو ڈانٹا۔ میر صاحب کا دل بڑھایا اور پھر وہی اعتراضوں کا سلسلہ شروع ہوا اور تو اور مولوی مملوک العلی صاحب کو ان سے اُلجھنے میں مزہ آتا تھا۔ یہ مولوی صاحب کی وہ خبر لیتے تھے کہ اگر اُن کا کوئی شاگرد سن لیتا تو مدرسے مولوی صاحب کا سارا رعب داب رخصت ہو جاتا۔

میر صاحب نے شمع کے سامنے بیٹھتے ہی ساری محفل پر ایک نظر ڈالی اور کہا:

”حضرات میں آج یہاں میاں ہدہد کی شان میں ایک قصیدہ سناؤں گا۔ اپنے منہ میاں مٹھو یہ تعریف خود تو پہلے کر چکے ہیں۔ اب ذرا دل لگا کر اپنی ہجو بھی سن لیں۔“ میاں ہدہد سب سے پہلے بیٹھے تھے۔ اب جو سنا کہ ان کی ہجو ہو رہی ہے اور پھر وہ بھی میر صاحب کے منہ سے! سب نے کہا:

”ہاں میر صاحب، ضرور فرمایئے۔“ میاں ہدہد حکیم آغا جان عیش کے پٹھو تھے اور ان ہی کے بل بوتے پر پھدکتے تھے۔ اب جو حکیم صاحب نے سنا کہ میر صاحب ہدہد کی ہجو پر اتر آئے ہیں تو بہت پریشان ہوئے۔ ڈر تھا کہ کہیں مجھ کو بھی نہ لپیٹ لیں۔ دوسرا کوئی ہجو کرے تو جواب بھی دیا جائے، بھلا میر صاحب کی بحرِ طویل کا کون جواب دے سکتا ہے۔ اور تو کچھ نہ بن پڑا، میاں ہدہد کو گاؤ تکیہ کے پیچھے غائب کر دیا۔ اب جو میر صاحب ادھر نظر ڈالتے ہیں تو ہدہد ندارد ہیں۔ بہت گھبرائے۔ اِدھر دیکھا، اُدھر دیکھا، جب کسی طرف نظر نہ آئے تو کہا:

”ہجو ملتوی کر کے اب میں غزل پڑھتا ہوں۔“

سب نے کہا، ”نہیں میرے صاحب! یہ آپ نے ارادہ کیوں تبدیل کر دیا۔ پڑھیے میر صاحب! خدا کے لیے پڑھیے؟ سودا کے بعد ہجو تو اُردو زبان سے اُٹھ ہی گئی۔ اگر آپ بھی اس طرف توجہ نہ دیں گے تو غضب ہو جائے گا۔ زبان ادھوری رہ جائے گی۔“

''نا بھئی نا، میاں ہد ہد ہوتے تو ہم کو جو کچھ کہنا تھا، ان کے منہ پر کہتے۔ ان کے پیٹھ پیچھے ان کو کچھ کہنا ہجو، نہیں غیبت ہے اور میں غیبت کرنے والوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔'' جب میر صاحب کا یہ رنگ دیکھا تو حکیم آغا جان کے دَم میں دَم آیا۔ انہوں نے بھی اس ہجو اور غیبت کے فرق کے متعلق چند مناسب الفاظ کہے اور خدا حافظ کر کے یہ آئی بلا ٹلی۔

اب میر صاحب نے غزل شروع کی۔ کیا پڑھا خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ بس اتنا معلوم ہوا کہ تیر، پیر، کھیر، قافیہ، ہے، ردیف ہے۔ اس کے علاوہ میں تو کیا خود میر صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ انہوں نے کیا پڑھا اور مضمون کیا تھا۔ جہاں قافیہ اور ردیف آئی، لوگوں نے سمجھ لیا کہ شعر پورا ہو گیا اور تعریفیں شروع ہوئیں۔ کسی نے ایک آدھ اعتراض بھی جڑ دیا۔ اعتراض ہوا اور میر صاحب بگڑے۔ ان کے بگڑنے میں سب کو مزا آتا تھا۔ اعتراضوں اور میر صاحب کے جوابوں کا رنگ بھی دیکھ لیجیے۔ غزل میں میر صاحب نے جو ایک مصرع کو کھینچا۔ اتنا کھینچا کہ شیطان کی آنت ہو گیا۔ مولوی مملوک العلی صاحب نے کہا۔

''اجی میر صاحب! یہ مصرع بحرِ طویل میں جا پڑا۔'' میر صاحب نے کہا۔

''مولوی صاحب! کبھی بحرِ طویل دیکھی بھی ہے، یا یونہی سنی سنائی باتوں پر اعتراض ٹھونک دیا۔ پہلے مطول پڑھیے، مطول، جب معلوم ہو گا کہ بحرِ طویل کس کو کہتے ہیں۔'' مولوی صاحب بڑے چکرائے، کہنے لگے۔

''میر صاحب! بھلا مطول کو بحرِ طویل سے کیا واسطہ، ماروں گھٹنا، پھوٹے آنکھ۔ آپ کا جو جی چاہتا ہے کہہ جاتے ہیں۔'' میر صاحب کو اب کسی حمایتی کی تلاش ہوئی۔ مولانا صہبائی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے کہا:

''مولوی صاحب! مطول میں بحرِ طویل کی بحریں نہیں ہیں، تو اور کیا ہے۔ آپ بھی ہمارے میر صاحب کو اپنی علمیت کے دباؤ سے خاموش کر دینا چاہتے ہیں۔''

بس اتنی مدد ملنی تھی کہ میر صاحب شیر ہو گئے۔ کہنے لگے۔

''جی ہاں مولوی صاحب! آپ سمجھے ہوں گے کہ آپ کے سوا کسی نے مطول پڑھی پڑھائی ہی نہیں۔ اجی حضرت میں تو روزانہ اِس کے دو دَور کرتا ہوں۔ کل ہی اس کی بحر میں غزل لکھنے بیٹھا تھا۔ لکھتے لکھتے تھک گیا۔ ایک مصرع کوئی پونے دو سو صفحے پر لکھا۔ وہ تو کہو کہ بیاض کے صفحے ہی ختم

ہو گئے جو مصرع ختم ہوا ورنہ خدا معلوم اور کہاں تک جاتا۔''

مرزا نوشہ نے کہا، ''میر صاحب! آپ سچ فرماتے ہیں۔ ہمارے مولوی صاحب نے بحرِ طویل کہاں دیکھی۔ مجھ سے پوچھیے، میرے بھتیجے خواجہ امان کو جانتے ہو۔ اُس نے ایک کتاب بوستانِ خیال لکھی ہے۔ یہ بڑی موٹی موٹی بارہ جلدیں ہیں۔ بحرِ طویل کے بس بارہ مصرعوں میں ساری جلدیں ختم ہو گئیں۔ آپ کا مصرع بحرِ طویل نہیں رہا، رباعی کی بحر میں ہے۔''

میر صاحب نے بڑے زور سے 'ہیں' کی اور بگڑ کر کہا، ''واہ مرزا صاحب! چلتے چلتے آپ بھی بھٹک گئے۔ رباعی کی بحریں آپ کو معلوم بھی ہیں۔ بتلائیے تو سہی کون سی کتاب میں ہیں؟''

یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ مرزا غالب ذرا چپ ہوئے تو خود میر صاحب نے کہا:

''میں تو پہلے جانتا تھا کہ آپ نے زبردستی اعتراض کر دیا ہے۔ مرزا صاحب! اربعین پڑھیے، جب معلوم ہو گا کہ رباعی کی بحریں کون کون سی ہیں۔''

غرض اسی طرح کی خوش مذاقی میں کوئی گھنٹہ بھر گزر گیا۔ ہنستے ہنستے جو آنسو نکلے، انہوں نے نیند کے خمار سے آنکھیں صاف کر دیں اور ایسا معلوم ہونے لگا، گویا مشاعرہ کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے اور سب لوگ تازہ دم ابھی آ کر بیٹھے ہیں۔ جب لوگ اعتراض کرتے کرتے اور میر صاحب جواب دیتے دیتے تھک گئے تو ایک دفعہ ہی میر صاحب نے کہا:

''حضرات غزل ختم ہوئی۔'' سب نے کہا۔

''میر صاحب! ابھی تو مقطع آیا ہی نہیں، بے مقطع کی یہ کیسی غزل؟'' میر صاحب نے فرمایا۔

''مقطع کی اُس شاعر کو ضرورت ہے، جو بتانا چاہے کہ غزل میری ہے۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ ہماری غزل کی یہی پہچان ہے، جہاں شروع کی بس معلوم ہو گیا کہ یہ میر صاحب کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔'' یہ کہتے کہتے انہوں نے جزدان گردانا اور اپنی جگہ آ بیٹھے۔

* * *

قصہ ایران میں بیگم کے بچھڑ جانے کا!

مرزا عابد عباس

آج منگل کی شب جب ہم مسجدِ جمکران میں نماز کی ادائیگی کے لیے مع اہل و عیال پہنچے تو حیرت ہوئی کہ ہم ہی نماز پڑھنے نہیں آئے، وہاں تو پہلے سے لاکھوں فرزندانِ توحید نماز کی ادائیگی کے لیے بے چین ہیں اور مزید جوق در جوق قافلے کی شکل میں چلے آ رہے ہیں۔ ہم ایران کے تفریحی مقامات پر تو نہیں گئے، لیکن روضے اور مسجد کے وسیع صحنوں میں ایرانیوں کو تفریح گاہ سمجھ کر لیے ضرور دیکھا۔ لوگ اپنے ساتھ بیوی بچوں کے علاوہ کمبل، فرش، کولر، چائے کا تھرماس اور نوشابہ (فانٹا قسم کا مشروب) لے کر آتے ہیں، لیکن بے چاری شبانہ کو گھر پر چھوڑ آتے ہیں۔

بہرحال، آپ نے مسجد میں اکثر لوگوں کے جوتے اُڑتے سنا ہوگا، لیکن چند اشخاص ایسے بھی ہوتے ہیں، جو اُڑانے کے فن میں مہارت رکھتے ہیں۔ خیر، ہماری تو کیا کہیے، مسجد میں ہمارے جوتے اُڑے، امام بارگاہ میں ہمارے جوتے اُڑے، ایک مرتبہ مندر جانا ہوا تو وہاں بھی جوتے اُڑے، لیکن ایران ایسا ملک دیکھا، جہاں ہمارے جوتے نہیں اُڑ سکے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں جوتے رکھوا کر ٹوکن مل جاتا ہے۔ مسجدِ جمکران میں ہمارے جوتے تو محفوظ رہے، لیکن بیگم کھو گئیں (کیوں کہ ہم نے اُن کا ٹوکن نہیں لیا تھا)۔ ہم چوں کہ زیارت کی غرض سے ایران آئے تھے، اس لیے ہمیشہ سر جھکائے ہی چلتے رہے۔ دوست یہی کہتے رہے کہ بھائی، کیا آپ کششِ ثقل دوبارہ سے دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم دوستوں کو یہی جواب دیتے کہ جناب اگر اِس سلسلے میں آپ ہماری تقلید کریں گے تو آپ کا بھی بھلا ہوگا۔

لیکن آج بیگم کے گُم ہو جانے پر اِتنا پریشان ہوئے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہر جگہ خواتین کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے کہ شاید بیگم صاحبہ کہیں نظر آ جائیں۔ یقیناً وہ ایرانی خواتین ہمیں 'چچا تاڑو' ہی سمجھ رہی ہوں گی۔ افسوس ہوا کہ ایک ماہ تک ہم ناحق نظریں جھکائے چلتے رہے!

ہزاروں خانمیں ایسی کہ ہر خانم پہ دم نکلے

ہم گڑگڑا کر بارگاہِ خداوندی میں دعا گو تھے کہ اے پالنے والے! ہماری بیگم ہمیں مل جائیں۔ ویسے تو خیر تیرے در پر کیا کمی ہے، تو چاہے تو ہمیں ایک کی جگہ دس عطا کر سکتا ہے، لیکن ہماری بیگم میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انہیں اُردو بولنا آتی ہے۔ اب اگر عطائے خداوندی ہو بھی جائے تو زبان کی پریشانی اپنی جگہ قائم رہے گی، جب کہ ہم پر اللہ کا یہ خاص احسان ہے کہ ہم دنیا کی تمام زبانیں اتنی جانتے ہیں کہ سن تو لیتے ہیں بس ذرا بولنے اور سمجھنے سے قاصر ہیں! اب یہ سوچتے ہیں کہ:

سیکھنا ہے آج مجھ کو گونگے بہروں کی زباں
بین الاقوامی ہے بولی بے زبانی پھر کہاں

ہم بار بار خدا سے یہی دعا کر رہے تھے کہ اے مالک ہماری تو صرف ایک ہی بیوی ہے، اگر وہ بھی نہ ملی تو ہم کیا کریں گے۔ دوست مسکرائے اور کہنے لگے، ”جناب! کتنی ہونی چاہییں؟“ ہم نے اُن لوگوں سے کہا، ”ہم کتنی سخت پریشانی میں ہیں اور آپ لوگوں کو مذاق سوجھ رہا ہے۔“ پھر وہ فرمانے لگے، ”اچھا آپ دعا کریں، بیگم مل جائیں گی تو دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کریں گے۔“ ہم نے کہا، ”حضور! یہ منّت آپ ہی مانیں اور آپ ہی پوری کریں، لیکن خدا کا شکر ہم ہر حال میں ادا کرتے رہیں گے، سو بیگم کے گُم ہو جانے پر بھی خدا کا شکر وردِ زباں ہے۔“ وہ کہنے لگے، ”دو رکعت نمازِ شکرانہ پڑھ لیں گے تو آپ کا کیا بگڑ جائے گا۔“ ہم نے اُن سے کہا، ”جناب! ہم نے اس ایک ماہ میں اتنی نمازیں پڑھی ہیں، جتنی پوری زندگی میں نہیں پڑھی تھیں، اس لیے اب مزید نمازوں کی بالکل بھی گنجائش نہیں ہے۔“ وہ کہنے لگے، ”لاحول پڑھیں۔“ ہم نے کہا، ”ہاں، لاحول تو خیر آپ کے لیے پڑھ ہی لیں گے!“

تین گھنٹے تک لاکھوں کے ہجوم میں، بیگم کی تلاش میں جس پریشانی کی کیفیت سے ہم دوچار ہوئے، وہ ہمارا دل ہی جانتا ہے۔ گیٹ نمبر ایک سے گیٹ نمبر سات تک، بیگم کو ڈھونڈنے میں میلوں کا سفر کر کے ہم بہت تھک چکے تھے کہ اچانک بیگم ہمیں نظر آ گئیں! ہم تو تقریباً نا اُمید ہو چکے تھے کہ اب شاید بیگم نہ مل پائیں گی۔ اُن کے ملنے سے بظاہر تو خوشی ہوئی، لیکن دل میں کچھ تے ارمان جنم لے چکے تھے، جو اُن کے ملتے ہی ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے...

مرزا عابد عباس ...... قصہ ایران میں بیگم کے بچھڑ جانے کا

غالب کا خط... مرزا ظفر الحسن کے نام

مشفق خواجہ

شفیق بالتحقیق، نورِ نظر، لختِ جگر، مرزا ظفر الحسن المتخلص بہ ادارۂ یادگارِ غالب!

بہت دنوں سے تمہیں خط لکھنے کا ارادہ تھا، لیکن اس خیال سے ہمت نہ ہوئی کہ تم بے حد مصروف آدمی ہو، ہر وقت ادارۂ یادگارِ غالب اور غالب لائبریری کے کاموں میں اُلجھے رہتے ہو۔ پہلے مسائل پیدا کرتے ہو۔ پھر ان کا حل تلاش کرتے ہو، یعنی کبھی کتابیں جمع کرتے ہو اور کبھی ان کتابوں کے پڑھنے والوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہو۔ بھلا ایسی مصروفیت میں تمہیں بے چارے غالب کا خط پڑھنے کی فرصت کہاں مل سکتی ہے۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ تم اس مہینے میری برسی منا رہے ہو، تو اندازہ ہوا کہ فرصت سے ہو، لہٰذا میں نے سوچا کہ لگے ہاتھوں میں بھی اپنا دردِ دل بیان کر ڈالوں۔ دو چار محبت کی باتیں ہی ہو جائیں۔

بھئی مرزا، اس بے تکلفی کا بُرا نہ ماننا۔ محبت کی باتیں میں تم سے نہیں کروں گا تو اور کس سے کروں گا۔ میرے تمہارے درمیان کئی رشتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں، تم بھی مغل بچے ہو۔ میرے بزرگ ماوراء النہر سے آئے تھے۔ تمہارے بزرگ بھی وہیں کہیں کے تھے۔ مغلیہ خاندان کا آخری فرماں روا بہادر شاہ ظفر میرا ممدوح تھا، تم میرے ممدوح کے ہم نام ہی نہیں، بلکہ اسی کے دودمانِ عالی شان سے تعلق رکھتے ہو۔ اگر میرے نام پر ایک ادارہ قائم کر کے اور میری برسی منا کر مجھ سے بے تکلفی کا اظہار کر سکتے ہو تو پھر میں خط لکھنے اور محبت کی باتیں کرنے میں تکلف سے کیوں کام لوں؟

بہر حال کچھ بھی ہو، میں خط لکھ رہا ہوں اور اسے تم غالب لائبریری کے نوادر میں اضافہ سمجھ کر محفوظ کر لو۔ لیکن میری جان لائبریری کے دیگر نوادر کی طرح یہ خط یوں ہی پڑا نہ رہے، اسے پڑھ ضرور لینا اور اگر مصروفیت کی وجہ سے خود نہ پڑھ سکو تو عزیزی سحر انصاری سے کہنا کہ وہ پڑھ کر اس کا خلاصہ تمہیں سنا دیں۔ یقیناً عزیزِ موصوف اس کام میں مہارت رکھتے ہوں گے۔

سب سے پہلے تو میں بتا دوں کہ میں نے دلّی سے سفرِ آخرت اختیار کرنے کے بعد کسی کو خط نہیں لکھا۔ اس کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ یہاں زیادہ وقت ان پری زادوں سے انتقام لینے میں گزر جاتا ہے جو دلّی میں ہاتھ نہ لگے تھے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میں جن لوگوں کو خط لکھا کرتا تھا، وہ سب یکے بعد دیگرے یہیں پہنچ گئے اور وہ بھی انتقامی کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ اب خط لکھوں تو کسے لکھوں اور کیا لکھوں اور پھر خط اسے لکھا جاتا ہے جس سے کوئی تعلق خاطر ہو۔ میرا خیال تھا کہ دلّی میں ضرور کوئی نہ کوئی میرا جاننے والا اَب بھی موجود ہوگا، لیکن یہاں کے بعض نوواردوں نے بتایا ہے کہ اب اس شہر میں سوائے میرے مزار کے کچھ نہیں رہا، مجاور سب پاکستان آ چکے ہیں۔ انہیں نوواردوں میں سے ایک نے تمہارا نام پتا بتایا اور میرے نام پر تم نے جو کچھ بنایا بگاڑا ہے، اس کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ بے حد خوشی ہوئی کہ مرزا تفتہ کے بعد مجھے مرزا ظفر جیسا جاں نثار ملا۔ کل ہی مرزا تفتہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ تمہارا ذکر آیا تو کہنے لگے، ”مرزا ظفر بہت بڑا غالب پرست ہے۔ بس اس سے ایک ہی کوتاہی ہوئی کہ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد غالب پرستی کو اپنا اشعار بنایا، اگر کہیں وہ جوانی کے زمانے میں اس راہ پر چل نکلتا تو ایک غالب لائبریری کیا، غالب کے نام پر کئی شہر آباد کر دیتا۔“ معلوم نہیں مرزا تفتہ کی یہ بات کہاں تک درست ہے، البتہ تم ان لوگوں سے بدرجہ بہتر ہو جو ریٹائر ہونے کے بعد شاعری شروع کر دیتے ہیں اور دوسروں کے اشعار بھی اس طرح پڑھتے ہیں جیسے ان کی اپنی تخلیق ہو۔ یہ بڑی اچھی بات ہے تم شاعر نہیں ہو، تم میری زمینوں میں شعر کہہ کر میری دنیا اور اپنی عاقبت خراب کرتے۔

خیر، یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، اب تم میرا دردِ دل سنو کہ جس کے لیے میں نے ایک مدت کے بعد قلم ہاتھ میں لیا ہے۔ میرا المیہ یہ ہے کہ مجھ سے زندگی میں قرض خواہوں نے اور مرنے کے بعد عقیدت مندوں نے جو سلوک کیا ہے وہ ناگفتنی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ پچھلے جنم میں میرے قرض خواہ تھا، اب وہ میرے عقیدت منداور غالب پرست بن گئے ہیں اور حسبِ معمول سود در سود کا کاروبار کر رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ قرض خواہوں سے قرض میں نے اپنی مرضی سے لیا تھا اور عقیدت مند میری مرضی کا خیال کیے بغیر مجھ پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں اور کرتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ اپنے عقیدت مندوں سے مجھے جو شکایتیں ہیں، وہ سب کی سب بیان کرنا تو میرے بس کی بات نہیں، ہاں چند خاص خاص باتیں عرض کیے دیتا ہوں، اگر تم انہیں

مشفق خواجہ ...... غالب کا خط... مرزا ظفر الحسن کے نام

متعلقہ حضرات تک پہنچا دو تو بڑا کرم ہوگا۔

پہلی شکایت تو مجھے تمہیں سے ہے اور وہ یہ کہ تم نے میرے نام پر ایک محدود لائبریری قائم کی ہے۔ میاں اگر کچھ قائم کرنا ہی تھا تو کوئی ایسی چیز قائم کرتے جس سے لوگوں کو دلچسپی ہوتی۔ بھلا ایسی یادگار قائم کرنے کا کیا فائدہ، جہاں نہ کوئی آتا ہے نہ کوئی جاتا ہے۔ سنا ہے کہ تم لائبریری میں اکیلے سر جھکائے بیٹھے رہتے ہو اور لائبریری کی کتابیں تمہارا مطالعہ کرتی رہتی ہیں۔

آخر اِس محنت و مشقت کا فائدہ! مانا کہ تم اس صورتِ حال سے نہ تھکو گے۔ لیکن کتابوں کو تو ہر حال پریشانی ہوگی۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تم نے لائبریری کی عمارت بڑی خوب صورت بنوائی ہے اور اس میں کتابوں کی الماریاں قرینے سے سجائی ہیں اور جب کوئی وزیر یا اعلیٰ افسر قسم کا مہمان آتا ہے تو وہ کتابوں کی جلدوں اور تمہارے سلیقے کی بڑی تعریف کرتا ہے اور چلتے وقت یہ بھی پوچھ لیتا ہے کہ غالب کون تھے۔ یہ سب باتیں تو سمجھ میں آتی ہیں، لیکن ایک بات میری فہم سے بالا ہے اور وہ یہ کہ تم نے کتابوں کی الماری کو بڑے بڑے قفل لگا رکھے ہیں۔ اگر یہ قفل، قفل ابجد ہوتے تو میں سمجھتا کہ اس سے تمہارا مقصد یہ ہوگا کہ لوگ ان الماریوں کو کھولنے سے پہلے ابجد شناس ہو جائیں۔ لیکن یہ قفل تو عام قفل ہیں۔ آخر اِس سے تمہارا مقصد کیا ہے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر الماریاں مقفل نہ ہوں گی تو کتابیں اپنے پڑھنے والوں کی تلاش میں لائبریری سے باہر نکل جائیں گی؟ برخوردار یہ محض تمہاری ناتجربہ کاری ہے۔ جب کتابوں کو کوئی لائبریری میں نہیں پوچھتا تو لائبریری سے باہر کون ہاتھ لگائے گا؟ تمہارے شہر کے لوگ کتابوں کے لیے نامحرم ہیں، اور اگر انہیں چھو لیں گے تو اُن پر کفر کا فتویٰ لگ جائے گا۔ میری مانو تو لائبریری کا یہ جھنجھٹ ختم کرو، کتابیں جہاں جہاں سے اُٹھائی ہیں، وہیں پہنچا دو اور اِس کشادہ کمرے کو رائٹرز گلڈ قسم کی تفریح گاہ میں تبدیل کر دو۔ پھر دیکھنا یہ خرابہ کیسا آباد ہوتا ہے۔ میری اس بات کو بیکار نہ سمجھنا۔ میں بروقت متنبہ کر رہا ہوں۔ غالب لائبریری کی عمارت کا نچلا دھڑ جہاں ایک بینک ہے، نیشنلائز ہو چکا ہے، اگر خدانخواستہ اوپر کا دھڑ بھی نیشنلائز ہو گیا تو تم دوسری مرتبہ ریٹائر ہو جاؤ گے۔ میری جان! یہ بار بار کی ریٹائرمنٹ کوئی اچھی چیز نہیں، اگر میرا نہیں تو کم از کم اپنی صحت کا ہی خیال کرو۔

دوسری شکایت مجھے اپنے محققوں سے ہے۔ ایک طویل عرصے سے اہلِ تحقیق نے مجھے تختہ مشق بنا رکھا ہے۔ میری زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر بلا مبالغہ سیکڑوں مقالے نہ لکھے گئے

ہوں اور ہر مقالے میں ایک ہی جیسی باتیں نہ کہی گئی ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ تحقیق کے پاس کوئی اور موضوع نہیں رہا۔ مجھے اپنے کردہ گناہوں کی سزا دنیا میں مل گئی تھی اور نا کردہ گناہوں کی سزا اَب اہلِ تحقیق کے ہاتھ مل رہی ہے۔ محققین کا سب سے پسندیدہ کام یہ ہے کہ وہ میرے غیر مطبوعہ خطوط اور کلام تلاش کرتے رہتے ہیں۔ میرے تمام مطبوعہ خطوط اور کلام کو غیر مطبوعہ بنا کر بار بار شائع کیا جاتا ہے اور ہر مرتبہ ان نوادر کی دریافت کی طویل اور سنسنی خیز داستان بیان کی جاتی ہے۔ کسی کو یہ چیزیں اپنے دادا کی بیاض سے ملتی ہیں اور کسی کو میرے دادا کی بیاض سے، میرے دادا میری پیدائش سے پہلے مر گئے تھے، لیکن محققین کا کمال یہ ہے کہ وہ نہ صرف میرے دادا مرحوم کی بیاض تلاش کر لیتے ہیں، بلکہ اس میں انہیں میرے غیر مطبوعہ خطوط اور اشعار بھی نظر آ جاتے ہیں، یقیناً یہ محنت قابلِ داد ہے۔ لیکن اس تحقیق میں یہ ستم بھی ہوا ہے کہ بعض ایسی چیزیں میرے نام سے چھاپ دی گئی ہیں کہ اگر وہ مرزا ظفر الحسن، تمہارے نام سے چھاپ دی جاتیں تو پہلے تو تم خوش ہوتے، لیکن بعد میں محققین پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر دیتے اور اِس کے نتیجے میں محققین کے ہاتھوں تمہاری حیثیت عرفی کا ازالہ ہو ہی جاتا۔

محققین کا ایک گروہ میرے حالاتِ زندگی پر جان کھپاتا رہتا ہے۔ ان لوگوں نے میرے سالِ پیدائش کو بھی متنازعہ فیہ بنا دیا ہے۔ کوئی میرے سالِ پیدائش کا تعین میرے والدِ مرحوم کے سالِ پیدائش سے چار سال پہلے کرتا ہے اور کوئی مرحوم کی وفات کے چار سال بعد۔ خدا شکر ہے کہ اختلاف صرف سال پر نہیں، ورنہ میں یا تم ان محققوں کا کیا بگاڑ لیتے۔ اہلِ تحقیق کی واماندگیوں اور ابوالعجبیوں کی داستان سنتا ہوں تو سر پیٹ لیتا ہوں۔ عجیب و غریب عنوانات پر یہ لوگ مضامین لکھتے ہیں۔ ایک صاحب نے مضمون لکھا۔ 'غالب اور ہمزۂ وصل' اور اُس میں ثابت کیا کہ غالب کو محبوب کا وصل نصیب نہ ہوا، لیکن ہمزۂ وصل کے سلسلے میں بڑا خوش نصیب تھا۔ اس کے کلام میں ہمزۂ وصل کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ دوسرے صاحب نے حروفِ منقوطہ اور غیر منقوطہ پر تحقیق کر ڈالی اور ثابت کر دکھایا کہ غالب کے کلام میں نقطے دار حروف بے نقطے دار حروف سے زیادہ ہیں۔

مرزا ظفر الحسن، میری دعا ہے کہ خدا تمہیں تحقیق کے مرض سے بچائے رکھے۔ دشمنوں کے منہ میں خاک، اگر کبھی تمہیں بھی تحقیق سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور تم نے بھی 'غالب اور چار مینار' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی تو میں تمہارا کیا بگاڑ لوں گا۔ ہاں تم خود ضرور

مشفق خواجہ ...... غالب کا خط... مرزا ظفر الحسن کے نام

بزرجمہر دو عالم

بگڑ جاؤ گے اور اس کی بڑی حد تک ذمہ داری بھائی مسلم ضیائی پر ہوگی، کیوں کہ تمہارے لیے تحقیقی مواد وہی فراہم کریں گے۔

پچھلے دنوں یہاں ایک محقق سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے بڑی عقیدت کا اظہار کیا اور بتایا کہ انہوں نے مجھ پر ایک مقالہ لکھ کر کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔

میں نے مقالے کا عنوان پوچھا تو فرمایا، ”غالب اور ٹنڈو آدم“

میں نے کہا، ”یہ ٹنڈو آدم کیا ہے؟“ کہنے لگے، ”ایک شہر کا نام ہے۔“

میں نے عرض کیا، ”اس شہر سے میرا کیا تعلق ہے۔“ اس پر انہوں نے فرمایا، ”جی ہاں مجھے معلوم ہے۔ میں نے اپنے مقالے میں یہی تو ثابت کیا ہے کہ آپ کا ٹنڈو آدم سے کوئی تعلق نہیں رہا۔“

اس بات پر مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے کہا، ”حضرت اگر کچھ ثابت کرنا تھا تو یہ ثابت کیا ہوتا کہ میرا اس شہر سے بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔“

کہنے لگے، ”پہلے میرا یہی ارادہ تھا، لیکن افسوس کہ مواد نہیں ملا۔“

دیکھا مرزا ظفر الحسن، یہ ہیں تمہارے محقق، جو مواد کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے، خواہ وہ مواد، مواد فاسد ہی کیوں نہ ہو۔ اب تمہیں انصاف کرو مرزا کہ مجھ پر تحقیق کرنا، مجھ پر قاتلانہ حملے کرنے کے مترادف ہے کہ نہیں۔ ممکن ہے یہ محقق رائٹرز گلڈ کے انعامات کے لیے اس قسم کی تحقیق کرتے ہوں، لہٰذا تم انہیں یہ سمجھا دو کہ اب وہ یہ کام چھوڑ دیں، کیوں کہ وہ زمانہ جلد آنے والا ہے جب گلڈ کے انعامات صرف اُنہیں ادیبوں کو ملا کریں گے جو کچھ نہیں لکھیں گے۔

محققوں کی طرح نقاد بھی میرے حال پر کچھ کم مہربان نہیں ہیں۔ انہوں نے میرے کلام پر تنقید لکھنے کا آسان طریقہ یہ دریافت کیا ہے کہ میرے شعروں کے مضامین کو اپنی فہم کے مطابق نثر میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک نقاد نے کچھ اس قسم کے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔

”غالب ایک نقش فریادی تھا اور عام طور پر کاغذی پیرہن میں ملبوس رہتا تھا اور اسی وجہ سے فکر و تجسس کا عادی تھا اور ہر وقت یہی سوچتا رہتا تھا کہ سبزہ گل کہاں سے آئے ہیں۔ اسی فکری تجسس کی بنا پر اس میں فکری تسلسل پایا جاتا ہے، جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے بہت سی مسلسل غزلیں ہی نہیں لکھیں، بلکہ اُس کا پورا دیوان مسلسل ہے، یعنی ردیف وار مرتب ہوا ہے۔“

دیکھا مرزا ظفر الحسن تم نے یہ اندازِ تنقید!

تنقید کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے کوئی موضوع تلاش کیا۔ مثلاً 'غالب اور آئینہ' پھر میرے کلام سے وہ تمام اشعار نکال لیے جن میں مَیں نے آئینے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ان شعروں کے درمیان کہیں کہیں ایک آدھ سطر اپنی طرف سے بھی لکھ دی۔ چلیے تنقیدی مضمون تیار ہو گیا۔ اگر کسی نقاد کے پاس فرصت زیادہ ہے تو وہ اس مضمون کو تمہید میں لفظِ 'آئینہ' کے لغوی معنوں اور آئینہ گری کی صفت پر بھی بحث کر ڈالتا ہے اور مضمون کا عنوان بدل کر 'غالب اور آئینہ سازی کا فن' رکھ دیتا ہے۔

نقادوں ہی کی ایک قسم شارحین کہلاتی ہے۔ ان لوگوں کی گزر اوقات میرے کلام کی شرح پر ہے۔ ہر شارح دوسرے شارح سے اختلاف کرتا ہے اور میرے اشعار کے وہ معانی بیان کرتا ہے، جس سے میرا دُور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایک شارح سے یہاں ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے کہا، ''حضرت آپ نے میرے اشعار کی جو شرح کی ہے، مجھے اس اتفاق نہیں ہے۔''

انہوں نے جواب دیا، ''آپ نے بھی میری شرح پر جو شعر کہے ہیں، مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے۔''

میں نے کہا، ''میں نے شعر پہلے کہے تھے، شرح آپ نے بعد میں لکھی۔ بھلا میں آپ کی شرح کو کس طرح منظوم کر سکتا تھا۔''

کہنے لگے، ''یہ غلطی آپ کی ہے میری نہیں۔''

واقعی مرزا ظفر الحسن بنیادی غلطی میری ہے۔ اگر میں شعر نہ کہتا تو ان شارحین کو اپنی عمریں ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

اب آخری شکایت بھی سن لو۔ یہ شکایت مجھے ان شاعروں سے ہے، جو میری زمینوں میں شعر کہتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ میں نے ان زمینوں کو اپنے نام رجسٹری نہیں کرایا تھا۔ لیکن یہ بھی کوئی بات ہے کہ آپ ذرا سے لفظی تغیر سے میرے اشعار کو اپنے نامہ اعمال کی سیاہی بنا لیں گے۔ میں نے بھی اساتذہ کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں، ان کے چراغ سے چراغ جلایا ہے، لیکن ان کے چراغ کو اُٹھا کر اپنے گھر نہیں لے آیا ہوں۔

مرزا صاحب: میں نے تم سے بہت باتیں کر لیں۔ اب کچھ تم اپنا حال سناؤ۔ سنا ہے کہ تمہارے شہر میں مہنگائی بہت ہے۔ مجھے یہ واقعہ معلوم ہوا ہے کہ پچھلے دنوں لڑکوں نے شرارت میں تمہاری لائبریری کی کھڑکیوں کے دو شیشے توڑ دیے تھے، تو تم نے اخباروں میں اعلان کیا تھا کہ دس

رنگِ ادب دہلی نمبر

ہزار روپے کا نقصان ہو گیا۔ اللہ اللہ دو شیشے دو ہزار روپے کے۔ میرے زمانے میں تو بادۂ گلگلوں کے ہزار شیشے بھی اتنے مہنگے نہ تھے۔

خدا جانے اس مہنگائی کے زمانے میں تم اس لائبریری کو کس طرح چلاتے ہو گے۔ تمہارے کاموں کے بارے میں جب کچھ سنتا ہوں تو دل سے دعا نکلتی ہے۔

اگر تم میرے زمانے میں دلّی میں ہوتے تو میں بہت آرام سے زندگی بسر کرتا۔ تم کہتے، ”چچا تمہارے نام پر ایک لائبریری بنوا رہا ہوں۔“

میں کہتا، ”بیٹا اس کے دو شیشے نہیں لگوانا۔“

”تم پوچھتے، ”وہ کیوں۔“

میں کہتا، ”ان کی قیمت کی رقم میرے حوالے کر دینا تاکہ میں آئندہ دس برس تک فکرِ روزگار سے محفوظ رہوں۔“

اور ہاں بھئی مرزا ظفر الحسن یہ کیا معاملہ ہے کہ تم عقیدت مند تو میرے ہو اور سوانح عمری لکھ رہے ہو فیض احمد فیض کی۔ یہاں بعض لوگوں نے اس سلسلے میں طرح طرح کی باتیں بنائی ہیں۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مرزا ظفر الحسن غالب سے مخلص نہیں، اگر مخلص ہوتا تو فیض کی نہیں، غالب کی سوانح عمری لکھتا۔ میں نے یہ کہہ کر اُس شخص کا منہ بند کر دیا کہ مرزا ظفر الحسن کے مخلص ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہی یہ ہے کہ اس نے آج تک میرے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

مرزا معاف کرنا، معلوم نہیں میں جنوں میں کیا کچھ بک گیا ہوں اور میرا قلم بھی تمہاری زبان کی طرح کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے۔ میری کسی بات کا بُرا نہ ماننا۔ میں ہر اعتبار سے قابلِ معافی ہوں۔ آخر یہ بھی تو دیکھو کہ مجھے سٹھیائے ہوئے ایک صدی سے زیادہ گزر چکا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔

عقیدت مندوں سے نجات کا طالب

غالب

* * *

ٹوکیو میں ابنِ اِنشا کی یاد

مجتبیٰ حسین

ناظرین کرام! ہم اس وقت دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے مہنگے شہر میں ہیں۔ مہنگائی کا یہ عالم ہے کہ اس شہر میں ہمیں اپنے سوا کوئی اور سستی چیز نظر نہیں آتی۔ ٹوکیو کے نریتا ایئرپورٹ پر جب ہم اُترے تھے تو ہماری آنکھیں کھل گئی تھیں۔ جب ہم ایشیائی ثقافتی مرکز کے بک ڈویژن کی سربراہ مسز آسانو کے ساتھ ٹوکیو گرین ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے تو ہماری آنکھیں مزید کھلتی چلی گئیں۔ صاف شفاف اور کشادہ سڑکیں روشنی میں اس طرح نہارہی تھیں کہ اگر سوئی بھی سڑک پر گری ہو تو صاف نظر آ جائے۔ سجے سجائے بازاروں پر حیرت کی نظر ڈالتے ہوئے ہم ٹوکیو گرین ہوٹل پہنچے۔ یہ ہوٹل مرکزی ٹوکیو میں واقع ہے۔ مسز آسانو نے ہمیں یہ خوشخبری بھی سنائی کہ شہنشاہ جاپان کا محل بھی پڑوس ہی میں واقع ہے۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ زندگی بھر ہمیں ایک اچھے پڑوسی کی تلاش رہی ہے، جو کبھی میسر نہ آسکا۔ شہنشاہ جاپان کے پڑوسی بن کر کچھ دن آرام سے گزار لیں گے۔ ٹوکیو گرین ہوٹل کئی منزلہ عمارت ہے۔ ہمیں اس کی چوتھی منزل میں ایک کمرہ ملا۔ نام چوں کہ گرین ہوٹل ہے، اس لیے بڑا سرسبز شاداب ہوٹل ہے۔ یہاں کی ہر چیز ہری ہے۔ کچھ دن بعد ہمیں اپنا رنگ بھی طوطے کی طرح ہرا نظر آنے لگا تھا۔ ٹوکیو کے بارے میں ہی کیا، بلکہ سارے جاپان کے بارے میں یہ عرض کر دیں کہ جاپان کے دس فی صد علاقے پر پہاڑ ہی پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں۔ بیس فی صد علاقہ میدانی ہے، جس پر سارے جاپانی مل جل کر رہتے ہیں۔ وہ تو اچھا ہے کہ جاپانیوں کا قد چھوٹا ہوتا ہے، ورنہ ان سب کا مل جل کر رہنا دشوار ہو جاتا۔ ادب میں ہمارا قد جو کچھ بھی ہے، اس کے بارے میں آپ بخوبی جانتے ہیں، لیکن ہمارا جسمانی قد پھر بھی اتنا بلند نہیں ہے، بس پانچ فٹ گیارہ انچ کا قد ہے۔ پھر بھی ٹوکیو کی سڑکوں پر ہم نکلتے ہیں تو اپنی قد آور شخصیت کے باعث لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ کچھ جاپانی دوستوں کا کہنا ہے کہ جب سے ہم ٹوکیو میں

آئے ہیں، ٹوکیو بھرا پرا سا نظر آنے لگا ہے، حالاں کہ آبادی اور علاقہ کے لحاظ سے یہ دنیا کا سب ے بڑا شہر ہے۔ ٹوکیو کی آبادی ایک کروڑ سے زیادہ ہے اور ہر دسواں جاپانی ٹوکیو میں رہتا ہے۔ رہنے کی جگہ کی قلت کے باعث جاپانی اپنی زمین کے ایک ایک انچ کا فائدہ اُٹھاتا ہے، جاپانیوں کی ہر چیز چھوٹی ہوتی ہے، سوائے کردار کے۔

ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے ہیں، خود اس کا حال سن لیجیے کہ جب ہم اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ اس میں ہر سہولت حاصل ہے۔ ٹیلی ویژن ہے، ٹیلی فون ہے، کمرے سے ملحق باتھ روم بھی ہے، باتھ روم میں نہانے کا ٹب بھی موجود ہے۔ پھر پورا کمرہ ایئر کنڈیشنڈ بھی ہے، اس میں لکھنے پڑھنے کے لیے ایک چھوٹی سی میز بھی ہے۔ حد تو یہ کہ ایک کرسی بھی موجود ہے۔ بس تکلیف یہ ہے کہ جب بھی ہم صبح اُٹھ کر اپنے بستر میں بھرپور انگڑائی لیتے ہیں (جس کی عادت ہمیں برسوں سے ہے) تو ہماری انگڑائی کبھی ٹیلی ویژن سے ٹکرا جاتی ہے اور کبھی اس انگڑائی میں ٹیلی فون اٹک جاتا ہے۔ دو تین دن تک اپنی انگڑائی کے ذریعے ٹیلی فون کے ریسیور کو گرانے کے بعد ہم نے اب یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ آنکھ کھلتے ہی لپک کر ہوٹل کے کاری ڈور میں چلے جاتے ہیں اور دو چار بھرپور انگڑائیاں لے کر پھر اپنے کمرے میں واپس آجاتے ہیں۔ صرف پچیس دنوں تک ٹوکیو میں رہنے کی خاطر ہم اپنی برسوں کی انگڑائی سے دست بردار ہونے سے تو رہے۔ اس ہوٹل کی تنگ دامانی کا حال کبھی ہم بعد میں بیان کریں گے، کیوں کہ اس حال کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرنے کے بعد ایشیائی ثقافتی مرکز کے ڈائریکٹر جنرل مسٹر یوجی ایٹو نے ہمیں مزاح نگار تسلیم کر لیا تھا۔ آپ نے ابھی تک تسلیم نہیں کیا ہے تو ہمیں اس کی کوئی فکر نہیں ہے، ٹوکیو والوں نے تو اُردو جانے بغیر ہی ہمیں مزاح نگار مان لیا ہے، جاپانی بڑے مردم شناس ہوتے ہیں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کسی معمولی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ روزانہ پانچ ہزار 'ین' (جاپانی سکہ) ادا کرتے ہیں اور وہ بھی صرف رہنے کا۔ یہ کرایہ بھی یونیسکو کے مہمان کی حیثیت سے ہم سے رعایت کے ساتھ وصول کیا جاتا ہے۔ کھانا ہم ہوٹل میں کم ہی کھاتے ہیں، کیوں کہ ہمیں اپنی بھوک اتنی پیاری نہیں جتنی عزت ہے۔ اور باتیں بعد میں ہوں گی، پہلے مسز آسانو کا حال سنیے، جو ایشیائی ثقافتی مرکز کے بک ڈویژن کی چیف ہیں اور جو ہمارے خیر مقدم کے لیے بہ نفسِ نفیس تشریف لے آئی تھیں۔ مسز آسانو سچ مچ جہاں دیدہ خاتون ہیں، ساری دنیا گھوم چکی ہیں۔ ہندوستان میں کئی بار تشریف لا چکی

ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کے بارے میں ہم سے زیادہ جانتی ہیں۔ انہوں نے ہی ہمیں ہندوستان کے بارے میں یہ بتایا کہ ہندوستان میں چیزیں بہت سستی ہیں (ہمیں یہ بات جاپان جانے تک معلوم نہیں تھی۔ آپ میں سے بہتوں کو اَب بھی معلوم نہیں ہوگی)۔ مسز آسانو نے پہلے پہل ہمیں بتایا کہ ہندوستانی بڑے مہذب، شائستہ اور ایمان دار ہوتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مسز آسانو سے ملاقات نہ ہوتی تو ہمیں اپنے وطنِ عزیز کے بارے میں اتنی اہم معلومات کہاں سے حاصل ہوتیں! ہم تیرہ گھنٹوں کے ہوائی سفر کے بعد ٹوکیو پہنچے تھے اور یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ مسز آسانو ہمارے استقبال کے لیے آئی تھیں۔ ہوٹل میں ہمارا سامان رکھوانے کے بعد بولیں،

”آج رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں گے۔“

اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے۔ ہم نے کہا، ”مسز آسانو، مانا کہ ٹوکیو میں اس وقت رات کے آٹھ بجے ہیں، مگر وطنِ عزیز میں اس وقت شام کے پانچ بجے ہوں گے۔ یہ وقت تو ہمارے چائے پینے کا ہے۔ یوں بھی طیارے میں ہم خوب ڈٹ کر کھا چکے ہیں۔ اب کھانے کی حاجت نہیں ہے۔“

بولیں، ”ٹوکیو میں آپ کی پہلی شام میرے ساتھ گزرے گی، چاہے آپ چائے پئیں یا ڈنر کھائیں۔“

ہم نے مذاق میں کہا، ”مسز آسانو، کیا آپ کو پتا ہے کہ اُردو میں آپ کے نام کے کیا معنی ہوتے ہیں؟“

ہنس کر بولیں، ”مجھے پتا ہے کہ میرا نام آسانو ہے اور آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں ہر مشکل آسان کر دیتی ہوں۔“

ہم نے حیرت سے کہا، ”سچ مچ بتائیے۔ آپ کو اپنے نام کے یہ اُردو معنی کس نے بتائے تھے؟“

اپنے چہرے پر اچانک سنجیدگی طاری کر کے بولیں، ”آپ ہی کی زبان کے ایک پاکستانی ادیب ہوا کرتے تھے، جو ہمارے ایشیائی ثقافتی مرکز کے سیمیناروں میں شرکت کے لیے آیا کرتے تھے۔ کئی بار وہ ٹوکیو آئے، بڑے زندہ دل آدمی تھے، نام تھا اُن کا ابن انشا، آپ نے انہیں ضرور پڑھا ہوگا۔“

ہم نے کہا، ”مسز آسانو! ابن انشا ہمارے محبوب اور پسندیدہ ادیب ہیں۔ ملاقات ان سے

بزمِ جہاں دو عالم

کبھی نہیں ہوئی۔ ہمارے بڑے بھائی ابراہیم جلیس کے جگری دوست تھے۔ اتنے جگری دوست تھے کہ دونوں تین مہینوں کے وقفہ سے آگے پیچھے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔"

بولیں، "بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ انہوں نے صرف مذاق میں اور مصلحتاً میرے نام کے یہ اُردو معنی تراش رکھے تھے۔ اب آپ نے بھی میرے نام کے یہی معنی بتائے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابن انشا نے میرے نام کا کوئی مزاحیہ ترجمہ نہیں کیا تھا۔ پھر آپ کا بھی کیا بھروسا، آپ بھی تو مزاح نگار ہیں۔"

ہم نے حیرت سے کہا، "مسز آسانو، آپ کو کس نے بتایا کہ ہم مزاح نگار ہیں۔"

بولیں، "آپ ہی نے تو اپنے "Bio Data" میں سب کچھ لکھا ہے۔ میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں کہ آپ سور کا گوشت نہیں کھاتے۔ آپ کی تاریخ پیدائش بھی مجھے زبانی یاد ہے۔"

ہم مسز آسانو کی عام معلومات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً اُن کے ساتھ ڈنر کھانے کے لیے چلے گئے۔

وہ بولیں، "میں آج رات آپ کو جاپانی ریستوران میں نہیں، ایک چینی ریستوران میں لے جاؤں گی۔ ابھی تو آپ آئے ہیں، آتے ہی آپ کے جوتے کھلوانا نہیں چاہتی۔ جاپانی ریستورانوں میں نیچے بیٹھنے کا رواج ہوتا ہے۔ (جن لوگوں نے حیدر آباد کے چوکی ڈنروں میں حصہ لیا ہے، وہ اپنے تئیں یہ سمجھیں کہ وہ جاپانی ریستوران میں کھانا کھا چکے ہیں، مینو البتہ مختلف ہوتا ہے) ہم ٹوکیو کے جس علاقے میں ٹھہرے ہیں، اسے سوئیدہ باشی کہتے ہیں۔ باشی جاپانی میں پل کو کہتے ہیں اور سارے جاپان میں آپ کو کئی باشی مل جائیں گے۔"

ایک علاقے کا نام تو شاباشی سے ملتا جلتا ہے۔ ٹوکیو کا پہلا کھانا ہم نے ایک چینی ریستوران میں کھایا۔

مسز آسانو نے پہلے تو ہمارے لیے سنگترے کا رس منگوایا۔ دہلی میں قیام کے بعد سے ہماری عادت یہ ہو گئی ہے کہ جب بھی سنگترے کا رس ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو اُس میں کالی مرچ اور نمک ضرور ملا لیتے ہیں۔ جیسے ہی ہم نے سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملانا شروع کیا آسانو نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا:

رنگِ ادب پبلی کیشنز

مجتبیٰ حسین ...... ٹوکیو میں ابنِ انشا کی یاد

انور احمد علوی

"مسٹر حسین! عجیب اتفاق ہے کہ ابنِ انشا بھی سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملایا کرتے تھے۔ کیا اُردو میں مزاح نگاری کرنے کے لیے سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملانا ضروری ہوتا ہے؟"

ہم نے کہا، "مسز آسانو! کہاں ابنِ انشا اور کہاں ہم! ہم میں اور اُن میں ایک قدرِ مشترک یہی ہے کہ ان کی طرح ہم بھی سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملایا کرتے ہیں۔ اس کے سوائے ہمیں کچھ نہیں آتا۔ ہم صرف رس میں نمک ملاتے ہیں۔ ابنِ انشا اپنی تحریروں میں جتنا نمک مرچ ملاتے تھے، وہ گُر ہمیں نہیں آتا۔"

مسز آسانو پھر یادوں میں کھو گئیں اور بولیں، "شاید آپ کو پتا نہیں، ابنِ انشا پہلے پہل ٹوکیو میں ہی بیمار ہوئے تھے۔ یہیں ان کا میڈیکل چیک اَپ ہوا تھا۔ پھر وہ یہاں سے گئے تو ایسے گئے کہ کبھی نہیں آئے۔"

مسز آسانو کی اس بات سے ہم اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ ٹوکیو میں جب بھی ہمارے سامنے سنگترے کا رَس آیا تو اُس میں کبھی نمک نہیں ملایا!

مسز آسانو نے اس رات دنیا جہان کی باتیں کیں۔ کئی ہندوستانی دوستوں کا ذکر کیا۔ کھانے کا بل آیا تو ہم نے دیکھا کہ مسز آسانو نے بڑی آسانی کے ساتھ ہنستے کھیلتے چار ہزار ین کی رقم ادا کردی اور ہمیں آٹے دال کے بھاؤ سے آگاہ کر دیا۔

ہم ڈنر کھا کر ہوٹل پر واپس ہوئے تو دس بج رہے تھے۔ دوسرے دن پبلشنگ کا کورس اور سیمینار شروع ہونے والا تھا۔ مسز آسانو نے وعدہ کیا کہ وہ سیمینار میں ہمیں لے جانے کے لیے صبح آجائیں گی۔ اس وقت ہماری ملاقات تھائی لینڈ کی نمائندہ مس پرینا سے ہوئی، جو اسی شام تھائی لینڈ سے پہنچی تھیں۔ ہم دس بجے اپنے کمرے میں پہنچے تو افسوس ہوا کہ اے کاش! ہماری اہلیہ محترمہ آج یہاں موجود ہوتیں، وہ دس بجے ہمیں اپنے کمرے میں دیکھ کر کتنا خوش ہوتیں۔ اس کا اندازہ کچھ ہم ہی لگا سکتے ہیں۔

کچھ دیر ٹیلی ویژن سے دل بہلاتے رہے۔ تاہم آدھے گھنٹے سے زیادہ جی نہیں بہلا سکے، کیوں کے سارے پروگرام جاپانی میں ہو رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ جب ساری زندگی رات دیر گئے گھر لوٹنے میں گزار دی ہے تو ٹوکیو میں اس شریفانہ وضع داری سے کیوں انحراف کیا جائے۔

رنگِ ادب پبلی کیشنز

اس خیال کے آتے ہی ہم اپنے کمرے سے باہر نکلے تو دیکھا کہ مس پرینا اپنے کمرے کے سامنے کھڑی ہیں۔ پوچھا، ’’خیریت تو ہے؟‘‘

بولیں، ’’تھائی لینڈ میں اس وقت آٹھ بجے ہوں گے اور مجھے اتنی جلدی سونے کی عادت نہیں ہے، بس بور ہوئی جا رہی ہوں۔‘‘

ہم نے کہا، ’’آپ کے ہاں تو آٹھ بجے ہوں گے۔ ہمارے ہاں تو ابھی سات ہی بج رہے ہوں گے۔ یوں بھی ہم شب بیدار قسم کے آدمی ہیں، لہٰذا ٹوکیو کی سڑکیں ناپنے باہر جا رہے ہیں۔‘‘

بولیں، ’’آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔‘‘

ہم دونوں ٹوکیو گرین ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ طے کیا کہ سڑکوں کی نشانیاں ذہن میں محفوظ کرکے چلتے ہیں، تاکہ واپسی میں آسانی ہو۔ ہوٹل کے کاؤنٹر سے ٹوکیو گرین ہوٹل کا کارڈ بھی اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پہلے ایک ٹیلی فون بوتھ کی نشانی ذہن میں محفوظ رکھی کہ اس کے برابر والی گلی میں مڑنا ہے۔ بیس قدم کے بعد ایک اور بوتھ ملا جاپان میں ہر سڑک پر قدم قدم پر آپ کو ٹیلی فون بوتھ ملیں گے۔ ٹوکیو اس اعتبار سے خالص ایشیائی شہر نظر آیا کہ یہ ساری رات جاگتا ہے۔ تقریباً ساری رات ہوٹلیں کھلی رہتی ہیں (حیدرآباد والے پتھر گٹی کو اپنے ذہن میں رکھیں) سڑکوں پر ٹریفک برابر جاری رہتی ہے۔ ہم بڑی دیر تک ٹوکیو کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ دو گھنٹوں بعد واپس ہوئے تو ہم سچ مچ تھک چکے تھے۔ جب ہم اپنے کمرے کی طرف جانے لگے تو مس پرینا نے انگریزی آداب کے مطابق ہم سے کہا، ’’آج رات کوئی اچھا سا خواب دیکھیے۔‘‘

ہم نے کہا، ’’مس پرینا کیا کریں، کمرہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں کسی خواب کے داخل ہونے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔‘‘

مس پرینا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ بعد میں انہوں نے ہمارے اس جملے کو سیمینار کے شرکاء میں اس قدر مقبول کیا کہ بالآخر اس کی اطلاع ہوٹل کی مینجمنٹ تک پہنچ گئی اور مینجمنٹ کے ایک فرد نے ہم سے ازراہِ مذاق یہاں تک کہا کہ اگر آپ کو خواب دیکھنے کے لیے بڑے کمرے کی ضرورت ہے تو وہ آپ کو مل جائے گا، دس ہزار ین کرایہ دینا ہوگا۔

* *

ہر فن مولا دیہاتی خواتین

محمد ارشاد اللہ

دیہاتی خواتین زندگی کے تمام شعبوں میں اتنی ماہر ہیں کہ ان کے لیے 'ہر فن مولا' یا 'اپنی ذات میں انجمن ہونا' کے محاورے ماند پڑ رہے ہیں۔ میری ناقص معلومات میں ایسا کوئی محاورہ موجود نہیں ہے، جو اِن کی مہارت، کرامات اور پھرتی کا بیک وقت احاطہ کرے۔ مجھے اُردو زبان میں اختراعات کرنے کی اجازت نہیں، ورنہ میں ایک نیا محاورہ ایجاد کر لیتا۔ بہر حال، دیہاتی خواتین کی آل راؤنڈر کارکردگی کے لیے عارضی طور پر ہر فن مولا کے محاورے سے کام چلایا جا رہا ہے، لیکن:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں   محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

دیہاتی خواتین جانور پالنے میں بے مثال ہیں۔ ان کا مقابلہ یا موازنہ ہمارے ماہرین حیوانات سے کروایا جائے تو کوئی شک نہیں کہ مہارت اور معلومات کے اعتبار سے ہمارے ماہرین ناک آؤٹ ہوں اور اُن کی ناک کٹ جائے! دیہات میں وہ گھر فالتو سمجھا جاتا ہے، جہاں پالتو جانور نہ ہوں۔ ان جانوروں کی دیکھ بھال خواتین کے سپرد ہوتی ہے اور وہ یہ ذمہ داری بے مثال لگن کے ساتھ انجام دیتی ہیں۔ جانوروں کو مقررہ اوقات پر چارہ کھلانا، انہیں پانی پلانا، انہیں باندھنا، انہیں کھولنا اور بوقتِ ضرورت ان کی گندگی صاف کرنا، دیہاتی عورت کی 'اوقات' میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح دودھ دوہنا، دودھ میں لسی ڈال کر دہی بنانا، دہی سے پھر لسی بنانا، لسی سے مکھن نکالنا، مکھن سے دیسی گھی بنانا، دیسی گھی کو محفوظ رکھنے کے لیے وٹلن (دیسی گھی جمع کرنے کی مشکیزہ نما شے) بنانا، دیہاتی خواتین کے فرائضِ زندگی کا معمولی سا حصہ ہے۔ اسی طرح لسی سے گرت (لسی کی ٹھوس شکل) بنانا، گرت سے کرتوبہ (لسی کی خالص ترین ٹھوس شکل) بنانا۔ صرف اور صرف دیہاتی خواتین کے کام

ہیں۔ دودھ دوہنا ویسے بھی انہی کا کام ہے، گویا دیہاتی خاتون گوالن ہے!

دیہاتی خواتین مختلف انواع کے کھانے تیار کرنے کی ماہر سمجھی جاتی ہیں، جب کہ اسپیشل دیہاتی کھانے پکانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اسپیشل دیہاتی کھانوں کی ترکیبیں انہیں ازبر ہوتی ہیں اور وہ آنکھیں بند کر کے بھی یہ کھانے تیار کر سکتی ہیں۔ ویسے دیہاتی خواتین کی بنی ہر ڈش اسپیشل ہوتی ہے، کیوں کہ ہر ڈش میں انفرادیت ہوتی ہے۔ انفرادیت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کھانے میں نمک زیادہ ہو، یا بالکل غائب ہو۔ پانی بہت زیادہ ہو، یا پھر گھی کا سیلاب ہو۔ اس طرح کی ملتی جلتی خصوصیات کی بنا پر ان کی ہر ڈش اسپیشل ہی ہوتی ہے۔

دیہاتی خواتین نصف سنچری کے آس پاس کھانے پکانا جانتی ہیں۔ ان کے کھانے دیکھ کر مُلّا نصیر الدین کا لطیفہ یاد آتا ہے، جو مرغابی کے شوربے سے تعلق رکھتا ہے۔ دیہاتی خواتین کے ہاتھ کی بنی ڈشز بے شک لذیذ نہ ہوں، لیکن ان کے یہاں ورائٹی موجود ہے۔ مثال کے طور پر آلو کے اتنے کھانے دیہات میں بنائے جاتے ہیں، کھائے جاتے ہیں اور پسند بھی کیے جاتے ہیں کہ انہیں شمار کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آلو پانی میں اُبال کر، ان پر مرچ، نمک چھڑک کر ایک سستی اور مزیدار ڈش پکائی جاتی ہے۔ آلو کے سالن میں اُبالے گئے انڈے ڈال کر ایک اور ڈش بھی موجود ہے۔ دیہاتی خواتین آلو کو گھی میں تل کر آلو فرائی بناتی ہیں۔ آلو کا سالن تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آلو کو تپتی راکھ میں رکھ کر ’آلو کباب‘ بنا سکتی ہیں۔ آلو کے ساتھ ’لاندی‘ (سوکھا ہوا گوشت) ملا کر ایک نہایت ہی اسپیشل ڈش ’مُو‘ بناتی ہیں۔ آلو مٹر ایک عام، معروف اور مقبول ڈش ہے۔ آلو چپس بنانا ان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آلو کی ان ڈشز کا مجھے پتا ہے، خدا جانے آلو کے اور کتنے کھانے بنتے ہوں گے۔ یہ سارے کھانے اتنے مزیدار ہوتے ہیں کہ کھانے والے ان کے ساتھ اپنی انگلیاں تک چبا لیتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ یہ کھانے انتہائی نفاست سے پکائے جاتے ہیں اور ایسا کرتے وقت صفائی، ہاتھ کی صفائی اور ممکنہ بچت کا غیر معقول حد تک خیال رکھا جاتا ہے۔ جب یہ کھانے پک رہے ہوتے ہیں تو آپ سو میٹر کے فاصلے پر ان کی خوشبو سونگھ کر بتا سکتے ہیں کہ یہ کون سی ڈش ہے۔ یہ تمام باتیں ذہن میں رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں، دیہاتی خاتون گویا ’خانساماں‘ بھی ہے۔

ایک فرضی سروے کے مطابق ’دو درجن فیصد‘ دیہاتی خواتین اپنے شوہر کو کاٹتی ہیں۔ آپ

نے انگریزی کا وہ مشہور محاورہ ضرور سنا ہوگا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ عورت کے بال لمبے ہوتے ہیں، جب کہ ان کی زبان ان کے بالوں سے بھی لمبی ہوتی ہے۔ 'لاحول ولاقوۃ' آج تک مجھے ایسی عورت دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا کہ اس کی زبان معمولی سی بھی لمبی ہو۔ پھر اس انگریزی محاورے کا کیا مطلب؟ یہ محاورہ شاید زبان دراز خواتین کی بابت ہو، جو دانتوں کی بجائے زبان سے لوگوں کو کاٹتی ہیں۔ ایسی خواتین کے شوہر حضرات سر جھکائے، آنکھیں نیچی رکھے زندگی گزار دیتے ہیں۔ بقول غالبؔ:

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

ان کی زبان قینچی کی طرح تیز ہوتی ہے اور مرد کی مردانگی ان کے سامنے نرم کپڑے کی طرح بے وقعت اور مزاحمت کی طاقت سے خالی۔ یہ خواتین جب فرنٹ فٹ پر کھیلتی ہیں تو شوہروں کو دفاعی انداز میں ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس طرح شاہد آفریدی جارحانہ موڈ میں ہوں تو بالر کی کیا حالت ہوگی؟ کہتے ہیں کہ زبان کے زخم ہمیشہ ہرے رہتے ہیں، یہ کبھی مندمل نہیں ہوتے، لیکن عورت کی زبان کے زخم شاید شوہر کے دل پر نہیں لگتے۔ اس طرح کے ماحول میں عورت کی 'مردانیت' اور مرد کی 'نسوانیت' قابلِ دید ہوتی ہے۔ عورت شوہر کو اوقات بتاتی ہے، لیکن اپنی اوقات نہیں دیکھتی۔ دیہات کی دو درجن فیصد خواتین اتنی سفاک ہوتی ہیں تو مغربی خواتین سے گلہ کرنا بے انصافی ہے۔ یہ تمام باتیں ذہن میں رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے، گویا دیہاتی خواتین، ڈلیش ڈلیش ڈلیش...

دیہاتی خواتین دُور افتادہ علاقوں میں، جہاں رات کے وقت مختلف درندے اور حشرات الارض اُمڈ آتے ہیں، پانی کے ذخیرے، منبع یا ڈیپازٹ تلاش کرتی ہیں، ان کی حفاظت کا انتظام کرتی ہیں۔ یہ مظلوم قسم کی خواتین وہ پانی، جسے انسان استعمال کرتے ہیں، جانور پیتے ہیں، اُسی پانی کو گھر کے استعمال اور پینے کے لیے گھر لاتی ہیں۔ یہ خواتین اس پانی کو مشکیزوں اور مٹکوں کے ذریعے سے گھر تک پہنچاتی ہیں۔ گویا دیہاتی خواتین، ڈلیش ڈلیش ڈلیش...

دیہاتی خواتین سینڈل نام کی چیز سے واقف نہیں ہوتیں، بلکہ وہ تو پلاسٹک کی بنی ہوائی چپل اور پلاسٹک ہی کے بنے بوٹ استعمال کرتی ہیں۔ مرد حضرات البتہ گھر پر ہوائی چپل استعمال کرنے

بڑا سیانا دو عالم

کی عیاشی کرلیتے ہیں۔ نیز بچوں کی قسمت میں بھی پلاسٹک کے بوٹ نوشتہ کیے جا چکے ہیں۔ یہ ہوائی چپل اور یہ بوٹ انتہائی نرم اور بے کار پلاسٹک کے بنے ہوتے ہیں اور پہاڑی علاقوں میں انہیں استعمال کرتے ہوئے ایک ہفتہ کے اندر اِن میں دراڑیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ ان دراڑوں کو پاٹنے کے لیے موچی کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن دیہات میں موچی کہاں؟ ’ضرورت ایجاد کی ماں ہے‘۔ دیہاتی خاتون سوئی لیتی ہے، دھاگا سوئی میں ڈالتی ہے اور دراڑیں پاٹنے کے لیے بیٹھ جاتی ہے۔ ایسا کرتے وقت اس بات کا بھرپور خیال رکھا جاتا ہے کہ سبز رنگ کے جوتے کے لیے سرخ دھاگا استعمال ہو اور سرخ رنگ کے بوٹ کے لیے سبز رنگ کا دھاگا۔ نیز سفید دھاگا سیاہ چپل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسا اس لیے کیا جاتا ہے کہ دُور سے ہی نظر آجائے کہ چپل سے دراڑیں غائب ہو چکی ہیں۔ کچھ دیر کی کارروائی کے بعد یہ دراڑیں غائب ہو جاتی ہیں، گویا، دیہاتی خاتون موچی بلکہ ’موچن‘ بھی ہے!

دیہات میں سالگرہ منانے کا کوئی رواج ہے، نہ تصور۔ دیہات میں رہتے ہوئے کسی بھی شخص کے لیے یہ یاد رکھنا ممکن نہیں ہے کہ اس کی شادی کو کتنے سال ہوئے ہیں۔ ہاں، ایک طریقہ ہے، جس کے ذریعے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ شادی کو کتنے سال ہوئے ہیں۔ عورت اپنے بچے گنتی ہے اور پتا چل جاتا ہے کہ شادی ہوئے کتنے سال ہوئے ہیں۔ فرض کریں کسی خاتون کے بیس بچے ہیں، بآسانی کہا جاسکتا ہے کہ اس خاتون کی شادی کو 21 سال ہوئے ہیں! گویا، دیہاتی خواتین پیداوارِ اطفال کی فیکٹریاں بھی ہیں!

دیہاتی خاتون نہ صرف اپنے، بلکہ اپنے شوہر اور بچوں کے بھی کپڑے دھوتی ہے۔ واشنگ مشین تو در کنار، اُس کے پاس صابن یا واشنگ پاؤڈر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ کئی خواتین اِن کی جگہ چند جڑی بوٹیوں کے پتے استعمال کرتی ہیں۔ اور تو اور ایک خاص قسم کی چکنی مٹی بھی استعمال کی جاتی ہے۔ اس بے سروسامانی کی حالت میں یہ خواتین کپڑے دھوتی ہیں، دیواروں پر ڈال کر سکھاتی ہیں، کبھی کبھی استری بھی کرتی ہیں، بوقتِ ضرورت پیوند لگاتی ہیں۔ گویا دیہاتی خاتون دھوبن بھی ہے اور درزن بھی!

دیہاتی خواتین کو جڑی بوٹیوں اور بیماریوں کے تعلق کا پورا پورا علم ہوتا ہے۔ ویسے کئی وجوہات کی بنیاد پر دیہات میں جدید میڈیکل سائنس کے خلاف غصہ پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ جڑی بوٹیوں کے ذریعے علاج کافی مقبول ہے۔ ان جڑی بوٹیوں کا علم دیہاتی خواتین کو ازبر ہوتا ہے۔ کون سی جڑی کب اُگتی ہے، کہاں اُگتی ہے، کس موسم میں اُگتی ہے، اُس کے فائدے کیا ہیں، کس مرض کے لیے مفید ہے، کس مرض کے لیے نقصان دہ ہے۔ انہی معلومات کی بنیاد پر دیہاتی خواتین جڑی بوٹیاں جمع کرتی ہیں۔ ان کو ملا کر مختلف قسم کی دوائیں بناتی ہیں اور بوقتِ ضرورت انہیں استعمال کرتی ہیں۔ گویا دیہاتی خواتین طبیب بھی ہیں!

آپ دیکھ چکے ہیں کہ دیہاتی گھروں میں ڈیری فارم موجود ہوتے ہیں، دواخانہ ہوتا ہے اور باورچی خانہ بھی۔ اسی طرح ان گھروں میں پولٹری فارم بھی ہوتا ہے! دیہاتی خواتین مرغیاں ضرور پالتی ہیں۔ دیگر اُمور کی طرح مرغیوں کی دیکھ بھال اور حفاظت بھی صنفِ نازک کے ناتواں کندھوں پر رکھ دی گئی ہے۔ مرغیاں انڈے دیتی ہیں۔ کوئی مرغی روزانہ ایک انڈا دیتی ہوئی بیس انڈے اسکور کرتی ہے، کوئی مرغی چالیس انڈے اسکور کرتی ہے، جب کہ کچھ مرغیاں مسلسل چھ ماہ تک انڈے دیتی ہیں۔ مرغیاں اپنی مقررہ مدت تک انڈے دیتی ہیں اور پھر انڈے دینا بند کر دیتی ہیں۔ اس کے بعد مرغی انڈے دینے والی جگہ پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے مرغی انڈے سینے کے لیے تیار ہے۔ دیہاتی خاتون ان حالات میں اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے درجن کے آس پاس بڑے انڈے جمع کرتی ہے اور انہیں مرغی کے نیچے رکھ دیتی ہے۔ مرغی یہ انڈے سینا شروع کرتی ہے تو اِس دوران دیہاتی خاتون مرغی کے لیے خور و نوشت کا انتظام اُسی جگہ کرتی ہے، تا کہ کسی پریشانی کا شکار نہ ہو۔ مرغی مسلسل اٹھارہ دن اور رات انڈے سیتی ہے اور انیس دن کے بعد انڈے میں چوزہ بننے کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔ چوزہ بننے کے بعد انڈے میں دراڑیں نمودار ہو جاتی ہیں اور پھول سا نازک چوزہ اپنی زندگی کا سفر شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح اُن چوزوں کی حفاظت، دیکھ بھال اور اُن کے آب و دانہ کی ذمہ داری حسبِ معمول خاتونِ خانہ کے سپرد ہوتی ہے۔ یہ چوزے بڑھتے بڑھتے مرغیوں اور مرغوں کا روپ دھارتے ہیں۔ 'تازہ دم' مرغیاں انڈے دیتی ہیں اور کہانی پھر وہیں سے شروع ہو جاتی ہے۔ ان حالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ دیہاتی خاتون پولٹری فارمر بھی ہے!

دیہاتی خاتون اپنے شوہر، اپنے بچوں اور اپنے خاندان کی خدمت کرتی ہے، گویا دیہاتی خاتون خادمہ بھی ہے۔ اسی طرح کچھ واجبی سے کام ویسے بھی دیہاتی خاتون کے سپرد ہیں، مثلاً

بڑی جوکھوں دو عالم

روٹی پکانا، کھیت سے گھاس لا کر جانوروں کو کھلانا، برتن دھونا، لکڑی کاٹ کر گھر کا چولہا جلا رکھنا، کشیدہ کاری کے ہنر استعمال کرتے ہوئے نہایت نفاست سے بہترین لباس تیار کرنا، کمرے اور آنگن کو صاف رکھنا، چائے بنانا، وغیرہ وغیرہ... اس کا مطلب یہ نہیں کہ دیہات کے مرد شاہی محل میں پاؤں پھیلائے زندگی بسر کرتے ہیں! امرِ واقعہ یہ ہے کہ دیہات کی زندگی سہولیات سے عاری؛ ہے۔ یہاں ٹیکنالوجی نہیں ہے، شعور نہیں ہے، تعلیم نہیں ہے، دولت ناراض ہے، حکومتیں لاپرواہیں اور... نتیجہ کے طور پر زندگی کٹھن اور دشوار ہے۔

ہاں! دیہات میں تصنع نہیں ہے۔ فطرت کی روشن نشانیاں انسانوں اور سرزمین دونوں میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

* * *

ہم بھی ہوئے بیمار!

محمد انوار احمد

اور جب کچھ بن نہ پڑا تو آخر ہونا ہی پڑا داخل ہمیں ہسپتال میں، کوشش اگرچہ بہت کی تھی بچنے کی۔ ”کمرہ نمبر ایک سو ایک ہے آپ کا۔“ ہم نے کاؤنٹر سے پرچی بنوائی اور اپنے کمرے میں جا پہنچے، جہاں سامنے وہی اُونچا سا لوہے کا اسپرنگوں والا موٹے سے گدے اور ربڑ کے پہیوں والا پلنگ ہمیں اپنی طرف بلا رہا تھا۔ مگر لیٹیں کیسے، اس پلنگ پر؟ ہم تو ہٹے کٹے ہیں، چل پھر رہے ہیں، جب کہ یہ تو مریضوں کا پلنگ ہے۔ خدا بچائے اِس پلنگ اور اِس بستر سے۔ ہم اُس پلنگ کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گئے! اتنے میں ایک نرس ہاتھ میں گلوکوز کی تھیلی، سوئی اور مختلف قسم کے انجکشن لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی، ”آپ میں سے مریض کون ہے؟“ اس نے کمرے میں دو آدمیوں کو دیکھ کر پوچھا، ”مریض ہم ہیں۔“ ہم نے تندرست بنتے ہوئے کہا، ”آپ کو ڈرپ لگے گی، لیٹ جائیے۔“ نرس نے کہا۔ ہم سہم کر چپ چاپ اُس اُونچے بستر پر جا لیٹے۔ نرس نے ہماری نس ٹٹولی اور بڑے اطمینان سے ڈرپ کی موٹی سی سوئی ہماری کلائی کی نس میں داخل کر دی۔ پھر اُس نے اُس پائپ کی ٹونٹی کھول دی، جس کا ایک سرا سوئی سے اور دوسرا گلوکوز کی تھیلی سے لگا ہوا تھا۔ تھیلی سے گلوکوز قطرہ قطرہ ہو کر ہماری اُس نس کے ذریعے خون میں داخل ہونے لگا۔ ہم نے بھی نظر تھیلی پر جما دی اور ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھنے لگے، کیوں کہ یہی شاید ہماری بیماری کا علاج تھا۔ دوا آہستہ آہستہ ہمارے خون میں شامل ہوتی رہی اور ہم سمجھتے رہے کہ اب ہم فوراً ہی تندرست ہو جائیں گے۔ اِدھر اَب رات بھی کافی ہو چکی تھی، کوئی دس بجے کا وقت ہوگا۔ ہم نے سوچا کہ چلو اَب سو جائیں۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ رات کی نرسوں نے ڈیوٹی سنبھال لی تھی۔ دستک کے ساتھ ہی دو نرسیں ہمارے کمرے میں داخل ہو گئیں، ”کیا حال ہے؟“ ایک نے پوچھا۔ اس نے

پہلے کہ ہم کوئی حال بتاتے تھرمامیٹر اُس نے ہمارے منہ میں لگا دیا:

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

ہم نے سوچا، یہ تو بڑے کام کی چیز ہے، کسی کو خاموش کرنے کے لیے۔ پھر اِدھر تھرمامیٹر ہمارے منہ میں لگایا اور اُدھر نرس نے اپنا ایک ہاتھ ہماری نبض پر رکھ دیا۔ دوسری نرس نے ہمارا دوسرا بازو تھاما اور بلڈ پریشر ناپنے کا آلہ ہمارے آگے رکھ کر اُس میں ہوا بھرنے لگی۔ پھر دونوں نے اپنی اپنی کارگزاری ہمارے چارٹ میں نوٹ کی اور کمرے سے نکل گئیں۔

ہم نے دوبارہ سوچا کہ اب سو جائیں، رات کافی بیت چکی ہے۔ اگر ہسپتال میں بھی آرام نہ کیا تو پھر اور کہاں آرام ملے گا۔ یوں بھی بڑے لوگ ہسپتال جا کر ہی آرام کیا کرتے ہیں۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ دیکھا ایک صاحب ایک رجسٹر ہاتھ میں لیے کھڑے ہیں۔ ”صاحب! ہمیں تکیے، غلاف اور چادریں چیک کرنا ہیں۔“ ہم تو خود نووارد تھے۔ اُن کے اس اخلاق کا کیا جواب دیتے۔ وہ اندر داخل ہو گئے۔ پھر چادر، تکیے اور غلاف ہی کیا، کرسیاں، بینچ، اسٹول، بالٹی، لوٹا اور گدا سبھی کچھ دیکھتے جاتے اور اپنے رجسٹر میں نشان لگاتے جاتے۔ جرح کے لیے ہم ہی تھے، جو اُن کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ جو چیزیں پچھلے مریضوں کے وقت سے کم تھیں، اُن کا جواب بھی ہم سے ہی طلب ہو رہا تھا۔ گویا خطاوار ہم تھے کہ داخل ہوتے وقت تمام چیزوں کا گن گن کر چارج کیوں نہیں لیا تھا! پھر بھی اُن کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر ہم نہ رہ سکے، جب جاتے وقت انہوں نے پوچھا، ”کوئی شکایت تو نہیں آپ کو؟“ اب کون اُن سے کہتا کہ ”ہزاروں ہیں شکوے، کہاں تک سناؤں۔“ ویسے انہوں نے اتنا موقع ہی نہ دیا کہ ہم حرفِ شکایت زبان پر لا سکتے۔ ہماری خاموشی کو اُنہوں نے جواب سمجھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ اب ہماری آنکھوں میں نیند بھر چکی تھی، پپوٹے بوجھل ہو رہے تھے۔ قریب تھا کہ ہم اس ڈرپ کی سوئی کے باوجود سو جاتے کہ دروازے پر ایک مرتبہ پھر دستک ہوئی اور ایک صاحبہ اندر داخل ہوئیں۔ ہم نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اُن کی جانب دیکھا۔ ”یہ آپ کی سوتے وقت کی گولی کھلانا ہے۔“ وہ بڑے اخلاق سے بولیں۔ ہم نے نہایت بے چارگی سے اُن کے حکم کی تعمیل میں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ گولی لے کر منہ میں رکھی اور پانی کے گھونٹ سے وہ کڑوی گولی نگل

لی۔ اُنہوں نے گلاس ہم سے لے کر میز پر رکھا اور ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر کے کمرے سے نکل گئیں۔

ہم خوش ہوئے کہ چلو جان چھوٹی۔ اب اگر اِس وقت ہم جلدی نہیں سو سکے تو کیا ہے، صبح دیر تک سوتے رہیں گے۔ یہاں بھلا کون ہمیں صبح ہی صبح آ کر جگائے گا۔ ہم تو آخر بیمار ہیں نا۔ ہم نے بجلی بند کی اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔ نئی جگہ، نیا ماحول اور وہ بھی ہسپتال کا، اس پر طرح طرح کی آوازیں اور شور۔ نیند تو کیا آنا تھی، بس پڑے گھڑیاں گنتے رہے۔ آدھا گھنٹہ گزرا۔ ایک ڈیڑھ، دو، پھر نہ جانے کب ہم کو نیند نے آ دبوچا۔ ابھی ہم پوری طرح غافل نہ ہونے پائے تھے کہ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ اب کیا آفت آئی؟ ہم نے سوچا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک نرس گلوکوز کی دوسری بوتل لیے اندر داخل ہوئی۔ ”آپ کی ڈرپ ختم ہو رہی ہے، یہ دوسری اسی میں لگا دیتے ہیں، پھر سوئی بدلنا نہیں پڑے گی۔“ اس نے ایک بوتل نکالی اور دوسری بوتل اس نلکی میں لگا دی۔ دوا پھر قطرہ قطرہ ہو کر ہماری رگوں میں دوڑتے خون میں شامل ہونے لگی۔ اب ہم نے بھی اطمینان کا سانس لیا کہ شاید اب اور کوئی جگانے والا نہ ہو اور ہم باقی رات آرام سے سو سکیں۔ کچھ دیر یونہی لیٹے رہے، آخر دوبارہ ہمیں نیند آ گئی۔ ابھی آنکھ ہی جھپکی ہو گی کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ دیکھا تو فجر کا وقت ہو چکا تھا۔ دروازے پر صبح کی ڈیوٹی والی نرس تھرمامیٹر لیے کھڑی تھی۔ ہم نے لیٹے لیٹے منہ کھول دیا۔ نرس نے تھرمامیٹر ہماری زبان کے نیچے رکھا اور ایک ہاتھ ہماری نبض پر رکھ دیا۔ پھر جب زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو ہم چونکے۔ وہ اپنی ڈیوٹی پوری کر کے جا چکی تھی۔

اب اُجالا پھیلنے لگا تھا، لیکن دن نکلنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ ہم نے سوچا کہ اسی نیند میں گرہ لگا لیں، لیکن ابھی سونے کی کوشش میں ہی تھے کہ دروازہ ایک زوردار جھٹکے سے پھر کھلا اور صبح کی ڈیوٹی والا جمعدار اپنی ڈیوٹی پر آ موجود ہوا۔ خیر جلد ہی وہ کمرے میں جھاڑو دے کر باہر نکل گیا۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔ اب سورج نکل رہا تھا اور اُجالا کافی پھیل چکا تھا۔ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ ”دودھ والا، دودھ، چائے صاحب؟“ اب ایک دودھ والا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ ابھی ہم کوئی جواب دینے نہ پائے تھے کہ وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا اور دوسرے دروازے پر دستک دینے لگا۔ ہم نے شکر ادا کیا اور پھر بستر پر لیٹ گئے۔ ”ناشتا صاحب۔ ناشتا آئے گا صاحب؟“ فوراً ہی پھر

کسی نے دروازہ کھٹکھٹا کر ہم سے پوچھا، ”نہیں بھئی نہیں چاہیے۔“ ہم نے جلدی سے جان چھڑانے کو کہہ دیا، مگر وہ تو دروازہ کھٹکھٹا کر جا چکا تھا اور برابر والے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

ہمیں ڈرپ کی نلکی سے بڑی اُلجھن تھی، اس پر یہ آنے جانے والے کسی طرح چین نہ لینے دیتے تھے۔ جھنجھلاہٹ سی ہو رہی تھی ہر کھٹکے پر، مگر کیا کرتے، مجبور تھے اپنے چارہ گروں کے ہاتھوں۔ خدا خدا کر کے وہ بوتل ختم ہوئی اور نرس نے آ کر نلکی ہمارے ہاتھ سے نکالی۔ اب ہم ذرا ہلکا محسوس کر رہے تھے، بھوک بھی لگ رہی تھی، مگر اَب ناشتا نہ تھا۔ گھر پر تو ابھی سب اُٹھے ہی ہوں گے، ابھی ناشتا تیار ہو رہا ہوگا، مگر لگ ایسا رہا تھا کہ نہ جانے کتنی دیر ہو گئی ہے، جو کوئی ابھی تک ہمارے لیے ناشتا لے کر نہیں پہنچا۔ ہم پوری طرح جاگ چکے تھے اور مزید سونے کا ارادہ بھی ملتوی کر دیا تھا۔ سوچا، جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہو لیں۔ لیکن اب نل کھول کر جو دیکھا تو پانی غائب تھا۔ غور کیا تو اِدھر اُدھر ہر کمرے میں پانی کا ہنگامہ سنائی دیا۔ چوکیدار کی تلاش جاری تھی۔ وہ آئے تو موٹر چلائے، تا کہ پانی ٹینک میں چڑھے اور نلوں میں اُترے۔ مجبور ہو کر پھر لیٹ گئے بستر پر۔ تھوڑی دیر بعد موٹر چلنے کی آواز آئی تو ہماری جان میں جان آئی اور اُٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگے۔

ابھی ہم منہ دھو کر ناشتا کرنے ہی والے تھے کہ ایک نرس آئی اور آ کر ہم سے کہا، ”ناشتا ابھی نہ کیجیے گا آپ، ابھی آپ کا خون لینا ہے ٹیسٹ کرنے کے لیے۔“ اب تو ہم اور بھی مجبور ہو گئے کہ کچھ کھا بھی نہ سکتے تھے، جب کہ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ ناچار لیٹ رہے بستر پر۔ اتنے میں پھر دستک ہوئی۔ دیکھا تو خون لینے والا ہی تھا، اپنی سرنج لے کر آیا تھا۔ اُس نے خون لے لیا تو ہمیں اطمینان ہوا کہ اب اطمینان سے ناشتا کر سکیں گے۔ اتنے میں پھر دستک ہوئی۔ معلوم ہوا اَب دوسرا جمعدار ہے، وہ کمرے کی صفائی کرے گا۔ وہ گیا تو ایک وارڈ بوائے اندر داخل ہوا اور چادر اور غلاف بدلنے لگا۔ ہم خطاوار سے اُٹھ کر ایک طرف کو کھڑے ہو گئے۔ وہ گیا تو ایک محترمہ اندر داخل ہوئیں، جنہیں واش بیسن دھونا تھا۔ یہ سب کارروائی ہوتی رہی اور ہم دیکھتے رہے۔ اس دوران میں ناشتا بھی آ گیا تھا۔ ہم نے ناشتا کیا اور سوچا کہ اب لیٹ کر ذرا آرام کر لیں، مگر دروازے پر پھر دستک ہونے لگی۔ اس مرتبہ ایک نرس تھیں، جو ہمیں صبح کی دوا کی خوراک کھلانے آئی تھیں۔

انہوں نے رجسٹر دیکھا، گولیاں ہمارے ہاتھ میں تھمائیں، گلاس میں پانی لوٹ کر دیا اور ہم نے اچھے بچوں کی طرح فوراً ہی وہ گولیاں نگل لیں اور دوا کی خوراک پی لی۔ انہوں نے اپنے رجسٹر میں اندراج کیا اور رخصت ہو گئیں۔ ابھی بستر پر لیٹے ہی تھے کہ پھر دستک ہوئی اس مرتبہ ایک نرس اور ایک کمپاؤنڈر تھا، جو گلوکوز کی بوتل، انجکشن اور سوئیاں ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہم گرہی رہ گئے۔ فوراً ایک نے ہماری کلائی پکڑی اور دوسری نے سوئی ہماری رگ میں اُتار دی، پھر گلوکوز کی بوتل کا پائپ کھول دیا اور قطرہ قطرہ دوا ہماری نس سے اُتر کر ہمارے خون میں شامل ہونے لگی۔ دوا آہستہ آہستہ ہماری رگوں میں اُترتی رہی اور ہم ان قطروں کو پُر اُمید نظروں سے تکتے رہے۔ انہیں تکتے تکتے ہی ہمیں شاید کسی وقت اونگھ بھی آ گئی، کیوں کہ اب جو دروازے پر دستک ہوئی تو ہم چونک پڑے تھے۔ دیکھا تو یہ دو نرسیں تھیں، جو ہمارا ٹمپریچر اور بلڈ پریشر لینے آئی تھیں اور پھر وہی...!

* *

چاچا چوہان

مرزا عاصی اختر

نام تو اللہ جانے کیا تھا، مگر اُن کے حلقے کے ووٹر انہیں چاچا چوہان کہہ کر کھری کھری سناتے تھے۔ مخالفین کو کھلے چھپے یہ شکایت رہی کہ اِن کے نام کے ساتھ 'ن' بالکل لگا نہیں کھاتا، لہٰذا مخالفین کے چمچے الیکشن کے دنوں میں دیواروں اور بینروں سے 'ن' اُڑا دیا کرتے تھے۔ دوسرے دن چاچا کو ذاتی خرچ پر 'ن' لکھنے کا کام دوبارہ کرانا پڑتا تھا۔

انہوں نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز ایک معصوم بچے کی چونی نکال کر کیا جو نالی میں گر گئی تھی۔ بچے نے انہیں روتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ نالی میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا، والدین کی طرف سے سخت ممانعت ہے۔ چاچا نے فوراً نالی میں ہاتھ ڈال دیا تھا یہ بڑبڑاتے ہوئے کہ "ہمیں کون سا والدین نے منع کیا ہوا ہے۔" اس معمولی واقعے نے خاصی شہرت حاصل کر لی اور چاچا چوہان محلّے کے بچوں میں بے حد مقبول ہو گئے۔ اب نالی سے گٹر تک کے مسائل یہ حل کرتے۔ چوں کہ گٹروں کے ڈھکن خاصے دنوں سے غائب تھے اس لیے کرکٹ کی گیند اور فٹ بال اکثر اِن میں جا گرتی۔ یہ فوراً گیند نکالنے دوڑتے۔ اُس سستے زمانے میں فی گیند آٹھ آنے لیا کرتے۔ بچوں کا اب یہ عالم تھا کہ میچ شروع ہونے سے قبل ایمپائر اور ریفری کی بجائے چچا کو پہلے تلاش کرتے، کیوں کہ ایمپائر تو کوئی بھی بن سکتا تھا، مگر نالی اور گٹروں میں جھانکنا سب کے بس سے باہر تھا۔ اپنی اس مقبولیت پر چاچا نازاں تھے۔ بچوں کی محبت دیکھتے تو اکثر فرطِ جذبات سے بے قابو ہو کر کہا کرتے، "اگر بچوں کو ووٹ ڈالنے کا حق مل جائے تو قومی اسمبلی کی سیٹ جیت سکتا ہوں، وہ بھی بلا مقابلہ۔"

بلدیاتی الیکشن میں چاچا نے کاغذات نامزدگی بھرے تو محلّے کے بچوں نے بڑے پُرشکوہ جلوس نکالے۔ یہ جلوس اتنے شاندار اور بقول چاچا چوہان، مخالفین کے لیے اتنے کمر توڑ بلکہ اعصاب شکن تھے کہ اخبارات کئی دنوں تک جلی سرخیوں میں جلوس کے اعداد و شمار شائع کرتے

رہے۔ آخر بچوں کی محنت رنگ لائی اور غیر سرکاری نتائج کے مطابق چاچا چوہان نہایت شاندار اکثریت... سے ہارے، مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ محلّے کے بچوں سے مشورہ کرنے کے بعد نہایت غور و خوض سے علاقہ کے بند گٹروں کو صاف کرنے کا شش ماہی منصوبہ بنا ڈالا، کیوں کہ بلدیہ کے خاکروب، عرصہ ہوا اُس علاقے کا رُخ کرنا چھوڑ چکے تھے۔ اب حالت یہ تھی کہ ہر گلی، نہر یا ندی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ شہر بھر کے مچھر چاچا کے حلقے میں اپنا کنونشن منعقد کر رہے تھے۔ سینیئر مقرّرین نے ملیریا کے حق میں دھواں دھار تقاریر کیں۔ بیشتر نے جراثیم کش ادویات بنانے والے اداروں کے خلاف زورِ بیان صرف کیا۔ نیز ایک قرارداد کے ذریعے حکومتِ وقت سے مطالبہ کیا گیا کہ ایسی مضرِ صحت، بلکہ مضرِ جاں ادویات بنانے والوں کے خلاف فی الفور کارروائی کی جائے، جن سے مچھرانیت یا مچھر برادری کی زندگیوں کو سنگین خطرات لاحق ہیں۔ غرضیکہ مچھروں نے محلّے کا اس بُری طرح محاصرہ کر رکھا تھا اور ایسی درست اور بروقت حکمتِ عملی کا مظاہرہ کر رہے تھے کہ ملیریا کے جراثیم بھی عش عش کر اُٹھے۔ گندے پانی پر اس طرح بچھے ہوئے تھے کہ سمینٹڈ فرش کا گمان گزرتا تھا۔ راہ گیر اِن پر فرشِ زمیں سمجھ کر پاؤں رکھتے اور بعد میں پچھتاتے۔ بہت سے راہ گیروں نے تو یہ کہتے ہوئے اپنی عینکیں توڑ کر پھینک دیں کہ ”لعنت ہے ایسی عینک پر، جو فرش اور مچھروں کے فرش میں تمیز نہ کر سکے۔“ چاچا نے اس موقعے سے بھرپور فائدہ اُٹھایا اور لنگوٹ کس، دائیں ہاتھ میں بانس کی کھچی اور بائیں ہاتھ میں پھاوڑا لے، میدان میں، ہمارا مطلب ہے کیچڑ میں کود پڑے۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ بلدیہ کے خاکروبوں نے عرصہ ہوا یہاں کا رُخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ لوگ اتنے سُست اور کاہل ہو گئے تھے کہ اپنے حقوق کی پامالی کو بہ چشمِ وا دیکھتے تھے اور دم نہیں مارتے تھے۔ چاچا نے اپنے مقرّر کردہ وقت سے بہت پہلے تمام گلیوں اور گٹروں کو چماچم کر دیا۔ اب محلّے میں اُن کا خاصا اعتبار قائم ہو گیا تھا، یعنی لوگ انہیں دُور سے دیکھ کر ہیلو ہیلو کرنے لگتے تھے۔ اب ہم چاچا چوہان کی شہرت کا وہ واقعہ بیان کرتے ہیں، جس کے طفیل یہ محلہ جاتی سیاست سے باہر نکلے اور بین الصوبائی سیاست میں داخل ہوئے۔

ہوا یوں کہ بارشوں کے موسم میں بجلی کا ایک تار ٹوٹ کر ایک بڈھے پر گرا اور وہ اِس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔

ہر چند یہ چاچا کا علاقہ نہیں تھا، تاہم گٹروں کی صفائی والے واقعے نے اِن کو دیگر حلقوں میں

بھی مشہور کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُن حلقوں کے بہت سے اُمیدوار اِس واقعے کو سن کر اپنے دوران کرام سے منہ چھپانے لگے تھے۔ کئی تو غسل کے بڑے تولیے سے اس طرح لپٹ لپٹا کر نکلتے، جیسے پاک باز اور عفیف خواتین نکلا کرتی ہیں، یا پھر جیسے ریسلنگ میں ہارے ہوئے پہلوان ماسک چڑھا کر چہرہ چھپا لیتے ہیں، مبادا کوئی گٹر صاف کرنے کے لیے کہہ دے۔ بہر کیف، چاچا نے متعلقہ محکمے کی ایک گاڑی دیکھی، جو لبِ سڑک ترچھی کھڑی ہوئی اپنے سواروں کی منتظر تھی۔ مگر یہ کیا؟ سوار تو ہلکی ہلکی بوندا باندی میں چائے کی چسکیاں لینے میں مصروف تھے۔ چاچا نے نہایت آسان اور بہت کم الفاظ میں اپنا مافی الضمیر بیان کیا۔ لہجے کی مٹھاس اور نرمی کو متعلقہ اہلِ کار چاچا کی کمزوری سمجھے۔ لائین سپرنٹنڈنٹ نے نہایت حقارت آمیز اور ناقابلِ اشاعت الفاظ میں انہیں آگاہ کیا، جن کا لبِ لباب یہ تھا کہ یہ ہمارا علاقہ نہیں ہے۔ جس پر چاچا نے یہ جوابی چوٹ کی کہ جب یہ آپ کا علاقہ نہیں تو آپ یہاں چائے کیسے پی رہے ہیں؟ چاچا نے بہتیرا کہا، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ حسنِ اتفاق کہ محکمۂ بجلی کا ایک افسر چاچا کے محلّے میں رہائش پذیر تھا۔ یہ فوراً اُس کے پاس پہنچے اور متعلقہ لوگوں کی بدتمیزی کی شکایت کی۔ کچھ تو محلّے داری کا خیال اور کچھ چاچا کی خدماتِ جلیلہ کا لحاظ اور سب سے بڑھ کر بیمہ ایجنٹوں کا سا اندازِ بیان۔ فوراً اُن کم بختوں کے ٹرانسفر آرڈر نکال کر چاچا کے حوالے کیے۔ آرڈر لے کر یہ ہوٹل پہنچے تو متعلقہ اہل کار مرغ مسلّم کھانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ابھی لائن سپرنٹنڈنٹ نے مرغ مسلّم پر اپنا پہلا ہی دانت مارا تھا کہ انہوں نے ٹرانسفر آرڈر کی جھلک دکھائی۔ منہ کا نوالہ منہ ہی میں رہ گیا اور مرغ کی ٹانگ لڑکھڑا کر نیچے گر گئی، جسے فوراً ہی تاک میں بیٹھی ہوئی ایک بلی نے کیچ کیا اور نو دو گیارہ ہوئی۔ اب منظر یہ تھا کہ چاچا کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑے جا رہے تھے اور گھگیاتے ہوئے کہا جا رہا تھا کہ ہم ابھی ٹوٹتے ہوئے تار اور دل جوڑ دیتے ہیں۔ مگر اِس وقت چاچا کی گڈی اُونچی جا رہی تھی، لہٰذا اُن کے منہ پر ایک ہی جملہ تھا، ”مگر یہ تو آپ کا علاقہ ہی نہیں۔“ بمشکل تمام لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر یہ انہیں معاف کرنے پر رضا مند ہوئے۔ وہ اس طرح کہ تار جوڑنے کے بعد اُن لوگوں نے چاچا سے ’بآوازِ بلند‘ معافی مانگی اور انہوں نے بھی ’بآوازِ بلند‘ اُن کو معاف کیا۔

اس واقعے نے چاچا کی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔ اب یہ محدود حلقوں سے نکل کر نسبتاً وسیع حلقوں میں مشہور ہونے لگے۔ جب ذرا اور بھرم قائم ہوا تو بیس پچیس افراد روزانہ آنے لگے۔

ہوٹل کا بل بھی کچھ زیادہ ہی آنے لگا۔ ہوٹلنگ کرتے کرتے چاچا کا بھرکس نکل گیا تو انہیں آفس کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ خدا بھلا کرے مخالفین کا کہ ایک غیر سیاسی تقریب میں کسی نے انہیں منہ بھر کے خانہ بدوش کہہ دیا۔ یہ پھبتی کچھ ایسی چپکی کہ تلملا کر رہ گئے، مگر خاموش رہے کہ اس وقت مہمان خصوصی کی حیثیت سے تقریر کر رہے تھے، بلکہ پڑھ رہے تھے:

جس میں جتنا ظرف ہے اُتنا ہی وہ خاموش ہے

یہ تلملاہٹ اپنا کام کر گئی۔ اب انہوں نے سنجیدگی سے جگہ کی تلاش شروع کر دی۔ مگر اصل مسئلہ جگہ کا نہیں، رقم کی فراہمی کا تھا۔ اپنے ووٹروں سے مانگتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی تھی، لہٰذا ایک سود خور کو پکڑا اور دس ہزار پر پانچ ہزار کی شرح سے رقم حاصل کی اور اپنے دفتر کا باقاعدہ افتتاح کر کے مخالفین کو حیرت کے آزار میں مبتلا کر دیا۔ بارے ٹھکانہ مستقل ہوا تو مسائل کی نوعیت قدرے بدل گئی۔ اب نالیوں اور گلیوں کی صفائی کے مسائل کم اور طلاق، خاندانی جھگڑے اور باہمی رنجشوں کے زیادہ آنے لگے۔ مسائل تو اُن سے کیا سلجھتے، کیس کو بڑھا کر ہائی کورٹ تک پہنچا کر وکیلوں کی چاندی کرا دیتے۔ دروغ بر گردنِ راوی، سنا تھا کہ مختلف وکیلوں سے باقاعدہ کمیشن بندھا ہوا تھا۔ مدعی اور مدعا علیہ عدالتوں کی سیڑھیاں گنتے ہوئے اُن کے حسنِ تدبّر کی تعریف کرتے اور ساتھ ہی خدا کا شکر بھی ادا کرتے کہ چاچا نے سپریم کورٹ تو نہیں پہنچایا۔

سود خور ہر پہلی تاریخ کو مالک مکان کی طرح نازل ہو جاتا اور یہ فی الفور ایک ہزار کی قسط نذر کرتے۔ چاچا نے دس ماہ میں دس ہزار ادا کر کے بریک لگا دیا اور سود کی رقم علی الاعلان ہضم کر گئے۔ نیز یہ فتویٰ بھی دیا کہ ہمارے مذہب میں سود دینا حرام ہے۔ جس کے جواب میں سود خور نے بڑا واویلا مچایا کہ یہ کیا تک ہے، سود لیتے وقت حلال اور دیتے وقت حرام ہو جاتا ہے۔ کیسے؟ چاچا نے دس ہزار کی رقم پر چار آدمیوں کے سامنے ہاں کروائی کہ ’’میں نے دس ہزار کی رقم تجھے واپس کی۔‘‘ اُس نے کہا، ’’ہاں واپس کی۔‘‘ پھر نہایت تیز آواز میں بولے، ’’ابے جتنی رقم میں نے تجھ سے لی اتنی ہی واپس کی، پھر جھگڑا کیا، چل تیرا میرا حساب بے باق ہوا۔‘‘ یہ سن کر وہ کچھ اور بے باک ہوا، جس پر چاچا مزید طیش میں آ گئے اور سود خور کو یہ غیر مسلح دھمکی دی کہ ’’اگر یہ سودی کاروبار بند نہ کیا تو سنگین نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہو۔‘‘ یہ دھمکی آمیز گفتگو سن کر اُس نے ہتھیار ڈال دیے۔

اصل رقم کی واپسی پر خود کو بآوازِ بلند مبارک باد دی، چاچا کی طرف پیٹھ کر کے اُن کے چھوٹے سے آفس میں سجدہ شکر بجالایا اور بہت ہی نازاں و فرحاں سب کو سلام کرتا ہوا رُخصت ہوا۔

اب آتے ہیں، چاچا کے دفتر کم کٹیا کی طرف۔ بیس گز کے پلاٹ کو اِس طرح تقسیم کیا گیا تھا کہ ایک چھوٹی کٹیا (جسے آفس لکھتے ہوئے قلم شرمارہا ہے) اور چار بیت الخلاء آرام سے بن گئے۔ لیکن چار کی منطق ایک عام آدمی کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ لوگوں کے بے حد اصرار پر اِس کی وجہ یوں بیان کرتے، ”بھائی میرے، پچاس ساٹھ افراد کے مسائل سننا اور پھر انہیں حل کرنا۔ جس کے حق میں فیصلہ ہوا وہ تو ٹھیک ٹھاک رہا اور فیصلہ جس کے خلاف گیا، کیا تعجب کہ وہ فرطِ غم سے بے قابو ہو جائے۔ چار بیت الخلاء اسی مناسبت سے بنوائے ہیں۔“

دلچسپ بات یہ تھی کہ اُن کا کمرۂ انصاف اور بیت الخلاء ایک ہی رو میں واقع تھے۔ نیز اُن کے دروازے بھی ایک ہی ڈیزائن کے تھے۔ مزید یہ کہ مرکزی دروازے سے داخل ہوتے وقت پہلے کمرہ ہونا چاہیے تھا، مگر یہاں اور کون سی بات قواعد و ضوابط کے حساب سے ہو رہی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نیا آنے والا کمرہ سمجھ کر بیت الخلاء میں باری باری داخل ہوتا اور ناک پر رومال اور منہ پر لاحول، کی کیفیت میں پُھرتی سے باہر نکلتا اور آخر میں چاچا کے کمرے میں اِسی حلیے میں داخل ہوتا، یعنی ناک پر رومال اور منہ پر لاحول۔ مگر اِس معاملے میں چاچا بہت دُور اندیش تھے۔ اب انہوں نے یہ کیا کہ تیز پرفیوم کپڑوں پر لگانا شروع کر دیا، جس کا فائدہ یہ ہوا کہ بہت سارے افراد بیت الخلاء کی لازمی حاضری کے بعد اُن کی طبیعت پر گراں نہیں گزرتے تھے۔

اِس وقت چاچا کی عمر ستر کے لگ بھگ ہے، مگر اُن کے حوصلے اب بھی جوان ہیں۔ تاحال وہ کسی بھی الیکشن میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ آیئے دُعا کریں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ انہیں آئندہ الیکشن کے جھمیلوں سے محفوظ و مامون رکھے۔

* *

امتحان زدہ

مرزا عظیم بیگ چغتائی

ہم تحصیلی اسکول میں اُردو مڈل میں پڑھتے تھے اور ہمارے والد صاحب قبلہ کی تمنا تھی کہ کسی طرح ہم جلد مڈل پاس کر کے پٹواری بن جائیں اور ہماری شادی کر دی جائے۔ مگر ہماری قسمت بھی عجیب تھی دو سال سے برابر فیل ہو ہو جاتے۔ لوگ ہم کو کوڑھ مغز کہتے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ ہمارے دماغ میں بھس بھرا ہے اور کوئی کہتا تھا کہ گوبر بھرا ہے اور ہم اُلو ہیں، مگر ذرا انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو ہماری کچھ خطا نہ تھی۔ اگر ہم سبق یاد کریں اور پھر بھی بھول جائیں تو ہم اُلو کیوں کر ہوئے۔

ہمارے اسکول کے ہیڈ مدرس منشی ارم سہائے کایستھ تھے اور نہایت ہی خطرناک آدمی تھے۔ ہم کو اچھی طرح یاد ہے کہ "منشی جی اس لڑکے کی ہڈی پسلی ہماری اور گوشت اور چمڑا تمہارا، اگر یہ لڑکا لائق نکلے۔" ظاہر ہے کہ اس خطرناک منشی جی کو ہمیں مارنے کوٹنے میں کیا تامل ہو سکتا ہے۔ جب ان کے حق میں گوشت اور پوست کا اس طرح ہبہ کر دیا جائے۔

ہر سال ہمارے فیل ہونے پر منشی جی ہمیں کوٹ کوٹ کر درست کرتے تھے۔ لیکن سب سے بڑی مصیبت فیل ہونے سے ہمارے اوپر یہ نازل تھی کہ ہماری شادی۔ محض اسی وجہ سے رکی ہوئی تھی کہ ہم فیل ہو ہو جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ ہماری نالائقی مشہور ہوئی جا رہی تھی۔ اور ہم کو اندیشہ تھا کہ کہیں خطرناک صورت اختیار نہ کرے۔

ہمیں سب سے زیادہ ڈر اس کا تھا کہ ہماری منگیتر اور محبوبہ کی اسی گڑبڑ اور نالائقی کے چکر میں کہیں دوسری جگہ شادی نہ ہو جائے۔ کیوں کہ ہم کو پھر ایسی لڑکی ملنا ناممکن تھی۔ یہ لڑکی ہمارے گاؤں کے سب سے بڑے پٹواری کی لڑکی تھی، جو ہمارے پڑوسی تھے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمارے ساتھ کی کھیلی ہوئی تھی اور دونوں کے دل ملے ہوئے تھے۔ جب ہم خیال کرتے تھے

کہ اس فیل ہونے کی وجہ سے ہماری منگیتر چھن جائے گی تو ہمارا مارے فکر کے بُرا حال ہو جاتا تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر ہم کیا ترکیب کریں، جو پاس ہوں۔ اب چوتھی مرتبہ امتحان کی تیاری کرنا تھی۔ وہی مضامین اور وہی سب کتابیں رہ رہ کر سوچتے تھے کہ الٰہی ہم کیا تدبیر کریں، جو پاس ہوں۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ ہم اس خلجان میں پڑے ہوئے اپنی قسمت پر رو رہے تھے کہ ہمارے گھر کی اور پڑوس کی تمام عورتیں کسی دوسری جگہ ایک موت میں گئیں۔ ہم چھت پر چڑھ گئے اور اپنی دیوار پر چڑھ کر دوسرے مکان کی چھت پر آہستہ سے کودے چپکے چپکے رینگتے ہوئے سامنے دیوار کے پاس پہنچے۔ اُسے پار کر کے اپنی سسرال کی چھت پر پہنچے جھکے جھکے چھجے کے پاس پہنچ کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ایک لڑکی برآمدے میں بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ ہم محو دیدار تھے، کیوں کہ یہی ہماری منگیتر یا منسوبہ بیوی تھی۔ ہم نے آہستہ سے سیٹی بجا کر اس کو اپنی طرف مخاطب کیا۔ اس نے ہم کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا اور دوڑ کر دروازے کی کنڈی لگا دی۔ ہم جھٹ سے نیچے اُتر آئے اور بے اختیاری کے عالم میں اس کے ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کر رونے لگے۔ سب سے پہلے تو اس نے ہمارے پٹنے پر اظہارِ غم کیا اور پھر ہمدردی کی۔ اور پھر اس کے بعد ہماری ہمت بڑھائی اور اطمینان دلایا کہ اب کی مرتبہ ضرور پاس ہو جاؤ گے۔ ہم نے کہا کہ اب ہمارے بس کی بات نہیں کہ جو ہم اس مہم کو سر کر سکیں یا اس بارِ گراں کا ذمہ لے سکیں۔

بڑی بڑی تدبیریں سوچیں، مگر امتحان سے کوئی مفر کی صورت نظر نہ آئی۔ مگر کسی نے کہا ہے:

دو دل یک شود بشکند کوہ را

دو رُخ لڑیں اور کوئی تدبیر نہ نکلے! یہ ناممکن ہے۔ سوچتے سوچتے یکا یک ہماری منسوبہ کو خیال آیا اور اس نے وہ تجویز پیش کی کہ ہم مارے خوشی کے اُچھل پڑے۔ یہ واقعہ تھا کہ شہر کے بڑے شاہ صاحب نے اس کی ماں کو ایک ایسا وظیفہ بتایا تھا کہ وہ ہارا ہوا مقدمہ جیت گئی تھیں۔ ہم نے شاہ صاحب کا پورا نام و پتا معلوم کیا اور دل میں ٹھان لی کہ ضرور ان شاہ صاحب کے محض ایک وظیفے میں یہ امتحان کی مشکل حل ہو جائے گی تھوڑی دیر بعد ہم خوش خوش رخصت ہوئے۔ کامیابی کی اُمید دل میں ایک جنگ پیدا کر رہی تھی۔

شاہ صاحب نے سب سے پہلے تو ہمیں مرید کیا۔ اور اس بکھیڑے میں ہمارے پانچ روپے خرچ ہوئے، جو ہمیں چلتے وقت ہماری منگیتر نے دیے تھے۔ کیوں کہ وہ رئیس کی بیٹی تھی اور ہمارے پاس کوڑی نہ تھی۔ جب ہم نے شاہ صاحب سے اپنی مشکل بیان کی تو انہوں نے مسکرا کر کہا، ”ابھی کیا جلدی ہے۔ جب امتحان قریب آئے تو ہمارے پاس آنا۔“

سال بھر ہمارا بُری طرح گزرا۔ منشی جی بات بات پر ہمیں مارتے تھے اور ہڈی پسلی ایک کیے دیتے تھے۔ چوں کہ شاہ صاحب کے پاس ہم جب کبھی جاتے۔ اپنی کامیابی کا اور بھی پختہ یقین ہو جاتا۔ لہٰذا قدرتاً پڑھنے کی طرف کم توجہ ہوتی اور نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ اور بھی پٹتے۔ اس سال ہم ضرورت سے زیادہ پٹ رہے تھے حتیٰ کہ تنگ آ کر ہمیں شاہ صاحب سے پٹنے سے بچنے کا ایک تعویذ لینا پڑا۔ اس تعویذ نے ہمیں اور بھی پڑھنے سے باز رکھا اور نتیجہ یہ نکلا کہ اتنے پٹنے لگے کہ ہم سمجھے کہ تعویذ شاہ صاحب نے کہیں غلطی سے اُلٹا تو نہیں دے دیا۔ چنانچہ ہم نے تعویذ کھول کر الگ رکھا اور ذرا پڑھنے کی طرف توجہ کی۔ تب جا کر کہیں مار پڑنا کم ہوئی۔ دراصل ہم پٹتے وقت دل میں کہا کرتے کہ خیر مار لو اَب آئندہ سال تو ہم پاس ہو ہی جائیں گے۔

جب ہمارے امتحان کے دو مہینے رہ گئے، تو ہم شاہ صاحب کے پاس گئے۔ انہوں نے ہم سے کہا کہ تم چوالیس روز کا جلالی چلہ کھینچو۔ پوری تفصیل چلے کی ہمیں تلقین کی گئی۔ یہ چلہ ایک تنہا مکان میں کھینچا جانے کو تھا اور اس لیے ہمیں بیس روپے کی ضرورت ہوئی۔ جو ہم نے اپنی منسوبہ سے لیے۔

ہم گھر سے ایک دم سے ایسے غائب ہوئے کہ گاؤں بھر میں سوائے ہماری منسوبہ کے کسی کو پتا تک نہ چلا کہ آخر ہم ہوئے کیا۔ ہم نے شہر میں جا کر سر گھٹایا۔ ایک مکان چھوٹا سا سنسان سی گلی میں کرائے پر لیا اور چالیس دن کی خوراک کے لیے جو پسوا کر ساتھ لیے۔ ایندھن بھی کافی رکھ لیا۔ چالیس دن تک ہم سوائے جو کی روٹی کے کچھ نہ کھا سکتے تھے۔ ایک بہشتی کو ہم نے لگا لیا اور اس سے طے کر لیا کہ وہ تیسرے دن پانی بھر جایا کرے اور جمعے کے جمعے نائی بلا لیا کرے، کیوں کہ سر گھٹانا اس میں سخت ضروری تھا۔ ہم چلہ شروع کرنے سے قبل شاہ صاحب سے ایک مرتبہ اور ملے اور انہوں نے ہمیں سب ترکیبیں دوبارہ تلقین کرنے کے بعد کچھ جنات کا بھی حال سنایا۔

ہم بسم اللہ کر کے مکان میں داخل ہوئے اور اپنے ہم راز بہشتی کو تالا اور کنجی دی کہ مکان میں

باہر سے تالا ڈال دے، تاکہ کسی کو شبہ تک نہ ہو اور لوگ بھی سمجھیں کہ مکان خالی ہے۔ اندر پہنچ کر ہم نے زمین صاف کی اور اس کو لیپا پوتا۔ پھر صاف چونے سے تین حصار بناتے۔ یعنی کنڈلیاں یا حلقے جن کو اصطلاح میں حصار کہتے ہیں۔ ایک سب سے بڑا اور اس کے اندر ایک اس سے چھوٹا۔ اور اس کے اندر ایک سب سے چھوٹا، جو سب سے چھوٹا تھا۔ اس کے اندر ہم نہا دھو وضو کر کے ر جھکا کر بیٹھ گئے اور ’یا بدوح‘ کا جلالی وظیفہ شروع کر دیا۔

ہمارا وظیفہ بڑے مزے میں جاری تھا۔ تین دن کی روٹی ہم ایک روز پکا لیتے۔ دن اور رات ہمارا وظیفے میں گزرتا۔ جب نیند آئی تو حصار کے اندر ہی سو جاتے۔ ہر وقت باوضو رہتے۔ سوائے اوقاتِ مقررہ اور ضروریات کے حصار سے باہر نہ نکلتے تھے۔ بہشتی آتا اور چپ چاپ پانی بھر کر چلا جاتا اور نائی بھی اسی طرح سر مونڈ کر چلا جاتا۔ بات چیت کی سخت ممانعت تھی اور ہم اشاروں ہی ے کام لیتے تھے۔ دنوں کے شمار کے لیے روزانہ اُٹھ کر دیوار پر کوئلہ کا ایک نشان بنا دیتے تھے۔

جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے، ہمارا قلب روشن اور منوّر ہوتا جاتا تھا۔ دو تین دن شروع شروع میں رات کو تو ہمیں کچھ ڈر بھی لگا، کیوں کہ چاروں طرف سناٹے کا عالم ہوتا تھا اور ہم تن تنہا کڑوے تیل کے چراغ کی دھیمی روشنی میں اپنا جلالی وظیفہ پڑھتے ہوتے تھے۔ لیکن اب ڈر مطلق نہ لگتا تھا، بلکہ رات کا سناٹا دل کو اور قوتِ روحانی پہنچاتا معلوم ہوتا تھا۔

ابھی تک ہم کو جنات وغیرہ سے سابقہ نہ پڑا تھا، لیکن ہم ان کے لیے بھی تیار تھے۔ ایک روز ایک چھپکلی اس گستاخی سے ہمارے بالکل قریب آئی کہ ہمیں کچھ شبہ سا ہوا۔ چوں کہ شاہ صاحب نے ہم سے کہہ دیا تھا کہ جنات جانوروں کی شکل میں بھی ممکن ہے کہ آئیں۔ لہٰذا ہم نے جونہی ایک عمل پڑھ کر اس کی طرف دم کیا تو اس چھپکلی کو بھاگے ہی بن پڑا۔

ناظرین کو معلوم ہی ہے کہ ہم گھر سے اس طرح غائب ہوئے تھے کہ جیسے گدھے کے سر سے سینگ ہمارے غائب ہو جانے پر ہمارے والد صاحب اور چچا اور منشی جی نے بہت کچھ ڈھونڈا، مگر نہ پایا۔ منشی جی کا خیال تھا کہ جب امتحان کے دو مہینے رہ جائیں گے تو ہمارے اوپر خاص محنت اور توجہ کی جائے گی۔ ان حضرت کی توجہ اور محنت سے خدا ہر طالب علم کو بچائے، کیوں کہ ان کی توجہ کے معنی یہ تھے کہ لڑکے کو گھر پر رکھ کر دن رات مار مار کر ایسا پڑھاتے تھے کہ اس کو دنیا اندھیر معلوم ہونے لگتی تھی۔ اب کی مرتبہ یہ نوبت ہمارے ساتھ بھی آنے والی تھی۔ ہماری والدہ کا ہفتہ بھر کے

بعد ہی بُرا حال ہوگیا۔ اور انہیں یقین کامل ہوگیا کہ منشی جی کی سخت گیری سے تنگ آ کر ہم نے موت کو لبیک کہہ ڈالا۔ لہٰذا انہوں نے وہ واویلا مچایا کہ گھر سر پر اُٹھا لیا۔ منشی جی کو ہماری اماں جان کی واویلا کی تو خاک بھی پروانہ ہوتی ہوگی۔ ان کو تو محض یہ فکر تھی کہ ہم کسی طرح ہاتھ آ جائیں تو امتحان قریب ہے ذرا مرمت اور پڑھائی سخت کی جائے۔ مگر ہم ایسے گوشہ نشین ہوئے تھے کہ پولیس میں رپورٹ لکھانے کا بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا۔

ہم سے شاہ جی نے کہا تھا کہ ممکن ہے تم کو دورانِ چلہ کشی میں جنات ستائیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ جنات دن کو بھی آ سکتے ہیں اور رات کو بھی کبھی تو جانوروں کی شکل میں آتے ہیں اور کبھی دوستوں یا عزیزوں کا بھیس بدل کر آتے ہیں اور طرح طرح کی حرکتیں کرتے ہیں۔ لیکن مقصد ان کا یہ ہوتا ہے کہ وظیفہ خراب کر دیں۔ کبھی تو وہ دھمکیاں دیتے ہیں اور کبھی ڈراتے ہیں، مگر نقصان کسی طرح بھی اس وقت تک نہیں پہنچا سکتے جب تک کہ حصار کھینچے ہوں۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جنات کئی طرح کے ہوتے ہیں، جو زیادہ خبیث ہوتے ہیں اور بُری بُری ڈراؤنی شکلیں بناتے ہیں وہ تو تین حصاروں میں سے ایک کے اندر بھی نہیں آ سکتے۔ آنا تو در کنار اگر کہیں لکیر پر بھی پیر پڑ جائے تو جل کر راکھ ہو جائیں۔ دوسری قسم جنات کی وہ ہے، جو پہلے اور دوسرے حصار کے اندر آ سکتے ہیں، مگر تیسرے حصار میں نہیں آ سکتے۔ لیکن تیسری قسم جنات کی وہ ہے کہ جو عزیزوں اور دوستوں کی شکل میں آتے ہیں اور گو سب نہیں۔ لیکن بعض، چوں کہ ان میں سے خود عامل اور چلہ کش ہوتے ہیں۔ لہٰذا تیسرے حصار میں بھی بسا اوقات قدم رکھ دیتے ہیں۔ اور ایسی صورت میں شاہ صاحب نے ہمیں ایک علیٰحدہ عمل بتایا تھا کہ جب ایسا ہو تو جلدی سے تیسرے حصار کے اندر اپنے گرد ایک چوتھا حصار انگلی سے کھینچ کر عمل پڑھ کر جنات کی طرف پھونک دینا اور وہ دفع ہو جائیں گے۔

ہمارا وظیفہ اب قریب الختم تھا اور مہینہ بھر سے زائد ہو چکا تھا۔ سوائے اس جن کے جو ہمارے پاس چھپکلی کی شکل میں آیا تھا اور کوئی جن یا بھوت نہیں آیا۔

جمعے کا متبرک دن تھا۔ ہم نے اُٹھ کر دیوار پر انتالیسویں لکیر کھینچی۔ کل چالیسواں دن چلے کے ختم کا اور دعا کا تھا کہ چلے سے فارغ ہو کر جو دعا بھی ہم مانگیں گے وہ قبول ہوگی۔ اب ہم یہ سوچ رہے تھے کہ کیوں نہ کوئی دوسری دعا بھی اس میں شامل کر لیں۔ مگر پھر خیال آیا کہ شاہ صاحب

نے کہا تھا کہ محض ایک دعا کے لیے چلہ کھینچا جاتا ہے اور گو کہ کئی دعائیں ایک ساتھ ملا لینے میں مضائقہ نہیں، مگر اندیشہ ضرور ہوتا ہے۔ کیوں کہ دعا صرف ایک ہی قبول ہوتی ہے۔ بہت پس و پیش کے بعد ہم نے یہ طے کیا کہ ہم دو دعائیں مانگیں گے۔ ایک تو پاس ہونے کی اور دوسری اپنی منگیتر ے نکاح کی۔ خواہ کوئی بھی قبول ہو بات ایک ہی تھی۔

غرض ہم نے اس جمعہ کے دن سر گھٹوایا، نہائے دھوئے اور خوش خوش اپنا وظیفہ شروع کر دیا۔ اب گویا سارے بدن کی سوئیاں نکل گئی تھیں اور صرف آنکھوں کی باقی رہ گئی تھیں۔

جلال کا وقت تھا یعنی دن چڑھ رہا تھا اور دراصل تمام جلالی وظیفوں میں اسی مخصوص وقت میں نزول جلال باری ہوتا ہے اور وظیفہ بھی زوروں پر ہوتا ہے۔ غرض بھئی جلال کا وقت تھا کہ دوپہر کا وقت قریب پہنچا۔ ہم اپنے وظیفے میں ایسے محو تھے کہ تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ اس سناٹے کے عالم میں ایک دم سے ہمارے کانوں میں آواز آئی، ”کیوں بے! یہ کیا ڈھکوسلہ؟“ ہم نے چھت کی طرف دیکھا اور کچھ نہ پایا تو ہمارے کان کھڑے ہوئے۔ جن آگئے۔ ہم نے دل میں کہا۔ پھر آواز آئی۔ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ منشی رام سہائے سامنے مکان کی دیوار پر کھڑے ہیں۔ ہم جان گئے کہ جن آگئے اور ہم نے اپنی تسبیح کو ذرا تیزی سے گھمانا شروع کیا اور بجائے جواب دینے کے ہم دیوار کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ والد صاحب بھی دیوار پر آموجود ہوئے۔ ہم برابر وظیفہ پڑھ رہے تھے، مگر دل میں ہم ضرور ہنسے کہ جنات ہمیں الّو بناتے ہیں۔ بھلا ہمارا کر بھی کیا سکتے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ جنات تیسری قسم کے ہیں، جو عجب نہیں کہ ہمارے حصار میں گھس آئیں۔ منشی رام سہائے ضعیف آدمی تھے اور جب انہوں نے دو تین اور ڈانٹیں دیں اور ہم نے کچھ نہ سنا تو وہ دیوار پر چل کر پاخانے کے پاس پہنچے اور وہاں سے اُترنے لگے۔ ہم نے دل میں کہا کہ منشی رام سہائے کا بھیس تو بیشک اس جن نے لاجواب بدلا ہے کہ آواز تک ہو بہو ملا دی ہے، مگر اس نے یہ نہ سوچا کہ بھلا ایک ضعیف آدمی کیوں کر اس طرح دیواروں پر تیزی سے چل سکتا ہے۔ قصہ مختصر یہ دونوں جنات جو منشی رام سہائے اور ہمارے والد کا بھیس بدلے ہوئے تھے۔ پاخانے میں سے اُتر کر ہمارے قریب آ کھڑے ہوئے، مگر ہم اسی طرح برابر وظیفہ میں مشغول تھے۔ ہم بڑے غور ے منشی رام سہائے والے جن کو دیکھ رہے تھے، جو کوئی شرارت کا پہلو نکالنے کی تیاری کرتے ہوئے دوسرے جن کو دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ اگر ہم دل میں کہہ رہے تھے کہ حضرت ہم آپ کے لیے

تیار ہیں۔

ہمارے دیکھتے دیکھتے منشی جی کی شکل والے جن نے ایک دم سے ہنسنا بند کیا اور زور سے ڈپٹ کر کہا، ”نالائق“ اور یہ کہہ کر ”ابے پاجی“ کہتے ہوئے حصار میں قدم رکھ دیا۔ چشم زدن میں دوسرے حصار کو پار کر کے تیسرے میں قدم رکھا ہی تھا، ہم جان گئے کہ یہ قطعی تیسری قسم کا چلہ کش جن ہے اور چھوٹے حصار میں گھس آئے گا۔ ہم نے پھرتی سے انگلی سے خاص چوتھا حصار بنایا اور عمل شریف پڑھ کر اس گستاخ جن کی طرف جو منہ بڑھا کر پھونکا تو ہمارے بائیں گال پر اس زور سے کوئی 80 نمبر کا چانٹا پڑا کہ ہمارا منہ پھر گیا۔ ہم کچھ سوچنے بھی نہ پائے تھے کہ ہمارا کان اس خطرناک جن کے ہاتھ میں تھا اور ہماری تازہ گھٹی ہوئی کھوپڑی پر منشی رام سہائے کا جوتا بج رہا تھا۔ تڑاتڑ، تڑاتڑ دو تین جوتوں تک تو ہم یہی سمجھے کہ جن مار رہا ہے، یہ سلسلہ دیر تک بند نہیں کیا، مگر جوتا اس زور سے پڑ رہا تھا کہ فوراً حقیقت آشکارا ہو گئی۔ یعنی بڑی بُری طرح اصلی رام سہائے ہماری تاجپوشی کر رہے تھے اور برابر یہ کہہ رہے تھے کہ ”تو نے مجھ کو بدنام کیا۔ امتحان کے زمانے میں بھاگ آیا۔ یہ سب تیرے نالائق باپ کی خطا ہے۔ آج تجھ کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔ آخر یہ تو کیا کر رہا تھا۔“ وغیرہ وغیرہ۔ قصہ مختصر منشی رام سہائے نے تھوڑی ہی دیر میں ہمارا وہ حال کر دیا کہ بیان سے باہر ہے۔ جب انہوں نے خوب جی بھر کر پیٹ لیا اور ہمیں مارتے مارتے پیٹتے پیٹتے پڑا کر دیا، جب جا کر کہیں چھوڑا۔ ہم کھڑے ہاتھ جوڑے رو رہے تھے اور اِکا دُکا چانٹا پڑتا جاتا تھا اور سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔

ہمیں بہشتی کا نام اور پتا بتانا پڑا، جس کے پاس کنجی تھی۔ دروازے پر یکے والا موجود تھا، جو کواڑ کی دراڑ میں سے جشنِ تاجپوشی دیکھ رہا تھا۔ وہ بہشتی کے پاس سے کنجی لایا اور ہم یکے پر بیٹھ کر گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔

بعد میں ہم کسی نہ کسی طرح پاس تو ہو گئے، لیکن کچھ بھی ہو، ہماری صلاح ہے کہ اگر کوئی صاحب جلالی چلہ کھینچیں تو خدا کے واسطے جنات آنے پر تو کم اَز کم عمل پڑھ کر پھونکتے وقت اپنا منہ ذرا فاصلے ہی پر رکھیں، ورنہ اس زور سے چانٹا پڑے گا کہ اس کا اثر قیامت تک باقی رہے گا۔

◆ ◆

کیسے نبھائیں کماؤ بیوی سے؟

مرزا محمود بیگ

لڑکے لڑکی کا جب بیاہ ہوتا ہے تو سب دوست رشتے دار اور ہمدرد ایک ہی دعا مانگتے ہیں کہ ان کے دل ملے رہیں اور زندگی بھر آپس میں نبھاؤ ہے۔ شادی نام ہے نبھاؤ گا۔ اگر نبھاؤ نہ ہو تو شادی نہیں بربادی ہے۔ روز روز کی کِل کِل سے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ دنیا دونوں کے لیے دوزخ ہو جاتی ہے۔ زندگی سے اتنے تنگ ہو جاتے ہیں کہ زندگی کے مقابلے میں موت اچھی معلوم ہوتی ہے اور کچھ تو اتنے بیزار ہوتے ہیں کہ خودکشی کر کے چھٹکارا پاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ نبھاؤ کی دعائیں مانگی جاتی ہیں اور لڑکے لڑکی کو آپس میں نباہ قائم رکھنے کی نصیحتیں کی جاتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ یہ نباہ بہت آسان تھا۔ جب سے انسان نے ہوش سنبھالا مرد کی حکومت تھی۔ جب غاروں میں جنگلوں میں، پہاڑوں میں رہتا تھا تو مرد جنگل کے جانوروں کا شکار کرتا تھا۔ عورت کھالوں کے کپڑے بناتی تھی۔ عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرنا، اُن کے لیے خوراک مہیا کرنا۔ یہ کام مرد کا تھا اس لیے حکم بھی اسی کا چلتا تھا۔

جب جنگل نہ رہے، جنگلی جانور نہ رہے۔ گاؤں بسے اور شہر بسے، شکار کی جگہ کھیتی باڑی نے لی۔ تب بھی جفاکشی کے کام مرد کے تھے۔ ہل چلانا، بیج بونا، کنواں چلانا، پانی دینا، فصل کاٹنا، اناج منڈی میں لے جانا، روٹی کپڑے کے لیے پیسے کمانا۔ یہ سب کام مرد کے تھے اور اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو گھر چل نہیں سکتا۔ اس لیے جب کھیت پر اس کی بیوی روٹی ساگ اور لسی پہنچاتی تھی یا گھر میں اس کے سامنے دودھ، مکھن، پراٹھے، رابڑی رکھتی تھی تو وہ مونچھوں پر تاؤ دیتا جاتا تھا اور کھاتا جاتا تھا۔ بیوی الگ بیٹھی دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی تھی اور دل ہی

دل میں دعا مانگتی تھی کہ اس کا سہاگ بنا رہے۔ اس کا کماؤ جیتا رہے۔ وہ اس کی خدمت کر کے اس دنیا میں بھی سکھی رہے اور اس دنیا میں بھی۔

زمانہ اور آگے بڑھا۔ کھیتی کیاری رہی۔ مگر اَب کارخانے، ملیں، دکانیں، دفتر بہت ہو گئے۔ مرد اَب بھی کماؤ تھا۔ مہینہ بھر محنت کرتا، تنخواہ لاتا، بیوی کے ہاتھ میں دیتا اور پھر سارے مہینے پیٹ بھر روٹی کھانے اچھے کپڑے پہننے اور آرام سے زندگی بسر کرنے کو اپنا حق سمجھتا۔

بیوی بھی جانتی تھی کہ کماؤ کون ہے اور خدمت کس کا فرض ہے۔ اگر میاں دیر سے آتا یہ بیٹھی انتظار کرتی۔ وہ بہت کہتا۔ اجی تم کھا لیا کرو نا۔ مگر جواب ملتا، کیسے کھا لوں تمہیں نہ دیکھ لوں تو حلق سے نوالہ نہیں اُترتا۔

یہ حضرت دل ہی دل میں خوش ہوتے کہ کتنی قدر ہے ان کی اور پھر جب ان کی بیوی جلدی سے چولھا جلا کے ان کے لیے گرم گرم پھلکے اُتارتی اور زیادہ زیادہ گھی لگا کر ان کو دیتی جاتی تو ان کی نگاہوں سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ بیوی کی کتنی قدر کرتے ہیں اور اس سے کتنی محبت کرتے ہیں اور جب وہ نہایت محبت کے لہجے میں کہتی۔ اجی ابھی کھایا ہی کیا ہے۔ لو یہ ایک پھلکا اور گرم گرم لے لو۔ دن بھر کام میں خون پسینہ ایک ہوتا ہے۔ آخر کھاؤ گے نہیں تو...

خوشی کے مارے ان کی بھوک اور کھلتی اور یہ ایک پھلکا ہی نہیں، بلکہ دو تین تر ترے پھلکے اور کھاتے اور سچے دل سے کہتے۔ اجی تم سچ مچ میں دیوی ہو۔ میری قسمت ہی اچھی تھی کہ تم...

دیوی کا لفظ سننا تھا کہ خوشی کے مارے ان کی باچھیں کھل گئیں اور انہوں نے شرما کر کہا اجی بس رہنے بھی دو۔ بھاگ تو میرے ہی اچھے تھے اور اسی لیے میں کروے چوتھ کا برت پابندی سے رکھتی ہوں کہ اگلے جنم میں بھی...

اب آپ ہی بتائیے جہاں یہ باتیں ہوں وہاں نبھاؤ کیسے مشکل ہو سکتا ہے۔ ایک کماؤ ہے۔ اَن داتا ہے۔ دوسری دیوی ہے۔ خدمت کرنے میں پوری ہے۔ دونوں کے لیے چین ہی چین لکھا ہے۔

مگر زمانے کو بھی قرار نہیں۔ اسکول کھلے، کالج کھلے، لڑکوں نے پڑھا، لڑکیوں نے پڑھا۔ پھر دونوں سے حکومت کرنے والے چنے جانے لگے اور ووٹ مرد اور عورت دونوں کی برابر۔ جب

ووٹ برابر تو حقوق برابر۔ جب حقوق برابر تو نوکریاں برابر۔ کام برابر۔ مرد کماتے ہیں تو عورتیں کیوں نہ کمائیں۔ اور مہنگائی کی وجہ سے نئی نئی ضرورتوں کی وجہ سے جب مرد نے دیکھا کہ اس کی تنخواہ کافی نہیں تو اُس نے ایسی لڑکی کو پسند کیا، جو خود بھی کماتی ہو اور تنخواہ لاتی ہو تا کہ دونوں کی تنخواہ ل کر اچھا گھر لیا جا سکے نوکر رکھا جا سکے۔ ریڈیو، ریفریجریٹر وغیرہ زندگی کی ضرورتیں پوری کی جا سکیں۔

کماؤ بیوی سے شادی کر کے روپے پیسے کی ریل پیل ضرور ہو گئی، مگر ایک آدھ بات حکومت کرنے کے عادی مرد کو ذرا کھٹکی۔ پہلے جب مرد دفتر جانے کے لیے تیار ہوتا تھا تو اس کی خدمت گزار بیوی تولیہ صابن کا خیال رکھتی تھی۔ اِدھر یہ سنا کہ آئے اُدھر گرم گرم ناشتا اُن کے سامنے رکھا۔ کپڑوں پر استری کی۔ چلتے چلتے ان کو نہایت اچھا پان بنا کر دیا۔ دفتر سے جب یہ لوٹے ابھی کپڑے بدلنے نہ پائے تھے کہ گرمیوں میں شربت، جاڑوں میں چائے سامنے لا رکھی۔ اور پھر وہی گرم پھلکے اور خدمت۔

اب معاملہ دوسرا تھا۔ ادھر یہ تیار ہو رہے ہیں، اُدھر بیوی نے ڈریسنگ ٹیبل سے آواز دی۔ ”اجی ذرا چائے کا پانی رکھ دینا اور آج ذرا دیر ہو گئی ہے ذرا لگے ہاتھوں چائے بنا ڈالو۔“ ان کے کان کھڑے ہوئے۔ انہوں نے غور سے بیوی کی طرف دیکھا اور چپ چپاتے صرف چائے ہی نہیں بنائی، بلکہ پورا ناشتا تیار کر ڈالا۔ شام کو یہ لوٹے تو گھر سونا۔ بیوی ابھی دفتر سے واپس نہیں آئی ہیں۔ انہوں نے چائے تیار کی۔ کچھ بسکٹ وغیرہ کا انتظام کیا۔ ابھی شروع نہیں کیا تھا کہ بیوی آگئیں اور بہت خوشی اور محبت سے بولیں۔ کام ریڈ میں سوچتی آ رہی تھی کہ اگر اس وقت گھر جا کر چائے بنانی پڑی تو میں تو بس لیٹ جاؤں گی۔ اتنی تھک گئی ہوں، مگر کیا اچھی چائے بنائی ہے آپ نے۔ نہیں بسکٹ تو آپ ہی کھائے۔ میں تو چائے کی ایک پیالی اور لوں گی۔ آج رینو کا نے کھانا کیا ہے اگر بسکٹ کھاؤں گی بھوک ماری جائے گی۔ اچھا لو میں چلی۔ ٹا ٹا۔ اور ہاں رات کا پکا ہوا سالن ڈولی میں رکھا ہے۔ وہ لے لینا۔ اگر چاہو تو ایک آدھ انڈا تل لینا۔ ٹا ٹا۔

لیجیے صاحب وہ تو ٹا ٹا کر کے چلتی بنی۔ اب یہ آہستہ آہستہ چائے پیتے جا رہے ہیں اور اپنی حالت پر غور کرتے جا رہے ہیں۔

ایک لمحے کے لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے گا، مگر پھر ایک دم

سنبھلتے ہیں اور نبھاؤ کا وعدہ یاد آتا ہے۔ جب خدمت گزار بیوی سے نبھاؤ کیا تھا۔ اب کماؤ بیوی سے نبھاؤ کرنا ہے کیسے کریں۔

اگر یہ ذرا سمجھ سے کام لیں تو کماؤ بیوی سے نبھاؤ بہت آسان ہے۔ فقط ضرورت اس بات کی ہے کہ جتنے پُرانے وہم ان کے دماغ میں عورت کی خدمت اور مرد کی حکومت کے بارے میں ہیں اُن کو ذہن سے نکال دیں۔ زمانے کو سمجھیں، وقت کو پہچانیں۔ اور تعلیم نے، نئی سماج نے، نئے طریقوں نے مرد عورت کو جو نیا مرتبہ دیا ہے اُس کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد نبھاؤ کی کوشش کریں تو وہی محبت وہی پیار قائم رہے گا، جو پُرانے زمانے میں تھا۔

اگر یہ کماؤ بیوی کو اَب بھی وہی پرانی بیوی سمجھیں گے، جو اُن کی آنکھ کے اشارے پر چلتی تھی مصیبتیں اپنے پر جھیلتی تھی اور اُن کے سکھ دُکھ کا خیال رکھتی تھی۔ اُن کی خدمت ہی اپنا دھرم سمجھتی تھی۔ اور اپنی زندگی کا ہر لمحہ اُن کا حکم ماننے میں صَرف کرتی تھی۔ تو اُن کو بڑی مایوسی ہوگی۔

اگر یہ کماؤ بیوی کے نئے طور طریق نے دل میں یہ شبہ پیدا ہونے دیں گے کہ پچھلے زمانے کی عورتوں پر مردوں نے جو ظلم کیا ہے وہ اب اُس کے چن چن کر بدلے لے رہی ہے۔ خواہ مخواہ اُن سے کام لے کر اپنے کماؤ ہونے کا احساس دلا رہی ہے، اپنا رعب ڈال رہی ہے تو یہ بھی اُن کی بڑی غلطی ہوگی۔

یہ ٹھیک ہے کہ اُن کی کماؤ بیوی ان کی پہلے جیسی خدمت گزار حکم ماننے والی بیوی نہیں ہے اور اگر وہ چاہے بھی تو وہ نہیں ہوسکتی۔ وہ اب اُن کی ساتھی ہے اور یہ ناطہ محض بیوی کے ناطے سے بہتر ہے۔ وہ صرف گھر کی آمدنی بڑھانے میں ہی اُن کا ہاتھ نہیں بناتی، بلکہ وہ اُن کے فکر اور فیصلے میں بھی اُن کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ پہلے زمانے کی خدمت گزار بیوی سب فیصلے ان پر چھوڑتی تھی۔ کیوں کہ بھلا حاکم مرد کو فیصلہ کرنے میں محکوم بیوی کیسے مدد دے سکتی ہے اور وہ جس کے بارے میں یہ خیال کرلیا گیا ہو کہ اس کی عقل گدی کے پیچھے ہوتی ہے۔ اب یہ حال نہیں ہے۔ اب دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ دُکھ سکھ میں ہی نہیں، بلکہ فیصلہ اور مشورے میں بھی۔

ایسے بھی مرد ہیں، جو ابھی تک پرانے وہموں سے نہیں نکلے ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ اُن کی کماؤ بیوی کے اب بھی وہی فرض ہیں، جو سارے وقت گھر میں رہنے والی بیوی کے ہوتے تھے۔ وہ

اب بھی یہی چاہتے ہیں کہ جب صبح سویرے ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے سو کر اُٹھیں تو اُن کی بیوی خود اپنی تیاری کرنے کے علاوہ ناشتا تیار کرے اور توس میں مکھن بھی اپنے ہی ہاتھ سے لگا کر دے، جب شام کو یہ گھر آئیں تو اُن کی بیوی جو چند منٹ پہلے گھر پہنچی ہے۔ انہیں چائے بنا کر دے۔ رات کا کھانا بنائے انہیں کھلائے اور ان کی سیوا کا دَم اس طرح بھرے کہ اُن کو وہی پرانا مرتبہ دے حاکم کا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو اُن کو شکایت ہوتی ہے۔ ”کمانا کیا شروع کر دیا ہے سر ہی چڑھ گئیں لیجیے صاحب اب یہ آزاد ہیں۔ بھلا ایسا بھی کبھی ہوا ہے۔ عورت عورت ہے مرد مرد ہے۔ عورت کی کتی ہوتی ہے، مرد کی خدمت کر کے جہاں عورت پہلے خالی وقت گھر میں گزارتی تھی۔ اب کماتی ہے۔ مگر اُس کے اور فرائض اپنی جگہ ہیں۔ ہمیں یہ پسند نہیں ہے کہ عورتیں برابری کا دعویٰ کریں۔“

ان کو اپنی بیوی سے محبت ہے۔ پیار ہے، مگر اُن کا دل یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ اُن کی جب شادی ہوئی تھی اُن کی دلہن نے اُن کے پاؤں دھوئے تھے اور چرن امرت پیا تھا۔ یہ اب بھی گھر کے راجا ہیں۔ جب گھر میں داخل ہوتے ہیں، سینہ پھلا لیتے ہیں، گردن اکڑا لیتے ہیں، ٹھوڑی ذرا آگے نکال لیتے ہیں، بالکل اُس مرغے کی طرح جو مٹک مٹک کر چلتا ہے اور سب مرغیوں کو جتا دیتا ہے کہ خود وہ ایک مرغ ہے اور باقی سب محض مرغیاں ہیں۔ اُن کی بیوی بھی ایک کمزور، پابند، محکوم چیتی ہے ایسا خیال اُن کو ورثہ میں ملا ہے۔ بھلا یہ اب بیوی کو ساتھی کیسے مان لیں۔ کماؤ ہو یا بے کماؤ۔

مگر اُن کو یہ نہیں معلوم کہ کماؤ بیوی کے ساتھ نبھاؤ کرنے کے لیے اُن کو اپنے پرانے خیال چھوڑنے پڑیں گے، نہیں تو دونوں کو تکلیف ہوگی۔ اُن کی کماؤ بیوی اگر طبیعت کی خاموش ہے اور شوہر سے جھگڑنا بُرا سمجھتی ہے تو وہ 48 گھنٹے کے کام 24 گھنٹے میں کرنے کی کوشش کرے گی اُف نہ کرے گی، مگر کب تک۔ آخر قدرت کے قانون اس کے دل و دماغ اور جسم پر بھی لاگو ہوتے رہیں اور بہت جلدی وہ دن آئے گا جب یہ تھک جائے گی، بیمار ہوگی، مر جائے گی۔ بھلا یہ کیسا نبھاؤ ہوا کہ نبھانے میں جان گئی۔

اگر وہ خاموش نہیں ہے، اگر وہ بھی منہ میں زبان رکھتی ہے، اتنی دبی دبائی نہیں ہے، بلکہ جو دل میں آیا کہہ دیتی ہے تو پھر گھر میں وہ مزے دار چٹ پٹ ہوگی کہ انسان دیکھا کرے، بلکہ سنا

کرے۔ ہر بات پر تُو تُو مَیں مَیں۔ اور خدانخواستہ بچے ہوئے تو بس کچھ نہ پوچھو۔ یہ نبھاؤ نہیں لڑائی ہے۔ اور لڑائیاں ہوتی ہیں چار سال کی، چھ سال کی، مگر یہ عمر بھر کی لڑائی ہے۔ اور یہ زندگی نہیں، عذاب ہے۔

شادی کرنا شاید اب آسان ہے، مگر شادی نبھانا مشکل ہے جب تک میاں بیوی اور خاص طور پر کماؤ میاں اور کماؤ بیوی دونوں یہ فیصلہ نہ کرلیں کہ ہمیں نبھانا ہے۔ زندگی ایک گاڑی ہے، جس میں یہ دونوں جوتے گئے۔ جوا دونوں کی گردن پر ہے۔ اگر ایک بھی پیچھے رہ گیا یا پیچھے کر دیا گیا تو گاڑی رُک جائے گی اور اگر دونوں بیلوں نے ایک دوسرے کو سینگ مارنا شروع کیے تو نہ بیلوں کی خیر ہے، نہ گاڑی کی۔ یا یوں سمجھیے کہ گاڑی ایک کشتی ہے، جس کو میاں بیوی دونوں مل کر کھیتے ہیں۔ اگر چپو ایک ہی طرف سے چلایا گیا اور دوسری طرف کا کھینے والا خالی رُکے یا خالی ہاتھ کر دیا گیا تو کشتی ایک طرف کو مُڑ جائے گی اور بھنور میں پڑ جائے گی۔ اور اگر کشتی کھینے والوں نے اپنے چپوؤں کو کشتی کھینے کے لیے نہیں، آپس میں لڑنے کے لیے استعمال کیا تو پہلے کشتی ڈگمگائے گی اور پھر دونوں کو ساتھ لے کر ڈوب جائے گی۔

گھر اُس ہی وقت تک گھر ہے، زندگی اس ہی وقت تک زندگی ہے جب تک میاں بیوی مل کر ایک دوسرے کو سمجھ کر، ایک دوسرے کے ساتھی بن کر رہیں۔ ہر زمانے کی ضرورتیں الگ ہوتی ہیں۔ ہر زمانے کا مزاج الگ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں اگر کماؤ بیوی یہ سمجھے کہ وہ کماتی ہے اس لیے ایسا انوکھا کام کرتی ہے، جو عورت ذات نے پہلے کبھی نہیں کیا۔ اس لیے اب اُس کی خدمت ہونی چاہیے تو بڑے سخت دھوکے میں ہے۔ پہلے زمانے کی عورت مانا کہ دفتر کی نوکری نہیں کرتی تھی، مگر محنت مشقت کے کام آج کل کی کماؤ بیوی سے زیادہ کرتی تھی۔ صبح کے تڑکے سے پہلے یہ گھمر گھمر چکی چلاتی تھی۔ پھر دہی بلوتی تھی کہ دوپہر کی روٹی کے لیے مکھن اور لسی تیار ہو سکے۔ گھر صاف کرنا، روٹی بنانا اور پھر پانی کی چھاگل لے کر کنویں سے پانی لانا، چلچلاتی دھوپ میں کھیت پر روٹی لے جانا، واپس آن کر سوت کاتنا اور رات کے لیے روٹی بنانا۔ یہ سب کام کرتی تھی، مگر اعلان نہیں کرتی تھی۔ ایک آدھ دفعہ پِٹ بھی لیتی تھی اور اُسے بھی شوہر کی محبت کا ایک اظہار سمجھ کر خوش ہو لیتی تھی۔

وہی عورت اب چکی نہیں پیستی، وہی نہیں بلوتی، کنوئیں پر سے پانی نہیں لاتی، بلکہ کارخانے میں کام کرتی ہے یا دفتر میں کام کرتی ہے۔ تو شوہر کا ہاتھ بٹانے کا یہ محض نیا طریقہ ہے اور انوکھی بات نہیں ہے، جس کی وجہ سے نئی آزادی اور نئے حقوق حاصل ہوں۔

مرد کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ اب اَن پڑھ اُجڈ بیوی کے ساتھ واسطہ نہیں ہے۔ ایسا ساتھی جو گھر میں اپنے سلیقے سے بھی اور اپنی خوش مذاقی، خوش گوئی سے بھی لطف پیدا کرتا ہے اور صرف اتنا چاہتا ہے کہ اُسے ساتھی سمجھا جائے۔

اگر کماؤ میاں اور کماؤ بیوی صرف اتنی سی بات سمجھ لیں تو زندگی میں اُن کے لیے بھی چین ہی چین لکھا ہے۔ خوب گزرے گی، جو مل بیٹھیں گے۔ کماؤ دو۔

* *

نکلے جو دانت نکلوانے!

محمد افضل خان

شام کا وقت تھا، ہم لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ ہم شاید شازی کی جھیل سی آنکھوں میں غوطہ زن ہو کر اپنے ماضی کے حسین مناظر تلاش کر رہے تھے۔ گلاب جامنوں سے بھری طشتری میز پر سجی تھی اور سجی سجائی شازی اپنی مدھم مدھم سرگوشیوں اور ہلکی ہلکی ہنسی سے کانوں میں شہد ٹپکا رہی تھی۔ اتنے میں رحمت نے ہماری پسندیدہ ڈش یعنی گرم گرم شامی کباب لا کر میز پر رکھ دیے اور چند ہی ساعت بعد شازی کی پسندیدہ کھٹی میٹھی چٹنی کا پیالہ بھی میز پر آرونق افروز ہوا۔

اِدھر کباب میز پر پہنچے اُدھر ہمارے دانت میں ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا۔ یوں تو شازی سے [illegible] ہی کچھ اور ہے۔ اسباب کا تو علم نہ تھا، لیکن ہم گزشتہ کئی دن سے اس درد میں مبتلا تھے۔

درد ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ گیا، تو شازی بولی، ”یہ آپ گنگنا رہے ہیں یا رو رہے ہیں؟“

وہ پگلی شاید اپنے آپ کو ابھی تک اُسی رومانوی ماحول میں پا رہی تھی۔ مگر دانت کے درد نے ہمیں اذیتوں کی انتہائی گہرائی میں دھکیل دیا تھا اس سے پہلے کہ غصے میں شازی کو کوئی سخت سا جواب دیتے، وہ خود ہی حالات کو سمجھ گئی اور بے قراری سے بولی، ”پھر دانت میں درد شروع ہو گیا کیا؟ کئی بار کہا ہے آپ سے کہ اس قدر میٹھا مت کھایا کیجیے، مگر آپ کسی کی سنتے ہی کب ہیں۔“

پھر وہ دوڑتی ہوئی اپنے میڈیسن کے بیگ سے ارکا پائرین کی ایک گولی نکال لائی جس کے کھاتے ہی درد آہستہ آہستہ تھم گیا۔ اب جو حالت کچھ سنبھلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ شازی بیٹھی بڑی رغبت سے شامی کباب اُڑا رہی ہے۔ ہم نے بھی کباب کی طرف ہاتھ بڑھایا، تو پلیٹ میز سے اُٹھاتے ہوئے بولی، ”ارے کیا غضب کر رہے ہیں آپ؟ ابھی درد سے جان نکلی جا رہی تھی اور ابھی چلے ہیں کباب کھانے۔“

اس کے ساتھ ہی آخری کباب بھی پلیٹ سے اُٹھا کر منہ میں رکھ لیا اور ہم کسی ندیدے بچے کی طرح شازی کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

کبابوں سے لطف اندوز ہونے کے بعد شازی بولی، ”جان! آخر آپ یہ دانت نکلوا کیوں نہیں دیتے؟ صبح میرے ساتھ ڈینٹل سرجن ڈاکٹر اختر کے پاس چلیے گا۔ وہ بڑے آرام سے دانت نکال دیں گے۔ آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا۔“

ہم نے ذرا سہم کر کہا، جو اُنہوں نے دانت کے ساتھ ہماری جان بھی نکال لی اور آپ کو پتا بھی نہ چلا تو؟“

شازی ہنستے ہوئے بولی، ”آپ تو ہمیشہ بے پَر کی اُڑاتے ہیں، بھلا دانت نکالنے سے بھی کسی کی جان نکلی ہے؟“

ہم نے کہا، ”شازی نکلی نہ سہی، نکالی تو جا سکتی ہے۔“

شازی بولی، ”ہائے اللہ یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“ بھلا ڈاکٹر اختر کیوں نکالنے لگے آپ کی جان؟“

ہم نے کہا، ”شازی! دیکھیں بات دراصل یہ ہے کہ آپ ٹھہریں ڈاکٹر اور جب بھی آپ ہمارے علاج کے لیے اپنے کسی پُرانے واقف ڈاکٹر کا نام تجویز کرتی ہیں، تو ہم کچھ خوف زدہ سے ہو جاتے ہیں کہ کہیں علاج کے دوران میں اُن صاحب کی رگِ رقابت نہ پھڑک اُٹھے۔ یوں بھی یہ ڈاکٹر لوگ کسی خوب صورت لیڈی ڈاکٹر کو کسی نان میڈیکل آدمی کی بیوی دیکھنا کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے۔“

شازی بسورتے ہوئے بولی، ”یہ آپ آج کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ مَیں تو ازل سے آپ کو چاہتی آئی ہوں، مگر نہ جانے کیوں آپ سب ڈاکٹروں کو اپنا رقیب سمجھ بیٹھتے ہیں۔“

ازل کا لفظ سن کر ایک دم ہم چونکے۔ پھر ہم نے مسکراتے ہوئے کہا، ”کیوں نہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے جب آپ پیدا ہوئی تھیں، تو رونے کی بجائے چلّائے جا رہی تھیں۔ جان اے جان کدھر ہیں آپ؟ دیکھیں تو ہم آپ کے لیے جنت بھی چھوڑ کر چلے آئے ہیں۔ تب ہم بھاگم بھاگ ہاسپٹل کے ڈیلیوری روم کی طرف بڑھے تھے جہاں آپ لینڈ ہوئی تھیں۔ جاتے ہی ہم نے دروازے پر مُکّوں اور لاتوں کی بارش کر دی تھی۔ تب آپ نے اندر سے پکار کر کہا تھا جان ذرا صبر تو

کیجیے، آپ کس قدر شیطان ہو گئے ہیں اس دنیا میں پہنچ کر... ذرا ہم دودھ کے دو گھونٹ تو حلق سے اُتار لیں۔“

ہم آنکھیں موندے یہ سب کچھ کہے جا رہے تھے کہ اچانک ہمیں اپنی انگلی میں کچھ تکلیف محسوس ہوئی۔ آنکھیں کھولیں، تو کیا دیکھتے ہیں ہماری ایک عدد انگلی شازی کے تیز دانتوں میں دبی ہوئی ہے۔ جب ہم نے احتجاجاً پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ تو وہ گویا ہوئیں، ”صاحب! آپ کو حواس میں لانے کی اپنی سی کوشش کر رہی تھی۔“

اب ہم نے جو ذرا غور سے شازی کی طرف دیکھا، تو اُس کے گلابی گلابی رخساروں پر ننھے ننھے موتی چمک رہے تھے۔ شاید ہماری فضولیات سن کر شرم سے پسینہ آ گیا تھا۔ اس کے بعد بھی جب کئی بار دانت نکلوانے کا مشورہ ملا، تو ہم نے محسوس کیا کہ شازی ہاتھ دھو کر ہمارے اس دانت کے پیچھے پڑ گئی ہے اور یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ کسی صورت میں بھی ہمارے اس لاغر و بیمار دانت کو اُس کے مسکن میں نہ رہنے دے گی، تو ہم نے بھی تہیہ کر لیا کہ اگر دانت کو منہ بدر کرنا ہی ہے، تو یہ کام شازی کے کسی واقف ڈاکٹر سے ہرگز ہرگز نہ کروائیں گے۔

ایک روز اسٹڈی روم میں بیٹھے مطالعے میں مصروف تھے کہ رحمت چائے لے کر آ گیا اور چینی دان پر نگاہ پڑتے ہی ہمیں اپنے دانت کا درد یاد آ گیا اور پھر ہم نے یونہی رحمت سے پوچھ لیا،

”بابا! کیا تمہیں کبھی دانت نکلوانے کا بھی اتفاق ہوا ہے؟“

بابا دماغ پر کچھ زور دیتے ہوئے بولا، ”ہاں صاحب جی! شاید دس بارہ برس پہلے ایک دانت نکلوایا تو تھا، مگر صاحب، آپ یہ کاہے کو پوچھ رہے ہیں؟“

ہم نے کہا، ”بابا دراصل ہمیں بھی ایک دانت نکلوانا ہے اپنا۔ اچھا یہ تو بتاؤ دانت کس سے نکلوایا تھا تم نے؟ درد تو نہیں ہوا تھا؟“

بابا بولا، ”نہیں صاحب جی! درد تو بالکل نہیں ہوا تھا۔ بہت اچھا ڈاکٹر ہے، عنایت حسین دندان ساز۔ مَیں نے اپنی اماں کی بتیسی بھی اُسی سے بنوائی تھی۔“

ہم نے ہنستے ہوئے پوچھا، ”اور تم نے اپنی بتیسی کس سے بنوائی ہے؟“

بابا سنجیدہ صورت بناتے ہوئے بولا، ”اللہ بخشے اماں مرحوم کو! صاحب جی! وضو کا لوٹا اور بتیسی مجھے اماں مرحومہ ہی سے ورثے میں ملی ہے۔“

یہ جواب سن کر ہم نے لاکھ دبانے کی کوشش کی، مگر ایک ہلکا سا قہقہہ ہونٹوں سے پھسل ہی گیا۔

دوسرے دن ہم بیگم صاحبہ سے چوری چھپے سیدھے بابا کے بتائے ہوئے پتے پر ڈاکٹر عنایت حسین کے پاس جا پہنچے۔ جب ہم اُن کے کلینک پہنچے، تو موصوف دھوپ میں بیٹھے دانت نکال رہے تھے۔ شاید پاس بیٹھے ہوئے شخص نے کوئی لطیفہ سنایا تھا۔ اچانک ڈاکٹر صاحب کے سائن بورڈ پر نظر پڑی، تو پیشانی پر درج تھا:

ہوالشافی۔ الجدید کلینک۔ یہاں پر بغیر تکلیف کے دانت نکالے جاتے ہیں۔ آنکھوں کا بغیر آپریشن علاج کروائیے۔ بواسیر اور بچوں کے سوکھے کا شرطیہ علاج کیا جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

گویا قدرت ابھی تک کوئی ایسی بیماری تخلیق نہ کر پائی تھی جس کا شرطیہ علاج ڈاکٹر عنایت حسین کے پاس نہ ہو۔

ہم جیسے ہی کلینک میں داخل ہوئے، عنایت صاحب کی سیٹی نما آواز سنائی دی، ”صاحب کیا تکلیف ہے آپ کو؟“

ہم نے ڈاکٹر عنایت حسین کے سامنے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے شروع کیے اور انہیں بتایا کہ یہ دانت کا درد ہمیں کیسے کیسے موقعوں پر رُسوا کراتا ہے۔ اچھے بھلے خالی پیٹ دعوت پر جاتے ہیں، مگر اُوئی اُوئی کرتے خالی پیٹ ہی واپس آجاتے ہیں اور کبھی تو مرغِ مسلّم پر جھپٹتے ہی دانت کا درد شروع ہو جاتا ہے اور چھری ہاتھ میں تنی اور مرغ میاں میز پر دراز۔ دونوں ہمارا منہ چڑاتے رہ جاتے ہیں۔“

ہمارا فقرہ ابھی پورا بھی نہ ہوا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی سیٹی پھر بجنے لگی، ”چھوٹے او چھوٹے! اِدھر آؤ، ان صاحب کا دانت نکال دو۔“

ہم نے پوچھا، ”کیا دانت آپ نہیں نکالیں گے؟“

اُنہوں نے تھوڑا سا توقف کیا اور پھر اپنی حسرت بھری آواز میں یوں گویا ہوئے:

”دیکھیے صاحب! اب عمر نہیں رہی ایسے کام کرنے کی۔ اسی لیے اپنا یہ خاندانی فن اپنے شاگرد کو سکھا دیا ہے۔ بڑا ہی جی دار لڑکا ہے۔ ایک ہی جھٹکے میں دانت نکال کر گاہک کی ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے۔“

اِدھر ڈاکٹر صاحب کی سیٹی رُکی اُدھر چھوٹے میاں بھی تشریف لے آئے۔ یہ کوئی تیس

پینتیس سالہ ورزشی جسم کا آدمی تھا۔ قد چھوٹا تھا اور شاید اسی لیے چھوٹے کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

دونوں اُستاد شاگرد ہمیں ڈینٹنگ روم میں لے گئے اور ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ گویا وہ اُن کی ڈینٹنگ چیئر تھی۔ ہم کرسی پر نیم دراز ہوگئے اور تھوڑی دیر بعد چھوٹے میاں ایک بڑی سی سرنج لے کر ہماری طرف بڑھنے لگے۔ اتنی بڑی سرنج کہ اگر وہاں ہماری جگہ کوئی کمزور دل کا انسان ہوتا، تو بغیر دانت نکلوائے اِس دنیائے فانی سے بہت دُور پہنچ جاتا، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ہم راجپوتوں کو تو ہمیشہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے میں مزہ آتا ہے، چنانچہ ہم نے روایتی دلیری کا مظاہرہ کیا اور بغیر کسی قسم کا احتجاج کیے اپنی کرسی پر جمے رہے۔

اب چھوٹے میاں ہمارے قریب پہنچ کر یوں گویا ہوئے: ''صاحب! ذرا درد والے دانت پر انگلی تو رکھیے۔ ہم نے فوراً درد کے مقام پر انگلی رکھ دی اور پھر چھوٹے میاں نے نہایت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک جھٹکے کے ساتھ سوئی ہمارے مسوڑھے میں گھونپ دی۔ ساتھ ہی ڈاکٹر عنایت نے پیچھے سے ہمارا سر پکڑ لیا اور چھوٹے میاں زنبور اُٹھا کر دانت نکالنے کے لیے تیار ہوگئے۔ ہم اپنی جگہ مطمئن کہ وعدے کے مطابق پتا بھی نہیں چلے گا اور چند سیکنڈ بعد وہ نامراد دانت جس نے جینا حرام کر رکھا ہے، ہتھیلی پر ہوگا، اس لیے ہم نے چھوٹے میاں کو مع اُن کے زنبور کے خوش آمدید کہتے ہوئے اپنا پورا منہ کھول دیا اور موصوف کو جو راستہ صاف نظر آیا، تو اُنہوں نے بغیر دستک دیے ایک دانت پر زنبور رکھ ہی دیا اور باوجود ضبط کے ہماری چیخیں نکل گئیں۔ ہماری راجپوتی غیرت اور جوانمردی دھری کی دھری رہ گئی۔ ہمارا خیال ہے میدانِ جنگ میں تو ہنسی خوشی جان قربان کی جاسکتی ہے، مگر ان زنبور بازوں کے ہاتھوں دُکھ اُٹھانے پر احتجاج کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا اور یہ احتجاج ہوگا بھی یقیناً چیخوں کی صورت میں، چنانچہ ہم بھی اسی طرزِ احتجاج کو اپنا حق سمجھتے ہوئے زور زور سے چیخ رہے تھے، مگر استاد اور شاگرد کے کان پر تو جوں تک نہ رینگی جیسے الجدید کلینک آکر ہم سے کوئی گناہ سرزد ہوگیا ہو۔

ذرا دیر بعد یوں محسوس ہوا جیسے چھوٹا، عنایت حسین سے کچھ کہہ رہا ہے۔ اُدھر توجہ دی، تو کانوں میں آواز آئی: استاد! مَیں نے تو اپنی زندگی میں کبھی کسی عورت کو بھی اس طرح چیختے نہیں دیکھا جیسے یہ صاحب چلاّئے جا رہے ہیں۔''

یہ سنتے ہی ہم تو جیسے پسینے میں نہا گئے دل میں فیصلہ کر لیا کہ چاہے ہماری شازی بیوہ

ہوجائے، ہم منہ سے اُف تک نہیں کریں گے اس کے بعد ہم نے اُچھلنے کودنے اور واویلا کرنے سے کامل اجتناب کیا اور کوئی پندرہ منٹ کی زور آزمائی کے بعد استاد اور شاگرد نے ہمارا دانت نکال ہی ڈالا اور ہم نے سچے دل سے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہماری بیگم کا سہاگ سلامت رکھا۔

اب ہمارے منہ سے خون کے چشمے اُبل رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب کسی طرح اُسے بند کرنے کے بجائے ایک ایک گندے سے برتن میں گھولی ہوئی لال دوائی کے غرارے کرنے کا حکم دے رہے تھے۔

ہم سے رہا نہ گیا، بھنا کر بولے، ”دیکھیں ڈاکٹر جی بات ہے اگر آپ نے اور زیادہ اصرار کیا، تو ہمیں اُلٹی ہو جائے گی۔ براہِ کرم آپ ہمیں گھر جانے کی اجازت دیں اور باقی علاج آپ ہم پر چھوڑ دیں۔“

یہ کہہ کر ہم وہاں سے ایسے بھاگے کہ پیچھے مُڑ کر نہ دیکھا۔

خون کی پچکاریاں پھینکتے گھر کی طرف دوڑے جا رہے تھے کہ راستے میں ایڈووکیٹ خالد رشید موٹر سائیکل پر آتے نظر آئے۔ وہ چھوٹتے ہی کہنے لگے، ”یار آج تو بڑے پان کھائے جا رہے ہیں۔“

ہم نے کہا، ”پہلے ہمیں گھر تک چھوڑ آئیں، پھر دندان ساز عنایت حسین سے آ کر جتنے جی چاہے، پان نوش فرمالیں اور بل ہماری طرف بھیج دیں۔“

اُن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مگر اسی اثنا میں ہم جست لگا کر اُن کے پیچھے سوار ہو چکے تھے اور مجبوراً انہیں بھی موٹر سائیکل کا رُخ ہمارے گھر کی طرف کرنا پڑا۔

گھر پہنچتے پہنچتے ہمارا رُخِ انور بُری طرح سُوج چکا تھا۔ معلوم ہوا بیگم صاحبہ ابھی اسپتال سے نہیں لوٹیں۔ چاروناچار بیڈروم میں جا لیٹے۔ ذرا دیر بعد بیگم کمرے میں داخل ہوئیں، تو ہمیں دیکھ کر اُن کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی، پھر وہ یوں گویا ہوئیں، ”ہائے میں مر جاؤں! یہ آپ کو کیا ہوا؟ آپ سے کئی بار کہا ہے احتیاط کیا کیجیے۔ کسی سے جھگڑا ہو گیا کیا؟ ہائے کس قدر بے رحمی سے مارا ہے ظالموں نے!“

بیگم کی یہ بے ربط اور نامعقول گفتگو سن کر ہمیں بے ساختہ ہنسی آ گئی، مگر اس کے ساتھ ہی درد میں بھی شدت پیدا ہو گئی۔ چاروناچار بتایا کہ ہم پٹے پٹائے کہیں نہیں، دانت نکلوا کر چلے آ رہے ہیں۔

پہلے تو وہ ایک غیر مستند ڈاکٹر سے دانت نکلوانے پر بے حد خفا ہوئیں، پھر کچھ ایسی پاور فل انٹی بائیوٹک استعمال کروائیں کہ دوسرے ہی دن تھوڑے پہچانے جانے لگے اور پھر تیسرے دن تو حالت یہ ہوگئی کہ ہر وہ شخص ہمیں شناخت کر سکتا تھا جس نے زندگی میں ایک بار بھی دیکھا ہو۔

دانت نکلوانے کے چند روز بعد تک ہم اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ دانت کے درد جیسے موذی مرض سے ہمیشہ کے لیے نجات پالی، مگر ایک روز جو بیٹھے بٹھائے ٹیس اُٹھی تو ہماری حالت کچھ ایسی غیر ہوئی کہ ساتوں آسمان گردش کرنے لگے۔ ہم بھاگم بھاگ الجدید کلینک پہنچے اور سارا معاملہ ڈاکٹر عنایت حسین صاحب کے گوش گزار کیا۔ وہ چند ساعت تو غور فرماتے رہے، پھر یوں سیٹی بجائی، ”صاحب! قصور آپ کا ہے جو آپ نے صحیح دانت پر انگلی نہیں رکھی۔ اسی لیے چھوٹے نے دوسرا دانت نکال دیا۔ بہر حال فکر کی کوئی بات نہیں۔ اپنے گاہکوں کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے ہم نے یہ اُصول بنا رکھا ہے کہ اگر پہلی بار اصل دانت نکل جائے، تو بہتر ورنہ آدھی فیس میں دوسری بار وہی دانت نکالا جاتا ہے جو واقعی خراب ہو۔“

یہ کہہ کر موصوف دوسرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے، ”چھوٹے او چھوٹے! ذرا اِدھر تو آ۔ ان صاحب کا دانت نکالنا ہے۔“

جیسے ہی عنایت صاحب دوسرے کمرے میں داخل ہوئے، ہم فوراً وہاں سے دُم دبا کر بھاگے اور گھر پہنچتے ہی شازی کے شانے پر سر ٹکاتے ہوئے کہا، ”شازی! آپ جیتیں، ہم ہارے۔ اب آپ جس ڈاکٹر سے کہیں گی، اُسی سے علاج کروائیں گے۔ شازی مسکراتے ہوئے بولی، ”دیکھیں جان! اب آپ تندرست بھی ہو جائیں گے۔“

دوسرے دن ہم ڈینٹل سرجن ڈاکٹر اختر کے کلینک میں موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے دانت کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد نسخہ لکھ دیا اور یہ مژدہ سنایا کہ دانت نکالنے کی ضرورت نہیں، اِن شاء اللہ ویسے ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“

یہ سنتے ہی ہم پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ جی چاہا یہیں کلینک میں ناچنے لگیں، لیکن اپنے جذبات قابو میں رکھے کیوں کہ شازی مسکراتے ہوئے طنزیہ نظروں سے ہماری دیکھ رہی تھی۔

* *

چک چوالیس کا اسکول ماسٹر!

محمد اکرم سرا

پڑھ پخت ہو کر بندے کی اوّلین خواہش ملازمت کا حصول اور دوسری بیوی کا حصول ہوتی ہے۔ ہر دو کے لوازمات کا درجہ بدرجہ اچھا یا بہت اچھا ہونا بعد کی بات ہے تاہم محبوبہ اور بیوی کے درمیان کم اَز کم ایک زینے کا فرق اور فاصلہ ضرور ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو یہ فرق کئی زینوں تک پہنچ جاتا ہے حتیٰ کہ ایک مقام پر زینے اور بیوی دونوں ختم ہو جاتے ہیں اور محبوبہ دُور کھڑی مسکرا کر رہ جاتی ہے۔

رائج دستور ہے کہ جس کسی کو عورت اور نوکری کے حصول میں مشکل پیش آئی اس نے دولت سے خرید لی۔ زردار اور زور آور ہوا تو خود خریدی اور بے زر و بے نوا ہوا تو توکل اللہ قرض کی مے پیتا رہا۔ بزرگوار رقیب چوہدری کا قولِ فیصل لکھنے کے لائق ہے کہ پکنے والی عورت اور دودھ دیتی بھینس کا مول ایک جتنا ہوتا ہے۔ ہماری شادی تو اس درخانہ دولت و دودھ کے دستور سے ہٹ کر ہوئی، مگر ہماری ملازمت مذکورہ دستور کے اندر ٹھہری۔

ان دنوں ہم بے روزگاری اور اقربا پروری کے اس غیر دانشمندانہ روزگار سے گزر رہے تھے، جو مہذب انسان پر بڑھ بڑھ کر حملہ آور ہوتا ہے۔ یہ زمانہ انسان کے اعصابی، دفاعی نظام کو شکست فاش دے کر اس کی ہڈیوں اور رُوح کو ایک وائرس کی صورت متاثر کر رہا تھا اور جب زمانہ بزلتہ ایک وائرس کی شکل اختیار کر لے اور قدروں کو گھن کی طرح کھانے لگے تو پھر دانائی اور راست بازی کی جگہ جگ ہنسائی اور بدخوئی لے لیتی ہے۔ یہی زمانے کے ہتھیار ہوتے ہیں، جو اوچھے ہاتھوں میں چلے جائیں تو سر سے بلند کی ہوئی اینٹ اور اچھے ہاتھوں میں آ جائیں تو نیو کی اینٹ بن جاتے ہیں۔

ماسٹر ڈگری لینے کے بعد یہ ڈر تو نہیں رہتا کہ مزید پڑھنا پڑے گا البتہ یہ فکر دامن گیر ہو جاتی

ہے کہ اب کیا کرنا ہے۔ خصوصاً جب ایک عدد گھر والی حاضر باش ہو، جو جگر داری کا دعویٰ کرے اور (اُمورِ جملہ داری کے لیے) زرداری کی طالب ہو۔ چنانچہ ہم طلب و رسد کے فسانہ ادھیڑ بُن میں مبتلا تھے کہ ایک قریبی عزیز نے یہ جانفزاء مژدہ گوش گزار کیا۔

"ملازمت کرو گے؟"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ فوراً ہامی بھر لی۔ (ان سے شاید ہماری بے روزگاری دیکھی نہیں جاتی تھی)۔

بولے انگلش ٹیچر کی ملازمت ہے، مگر ہے لو ہے توڑ پکی۔ (ایڈہاک، کنٹریکٹ اور تنخواہ کا کوئی چکر نہیں ہے)۔

ہم اُردو زبان و اَدب کے ایم اے اور بدیسی زبان کے اسکول ماسٹر، چہ باید؟ پھر یہ سوچ کر کہ چلو میم اور انگریزی کی جھجک دُور ہو جائے گی نیز بیگم کے تقاضاہائے ذرہ خرید کا بھی بھرم رہ جائے گا اور مختلف قرض خواہ احترام سے دیکھنا شروع کر دیں گے تڑاخ سے ہاں کر دی۔

بولے مبارک ہو۔ آج سے بلکہ ابھی سے آپ خود کو مدرس ہی سمجھیں۔

عرض کیا یہ تو آپ کی ذرّہ نوازی اور روزگار پروری ہے ورنہ

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے

بولے اب اس کی کچھ شرائط بھی طے ہو جائیں تو بات پکی ٹھہرے۔

"کیسی شرائط؟" ہم ہکا بکا رہ گئے۔ کہا، "شرائط تو بزنس ڈیلنگ میں ہوتی ہیں۔"

بولے، "وہاں تو اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ ابھی تو آپ سے ٹوکن نہیں مانگا ہے۔"

عرض کیا، "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"آپ تو خاصے سمجھدار دکھتے ہیں پر ہیں نہیں۔ دورِ کشاکش میں ملازمت اتنی آسانی سے نہیں ملتی۔ ضرورت مندوں کے لیے ایک آدھ جگہ نکالنی پڑتی ہے۔ یوں نہ کریں تو روزانہ چوراہے پر کوئی نہ کوئی جھولتا دکھائی دے۔ آپ ہمیں مسیحا بے شک نہ کہیں پر ہمدرد تو کہہ سکتے ہیں.... بھائی میرے یہ ملازمت ہے مسجد کا چندا نہیں ہے، جو بن شرائط کے مل جائے کہ ادھر آپ نے ہاتھ پھیلایا ادھر خدا کے نام پر چونی اٹھنی آن گری۔ جتنا سستا ہم خدا کو بیچ دیتے ہیں اتنی سستی تو اپنے ہاں سبزی ترکاری بھی نہیں ملتی۔ وہ لطیفہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ بس میں ایک مولوی صاحب مسجد کے لیے

چندا مانگ رہے تھے۔ انہوں نے صدا لگائی۔ خدا کا گھر بنانا ہے چندا دیجیے۔ تو ایک من چلے نے پیچھے سے کہا۔ مولوی صاحب کیا پہلے خدا کرائے کے گھر میں رہتا ہے؟

آپ شرائط بتائیں۔ ہم نے خود کو لاجواب ہوتے دیکھ کر کہا۔

آپ نے "B.Ed" کیا ہوا ہے؟

کبھی ضروری نہیں سمجھا۔ ہم نے کندھے اچکائے۔

سی ٹی "CT" کیا ہوا ہے؟"

ہم نے بیٹھے بیٹھے دائیں بائیں سر ہلا دیا۔

اس کا صاف مطلب ہے کہ آپ کے پاس پروفیشنل ڈگری نہیں ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ آپ پڑھتے کیا رہے ہیں؟"

عرض کیا ہمارے پاس ڈگری نہیں ہے، مگر ہماری اپروچ پروفیشنل ہے۔

مگر انگلش ٹیچر بھرتی ہونے کے لیے اپروچ نہیں ڈگری چاہیے، جو تمہارے تعلیمی اعمال میں نہیں ہے۔

اب کیا ہوگا؟ ہمارے نادیدہ خواب ٹوٹتے اور ہم پھر سے بے روزگار ہوتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔

اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا، مگر شرائط سخت اور فیس کچھ زیادہ ہوگی۔

عرض کیا کتنی زیادہ ہوگی؟

"اصل زر پر دس پرسنٹ کے حساب سے ہوگی، مگر ڈگری اتنی نیٹ اینڈ کلین ہوگی کہ اصل ڈگری اس کے سامنے نقل لگے گی۔"

ہم نے اپنے تئیں حساب لگایا تو یہ کوئی تین ہزار روپے بنتے تھے۔ سوچا جب ایک پروفیشنل ڈگری کے ساتھ نوکری مل رہی ہے تو حصول میں کون سی چیز مانع ہو سکتی ہے۔

یقین جانیے اس سے ہمیں اپنے پڑھائی میں صرف کیے ہوئے سولہ سال ضائع شدہ عمر لگے کہ کیوں نہ یہ عزیز دل شکن ہالی عمر میں مل گئے ہوتے تو عمر عزیز کا رنگین دور پڑھائی لکھائی کی نظر کرنے کی بجائے تین تین ہزار میں اصل سے بہتر ڈگریاں حاصل کرتے اور یوں آج گھر بیٹھے کئی کئی ناکام عشقوں، پروفیشنل ڈگریوں اور شعبہ جات کے مالک ہوتے۔

آپ بات ختم کرنے کے انداز میں بولے۔ مبلغ تیس ہزار روپے ملازمت کی تصدیق کے ہوں گے اور تین پرسنٹ پروفیشنل ڈگری کے۔ یہ مل ملا کر کلھم تینتیس ہزار بنتے ہیں۔ آپ چوں کہ دوست اور تعلق دارِ خاص ہیں ہزار کم دے دیجیے۔“

پوچھا اور رعایت نہیں ہو سکتی کیا؟“

”میں آپ کو ملازمت آفر کر رہا ہوں کوئی تربوز نہیں بیچ رہا، جو بھاؤ تاؤ کرتا چلوں۔ اور پھر یہ ملازمت کا نازک معاملہ ہے کوئی غیرت کا مسئلہ تھوڑا ہی ہے، جو میں رعایتیں کرتا چلوں۔ ہاں اگر منظور نہیں ہے تو صریحاً انکار کر دیجیے۔ بخدا ہمیں کوئی دُکھ نہیں ہوگا، لیکن دیکھ لیجیے اس میں آپ سراسر اپنا ہی نقصان کریں گے۔ زندگی میں اتنے اچھے مواقع نصیب والوں کو ہی ملتے ہیں۔ اور آپ کے طالع کا ستارہ تو اوج پر ہے۔ یہ نہ ہو کہ آپ ہاتھ ملتے رہ جائیں۔ مجھے تو رہ رہ کر آپ کی بیگم کا خیال آتا ہے کہ دلہن کو شہر کے علاوہ کپڑے لتے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

عرض کیا ہمیں کچھ وقت چاہیے۔ ہم آپ کو مزید مشورہ کرنے کے بعد بتا سکیں گے۔

آپ تو مجھے قوتِ فیصلہ کی طاقت، توانائی اور بینائی سے عاری دکھائی دیتے ہیں۔ ایک بات یاد رکھیے کہ یہ کنٹریکٹ کی دنیا میں ایک مستقل ملازمت ہے۔ ایسی اچھی، قیمتی، آسان اور پُرمنفعت جاب آپ کو کہیں اور سے نہیں ملے گی۔“

آپ ہمیں کل تک کی مہلت دے دیجیے۔

”ایسے معاملات میں مہلت تو نہیں ہوتی پر آپ کا معاملہ اور ہے۔ بتائے دیتا ہوں کہ وقت اور سیٹیں ''Posts'' کم اور ''Compitent'' موزوں اُمیدوار زیادہ ہیں۔ آپ کل مجھے ٹیلی فون پر بتا دیجیے گا، شکریہ۔ اور ہاں یاد رکھیے ٹیلی فونک گفتگو مختصر، جامع اور بامعنیٰ ہو۔“

آپ پیشے کے اعتبار سے کسی سرکاری ادارے میں میر منشی تھے اور ایسے تمام گُر سیکھ کر آزما چکے تھے، جس سے کسی سائل کی جیب خالی کر کے اُسے بلیک میل کیا جا سکتا ہے۔ سائلین کی تعداد کم ہوتے دیکھی تو ایجنٹ کا کام شروع کر دیا۔ یہ دھندا چل نکلا تو سرکاری ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔ سرکاری اداروں کے بست و کشاد کی ملی بھگت سے ان اداروں میں ''Appointment order'' کروانے میں اتنے تاک ہو گئے تھے کہ اسٹیٹ لائف کے ایجنٹوں کو فرسنگوں پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ نماز پابندی سے پڑھتے تھے تاہم نماز اور ایجنٹی کو کبھی ایک نہیں ہونے دیا۔ کہتے نماز اپنی جگہ دھندا

بزمِ جہاں دوعالم

اپنی جگہ۔ سو ریل کی دو متوازی پٹڑیوں کی طرح دونوں کام خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہے تھے۔ نماز آپ کے دھندے میں حارج نہیں ہوتی تھی اور نہ دھندے نے نماز کو کبھی حارج ہونے دیا تھا۔ ایسی خاموش مفاہمت جس میں ذہنی آسودگی ہو کم ہی لوگوں میں ہوتی ہے۔

آپ جو خضرِ طریقت بن کر آئے تھے خفا خفا اُٹھے تو ہم خوشی خوشی گھر کو دوڑے۔ شام سے تمام اہلِ خانہ کھانے پر اکٹھے ہوئے (اہلِ خانہ صرف کھانے پر ہی اکٹھے ہوتے تھے) تو ہم نے روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے پیش آنے والی ملازمت کا احوال کہہ سنایا اور ساتھ ہی گھر والوں کو کچھ گفتگو سے، کچھ تاثرات سے ممکن حد تک باور کروا دیا کہ اب ہمارا دانہ پانی حکومتِ وقت کی عملداری میں آچکا ہے۔ یہ سب ایک فرشتہ صفت عزیز جاب نواز کی پُرخلوص کوششوں کی بدولت ممکن ہوا ہے۔

ہمارے پُرزور خلوص کوششوں کی بدولت ممکن ہوا ہے۔

ہمارے پُرزور دلائل، مختلف نوعیت کے رویّے اور شاندار اندازِ گفتگو کو سراہتے ہوئے والدہ ماجدہ نے فرمایا، "یہ تو پھر رشوت کی نوکری ہوئی ناں۔"

اس پر چھوٹی ہمشیرہ نے فوراً کہا۔ نہیں امی یہ تو کام کا معاوضہ ہے۔ ہم چھوٹی ہمشیرہ کی بڑی منطق پر حیران رہ گئے۔ شاید ہم خود ایسا جواب نہ دے پاتے۔ منجھلی ہمشیرہ بولی، کچھ بھی ہو آج کل ملازمت حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اور پھر ایسی سرکاری ملازمت جو ننگے پاؤں آکر دروازے پر دستک دے قسمت والوں ہی کو ملتی ہے۔ اس پر والدہ ماجدہ کی اخلاقیات اور مذہب کے پارینہ تصورات گنگ ہو کر رہ گئے۔

کُند ہو کے رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام

البتہ زوجہ محترمہ خوشی خوشی اپنے ہاتھوں کے کڑے اور طلائی چوڑیاں کہ جن کا رنگ و روغن بھی ابھی میلا نہیں ہوا تھا فی سبیل اللہ دینے پر تیار ہو گئیں۔ مشرقی عورتوں کی یہی ایک خامی ہے، جو مردوں کو اچھی لگتی ہے۔ میاں اگر جھوٹے دبئی جانے کا نام بھی لے تو خاتون زیورات کی پوٹلی ہاتھوں میں تو لے دروازے میں کھڑی ہوتی ہے۔ ہم بیگم کی بانہوں میں طلائی چوڑیوں کی جگہ پر ہری ہری چوڑیاں نہیں دیکھنا چاہتے تھے اس لیے زندگی میں پہلی مرتبہ قرض لینے کے لیے روانہ ہوئے۔

جاتے ہوئے دلِ بے قرار کو بار بار تسلیاں دے رہے تھے کہ جب حضرتِ غالب تمام عمر قرض کی مے پیتے رہے ہیں۔ اپنے ملک کی معیشت قرض کی رسیا ہو گئی ہے تو ہم کس کھیت کی مولی ہیں۔

اس واقعہ کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد ہم چک چوالیس آر بی کے کسی پرائمری اسکول میں انگلش ٹیچر تعینات ہو چکے تھے۔ ملازمت کا پروانہ ہمارے ہاتھ میں تھا اور ہم لوگوں سے متعلقہ چک کا پتا دریافت کرتے پھر رہے تھے۔ اس یارِ طرف دار کے بارے میں اطلاع ملی کہ انہوں نے دلالی میں حاصل کی گئی رقم کو حرام جانا اور اسے بطور 'معاوضہ' استعمال کرتے ہوئے بیگم کی اگلے گریڈ میں ترقی لگوالی ہے۔ ہمیں پیغام ارسال کیا کہ اسکول دُور دراز کے چک میں ہے۔ آپ وہاں روز روز نہیں جا سکیں گے۔ پھر دیہات کے اسکولوں میں کوئی پڑھنے اور پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا اس لیے آپ کبھی کبھی اسکول جاتے رہنا۔ ہم نے بھی اس پرہیزی ہدایت نامے پر ہو بہو عمل کیا اور انسپکشن کے طور پر اسکول جاتے تھے۔ ہمارے طرزِ بے عمل سے اوّل معلّم بھی شاد تھا اور بچے بھی خوش تھے۔ اوّل معلّم اس لیے مطمئن تھا کہ ہماری حاضریاں بھر کر وہ نذرانے کا حقدار ٹھہرتا تھا جب کہ سادہ دل مسلم بچے اس لیے خوش تھے کہ انگریزی زبان و حضرات سے ان کی نفرت میرے آجانے پر بھی برقرار تھی، بلکہ دوچند ہو گئی تھی۔

دیہاتی اسکولوں کے معلّمین اور کلرک برادری کی تنخواہیں اس قدر قلیل ہوتی ہیں کہ انہیں نذرانوں پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ بعض کلرک حضرات کے نذرانے اور بچے اس قدر زیادہ ہوتے ہیں کہ انہوں نے تنخواہوں اور بچوں کی کمیٹی ڈالی ہوتی ہے۔ بچوں کی تعلیم و جوانی اور اپنا بڑھاپا بھی نذرانوں کی سیڑھی پر چڑھ کر تکمیل پاتا ہے۔ رقیب چوہدری کی کلرک بیانی بھی سن لیجیے۔ بولے ہم ایک ایسے کلرک کو جانتے ہیں، جو آج تک رشوت کا پیسہ گھر لے کر نہیں گیا۔ جی ہاں سارے کا سارا کاروبار میں لگا دیا۔ رشوت کا کاروبار ایسا چمکا کہ اب بڑے بڑے سودے موبائل فون پر کرتے ہیں۔ کہیں عوضانہ لینے جانا ہو تو خدامِ ادب کار گیراج میں کھڑی ہے۔ پورے دفتر نے جانا ہو تو ایک معروف کمپنی کی بس بھی دروازے پر کرپشن کی نشاندہی کرتی ہے۔ غریب آدمی کی فائل سرخ فیتے کی نظر (داخل دفتر) جب کہ عوضانہ دینے والی کی فائل گھر پر پہنچا کر دم لیتے ہیں۔ بڑے فرض شناس اور اہل اہلکار ہیں۔

چک چوالیس و اسکول ہذا بڑی آئیڈیل جگہ ایک چوراہے پر واقع تھا۔ اس کے شمال میں

ریل گاڑی فراٹے بھرتی گزرتی تھی۔ ایک سڑک مشرق کی جانب سے اور دوسری سنسان راہ جنوب کی سمت سے چلی آتی تھی۔ چوتھا اور آخری راستہ مغرب کی جانب سے شہر سے ہو کر آتا تھا۔ چہار رستہ مسافت بے ایمان کے حساب کی طرح برابر تھی۔ اگر ہم براستہ لاری سفر کرتے تو سب سے پہلا سٹاپ چک جیک تھا۔ اگلا سٹاپ جنوب کی سمت سے ہریالہ چک تھا۔ اس سے آگے مغرب کی سمت احمد آباد کا قصباتی شہر تھا۔ وہاں سے واپس چک چوالیس براستہ بانیہالہ تھا۔ سڑک جوں جوں آگے بڑھتی تھی شوہدے کسان کی وٹ بندی کی طرح مڑتی جاتی تھی۔

ان تینوں رستہ جات سے آپ جدھر سے بھی تشریف لائیں چک چوالیس کا کل فاصلہ کوئی 4 کلومیٹر پر مشتمل تھا۔ ان بے نام رستہ جات پر ٹریفک نام کی کوئی سواری نہیں تھی۔ اِکا دُکا کوئی سائیکل سوار رستے میں ٹکرا جاتا یا پھر دیہاتی جو خود گدھے پر سوار بچوں کو ہانک رہے ہوتے۔ جگہ جگہ گھات میں بیٹھے ڈاکو، لٹیرے اور جنگلی کیکروں سے واسطہ رہتا تھا۔ اگر جیب کو دیکھتے تو شاہ ببول کے کانٹوں سے اُلجھتے۔ رستے سے کانٹے چنتے تو جیب پرائی ہو جاتی۔ شومئی قسمت کہ ان دونوں سے بچ نکلتے تو پاؤں کے چھالے زیادہ تکلیف دہ ہوتے۔ گویا اس غیر آباد اور ویران حال رہ گزر کے دو رویہ کانٹے منہ کھولے کسی اجنبی مسافر کی آمد کو ترستے رہتے:

اِک آبلہ پا وادیٔ پُر خار میں آوے
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یا رب

آپ یقین جانیے یہ چار کلومیٹر کا فاصلہ ہم سر پر کفن باندھ کر کرتے تھے۔ جس روز ہمارے پیچھے کوئی جیب شکن لگ جاتا تو تین گھنٹے کا فاصلہ ہم ایک گھنٹے میں کر جاتے تھے۔ بس سے اُترتے وقت ہم اکثر اوقات دعا مانگا کرتے تھے کہ خدا کا کرنا ہو کہ ہم پر کسی ڈاکو بھائی کی نظر پڑ جائے۔ اس سے بڑے دُور رس فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔ ایک تو یہ کہ بروقت اسکول پہنچ سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ہمارا سانس پکا ہو سکتا تھا۔ تیسرے ہم اتھلیٹکس کے بہترین کھلاڑی بن سکتے تھے۔ چوتھا اگر کبھی پولیس میں کانسٹیبل بھرتی ہونے جائیں تو 'دوڑ' میں فیل نہ ہو جائیں۔ اس لیے ہم بس سے اُترتے ہی اکثر اوقات بھاگنا شروع کر دیتے تھے۔ یہ ڈر نہیں ہوتا تھا کہ رستے میں لُٹ جائیں گے اس لیے کہ اوّل تو جیب میں کچھ ہوتا ہی نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تھا تو جیب کترے بس میں اُڑا لیتے تھے۔ ہماری حالت زار پر تاسف کرتے ہوئے اور خالی جیب کو پوری طرح کھنگالتے ہوئے ایک

ہمدرد ڈاکو نے مشورہ دیا۔ ''اس طرح بھاگ بھاگ کر آپ جلد بوڑھے ہو جائیں گے۔ آپ کے بچے کھچے دانت گر جائیں گے اور بال سفید ہو جائیں گے۔ آپ پر رعشہ بھی طاری ہو سکتا ہے۔ اس لیے بھاگنا دوڑنا آپ صرف ہم پر چھوڑ دیں۔ ہو سکے تو آپ ٹرین کا راستہ اختیار کریں یا پھر جیب میں کچھ ڈال کر آیا کریں۔ آپ کو دیکھ کر تو ہمیں شرمندگی ہونے لگتی ہے۔ پاس سے کچھ دینے کو جی چاہتا ہے۔ ایک خیال آتا ہے اس دھندے سے تائب ہو جائیں۔ آج کل اپنا بزنس بھی ملکی معیشت کی طرح فلاپ جا رہا ہے۔''

اس گفتگو سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ڈاکو اب کافی حد تک میرے ساتھ فری ہو چکے تھے۔ تاہم ہم نے ان کی نصیحت کو پلے باندھا اور اگلے روز ریلوے اسٹیشن جا پہنچے۔ چھوٹتے ہی ٹکٹ بابو سے کہا۔

''چک چوالیس کی ایک ٹکٹ بنا دیجیے۔''

بولے نہیں ہے۔ ہم نے سوچا شاید ٹکٹ ختم ہو گئے ہیں۔ پوچھا کب تک مل جائے گی؟

''12 (بارہ) بجے ملے گی۔''

''اس سے پہلے نہیں مل سکتی کیا؟''

''نہیں۔ چک چوالیس کے لیے ٹرین 12 بجے آتی ہے۔''

عرض کیا، ''کیا ہندوستان سے ہو کر آتی ہے؟'' تو ایک آنکھ پر ہاتھ رکھ کر دوسری آنکھ سے بغور دیکھتے ہوئے کہا، ''نہیں لاہور سے آتی ہے اور اکثر لیٹ آتی ہے۔ آپ 12 بجے کا ٹکٹ ایک بجے بھی لے سکتے ہیں۔''

ہم نے ایک باوقار استاد کا رویہ اپناتے ہوئے کہا، ''دیکھیے ہم وہاں پر مدرس مقرر ہوئے ہیں اور ہمیں وقت پر اسکول پہنچنا ہے۔''

''تو میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں مدرس صاحب؟''

''دیکھیے آپ ہمیں کوئی مناسب راستہ بتائیں اور چک چوالیس کے لیے ایک ٹکٹ...''

''لگتا ہے تمہاری کھوپڑی میں میری بات نہیں پڑی۔ پتا نہیں تمہیں مدرس کس گھامڑ نے مقرر کر دیا ہے۔ جب مذکورہ چک میں گاڑی کھڑی ہی نہیں ہوتی تو میں تمہیں وہاں کا ٹکٹ کیسے بنا دوں۔ اور پھر تمہارے ایک مدرس کے لیے ہم وہاں پر گاڑی کھڑی نہیں کر سکتے۔ یوں بھی تم

پرائمری اسکول کے مدرس ہو، کوئی تھانیدار نہیں ہو... یہ گاڑی ڈاچی گاڑی ہے کوئی گدھا گاڑی نہیں ہے۔"

"تو پھر آپ ہمیں کسی اور اسٹیشن کا ٹکٹ بنا دیں۔"

بولے، "اب آئے نا آپ لائن پر۔ برخوردار آپ بتالیکے اسٹیشن کی ٹکٹ لے لیں۔ وہاں ے چک چوالیس نزدیک ہی ہے۔"

بتالیکے سے چک چوالیس تک کا درمیانی فاصلہ بھی چار کلومیٹر پر محیط تھا۔ البتہ یہاں چورا چکے نہیں تھے۔ ان کی جگہ ریلوے لائن کے پتھر تھے۔ ان پتھروں پر چلتے ہوئے جب ہم سگ گزیدہ کی بجائے سنگ گزیدہ اسکول پہنچے تو وہ مصطفیٰ زیدی کے الفاظ میں ہمارا منہ چڑا رہا تھا:

مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے   انہی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ

چنانچہ ان پتھروں پر چلتے چلتے جب ہمارے پاؤں سنگِ خارا اور خارِ مغیلاں سے چھلنی ہو گئے اور ہم کسی کو پاؤں اور منہ دکھانے کے قابل نہ رہے تو ہم نے اس کہکشاں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔

* *

قوم سے خطاب!

محمد عادل گلزار

خطاب کا مطلب ہے، گفتگو، ہمکلام ہونا، بات چیت کرنا، مخاطب ہونا۔ اس کے علاوہ خطاب ایک اعزاز بھی ہے، جو بادشاہ یا سرکار کی جانب سے دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ 'خطاب' دیا جائے تو 'اعزاز' اور کیا جائے تو 'عذاب' ہوتا ہے! قوم سے خطاب ہر سربراہ کا اولین خواب، خواہش اور شوق ہوتا ہے۔ قوم سے خطاب کے لیے ضروری نہیں کہ سربراہ قوم سے مخاطب ہو۔ قوم سے خطاب کے لیے، بے زبان کیمرے اور سرکاری ٹیم کا ہونا ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ کسی بھی وزیراعظم یا صدر کے لیے یہ بات باعثِ عزت ہوتی ہے کہ وہ 'پاکستانی قوم' سے خطاب کر رہا ہے، جس سے اکثر مہنگائی، بے روزگاری، بدامنی، سفارش، رشوت اور لاقانونیت مخاطب رہتی ہیں۔

قوم سے خطاب کے لیے چند ایک چیزیں لازم و ملزوم ہوتی ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

تلاوت

ترانہ

سرکاری ٹی وی

قائداعظم کی تصویر

جھنڈا (غیر جمہوری سربراہ کے پاس ڈنڈا بھی ہوسکتا ہے)

اور

سب سے ضروری چیز، یعنی خطاب کرنے والا، یا والی

جس طرح کرکٹ کے میدان میں زیادہ وکٹیں لینے والے کامیاب باؤلر اور زیادہ سنچریاں یا اسکور کرنے والے کو کامیاب بیٹس مین تصور کیا جاتا ہے، اسی طرح سیاسی میدان میں اقتدار کی وکٹ پر کامیاب سربراہ اُسے تصور کیا جاتا ہے، جو سب سے زیادہ، قوم سے خطاب کرتا ہے۔

قوم سے خطاب کرنے کا مقصد ہرگز ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ قوم کو کوئی ریلیف یا پیکج دیا جائے، بلکہ اس کا مقصد بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ صدر یا وزیراعظم یہ بتا سکیں کہ:

السلام علیکم! میرے عزیز ہم وطنو! آپ کا موجودہ صدر یا وزیراعظم 'میں' ہوں اور میں مکمل طور پر 'خود مختار' بھی ہوں۔ میرے آج کے خطاب کا مقصد بھی صرف یہ ہے کہ میں آپ کو بتا سکوں کہ 'جس' کو آپ لوگ اب تک 'صدر، وزیراعظم' سمجھتے رہے، وہ پاکستان کا آئینی صدر، وزیراعظم نہیں تھا۔ اور جو ایسا سمجھ رہے تھے، وہ اپنی اصلاح فرمالیں۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ سربراہانِ مملکت جو کہنا چاہتے ہیں، وہ کہہ نہیں پاتے کیوں کہ اُنہیں وہ لکھ کر نہیں دیا جاتا اور خطاب لکھنے والے تو ہوتے ہی لکیر کے فقیر ہیں۔ ایک اور فائدہ ہے، قوم سے خطاب کا۔ اور وہ یہ ہے کہ کم از کم اس میں پاکستان کا پورا نام لیا جاتا ہے، یعنی 'اسلامی جمہوریہ پاکستان'، جو شاید ایسے ہی خاص مواقع کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔

سربراہانِ مملکت پر وقت کی پابندی کی شرط بھی عائد نہیں ہوتی، کیوں کہ وہ مختارِ کُل ہیں، بچے دیں یا انڈے، اُن سے کوئی بھی نہیں پوچھ سکتا۔

کبھی کبھار خطاب انگریزی میں کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہر بات قوم کو بتلانے کی نہیں ہوتی، یا قوم میں سننے کا حوصلہ نہیں ہوتا!

بعض لوگ خطاب کو گناہ کے مترادف تصور کرتے ہیں، اس لیے کہ خطاب نہ کرنے سے ایک اُمید بندھی رہتی ہے۔ اور اُمید سے دنیا اور پاکستان قائم ہے۔ نا اُمیدی گناہ ہے اور جو خطاب نا اُمید کرے وہ گناہ نہیں تو اور کیا ہے۔

سُنا ہے خطاب کرنا بھی کوئی خالہ جی کا گھر نہیں، اس کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ بعض خطاب تو ایسے ہوتے ہیں، جنہیں سن کر لگتا ہے کہ پاپڑ بیلنے والے بھی قوم سے خطاب کر سکتے ہیں!

آخر میں مہاتما بدھ کا ایک قول یاد آ رہا ہے۔ مہاتما بدھ کہتا ہے، 'دنیا دکھوں کا گھر ہے'۔ سرکاری ٹی وی پر خطاب دیکھ کر اس قول کی صداقت پر یقین آ جاتا ہے!

* *

ہوم اکنامکس

محمد عثمان فاروق

ہوم اکنامکس بہت اچھی چیز ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، یہ کسی شخصیت کا نام ہے، یا یہ کوئی کھانے کی چیز ہے۔ نہیں... بلکہ یہ فزکس، میتھ کی مانند بیہودہ سا مضمون ہے۔ جس کا مقصد طالب علموں کو پریشان کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ ہوم اکنامکس کا تعلق لڑکیوں کے کھانا بنانے سے متعلق ہے۔ لڑکیوں کو ہوم اکنامکس اتنے ہی دھیان سے سیکھنا چاہیے، جتنی دھیان سے وہ شاہ رخ خان کی فلمیں دیکھتی ہیں، کیوں کہ اگر انھوں نے ہوم اکنامکس نہ سیکھا تو وہ کھانا اچھا نہیں پکا سکیں گی، جس سے شادی کے بعد اُن کے لیے مسائل پیدا ہوں گے۔ شوہر دال ماش کی فرمائش کرے گا، یہ آلو گوشت پکانے کا کہیں گی۔ وہ بھنڈیاں پکانے کا کہے گا، یہ برگر کھانے کا مشورہ دیں گی۔ وہ کڑاہی کی فرمائش کرے گا، یہ ڈائیٹ کا مشورہ دیں گی۔ اس طرح کی صورتِ حال میں شوہر ناراض ہوگا، ساس طعنے دے گی۔ لڑائیاں ہوں گی۔ برتن ٹوٹیں گے۔ بلیاں کودیں گی۔ محلے والے باتیں بنائیں گے۔ ملک میں فسادات ہوں گے۔ لوڈشیڈنگ ہوگی۔ پیٹرول مہنگا ہوگا۔ آٹا نایاب ہوگا۔ دھماکے ہوں گے۔ دھاندلیاں ہوں گی۔ اسٹاک مارکیٹ گر جائے گی۔ خزانہ خالی ہو جائے گا۔ خودکشیاں بڑھ جائیں گی۔ ملک دیوالیہ ہو جائے گا۔ محکمۂ بہبودِ آبادی والے دیکھتے رہ جائیں گے۔ آبادی بڑھ جائے گی۔ بے روزگاری عام ہوگی۔ چور آئیں گے۔ ڈکیتیاں ہوں گی۔ رشوتیں لی جائیں گی۔ سرکار کرپٹ ہو جائے گی۔ کرکٹ ٹیم ہار جائے گی۔ فحاشی پھیل جائے گی۔ بیرونی قرضہ بڑھ جائے گا۔ امریکا حملہ کر دے گا۔ انڈیا میزائل مار دے گا۔ اسرائیل چڑھ دوڑے گا۔ روس آن ٹپکے گا۔ بیڑہ غرق ہو جائے گا۔ ستیاناس ہو جائے گا۔ توبہ توبہ ہو جائے گی۔ قیامت آجائے گی۔ غدر مچے گا۔ سر کٹیں گے۔ لاشے گریں گی۔ اسکینڈل بنیں گے۔ ٹائر جلیں گے۔ کتے بھونکیں گے۔ درخت کٹیں گے۔ آلودگی بڑھے گی۔ بندے مریں گے۔ ڈنڈے پڑیں گے۔ یہ

سب ہونے سے بہتر ہے کہ ہوم اکنامکس پہ دھیان دے لیا جائے، اسے سیکھ لیا جائے، تاکہ ملک بچ جائے۔ ملکی سالمیت کی خاطر ملکی ترقی کی خاطر... آپ کی بڑی مہربانی ہوم اکنامکس سیکھ لیں۔ آپ کو خدا کا واسطہ اِسے سیکھ لیں۔ آپ کو کچھ پکانا آجائے گا تو بے چارے شوہر کے منہ میں کوئی ڈھنگ کا کھانا چلا جائے گا، ورنہ شوہر کی آدھی عمر شادی سے پہلے لڑکیوں کو اشارے کرتے اور باقی آدھی عمر بیوی کے اشاروں پہ ناچتے گزر جاتی ہے۔ ہم امریکا کو واضح بتا دینا چاہتے ہیں کہ اُس کا ظلم اور جبر ہمیں روک نہیں سکتا۔ ہم انقلاب ہوم اکنامکس لے کر آئیں گے۔ ہم اپنی جان دے دیں گے۔ جاؤ تم جو مرضی کر لو۔ ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ہم نے اپنے قلموں میں سیاہی کی بجائے بارود بھرا ہوا ہے۔ جب تک ہمارا مشن مکمل نہیں ہو جاتا، ہمارا قلم آگ اُگلتا رہے گا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تمام پاکستانی عوام کو جاگ جانا چاہیے، اور سمجھنا چاہیے، پاکستان کی فلاح فوجی آمریت میں نہیں، بلکہ ہوم اکنامکس میں ہے۔ اے خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے لوگو! اُٹھو اور وقت کی پکار سنو۔ یہ دور ہوم اکنامکس کا دور ہے، تم ابھی تک ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر سیکھ رہے ہو۔ جب کہ مغربی دنیا ہوم اکنامکس سے کام لے کر کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے۔ دنیا پلوٹو پر پہنچ چکی ہے اور ہم ابھی تک... یہ سب کیا ہے؟ یہ سب ہوم اکنامکس سے دُوری کا نتیجہ ہے۔ ہم تمام زنجیریں توڑ کر انقلابِ ہوم اکنامکس لے کر آئیں گے۔ اقوام متحدہ سن لے، جنرل اسمبلی سن لے۔ ہمارے دل ہوم اکنامکس کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ اگر ہمیں روکا گیا تو ہم آسمان چیر ڈالیں گے۔ زمین پھاڑ ڈالیں گے۔ بحیرۂ عرب خشک ہو جائے گا۔ بحرالکاہل کی مچھلیاں مر جائیں گی۔ ہم دریاؤں کے پاٹ روک دیں گے۔ ہم کافروں کا تیل بند کر دیں گے۔ کے ٹو ٹوٹ جائے گا۔ ماؤنٹ ایورسٹ میں شگاف پڑ جائیں گے۔ ہم تاریخ رقم کریں گے۔ یہ تاریخ وہ والی تاریخ نہیں، جو کیلنڈروں میں لکھی ہوتی ہے، بلکہ وہ تاریخ ہے، جو بلاوجہ زبردستی اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے اور عجب بے تکے سوال پوچھے جاتے ہیں۔ امتحان میں سوال آیا اکبرِ اعظم نے پہلی جنگ کب لڑی۔ اب بندہ اُس سے پوچھے میں اکبرِ اعظم کا پھوپھا لگتا ہوں، مجھے کیا پتا اُس نے پہلی جنگ کب لڑی۔ بہر کیف، ہم اتنا جانتے ہیں، ہمارا یہ مضمون پڑھ کر ایک لڑکی بھی راہِ راست پر آ گئی تو ہم سمجھیں گے ہم نے اپنا حق ادا کر دیا۔ کل روزِ محشر خدا پوچھے گا، دنیا سے کیا لایا؟ بس یہی مضمون پیش کر دوں گا، جو کہ میری ابدی نجات کا باعث بن جائے گا۔

تعزیت کا سلیقہ

محمد عثمان جامعی

موت سے کس کو رستگاری ہے۔ تاہم، موت کا ایک دن معین ہے، چنانچہ مرنا کتنا بھی مشکل ہو، ہر شخص صرف ایک بار ہی مرتا ہے (بس آمر و جابر حکمرانوں کو یہ استثنیٰ حاصل ہے کہ وہ نام اور مقام کی تبدیلی کے ساتھ بار بار پیدا ہوتے اور مرتے ہیں اور ہر بار بُرے انجام سے دوچار ہونے کے باوجود 'آواگون' کا یہ سلسلہ ترک کرنے پر آمادہ نہیں... ڈھیٹ کہیں کے!) لیکن زندگی میں کچھ ایسے کٹھن مرحلے بھی آتے ہیں، جن سے بیسیوں مرتبہ دوچار ہونا ہوتا ہے۔ مثلاً تعزیت۔

ہم نہ صرف خود تعزیت کے قواعد و ضوابط، زبان و بیان اور مسائل سے نا واقف ہیں، بلکہ ہمارے حلقۂ احباب میں بھی ایسے کئی حضرات موجود ہیں، جو یوں تو گفتار کے غازی ہیں، مگر میدانِ تعزیت میں قدم رکھتے ہی نرے 'نیازی' ثابت ہوتے ہیں۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ جب کسی مرحوم کے لواحقین کی دلجوئی کی نیت سے جاتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہیں۔ ہمیں ایسے موقع پر پوچھا جانے والا سوال 'کیا ہوا تھا...؟' اُس وقت انتہائی لغو معلوم ہوتا ہے۔ جب مرنے والا زندگی کی ستر، اسّی بہاریں دیکھ کر دنیا سے رخصت ہوا ہو، بھئی اب یہ نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا؟ مگر صاحب! شاباش ہے مرحومین کے لواحقین کو کہ ایک دن میں درجنوں مرتبہ اس روایتی سوال کا جواب پوری تفصیل سے اور تمام تر جزئیات بیان کرتے ہوئے اس طرح دیتے ہیں، گویا اگر مرحوم کے آخری دن، خاص طور پر آخری لمحات کے بارے میں کوئی ایک بات بھی بیان کرنے سے رہ گئی، تو مردے کی بخشش نہ ہو پائے گی۔ اب صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ 'تعزیت کنندہ' سر جھکائے، چہرے پر مصنوعی افسردگی سجائے اور وقتاً فوقتاً 'چہ چہ'، 'اوہو'، 'اچھا' کے بے ساختہ سے زیادہ خود ساختہ ردِ عمل کے ساتھ، جانے والے کے اختتام بالخیر کی تفصیل اس دلچسپی سے سن رہا ہے، جیسے ان 'گراں قدر' معلومات کے بغیر اس کا علم ادھورا رہ جائے گا۔ وہ تہہ دل سے خواہش مند ہے کہ

جلد از جلد 'موت کا منظر' بیان ہو جائے، تا کہ وہ فاتحہ پڑھ کے گھر کی راہ لے، لیکن اِدھر ابھی موت سے ایک روز پہلی والی رات کا بیان ہی چل رہا ہوتا ہے۔ دوسری طرف اس 'تعزیت کنندہ' سے کچھ فاصلے پر بیٹھے دیگر اصحاب یہ سوچ کر بے حال ہو رہے ہیں کہ اُنہیں 'کیا ہوا تھا' کے جواب میں یہ تمام تفصیل دوبارہ سننی پڑے گی!

مرنے والوں کے لواحقین کا معاملہ یہ ہے کہ اُنہیں کم اَز کم سوئم تک فرصت ہی فرصت ہوتی ہے، لہٰذا وہ کریں تو کیا کریں؟ اب اگر مرحوم یا مرحومہ کوئی نامور ہستی ہوں، جنہوں نے کسی شعبے میں کارہائے نمایاں سرانجام دے کر عالمِ آب و گِل سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کیا ہو، تو اُن کے بارے میں تو کہنے سننے کو بہت کچھ ہوتا ہے، لیکن جن اصحاب کی زندگی 'بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے' کے سوا کچھ نہ ہو اور جو خواتین مردم شماری کے خانے میں نورِ نظر اور لختِ جگر کے نام بڑھوانے کے علاوہ کسی شعبۂ حیات میں کوئی اضافہ نہ کر سکی ہوں، اُن کے بارے میں کتنی اور کہاں تک گفتگو ہو سکتی ہے؟ لہٰذا ایسے خواتین و حضرات کے گزر جانے کا احوال جاننے کی خواہش میں آپ کو جو تفاصیل سننا پڑتی ہیں، وہ کچھ یوں ہوتی ہیں:

> صبح کوئی آٹھ بجے کے قریب اُٹھے (ہچکیاں) منہ دھویا (کیا زندگی میں پہلی بار دھویا تھا؟) میں نے کہا، ابا ناشتا دوں؟ (بے وقوف! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی!) کہنے لگے، ہاں۔ میں نے سلیم کو بھیج کر انڈا منگوایا، وہ گندہ نکلا... کون؟ سلیم؟... نہیں بہن، انڈا! میں نے دوسرا انڈا منگوایا۔ فرائی کیا۔ ساتھ پراٹھا بنایا، چائے بنائی، ٹرے میں ناشتا سجا کر دیا۔ ماشاء اللہ پورا انڈا کھا لیا اور پراٹھا بچ گیا تو چائے میں ڈبو ڈبو کر کھایا۔ (تم سر پر سوار نوالے گن رہی تھیں...؟) پھر کہنے لگے، بہو! ایک کپ چائے اور دے دو۔ میں نے دوسرا کپ دیا، خوب مزے لے لے کر سڑپ سڑپ کر چائے پی۔ کہنے لگے، بہو! تمہارے ہاتھ میں بڑی لذت ہے۔ چھوٹی بہو کے پکائے ہوئے کھانے کے تو چند نوالے کھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ (پتا نہیں، وہ تمہیں پانی پر چڑھائے رہے تھے، یا تم جھوٹ بول رہی ہو!) ناشتے کے بعد ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگے۔ میں کسی نہ کسی کام سے کئی بار ڈرائنگ روم میں گئی۔

مجھے دیکھتے ہی چینل تبدیل کر دیتے تھے! دوپہر کو میں نے کہا، ابا کھانا کھا لیجیے۔ (تم کھلا کھلا کے مار رہی تھیں!) کہنے لگے، لے آؤ۔ میں نے کھانا لا کر دیا۔ ویسے تین روٹیاں کھاتے تھے، لیکن اُس وقت چار کھائیں۔ پھر سو گئے۔ شام کو اُٹھے تو بُری طرح کھانس رہے تھے۔ میں نے سلیم سے کہا کہ دادا کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ، واپسی میں کوئی نئی فلم بھی لیتے آنا۔ کوئی شام سات بجے سلیم واپس آیا۔ ایک ہاتھ میں فلم تھی، دوسرے میں دادا! فلم میز پر رکھ دی اور دادا کو بستر پر لٹا دیا۔ میں نے کہا، سلیم میں فلم دیکھ رہی ہوں، تم دادا کو دیکھو۔ (پھر ہچکیوں اور آنسوؤں کے ساتھ) اے بہن! فلم کا انٹرویل بھی نہیں ہوا تھا کہ ابا کا اینڈ ہو گیا۔ وہ والا گانا چل رہا تھا (سوچتے ہوئے) اے سلیم! کون سا گانا تھا؟ 'کہاں چلی مری چھمو رانی' اے ہاں، یہ گانا شروع ہی ہوا تھا کہ سلیم بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور کہنے لگا، اماں! دادا سانس نہیں لے رہے۔ میں نے کہا بیٹا! بڑھاپے میں یادداشت کمزور ہو جاتی ہے، سانس لینا بھول گئے ہوں گے، جگا کے یاد دلا دے۔ کچھ دیر بعد پھر آیا، کہنے لگا، اماں دادا اُٹھائے نہیں اُٹھ رہے۔ اب جو میں نے جا کے دیکھا، ارے وہ تو سرے سے اُٹھ چکے تھے ے ے ے (رونا شروع)۔

اسی طرح لواحقین کی جانب سے بیان کردہ رُوداد مرحومین کے صبح بستر سے اُٹھنے سے لے کر دنیا سے اُٹھنے تک، ایک دن کی تمام ضروری اور غیر ضروری مصروفیات پر مشتمل ہوتی ہے، جس میں اُن کے کھانے پینے، نہانے دھونے، اُٹھنے بیٹھنے، کھانسنے، کھنکارنے اور ڈکاریں مارنے تک کا تذکرہ شامل ہوتا ہے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ مرحوم مرنے سے کچھ دیر پہلے تک بھلے چنگے، ہٹے کٹے اور ہشاش بشاش تھے۔ غالباً لواحقین توقع اور خواہش رکھتے ہیں کہ برسات، طوفان اور حکومت کا تختہ اُلٹنے کی طرح موت کی بھی کچھ علامات اور نشانیاں پہلے سے ظاہر ہو جائیں، تاکہ تجہیز و تکفین کی تیاری 'ایڈوانس' کی جا سکے۔ ویسے قبر کی جگہ ملنے میں پیش آنے والی مشکلات کو دیکھتے ہوئے یہ خواہش کچھ بے جا بھی نہیں!

ہمارے ہاں عموماً ساٹھ سال کی عمر کے بعد دنیا سے گزرنے والا ہر شخص 'مقامِ ولایت' پر فائز نظر آتا ہے، جسے اپنی موت کا علم ہو جاتا ہے۔ وہ مختلف طریقوں سے اپنی اس باخبری کا اظہار بھی

کردیتا ہے۔ مثلاً، اگر کوئی صاحب اپنی وفات سے کچھ روز، یا چند گھنٹے قبل اپنے کسی بھولے بسرے دوست سے ملاقات کرلیں، بدنما بیوی کی خوش نما الفاظ میں تعریف کردیں، ایک دو مرحومین کا تذکرہ لے کر بیٹھ جائیں، یا بیگم سے ڈرتے ڈرتے اپنے کسی پسندیدہ کھانے کی فرمائش کردیں تو اُن کے اہلِ خانہ کو اِس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں رہتا کہ وہ اپنی موت کے بارے میں پہلے سے جانتے تھے۔

یہی معاملہ 'نور' کا ہے۔ ہمارے ہاں کسی کے چہرے پر زندگی میں کتنی بھی پھٹکار رہی ہو، مرنے کے ساتھ ہی اُس کا چہرہ نورانی ہوجاتا ہے۔ جذبات سے مغلوب لواحقین مردے کا چہرہ دل کی آنکھ سے دیکھ کر اُس کے پُرنور ہونے کا انکشاف فرماتے ہیں اور دیگر اہلِ جنازہ 'خیالِ خاطر احباب' کے باعث سر ہلا ہلا کر اِس نورانی انکشاف کی تصدیق کرتے ہیں۔ ہمارا کئی بار ایسی صورتِ حال سے پالا پڑا، جب مردے کا چہرہ دکھاتے ہوئے ہم سے کہا گیا، ''دیکھیے، کتنا نور ہے۔'' اور ہم، اپنی کم عقلی اور 'پاکستانی آدابِ جنازہ' سے ناواقف ہونے کی وجہ سے مردے کے چہرے کی بجائے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ ایسے میں برہم لواحقین، یا تو چہرہ ڈھانپ دیتے ہیں، یا ہمیں ہانک دیتے ہیں۔

ایک دفعہ تو غضب ہوگیا۔ ہوا یوں کہ ہمارے ایک عزیز فوت ہوگئے۔ مرحوم بہت نیک خصلت پولیس افسر تھے، اپنی پوری تنخواہ غریبوں کو دے دیتے تھے۔ کہتے تھے، نیکی کا کام مَیں حلال کمائی ہی سے کروں گا۔ چنانچہ اُنہیں میسر حلال کمائی کی طرح اُن کی نیکیاں بھی بڑی محدود تھیں۔ اِس محدود حلال کمائی کو چھوڑ کر موصوف نے اپنے 'پولیسانہ جلال' سے وہ کمال کمائی کی کہ اگر یہ مال ساتھ لے جاسکتے تو اپنی جنت آپ بنا لینے پر قادر تھے! بہرحال، ہم اپنے اِن عزیز کی میت کا آخری دیدار کر رہے تھے کہ اچانک کسی نے عین ہمارے کان پر منہ رکھ کر ہچکیوں بھری آواز میں 'کتنا نور ہے' کہا، تو ہم ایک ساتھ چونک اور اُچھل پڑے۔ اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں مرحوم کے چہرے کا دیدار کیا تو وہاں نور تو کجا، کسی موہوم سی کرن کا بھی نام ونشان نہ تھا۔ بے اختیار نور کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ یکایک ہماری نظر مرحوم کی تیسری اور آخری کم عمر ترین بیوہ پر جا ٹکی اور ہم اُن کے رُخِ روشن پر پھیلے نور سے روشنی کشید کرنے لگے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ہمارے ایک بہی خواہ نے 'کیا کر رہے ہو' کہہ کر ہمیں ہمارے کمینے پن کا احساس دلا دیا، ورنہ مرحوم کے مرد لواحقین اگر

ہماری یہ 'تعزیتی نظر بازی' دیکھ لیتے تو وہاں سے ایک کی بجائے دو جنازے اُٹھ رہے ہوتے!

انور احمد علوی

ایک تو رموزِ تعزیت سے ناواقفیت کی وجہ سے جنازوں میں ہمارے لیے اظہارِ غم دوبھر ہوتا ہے، دوسرے عجب اتفاق ہے کہ ہم نے اب تک جن جنازوں میں شرکت کی ہے، اُن میں سے زیادہ تر ایسے اصحاب کے تھے، جن کے کردار و اعمال سے ہم اتنی اچھی طرح واقف تھے کہ انھیں اچھا کہنا ہمارے لیے 'زہرِ ہلاہل' کو 'قند' کہنے کے مترادف تھا۔ اور اگر ہم طوعاً و کرہاً ایسا کرنا چاہتے بھی تو کوئی قابلِ تعریف پہلو ڈھونڈ نکالنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا۔ ایک بار اس کوشش میں ہماری خاصی درگت بن چکی ہے۔ ہوا یوں کہ ہمارے ایک محلے دار چل بسے۔ یوں تو مرنے والوں کو بُرا کہنا کوئی اچھی بات نہیں، لیکن یہ مرحوم اُن مرنے والوں میں شامل تھے، جن کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہوئے لگتا ہے، 'جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں'۔ بہرحال، میت کے گھر کے باہر بچھی دری پر دوسروں کی طرح ہم بھی غم زدہ منہ بنا کر بیٹھ گئے۔ ایسے مواقع پر مردوں کے مثبت اوصاف کا تذکرہ ہوتا ہے، مگر وہاں تو مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شاید ہماری طرح دیگر حضرات بھی اس فکر میں غلطاں تھے کہ مرحوم کے اوصاف میں سے 'ایسا کہاں سے لائیں کہ 'اچھا' کہیں جسے!' بالآخر بڑی سوچ بچار کے بعد ہم مرحوم کی شخصیت کا ایک قابلِ ذکر 'فوری بعد از موت' پہلو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور گویا ہوئے، ''کبھی کسی کو بلاوجہ تنگ نہیں کیا، ہمیشہ پہلے کوئی وجہ تراشتے تھے۔'' ہمارا یہ 'کلمۂ توصیف' سن کر مرحوم کے صاحبزادے کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ آسمان کو یوں تکنے لگے، جیسے وہاں محوِ سفر اپنے 'ابا جی' کو دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے ہوں، 'دیکھیں ابا جی! آپ کی ایک خوبی دریافت ہو ہی گئی! لیکن یہ تاثر زیادہ دیر قائم نہیں رہا۔ چند ساعتوں بعد جب ہمارے 'کلمۂ توصیف' کے معنی اُن کی سمجھ میں آئے تو وہ چونک اُٹھے اور 'اب کیا بک رہا ہے' کہہ کر ہماری جانب لپکے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ لوگوں نے اُنھیں یہ کہہ کر روک دیا کہ لڑائی جھگڑے سے میت کو تکلیف ہوگی، ورنہ وہ تو ہمیں تکلیف دے کر میت بنا دینے کے موڈ میں نظر آ رہے تھے!

ہمارے دوست دانا ہوشیار پوری کو نہ صرف اظہارِ تعزیت میں کمال حاصل ہے، بلکہ تعزیتی کلمات ادا کرتے ہوئے وہ مردے میں ایسے ایسے اوصاف تلاش کر لیتے ہیں کہ اگر وہ زندہ ہو تو اپنے بارے میں یہ دل خوش کن انکشافات سن کر شادیِ مرگ کا شکار ہو جائے۔ دراصل دانا ہوشیار رنگِ ادب ولی بکنیز

محمد عثمان جامعی ...... تعزیت کا سلیقہ

[illegible]

پوری صاحب کا معاملہ یہ ہے کہ اُن کا اُٹھنا بیٹھنا حکمرانوں، سیاست دانوں اور اعلیٰ سرکاری حکام کے ساتھ ہے، جس کی وجہ سے اُنہیں جھوٹی تعریف پر پوری قدرت حاصل ہوگئی ہے۔ ابھی کچھ روز پہلے کی بات ہے۔ ہمیں دانا صاحب کے ساتھ ایک مرحوم سیاست داں کے تعزیتی جلسے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سیاست داں کی سیاسی و نجی زندگی سے کوئی تعریفی پہلو ڈھونڈ نکالنا، ہمارے اُن بعض ثقہ کالم نگاروں کے لیے بھی ممکن نہیں تھا، جو ذاتی تعلقات، یا مفادات کی بنیاد پر فرعون کے لیے بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ سیاست میں شرافت کے قائل ہیں، اپنے سیاسی مخالفین کو مشکلات کا شکار نہیں کرنا چاہتے، اس لیے اُنہیں پیدا ہوتے ہی مار دیتے ہیں۔ لیکن دانا صاحب نے اپنی تقریر میں اُس سیاست داں کی زندگی سے توصیف کے وہ وہ پہلو نکال کر پیش کر دیے کہ ہم اُن کی نکتہ سنجی پر اش اش کر اُٹھے۔ فرمانے لگے:

> ارے صاحب! مرحوم میں کیا رواداری تھی، اپنے لیے سب کچھ روا سمجھتے تھے۔ وضع دار اتنے کہ اپنے سیاسی کیریئر کے آغاز میں، پارٹی کے مشکل وقت میں اسے چھوڑ دینے کی جو روش اپنائی تو عمر بھر نبھائی۔ پُرانے دوستوں کو کبھی نہیں بھولتے تھے۔ جو پارٹی بھی چھوڑی، اُس میں دوبارہ دو تین بار ضرور شامل ہوئے۔ یوں تو وہ پورے پاکستان پر سو سو جان سے فدا تھے، مگر اسلام آباد کے تو عاشقِ صادق تھے۔ کہتے تھے، میاں! ہم فقیروں کو حکمرانی سے کیا غرض، ہم تو ہر حکومت میں صرف اس لیے شامل ہوتے ہیں کہ اسلام آباد میں رہنا نصیب ہو جائے۔ سیاسی وفاداری اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، کبھی کسی حکمراں جماعت سے بے وفائی نہیں کی۔ فن کے بے حد قدرداں تھے۔ خاص طور پر فلمی صنعت کے تو دلدادہ تھے۔ فلمی اداکاراؤں کے لیے اُن کے گھر کے دروازے، اداکاراؤں کے گھر میں داخل ہونے تک کھلے رہتے تھے! خواتین کا بہت احترام کرتے تھے۔ اُن کے آدمی جب بھی کسی نوخیز ماڈل گرل، یا ہیروئن کو اغوا کر کے لاتے، اُس کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے! بیواؤں اور مطلقہ خواتین سے خاص ہمدردی تھی۔ ایسی خواتین کی شادی کے لیے فکر مند رہتے۔ کسی اور پر اعتبار نہیں تھا، اس لیے ایسی خواتین کو خود ہی اپنا لیتے تھے۔ بیوہ سے شادی کو بہت بڑی نیکی تصور کرتے تھے، چنانچہ کئی خواتین کو بیوہ

کروا کے اپنے عقد میں لے آئے۔ اُن کے بعض قریبی دوستوں کا تو یہ کہنا ہے کہ مرحوم نے مرنے کے بعد چار بیوائیں ضرور چھوڑیں، مگر اپنی زندگی میں اپنے اردگرد کوئی بیوہ نہیں چھوڑی! چوں کہ نیکی چھپا کر کرنے کے قائل تھے، اس لیے ایسی تمام شادیاں سات پردوں میں چھپا کر رکھیں۔ اپنے ادوارِ وزارت میں پوری دیانت داری کا مظاہرہ کیا اور کمیشن اور کک بیکس کی رقوم ایمان داری سے سیکریٹریوں میں تقسیم کرتے رہے۔

دانا ہوشیار پوری صاحب کی یہ 'مدح سرائی' سن کر ہم نہ صرف اُن کے ممدوح کے اوصافِ حمیدہ پر ایمان لے آئے، بلکہ ہمیں تعزیت کا سلیقہ بھی آ گیا!

* * *

متضاد ناموں کا تماشا

محمد ممتاز راشد

کچھ نام یقیناً ایسے ہوتے ہیں کہ کسی کی شخصی خوبیوں سے لگا کھا رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً، کسی خوبرو دوشیزہ کا نام ’حسینہ‘ ہو یا کسی سرو قد کا نام ’صنوبر‘ ہو۔ یا پھر کسی مالدار خاتون کا نام ’امیر بی بی‘ وغیرہ وغیرہ۔ مگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو خاصی مضحکہ خیز صورت بن جاتی ہے۔ ماضی میں ایک پنجابی اکھان (محاورہ) تھا:

اکھوں دِسے نہ تے ناں نور بھری (آنکھ سے نظر نہیں آتا اور نام نور بھری ہے)

ایسی ہی متضاد کیفیت کے حامل نام اور بھی بہت سے ہیں۔ 1990ء کے عشرے میں ’تماثیل تھیٹر‘ لاہور میں ایک اسٹیج ڈرامہ ’شرطیہ مٹھے‘ کئی مہینے لگاتار چلا جس میں کامیڈین امان اللہ اور ببو برال نے دو اندھے بھائیوں کا کردار ادا کیا تھا اور نام ان کے اس اندھے پن کے خلاف تھے یعنی ’روشن‘ اور ’چراغ‘ ... اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچوں کے جو چھوٹے نام (نِک نیم) اُن کی بچپنے کی جس خصوصیت کی وجہ سے رکھے گئے وہ اُن کی بڑی عمر میں بھی اُن کی پہچان رہتے ہیں۔ مثلاً، ننھی، گڈی، بے بی اور بھولی وغیرہ... اب کسی بڑی بوڑھی کو ننھی یا گڈی کہیں یا کسی میڈم کو بے بی یا بھولی کے نام سے پکاریں تو عجیب تو لگے گا ہی۔ مرد حضرات میں بھی ایسی مثالیں عام ہیں۔ 1970ء کے عشرے کے بھاری بھرکم اور موٹے کامیڈین ’ننھا‘ کا نام واضح مثال ہے۔ کامیڈین اداکاراؤں میں ’ٹُن ٹُن‘ اور ’چُن چُن‘ بھی خاصی موٹی تھیں۔

متضاد ناموں میں کچھ نام طنزیہ یا مزاحیہ انداز کے بھی رکھ دیے جاتے ہیں۔ مثلاً، کسی بدعنوان کو ’صوفی ثناء اللہ‘ کہہ دیا جاتا ہے اور کئی بے ایمان تاجروں کو طنزاً حاجی صاحب کہہ کر بلایا جاتا ہے۔ نامور شاعر عبدالحمید عدمؔ کا ایک شعر بھی ایسی ہی صورتِ حال کا غماز تھا:

بوجھ اتنا بڑا گناہوں کا
حاجیوں کا جہاز ڈوب گیا

انور احمد علوی

اسی طرح طنزیہ طور پر کسی ’چالاک‘ کو ’بھولا‘ اور ’بھولے‘ کو ’میسنا‘ کہہ دیا جاتا ہے۔ مزاح کے انداز میں کسی کالے رنگ کے فرد کو ’گورا‘ یا ’چٹا‘ کہہ دینا اور کسی بدصورت کو ’سوہنا‘ کہنا بھی عام بات ہے۔

البتہ کسی گورے چٹے فرد کا نام ’کالا‘ یا ’کالو‘ ذرا کم ہی سننے میں آتا ہے۔ متضاد ناموں میں اتفاقاً یہ بھی ہو جاتا ہے کہ کسی بدمعاش کا نام ’شریف‘ اور کم صورت خاتون کا نام ’حسینہ‘ ہوتا ہے۔ طنزیہ متضاد ناموں میں کسی کمزور فرد کو ’پہلوان‘ کہہ کر پکارنا بھی شامل ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کمزور فرد کو کہنا ’پہلوان‘ ہی ہے چاہے اس کا نام ’چڑی پہلوان‘ رکھ دیا جائے۔

بعض انوکھے نام متضاد تو نہیں ہوتے البتہ کسی شخص کی ذاتی خوبی یا خامی کی عکاسی کے بطور ’علامت یا استعارہ‘ کی شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ مثلاً، ایک ٹھگنے کامیڈین کا نام ’جندرا پہلوان‘ تھا۔ جندرا پنجابی زبان میں تالے کو کہا جاتا ہے۔ ہمارے ایسے ایک پست قامت دوست کو بعض دوست ’جھونگا‘ کہتے تھے۔ ’جھونگا‘ وہ چند چنے، پھلیوں کے چند دانے یا میٹھی سونف کے چند دانے وغیرہ ہوتے تھے، جو دکاندار کوئی سودا خریدنے والے بچے کو چھوٹی سی مٹھی میں بھر کر بچے کی ہتھیلی پر رکھ دیتا تھا۔ 1990ء کے عشرے میں لاہور کے اسٹیج ڈراموں میں کم قامت کامیڈین ’کوڈو‘ کا نام نمایاں ہوا۔ ’کوڈو‘ کا اصل پنجابی لفظ ’کوڈا‘ ہے۔ اس کا مونث ’کوڈی‘ ہے یعنی ’کوڑی‘ وہی کوڑی کوڑی کی محتاج والی۔

* *

مجلسِ ترقیِ تنقید

محمد منور

انور ہوٹل کے مالک شیخ محمد انور اپنے گھر والوں کی بدقسمتی سے بڑے خوش ذوق واقع ہوئے ہیں۔ بذلہ سنج بھی ہیں، سخن فہم بھی اور ستم بالائے ستم یہ کہ شاعر بھی ہیں۔ اس لیے مقامی مجلسِ ترقیِ تنقید کے اکثر اراکین ہر شام، کھانا اپنے اپنے گھروں پر کھا لینے کے بعد ہوٹل مذکور پہنچ جاتے ہیں اور کھانا ہضم کرنے کے لیے کسی چورن یا جوارش کی جگہ عملی تنقید سے کام لیتے ہیں!

یہ تنقیدی محفلیں خدا کے فضل سے بڑی بارونق ہوتی ہیں۔ جس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ ہوٹل پر گاہکوں کے بیٹھنے کے لیے جگہ باقی نہیں رہتی اور انہیں کسی دوسرے ہوٹل کا رُخ کرنا پڑتا ہے۔ یوں اس ادبی خدمت کی برکت سے انور روز بروز مقروض تر ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ وہ اس مقروضیت کا علاج بالمثل سوچنے لگے، آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ جب مقروض رہنے کی عادت ہی پڑ گئی ہے اور یہ عادت بے لذت بھی نہیں تو پھر کیوں نہ کوئی ادبی مجلّہ نکال لیا جائے، تا کہ ذوقِ ادب اور ذوقِ مقروضیت دونوں کی بیک وقت اور بخوبی تسکین ہوتی رہے۔

یہ محفلیں خالص ادبی مزاج کی مالک ہوتی ہیں، یہی سبب ہے کہ تا حال کوئی ایسا حادثہ رونما نہیں ہوا، جس کے باعث پولیس کو دست اندازی کرنا پڑتی۔ زیادہ سے زیادہ کبھی کبھی بڑے ادبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ تو تکار ہو جاتی ہے۔ گاہے گاہے کسی نقاد کے خلاف بڑے سلیقے سے آستینیں بھی چڑھا لی جاتی ہیں۔ ہفتے میں ایک آدھ بار 'ناچیز کیا چیز ہے' کہتا ہوا کوئی ہاتھ کسی گریبان تک بھی رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ بعض تنقیدی دلیلوں کی تائید میں کوئی کرسی بھی کسی فقیر خدامست کی انگلی کی طرح بڑی بے نیازی سے اُٹھ جاتی ہے۔ مگر عموماً بیچ بچاؤ سا ہو جاتا ہے اور اہلِ محفل تقریباً خیریت ہی سے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ اور اگلے روز پھر نئے شوق اور تازہ ولولے کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں۔ تنقید بھی وہ شراب ہے کہ:

چھٹتی
نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

جب مجلسِ ترقیِ تنقید کی تشکیل ہوئی تھی تو اس وقت اس کے کچھ قواعد وضوابط بھی تھے، مگر کچھ مدّت کے بعد محسوس ہوا کہ اس سے ذوقِ تنقید عام نہیں ہو رہا۔ تنقیدی رُوح پابندیوں کے باعث، مرجھائی مرجھائی سی نظر آئی، اُس سبزے کی طرح جو کسی بھاری سِل کے نیچے اُگ رہا ہو، ظاہر ہے ایسا سبزہ ضعیف بھی ہوگا اور زرد رُو بھی۔ لہٰذا ہم نے تمام تر پابندیاں، بہبودیِ تنقید پر قربان کر دیں۔ یہی باعث ہے کہ اب ارکانِ مجلس کے لیے کسی طرح کی کوئی قید نہیں حتیٰ کہ علم کی بھی۔ کسی ناقد کے لیے پڑھا لکھا ہونا کیوں ضروری ہے؟ یہ سوال ہمارے بہت سے پیدائشی نقادوں کی طرف سے مسلسل اُٹھایا جا رہا تھا۔ اُن کا دعویٰ یہ رہا ہے کہ علم سے تو محض معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، اس سے عقل و دانش اور پھر تنقید پر کیا اثر پڑ سکتا ہے، اگر خدانخواستہ علم کا کوئی اثر عقل و دانش پر پڑ بھی سکتا ہو، تو ہم پوچھتے ہیں عقل و دانش کو یہ حق کس نے دیا کہ وہ تنقید کے پھٹے میں ٹانگ اُڑائے۔ اہلِ مجلس کا اِس بات پر بھی ایمان ہے کہ اہلِ ذوق اور بالخصوص اہلِ ذوقِ تنقید بنائے نہیں جاتے۔ وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نہیں گھڑے جاتے، وہ بنے بنائے اور گھڑے گھڑائے نازل ہوتے ہیں، یعنی ذوقِ تنقید لدُنّی نعمت ہے۔ اِس لیے ہر شخص جسے خدا توفیق دے اپنے وہبی ذوقِ تنقید کی بدولت یا یوں کہیے کہ بَل بوتے پر تنقید کر سکتا ہے اور جس قدر چاہے اور جس ادب پارے یا مصنف پر چاہے کر سکتا ہے، ہاں وہ اگر خود بخل سے کام لے تو اس کی مرضی، اس اجتناب کو بعض اہلِ محفل اگر مہربانی اور عنایت تصور کریں تو یہ ان کی کوتاہ بینی اور تنگ دلی ہوگی۔ زوالِ نعمت پر شکریہ ادا نہیں کرتے۔

اب تنقیدی ضوابط و قواعد تو اُڑ ہی چکے تھے، عام آدابِ مجلس بھی گراں گزرنے لگے۔ محسوس کیا گیا کہ آدابِ مجلس کی پابندی سے بھی رُوحِ تنقید پر کچھ اوس سی پڑ جاتی ہے اس لیے مجلس نے اپنے معزز شرکاء کو اس ضمن میں بھی کھلی چھٹی دے دی۔ چنانچہ اب اگر کسی 'مقالہ خوانی' کے دوران میں کوئی شریکِ مجلس گنگنا رہا ہو یا خط لکھوا رہا ہو یا پان کا مطالبہ کر رہا ہو یا چنوں سے شوق فرما رہا ہو یا کسی کے کان میں کسی کے خلاف میل ڈال رہا ہو یا خود کسی 'کن میلیے' سے اپنے کان کا میل نکلوا رہا ہو تو اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا، اس لیے کہ:

آج وہ کل ہماری باری ہے

تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ ناقدروں کے لیے کسی ادب پارے کو غور سے سننا، بلکہ محض سننا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ اگر کوئی ناقد سارا مقالہ، ساری غزل، ساری نظم یا افسانہ سن لیتا ہے، تو گویا صاحبِ قلم کے حق میں بدگمانی کا اظہار کر رہا ہے۔ وہبی نقاد سنے بغیر ہی رائے قائم کر لیتے ہیں، ادب پاروں کے بارے میں بھی، ادب پاروں کے خالقوں کے بارے میں بھی اور اپنی صحتِ فہم کے بارے میں بھی۔ البتہ بعض مواقع ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں جملہ ناقدین یا کم اَز کم ان کی معقول تعداد کسی ادب پارے کو سنے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس میں نقادوں کی ذاتی عنایت کا قصور نہیں ہوتا، یہ قصور سرتاسر صاحبِ قلم کا ہوتا ہے، جو ایسی غیر معمولی یعنی مخالفِ معمول کوئی شے پیش کر دیتا ہے کہ خواہ مخواہ توجہ کو جذب کر لیتی ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اتنے طویل عرصۂ عمر میں ہماری مجلس کو فقط ایک آدھ بار ہی کسی ایسے حادثے سے دوچار ہونا پڑا اور آپ جانتے ہی ہیں جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

ہماری اِن ادبی مجالس میں صدر کا وجود بڑا عبرت خیز ہوتا ہے۔ عبرت خیز سے مطلب ہے سبق آموز۔ شاید اب بھی بات واضح نہ ہوئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرار ناقد کو کسی روز کھونجے لگانا، یعنی گوشۂ خاموشی میں دھکیلنا یا کنارے لگانا (محاورۃً نہیں) مقصود ہو اسے مسندِ صدارت پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ ایک ذرا راز کی بات ہے، خدا کرے کوئی ایسا رُکنِ مجلس جسے صدر بننے کا موقع ملتا رہا ہو یا جس کو صدر بن جانے کا شوق لاحق ہو سن نہ لے، اگر سن لے تو خدا اسے خوش فہمی کی ایسی وافر توفیق ارزانی فرمائے کہ وہ سمجھ نہ سکے، کہنا یہ ہے کہ کسی کو صدر بنا کے اس سے انتقام لیا جاتا ہے، کیوں کہ صدر ہو کر کوئی شخص بیٹھ جاتا ہے۔ تو ایک طرح سے اس کے طوطیِ زبان کے پَر کتر جاتے ہیں۔ اور اہلِ مجلس کی طرف سے اس پر بالواسطہ طعن توڑنا، اس کی تضحیک کرنا جائز تر اور آسان تر ہو جاتا ہے، مقالہ نگار یا شاعر و افسانہ نویس پر جو گزرتی ہے وہ تو خیر گزرتی ہی ہے، اس کا کوئی مداوا ممکن نہیں۔ مگر جو صدر پر بیت جاتی ہے وہ خود صدر اور چند خوش تدبیر صدر سازوں کے سوا کوئی نہیں جانتا، لیکن اس سب کچھ کے باوصف حق یہ ہے کہ صدارت پھر صدارت ہے۔ بقول غالب:

یہ شوق وہ نہیں کہ نہ پورا کرے کوئی

نظم و نثر کے موضوعات ہر طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ایسی تحریریں جن کا کوئی نفسِ مضمون نہ ہو زیادہ مرغوب بھی ہوتی ہیں اور بارعب بھی اس لیے کہ جو بات ہماری سمجھ میں نہ آئے اسے سمجھانے والے 'معرفت' قرار دے دیتے ہیں۔ چنانچہ ہماری تسلی ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایسی نامشخص 'کاوشیں' تنقیدی دشنہ و خنجر کے لیے بہترین سامان مہیا کر دیتی ہیں۔ نفسِ مضمون کے تعین کی کوشش خود اپنی ذات میں ایک کارنامہ متصور ہوتا ہے۔ اس باب میں جو زیادہ بڑھ کر بولے، وہ سچا ہوتا ہے اور اسی کی رائے کے مطابق مجلس یہ مان لیتی ہے کہ صاحبِ قلم نے دیے گئے عنوان کے زیرِ پردہ اصل عنوان جو دیا ہے وہ کیا ہے اور پھر اس اعتبار سے نفسِ مضمون کیا ٹھہرتا ہے۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی نظم یا مقالے کا موضوع تلاش کرتے کرتے مجلس تحلیل ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ کھانا ہضم کرنے والی تنقید کا اس سے بہتر مصرف اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ البتہ ایک امر کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر اس شے سے دانستہ اجتناب عمل میں آتا رہے، جس کا دین و شرافت یا انسانی مثبت قدروں یا اخلاق و آداب سے کوئی تعلق ثابت کیا جا سکتا ہو۔ ایک تو اس لیے کہ ایسے مضامین خلوص کے ساتھ کی جانے والی تنقیدی ورزش برداشت نہیں کر سکتے۔ دوم اس لیے کہ یہ زندگی کے ترجمان نہیں ہوتے۔ آج کی زندگی نئی زندگی ہے اور وہ ترقی پذیر ہے اس اعتبار سے انسانیت سے بلند اور رفیع ہو چکی ہے۔ لازم ہے کہ اس کے لیے نئی قدریں تلاش کی جائیں۔ بعض احباب کہتے ہیں کہ جب تک نئی قدریں تعمیر نہیں ہو جاتیں کام چلانے کے لیے پرانی قدروں کو عمل میں رکھیے، لیکن اہلِ مجلس کے بانی ارکان کی اکثریت کہتی ہے کہ اگر پرانی قدروں کا سہارا میسر رہا تو نئی قدروں کی تعمیر میں سستی در آئے گی اس لیے بہتر ہے کہ پرانی قدروں کی کشتیاں یکسر جلا دی جائیں اور ہر سہارے سے بے نیاز ہو کر نئے میدان مارے جائیں۔

یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجلس بنی کیسے اور اسے چالو کیوں کر کیا گیا، یہ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ مجالس کے اصل رُوحِ رواں فقط چند افراد ہوتے ہیں۔ ہم بھی چند دوست اکٹھے ہو گئے اور چاہا کہ ذہنی ورزش کے لیے کوئی اکھاڑہ بنائیں، جس میں ہم اپنی ذہنی پہلوانی کا مظاہرہ کر سکیں۔ اور تو کوئی ٹھوس کام ہم سے ہوتا نہیں لہذا یہی کچھ کر گزریں۔ ہم اگر تنقیدی حسنِ ذوق کی دھاک بٹھا دینے میں کسی قدر کامیاب ہو جائیں تو یہ خدمت بھی خاصی ہے۔ یہ فیصلہ کر چکے تو جگہ کا مسئلہ فی الفور اُٹھ کھڑا ہوا اس لیے کہ ہم چند میں سے کسی کا بھی گھر اتنا وسیع نہ

بزمِ سخنہائے دو عالم

تھا اور نہ گھر والے اتنے روشن خیال تھے، اگر ہم کسی سڑک پر بیٹھ کر تنقید شروع کر دیتے اور لوگوں ے کہتے کہ آؤ، سنو، دیکھو ہم تمہاری خدمت کے لیے تنقیدی فن کا مظاہرہ کرنے لگے ہیں تو ہمیں ائد کے بجائے فقید العقل سمجھ لیا جاتا۔ ویسے بھی وہ دور مرزا غالب کے ساتھ ہی ختم ہو گیا جب لوگ رہ گزر میں بیٹھ رہتے تھے اور انہیں اُٹھانا صحیح نہیں گردانا جاتا تھا، نیز یہ کہ وہ باتیں جو خوفِ فسادِ خلق سے سرِ راہ نہیں کہی جا سکتیں وہ کمروں میں بخوبی و باطمینان بیان کی جا سکتی ہیں۔

مجلس کو چالو رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ چند مقالے پیشگی تیار کر لیے جائیں، شہر میں شاعروں کی کمی نہ تھی۔ افسانہ نگار بھی خاصی تعداد میں موجود تھے، مگر حد یہ ہے کہ کسی علمی و ادبی مجلس کی دھاک فقط مقالوں ہی سے بیٹھتی ہے۔ شاعر و افسانہ نگار فنکار ہوتے ہیں، مگر مقالہ نگار عالم کہلاتا ہے۔ اس لیے ہم چند 'اکابرِ ادب' نے ایک دوسرے کی مدد سے چند مقالے گھسیٹ ڈالے، جن میں مواد کم، مفہوم کمتر اور حوالے زیادہ تھے۔ مقالوں کو معنوی ربط کی آلائش سے حتی المقدور پاک اور صاف رکھا گیا۔ جہاں تک حوالوں کے حصول کا تعلق ہے، کچھ حوالے تو ہم نے انگریزی کتابوں کے گرد پوشوں سے نقل کر لیے، دو ایک کتابیں کباڑیوں کے یہاں سے ایسی مل گئیں، جن میں دنیا کے مشہور ڈراموں، ناولوں اور داستانوں کے کرداروں کے اسما اور ان کے مختصر احوال مندرج تھے۔ اسی طرح ایک اور کباڑی کے یہاں سے 'اقوالِ عظما' پر مشتمل ایک کتاب مل گئی۔ یہ کتابیں انگریزی زبان میں تھیں۔ دیسی کتابیں اوّل تو کمیاب ہیں اور دوم بیکار، بایں معنوں میں کہ مشرقی اہلِ فکر و دانش کے حوالوں سے مقالے معتبر اور وزنی نہیں بن سکتے۔ حوالوں کا ایک اور فائدہ بھی ہے وہ یہ کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھنا پڑتا۔ تفکیر کی محنت اور تحقیق کی مشقت نہیں برداشت کرنی پڑتی۔ یہ معاملہ عام فہم ہے، تشریح کی کوئی ایسی ضرورت نہیں۔ بہر حال آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہماری تحریروں میں حوالے کیوں زیادہ ہوتے ہیں۔ نیز آپ یہ بھی جان گئے ہوں گے کہ یہ حوالے مغربی عظمائے ادب و دانش کے فرمودات پر کیوں مشتمل ہیں۔

ہمیں احساس ہے کہ ہماری تحریروں میں در آنے والے حوالے ہر طرح کے ہوتے ہیں، مطلب یہ کہ باہم متضاد اور متخالف حوالے ساتھ ساتھ چلتے ہیں، بعض اوقات وہ بے محل بھی استعمال ہو جاتے ہیں۔ لیکن بے محل بات پر اعتراض اور متناقض اور متضاد تنقیدی آرا پر نکتہ چینی قدیم واز کار رفتہ معاشرے کے افکارِ باقیہ میں سے ہیں۔ عنقریب یہ رہی سہی بیماری بھی ختم ہو جائے گی

رنگِ ادب پبلی کیشنز

محمد منور ...... مجلسِ ترقیِ تنقید

اور پھر کوئی تناقض وتضاد ناگوار نہ گزرے گا، پھر اہلِ علم وفکر کی رائے موسموں بلکہ دنوں اور راتوں کے مختلف ساعات کے مختلف ٹمپریچروں کی طرح بدلا کرے گی اور کوئی ناک بھوں نہ چڑھائے گا اس لیے کہ یہی شے تو اُلٹا معراجِ کمالِ فن متصور ہوگی۔

مگر ہم چند اکابرِ ادب جو دراصل اِس مجلس کا 'اندرونی حلقہ' تھے ایک دوسرے کے چور نہ تھے، اگر چور بھی ایک دوسرے سے کچھ چھپائیں تو اِن کا گٹھ جوڑ کیوں کر نبھے۔ چنانچہ چوروں کے لیے اخلاصِ باہمی کی نسبتاً بہت زیادہ ضرورت ہے۔ ہمارا کام یہ تھا کہ پسِ پشت بھی اور زیادہ تر ایک دوسرے کی موجودگی میں ایک دوسرے کی علمیت کا اعتراف اور چرچا بہ شدومد کیا کرتے تھے۔ یہ باہمی مفاد کی بات تھی۔ عام دیکھنے والے یہ جانتے تھے کہ ہم چند قالب مگر یک جان ہیں۔ حق یہ ہے کہ منافقت بھی اگر وضعدار ہو اور ثابت قدمی کے ساتھ نباہ کرے تو بڑی ہی قابلِ عزت شے ہے۔

تاہم وہ بیٹھنے کی جگہ کا مسئلہ اُلجھن پیدا کر رہا تھا۔ آخر ہم نے انور کو پھانسا، اس کے ذوق گزیدہ ہونے کا فائدہ اُٹھایا، شہرت کی توقع کا جال پھینکا اور وہ رام ہوگیا۔ 'ہم چند' نے باہم چندہ کر کے انوؔر ہوٹل پر چائے پی، ایک دوسرے کو شعر سنائے۔ انوؔر کو بھی اس مختصری محفل میں شریک کر لیا۔ اُس سے بھی شعر سنے اور موسلا دھار داد دی اور بالآخر ایک زیادہ جوشیلے جاہ طلب شخص کے ذریعے جو کسی قدر مال دار بھی تھا ایک ادبی مجلس کی تشکیل کی تجویز پیش کرادی۔ اس مال دار صاحبِ ذوق کو صدر بنا دیا گیا اور انور کو نائب صدر، سیکریٹری میں خود بن گیا، تاکہ ریکارڈ ظاہری بھی اور باطنی بھی فقط اپنے قبضے میں رہے۔ اس طرح 'ہم چند' مجلس کی تاسیس کی براہِ راست ذمہ داری سے بھی بچ گئے اور کام بھی ہماری منشا کے مطابق چل نکلا۔ ہمیں مقالے پڑھتے ہمیں تنقید کے اسلوب ڈھالتے۔ رہے مقالوں کے فیہ مافیہ تو اُس سے آپ کو قبل ازیں آگاہ کیا جاچکا ہے، رہیں تنقیدیں تو آغازِ کار میں ہمیں ہم تو تھے لہٰذا تنقیدیں باہمی توصیفیں رہیں۔ "آج وہ کل ہماری باری ہے۔" کا روشن اُصول کارفرما تھا۔

شاید آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ذوقِ تسکینِ نخوت اور شوقِ تنقید انفلوئنزا سے بھی زیادہ متعدی مرض ہیں اس لیے ہوا یہ کہ ناقد ہماری مرضی اور خصوصی انتظام کے علی الرغم بڑھتے ہی چلے گئے۔ اسی طرح نئے نئے مقالہ نگار بھی نمودار ہو پڑے، نتیجہ یہ کہ ضبط کی زمام ٹوٹ گئی، ہماری چودھراہٹ

کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ اس خطرے کا تدارک یہی تھا کہ ہم ہر حیلہ و تدبیر سے نئے ناقدروں کی ٹانگ کھینچیں اور دل شکنی کریں۔ ہم نے بڑی عالی ظرفی سے بھی سوچا تو ثابت یہی ہوا کہ نئے ناقدوں کی تنقیدیں ہمارے ڈھب کی نہیں، وہ ہمیں بھی نہ بخشتے تھے، حالاں کہ ’بخش‘ ہی نہیں ہم تعریف و تحسین کے طالب تھے، انہیں کیا معلوم کہ ہم نے مجلس کس ’خلوص‘ کے ساتھ بنوائی تھی۔

یہ ٹانگ کھینچنے کا کاروبار فقط ’چند‘ سے نبھ نہ سکتا تھا اس لیے کہ اندر کی بات اس طرح بڑی جلدی عیاں ہو جاتی، معتبری پھر بھی بحال رہتی یا نہ، چنانچہ ہم چند نے اپنی معتبری کے دوام کی خاطر اُن پہلوانوں کی طرح جو رفتہ رفتہ استادی کا منصب سنبھال لیتے ہیں، نوخیز پٹھوں کو تنقیدی دنگل کے داؤں پیچ سکھانے شروع کر دیے اور پھر ایک خاص انتظام کے تحت اپنے پٹھوؤں کو ایک سے زیادہ حزبوں میں بانٹ دیا، تا کہ وہ نو وارد ناقدوں کے حلقہ بگوش بن کر ان کی مٹی پلید کریں۔ واضح رہے کہ ہمارے اس زورِ اخلاص کے باعث مجلس کئی گروہوں میں بٹ گئی۔ یہ کام بہتر مقالے لکھ کر لانے اور بہتر تخلیقی کاوشیں پیش کرنے سے بھی زیادہ دلچسپ تھا۔ اس طرح ہر گروہ نے اپنے اور دوسرے گروہ کے ناقدوں اور شاعروں اور اُدیبوں کے لتے لینے شروع کیے۔ ’ہم چند‘ ان خالص ادبی خدمات کو پسِ پردہ رہ کر باقاعدہ سراہتے رہے۔ آخر کار مجلسِ ترقیِ تنقید وہ کچھ بن گئی، جو کچھ وہ آج کل ہے۔ اور بفضلِ خدا ہم اس کی کارگزاری سے مطمئن ہیں۔

آپ ہماری مجلس کے اوصافِ حمیدہ سننے کے بعد یقیناً خواہاں ہوں گے کہ اس کے کسی اجتماع کا نظارہ فرمائیں۔ نظارہ اس لیے کہا کہ ہماری مجلس شنیدنی سے زیادہ دیدنی ہوتی ہے۔ مگر ساتھ ہی آپ یہ بھی سوچتے ہوں گے کہ اگر خدانخواستہ اس روز نقاد حضرات کی تنقیدی آرا کی تائید میں مکے کھنچ گئے یا کرسیاں اُٹھ گئیں تو کیا ہوگا، جان بہر حال عزیز ہے جان نہ بھی جائے تو عمر بھر کے لیے کسی تنقیدی زخم یا داغ کے لگ جانے کا اندیشہ تو ہے ہی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس مساوات پسند مجلس میں جہاں نو وارد اور کہنہ وارد میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا آپ بعض ’اعزازی‘ کلمات سن لیں یا ان اعزازی کلمات سے مخاطب کیے جائیں۔ چنانچہ بہتر یہی ہے کہ آپ اس خطرے میں نہ پڑیں، میں آپ کو بزدل عاشقِ ادب نہیں کہتا فقط یہ گمان ہے کہ آپ کا عشق ابھی خام ہے۔ اس لیے مشورہ یہی ہے کہ آپ فی الحال وہاں نہ جائیں، جب عزتِ ذات کے باب میں حساسیت ذرا کم ہو جائے تو چلے چلیے گا۔

لاہور ...... مجلسِ ترقیِ تنقید

عاقلوں کا ارشاد ہے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، میں یہی چاہتا ہوں کہ آپ تماشائے تنقید بھی دیکھ لیں اور خطرۂ توہین و جراحت سے بھی محفوظ رہیں۔ اس لیے ایک تنقیدی نشست کا ایک جزوی سا منظر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا ہے، یہ پچھلی کارروائی کی رپورٹ کا ایک حصہ ہے۔ رازؔ مرزا کی غزل تنقید کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھی تھی۔ غزل کا مطلع نہیں تھا۔ مقطع بھی نہیں تھا۔ مکمل غزل تین اشعار پر مشتمل تھی۔ پہلا شعر تھا:

الم گزیدہ ہے تسکیں، اُداس اُداس نظر
کہ آرزوؤں کے مدفن پہ رو کے آیا ہوں

صاحبِ صدر نے فرمایا، صلائے عام ہے، فرمایئے۔

جوہرؔ: بھلا سکون بھی افسردہ ہوتا ہے، سند دیجیے، یہ سکون ہے چھموں کا تنور نہیں ہے۔

ایک آواز: الم گزیدہ تسکیں نامانوس ترکیب ہے، لہٰذا فنی بدعت۔

صاحبِ صدر: کسی ڈھب سے چلیں، کسی ایک بات...

ایک اور آواز: بلا سند کوئی تشبیہ قبول نہ ہوگی، نئی ترکیب اختراع کرنا قدما کی شان میں گستاخی ہے۔

صاحب صدر: مگر میں نے بات ختم نہیں...

ایک آواز: کروچے کہتا ہے کہ ادبی بدعت پیدا کرنے والا گردن زدنی ہے۔

عنصر: کانوں کا میل، سعدی، وارث شاہ، وارث کا بھتیجا برنارڈ شاہ، سب کہتے ہیں کہ اختراع جاری رہے گی، ادب کے چمن میں نئے نئے ڈال پات، پھول پھل لگتے رہیں گے۔

صاحب صدر: مگر میں صدر ہوں، ارے میری سنو تو، میں...

بے ساختہ تنقیدی قہقہے، قہقہوں میں سے اُبھرتی ہوئی تنقیدیں ''ایلیٹ کہتا ہے مدفن پر رونا منع ہے۔'' ''اخلاص کی نشانی رونا... بکتے ہو۔ ''مدفن کا کتبہ پڑھا نہیں جا رہا''۔ ''تازہ مچھلی''۔ ''انور وہ تمہارا نوکر چائے نہیں لایا۔'' بڑے پُرسوز سُر کے ساتھ ''ترے کوچے میں اک پلٹن کا ڈبہ لے کے آیا ہوں''۔ ''آرزوئیں کیوں مریں؟'' ''انہیں پوشیدہ امراض لاحق تھے''۔ ''انہیں دفن کیوں...''۔

”تدفین ناجائز“ ... ”قبروں کو ...“۔ ”انور وہ میری چرس کی گولی کون لے گیا۔“

مزید تنقیدی قہقہے۔

گاماں: (بلند آواز سے) مصرع سیدھا کرو، یوں کہو کہ ”میں معشوق کی قبر پر رو کے آیا ہوں۔“

ناصر: صاحب صدر الگ الگ مصرعوں پر بحث کی جا رہی ہے، کسی طرح دونوں مصرعوں کو اکٹھا تو کرائیے، یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔

صاحب صدر: ہاں بھئی یہ دو مصرعے جوڑ دیجیے۔ دونوں کو ملا کر پڑھیے۔ اور شعر کو مجموعاً دیکھیے۔

عظمت: پھر تو خطرہ ہے کہ کوئی بات بن جائے گی۔

طفیل: کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے۔

مشہدی: مدفن کا کتبہ صاف پڑھا جا رہا ہے۔

ایک آواز: اندھیرے میں کس کی آنکھیں چمکتی ہیں؟

صاحب صدر: ہاں مجموعی طور پر شعر خوب ہے۔

آوازیں: ”یہ خوب ہے تو خرافات کسے کہتے ہیں“۔ ”کروچے نے کہا ہے کہ ...“ ”فقیرانہ آئے ...“

صاحب صدر: ارے بھئی میں آپ لوگوں کی اجازت سے بول رہا ہوں، فرض کر لیجیے کہ شعر اچھا ہے۔ ہائے اللہ ...

ہاں تو دیکھ لیا آپ نے، یہ فقط ایک شعر پر کی جانے والی تنقید کا جزوی سا نقشہ ہے، تاہم آپ کچھ نہ کچھ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم نے اپنی مجلسِ ترقیِ تنقید کا معیار کتنا اونچا کر رکھا ہے۔ خیر اسی طرح تبادلۂ آرا اور مقابلہ غوغا کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ رات کے بارہ بجے کے ارد گرد مجلس تحلیل ہونے لگتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ غائب ہو جاتی ہے۔ ہوٹل کی کرسیاں اور انور کے دو چار نوکر باقی رہ جاتے ہیں۔ مجلس کے باضابطہ اختتام کا اعلان کبھی نہیں کیا جاتا، اس لیے کہ اس میں بدشگونی کا

شائبہ موجود ہے کیا پتا ہمارے عارضی اعلانِ خاتمہ کو کارکنانِ قضا و قدر دائمی خاتمے کی درخواست جان لیں۔ ہمیں یہ مجلس بہت عزیز ہے، مگر جاتے جاتے ایک تکلیف دہ خبر بھی سنتے جایئے، جن پہ تکیہ ہو اگر وہی پتے ہوا دینے لگیں تو دکھ ہوتا ہے۔ کل شام میں راز مرزا کے گھر پہنچا اور آواز دی، کھڑکی میں سے سر نکلا، تو میں نے کہا بھئی آج ضرور آنا، میں نے ویسے ہی احتیاطاً کہہ دیا تھا، ورنہ وہ روزانہ آتے ہی ہیں۔ مرزا صاحب نے بڑے تجاہل سے پوچھا، ”کہاں بھئی۔“

میں نے کہا: ”وہیں تنقید کرنے...“

پوچھا، ”آج کا کیا پروگرام ہے کس کی اجل آئی ہے۔“

میں نے کہا، ”آج اسلم نظم پیش کرے گا۔ بچ کے نہ جانے پائے۔“

اس پر فرمایا، ”بھئی تو پھر مجھ سے اسلم کی نظم پر تنقید نہ کرایئے۔ میری اُس سے ابھی کل ہی صلح ہوئی ہے۔“ کم از کم مرزا صاحب کو میرا دل نہیں توڑنا چاہیے تھا۔ اس طرح تو ہم چند اکابر کا جتھا ٹوٹ جائے گا اور مجلس کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔

◆ ◆

محمد منور ...... مجلسِ ترقیِ تنقید

پھر کیا ہوا؟

محمد منشا یاد

قصے اور کہانی سے انسان کی دلچسپی نہایت پرانی ہے اور یہ جاننے کے لیے کہ پھر کیا ہوا انسان ہمیشہ متجسس اور بے تاب رہا ہے خود انسان کی تخلیق کے وقت ایک نہایت دلچسپ افسانہ یا ڈرامہ ظہور پذیر ہوا جس میں ابلیس صاحب نے ویلن یعنی رقیب کا رول بڑی کامیابی اور شر انگیزی سے ادا کیا۔ اس نے نہایت گستاخی سے بڑھک لگائی:

"یہ سجدہ نہیں ہو سکتا۔"

اور اس طرح خیر کے ساتھ شر بھی تولد ہوا اور خیر و شر کے کنفلیکٹ یا تصادم سے تخلیقِ آدم کے افسانے میں رنگ آمیزی ہوئی۔

قصہ یا کہانی کی کامیابی یہی ہوتی ہے کہ سننے والا ہر لمحے یہ جاننے کے لیے بے چین رہے کہ پھر کیا ہوا؟ آپ نے فلم والوں کو دیکھا ہوگا فلمی گانوں کی کاپیاں بازار میں فروخت ہوتی ہیں۔ ان میں فلم کی کہانی دی ہوتی ہے لیکن کہانی کو کلائمکس یا نقطہ عروج پر پہنچا کر چھوڑ دیا جاتا ہے اور لکھا ہوتا ہے 'باقی پردہ فلم پر'۔ اسی طرح ٹیلی وژن سیریز کی ہر قسط بھی ایسے ہی نازک مقام پر لا کر ختم کی جاتی ہے کہ آدمی خواہ مخواہ پریشان ہو جاتا ہے اور اگلے ہفتے یہ جاننے کے لیے کہ پھر کیا ہوا، ہر شخص دوستوں سے ضروری کام کا بہانہ کر کے گھر پہنچتا ہے اور ٹیلی وژن کے سامنے سے یہ پریشانی لے کر اُٹھتا ہے کہ اب اگلے ہفتے کیا ہوگا؟

کامیاب اور دلچسپ قصے کہانیوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ ہر قدم پر پڑھنے والے کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ جائے۔ اسے کھانے پینے نیز سر کھجلانے کا ہوش نہ رہے۔ خواتین اکثر ہنڈیا پکاتے ہوئے اسی لیے ناول یا رسالہ لے کر سامنے بیٹھ جاتی ہیں تاکہ شوہروں کو کھانا کچا رہ جانے کی شکایت نہ رہے۔

انور احمد علوی

ہم افسانہ لکھتے ہیں اور اپنے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن اس سے پہلے ہم کہانی اور افسانے کی کئی طرح سے علمی اور نصابی تعریفیں ہو سکتی ہیں۔ مگر ایک بات ان میں مشترک ہے یعنی پھر کیا ہوا۔ یہی چیز پڑھنے سننے والے کی دلچسپی کا سبب بنتی ہے۔ افسانے میں کہانی کی دوسری خصوصیات کے علاوہ تصور و تخیل یعنی گپ بازی کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ ویسے تو کہانی لکھی اور پڑھی بھی جاتی ہے لیکن یہ دوسروں کو سنائی بھی جا سکتی ہے جب کہ اکثر افسانے زبانی سنائے نہیں جا سکتے۔ افسانے کو کہانی کی ترقی یافتہ صورت کہتے ہیں جوں جوں افسانہ ترقی کرتا جا رہا ہے اس میں سے کہانی پن غائب ہوتا جا رہا ہے۔ جب بالکل ختم ہو جائے گا تو پھر الف سے شروع ہوگا یعنی پھر کہانی کی طرف واپس آ جائیں گے۔ بالکل ایسے ہی جیسے بال بڑھاتے بڑھاتے جب عورت اور مرد کی تمیز ختم ہو جاتی ہے تو پھر ایک دن سر منڈانے کا فیشن شروع ہو جاتا ہے بلکہ اُسترا پھرا لیتے ہیں۔

افسانہ زیادہ تر لکھنے، ادبی محفلوں میں پڑھنے، لوگوں کو پریشان کرنے اور موٹے موٹے ادبی پرچوں میں چھپوانے کی چیز ہے۔ موجودہ دور میں اس سے اخلاقی نتیجے نکالنا بدتہذیبی اور بداخلاقی سمجھا جاتا ہے۔ علامتی افسانے کی کامیابی نہ ہوتی ہے کہ اس کی علامتوں سے ہر سننے والا مختلف مطلب نکالے۔ افسانے کی ایک اور قسم بھی ہوتی ہے۔ نثری نظم سے اس کا دودھ کا رشتہ ہے اسے تجریدی افسانہ کہتے ہیں۔ یہ بھی دو طرح کے ہوتے ہیں اصلی اور نقلی اصل تجریدی افسانے وہ ہوتے ہیں جو سوچ سوچ کر لکھے گئے ہوں اور سارے ملک کے دانشور مل کر بھی ان کا مطلب یا مفہوم معلوم نہ کر سکیں۔ نقلی تجریدی افسانے وہ ہوتے ہیں جو بقول ہمارے ایک دوست کے انگریزی فلمیں دیکھ کر لکھے جائیں چوں کہ انگریزی فلمیں پوری طرح سے سمجھ میں نہیں آتیں۔ کہیں کہیں سے کچھ پلے پڑتا ہے۔ اس لیے ان ٹکڑوں کو جب اپنی زبان میں لکھتے ہیں تو یہ تجریدی افسانہ بن جاتا ہے۔

ہمارا خیال ہے جس طرح پیدائشی شاعر ہوتے ہیں اسی طرح پیدائشی افسانہ نگار بھی ہوتے ہوں گے۔ اور جس طرح برساتی، حادثاتی مشاعروں میں غزلیں پڑھ کر داد، شادی بیاہ کے موقع پر سہرہ پڑھ کر ویلیں اور ویڈیو کے لیے فرمائشی گیت لکھ کر چیک وصول کرنے والے شاعر ہوتے ہیں، اسی طرح افسانہ نگاروں کی بھی اتنی ہی قسمیں ہیں۔ تاہم ہمارے نزدیک سچے اور جھوٹے ادیب یا

رنگِ ادب دہلی کلکتہ

شاعری کی پہچان کا پیمانہ یہ ہے کہ اگر وہ معقول ملازمت مل جانے اور شادی ہو جانے کے بعد بھی شعر و ادب سے باز نہیں آتا تو وہ سچا ادیب ہے۔ ورنہ شادی سے پہلے تو ہر میٹرک پاس لڑکی اور لڑکا شاعر اور افسانہ نگار ہوتا ہی ہے۔ ہم نے بڑے تیس مار خاں بلکہ چالیس پچاس مار خاں ادیبوں کے فارغ البالی اور گھر والی کی وجہ سے ادبی جنازے اُٹھتے اور چالیسواں ہوتے دیکھے ہیں۔ فارغ البال کے مرض کو قبض کی طرح سمجھنا چاہیے۔ ادیب کئی کئی دن اور ہفتے سوچ سوچ کر اور زور لگا کر کچھ لکھنا چاہتا ہے، مگر نہیں لکھ سکتا تاہم کبھی کبھی کسی ایڈیٹر کا تعریف یا خوشامد سے بھرا خط رہنمائی کا کام دیتا ہے اور اس کی حالت قدرے سنبھلتی ہے۔ مگر شادی نہایت مہلک بیماری ثابت ہوتی ہے۔ اس کے لاحق ہوتے ہی تخلیقی ذیابیطس ہو جاتی ہے اور اَب تو بیوی کے علاوہ ٹی وی بھی ادب دشمنی میں پیش پیش نظر آتا ہے۔ بہت سے شاعروں اور ادیبوں کا لکھنے لکھانے، سوچنے اور مشق کرنے کا وقت اس کی نذر ہو جاتا ہے۔

اس طرح ایک صاحب ہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے ایک ادبی محفل میں مضمون پڑھنا تھا۔ ہم ان کا مضمون سننے گئے۔ مگر وہ تشریف نہیں لائے۔ بعد میں ہم نے نہ آنے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔

”وہ لوکاٹ کا درخت ہے نا ہمارے کوارٹر میں۔ تو اس روز ہم نے لوکاٹ اُتارے تھے سوچا سسرال والوں کو دے آؤں۔ ویسے بھی مضمون نہیں لکھ سکا تھا۔ کوئی نیا مضمون ہی نہیں ملا تھا۔“

ہم نے عرض کیا، ”اس سے زیادہ نیا موضوع اور کیا ہو سکتا تھا۔ آپ ادب اور لوکاٹ پر کچھ لکھ لاتے۔“

یہ تو تھی تمہید۔ اب ہم آپ کو اپنے اور کہانیوں سے دلچسپی کے بارے میں کچھ بتاتے ہیں۔ ہمیں بھی آپ کی طرح بچپن سے ہی کہانیاں سننے سنانے کا شوق تھا اور کہانی سنتے ہوئے ہم بے تاب رہتے تھے کہ اچھا پھر کیا ہوا؟

جب ہم نہایت بچے تھے تو محض کہانیاں سننے پر اکتفا کرتے تھے۔ پھر ذرا ہوش آیا تو نگلے ہوئے لطیفے، چٹکلے اور کہانیاں اگلنے لگے۔ پھر ذرا اور بڑے ہوئے تو ہم نے کہانیوں میں ترمیم و اضافہ کرنا سیکھا اور اس کی ایسی مشق کی کہ حسبِ ضرورت کہانی کو توڑ موڑ کر لمبا یا چھوٹا کر کے اور نمک مرچ لگا کر اس طرح پیش کرنے لگے کہ سننے والے کو جمائیاں آنے لگتیں۔ ہم جس قدر گپ ہانکتے،

جھوٹ شامل کرتے انور ہم عمر اور مبالغہ آمیزی سے کام لیتے اسی قدر داد ملتی اور ہمارے ہم عمر ہماری اس صلاحیت پر رشک کرتے۔ ایک دفعہ ہم نے اپنے ایک پڑوسی لڑکے کو شیر کی سواری کرنے کا سچا واقعہ سنایا۔ شیر پر سوار ہو کر ہم کافی دیر تک دشوار گزار راستوں پر چلتے رہے۔ شیر نے کئی بار دم لینا چاہا لیکن ہم نے ہر بار ڈانٹ دیا۔ ہمارا دوست بڑی توجہ اور داور دشواری سے سچا سمجھ کر سنتا رہا اور اس بات پر خوش ہوتا رہا کہ وہ ایک بہادر لڑکے کا دوست ہے۔ شیر جس کے ادنی اشارے پر گدھا بن جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس وقت تک ہم نے شیر تو کیا سچ مچ کا گیدڑ بھی نہیں دیکھا تھا۔ اور چوہے کو دیکھ کر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ ہمیں ایک چھوٹے سے سانپ نے ڈس لیا۔ قریب تھا کہ ہم اس صدمے اور زہر کے اثر سے بے ہوش ہو جاتے کہ چھوٹی بہن ہنسنے لگی کہ یہ تو کینچوا ہے۔

جب ہم پرائمری اسکول میں پڑھتے تھے، ہمارا اسکول گاؤں سے دو تین میل کے فاصلے پر تھا۔ گھر سے اسکول آتے جاتے ہم اپنے ساتھیوں کو کہانیاں سناتے۔ کبھی کبھی کہانیوں کا سٹاک ختم ہو جاتا تو ہمیں کسی کہانی کو لمبا کرنا پڑ جاتا یا کبھی کہانی پھیکی جا رہی ہوتی اس میں 'پھر کیا ہوا' بھرنا پڑ جاتا۔ بہرحال ہمیں اپنے ساتھیوں کو بنانے اور باتوں میں لگائے رکھنے کا فن آ گیا تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ہم ایک شہزادے کو گھما پھرا کر ایک نہایت ہی خطرناک جگہ پر لے گئے اور جوشِ بیان میں اسے خطرات اور مشکلات میں اس قدر پھنسا دیا کہ اب وہاں سے نکلنے کا کوئی طریقہ ہمیں خود بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ناچار ہم نے اعلان کیا کہ باقی کہانی کل سنائیں گے۔ لیکن ہمارے ساتھی انور، یوسف اور گلو کی جان پر بنی ہوئی تھی انہوں نے پوری کہانی سننے پر اصرار کیا۔ خصوصاً گلو نہایت پریشان تھا اور شہزادے کے بارے میں جلد از جلد کوئی اچھی خبر سننا چاہتا تھا۔ ہم اس سے ڈرتے بھی تھے کیوں کہ وہ ہم سے بڑا اور طاقتور بھی تھا۔ لیکن فن کار خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو اس کی انا یعنی خودی بہت بلند ہوتی ہے۔ مار پیٹ کے خوف سے کہانی سنانا ہمیں بڑا توہین آمیز معلوم ہوتا تھا۔ ہم چاہتے تو کسی نہ کسی بہانے شہزادے کو اس مصیبت سے رہائی دلا سکتے تھے مگر اب گلو دھمکیوں پر اُتر آیا تھا۔ اور دھمکی اور فن میں ہمیں کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا۔ ہم نے صاف انکار کر دیا۔ بس پھر کیا تھا۔

”پکی پل تے لڑائیاں ہوئیاں تے چھویاں دے کل ٹٹ گئے۔ وہ سب گلو کے طرفدار تھے کھڑے تماشا دیکھتے رہے اور شہزادے کو مشکل میں پھنسا کر چھوڑ دینے اور پوری کہانی نہ سنانے کی رسمِ ادب ہی بن گئی

پاداش میں گلو نے ہماری خوب پٹائی کی۔ اس کے باوجود ہم مطمئن اور خوش تھے کہ جیت ہماری ہوئی تھی۔ وہ ہمیں مار پیٹ کر بھی شہزادے کے بارے میں جاننے سے محروم رہا بلکہ اب شہزادے کا مستقبل اور بھی مخدوش ہو گیا تھا کیوں کہ ہم نے ان سب سے کٹی کر لی اور کئی روز تک آپس میں بول چال بند رہی اور شہزادہ قید میں پڑا سڑتا رہا۔

ہم اس وقت ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے جب ایک بکری کو ڈنڈا مار کر ہلاک کرنے کے بارے میں ہماری کہانی چھپی۔ ویسے کہانی کے آخر میں بکری کو ذبح کر لیا گیا تھا۔ اپنا چھپا ہوا نام دیکھ کر ایسی باچھیں کھلیں کہ آج تک اپنی اصل حالت پر واپس نہیں آئیں۔ حاسد، رقیب، ٹانگیں کھینچنے والے اور آستینوں کے سانپوں سے لے کر بڑے بڑے اژدہا راستے کی رکاوٹیں بنتے اور قدم قدم پر دل شکنی کرتے رہے مگر ہم نے برابر سفر جاری رکھا۔

آٹھویں جماعت کا زمانہ تھا۔ ہمیں ایسے مضامین اچھے لگنے لگے تھے کہ جن کا تعلق کہانیوں سے بنتا تھا۔ مثلاً اُردو، انگریزی، فارسی اور حساب وغیرہ اور ایسے مضامین جن کا تعلق کہانیوں سے نہیں بنتا تھا، ہمیں بالکل اچھے نہیں لگتے تھے۔ جیسے ڈرائنگ جغرافیہ، پی ٹی، کیمسٹری وغیرہ اُردو کی کتاب میں نہ صرف کہانیاں بلکہ نظمیں بھی ہوتی تھیں۔ مثلاً:

ایک بچہ جس کی ماں کا ہو گیا تھا انتقال
میرے پاس آیا کہیں سے روتا روتا ایک دن

یا پھر

ایک لڑکی بگھارتی تھی دال
اور دال کرتی تھی یوں عرض احوال

اور

گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی
پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی

انگریزی میں بھی کہانیاں اور جیک اور جیل وغیرہ کی نظمیں تھیں اور فارسی کی حکایات تو ہمیں بہت ہی دلچسپ اور اچھی لگتی تھیں۔ ویسے فارسی لینے سے پہلے ہم نے عربی سیکھنا چاہی تھی۔ مگر عربی کے استاد بڑے سخت مزاج تھے۔ ایک بار وہ پیریڈ شروع ہونے کے باوجود نہ پہنچے تو ہم انہیں

بلانے چلے گئے۔ وہ آ تو گئے مگر نہایت غیظ و غضب میں تھے ہمیں سامنے کھڑا کر لیا اور اپنے مخصوص لہجے میں فرمانے لگے۔

”ذرا سی دیر ہو گئی ہے تو کوئی قیامت تو نہیں آ گئی۔“

”گاڑی تو نہیں چھوٹ گئی؟“

”آگ تو نہیں لگ گئی؟“

”چھت تو نہیں گر گئی؟“

”گولی تو نہیں چل گئی؟“

پیچھے سے کسی نے لقمہ دیا: ”کھوتی تو نہیں کھب گئی؟“

بس پھر کیا تھا انہوں نے ڈنڈا سنبھالا اور آوازہ کسنے والے کا نام پوچھنے لگے۔ مگر ساری کلاس کو سانپ سونگھ گیا۔ چنانچہ انہوں نے ساری کلاس کو دو دو ڈنڈے فی کس کے حساب سے عطا فرمائے۔ ہمارے حصے میں تین آئے۔ دو کلاس میں مساوات کا اصول قائم رکھنے کے اور ایک انہیں بلا کر لانے کا۔ اس کے بعد ہم پھر کسی استاد کو بلانے کے لیے نہیں گئے کہ آ استاد مجھے مار۔

حساب یعنی ریاضی سے ہماری دلچسپی صرف عبارتی سوالوں تک محدود تھی۔ ہمیں ان عبارتوں میں چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیاں اور ڈرامے نظر آتے تھے۔ ان کہانیوں میں سسپنس بہت ہوتا تھا۔ عبارت والے سوالوں پر کس قدر افسانہ یا ڈرامہ ہوتا ہے اس کی ایک مثال عرض کرتے ہیں۔

مثال: چار راج اور آٹھ مزدور روزانہ آٹھ گھنٹے کام کر کے ایک مکان دو ماہ میں بناتے ہیں۔ بتائیے ایک منٹ میں ایسا ہی مکان بنانے کے لیے کتنے راج اور مزدور درکار ہوں گے؟

آپ تصور کیجیے کہ کتنا دلچسپ ڈراما ہے۔ ایک لاکھ پندرہ ہزار دو سو راج اور دو لاکھ بتیس ہزار چار سو مزدور ایک مکان بنانے میں مصروف ہیں۔ ہر مزدور کے ہاتھ میں ایک ایک اینٹ ہے۔ پہلے دس سیکنڈز میں بنیادیں کھودی گئی ہیں اور سیمنٹ اور ریت میں پانی ملا کر مسالہ تیار کر لیا گیا ہے۔ اگلے دس سیکنڈز میں چھت تک دیواریں کھڑی کی گئی ہیں۔ اگلے دس دس سیکنڈز میں چھت ڈال کر فرش اور پلستر کا کام مکمل کر لیا جائے گا۔ اس کے بعد رنگ روغن ہو گا۔ اور ابھی جب ایک منٹ پورا ہو گا تو مکان ہر طرح سے تیار ہو چکا ہو گا۔ اور راج اور مزدور کم از کم چھہتر ہزار ایک سو بیس تانگوں میں بیٹھ کر اپنے اپنے گھر کی راہ لیں گے۔

ہمیں نفع اور نقصان والے سوال بھی اچھے لگتے تھے اور ہمارا جواب عموماً درست ہوتا تھا۔ صرف نفع کو نقصان اور نقصان کو نفع لکھنے میں بھول چوک ہو جاتی تھی کیوں کہ اس کا ہمیں ذاتی تجربہ نہیں تھا۔ نہ ہم نے کبھی کوئی گھوڑا ایک ہزار پانچ سو میں خریدا اور چند روز تانگے میں جوت کر صرف پانچ سو روپے میں فروخت کیا تھا اور نہ ہم نے کسی تاجر کی حیثیت سے بیس روپے فی من گندم خرید کر پچاس روپے فی من کے حساب سے بلیک میں فروخت کی تھی تاہم اگر ہم جواب نکالتے کہ 90 فیصد منافع ہوا ہے تو کتاب کے آخر میں بھی 90 فیصد ہی لکھا ہوتا تھا۔ نفع یا نقصان کے سلسلے میں جو گڑبڑ ہو جاتی تھی اس پر اکثر ماسٹر صاحب معاف کر دیتے تھے۔ تاریخ یعنی ہسٹری ویسے ہی دلچسپ واقعات اور کہانیوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ کہیں تیر اندازی ہو رہی ہے۔ کہیں ہاتھی اپنی ہی فوج کو روند رہے ہیں۔ کہیں گھوڑے ہنہنا رہے ہیں اور گھمسان کا رن پڑا ہے اور کشتوں کے پشتے لگ رہے ہیں اور کہیں کوئی بے چارہ بادشاہ گنتی پوری کر رہا ہے بڑی دلچسپ صورتِ حال ہوتی۔ بادشاہ حملہ کرنے آ رہا ہے پھر آ رہا ہے اور گنتا جاتا ہے:

"یہ لے حملہ نمبر چودہ اور یہ پندرہ... یہ سولہ اور یہ ہوئے پورے سترہ"

یہ دور ہمارا کہانیاں پڑھنے کا دور تھا۔ چنانچہ ہم نے دیوؤں، پریوں، جنوں، بھوتوں، چڑیلوں، جادوگروں، بادشاہوں، شہزادوں، سوداگروں، ماہی گیروں اور شکاریوں کی سینکڑوں کہانیاں چٹ کر ڈالیں پھر آنہ لائبریریوں کا رُخ کیا اور ڈاکوؤں، جاسوسوں کے عظیم الشان کارنامے پڑھ کر خود بھی یہی پیشہ اختیار کرنے کا سوچ رہے تھے کہ ایک دن منظوم داستان امیر حمزہ کہیں سے ہاتھ آ گئی اور ہماری دوستی عمرو عیار سے ہو گئی۔ پھر نسیم حجازی کے ناول پڑھنے کا چسکہ پڑ گیا اور ہم کلاس میں گھر سے کام کر کے نہ لانے کی وجہ سے اکثر بنچ پر کھڑے نظر آنے لگے تاہم یہ ناول پڑھ کر ہم چڑیوں، کوؤں اور بطخوں کی کہانیاں بے مزہ اور پھیکی لگنے لگیں اور ہم نے خود بھی ایک ناول لکھنا شروع کر دیا۔ ظاہر ہے اس میں ایک بالغ ہیروئن بھی تھی۔ ایک دفعہ ہم نہایت درد ناک رومانی باب لکھ رہے تھے اور آپ ہمارے خلوص کا اندازہ لگائیے کہ ہیروئن کے ساتھ ساتھ ہم خود بھی لکھتے ہوئے رو رہے تھے۔ ہیروئن کی ہچکیوں کے ساتھ ہماری بھی ہچکی بندھ گئی۔ اور ہم نے اسے تڑپا دینے والا ایک رومانی ناول سمجھ کر محفوظ کر لیا۔ خیال تھا چھپے گا تو فلم والے ہمارا پتہ پوچھتے ہوئے آئیں گے۔ مگر ایک روز یہ ناول اباجی کے ہاتھ لگ گیا اور انہوں نے ہمارے اندر سے

ساری ہچکیاں نکال کر رکھ دیں۔ اور ناول جس کی وجہ سے نہ صرف ہمارا نام بلکہ ان کا اور ہمارے دادا جان کا نام بھی روشن ہو سکتا تھا، پھاڑ کر پھینک دیا اور کہا کہ اگر نوماہی امتحان میں اس مرتبہ بھی فیل ہوئے تو الٹا لٹکا دوں گا۔

ان دنوں میں ہم گھر والوں سے چوری کبھی کبھی فلم بھی دیکھ لیتے تھے۔ فلم کی کہانی، مناظر اور مکالمے ہمیں ازبر ہو جاتے اور ہم اپنے ہم عمروں کو ٹائٹل سے لے کر ہیرو ہیروئن کی شادی یا خودکشی تک ساری اسٹوری مزے لے لے کر سناتے۔

’’ہیرو کو ہوش آتا ہے اور پریشان ہو کر کہتا ہے میں کہاں ہوں؟ کوئی جواب نہیں ملتا۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور حیران ہوتا ہے یا الٰہی یہ میں کہاں آ گیا۔ وہ ویرانے میں زخمی پڑا ہے۔ جنگل بیابان۔ آدم نہ آدم زاد۔ جھینگروں، مینڈکوں اور گیدڑوں کے بولنے کی آوازیں سنتا ہے۔ اسی لمحے پانچ چھ فٹ لمبا سیاہ ناگ پھن پھیلائے جھاڑیوں میں سے نکلتا ہے اور ہیرو کی طرف بڑھتا ہے۔ ہیرو کو اچانک ہیروئن کی یاد ستانے لگتی ہے۔ ساتھ ہی موسیقی سنائی دیتی ہے۔ سازوں میں بین کی آواز بھی آ رہی ہے جسے سن کر ناگ جھومنے لگتا ہے ہیرو گانے لگتا ہے دور شہر میں اپنے کمرے میں بند ہیروئن اسے گا کر تسلی دیتی ہے۔ جب تک گانا شروع رہتا ہے سانپ جھومتا رہتا ہے لیکن جونہی۔‘‘

اور ہم جونہی رکتے۔ سامعین یا احمقین نہایت بے تابی سے پوچھتے۔

’’اچھا تو پھر کیا ہوا؟‘‘

قارئین کرام! یہ تو تھیں کہانیوں کی باتیں اب آخر میں ایک سچا واقعہ سن لیجیے۔

ہمارے گاؤں میں نورا نامی ایک لوہار رہتا تھا۔ اس کا بیٹا اکبر نہایت ذہین اور خوب صورت تھا۔ دوسری جماعت میں پڑھتا تھا ایک دن مولوی صاحب سے قربانی کے بارے میں وعظ سن کر اس کے جی میں آیا کہ وہ بھی اپنے بیٹے کی قربانی دے گا، چنانچہ اس نے عید کے روز اپنے بیٹے اکبر کو جس سے اسے بہت محبت تھی، عید کا میلہ دکھانے کے بہانے ساتھ لیا۔ اکبر کی ماں نے اسے اچھے اچھے کپڑے پہنائے، آنکھوں میں سرمہ لگایا اور خوشی خوشی رخصت کیا کیوں کہ اس کے شوہر نے اسے بالکل نہیں بتایا تھا کہ وہ بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے ساتھ لیے جاتا ہے۔ جب باپ اور بیٹا گاؤں سے کچھ دور ایک ویران جگہ پر پہنچے تو نورا نے بغل میں چھپائی ہوئی تیز دھار والی چھری

ٹٹولتے ہوئے بیٹے سے کہا۔

”رُک جاؤ بیٹے“ اور اکبر رُک گیا۔

اچھا قارئین کرام! اب اجازت دیجیے۔ پھر کبھی انہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔ لیکن ٹھہریے اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ نورے اور اکبر کی کہانی میں نے ابھی ابھی گھڑی ہے۔ پریشانی اور اُلجھن سے بچنے کے لیے آپ اس کہانی کو یوں پڑھ سکتے ہیں۔

ہمارے گاؤں میں کوئی نورا نامی لوہار نہیں رہتا تھا۔ نہ ہی اس کے بیٹے کا نام اکبر تھا۔ اس نے مولوی صاحب سے قربانی کے بارے میں وعظ بالکل نہیں سنا تھا کیوں کہ وہ تھا ہی نہیں۔ اس نے بیٹے کی قربانی کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا اور نہ ہی اسے عید کا میلہ دکھانے کے بہانے ساتھ لے کر گیا تھا۔ چوں کہ اکبر نہیں تھا اس لیے سرمہ ڈلوانے کے لیے اس کی آنکھیں بھی نہیں تھیں۔ بس آپ مطمئن رہیے کہ نورے نے اپنے بیٹے کو ذبح نہیں کیا تھا کیوں کہ اس کی بغل میں چھری نہیں تھی۔

* *

ہدایت نامہ تقریظ نگاری!

مسٹر دہلوی

آج کل بریانی اور کتاب کی خوبی ایک ہی طریقے سے جانچی جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ بریانی وہ بہترین ہے جو ایسی خوب صورت قاب میں پیش ہو کر بے اختیار ہو کر ڈھکنا اُٹھانے کو جی چاہنے لگے۔ پھر جیسے ہی ڈھکنا اُٹھے تو بہترین خوشبو کی لپٹیں نذیر احمد شیخ کے یہ اشعار یاد دلا دیں:

کہیں جو پلاؤ بگھارا گیا ہے   زمین سے فلک تک بھپارا گیا ہے
اِسی غم میں شیطان مارا گیا ہے   کہ مومن پہ یہ کیا اُتارا گیا ہے

اس پر قصاب کا کمالِ ہنر بریانی میں پڑے ہوئے گوشت سے ظاہر ہو اور میر مطبخ کے فن کی پختگی مکمل زعفرانی رنگ سے بالکل سفید تک ہر "Shade" کے کھلے ہوئے چالوں سے ہویدا ہو۔

اب اگر یہ تمام خوبیاں قوتِ باصرہ کو "Mesmerize" کر کے آپ کو لقمہ لینے پر مجبور کر دیں تو فیصلہ ہوگا کہ بریانی واقعی خوردنی ہے۔ اب وہ گیا ذائقہ تو اتنے اہتمام والی چیز کا ذائقہ بھی اچھا ہی ہوگا اور اگر اچھا نہ ہو تب بھی کھانے والا بے مزہ نہیں ہوتا کیوں کہ انتظام و انصرام کا اعلیٰ و قیمتی ہونا ہمارے معاشرے کی معروف قدر ہے۔

اسی طرح آج کل کتاب بھی وہی اچھی شمار ہوتی ہے جس کا مصنف نامور ہو۔ جس کی جلد اور کاغذ قیمتی ہو جس کا "Title" اتنا خوب صورت ہو کہ قاری بے اختیار ہو کر کتاب کو اُٹھا لے۔ پھر وہ کتاب کو اِدھر اُدھر سے دیکھے تو کتابت و طباعت اس کو ایسی ملے جیسے موتی جڑے ہیں۔ پھر زبان و بیان کی خوبیاں دل کا دامن پکڑ لیں کہ جا ایں جاست تو وہ قاری فیصلہ کر لیتا ہے کہ یہ کتاب قابل خرید ہے۔ اب رہ گیا کتاب کا متن تو وہ بھی عمدہ ہی ہوگا۔ ورنہ اس کتاب پر اتنی لاگت لگائی

ہی کیوں جاتی۔ اور بفرضِ محال وہ متن اگر اچھا نہ بھی ہو تب بھی کیا بگڑتا ہے کیوں کہ وہ کتاب اپنی خوب صورتی کے باعث اعلیٰ درجے کے ڈرائنگ روم میں دیدہ زیب "Book Shelf" کی زینت تو بن سکتی ہے اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ "Book Shelf" میں جتنی کتابیں ہوتی ہیں۔ وہ اگر سب کی سب پڑھ لی جائیں تو قاری کا سقراط بن جانا یقینی ہو جاتا ہے اور سقراط کا جو انجام ہوا تھا وہ آپ کو بھی معلوم ہے۔ چنانچہ شاید اسی باعث ہم آپ اپنے آپ "Book Shelf" کی پانچ دس فیصد سے زیادہ کتابیں نہیں پڑھتے۔

بہرکیف یہ ہے کتابوں کی عمدگی پرکھنے کا رائج الوقت پیمانہ۔ مگر ہم عملی آدمی ہیں۔ لہٰذا اس فارمولے کے ہم قائل نہیں ہیں پھر یہ بال ہم نے دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ بلکہ ہم نے تو مشاطہ اور درزی کے ایسے ایسے کمالات دیکھے ہیں کہ اب "Packing" کا اعتبار ہی نہیں رہا۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ ہم کتاب سے زیادہ کتاب کے متن پر توجہ دیتے ہیں۔

اس عادت کی پختگی میں اس حادثے کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے کہ ہم دہلی والے عام طور پر چٹورے ہوتے ہیں اور یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ سامانِ چٹورپن کی شاید ہی کوئی چیز ایسی ہو جو مزے کی ہونے کے ساتھ ساتھ خوب صورت بھی ہو چنانچہ ہم لوگ واجبی شکل و صورت کو بھی صرف اس بنا پر قبول کر لیتے ہیں کہ دیدہ زیب نہیں ہے۔ لہٰذا وجہ لذیذ ہوگی۔

مثلاً ہمارے ہاں کی "Delicious" میں ایک چیز ہوتی تھی لونگ چڑا اور اس کی لذت کا اندازہ یوں لگا لیں کہ جو اس کا قدردان نہیں وہ دہلی والا نہیں۔ مگر اس شئے لذیذ کی ظاہری وضع قطع اس سے قیاس کر لیں کہ انتہائی سوکھے ساکھے اور بدوضع انسان کو محاورے میں 'لونگ چڑا' کہتے ہیں۔ چنانچہ کتاب کے بارے میں بھی ہمارا یہی مسلک ہے کہ صرف خوب صورتی کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا متن بھی لذیذ یا مفید ہونا چاہیے اور وہ مثل ہرگز نہیں ہونی چاہیے کہ خوان بڑا، خوان پوش بڑا۔ اندر دیکھو تو دہی کا بڑا۔

اب آمدم برسرِ مطلب ہم نے آج کی بارات کے دولہا حضرت شیخ عبدالشکور کی اکلوتی تصنیف 'سبزۂ بے گانہ' از اوّل تا آخر پڑھی۔ اور اپنی مذکورہ کسوٹی لذت پر اس کے متن کو آنکا تو مال 'کو گنی' کے سونے جیسا کھرا پایا۔ اب کہیے کہ 'گنی' میں تولے پیچھے ماشا کھوٹ ہوتی ہے۔ تو ہم عرض کریں گے کہ اس کھوٹ کے بغیر زیور بنتا بھی نہیں ہے یعنی وہی بات کہ "بڑھا بھی دیتے ہیں

کچھ زیبِ داستاں کے لیے۔"

خیر لذت و افادیت کے پیمانے سے جانچنے کے بعد ہم نے اس کتاب کو زبان و بیان اور فصاحت و بلاغت کے زاویے سے دیکھا۔ جو آج کل ہمارا پسندیدہ طریقۂ کار ہے۔ اس جملے میں آج کل پُر زور اس لیے ہے کہ ہمارے زمانے میں وہی لوگ کتابیں لکھتے تھے جن کے پاس صرف لکھنے کے قابل بات ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ انہیں زبان و بیان پر قدرت بھی حاصل ہوتی تھی، جب کہ آج کل اس میدان میں وہ لوگ زیادہ آ رہے ہیں جنہیں زندگی کا کوئی شعبہ قبول نہیں کرتا تو وہ تالیف کے کام کو نرم چارہ سمجھ کر اس پر منہ مارنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ نہ ان کے پاس کہنے کے قابل کوئی بات ہوتی ہے اور نہ کسی بات کو کہنے کا سلیقہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے زمانے میں کتابوں کی قلت اور فی زمانہ کتابوں کی کثرت کا بڑا سبب یہی ہے۔

ویسے اس معاملے میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کا یہ قول بھی قابل غور ہے کہ تصنیف و تالیف کے کام میں چار اقسام کے 'م' کی اشد ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ ان کے بغیر اس کام میں سرخرو ہونا غیر ممکن ہے، یعنی اوّل مشاہدہ، دوئم مطالعہ، سوئم مراقبہ اور چہارم مغالطہ اور بہترین تخلیق وہ ہے، جس میں ان چاروں کا اعلیٰ امتزاج ہو۔ ہم ان چاروں کی تفصیل میں اس لیے نہیں جاتے کہ آپ حضرات بھی ماشاء اللہ پڑھے لکھے لوگ ہیں لیکن اتنا ضرور عرض کریں گے کہ آج کل کی بیشتر کتابوں میں اوّل تین 'م' یعنی مشاہدہ، مطالعہ و مراقبہ کی کمی کو چوتھے 'م' مغالطہ کی افراط سے پورا کر لیا جاتا ہے۔ اس پر زبان و بیان کی کوتاہیاں؟ سبحان اللہ۔ ماشاء اللہ میر تقی میرؔ ہوتے اس دور میں تو کہتے کہ:

"نا بابا، نا۔ ہم یہ کتابیں پڑھ کر اپنی زبان خراب نہیں کرتے۔"

تو مطلب آخرش یہ ہے کہ ہم نے 'سبزۂ بے گانہ' کو زبان و بیان سے چنداں بے گانہ نہیں پایا اور یہ ہمارے خیال میں کسی "Amature" کتابی مصنف کے لیے بہت بڑا "Credit" ہے۔ اب رہا یہ کہ تھوڑا بہت اعتراض ہے تو وہ کس کی زبان پر نہیں ہوتا۔ خود ہماری اپنی زبان کب کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی ہے جو ہم حضرت شیخ کی زبان پکڑیں اور میاں سو بات کی ایک بات یہ کہ بے عیب ذات اللہ کی اور بے عیب کلام ہے کلام اللہ۔ ورنہ زبان و بیان کو سقم کا تنکا تو ہر کشش تحریر میں لگا ہوا ملے گا۔ لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ مصنف اگر ہمہ قلم کا پیشہ نہیں کرتا تو تھوڑا بہت لسانی گھپلا روا ہے کیوں کہ

بقول حاذقؔ ضیائی:

ترا کلام، کلام خدا نہیں حاذقؔ
عبث یہ فکر ہے خامی نہ کچھ سخن میں رہے

اب آیئے! ایک آدھ مثال پر:

تو جس طرح قاب سے بریانی نکالنے والا اپنے پسندیدہ گوشت پر پہلے ہاتھ مارتا ہے۔ صاحبِ ذوق ہے تو چکنا گوشت ڈھونڈھتا ہے اور کور ذوق ہے تو روکھی بوٹی تلاش کرتا ہے۔ اسی طرح ہم بھی جو کتاب اُٹھاتے ہیں تو اس میں طنز ومزاح کے عناصر ڈھونڈھتے ہیں کہ ہم انہی کے رسیا ہیں سو ہمیں اس پہلو سے بھی کافی مواد ملا جس کی تفصیل بیان کرکے آپ کی آزمائش صبر میں اضافہ ہمیں منظور نہیں۔ اس لیے صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں جس کا تعلق گوہر جان سے ہے۔ وہ محترمہ ہمارے دادا جان کے زمانے کی نامی گرامی بالانشین، خاتونِ محفل تھیں اور ان کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے روحانی گرو۔ اکبر الٰہ آبادی نے یہ شعر انہی محترمہ کی فرمائش پر کہا تھا:

کون خوش بخت زمانے میں ہے گوہر کے سوا
جس کو اللہ نے سب کچھ دیا شوہر کے سوا

تو ہمارے محترم شیخ نے ان محترمہ کا ذکر بڑے فسوق وشوق سے اور بہت جی لگا کر کیا ہے اور ان کے فارسی غزل گانے کی تان یہاں لا کر توڑی ہے کہ ایک پٹھان اس گانے سے بے خود ہو کر پکار اُٹھا:

''مرحبا گوہر جان۔ نام افغاناں روشن کردی''

اور ہماری آنکھوں کے سامنے وہ لاتعداد بالانشین خواتینِ محفل گھوم گئیں جنہیں ہم سر آنکھوں پر بٹھا کر ان سے 'نامِ پاکستانیاں' روشن کرا رہے ہیں!

* *

نہ مسٹر نہ مولانا

مسعود احمد چیمہ

ایک مترجم کی حیثیت سے انگریزی لفظ 'مسٹر' کے لیے مناسب اُردو متبادل کی تلاش ہمارے لیے ہمیشہ سے ایک مسئلہ رہی ہے۔ کبھی 'جناب' سے کام چلانے کی کوشش کی تو کبھی نام کے آخر میں 'صاحب' کا دُم چھلا لگا کر گزارہ کرنے کی۔ 'محترم' بھی نہ جچا، کیوں کہ ہر کوئی تو محترم ہو نہیں سکتا۔ قرونِ اولیٰ کا زمانہ تو آنے سے رہا کہ غلام کو آقا سے بھی زیادہ قابلِ احترام قرار دیا جائے۔ اب تو اِس بات کا خطرہ ہے کہ صاحب بہادر کے ساتھ ساتھ اُن کے نائب قاصد کو بھی محترم لکھا گیا تو اُردو کو پس ماندہ سمجھ کر قابلِ گردن زدنی قرار دے دیا جائے گا اور انگریزی کے عاشقانِ زار کی خوئے بد کو ایک اور بہانہ مل جائے گا، جہاں پہلے ہی بہانوں کے (پیمانوں کے نہیں) ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اِس خیال کو اپنے ہی خلاف سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔

ہمارے ایک مترجم دوست نے تجویز پیش کی کہ گریڈ سولہ اور اِس سے اوپر کے سرکاری ملازمین کے نام کے شروع میں 'جناب' لکھا جائے اور گریڈ ایک تا پندرہ کے سرکاری ملازمین کے نام کے آخر میں 'صاحب' کا لاحقہ لگایا جائے۔ گویا یہاں بھی طبقاتی امتیاز کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی۔ ایک تجویز یہ تھی کہ مسٹر کو 'مسمی' اور مس یا مسز کو 'مسماۃ' لکھا جائے۔ لیکن ان دو الفاظ سے 'ایف آئی آر' یا کسی 'دیوانی مقدمے' کی بو آتی ہے۔ پھر یہ کہ ایرے غیرے، نتھو خیرے کو تو 'مسمی' کہا جا سکتا ہے، یا اُس کی گھر والی کو 'مسماۃ' کہہ سکتے ہیں، لیکن کسی صاحب بہادر کو 'مسمی' کہنا یا صاحب بہادر کی میم صاحبہ کو 'مسماۃ' کہنا مشکل، بلکہ ناممکن ہو گا۔

بھارت والوں نے 'مسٹر' کے متبادل کے طور پر 'شری' سے خوب کام لیا ہے۔ وہاں مرار جی ڈیسائی بھی 'شری' ہیں، تو کرتار سنگھ اور جمیل احمد بھی 'شری' ہیں۔ ہم ہیں کہ ابھی تک 'مسٹر' سے چمٹے ہوئے ہیں۔

اس سلسلے میں فارسی اور عربی والے بھی ہماری مدد نہیں کر سکتے۔ فارسی میں مسٹر کے لیے ’آقا یا آغا‘ کا لفظ ہے، جب کہ اُردو میں ’آقا‘ کے معانی مالک، حاکم، افسر وغیرہ کے ہیں۔ لہٰذا کسی سیٹھ صاحب یا صاحب بہادر کو تو ’آقا‘ کہا جا سکتا ہے، لیکن ان کے نوکروں کو ’آقا‘ کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔ عربی میں مسٹر کا نعم البدل ’سیّد‘ ہے وہاں ہر مرد ’السید اور ہر عورت السیدہ‘ ہے، جب کہ ہمارے یہاں یہ لفظ صرف آلِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے لیے مخصوص ہے۔ ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ اُن کے گاؤں کا ایک غریب آدمی (محمد علی نامی) کسی نہ کسی طرح سعودی عرب جانے میں کامیاب ہو گیا۔ پانچ سال کے بعد واپس آیا تو اُس نے پاسپورٹ کے صفحے پر سعودیہ کے ویزے کی مہر لگی ہوئی دیکھی، جس پر ’السید محمد علی‘ لکھا ہوا تھا۔ لوگوں نے فوراً یہ خبر گاؤں کے نمبردار کو پہنچائی کہ علیا اتر سعودی عرب جا کر سیّد بن گیا ہے۔ پھر یہ ہوا کہ نمبردار کے حکم پر علیا اور اُس کے خاندان کا حقہ پانی بند کر دیا گیا۔ بے چارے علیا کو اِدھر باپ کی طوفانی گالیوں کا سامنا کرنا پڑا اور اُدھر چچا نے اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ آخر عربی کے ایک پروفیسر صاحب نے اس مسئلے کو حل کیا، ورنہ علیا صاحب کے لیے دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ لہٰذا ہم پاکستان میں لفظ ’سیّد‘ کو ’مسٹر‘ کے نعم البدل کے طور پر نہیں اپنا سکتے۔

ہمارے یہاں عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ مسٹر صرف پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ہے۔ ہم نے ایک دن اپنے دفتر کے خاکروب پیارا مسیح کو مسٹر پیارا کہہ کر مخاطب کیا تو اُس نے ہماری طرف اس طرح حیرت سے دیکھا، جیسے ہمارے سر پر سینگ نکل آئے ہوں اور پھر کہا، ”جان دیو باؤ جی! کیوں مخول کر دے او۔ اَسی کویں مسٹر ہو سکنے آں، مسٹر تے تُسی او۔“ پیارا مسیح کے اس تبصرے کی روشنی میں پاکستان کی اسّی فیصد آبادی ’مسٹر‘ کی حدود سے نکل جاتی ہے۔ اگر حکومت کی تعلیمِ عامہ اور خواندگی کی مہم کامیاب ہو جاتی تو پچاس فیصد آبادی کا ’مسٹر‘ کے دائرہ کار میں آ جانا ممکن تھا، لیکن پرنالہ وہیں رہا۔

اے میرے پیارے قارئین! ہمارے عوام کالانعام ’مسٹر، مس، مسز، میڈم‘ کہلانے کے حقدار نہیں ہیں۔ وہ صرف ’مسمی یا مسماۃ‘ ہو سکتے ہیں اور وہ بھی تھانے، کچہری کے کاغذات میں۔ ویسے احترام کے طور پر بعض لوگ اپنے مخاطب کو ’مولانا‘ کہہ کر بھی مخاطب کرتے ہیں۔ آج سے پچیس سال پہلے کی بات ہے کہ ہمارے ایک افسر تھے، علی گڑھ کے فارغ التحصیل۔ وہ اپنے عملے

کے تمام ارکان کو 'مولانا' کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ کو بھی مولانا اور لوئر ڈویژن کلرک کو بھی مولانا۔ شعبے کے نائب قاصد تو تھے ہی مولانا، کیوں کہ اُن کے چہرے پر مسجّع و مقفّی داڑھی موجود تھی۔ ہمارے افسر کا اندازِ تخاطب کچھ اس طرح تھا! سپرنٹنڈنٹ سے مخاطب ہوکر، "مولانا کیا حال ہے آپ کا؟ کام کیسا چل رہا ہے؟ چھوٹے مولانا تو تنگ نہیں کرتے۔" لوئر ڈویژن کلرک سے مخاطب ہوکر، "مولانا! یہ ڈائری لے جایئے اور بڑے مولانا سے کہیے کہ 'آؤٹ اسٹینڈنگ' لیٹروں کا آج ہی ڈسپوزل کروائیں۔" اور اِس ہیچ مداں کو تو اکثر اِس طرح ہدایات دیا کرتے تھے، "مولانا! یہاں شاعری اور انشاء پردازی نہیں چلے گی۔ ٹو دی پوائنٹ بات کریں۔"

بہرحال، 'مولانا' کے سابقے کا عام رواج ممکن نہیں ہے۔ فرض کریں، کوئی صاحب ہمارے نام کے ساتھ 'مولانا' کا سابقہ لگا کر ہمیں 'مولانا مسعود احمد چیمہ' لکھنا شروع کردیں تو ہمارے لیے بڑی 'کنفیوژنگ' صورتِ حال پیدا ہوجائے گی اور کسی نے کوئی فتویٰ پوچھ لیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ پھر ہمیں ایسی صورتِ حال کا سامنا ہوگا، جس کا سامنا ایک گاؤں کے مولوی صاحب کو کرنا پڑا تھا۔ ان مولوی صاحب سے گاؤں کے لوگ مہینے کی تاریخ پوچھنے آیا کرتے تھے اور مولوی صاحب اپنے حجرے کے ایک کونے میں رکھی ہوئی بکری کی مینگنیوں سے کیلنڈر کا کام لیا کرتے تھے اور ہر روز اُس کیلنڈر میں ایک مینگنی کا اضافہ ہوجاتا تھا۔ پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ایک دن مولوی صاحب کی غیر حاضری میں ان کی بکری نے حجرے میں داخل ہوکر حجرے کے کونے میں پڑے ہوئے کیلنڈر کی تاریخوں میں بے پناہ اضافہ کردیا۔ اسی دن شام کو ایک دیہاتی تاریخ پوچھنے آیا تو مولوی صاحب نے اس سے کہا، "تم یہاں ٹھہرو، میں ابھی اندر دیکھ کر آتا ہوں۔" پھر مولوی صاحب بڑی دیر کے بعد ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے اپنے حجرے سے باہر نکلے اور دیہاتی کو بتایا کہ آج ساٹھ تاریخ ہے! اب دیہاتی کوئی ایسا گیا گزرا بھی نہیں تھا کہ مولوی صاحب کے اس جھوٹ کو بلا چوں چرا کیسے مان لیتا۔ لہٰذا اُس نے حیران ہوکر کہا، "مولوی صاحب! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں، ساٹھ تاریخ کیسے ہوسکتی ہے؟" مولوی صاحب بولے، "میرے بھائی! میں نے تو یہ تاریخ بھی خدا خوفی سے کام لیتے ہوئے کم بتائی ہے، ورنہ وہاں تو ایک سو سے اوپر تاریخیں پڑی ہوئی ہیں!"

اب اس قسم کے مولانا ہونے سے کچھ نہ ہونا بہتر ہے۔ لہٰذا یہاں 'مولانا' بھی 'مسٹر' کے

نعم البدل کے طور پر نہیں چل سکتا۔ اکبر الہ آبادی نے فرمایا تھا:

پکا لیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جَو لانا   ہماری کیا ہے اے بھائی، نہ مسٹر ہیں نہ مولانا!

اس طرح حضرتِ اکبر 'مسٹر اور مولانا' کی صف سے نکل کر عوام کی صف میں شامل ہو گئے۔ اُن کے زمانے میں جَو سستا ہوگا، آج کل تو گندم سے بھی زیادہ مہنگا ہے اور گندم بھی عوام کی حدود سے نکلتا جا رہا ہے۔ اب تو عوام کی خوراک کے لیے کوئی پلاسٹک قسم کی چیز ہی ایجاد کرنی پڑے گی، تا کہ گندم کو 'مسٹر اور مولانا' کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ آسان الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں:

"کھان پین نوں باندری تے ڈنڈے کھان نوں رِچھ"

(کھانے پینے کے لیے بندریا اور ڈنڈے کھانے کو ریچھ)۔

* * *

غلطی

مسعود مفتی

اب آپ ہی بتائیے، اِس میں ہمارا کیا قصور؟ غلطی ضرور ہوئی، اکثر لوگوں سے ہو جاتی ہے۔ خود ہمارے جدِ امجد باوا آدم سے ہوئی۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ آدم جیسے بندے کی خطا پر اُن کے خدا نے اتنا شور نہ کیا ہوگا، جتنا ہم جیسے مجازی خدا کی بھول پر ہماری ہی بندی کر رہی ہیں۔ شوہرانہ انداز میں سمجھوتے کی کئی بار کوشش کی، غلطی بر بنائے غلط فہمی کا یقین دلایا، مصنوعی غصے میں ڈرامائی ایکٹروں کے سے انداز میں بیگم کو مارنے دوڑے، لیکن بیگم ہیں کہ زبان کے ہتھیاروں سے ہلاکو اور چنگیز کی یاد تازہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں اور یہ نہیں سوچتیں کہ جو شخص ان سے شادی جیسی فاش غلطی کر سکتا ہے، اس سے چھوٹی موٹی دوسری غلطیاں سرزد ہو جانا نہ صرف قرینِ قیاس ہے، بلکہ ہر وقت قابلِ معافی بھی۔

ہماری بریت میں سب سے وزن دار دلیل تو یہ تھی کہ اول تو یہ جرم ہم سے نادانستہ سرزد ہوا اور دوسرے اس وقت ہوا جب ہم ایک اچھا شوہر ہونے کا ثبوت بہم پہنچانے کو بیگم ہی کی خدمت پر مامور تھے۔ بات صرف اتنی تھی کہ ہماری درجن بھر سالیوں میں سے کسی ایک کے ہونے والے شوہر کا انٹرویو تھا، جس کے بورڈ میں ہمیں بھی بیٹھنا تھا۔ خدا جانے کاتبِ تقدیر کا منشا کیا تھا کہ آیا ہم اسے چنیں یا وہ ہمیں دیکھ کر عبرت پکڑے اور اِس گھر کا نام نہ لے۔ بہر حال، اسی مقصد کے لیے ہم سفر کر رہے تھے۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے گاڑی میں ہماری ہم سفر ایک محترمہ تھیں، یعنی ایک تو ہم سفر اور پھر صنفِ نازک، یقین جانیے سفر کٹنے کا پتا بھی نہ چلا۔ ویسے تو عورتوں کی موجودگی کا احساس ان کے جانے کے بعد ہی ہوا کرتا ہے، لیکن اس دن اس احساس کو شدید تر کرنے والی چیز کتابوں کا ایک بنڈل تھا جو وہ غلطی سے چھوڑ گئی تھیں۔ اب مشکل یہ پڑی کہ ہمارے خمیر میں خدا تعالیٰ نے دیانتداری کے مادے کا تناسب ضرورت سے کچھ زیادہ ہی رکھا ہے۔ چنانچہ اسی کے زیرِ اثر ورق

گردانی کی تو ایک کتاب پر اُن محترمہ کا نام اور مکمل پتا بھی مل گیا۔ اخلاقاً ہم نے دوسرے روز وہ بنڈل بذریعہ ڈاک ان کو بھجوا ڈالا۔ ساتھ ہی ایک رسمی سا خط لکھ ڈالا۔ رسمی خط سے زیادہ کچھ لکھنے کی گنجائش ہی نہ تھی، کیوں کہ ایسا وہم دل میں لاتے ہی نہ معلوم ہمارے تصور میں بیگم کا وہ سین کیوں آجاتا ہے، جب کسی ایسی ہی بات پر بگڑ کر وہ باورچی خانے کی پھکنی تک سمیٹ کر اپنے میکے کو پرواز کر چلی تھیں۔ اس لیے ہم ہمیشہ اس امر کی احتیاط کرتے آئے تھے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے نہ پائے، ورنہ ہمارے گھر اور پانی پت کے میدان میں کوئی زیادہ فرق نہ رہتا۔ قصہ مختصر، محترمہ کو ہمارا خط مع کتابوں کے ملا تو اُنہوں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک جوابی خط ارسال فرما دیا۔

یادش بخیر! خط کیا تھا، ایک سادے سے ورق پر ٹیڑھی لکیروں پر مشتمل کچھ ایسی اشکال بنی ہوئی تھیں جو محض منطقی دلائل کی مدد ہی سے الفاظ کہلائی جا سکتی تھیں۔ بوجہ خط ہونے کے یہ فرض کر لیا کہ سب سے پہلی دم کٹی لائن میں ہمیں کسی معزز القاب سے یاد فرمایا ہوگا اور خط کے اخیر میں اکڑوں بیٹھے چند الفاظ کے گچھے کے متعلق گزشتہ علم کی بنا پر اندازہ لگایا کہ یہ ان کا نام اور پتا ہوگا۔ ان قطبین کے درمیان گویا ایک میدانِ کارزار تھا جس پہ الفاظ باہم اُلجھ رہے تھے۔ ہم نے اسے پہلی نظر میں تعویذ سمجھا، دوسری نظر میں بہرام ڈاکو کا کوئی خفیہ پیغام اور پھر سوچتے رہے کہ اسے کیا سمجھیں؟ عینک اتار کر پڑھا، لیٹ کر پڑھا، دوسری میز پر سر تھام کر پڑھنے کی کوشش کی، اکڑوں بیٹھ کر دماغ آزمائی کی، ٹہلتے ٹہلتے آنکھیں موند کر، دیدے پھاڑ کر، ایک آنکھ بند کر کے، اس راز کو حل کرنا چاہا۔ دیوار پر لٹکایا، دری پر بچھایا، محدب شیشے میں جھانک جھانک کر غور و خوض میں درجنوں سگریٹ پھونک ڈالے، خلل اندازی کے جرم میں ہر بچے کو بیسیوں مرتبہ دھنک ڈالا، کھانا کھاتے وقت کتنے ہی نوالے منہ کی بجائے ناک اور رُخساروں پر دے مارے، لیکن قسم لے لیجیے جو اس احساس کے علاوہ کہ یہ ایک ممنون محترمہ کا خط ہے، کچھ بھی پلے پڑا ہو۔ انگریزی کے حروف (خصوصاً ایل ایچ اور ایم این یو) اگر جلدی میں لکھے جائیں تو ویسے ہی توام بھائی بن جاتے ہیں، لیکن وہاں تو مصیبت یہ تھی کہ ہر دائرے، نقطے یا خط کو مختلف زاویوں سے دیکھتے تو اُس پر نئے حرف کا گمان ہوتا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ تھا کہ بند کمرے میں ہماری محویت دیکھتے ہوئے بیگم نے نیم تیموری، نیم معشوقانہ انداز میں تقاضا شروع کر دیا تھا کہ جو روپے ان نگوڑے معموں پر صرف کرتے ہو، اُن سے میری گھڑی میں فیتہ کیوں نہیں ڈلواتے؟ اس تقاضے کا حشر تو خیر مسلسل ایک

ہفتے کی دماغ سوزی کے بعد وہی ہوا، جو ایسے تقاضوں کا ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے، لیکن مسلسل ایک ہفتہ کی دماغ سوز کے بعد ہم نے بھی تنگ آ کر فیصلہ کیا کہ اسے اپنے کلرک ہمسائے کو دکھانا چاہیے، کیوں کہ کلرکوں کی تحریر پڑھنے میں بھی ہمیں بارہا انہی کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ اتنی عقل مندی البتہ ضرور کی کہ کاغذ کا القاب اور نام والا حصہ پھاڑ کر خط کا اصل مضمون انہیں دیا، کیوں کہ ہم بھی تو عزت دار آدمی ہیں، نہ معلوم خط میں کیا لکھا نکل آئے۔ عورت کے مزاج کی طرح عورت کا خط بھی تو قابلِ اعتبار چیز نہیں ہے۔

ایک دن کا وقفہ دے کر ہم صبح ان کے ہاں جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ گھنٹی بجی اور باہر نکلتے ہی انہی صاحب کو سوالیہ نشان بنے کھڑے پایا۔

چھوٹتے ہی بولے، ”یہ کاغذ آپ نے کہاں سے لیا تھا؟“ کہاں تو ہم راز حل ہو جانے کے خوش آئند تصورات میں پرواز کر رہے تھے اور کہاں یہ ناگہانی تفتیش ٹپک پڑی۔

”صاحب میرے ایک دوست نے مجھے پڑھنے کو دیا تھا اور میں نے آپ سے مدد مانگی۔“ ہم نے گھبراہٹ میں جلدی سے بات بنا ڈالی۔

”تو، بھائی صاحب۔“، وہ رازدارانہ انداز میں بولے، ”میری مانیے تو کاغذ فوراً انہیں واپس دے دیں اور آپ ہرگز اِس معاملہ میں نہ آئیں۔“

”کیوں؟ خیریت تو ہے۔“ ہم ہکا بکا رہ گئے۔

”سچ پوچھیے تو سارا تو مجھ سے بھی نہیں پڑھا گیا، لیکن بیچ بیچ میں سے پڑھ کر نفسِ مضمون کا پتا چل گیا ہے... یہ دراصل دفتر کا کوئی کیس ہے، جو اُن صاحب نے کسی کی پرسنل فائل سے پھاڑا ہے۔ مکمل کاغذ ہوتا تو شاید پتا لگ جاتا، لیکن اب تو آپ دیکھتے ہیں کہ اوپر اور نیچے سے بھی پھاڑ ڈالا گیا ہے، اسی لیے اب معاملہ بہت سنگین ہو گیا ہے۔ لہٰذا میرا مخلصانہ مشورہ تو یہی ہے کہ آپ یہ کاغذ اُن کے حوالے کیجیے اور اپنی جان بچائیے۔“

اب ہم دل ہی دل میں ہنس رہے ہیں تو انہوں نے اسے ہمارے فکر پر محمول کیا، چنانچہ سرگوشی میں بولے، ”میں نے کہا... کوئی اپنے آدمی ہیں کیا؟“

”ہیں تو!“ ہم نے ڈراما جاری رکھا۔

”آپ کل شام انہیں میرے ہاں لے آئیے۔ ایک تیر بہدف نسخہ بتاؤں گا۔ پندرہ سال کی

کلرکی میں سیکھا ہی کیا ہے۔ ایک آدھ فائل گم کر دینا کون سا مشکل کام ہے؟'' ان کا سینہ پھول گیا۔

''اچھا، میں ان سے مشورہ کر کے عرض کروں گا۔'' یہ کہتے ہوئے ہم نے دروازہ بند کرلیا اور جان بچائی۔

کلرک صاحب کو مطعون کرنا سراسر زیادتی ہوگی۔ یہ کیا کم تھا کہ جن گتھیوں کو ہم سمجھ نہ سکتے تھے، ان سے انہوں نے کچھ تو اخذ کرلیا تھا۔ لہٰذا اِس قصے کو وہیں ختم کرتے ہوئے ہم نے اپنے ایک ڈاکٹر دوست کی طرف رجوع کیا، کیوں کہ جو ڈاکٹر صاحب ایسا نسخہ لکھ اور پڑھ سکتے ہیں، جو تجریدی آرٹ کا کوئی نا قابلِ فہم شاہکار معلوم ہوتا ہو، ان سے اس راز کا حل ہو جانا بعید از قیاس نہ تھا۔

ایک دو دن تو ڈاکٹر صاحب کو فرصت ہی نہ ملی، لیکن تیسرے دن جب ہم ان کی ڈسپنسری کے سامنے سے گزر رہے تھے تو وہ اندر سے ہی چلائے:

''ارے بھائی، وہ تمہارے کاغذ نے بہت تنگ کیا۔''

اور پیشتر اِس کے کہ وہ کچھ اور فرماتے، ہم اُچک کر اندر پہنچ چکے تھے اور بے صبری سے مزید تفصیلات کا تقاضا کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ایک بچی کی نبض پکڑے لال پانی کی شیشی کے سوراخ دار ڈھکنے میں تھرمامیٹر ڈالتے ہوئے بولے، ''آج مسلسل تین گھنٹے کی محنت کے بعد پتا چلا۔ بس ابھی بنا کے آیا ہوں۔''

عرض کیا، ''کیا بنا کے آئے ہیں؟''

بولے، ''صرف چپاتی شوربا کھائیے۔ کھٹی اور بادی اشیا سے پرہیز۔ اور ہاں بھائی، ایک دوائی تو ملتی ہی نہ تھی۔''

ہم نے گھبرا کر عرض کیا، ''قبلہ آپ فارغ ہو لیں تو اطمینان سے بات کریں گے۔''

کہنے لگے، ''نہیں میں تو فارغ ہی ہوں۔ بڑے میاں پیٹ سے کپڑا اُٹھائیے، (مجھے اشارہ کر کے) بیٹھو گے بھی یا کھڑے ہی رہو گے؟ اور ہاں قبض تو نہیں ہے؟ ارے بھائی اندر سے لانا ان کی شیشی۔''

دراصل ڈاکٹر صاحب ان لوگوں میں سے تھے، جو قدرت کی ودیعت کردہ آنکھوں پر مطمئن

نہیں ہوتے اور ایجادِ بندہ۔ اگرچہ گندہ۔ کے قائل ہوتے ہوئے چیلیوں کا نیا زاویہ نگاہ ایجاد کر کے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس بھینگے پن کا عملی نقصان یہ تھا کہ ہمیں آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ وہ دراصل کس سے مخاطب ہیں۔ اکثر یہ ہوتا کہ وہ مرض ایک مریض سے پوچھتے ہیں اور حالت کوئی دوسرا بتانا شروع کر دیتا ہے۔ اِدھر ہم بیٹھے ڈرتے رہتے کہ وہ ایک مریض کی موت کہیں دوسرے پر منتقل نہ کر دیں۔ چنانچہ آج بھی یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کا رُوئے سخن کسی اور مریض کی طرف ہوگا، ہم چپکے بیٹھ گئے، لیکن چند ہی ثانیے بعد کمپاؤنڈر نے ایک نہایت بدرنگ دوائی کی بڑی سی شیشی ہمارے ہاتھ میں تھما دی۔ (جس کا کارک مضبوطی سے بند ہونے کے باوجود بدبو کے بھبکے لپک لپک کر دماغ کو چڑھ رہے تھے) اور ساتھ ہی محترمہ کا خط دیتے ہوئے بولا، ”اور یہ رہا صاحب آپ کا نسخہ!“

اب حضرت موسیٰؑ تو خوش ہوں، جن کو آگ کی بجائے پیغمبری مل گئی، لیکن جس بدقسمت کو متوقع دوستی کی بجائے غلیظ سی دوائی مل جائے وہ کیا خاک خوش ہوگا۔ ہم نے بے بسی سے کمپاؤنڈر کے چہرے کو دیکھا، اِرد گرد بیٹھے ہوئے مریضوں کی طرف تاکا اور پھر ایک ہی ٹک ’نسخے‘ اور دوائی کو جو دیکھنے لگے تو یقین جانیے دوائی پیے بغیر ہی پیٹ میں جلاب کی سی کیفیت محسوس ہونے لگی۔ عین اسی وقت ڈاکٹر صاحب کی چیخ کان پڑی، ”نہ نہ نہ، انار ہرگز نہ کھائیے گا۔ نقصان دے گا۔ اور بھائی یہ نسخہ کہاں سے لیا تھا؟ ایک دوائی تو بالکل ہی نایاب ہے۔ صرف تمہاری وجہ سے دوسرے ڈاکٹر کی منتیں کر کے دو گرام منگوائی ہے۔ بہرحال، تمہارا کام تو ہو گیا۔ لیکن اس ڈاکٹر سے کہنا کہ کم از کم کسی باضابطہ طریقے سے ڈھنگ کے کاغذ پر نسخہ لکھا کرے، یہ کیا حماقت...“

لیکن ان کی بات ختم ہونے سے پیشتر ہم ایک ہی جست میں دکان عبور کر کے نزدیک ترین بدرو کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ وہاں پہنچ کر شیشی کو پوری قوت سے کالے سیال پانی میں پھینکا اور جب دوائی کی بو بدرو کی بو میں مل گئی تو ہم سر جھکا کر گھر کو پلٹے۔

اگلی ساری رات خط کو سامنے رکھ کر ہم نے ایک دفعہ پھر گزشتہ دماغی ورزشوں کا ورد کیا، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ صبح صبح بجائے نماز ادا کرنے کے ہم اپنے دوسرے دوست کی طرف بھاگے جا رہے تھے، جو کافی مدت سے وکالت کر رہے تھے اور چوں کہ وکیلوں کا مختلف قسم کی مِسلوں سے واسطہ پڑتا ہے اس لیے ہمارا خیال تھا کہ وہ ضرور کچھ مدد دے سکیں گے۔ چنانچہ جب انہوں نے پوری توجہ

ے پڑھنے کا کئی بار یقین دلایا تو ہم واپس پلٹے۔ سارا دن بے چینی سے گزرا۔ ذہن میں وکیل صاحب کی مصروفیت تولتے رہے۔ تصور میں ان کی گزشتہ ساری عمر کی علمی قابلیت کو پرکھ کر اُن کی کامیابی کے امکانات پر غور کرتے رہے اور بالآخر شام کو دھڑکتے دل سے ان کے بنگلے پر پہنچے۔ وہ لان میں بیٹھے اپنے مؤکلوں کو پھانسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے حاضرین سے معذرت چاہی اور سارے مکان کو عبور کر کے ایک نسبتاً تاریک اور علیٰحدہ کمرے میں لے گئے۔

”ارے رامو۔“ ملازم کو للکارتے ہوئے بولے، ”اس طرف کوئی نہ آئے۔“

انداز اور لہجہ ایسا تھا کہ ہمارا ماتھا ٹھنکا اور دل میں ہزاروں اندیشے جاگ اُٹھے۔ مجھے کرسی میں دھکیلتے ہوئے بولے، ”میاں مجھ سے کیا پردہ تھا، جو شروع اور اخیر سے نام ہی پھاڑ ڈالے؟ یہ تو میں پھر بھی جان گیا ہوں کہ یہ ایک نسوانی خط ہے۔“

ہم غالباً عمر میں پہلی بار مکمل دنگ رہ گئے، لیکن راز کو حل ہوتے دیکھ کر ہمارے ذہن سے ایک بوجھ سا اُتر گیا۔ وکیل صاحب بولے، ”پہلے یہ بتاؤ کہ خط تمہارے ہی نام ہے؟“

اب کچھ چھپانا فضول تھا چنانچہ ہم نے مجرمانہ طریقے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وکیل صاحب نے ناک میں سے لمبا سا ’ہوں‘ کیا، کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر چھت کو گھورنے لگے، پھر آنکھیں موند کر پاؤں ہلانے لگے، کرسی کے بازو کو انگلیوں سے بجایا اور تھوڑا سا مخاطب ہو کر بولے، ”بھئی معاف کرنا، لیکن تمہاری بیوی بہت سخت قسم کی عورت معلوم ہوتی ہے۔“

ہم سچ مچ اُچھل پڑے۔ ان کی عالمانہ قابلیت کے دل ہی دل میں قائل ہوئے ہم نے سوچا کہ یہ کم بخت تو سب کچھ جان گیا ہے، ایسی چیزیں بھی جن کا خط سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ شیطان اور وکیلوں کے جس روایتی رشتے کا عموماً ذکر کیا جاتا ہے، ہمیں اس پر بھی یقین آنے لگا۔ لیکن اس یقین دہانی سے زیادہ نفسِ مضمون کے متعلق ہماری تشویش چٹکیاں لے رہی تھی۔ پھر بھی ہم نے شرماتے شرماتے ان کے مشاہدے کی تائید کر دی۔ وہ تسلی دیتے ہوئے بولے،

”خیر! خیر! کوئی بات نہیں۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بیوی عموماً پہلے سال تعاون سہتی ہے۔ دوسرے سال تعاون کرتی ہے اور پھر ساری عمر تعاون کراتی ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ عموماً بیویاں سخت ہی

ہوتی ہیں کیوں کہ وہ سمجھتی ہیں کہ عمر میں ایک ہی تو شکار سختی کرنے کو ملا ہے... لیکن میرا مطلب ہے کہ تمہارا معاملہ... یعنی بات یہ ہے کہ معاملہ تمہارے ہاتھ سے اب باہر ہو چکا ہے۔“

”کیا مطلب۔“ ہم نے اس معما بازی سے تنگ آ کر پوچھا۔

”مطلب یہ کہ خط بہت غصے کی حالت میں لکھا گیا ہے اور تمہاری بیوی نے صاف لکھ دیا ہے کہ وہ تم سے قطع تعلق کرنا چاہتی ہے اور یہ کہ چار دن کے اندر اندر حق مہر بھجوا دو نہیں تو عدالتی کارروائی کی جائے گی۔“

اگر یہ بات درست ہوتی تو شاید شادی کے بعد یہ ہمارے لیے دوسری بڑی خوشخبری ہوتی، لیکن اس وقت تو مایوسی سے ہم بے جان ہو گئے، وکیل صاحب کے ہاتھ سے خط چھین کر ہم باہر کو لپکے اور وہ ”سنو تو، ارے بھئی سنو تو۔“ ہی پکارتے رہے۔

بزرگوں کا قول ہے کہ ہر طرف سے مایوس ہو کر جب کوئی آدمی آخری کوشش کرتا ہے تو وہ عموماً کامیاب ہوتا ہے، چنانچہ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا اور پندرہ دن کی سرتوڑ کوشش کے بعد وہ لاطینی کچھ کچھ ہماری سمجھ میں آنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مزید پندرہ دن بعد ہم اس کا ہر حرف سمجھ گئے۔ پورا مضمون تو خیر پردے کی بات ہے، لیکن صرف آپ کو اتنا بتائے دیتے ہیں کہ اس خط میں جو فرمائش کی گئی تھی اس کی تکمیل میں ہم نے چار کتابیں بازار سے خرید کر بھیج دیں۔ ساتھ ایک خط بھی لکھا۔ آپ جانتے ہیں رسمی خط تو ایک ہی کافی ہوتا ہے اور ہم تو دوسرا لکھ رہے تھے۔

دوسرے ہی دن نہایت صاف ٹائپ کیا ہوا ایک خط ملا، جس کا ہر حرف کئی گز دور سے پڑھا جاتا تھا۔ خط کا مضمون یہ تھا:

(القاب کا راز میں رہنا ہی بہتر ہے) میں نہیں جانتی آپ کون ہیں۔ میری ایک سہیلی مجھ سے وہ کتابیں مانگ کر لے گئی تھی، جو آپ نے پہلی دفعہ بھجوائی تھیں۔ میرا خیال تھا اس نے آپ سے واقفیت کی بنا پر یہ کتابیں مجھے بھیجنے کو کہا ہوگا، چنانچہ میں نے محض شرافت سے مجبور ہو کر وہ چاروں کتابیں ملنے کی اطلاع دی تھی۔ لیکن آپ کی طرف سے کتابوں کا دوسرا بنڈل اور خط ملنے پر میں حیران ہوں کہ پہلی کتابیں آپ کے ہتھے کیسے چڑھ گئیں۔ میں آپ جیسے...“ مزید کیا لکھیں؟ خواہ مخواہ، آپ کی طبیعت خراب ہو گی اور قانون دان حضرات ہتکِ عزت

سے متعلق قانون کی کتابوں میں جھانکنا شروع کر دیں گے۔

لیکن جھگڑا سارا اِس بات کا تھا کہ وہ خط ہماری غیر حاضری میں بیگم نے وصول کر لیا تھا، پھر اپنے بیگماتی حقوق کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے اسے کھول لیا تھا اور نتیجہ یہ تھا کہ گزشتہ چار گھنٹے سے ہم کوئی تہ خانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ اور اَب بیگم بال کھولے، ایک ہاتھ میں خط پکڑے، ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی، اپنے چہرے پر کریم اور ہمارے چہرے پر کالک مل رہی تھیں۔ اِدھر ہم یہ سوچ رہے تھے کہ غلطی ہماری ہے جنہوں نے غلط فہمی میں وہ کتابیں بھیج دیں یا ان محترمہ کی جنہوں نے پہلا ہی خط ٹائپ شدہ کیوں نہ بھیجا؟

* *

دسترخوان کے شیر+شعر

مسیح انجم

آزادی کے بعد ملک میں ایک ایسی ہوا چلی کہ سماجی، ثقافتی اور تہذیبی قدریں بڑی تیزی سے بدل گئیں۔ روایات بدلے لوگوں کے قول و فعل کا بھروسا نہ رہا۔ نازنینوں کی زلفیں چھوٹی ہو گئیں، نوجوانوں نے خط بڑھائے، کاکل بڑھے، زلفیں بڑھیں، گیسو بڑھے، مگر دل بہت تنگ ہو گئے۔ معدوں میں بلا کی وسعت آ گئی۔ نتیجتاً دسترخوان کے آداب و قواعد بُری طرح متاثر ہوئے۔ خاص طور پر نان و بجٹیرین بڑا متاثر ہوا۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو مرغِ مسلم، دو گوشتہ بریانی اور مکمل لوازمات پر مشتمل ایک ضیافت کا اہتمام کر کے خود ہی دیکھ لیجیے کہ ہمارے نوجوان، شیروں کی طرح اپنی اپنی میزوں کے حدود اور احاطہ میں کس طرح اودھم مچاتے ہیں؟ اِدھر ابھی آپ ہاتھ دھو کر اپنی میز کے پاس بیٹھنے بھی نہیں پاتے کہ اُدھر آپ کے حصہ کی قیمی دسترخوان کے شیر کا لقمہ بن جاتی ہے۔ ادھر آپ تھوڑی سی رواداری برتنے میں مصروف ہو جاتے ہیں تو اُدھر آپ کے حصے کا مرغ آپ کو داغِ مفارقت دے جاتا ہے۔ آپ دسترخوان کے شیر پر صرف دانت پیستے رہ جاتے ہیں، مگر وہ اپنی داڑھ چلانے میں مگن رہتا ہے۔ بھلا اب اُن دسترخوان کے شیروں کو یہ کون سمجھائے کہ بھئی دسترخوان کے بھی کچھ آداب و قواعد ہوتے ہیں، آداب و قواعد کی بات تو دُور کی رہی۔ وہ تو دسترخوان پر پہنچنے سے پہلے مطلع کے طور پر ہاتھ دھو لینے کو بھی ایک جھنجھٹ تصور کرتے ہیں، بلکہ اکثر تو مقطع اور مطلع ایک ساتھ کہہ لینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بعض دسترخوان کے شیر تو دُور اندیشی کے تقاضے کے طور پر گھر پر ہی مطلع کہہ لیتے ہیں اور پھر دعوت میں تناولِ طعام کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ انہیں اس بات کی قطعی پروا نہیں رہتی کہ راستے میں ان کا 'مطلع' کتنا گرد آلود ہو گیا تھا۔ آخر ماضی میں بھی تو دسترخوان کے شیر ہوا کرتے تھے۔ لیکن ماضی، اب ماضی بعید ہو چکا ہے۔ ماضی میں دسترخوان 'پہلے آپ' سے شروع ہوتا تھا۔ لیکن اب 'پہلے میں' سے شروع ہوتا ہے۔

رنگِ ادب، دہلی، کلکتہ

مسیح انجم ...... دسترخوان کے شیر+شعر

اور اکثر 'تُو تُو مَیں مَیں' بھی ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر اگر میزبان ذرا 'رَف' قسم کا ہو تو وہ لوازمات میں گھونسوں کو بھی شامل کر دے گا۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ گھونسے کھانے والا۔ (دسترخوان کا شیر) گردن جھکا کر یہی کہے گا کہ:

"بچپن میں میری ماں بھی مجھے اسی طرح مار کر کھانا کھلاتی تھی!"

لیکن ماضی میں اگر کوئی دسترخوان کا شیر ڈٹ کر کھانے اور اودھم مچانے پر تُل جاتا تھا تو میزبان کی بھی رگِ حمیت پھڑک اُٹھتی تھی اور وہ بھی کھلانے پر تُل جاتا تھا۔ اس طرح ہر دو فریق اپنی اپنی ہار کو کرکٹ ٹیسٹ میچ کی طرح اپنے لیے ایک وقار کا مسئلہ بنا دیتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ دعوت 'کھائیں تمام رات، کھلائیں تمام رات' وہ دن بھی آئیں اُن کو جگائیں تمام رات' میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ بالآخر میزبان اسپورٹس مین اسپرٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے دسترخوان کے شیر کی پیٹھ تھپک کر ڈکلیر کرتا:

"You are the man of the match!"

تب وہ دسترخوان کا شیر **"Man of the Series"** کا ٹائٹل حاصل کرنے کے لیے سلسلہ وار کئی دعوتوں میں معرکے سر کرتا اور بکرے اور مرغوں کی 'باقیات' کے ڈھیر دسترخوانوں پر لگا دیتا اور کئی دن تک پیچش کے مرض میں مبتلا رہتا۔ لیکن اب جو دعوتیں دی جاتی ہیں وہ 'لمیٹیڈ اوورس' کی بنیاد پر دی جاتی ہیں۔ محدود مہمان اور لامحدود بن بلائے مہمان۔ محدود لوازمات اور محدود بوٹیاں۔ بعض وقت تو بریانی کی پلیٹ میں بوٹیوں کی مقدار اس حد تک کم کر دی جاتی ہے کہ وہ 'تلاش گمشدہ' کا اشتہار بن جاتی ہیں۔ اور بوٹی کو کھوجنے کے لیے ایک مہمان کو باضابطہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ "جو شخص بھی بوٹی کو تلاش کر کے لائے اُسے پچاس روپے نقد انعام!" ایسے موقع پر میزبان سے گوشت کے بارے میں دریافت کرنا بالکل فضول ہے۔ وہ مہمانوں پر اپنی دھاک جمانے کے لیے یہی جواب دے گا کہ "ساری بوٹیاں گھل گئی ہیں۔ کیوں کہ گوشت جو منگایا گیا تھا وہ 'بغیر ہڈی' کا تھا۔" اگر دعوت شیرمال اور قورمہ کی ہو تو دسترخوان پر کٹوروں میں شوربا ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دے گا۔ اُس وقت بوٹی کو تلاش کرنے کے لیے ایک مہمان کو باضابطہ لنگوٹ لگا کے شوربے میں ڈبکی لگانے کی نوبت آ جاتی ہے۔

ہم نے مروّت میں دسترخوان پر ڈٹ کے کھانے اور اودھم مچانے والے نوجوان کو شیر سے

انور احمد علوی

تشبیہ دی ہے اور یہ بات جنگل کے شیر کے لیے عین توہین کے مترادف ہے۔ اگر شیر کو اس بات کا پتا چل جائے تو وہ ہمارے خلاف عدالت میں ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر بیٹھے۔ کیوں کہ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جب شیر کا پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے تو وہ کسی جانور کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا، بلکہ تصورِ جاناں اور 'چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ' میں مصروف رہتا ہے۔

لیکن جہاں تک دسترخوان کے شیروں کا تعلق ہے وہ بڑے بے حیا ہوتے ہیں۔ انہیں 'ہوکا' نام کی ایک بیماری مستقل لگی رہتی ہے، جو دعوتوں کے سیزن میں بساند چیزوں کو دیکھنے اور سونگھنے سے عود کر آتی ہے۔ جس کا خمیازہ ضیافت کرنے والوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اس کا واحد علاج اُبلے ہوئے موٹے چاول اور چٹنی ہے۔ (مگر واضح رہے کہ لفظ 'چٹنی' کسی شاعر کا تخلص نہیں ہے) اس علاج سے اگر مرض میں افاقہ نہ ہوا تو ہمارا ذمہ۔ گاؤں کی ہوشیار ساس اپنے چٹورے داماد کو اسی علاج سے راہِ راست پر لاتی ہے۔ طب کی اصطلاح میں اس علاج کو 'گھریلو علاج' یا 'علاج بالغذا' کہا جاتا ہے۔

دسترخوان کے شیروں کے تذکرے کے بعد ان اشعار کا تذکرہ بھی ضروری ہے، جو دسترخوان پر زیورِ طبع سے آراستہ ہوتے ہیں۔ اس قسم کے دسترخوان کو آپ 'اُردو دسترخوان' کہہ سکتے ہیں، لیکن آج کل یہ 'اُردو دسترخوان' اُردو میڈیم کے مدارس کی طرح اکا دُکا ہی نظر آنے لگے ہیں۔ پرسوں ہم نے بہت کوشش کی کہ کہیں سے اشعار سے مزین دسترخوان حاصل کریں، لیکن بُری طرح ناکام رہے۔ ایک دوست نے مشورہ دیا کہ ''تم پتھرگٹی جاؤ۔ وہاں بہت سی دکانیں ہیں۔ کسی ایک دکان پر جا کر دسترخوانوں سے مختلف شعر نوٹ کر لینا اور اگر اشعار والے دسترخوان نہ ملیں تو فکر ضرورت نہیں۔ وہاں کی ہوٹلوں میں بہت سارے شاعر مل جائیں گے۔ ان سے بلا معاوضہ شعر لکھوا لینا۔''

مجھے یہ بات بے حد پسند آئی۔ مَیں پتھرگٹی گیا اور ایک دکاندار سے پوچھا، ''جناب! کیا آپ کے پاس اشعار والے دسترخوان ہیں؟'' دکاندار نے دریافت کیا، ''گھر کے لیے یا جہیز میں دینے!؟''

میں کوئی جواب دیے بغیر مسکرا کر رہ گیا اور مختلف دسترخوانوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ بڑی مشکل سے ایک دسترخوان ہاتھ لگا، لیکن اس پر اُردو کا جو شعر تھا وہ بہت ہی دھندلا گیا تھا۔ میں نے

رنگِ ادب دہلی کینٹ

مسیح انجم .... دسترخوان کے شیر + شعر

دکاندار سے پوچھا، ’’کیا آپ کے پاس اُردو اشعار کے لیٹسٹ "Latest" دستر خوان نہیں ہیں؟‘‘

وہ کاروباری انداز میں بولا، ’’جناب! جب اُردو کی کتابیں نہیں خریدی جاتیں تو پھر اُردو کے دستر خوان کون چھپوائے گا؟ اب تو میں انگلش میڈیم کے دستر خوان چھپوا رہا ہوں!‘‘ یہ سنتے ہی میں دکان سے باہر نکل آیا۔

اتنے میں میری نظر ایک لیڈر پر پڑی۔ وہ اپنی کار میں کسی جلسہ گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے یاد آیا کہ ان کے پاس بھی اُردو کا ایک دستر خوان ہے۔ جب وہ اپنا دستر خوان بچھاتے ہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ الیکشن کے دن آ گئے ہیں۔ وہ اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کو لڑانا چاہتے ہیں تو اُن کو اسی دستر خوان پر جمع کرتے ہیں ایک بار اُنہوں نے لومڑی کی چال چلی اور اُردو کی ترقی کے مسائل پر بحث کرنے کے لیے ادیبوں اور شاعروں کو ڈِنر پر مدعو کیا۔ شعرا خوش ہوئے ادیبوں نے بغلیں بجائیں۔ مقرّرہ وقت پر دستر خوان بچھایا گیا۔ بڑا شاعر، چھوٹا شاعر، صرف شاعر، متشاعر ادیب اور ادیب نما سب دستر خوان پر بیٹھ گئے۔ ’’کھانا چنے جانے میں ابھی دیر تھی تو شعرائے کرام کلام دستر خوان سے دل بہلانے لگے۔ کوئی دستر خوان کے کسی مصرعہ پر گرہ لگانے لگا تو کوئی دستر خوان کی زمین میں شعر موزوں کرنے لگا۔ اتفاق سے اُس دستر خوان پر فارسی کا یہ شعر چھپا ہوا تھا:

شکر بجا آر کہ مہمان تو　　روزیِ خود می خورد از خوان تو

ایک متشاعر نے رَو میں ’شکر بجا آر کہ‘ کو ’شکر بجا آر کہ‘ کچھ اس طرح پڑھا، جس طرح اُردو کے ایک ریسرچ اسکالر نے میڈیکل کالج کے بورڈ پر کی اُردو تحریر ’کلیہ طبیہ‘ پڑھا تھا۔ لفظ ’شکر‘ سنتے ہی دستر خوان پر اونگھتے بیٹھتے ہوئے نقاد کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے فوراً شاعر سے سوال کیا:

اس شعر میں ’تو‘ ہونا چاہیے یا ’تست‘

شاعر بولا، ’’تُو!‘‘

نقاد نے ڈانٹا، ’’خبردار! زبان سنبھال کر بات کرو!‘‘

شاعر نے گھبرا کر کہا، ’’مجھے فارسی نہیں آتی!‘‘

اس اطلاع پر نقاد نے شکریہ ادا کیا۔ اور پھر دستر خوان پر چھپے ہوئے ایک اُردو شعر کی طرف

انور احمد علوی

اشارہ کرتے ہوئے کہا،

"تو پھر یہ شعر پڑھو!"

شاعر کی اَنا فوراً جاگ پڑی۔ وہ بولا، "میں نہیں پڑھتا۔ آخر آپ کون ہوتے ہیں پڑھوانے والے؟"

نقاد نے کسی قدر گھمبیر آواز میں کہا، "نہیں آپ کو پڑھنا ہی پڑے گا۔ میں نقاد ہوں!" یہ سنتے ہی شاعر کے ہوش اُڑ گئے۔ اس نے سنبھل کر وہ شعر پڑھا:

عزیز اب فکر کیوں ہو مجھ کو مہمانوں کے کھانے کی
خدا نے رزق بھیجا ہے مجھے اور میرے مہماں کو

نقاد نے پوچھا، "بتاؤ یہ شعر کس کا ہے؟"

شاعر نے جواب دیا، "فکر تونسوی کا ہے!"

نقاد نے کہا، "فکر تونسوی کو شاعری چھوڑے کئی سال گزر گئے۔"

"تو پھر عزیز کا ہے" شاعر نے کہا

نقاد نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"تو پھر مہمان کا ہے!" شاعر زچ ہو کر بولا۔

نقاد نے کہا، "یہ بھی غلط!"

بڑے غور و فکر کے بعد شاعر نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا، "پھر تو خدا کا ہونا چاہیے۔"

نقاد نے سمجھایا، "تخلص کو پہچاننے کا طریقہ یہ ہے کہ تخلص والے لفظ پر چمچے کی علامت (~) ہوتی ہے!"

شاعر نے دستر خوان پر چھپی ہوئی چمچے کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "علامت یہاں ہے اور شعر وہاں ہے۔ وہ روایتی شاعری ہے اور یہ علامتی شاعری۔ چمچہ، پلیٹ، کٹورا۔"

یہ سنتے ہی نقاد کو جلال آ گیا۔ اس کے منہ سے کف بہنے لگا۔ تمام شاعر اور اَدیب اُردو کی ترقی کے مسائل اور ڈِنر کو بھول کر بحث میں اُلجھ گئے۔ ہاتھا پائی کی نوبت آنے کو تھی۔ اتنے میں ایک کہنہ مشق شاعر نے آگے بڑھ کر کہا، "آپ لوگ خواہ مخواہ آپس میں اُلجھ گئے ہیں۔ جس شعر کو آپ

رنگِ ادب پبلی کیشنز

مسیح انجم ...... دسترخوان کے شیر + شعر

لوگوں نے اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا ہے وہ 'بحر' اور 'بحث' سے خارج ہے!''

اس ہڑبونگ کا فائدہ اُٹھا کر عین اسی وقت لیڈر کے سیکریٹری نے سارے ادیبوں اور شاعروں کو یہ کہتے ہوئے دسترخوان سے خارج کر دیا کہ اب آپ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا سکتے ہیں۔

بعد میں پتا چلا کہ وہ نقاد کوئی 'ایجنٹ' تھا۔ کون سا ایجنٹ تھا خدا ہی جانے!؟

* *

صحافت سے سفارت تک!

مشتاق احمد یوسفی

افسانوی زبان میں یہ ایک گرم ایشیائی دوپہر کی بات ہے، جب چیل انڈا اور کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن ٹرانسفارمر چھوڑ دیتی ہے۔ ایک خاتون افسانہ نگار کا، جن کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ آنے والا ہے، ایک مدّت بعد فون آیا۔ میں نے عرض کی، میں یوسفی بول رہا ہوں۔ بولیں، مگر آواز آپ کی نہیں لگ رہی۔ میں نے کہا، ”رات ایک نجی اور منی مشاعرے میں سات آٹھ غزلیں ترنم سے سننے سے میرے گلے میں خراش ہوگئی ہے، جس کی ٹکور، عطاء الحق قاسمی کی نثر سے کر رہا ہوں۔ میں اس وقت ان کا کالم پڑھ رہا تھا جو کراچی کے نوائے وقت میں بڑی باقاعدہ بے قاعدگی سے چھپتا ہے اور اسی انداز سے اپنے مداحوں سے قبولِ عام و طلبِ مدام کی سند پاتا ہے۔“

بعد دعائے روانیِ قلم بولیں، مجھے آپ سے ایک فرمائش کرنی ہے، بشرطیکہ آپ وعدہ کریں کہ پوری کریں گے۔ میں نے جواب دیا کہ فرمائش اگر فضول اور مہمل ہوئی تو ضرور پوری کروں گا۔ فرمایا، میں سیریس ہوں۔ آپ پکا وعدہ کیجیے۔ کہ فرمائش پوری کریں گے۔ میں نے عرض کیا، اپنی بیگم کو حاضر و ناظر جان کر عرض کرتا ہوں کہ ہر قابلِ اشاعت فرمائش پوری کروں گا بشرطیکہ میری ان مجبوریوں کو ملحوظ رکھا جائے۔

- کسی ادبی جلسے یا مشاعرے کی صدارت نہیں کروں گا۔
- انٹرویو نہیں دوں گا۔
- مہمانِ خصوصی نہیں بنوں گا۔
- کسی شاعر یا ادیب کی شام یا کسی کتاب کی رسمِ اجراء میں مضمون نہیں پڑھوں گا۔

بے ساختہ بولیں، ”یوسفی صاحب پھر آپ میں رہ کیا گیا!“ اور فون بند کر دیا کہ کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا اور دونوں کو ایک دوسرے کی آواز بھی کسی اور کی لگ رہی تھی۔

جب سے فقیر ادبی اعتکاف میں گیا ہے، اس پر اپنی رہی سہی اوقات اسی طرح منکشف ہوتی رہتی ہے۔ میرؔ کی زبان میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں۔

تم تو کرو ہو صاحبی، بندے میں کچھ رہا نہیں۔ اپنے منہ سے کہتے حیا آتی ہے، مگر مرزا کہتے ہیں کہ تم ایک شرمیلے آدمی ہو۔ جب تک دو تین سو کا مجمع نہ ہو، کھلتے نہیں۔ کسی نے محمود ایاز مرحوم کو یہ خبر دی کہ مشتاق احمد یوسفی پردہ نشین ہو گئے ہیں تو انہوں نے اپنے رسالے 'سوغات' کے اداریے میں مجھے مخاطب کر کے مومن خان مومنؔ کا شعر نقل کیا:

ہے ہے! تمیزِ عشق و ہوس آج تک نہیں
وہ چھپتے پھرتے ہیں مجھے بیتاب دیکھ کر

اور آخر میں یہ فقرہ کسا کہ ہم اس پردہ نشین کو مومن خاں کو سونپتے ہیں!

یہ تمہید دلنشیں اس لیے باندھنی پڑی کہ ضیاء الحق قاسمی صاحب، برادر بزرگ (بزرگ بلحاظ سن و سال) جناب عطاء الحق قاسمی کے حکمِ دلپذیر کی تعمیل میں حاضرِ خدمت ہوا ہوں۔ اور انہیں مخاطب کر کے صرف اتنا عرض کرنا چاہتا تھا کہ:

لایا ہے ترا شوق مجھے پردے سے باہر

ان کا حکم سر آنکھوں اور قلم توصیفِ رقم پر۔ ضیاء الحق قاسمی صاحب اپنے نام کے تاریخی ہینڈی کیپ کے باوجود کراچی کی ادبی تقریبوں کے رُوح رواں ہیں۔ ان کے حکم سے یوں بھی سرتابی ممکن نہیں کہ وہ عرصۂ دراز سے بے وقت مرنے کی دھمکیاں دیتے رہے ہیں۔ اپنے اشعار میں بھی فرمائشِ وصل اس طور پر کرتے ہیں جیسے وصیت کر رہے ہوں، اور کبھی اس طرح جیسے بینکوں کے نادہندگان سے ڈوبی ہوئی رقمیں وصول کرنے کی دھمکی دے رہے ہوں۔ کل جب اس تقریب سے متعلق ان کا فون آیا تو میں نے پوچھا، طبیعت کیسی ہے؟ گھبرائے گھبرائے بولے، پیٹ بہت بڑھ گیا ہے! میں نے کہا یہ خوشخبری آپ مجھے کیوں سنا رہے ہیں؟ ایک قہقہے کے بعد فرمایا کہ وزن بھی دل کے آپریشن کے بعد 20 کلو بڑھ گیا ہے! اسی حساب سے کمزوری بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے ٹانگیں صہبا لکھنوی کی لگا دی ہیں؟ ہم تو پندرہ سال سے کہ یہی ہماری مدتِ نیاز مندی بنتی ہے، دیکھتے آئے ہیں کہ جب بھی نصیبِ دشمناں ان کی طبیعت ناساز ہوتی ہے، وزن دو تین کلو بڑھ جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ موجودہ جثہ و جسامت بیماریوں کا تعمیر کردہ ہے۔ ہم

ان کے نجی کوائف سے مجرمانہ واقفیت کا دعویٰ تو نہیں کر سکتے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ ان کے کمر بند کی ادوائن بنا کر بڑی سے بڑی چارپائی کی پائینتی کسی جا سکتی ہے۔

صاحبو، دل کا آپریشن ہمارا بھی ہوا ہے۔ مگر اس کے بعد:

وہ لہر نہ پھر دل میں جاگی، وہ رنگ نہ لوٹ کے پھر آیا

ہمارے برعکس ضیاء الحق قاسمی صاحب کے چہرے کی شادابی اور چونچالی کو دیکھ کر خواتین اپنے سر وغیرہ دوپٹے سے اس طرح ڈھانک لیتی ہیں جیسے اذان ہو رہی ہو۔ ایک دن میں نے ضیاء صاحب سے کہا کہ مجھے بلڈ پریشر کبھی نہیں ہوا۔ سگریٹ نہیں پیتا۔ شراب کبھی چکھی نہیں۔ عشاء پڑھ کر جلد سو جاتا ہوں اور فجر کی اذان سے پہلے اٹھ بیٹھتا ہوں۔ تین چار میل روز ٹہلتا ہوں۔ مرغن غذا اور غزل سے پرہیز کرتا ہوں۔ پاکیزہ ادب پڑھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے ان ہی تمام وجوہات کی بنا پر دل کا آپریشن کرانا پڑا۔

مسکرائے، فرمایا اپنا کیس اس کے بالکل الٹ ہے۔

اب آپ خود ہمارے اطوار و عادات کو اُلٹا کر کے دیکھیے کہ ضیاء الحق قاسمی صاحب کی کیا تصویر بنتی ہے۔ زیادہ وضاحت کرنے سے ڈرتا ہوں کہ ہم دونوں بے تکلف ہیں، نہ ایک دوسرے کو بہت قریب سے جانتے ہیں۔ شاید اسی لیے ایک دوسرے کا اتنا احترام کرتے ہیں۔

یہ انتہائی فخر و مسرّت کا مقام ہے کہ جناب عطاء الحق قاسمی نے، جنہیں عزت مآب کہتے ہوئے ایک عمر کی اپنائیت مانع ہے، کلام و طعام کی تھکا دینے والی مصروفیات کے باوجود کراچی کے احباب کے لیے ایک شام نکالی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ایک مدت کے لیے ہم سے جدا ہو رہے ہیں۔ کبھی آئے بھی تو ان کا تمام تر وقت شہرِ بادشاہ گراں... اسلام آباد کی پُر پیچ غلام گردشوں کے طوافِ منصبی میں گزرے گا۔ تاہم یہ شامِ رخصت و وداع نہیں، جشنِ ملاقات ہے۔ میرؔ کیا خوب کہہ گئے ہیں:

روز آنے پہ نہیں نسبتِ عشقی موقوف
عمر بھر ایک ملاقات چلی آتی ہے

خدا ان کے قلم کو اسی طرح رواں دواں اور جواں رکھے۔ ان کے کالم کے جھروکے سے ان کے درشن ہوتے رہیں گے۔ مجھے اُمید ہی نہیں، یقین ہے کہ ان کے کالم 'روزنِ دیوار' کا سلسلہ جاری رہے گا۔ نئے موضوعات اور تازہ منظرنامے کے ساتھ۔ وہ کم و بیش تیس برس سے ایک ہی

اخبار نوائے وقت سے وابستہ رہے ہیں۔ اتنی مدت تک تو آج کل میاں بیوی کا رشتہ بھی قائم نہیں رہتا۔ اخباری دنیا میں 'وفاداری بشرط استواری' کی ایسی مثالیں ذرا مشکل سے ملیں گی۔

طنز و مزاح کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی شگفتہ نگار کو سفارت سے نوازا گیا اور سفارت کی تاریخ میں یہ بھی پہلی مثال ہے کہ اسے ایک شگفتہ نگار کے تقرر سے سرفراز کیا گیا۔ ہم ان کے پُر وقار تقرر پر اتنے ہی خوش ہیں جتنے کہ ہم خود ضیاء الحق صاحب کے ہم نام کی حکومت کی ملازمت 1980ء میں چھوڑنے پر ہوئے تھے:

اِس کا بھی مزہ یاد ہے، اُس کا بھی مزہ یاد

ماضی کی ملاوٹ ہو جائے تو پھر ہر مزہ اچھا اور ہر رنگ چوکھا لگنے لگتا ہے۔

مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ گزشتہ پندرہ برسوں میں ان سے بہتر، زیادہ شگفتہ اور "readable" کالم اس تسلسل اور اعتماد کے ساتھ کسی نے نہیں لکھے۔ ریڈ ایبل کا موزوں مترادف اس وقت ذہن میں نہیں آ رہا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی سے رجوع کرنا چاہیے کہ جو بات ہمارے ذہن میں نہیں آتی وہ ان کی زبان پر ہوتی ہے۔ مثلاً مقتدرہ۔ یہ جو پندرہ سال کی قید میں نے لگائی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے پہلے کے کالموں میں خدانخواستہ کوئی کمی یا خامی پاتا ہوں۔ بلکہ اصل سبب یہ ہے کہ عمر کے اس مرحلے میں میرا حافظہ اس سے آگے کام نہیں کرتا۔ شگفتگی، برجستگی، تیر بہدف، طنز، لطیفوں کے برمحل استعمال، تحریر اور محاورے کی سوندھی سوندھی 'زینت':

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن طنز؟

بہترین طنزیہ کالم نگار کا اگر کوئی اعلیٰ ترین ادبی انعام ہوتا تو منصفین کو ان کے حق میں فیصلہ کرنے میں بس اتنی ہی دیر لگتی، جتنی کہ ان کے نام کے تمام حروف کو، تکلیف دہ ہمزہ سمیت املا کرنے میں لگتی ہے۔ یہ بات بھی بلاخوف وخطر کہہ رہے ہیں۔ بے خوف ہونے کی ایک ضمنی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں کچھ ایسی ریت چلی ہے اگر آپ کسی شاعر سے نئی پرانی دشمنی نکالنا چاہتے ہیں تو کسی انٹرویو میں یہ بیان دے دیجیے کہ فلاں شخص کو میں اس عہد کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔ پھر تماشا دیکھیے۔ لوگ آپ کو تو یہ کہہ کر معاف کر دیں گے:

جا چھوڑ دیا حافظِ دیوان سمجھ کر

لیکن اس غریب کے کلام میں ایسی ایسی جوئیں نکالیں گے کہ ایک ایک جوں کا وزن اس کے دیوان کے برابر! وہ بے چارہ ساری عمر منہ چُھپائے پھرے گا۔ مطلب یہ ہوا، صرف ٹی وی پر نظر آئے گا۔

ان کے تقرر، ترقی اور تعیناتی سے ہمیں خوشی تو بہت ہوئی، لیکن کچھ اندیشہ ہائے دُور دراز بھی ہیں۔ مثلاً یہی کہ جب انہیں ان کی موجودگی میں اور منہ در منہ غیر حاضر کہا جائے گا تو یہ کیسا محسوس کریں گے؟ یعنی جب دس میں سے نو ہم وطن یور ایکسیلنسی کی بجائے ان کو ہز ایکسیلنسی کہہ کر مخاطب کریں گے تو یہ ان کی اصلاح یا اپنی ہنسی ضبط کیسے کریں گے؟ دوسرا دُکھ یہ ہے کہ ہمارے ادب میں طنز کی جوڑی ٹوٹ رہی ہے۔ عارضی طور پر ہی سہی۔ ناممکن ہے کہ عطاء الحق قاسمی کا نام آئے تو ذہن معاً امجد اسلام امجد کی طرف نہ جائے۔ فیض صاحب کی وفات کے بعد سیّد سبط حسن صاحب نے بیگم سرفراز اقبال کو تعزیتی خط میں لکھا تھا کہ تم خود کو تنہا نہ سمجھنا۔ اب مجھ کو مرحوم کا نعم البدل سمجھو۔ اگر ہم کو یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ عطاء اس جسارت پر اپنے کالم میں ہمارے چیتھڑے بکھیر دیں گے تو ہم امجد کو یہی حقیر سی پیشکش کرتے۔ لیکن کہاں لاہور کہاں کراچی۔ کہاں قاسمی کہاں یوسفی۔ چہ نسبت خاک را بہ خاکسار:

ہمارے درمیاں اے دوست لاکھوں یار حائل ہیں

محفلِ یاراں میں اب کون ایک دوسرے کو کبھی فرمائش کبھی فہمائش کر کے کبھی مہمیز کبھی لقمہ دے کے، ایک سے ایک لطیفہ سنوائے گا۔ کیا اچھا ہو کہ سب لوگ بھاگ دوڑ کر کے ان جڑواں ہم جلیسوں کی یکجائی کا انتظام کریں۔ یعنی امجد کو ناروے کے جڑواں ملک سویڈن کا سفیر و ہم صغیر بنوا دیں۔

خیر۔ ہماری دعا ہے کہ دونوں جہاں رہیں، خود خوش رہیں نہ رہیں، دوسروں کو خوش رکھیں کہ یہی شگفتہ نگاروں کا شعار اور مقسوم ہے۔

ایک خوشی اس بات کی بھی ہے کہ ناروے میں مستقل پوسٹنگ کی وجہ سے وہ سفرنامہ نہیں لکھ پائیں گے۔ یہ بات بھی ہم تجربے کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔ ہم بارہ سال لندن میں رہے۔ گھاٹ گھاٹ گئے اور پیاسے کے پیاسے لوٹے۔ مگر سفرنامہ نہیں لکھا۔ اس لیے کہ وہاں رہ کر سفرنامے

رنگِ ادب پبلی کیشنز

پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ دروغ کو جتنا فروغ سفرناموں سے پہنچ رہا ہے اتنا سیاست دانوں کے بیان سے بھی نہیں۔ چند برس ہوئے، ہم نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ بیرونِ ملک جانے والے ادیبوں سے ایک حلف نامہ لینا چاہیے کہ وہ واپسی پر سفرنامہ نہیں لکھیں گے۔ ہم گنہگار ہیں شاید ہماری بخشش محض اس وجہ سے ہو جائے کہ ہم نے سفرنامہ نہیں لکھا۔ میموں کے خود پر فریفتہ ہونے کی فرضی داستانوں سے اہلِ وطن کو آتشِ رشک میں نہیں جلایا۔ ورنہ صاحبو، ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔ کرسمس سیل کے اژدہام میں ہم نے بھی میموں کے گداز دھکے کھائے ہیں اور ہر دھکے پر sorry کی بجائے زبان سے 'تھینک یو' کہا ہے اور آنکھوں سے 'مکرر'، 'پھر عنایت ہو'۔ مگر ہم نے فنکارانہ ضبط سے کام لیا اور زبانِ قلم سے ایک لفظ ایسا نہ نکلنے دیا جس سے ان قربتوں کی تشہیر یا ان عفیفاؤں کی رسوائی ہو۔ اس ضمن میں ہم نے اپنی ممکنہ بدنامی کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ ایک عمر ایسی بھی آتی ہے کہ کوئی تہمت بھی لگا دے تو خوشی ہوتی ہے۔

دوسری وجہ، اصل وجہ، سفرنامہ نہ لکھنے کی یہ ہے کہ ہم قاسمی جیسا شگفتہ، چلبلا اور بھرا پرا سفرنامہ نہیں لکھ سکتے۔ ان کے اوّل تا آخر دلچسپ اور ہمارا سفر حرام کر دینے والے سفرناموں میں تازگی، شگفتگی اور طنز و مزاح کی آمیزش کے علاوہ جوانی کی چاشنی بھی ہے۔

ایک اور بھی غم ہمیں ستا رہا ہے۔ ناروے کے شمالی علاقوں میں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے۔ دن اور رات کا پتا صرف ریڈیو، ٹی وی، اخبار اور حوائج ضروری کے مقررہ اوقات سے لگتا ہے۔ اس کے تصور ہی سے جی اوبنے لگتا ہے۔ مثلاً عید کا سورج طلوع ہوا تو پانچ چھ مہینے تک غروب نہیں ہو رہا۔ شاعر ہمیشہ سے شبِ وصل کے مختصر ہونے اور موذن کے اتاؤلے پن کی شکایت کرتے آئے ہیں۔ لیکن ناروے کی شبِ وصل شروع ہوتی ہے تو چھ مہینے سے پہلے ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ مرزا عبدالودود بیگ کہتے ہیں کہ خدا ہر مسلمان شاعر کو ایسی شبِ وصل سے محفوظ رکھے۔

اتنا وقت ہے نہ اس کا محل، کہ اس محفل میں ان کے کالموں کے ادبی محاسن پر گفتگو کی جائے۔

میتھیو آرنلڈ نے جرنلزم کی تعریف ان الفاظ میں کی تھی:

"Journalism is literature in a hurry."

یعنی صحافت عجلت میں لکھا ہوا ادب ہے۔ قاسمی کے کالموں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے

ہیں۔ مجھے قاسمی کا دل دُکھانا مقصود نہیں، نہ کسی اور کالم نویس کی دلآزاری لیکن یہ حقیقت ہے کہ جتنے ادب پارے ابنِ انشا اور قاسمی کے کالموں میں ملتے ہیں وہ کسی اور کے ہاں اس افراط سے نظر نہیں آتے۔

پچھلے چند برسوں میں سیاسی ''**Polarization**'' (قطبینی اختلاف) کا پہلا شکار کالم نگار ہوئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ حالاتِ حاضرہ پر زبان، لہجہ اور منہ بگاڑے بغیر گفتگو کرنا بڑے حوصلہ کا کام ہے۔ مرزا اکثر کہتے ہیں کہ جو شخص حالاتِ حاضرہ پر گالی دیے بغیر گفتگو کر سکے وہ یا تو ولی اللہ ہوگا یا وہ باسٹرڈ خود حالاتِ حاضرہ کا ذمہ دار ہوگا۔ ہمارے حالاتِ حاضرہ کی مثال اس بچے کی سی ہے جسے کوئی رات کے اندھیرے میں ایدھی سینٹر کے گہوارے میں ڈال جائے۔ کوئی اس کی ولدیت قبول نہیں کرتا۔ جی ہاں، سب حکومتوں کو اس بچے میں ایک دوسرے کی شباہتیں نظر آتی ہیں!

جب حالاتِ حاضرہ خراب ہوں اور سیاسی لہجہ ان سے بھی زیادہ خراب ہو جائے تو سیاسی کالموں میں معروضی اور بے لاگ تجزیہ کیسے مل سکتا ہے۔ اسٹیونسن نے ربع صدی قبل کہا تھا کہ آج کل کے اخبار بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے گندم کو بھوسے سے علیحدہ کرتے ہیں۔ اور جب یہ علیحدہ ہو جاتے ہیں تو بھوسے کو چھاپتے ہیں! ہم علیحدہ کرنے کی زحمت بھی بالعموم گوارا نہیں کرتے۔ ہم اپنی خواہش کو خبر، قیاس کو حقیقت اور بدگمانی کو افواہ بنانے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہماری افواہوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ سچ ثابت ہوتی ہیں۔ ایسے میں گنتی کے وہ کالم نگار لائقِ ستائش ہیں جو اپنے تعصب کو تبصرہ نہیں بننے دیتے۔ جہاں تک تجزیاتی انداز، معروضی طرزِ پیشکش اور اعداد و شمار کے حوالوں کا تعلق ہے، ارشاد احمد حقانی اور جمیل الدین عالی کے نام کالم نگاروں کی فہرست میں نہایت کارزارِ سیاست کی گھن گرج سنائی دیتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے تندیِ سیاست اور تلخیِ دوراں کو اپنی فطری شگفتگی پر غالب نہیں آنے دیا۔ دست بدعا ہوں کہ ان کا تقررِ ملک و قوم کے لیے بالخصوص ان تیس ہزار پاکستانیوں کے لیے جنہوں نے ناروے میں سکونت اختیار کر لی ہے اور خود عطاء الحق قاسمی کے لیے باعثِ خیر و برکت و طمانیتِ خاطر ثابت ہو۔ آمین

* * *

شاہی شتر غمزے

مشکور حسین یاد

ہماری زندگی معموم کے مطابق اچھی خاصی گزر رہی تھی کہ پچھلے دنوں بچوں کی منجھلی خالہ ہمارے ہاں تشریف لائیں اور ہمارے غیر معمولی انکسار کو دیکھ کر بولیں:

"اے ہے بھائی جان! آپ اتنا بھی اپنے آپ کو نہ گرائیں۔ کسر نفسی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے آپ اپنے گھر کے بادشاہ ہیں۔"

"اری بہن چھوڑو، ہم بادشاہ کیسے ہوئے؟"

ہمارے اس سوال پر اُن محترمہ نے ایسے ایسے زبردست دلائل پیش کیے کہ ہمیں خاموش ہونا پڑا۔ واقعی ہم اپنے گھر کے سب سے بڑے فرد ہیں، کما کر بھی ہمیں لاتے ہیں، ماشاء اللہ آدھ درجن بچوں کے باپ ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک عدد بیوی کے خاوند بھی ہیں۔ خاوند کیسا ہی کیوں نہ ہو، آخر خاوند ہے، بیوی کا مجازی خدا!

اب یہی سوچا، ہم بھی کس قدر بے وقوف واقع ہوئے ہیں کہ حالات ہمارے حق میں اس قدر سازگار ہیں اور ہم پھر بھی گھر میں بھیڑ بکری بنے پھر رہے ہیں۔ ہمیں تو گردن اکڑا کر، سینہ تان کر اور ایک خاص دبدبے کے ساتھ چلنا پھرنا چاہیے۔ بادشاہ کیا ہوتا ہے؟ یہی نا کہ وہ اپنی مرضی چلاتا ہے۔ جو چاہے کرتا ہے، سونے کی خواہش ہوئی، سو گئے، کھانے کی خواہش ہوئی، کھالیا، جی بہلانے کی خواہش ہوئی، جی بہلالیا... اور یہی کچھ گھر کا ایک اعلیٰ فرد بھی کر سکتا ہے۔ پھر ہم کیوں نہیں کر سکتے؟ ہم جو ایک عدد بادشاہ سلامت ہیں!

اس خیال کے آتے ہی ہم نے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی تو واقعی تمام ماحول پر ہم ہی ہم چھائے ہوئے نظر آئے۔ ماشاء اللہ، یہ چھ بچے کس کے ہیں؟ ہمارے۔ یہ ایک عدد بیوی کس کی ہے؟ ہماری۔ یہ مکان کس کا ہے؟ ہمارا۔ اس مکان میں جو مرغیاں پھر رہی ہیں کس کی ہیں؟ ہماری۔

مکان میں جو سامان اِدھر اُدھر بکھرا پڑا ہے کس کا ہے؟ ہمارا۔ تو پھر ہم بادشاہ نہیں، تو اور کیا ہیں؟ یقیناً ہم بادشاہ ہیں۔ ہم نے فلمی بادشاہوں کی طرح تالی بجا کر کہا، ’’ارے کوئی ہے؟‘‘

جواب ندارد۔

ہم نے دوبارہ تالی بجائی، ’’ارے کوئی ہے؟‘‘

اس دفعہ بھی ہماری اس تالی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ تیسری دفعہ ہم نے ذرا زور کے ساتھ تالی بجاتے ہوئے کہا، ’’ارے کوئی ہے؟‘‘

بیوی نے صحن میں سے جواب دیا، ’’یہ آج آپ کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا جو تالیاں بجا بجا کر کوّے اُڑا رہے ہیں؟‘‘

ہم غصّے میں آکر چلائے، ’’میں پوچھتا ہوں کوئی ہے؟‘‘ زور ’ہے‘ پر تھا۔

’’میں کہتی ہوں سب ہیں۔ آپ کو نظر نہیں آ رہا ہے کیا؟ بچے بھی سامنے کھیل رہے ہیں۔ میں بھی یہاں صحن میں بیٹھی ہوں۔‘‘

بیوی کے اس جواب پر ہمیں خیال آیا کہ ہم نے اپنی بادشاہی کا اظہار صحیح طریقے سے نہیں کیا۔ واقعی جس وقت سب لوگ سامنے ہوں، اُس وقت ’’ارے کوئی ہے؟‘‘ کی آواز لگانا بے معنی ہے۔ فلموں میں بھی بادشاہ سلامت اُسی وقت تالی بجا کر ’’ارے کوئی ہے؟‘‘ کہتے ہیں، جس وقت اُن کے سامنے کوئی نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہم بادشاہ ضرور ہیں، لیکن ہمیں نامعقول بادشاہ سلامت ہرگز نہیں بننا چاہیے۔

ہم خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ہمیں پیاس لگی۔ پہلے تو ہم باقاعدہ کسی بچے کا نام لے کر کہا کرتے تھے کہ عزیزم فلاں! میاں ہمیں پانی پلاؤ اور اگر بچے نہ ہوئے تو بیگم سے کہہ دیا، لیکن اب سوچا، کسی کا نام لینا اُصولِ بادشاہت کے خلاف ہو گا۔ ویسے بھی بادشاہ کم سے کم الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہوتے ہیں، چنانچہ ہم نے صرف اتنا کہا ’’پانی۔‘‘

لیکن بچے حسبِ معمول کھیلتے رہے۔ تیسری دفعہ ہم واقعی بادشاہوں کی طرح کڑک کر پانی کہنے لگے تھے کہ ہمیں خود خیال آیا، کیا بادشاہ خالص پانی پیتے ہیں؟ اور فرض کرو پیتے بھی ہیں تو کیا پانی کو وہ بھی عام آدمی کی طرح پانی ہی کہتے ہیں۔ ہم نے تو ویسے تو کسی بادشاہ کو آج تک قریب سے دیکھا ہی نہ تھا اور اتفاق کی بات کہ ہم نے کسی فلم میں بھی بادشاہ کو پانی مانگتے نہیں سنا تھا، لہٰذا

خاصے پریشان ہوئے۔ آخر یہی فیصلہ کیا کہ پانی ضرور طلب کریں گے، لیکن کڑک کر نہیں، بلکہ نہایت آہستگی اور رومانوی انداز کے ساتھ۔ چنانچہ ہم نے لفظ پانی کے دو ٹکڑے کرتے ہوئے بڑی ملائمت سے کہا، ”پا... نی...“

بیوی صحن سے برآمدے میں ہماری طرف آ رہی تھیں۔ یہ سن کر کہنے لگیں، ”کچھ حیا کرو۔ بچوں کے سامنے جا... نی... جانی... کہہ کر مجھے پکار رہے ہو۔“

ہمارا گلا واقعی خشک ہو گیا۔ ہم بیوی کو یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم نے اسے جانی نہیں کہا اور ظاہر ہے فی الحال پانی کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ قہر درویش کی بجائے قہر بادشاہ بر جان بادشاہ کی نئی کہاوت کے تحت خود ہی اُٹھ کر پانی پی لیا۔

جب واپس اپنے کمرے میں آئے تو ہمیں کچھ نیند سی آنے لگی۔ سوچا کہ بادشاہ کی جملہ حرکات و سکنات کا علم اُس کے گھر والوں کو ہوتا ہے، یعنی سب کو معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ سلامت اس وقت کیا کر رہے ہیں۔ سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں، دیوان خانے میں آرام فرما رہے ہیں یا مطالعے میں مصروف ہیں، بیٹھے ہیں یا کھڑے ہیں۔ غرض گھر والے بادشاہ کی ایک ایک حرکت سے باخبر ہوتے ہیں۔ کیوں نہ ہم بھی اپنے گھر والوں کو بتا دیں کہ ہم سونے لگے ہیں۔ چنانچہ ہم نے تمام بچوں کو باری باری بلا کر کہا، ”ارے بھئی تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم سونے لگے ہیں۔“

اس اعلان پر ہم نے محسوس کیا کہ ہر بچہ اسے سن کر کچھ حیران و پریشان سا ہے۔ سب سے چھوٹی بچی دُرِ نجف نے تو ہمیں فوراً ترَاق سے جواب دیا، ”ابو! آپ سونے لگے ہیں تو سو جایئے، ہمیں کس لیے بتا رہے ہیں۔“

بیوی کو بلا کر کہا تو وہ نیک خصلت ایک دم بولی، ”اے ہے، سونے کے علاوہ آج تک آپ نے کچھ کیا بھی ہے، جو اب ماشاء اللہ باقاعدہ سونے کا اعلان فرما رہے ہیں۔ میں کہتی ہوں ایک بار نہیں ہزار بار سو جایئے۔ لو اور سنو، مجھ کام کرتی کو باورچی خانے سے بلا کر بتایا جا رہا ہے کہ میں سونے لگا ہوں۔ میرا خیال ہے آپ ساٹھ سال کی عمر ہونے سے پہلے سٹھیا گئے ہیں۔ خدا خیر کرے۔“

ہم نے سوچا یہ دقیانوسی تصور ہے کہ بادشاہ کی ایک ایک حرکت کا علم اُس کے گھر والوں کو ہو۔ اسے ہر صورت میں اپنی خلوت برقرار رکھنی چاہیے۔ اس قسم کی بادشاہت کو ہم جدید لغت میں

فرعونیت بھی کہہ سکتے ہیں، جو ہمارے افسر صاحبان اکثر و بیشتر قائم رکھتے ہیں۔ ہم چوں کہ نہ تو دقیانوسی بادشاہ بننا چاہتے تھے، نہ ہی فرعون طبع افسر بننے کا کوئی ارادہ تھا، اس لیے یہی مناسب سمجھا کہ ہم اپنی جگہ بادشاہ بھی رہیں اور ایک عام آدمی کی آزادیاں بھی ہمیں پوری طرح حاصل ہوں۔

اس خیال کے آتے ہی آرام سے پڑ کر سو گئے۔ گویا اَب ہم بادشاہت کے تصور میں ایک انقلاب برپا کر رہے تھے۔ ہمارے ہر خراٹے سے اس انقلاب کی رُوح پرور صدا بلند ہو رہی تھی۔ ابھی ہم نے اس قسم کے حشر خیز دس پندرہ خراٹے ہی لگائے تھے کہ ہماری چھوٹی بیٹی نے ہمیں جھنجھوڑا، ”ابو... ابو... اُٹھیے۔ امی کہہ رہی ہیں آٹا ختم ہے، بازار سے جا کر لے آیئے۔ آٹا نہ لائے تو کھانا نہیں ملے گا۔“

ہم گھبرا کر اُٹھے۔ واقعی بیوی کل سے کہہ رہی تھیں کہ آٹا لانا ہے، لیکن ہم ٹال مٹول کر رہے تھے۔ فوراً اُٹھ کر بازار کی طرف چل دیے۔ ابھی گھر سے باہر نکلے تھے کہ چھوٹی بیٹی دوڑتی ہوئی آئی اور ہمارے ہاتھوں میں سبزی کا تھیلا پکڑا کر بولی، ”ابو! امی نے کہا ہے کہ یہ کانے بینگن واپس کر کے آیئے، اور یہ بھی کہا ہے کہ دکان دار سے آنکھیں کھول کر سبزی لیا کیجیے۔“

اس وقت ہم نے سوچا، کیا بادشاہ سلامت خود سبزی خرید کر لاتے ہیں؟ اور اگر لاتے ہیں تو کیا واپس کرنے بھی وہی جاتے ہیں؟ کیا کسی بادشاہ نے دکان سے جا کر آٹا خود خریدا ہے؟ تب ہمیں اپنے اندر سے آواز آئی، ”بادشاہ ہو یا فقیر، اپنے گھر کا کام خود کرنا کوئی عیب کی بات نہیں۔“

یہ آواز سنتے ہی ہم ایک شان بے نیازی کے ساتھ سبزی کا تھیلا ہاتھ میں لیے بازار کی طرف چل دیے، مگر ہم اپنے آپ کو اُس وقت بھی بادشاہ تصور کیے ہوئے تھے، حالاں کہ ہمیں اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر ایسا تصور کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ بہر حال، ہم بزعمِ خود ایک بادشاہ کی طرح چلے جا رہے تھے کہ سامنے سے فارسی کے پروفیسر ص ض آتے دکھائی دیے۔ انھوں نے حسبِ معمول فارسی میں ہماری خیریت پوچھی، لیکن ہم نے انہیں حسبِ معمول جواب نہ دیا، بلکہ اُن کے سلام کے جواب میں نہایت آہستگی سے، یعنی دوسرے لفظوں میں ایک شاہانہ انداز میں سر کو معمولی سی جنبش دی۔

پروفیسر ص ض نے ہمارا گریبان پکڑ کر اپنے خاص انداز میں ہم سے خطاب فرمایا، ”اوئے میاں! تجھے آج یہ کیا ہو گیا ہے کہ اونٹ کی طرح اکڑ اکڑ کر چل رہا ہے، یعنی شتر غمزے

فرما رہا ہے۔“

”پیارے! میں اس وقت ایک بادشاہ کی حیثیت سے چلا جا رہا تھا۔“ انھیں جواب دیا۔

”وہ کیسے؟“

”کیا گھر کا سربراہ بادشاہ نہیں ہوتا؟“

”اس حساب سے تو میں بھی بادشاہ ہوں، لیکن بھائی، واضح رہے کہ بادشاہ سلامت ابھی ابھی گھر میں جھاڑو دے کر آ رہے ہیں۔ جمعدارنی ایک ہفتے سے نہیں آئی اور بیگم صاحبہ کو بخار ہے۔“

ہمیں پروفیسر ص ض کی یہ صاف گوئی بے حد پسند آئی۔ کچھ اس لیے بھی کہ ہمیں پتا چلا، ابھی دنیا میں ایسے بادشاہ موجود ہیں، جو نہ صرف سبزی بازار سے خرید کر لاتے ہیں، بلکہ گھر میں جھاڑو بھی خود لگاتے ہیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ہماری گردن اکڑ گئی۔ ہم نے اچھی خاصی بلند آواز میں اپنے آپ سے کہا، ”ہم جھاڑو ہرگز نہ لگائیں گے، یہ بادشاہت کی کھلم کھلا توہین ہے۔ جھاڑو دینا بھنگن یا پھر بیوی کا کام ہے۔“

اگرچہ اُس وقت سڑک پر بیوی کے نمودار ہونے کا امکان دُور دُور تک موجود نہ تھا، لیکن ہمیں یوں لگا، جیسے بیوی نے گھور کر دیکھتے ہوئے ہم سے پوچھا ہے، ”کیا بیوی اور بھنگن کو آپ برابر سمجھتے ہیں؟“

ہماری ٹانگیں کانپنے لگیں اور نہایت گرم موسم ہونے کے باوجود ہمارے دانت بجنے لگے۔ ہم نے گڑگڑا کر اعلان کیا، ”نہیں..... نہیں۔ ہم ایسے بدتمیز اور ناہنجار خاوند نہیں۔ ہم تو بیوی کو اپنے سر کا تاج سمجھتے ہیں۔“

سبزی خرید کر واپس گھر پہنچے تو بیوی نے خبر دی کہ گٹر بند ہو گیا ہے، اسے کھلوانے کا جلد انتظام کیا جائے۔ ہم نے غصے میں آ کر جواب دیا، ”ابھی ابھی اپنی ایسی تیسی کرا کے سبزی وغیرہ لے کر آیا ہوں، آتے ہی آپ نے یہ حکم صادر فرما دیا۔ ہم گٹر کھلوانے کا اس وقت کوئی انتظام نہیں کر سکتے۔“

بیوی نے نہایت ملائمت سے فرمایا، ”میں کب کہہ رہی ہوں کہ آپ گٹر کھلوانے کا انتظام کریں۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو خود گٹر کھول دیجیے۔ ایک دفعہ آپ نے کھولا تھا۔“

مشکور حسین یاد ...... شاہی شتر غمزے

اس مکالمے کے چند لمحے بعد ہی بادشاہ سلامت کپڑے اُتارے اور لنگوٹ کے گٹر کھولنے میں مصروف تھے۔

گٹر سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ بیوی کی پھر آواز آئی، لیکن اس آواز میں محبت اور لجاجت اپنے کمال پر تھی۔ بیوی کہہ رہی تھیں، ”میں نے کہا پیارے آپ اس وقت کہاں ہیں؟ اجی آپ سن رہے ہیں۔ میں کہہ رہی ہوں سرتاجِ من...

شاید زندگی میں دوسری یا تیسری مرتبہ بیوی نے ہمیں ایسے انداز میں پکارا تھا۔ اُس وقت ہم واقعی اپنے آپ کو بادشاہ سمجھنے لگے۔ ہمارا سر غرور کی وجہ سے عرش کو چھونے لگا۔ ہمیں یوں محسوس ہوا، جیسے اِس وقت جو حکم بھی صادر فرمائیں گے، اُس کی تعمیل معاذ اللہ ’کن فیکون‘ کے انداز میں ہو سکتی ہے۔ چوں کہ ہم اس وقت پلنگ پر دراز تھے، اس لیے بیوی نے بائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیوں سے ہمارے سر کے بالوں میں گدگدی کرتے ہوئے فرمایا، ”میری جان! کیا آپ تھک گئے ہیں؟“

ہم نے ایک دم اُٹھتے ہوئے کہا، ”ارے واہ، تھکنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟“

”سچی مچی؟“

”ہاں، کیا مابدولت جھوٹ بول رہے ہیں۔“

بیگم نے اپنی انگلی ہماری آنکھوں کے سامنے لا کر کہا، ”آپ میری انگلی دیکھ رہے ہیں۔“

”اُف! اسے کیا ہوا۔“

”سبزی کاٹتے ہوئے زخمی ہو گئی۔ اب چونکہ دائیں ہاتھ کی انگلی ہے... اس لیے...“

”بولو... بولو، رُک کیوں گئیں؟“

”آپ میرا ایک کام کر دیں گے؟“

”اگر شاہوں کی شان کے شایان ہوا تو یقیناً۔“

”تو پھر ذرا مسالہ پیس دیجیے۔ آپ کی لاڈلی سالی صاحبہ آئی ہوئی ہیں نا، وہ ہاتھ کا پسا ہوا مسالہ ہی پسند کرتی ہے۔“

بیوی کی اس التجا اور وجہ معقول کے بعد آپ خود ہی غور فرمایئے ہم مسالہ پیسنے سے کس طرح انکار کرتے؟ اگرچہ ہم نے کسی بادشاہ کو مسالہ پیستے نہیں سنا تھا، لیکن بڑے بڑے ادیب اور شاعر

مسالہ پیستے رہے ہیں۔ خود ہمارے ڈپٹی نذیر احمد سے ان کی ہونے والی بیوی نے مسالہ پسوایا تھا۔ اس اعتبار سے ہم ڈپٹی صاحب سے پھر بھی بہتر تھے کہ ہم سے ہماری بیوی نے مسالہ پیسنے کی درخواست کی تھی۔

جب ہم مسالہ پیسنے میں دل و جان سے مصروف تھے تو خریداری کرنے کے بعد بازار سے ہمارے بچوں کی منجھلی خالہ تشریف لے آئیں۔ ہمیں مسالہ پیستے دیکھ کر فرمانے لگیں:

”بھائی جان! میں نہ کہتی تھی خاوند اپنے گھر کا بادشاہ ہوتا ہے۔ جو کام وہ کرنا چاہے، کرسکتا ہے، خواہ مسالہ پیسنا ہی کیوں نہ ہو۔ آج تک آپ خواہ مخواہ انکسار سے کام لیتے رہے ہیں۔ اتنی عاجزی اچھی نہیں۔ بس اسی طرح آپ اپنی مرضی چلایا کریں۔ آپ کا موڈ مسالہ پیسنے کا تھا، آپ نے مسالہ پیسنا شروع کردیا۔ میرا خیال ہے آپا نے آپ کو بہت منع کیا ہوگا، لیکن آپ گھر کے بادشاہ ہیں، حکم آپ کا چلا۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے میری بات مان لی۔“

سالی صاحبہ کی اس دلجوئی کے بعد ہمارا دل چاہا مسالہ پیس کر ہم اپنے ہی منہ پر مل لیں تو زیادہ اچھا ہے۔ جل کر کباب تو پہلے ہی سے بنے ہوئے تھے، مسالہ لگ جائے تو چٹ پٹے کباب بن جائیں گے۔

* * *

محاورے اور ضربُ الامثال

منصور احمد

محاورے کا لفظ غالباً محور سے نکلا ہے، جس کے معنی گھومنے کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے بزرگ مثلاً، استاد ذوقؔ وغیرہ کھانے کے وقت پر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھ جاتے تھے اور گھومنے پھرنے والے لوگوں سے پوچھتے تھے کہ بھائی آج کا تازہ محاورہ کیا ہے اور جوتیوں میں دال کہاں بٹ رہی ہے۔ اس سے ادب کی بہت ترقی ہوتی تھی۔ اکثر محاورے اہلِ دلّی نے دریافت کیے تھے، لہٰذا مشہوری کے لیے خواہ مخواہ اپنے شہر کا نام بیچ میں ڈال دیا ہے۔ مثلاً کے طور پر ملاحظہ ہو:

ابھی دلّی دُور ہے۔ چنانچہ اکثر لوگ دلّی میں رہتے ہوئے بھی یہی کہتے تھے کہ ابھی دلّی دُور ہے۔

ضربُ الامثال اُن مثالوں کو کہتے ہیں جنہیں ضرب دے کر عوام کے سامنے پیش کیا جائے، مثلاً:

نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی۔ یعنی اگر ایک بلی روزانہ دو چوہے کھاتی ہے تو ہفتے میں چودہ چوہے کھائے گی اور مہینے میں چوراسی چوہے۔ اس حساب سے اُسے حج پر جانے کے لیے ایک سال دو مہینے پندرہ دن اور چھ گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا۔ اگر دیکھا جائے تو بلی کے لیے یہ سودا برا نہیں، بشرطیکہ ضرب ٹھیک طرح سے دی جائے۔

نو(9) کا عدد اکثر محاوروں میں آتا ہے، جیسے: نو دو گیارہ۔ نو نقد نہ تیرہ ادھار۔ نو تیرہ بائیس بتانا۔ وغیرہ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ دلّی نو سے زیادہ گنتی کبھی کبھار ہی گنا کرتے تھے۔

کچھ محاوروں کا مطلب سوچ سوچ کر بھی سمجھ میں نہیں آتا، جیسے:

جہاں بہو کا پسارا وہاں خسر کی کھاٹ۔ اس محاورے کو پڑھ کر خسر اور بہو کے تعلقات کے

بارے میں اچھے خیالات پیدا نہیں ہوتے۔ اسی طرح 'مائی جی کا تھان، کھیلے چوگان' سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مائی مذکورہ پولو کی کھلاڑی تھیں اور اگر خود میچ پر نہ پہنچ سکتیں تو اپنے تھان کو روانہ کر دیتیں۔

کچھ محاورے اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ ان کا طریقۂ استعمال بھی بیان کرنا چاہیے، مثلاً:

چھلنی میں ڈال کر چھاج میں اُڑانا۔ یعنی پہلے گندم وغیرہ کو چھاج میں پھٹکا جائے، تاکہ پتھر وغیرہ الگ ہو جائیں پھر چکی سے جا کر آٹا پسوایا جائے پھر اُسے چھلنی میں چھانا جائے اور پھر آٹا گوندا جائے اور لکڑیاں جلا کر روٹی پکائی جائے۔ اب آپ ہی کہیے کہ اتنی باریکیاں نکالنے سے کہیں بہتر ہوتا کہ بازار سے جا کر ڈبل روٹی لے آتے!

طالب علموں کی دلچسپی کے لیے ہم مزید چند مثالوں کا ذکر کرتے ہیں:

چور کی داڑھی میں تنکا۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چور وہی ہوگا، جس نے داڑھی رکھی ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ جتنی لمبی داڑھی ہوگی، اتنا ہی تنکا تلاش کرنا مشکل ہوگا۔ پھر بھی اگر آپ یہ عمل کرنا چاہیں تو اپنی ذمہ داری پر کریں، کیوں کہ چور کے پاس داڑھی کے علاوہ اسلحہ اور گولہ بارود بھی ہو سکتا ہے!

اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا۔ آج کل یہ کام ذرا مشکل ہے، کیوں کہ کلہاڑی کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ پھر بھی اگر آپ اس محاورے پر عمل کرنے پہ مصر ہوں تو کسی اسپتال کے آس پاس جا کر ایسا کریں، تاکہ آپ کو فوری طبی امداد مہیا کی جا سکے۔ اور ہاں، محاورے میں یہ نہیں کہا گیا کہ کلہاڑی زور سے ماریں اور خواہ مخواہ اپنا پاؤں زخمی کر بیٹھیں۔

آپے سے باہر ہونا۔ یہ بات ٹھیک ہی لگتی ہے۔ کبھی کبھار اپنے خول سے باہر بھی آنا چاہیے۔

آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ زمین پر گرنے سے بہر حال کھجور میں اٹک جانا کہیں بہتر ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ کھجور انتہائی صحت افزا اور مفید پھل ہے، خصوصاً جب اسی وقت درخت سے اُتار کر کھایا جائے۔

آسمان سے باتیں کرنا۔ آسمان سے باتیں ذرا ٹھیک طرح سے کرنا چاہییں، کیوں کہ اگر یہ آسمان کی مرضی کے خلاف ہوں تو پھر کھجور میں اٹکنا پڑتا ہے۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ یہ محاورہ اُس وقت تک ہی اچھا لگتا ہے، جب تک ڈوبنے والا کوئی

منصور احمد ...... محاورے اور ضرب الامثال

انور احمد علوی

اور ہو۔ اس سے ہمیں ایک اور محاورہ یاد آ گیا کہ دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی نظر آتا ہے اور اپنی آنکھ کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا۔ اگر ڈوبتے وقت آپ کو یہ شہتیر نظر آ جائے تو آپ کے بچنے کے امکانات کافی بڑھ جاتے ہیں!

لوہے کے چنے چبانا۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ ایسا کرنے سے دانتوں کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہے، جس کے بعد آپ کو ڈینٹسٹ کے پاس جانا پڑے گا۔ علاجِ دندان اخراجِ دندان۔ ڈینٹسٹ کے پاس جانے کا نتیجہ یہی نکلنا تھا۔

سانچ کو آنچ نہیں۔ واضح رہے کہ یہاں سچ کا ذکر ہے، سچ بولنے والوں کا نہیں۔ آخر الذکر کو اکثر آنچ دی جاتی ہے، بلکہ جلا کر بھسم بھی کیا جاتا ہے۔

اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ ہم اس محاورے کے حق میں نہیں۔ اونٹ کے منہ میں زیرہ ڈالنے کے لیے اونٹ اور سیڑھی کے علاوہ اونٹ کے ساتھ اچھے تعلقات کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔

بھینس کے آگے بین بجانا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ بھینس ایک نہایت لطیف جانور ہے، جسے موسیقی سے طبعی رغبت ہے۔ جدید طبّی سائنس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر بھینس کے سامنے چار گھنٹے بین بجائی جائے تو دو چار سیر زیادہ دودھ دے گی اور اگر اُس کے پیچھے بین بجائی جائے تو گوبر۔

لالچ بُری بلا ہے۔ یہ ہمیں بھی اچھی طرح سے معلوم ہے، لیکن آپ کے کہنے پر ہم حاتم طائی بن کر اپنا نقصان نہیں کروائیں گے۔

اپنا اُلو سیدھا کرنا۔ پہلے ایک اُلو پالیں اور ہر روز سونے سے پہلے اس کا مشاہدہ کریں (اُلو کے سونے سے پہلے) جب وہ درخت سے اُلٹا لٹک کر سونا شروع کر دے تو اُس کو فوراً سیدھا کر دیں۔ ایک دفعہ تجربہ ہو جائے تو دوسروں کے اُلو سیدھے کرنے شروع کر دیں۔

عقل چرنے کو جانا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہ مضمون پڑھ رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ جب آپ کی عقل چر کر واپس آ جائے گی تو آپ اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ عقلمند محسوس کریں گے۔

یہ تو تھے کچھ پرانے محاورے۔ اب زمانے کے طور طریقے بدل گئے ہیں، لہٰذا اگر کچھ نئے محاوروں کا ذکر بھی ہو جائے تو کیا مضائقہ۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

الیکشن ہونا۔ انتہائی مایوس کن صورتِ حال کے لیے بولا جاتا ہے، جیسے اب ملک کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں، الیکشن ہو چکے ہیں۔

رنگِ ادب پبلی کیشنز

ووٹ دینا۔ انتہائی بے کار کام کو کہتے ہیں، جس کا کبھی کوئی نتیجہ نہ نکلے۔ مثلاً، بیوی (خاوند سے) آپ نے ساری عمر ووٹ ڈالنے کے علاوہ کیا ہی کیا ہے!

بجلی آنا۔ بہت بے یقینی کیفیت کے لیے بولا جاتا ہے، جیسے عاشق (محبوب سے) اب کے بچھڑے تو شاید بجلی آنے پر ہی ملیں!

گیس ہونا، کھانا پکانا۔ بہت زیادہ خوشی کے موقعے پر بولا جاتا ہے، جیسے پہلے بیٹے کی پیدائش کی خوشی پر اُسے یوں لگا، جیسے گھر میں گیس ہو اور اُس کی بیوی اس پر کھانا پکا رہی ہو۔

خدمت کرنا۔ یعنی لوٹ مار کرنا۔ مثلاً، سیاست دان (عوام سے) مَیں اقتدار میں آ کر آپ کی اچھی طرح سے خدمت کروں گا۔

مارشل لاء آنا۔ ایسی چیز کو کہتے ہیں، جس کا آنا ہر عشرے کے بعد لازمی ہو، جیسے قربِ قیامت کی علامات ہیں۔ مثلاً، زلزلے طوفان اور قدرتی آفات ایسے آ رہی ہیں، جیسے پاکستان میں مارشل لاء آتا ہے۔

اسلام کا قلعہ بنانا۔ یہ ہوائی قلعے بنانے کے کافی قریب ہے۔ مطلب صاف ظاہر ہے۔ مثال کے طور پر پچھلے ساٹھ سالوں میں ہم نے پاکستان کو امن، عدل اور انصاف سے پاک کر کے اسلام کا قلعہ بنا دیا ہے۔

* *

حکیم فخر الدین

ملک دیوانا

حکیم صاحب پیری کی وجہ سے دو پہیوں والی سائیکل نہ چلا سکتے تھے، لہٰذا اُنھوں نے پچھلے ٹائر کے دونوں طرف ایک ایک چھوٹا ٹائر لگا دیا تھا، تاکہ توازن برقرار رہ سکے۔ سائیکل کے پیچھے اُنھوں نے جلی حروف میں 'چل بے وفا' لکھا ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہاتھ اور پاؤں سے چلنے والی گاڑیوں کو بڑا ہی بے وفا سمجھتے ہیں، کیوں کہ اِن کا بھروسا کم ہی ہوتا ہے، عین موقع پہ دغا دے جاتی ہیں۔ ایک دن حکیم صاحب حسبِ معمول سبز دین سے تازہ بھنڈیاں لینے 'بے وفا' پہ بازار تمنا گئے۔ سبز دین کے پاس اُن کی مطلب کی بھنڈیاں نہ تھیں، لہٰذا وہ بھائی حکم دین کے پاس پیدل ہی نکل پڑے اور 'بے وفا'، یعنی اپنی سائیکل کو گلی کے نکڑ میں لگا دیا۔ اتفاق سے کمیٹی کا ٹرک اُدھر سے گزر رہا تھا، اُس نے کچرا سمجھ کر ٹرک کے پیچھے پھینک دیا۔ اب جب حکیم صاحب تازہ بھنڈیاں لے کر واپس آئے تو 'بے وفا' غائب تھی۔ حکیم صاحب کے اوسان خطا ہوئے جاتے اور بار بار باآوازِ بلند کہتے جاتے، ہائے بے وفا کہاں چلی گئی؟ ہائے بے وفا کہاں چلی گئی؟ کچھ لوگوں کو معلوم نہ تھا، لہٰذا سمجھ نہ پائے کہ آخر شور کس بات کا ہو رہا ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ بڈھا پاگل ہوگیا ہے، کوئی کہہ رہا تھا کہ بڈھے کو خبط ہوگیا ہے، اس عمر میں سرِ بازار کیا بے حیائی کی باتیں کرتا ہے۔ کچھ عورتوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ انھوں نے جو سنا کہ حکیم صاحب ہائے بے وفا، ہائے بے وفا کر رہے ہیں تو سمجھیں کہ مہرو نے بے وفائی کر ڈالی ہے۔ ایک عورت کہہ رہی تھی، ہائے ری کم بخت، ایسے ہیرے کو چھوڑ کر کہاں منہ کالا کرنے چلی گئی، دوسری کہہ رہی تھی، ہائے مہرو اس عمر میں اللہ اللہ کرتی، نصیب جلی یہ کیا کر بیٹھی۔

مولوی نیک دین صاحب اور حکیم صاحب میں ایک زمانے سے اَن بن چل رہی تھی۔ مولوی صاحب حکیم صاحب کو شروع ہی سے ناپسند کرتے تھے، کیوں کہ حکیم صاحب نے اُن کا

حلوہ بند کروا دیا تھا اور آج کل وہ فقط چھوہاروں پہ گزارہ کر رہے تھے اور تاک میں تھے کہ کسی طرح وہ حکیم صاحب سے اپنا انتقام لے ہی لیں۔ مولوی صاحب کے لیے یہ انتقام لینے کا سنہری موقع تھا، وہ تو باقاعدہ کفر کا فتویٰ لگانے آ گئے، بلکہ نیک دین صاحب گلی کے نکڑ ہی سے باآوازِ بلند کہہ رہے تھے کہ ایسے خبطیوں کے لیے دین اور دنیا میں عبرت ناک عذاب ہے۔ مولوی صاحب کو لوگوں نے جو یہ کہتے سنا تو ایک مجمع جمع ہو گیا۔ کچھ لوگوں کو تو معلوم تھا کہ اصل بات کیا ہے، لیکن ان میں بہت سے انجان لوگ بھی تھے، جو اصل بات سے بے خبر تھے۔ اُن میں کچھ جوشیلے بھی جمع ہو گئے۔ ایک جوشیلے کو یہ کہتے پایا گیا کہ خدا کی قسم ایسے نافرمان کا سر تن سے جدا کر کے ہی چین کی سانس لوں گا۔ ایک کم بخت کو یہ کہتے بھی سنا کہ واللہ! آج حق اور کفر کی جنگ ہے اور میں اس جنگ میں خود کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کو تیار ہوں۔ اِدھر اُدھر سے راہ گیروں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہو گئی۔ اتنا بڑا مجمع دیکھا تو پیدل چلنے والوں کے علاوہ رکشا، گاڑی، ویگن اور بس والوں نے بھی بریک لگانا شروع کر دیے اور مجمع میں شامل ہو گئے۔ ایک خان صاحب نے اتنی زور کا بریک لگایا کہ کئی لوگ زخمی ہوتے ہوتے رہ گئے۔ دوسرے خان صاحب جو پہلے سے وہاں موجود تھے کہہ رہے تھے، وہ کون کم بخت جہنمی ہے۔ خدا کا قسم ہم اُس پر اپنا بس چڑھا دے گا ماں قسم۔ اُدھر سے ایک لاہوری بھائی آ نکلے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے تھے، کتھے اے اوئے، سامنڑے تے آ۔ سامنے سے دینداروں کی جماعت آ رہی تھی ان کے کان میں حق اور کفر کی جو بات پڑی تو باآوازِ بلند فرمانے لگے، جاؤ خدا کے بندو! آج حق اور کفر کا معرکہ ہے، آج آزمائش کی گھڑی ہے۔ سامنے سے ایک جہادی گزر رہا تھا۔ اُس نے جو یہ دیکھا کہ حق اور کفر کا معرکہ چل رہا ہے تو دو چار فائر ہوا میں داغ ڈالے اور للکار کر کہا، ”کس نافرمان کی موت میرے ہاتھوں لکھی ہے۔ اُس دین کے غدار کا آخری وقت آ گیا ہے۔ پڑھ لے کلمہ۔ اُسے کوئی ہاتھ نہ لگائے، اِس ثواب کا حقدار میں ہوں۔“ اس افراتفری کے عالم میں ایک فسادی نے مجمع میں سے ایک شخص کی پاکٹ مار لی۔ جس شخص کی پاکٹ ماری گئی تھی، اُس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس عالمِ نفسا نفسی میں لوگوں نے یہ سمجھا کہ کوئی اور تماشا کھڑا ہو گیا ہے۔ مجمع میں سے بہت سے لوگ حکیم کی طرف لپکے۔ سامنے سے خواتین کی ایک ٹولی مجلسِ میلاد سے لوٹ رہی تھی۔ انھوں نے جو اپنے محسن، یعنی حکیم صاحب کی یہ تذلیل دیکھی تو رہا نہ گیا، کیوں کہ حکیم صاحب تو عورتوں کے حقوق کے علم بردار تھے۔ انھوں نے للکار کر

کہا، ”اوئے نامردو! ہمارے محسن پہ ہاتھ اُٹھاتے ہو۔ یہ لو ہماری چوڑیاں ہاتھوں میں پہن لو۔“ انھوں نے ہاتھوں سے چوڑیاں اُتاریں اور اِن نامردوں کی طرف پھینک دیں۔ انھی میں سے کسی نے ایک موٹا سا کنکر اُٹھایا اور غصّے سے مجمعے کی طرف پھینکا۔ اتفاق سے وہ پتھر مولوی صاحب کے عین ماتھے پہ جا لگا اور خون کا ایک فوارہ جاری ہو گیا۔ مولوی صاحب نے اپنا خون بہتے ہوئے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس سے پہلے وہ دوسروں کا خون بہتا دیکھتے چلے آ رہے تھے، لیکن جب اپنا خون دیکھا تو پہلے تو کچھ دیر سکتے کے سے عالم میں رہے، پھر جب اس ناگہانی صدمے سے باہر آئے تو درد سے بے قابو ہو گئے۔ اسی عالم میں ان کا غصہ عروج پہ پہنچ گیا۔ تمام تر توانائی کو جمع کیا اور للکار کر پکارا، ”کاٹ ڈالو اِن دین کے غداروں کو۔ لیکن درد اور توانائی کی کمی کے باعث ان کی آواز سب تک نہ پہنچ پائی، لہٰذا انھوں نے اپنے ایک مرید سے کہا کہ کسی طرح لاؤڈ اسپیکر کا بندوبست کرے، کیوں کہ وہ لاؤڈ اسپیکر کے بِنا بولنے کے عادی نہ تھے۔ ان کو اُس وقت محسوس ہوا کہ لاؤڈ اسپیکر کتنی بڑی نعمت ہے۔ بہر حال، لاؤڈ اسپیکر کا انتظام تو نہ ہو سکا، لیکن ان کے مریدوں نے ان کا پیغام باقی مجمع تک پہنچانے کی ذمّہ داری اپنے سر لے لی، جو کئی مرتبہ سر کی طرف سے ہاتھوں تک چلی آتی تھی اور بعض اوقات پاؤں بھی شامل کر لیتے تھے۔ مولوی صاحب کا پیغام مجمع تک کیا پہنچنا تھا۔ اس شور کے عالم میں ایک مرید کہہ رہا تھا، مولوی نے فرمایا ہے کہ کاٹ ڈالو۔ مجمع نے سنا تو وہ سمجھا، شاید مولوی صاحب فرما رہے ہیں کہ ڈِش کے تار کاٹ ڈالو۔ لہٰذا ایک جوشیلے نے ساتھ والے گھر پہ چڑھ کر ڈش کا تار کاٹ ڈالا اور دوسرے نے ڈِش اُٹھا کر نیچے پھینک دی۔ ایک مزدور نیچے کام کر رہا تھا، اس کے پاؤں پہ یہ ڈش جا لگی۔ بے چارہ درد سے ہائے ہائے کرنے لگا۔ جس مرید نے یہ ڈش کاٹی تھی، وہ مولوی صاحب کے پاس آیا اور عرض کی کہ قبلہ اس ڈش کا کیا کروں۔ مولوی صاحب نے غصّہ سے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا کم بخت ہر دفعہ یہی پوچھتا ہے؟ جا ہمارے پچھواڑے جا کر رکھ آ اور اِس حق اور کفر کی جنگ میں پھر سے شامل ہو جا۔ رہا حکیم صاحب کا معاملہ تو وہ بے چارے اس قابل ہی کہاں تھے کہ اس عالمِ افراتفری کے متحمل ہو سکیں، بے ہوشی کے عالم میں ایک طرف کو گر پڑے۔ اب حکیم صاحب کی کسے فکر۔ بے چاری میلادی عورتوں نے حکیم صاحب پہ پانی کا چھڑکاؤ کیا، تاکہ بے چاروں کو ہوش تو آئے۔ حکیم صاحب نیم بے ہوشی کے عالم میں کہہ رہے تھے، بے وفا تو کہاں چلی گئی، بے وفا تو کہاں چلی گئی۔ ان عورتوں

میں سے کسی کو اصل صورتِ حال کا علم نہ تھا۔ کسی نے کہنا شروع کر دیا، ہائے کم بخت مہرو جہنم میں جائے تو، جو ایسے فرشتہ صفت انسان کو دھوکا دے کر بھاگ گئی۔ کوئی کہہ رہی تھی، ہائے ہائے قیامت کی نشانیاں ہیں یہ سب۔ اس عمر میں اللہ اللہ کرتی، نصیب جلی بھاگ گئی یار کے ساتھ۔ دوسری خاتون غصّے کے عالم میں کہہ رہی تھی، ہائے ہائے کلموہی جہنم میں جائے تو، جو ایسے ہیرے کو چھوڑ کر عاشق کے ساتھ بھاگ گئی۔ ساتھ میں ایک سنار کی دکان تھی۔ وہ یہ سمجھا کہ شاید اس افراتفری کے عالم میں اس کی دکان میں ڈاکا پڑ گیا۔ اس نے چلاّنا شروع کر دیا، ہائے ہائے میں لٹ گیا، میرے ہیرے کوئی لے گیا، پولیس کو بلاؤ کوئی، پرچہ کٹواؤ۔ غرض کوئی کچھ کہہ رہا تھا اور کوئی کچھ۔ اُدھر مولوی صاحب طیش کے عالم میں تھے اور اِس بات پہ مصر تھے کہ حکیم صاحب سے اپنی اگلی پچھلی تمام عداوت کا بدلہ لے لیں۔ حکیم صاحب کو بے بسی کے عالم میں دیکھا تو فخر سے اپنے مریدوں سے فرمانے لگے، دیکھا یہ حال ہوتا ہے دین کے غداروں کا، دیکھنا قبر بھی نصیب نہ ہوگی اس بڈھے کم بخت مارے کو۔ یہ عورتیں دفن کریں گی اِسے۔ ایک اللہ کی بندی چندو نے یہ گفتگو سن لی۔ غصّے سے مولوی سے کہا، ‘‘اے دین کے محافظ کیا کہا تو نے؟’’ مولوی صاحب نے غصّے سے کہا، ‘‘جا ہم عورت ذات کے منہ نہیں لگتے، معاف کیا ہم نے، کیا یاد رکھے گی۔’’ خاتون کو اِس بات پہ غصہ آ گیا۔ اس نے للکار کر کہا، ‘‘تو کون ہوتا ہے ہمیں معاف کرنے والا ابے اوئے بڈھے۔’’ مولوی صاحب نے تین چار مرتبہ اس لفظ ’ابے اوئے بڈھے‘ کو دھرایا، جیسے ان کو اپنے کانوں پہ یقین نہ آ رہا ہو۔ پھر غصّے سے فرمایا، ‘‘اے جہنم کی اُمیدوارو! تمہیں معلوم نہیں کہ دین کے محافظوں سے کس طرح بات کرتے ہیں۔’’ مولوی صاحب کا یہ فرمانا تھا کہ چندو آپے سے باہر ہو گئی اور پھر اُس نے مولوی صاحب کی وہ کلاس لی کہ مولوی صاحب کو چھپنے کو جگہ نہ ملے۔ مگر چندو کی زبان تھی کہ رُکے نہ رکتی تھی۔

* * *

سفر ہے شرط... لیکن بس کا!

معین اعجاز

شہر دلی کی قابلِ دید چیزوں میں تاریخی عمارات، لوک سبھا اور چڑیا گھر کے علاوہ یہاں کی بسیں بھی ہیں۔ اگر شاعرِ مشرق اس دور میں زندہ ہوتے اور دلی ٹرانسپورٹ کارپوریشن عرف ڈی ٹی سی کی بسوں سے ہر روز ان کا پالا پڑتا تو وہ ہرگز ہرگز یہ شعر نہ کہتے:

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس!
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

کیوں کہ دلی شہر کے لاکھوں عام آدمیوں کی طرح شاعروں، مصوروں اور افسانہ نویسوں کے اعصاب پر عورت کے بجائے ہر وقت بس سوار رہتی ہے۔ اگلے زمانہ میں کچھ لوگ محبوب کے انتظار میں ہر طرح کی اذیتیں جھیل لیا کرتے تھے، لیکن اب شہریوں کو اس قسم کی صعوبتیں بس کے انتظار میں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ بسوں کے انتظار کے تعلق سے ایک بزرگ ادیب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ بس اور سوشلزم کے انتظار میں عمر کا نصف حصہ گزر گیا۔ ہم اپنے بزرگ ادیب کے خیال سے سو فیصد متفق ہیں، لیکن اس ضمن میں ہماری بھی ایک حقیری رائے ہے۔ وہ یہ کہ جس رفتار سے ڈی ٹی سی کی بسیں چلتی ہیں اس رفتار سے اگر سوشلزم بھی بڑھنے لگے تو یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر ساری دنیا میں سوشلزم اور صرف سوشلزم نظر آئے گا اور سوشلزم کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دے گا۔

شہری زندگی میں بس کو وہی حیثیت اور اہمیت حاصل ہے، جو گھر میں بیوی کو! شادی شدہ افراد کو نہ گھر میں بیوی سے مفر ہے اور نہ باہر بس سے۔ خوش قسمتی سے دفتر جاتے وقت اگر بیوی سے بچ بچا کر نکل بھی پڑے تو بس میں آپ کے جیب و گریبان کی خیر نہیں رہے گی اور ایک نئی معنویت کے ساتھ آپ یہ مصرعے گنگنانے پر مجبور ہو جائیں گے:

اگر جراحتِ قاتل سے بخشوا لائے
تو دل سیاستِ چارہ گراں کی نذر ہوا

بسوں کے سفر کے معاملے میں ہمارا تجربہ ’بین الریاستی‘ قسم کا ہے یعنی ہم نے ملک کی کئی ریاستوں کی بسوں پر سفر کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ ہر ریاست کی ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی کچھ الگ الگ خصوصیات ہیں۔ لیکن راجدھانی کی بسیں ان سب سے مختلف اور منفرد ہیں۔ رابطۂ عامہ کے تعلق سے یہ محکمہ یک طرفہ ٹریفک یعنی ’وَن وے ٹریفک‘ کا قائل ہے۔ اُصول وضوابط کی ساری پابندیاں صرف مسافروں کے لیے ہوتی ہیں۔ ٹرانسپورٹ کا عملہ اس قسم کی پابندیوں سے یکسر مستثنیٰ ہے۔

اگر آپ پچھلے دروازے سے بس پر سوار ہوئے؟ لیکن بھیڑ کی وجہ سے کنڈیکٹر تک آپ کا ہاتھ نہ پہنچ سکا اور اسی درمیان ٹکٹ چیک کرنے والا اسٹاف آدھمکا تو سمجھ لیجیے کہ آپ کے ٹکٹ کی قیمت چالیس یا پچاس پیسوں کے بجائے پانچ روپے ہوگئی۔ اور اگر آپ کی جیب میں پانچ روپے موجود نہ ہوں تو ’عزتِ سادات‘ یقیناً جاتی رہے گی۔ مسافر بس پر سوار ہوں یا نہ ہوں کنڈیکٹر کسی فوجی ڈکٹیٹر کی طرح اپنی سیٹ سے چپکا رہے گا۔ وہاں سے اُٹھنا اس کے لیے کسرِ شان ہے اور اگر آپ نے اس کے سامنے رتی بھر بھی خفگی کا اظہار کیا تو وہ ایسی زبان اور لہجے میں آپ کو مخاطب کرے گا کہ آپ تو کیا آپ کے بعد آنے والی سات نسلیں بھی پناہ مانگنے لگیں گی۔ اس معاملے میں دوسرے شہروں کے کنڈیکٹر دلّی کے کنڈیکٹروں کی بارعب زندگی پر رشک کرتے ہیں۔

دلّی کی بسوں کی ادائیں اور چال ڈھال بھی بڑی دلچسپ اور قابلِ دید ہوتی ہیں۔ سب سے سہانا منظر وہ ہوتا ہے جب دو ڈرائیور ’دوستانہ مقابلے‘ کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اور اپنی اپنی بسوں کو ایک دوسرے سے آگے نکالنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اس عمل کو ٹریفک کی اصطلاح میں ’اوورٹیک کرنا‘ کہتے ہیں۔ دلّی کی بسیں آزاد اداروں کی طرح بیرونی مداخلت برداشت نہیں کرتیں۔ کنڈیکٹروں اور ڈرائیوروں کی مرضی کے مطابق بس کی رفتار اور اسٹاپ متعین ہوتے ہیں۔ آپ کسی اسٹاپ پر گھنٹوں انتظار کیجیے اور لاکھ ہاتھ دکھا کر بس روکنے کی کوشش کیجیے لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا تاوقتیکہ کنڈیکٹر اور ڈرائیور کو آپ کے اوپر رحم نہ آجائے۔ گویا بس اگر کسی اسٹاپ پر رُک گئی تو اُسے آپ اپنا حق نہ سمجھیے بلکہ یہ ایک طرح کی رعایت ہے۔ یہ رعایت بھی اسی حد تک

حاصل ہوگی کہ آپ بھاگ کر بس تک کسی صورت پہنچ جائیں۔ اگر آپ نے اس منزل پر بجلی کی سی تیزی نہ دکھائی تو آپ کے سر، دانت، گھٹنے یا ہاتھ پیر کا کوئی نہ کوئی حصّہ ضرور متاثر ہوگا۔ بسوں کی اِن اداؤں پر دلّی کی آبادی کی ایک بڑی تعداد اپنے جسم کا کوئی نہ کوئی حصّہ قربان کر چکی ہے۔ جس طرح عشق میں انسان چوٹ ضرور کھاتا ہے اسی طرح بس میں سفر کرنے والوں کے لیے بھی چوٹ کھانا لازم ہے۔

ہم جب سے شہرِ میرؔ و غالبؔ میں وارد ہوئے تب سے خدا جھوٹ نہ بلوائے ہر روز بسوں سے پالا پڑا۔ ایک زمانے میں ہم جامع مسجد کے قریب ایک گلی میں قیام پذیر تھے۔ ایک روز دفتر سے چھوٹے تو اتفاق سے فوراً بس مل گئی ہمیں ایک دوست کے بھتیجے کے عقد میں شرکت کرنا تھی۔ بس شہر کی پُر ہجوم سڑکوں پر اس رفتار سے بھاگ رہی تھی جس رفتار سے کھلی فضا میں طیارے اُڑتے ہیں۔ بس کے اندر بھیڑ کا یہ عالم تھا کہ ہم ایک سو بیس ڈگری کا زاویہ بنائے جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہے۔ اچانک یوں محسوس ہوا جیسے بھیانک قسم کا زلزلہ آ گیا ہو یا چند لمحوں کے لیے زمین کی گردش رُک گئی ہو۔ جب ہوش و حواس کچھ درست ہوئے تو پتا چلا کہ ہماری ناک کسی ٹھوس چیز سے ٹکرا گئی تھی، کیوں کہ خون کا فوارہ سا پھوٹ پڑا تھا۔ اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہماری نظر ولنگڈن اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ پر پڑی۔ ناک کا ایکسرے ہوا۔ پھر ڈاکٹر نے کہا، ”آپ کو اسپتال میں داخل کر لیا گیا اگرچہ کوئی بیڈ خالی نہیں ہے۔“ ہم نے کہا، ”ڈاکٹر صاحب اس شہر میں ہم نئے آئے ہیں۔ خدا کے لیے ایسا نہ کیجیے۔“ یہ بات ہم نے انگریزی میں کہی تھی اس لیے شاید اس کا اثر اچھا پڑا اور ڈاکٹر نے کہا، ”اچھا ٹھہر جایئے۔ ایکسرے کی رپورٹ آجائے!“ اب ہم دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ رپورٹ کا انتظار کرنے لگے۔ خدا خدا کر کے رپورٹ آ گئی۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا، ”کوئی خطرے کی بات نہیں۔ آپ چاہیں تو دستخط کر کے اپنی ذمہ داری پر جا سکتے ہیں۔“ یہ سن کر ہماری باچھیں کھل گئیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق رجسٹر کے ایک خانے پر ہم نے دستخط کر دیے۔ اسپتال سے تو ہمیں چھٹی مل گئی، لیکن ’مقاماتِ آہ و فغاں‘ ابھی اور بھی تھے۔ پولیس والوں کو بیان دینا تھا۔ طرح طرح کے سوالات کیے گئے۔

”کیا آپ بتا سکتے ہیں بس کیسے ٹکرائی؟“

”جناب! ہمیں کیا معلوم؟ اتنی بھیڑ میں تو ہمیں اپنے جسم و جان کا بھی کچھ ہوش نہیں تھا۔“

"یہ واقعہ کس جگہ پیش آیا؟"

"کناٹ پلیس کے پاس۔"

اور آخری سوال تھا۔

"کیا آپ کے خیال میں ڈرائیور کو سزا ملنی چاہیے؟"

ہم نے کہا، "آپ وہی کیجیے جو قانون کہتا ہے، لیکن خدارا ہمیں بخش دیجیے۔ ہمارا قصور تو صرف یہ ہے کہ ہم بس پر سوار ہوئے تھے۔"

کچھ دیر بعد ہمیں یہاں سے بھی نجات مل گئی۔ یہ اور بات ہے کہ بسوں سے اب تک نجات نہ مل سکی۔ اس حادثے کے بعد کئی روز تک ہماری ناک خاصی صحت مند رہی۔ چہرے کی جغرافیائی حالت بھی بڑی حد تک بدلی بدلی سی رہی اور اس عالم میں جب کبھی آئینہ دیکھا تو مرحوم خلیل الرحمٰن اعظمی کا شعر بے ساختہ زبان پر آگیا:

یہ آئینے میں کون ہے ہم جانتے نہیں
صورت ذرا ذرا سی ہمیں آشنا لگی!

* * *

لندھن کا عنابی دربار

ملا رموزی

اے میلاد کی غزلوں پرونے والو!

کیا نہ سنا تم نے کہ مبلغ ایک دربار بڑی شان والا منعقد ہوا۔ بیچ شہر لندھن کے خاص واسطے رسم تاجپوشی بادشاہ کے، مگر یہ کہ یہ ہے بے خبری تمہاری اے بے خبری حد سے گزری ہوئی بہ سبب اس کے کہ نہیں ہیں تعلیم پائے ہوئے بیچ ہندوستان کے مگر اوپر ایک سو کے چند۔

پس بیچ جس قوم کے ہوں لکھے پڑھے کہ وہ یا بھرتی ہوں گے بیچ فوج کے، یا ملازمت کریں گے وہ ایسے ٹھیکیداروں کی کہ بنائی ہوئی عمارتیں اُن کی نہیں زندہ رہتی ہیں مگر مبلغ ایک سال، مگر یہ کہ اصل بے وقوف ہیں وہ جو بنواتے ہیں عمارتیں ایسے ٹھیکیداروں بے ہنر اور بے ایمان سے۔

پس جب سلسلہ کلام ہمارے کا پہنچا اوپر اس جگہ کے تو تشریف لائیں بیوی نمبر 2 ہماری ساتھ مہربانی بہت کے اور فرمایا کہ اے شوہر میرے دراز کرے خدا عمر اور تندرستی آپ کی اور مسٹر لائڈ جارج شاگردِ قدیم آپ کے کی، کیا ہو گیا ہے آپ کو کہ اوپر ٹھیکہ داروں اس زمانہ کے غصہ ہو رہے ہیں آپ درآں حالیکہ جانتے ہیں آپ کہ بیچ اس زمانہ ہذا کے نہیں ہوتے تعلیم یافتہ مکمل علم والے جب کہ بیچ زمانہ طالب علمی کے پڑھائے جاتے ہیں مضامین کثرت سے تا دماغ خراب ہو جائے طالب علم ہندوستانی کا، پس جو طلبا کہ بیچ ایک وقت کے پڑھتے ہیں دس مضامین اور سولہ کتابیں تو کیا خاک باخبر اور صاحبِ کمال ہوں گے وہ بیچ ایک فن کے، پس جب یہ حال ہو نصاب تعلیم کا تو کیوں کر محنتی اور جفاکش ہوں نوجوان اس زمانہ ہذا کے، راستہ بتا دے اللہ مسلمانوں کو اے راستہ اجمیر شریف کا اگر نہیں ہوتی دلچسپی ان کو معاملوں سیاسی سے اور ترک کرا دے اللہ عادت حقہ نوشی کی مسلمانوں پنجاب کے سے اور محفوظ رکھے اللہ باشندوں چین اور ارکان جمعیۃ اقوام کو افیون اور گانجے سے کہ تحقیق محال ہے یہ کہ پھر بادشاہوں ہیلا سلاسی حبشہ کے، کہ تحقیق ہے یہ مقولہ

حکیموں ایران کے کا واسطے ایسوں کے کہ کہا ہے:

"جو کہ شمشیر مارتا ہے ساتھ ساتھ نام اس کے کے پڑھتے ہیں۔"

پس داد دیجیے ترجمہ اس مصرعہ کے کی مجھ کو اے شوہر میرے! پھر فرمایا کہ تحقیق جو جھگڑا کہ ساتھ شیعوں اور سنیوں لکھنؤ شریف کے ہوا ہے، غم کھایئے اوپر اس کے کہ تحقیق مسلمان رہ گئے ہیں اب بیچ دنیا کے خاص واسطے تباہی کے بہ سبب بیخبری تعلیمات مذہب اپنے کے، پس جس نے کہ دوری اختیار کی اصول مذہبی اپنے سے وہ راندا جائے گا اے بھٹکے گا وہ بھی گمراہ ہوگا وہ طرف سے اچھی اور کامیاب زندگی کے مگر اے عجب وہ گھڑی محبت کی بڑھانے والی کہ جب تشریف لائیں بیوی نمبر 2 ہماری ساتھ محبت ایسی کے کہ نثار ہوں اس پر شہر کلکتہ اور دہلی اور باتیں کیں انہوں نے اے باتیں اوپر والی تو کہا ہم نے کہ اے بیوی نمبر 2 ہماری تحقیق ربان ہوں اوپر وفاداری تیری کے چالیس خزانے اور قربان ہوں اوپر وفاداری ہماری کے چالیس اونٹ طرابلس کے مگر اے عجب وہ طرابلس کہ لڑے تھے کبھی واسطے حفاظت اس کی کے حضرت شیخ سنوسی رحمت خدا کی اوپر ان کے مگر عجب کہ آج قابض ہے ملک اٹلی اوپر طرابلس کے بہ سبب حقہ نوشی اور باہمی عداوت مسلمانوں کی کے جو ہے بہ سبب جہالت کے، پس بیچ جس شہر کے ہوں مقدمہ باز زیادہ بھی ہوں سڑکیں خراب اور گلیاں گندی جس شہر کی ماں تو اور جان تو اے عزیز بیوی ہماری کہ نہیں منہ فراغت کا دیکھیں گے باشندے اس شہر کے، بھی جہاں طلاق لیتی ہوں عورتیں زیادہ اور طلاق دیتے ہوں مرد زیادہ اور شادیاں ہوتی ہوں بے مرضی معلوم کیے لڑکیوں کی، تو تحقیق آوارگی اور افلاس بڑھے گا بیچ ایسے شہروں کیے بھی باشندے جس ملک اور شہر کے بیٹھے رہتے ہوں اوپر دکانوں کے بیکار تو قسم ہے امرت دھارا اور سوڈا واٹر کی کہ نیلام ہوگا جلد وہ شہر بہ سبب آوارگی باشندوں اپنے کی کے، بھی اسی طرح جب بڑھ شوق لوگوں کا واسطے قوالی اور گانے کے، بھی بڑھ جائے شوق خریداری زیور کا بیچ عورتوں کے اور بوڑھے ہونے لگیں لوگ بیچ عمر 40 سال کے تو مت گمان لے جا کہ راستہ کامیابی کا پائیں وہ کیوں کہ البتہ تحقیق آیا ہے بیچ کتابوں بڑی کے یہ کہ باشندے جس ملک کے قناعت اختیار کرتے ہوں اوپر دال روٹی کے تحقیق ہیں وہ مارے ہوئے سستی اور جہالت کے، پس چاہیے راستہ بتانا ان کو طرف تعلیم کے، مگر اے عجب وہ لیڈر قوم کے کہ نہیں ہے لیاقت اندر ان کے لیڈری کی، مگر یہ گزر بسر کرتے ہیں وہ اوپر لیڈری کے، گویا کہے تو کہ ہیں وہ تاجر قوم کے اور مال تجارت

ان کا ہے قوم بے وقوف۔

پس اما بعد، جب سلسلہ کلام کا اوپر اس جگہ کے پہنچا تو طعن و طنز کیا ہم نے اوپر اُن ایڈیٹروں اخباروں اُردو کے، جو پیشین گوئی کر رہے ہیں برسوں سے عالمگیر جنگ کی، خاص کی گئی جنگ ہسپانیہ کہ کہتے تھے وہ کہ تحقیق جنگ ہسپانیہ سے ہوگی شروع لڑائی بڑی مگر نہ ہوئی وہ موافق دلایل ہم ملا رموزی صاحب کے تو تحقیق مندان کا فق ہوگیا، پھر کہا ہم نے کہ دراز کرے اللہ بالوں سر تیرے کے کواے بیوی نمبر 2 ہماری اور توفیق زیادہ وفاداری سے دے تجھ کو واسطے ہمارے کہ تحقیق اوپر فقط وفاداری تیری کے ہو رہی ہے شاعری ہماری، اگرچہ بہت دن گزرے کہ نہ غزل کہی اوپر ہندوستان کے سرمائیکل اوڈوائر نے، بھی نہیں چھوڑتے پیچھا قادیانیوں کا مولانا ظفر علی خاں ہمیشہ ہوجیو اخبار 'زمیندار' ان کا کہ تحقیق ذریعہ اس اخبار تذکرہ کیے گئے کہ پہلا شوق سیاست کا بیچ مسلمانوں بے خبر کے، مرغ بازی سکھا دے اللہ مسولینی کو اور کبوتر بازی ہر ہٹلر کو بدلے شوق جنگی ان کے کے، بھی توفیق دے اللہ بجلی والوں کو تا مبلغ چار پنکھے بجلی کے دیں وہ واسطے دولت خانہ ہمارے کے بیچ اس زمانہ گرمی سخت کے، تا سکیں ہم لکھنا مضامین عمدہ کا موافق حق عمدگی ان کی کے، مگر بات کاٹی ہماری بیوی نمبر ایک ہماری نے اور کہا کہ اے شوہر میرے اور بیوی نمبر 2 اپنی کے ہرگز گمان مت لے جاؤ اوپر مسلمانوں کے کہ قدر پہچانیں گے وہ آپ کی اور دیں گے وہ پنکھا بجلی کا آپ کو مگر یہ کہ ساتھ قوت بازو اپنے کے لاؤ تم، تو آفرین بہت کہی ہم نے اوپر خودداری بیوی نمبر ایک اپنی کی کے اور کہا کہ تحقیق عورتیں جس گھرانے کی ہوں گی خوددار تو تحقیق محفوظ رکھے گا اللہ اس گھرانے کو فضولیوں مغربی تمدن کی سے، مگر عجیب بے وقوف وہ عورتیں کہ ہو کر کم آمدنی خرچ کرتی ہیں وہ زیادہ اوپر لباس قیمتی اپنے کے، بھی اوپر لباس قیمتی اولاد اپنی کے، بھی اوپر تفریح سینما کے، بھی اوپر کھانے لذیذ کے، بے خبر تنگدستی اور قرضداری سے، پس سن تو کان دھر باتیں حکمت کی، اے عورت اگر ہے تو عقل کی رکھنے والی کہ جو قوم کہ جاہل رکھے گی وہ عورتوں اپنی کو اور آزادی دے گی وہ قبل تعلیم کے، اے آزادی نامعقول، تو خانہ تلاشی لے گی ایسے گھرانوں کی پولیس بغیر وارنٹ کے، کیوں کہ موافق قول حکیم بزرجمہر کے رواج دنیا شادی مرضی طرافین کے مفید ہے اور ویسی لباس مفید ہے واسطے عورتوں ہندوستان کی کیے بھی اختیار کرنا گھریلو صنعت کا مفید ہے، بھی ادھوری تعلیم و تربیت کا ہونا ایسا ہی ہے گویا کہے تو کہ بیچ بخار سخت کے ہزیان بک رہا ہے مریض بخار کا، بھی اسی طرح نہ

فائدہ اُردو دیں گے قوم کو رسالے ادبی اُردو کے کہ تحقیق بجز ہفوات واہیات کے نہیں ہوتا اصل ادب بیچ ان کے، مگر غزلیں مہمل اور افسانے اخلاق کے جلانے والے، پس قسم ہے غزلوں رلانے والی کی کہ حوالات میں بھیجے جائیں گے وہ شوہر تمام کہ بے پروا رہتے ہیں وہ بیویوں اپنی سے بہ سبب ناراضی اپنی کے ابھی تکالیف پہنچاتے ہیں وہ بیویوں اپنی کو، بھی اسی طرح موٹر ڈرائیور بنائے جائیں گے دن حشر کے وہ شوہر جو زیادہ رہتے ہیں بیچ گھر خسر اپنے کے، محفوظ رکھے اللہ ہر ہندوستانی کو خضاب لاجواب اور سسرال اپنی سے اور پاک کرے اللہ اے رہائی دے اللہ بندشوں خلاف شرع سے عورتوں اس زمانہ ہٰذا کی کو، کیوں کہ شریک ہونا مسلمانوں کا بیچ کانگریس کے بغیر بصیرتِ سیاسی کے برابر ہے نہ شریک ہونے ان کے کے، دُور رکھے اللہ ہم کو اور بیوی نمبر ایک ہماری کو اجلاسوں ُ لے جس لے ٹو کونسلوں' کے سے اور گولیاں کونین کی کھلاتا رہے اللہ تعالیٰ خشک واعظوں اور جاہل میلاد خوانوں کو کہ تحقیق وجود ان کا بخار اور مراق ہے بیچ حق قوم مسلمانوں کی کے اور شوق دے اللہ ہندو مسلمانوں، دنیا تمام کو اتحاد و اتفاق کا، بھی طاعون پھیلا دے اللہ بیچ لیڈروں کے تا کم ہو جائے مقدار لیڈروں کی کہ کثرت لیڈروں کی سبب ہے تباہی قوم کا۔

پس بعد اس گفتگو کے مصروف ہو گئے ہم اور بیوی نمبر 4 ہماری بیچ تصاویر دربار لندھن کے، اب کیا کیا اشارے ہمارے جھٹلاؤ گے؟

* *

آسان اُردو

مولوی عبدالحق

مرزا غالب کا شعر ہے:

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

مرزا غالبؔ کی مشکل پسندی مشہور ہے اور جب اس کی شکایت بہت بڑھ چکی تو انہوں نے یہ عذر پیش کیا۔ یہ عذر تو ایک لطیفہ ہے لیکن عام شکایت کا اثر یہ ہوا کہ وہ سچ مچ آسان کہنے لگے اور آسان بھی ایسا کہ اس کا جواب نہیں۔ ان کی شہرت اور مقبولیت اسی آسان کلام پر ہے۔ آج مجھے بھی آسان لکھنے کی التجا کرنی پڑی ہے خدا کرے اس کا نتیجہ بھی حسبِ مراد نکلے۔

یہ واقعہ ہمارے لیے سبق آموز ہے اس کا ذکر میں نے اس لیے کیا تھا کہ اُردو کے اس نئے دور میں پھر ویسے ہی آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ ہماری زبان پر ایک اور وقت بھی ایسا ہی آیا تھا۔ اس بدعت کا آغاز لکھنؤ میں ہوا۔ جدّت پسندی کے شوق میں لکھنؤ کے شاعروں اور ادیبوں نے ایسے مشکل اور ثقیل فارسی عربی کے لفظ اپنے کلام میں داخل کرنے شروع کر دیے تھے کہ عام فہم تو کیا خاص فہم بھی نہیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اُردو کے بہت سے ٹھیٹ لفظ اور بول چال کے عام فہم محاورے عامیانہ قرار دے کر متروک کر دیے گئے۔ یہ معیار شرافت و ثقاہت سمجھا جاتا تھا۔ تحریر ہی میں نہیں۔ بات چیت میں بھی یہی شان پیدا ہو گئی تھی۔ اپنی علمیت جتانے کے لیے یہ لوگ عجیب طرح کی زبان بولنے لگے تھے۔ ایک زمانہ میں یہاں کی ہائی کورٹ میں لکھنؤ کے ایک صاحب علم میرِ مجلس تھے۔ ایک دن میں یونہی ان سے ملنے گیا۔ مزاج پوچھا تو فرمایا، ”صدر پر انصبابِ نوازل ہے۔“ آپ سمجھے کیا کہا۔ غزل جس کی زبان سبک فصیح اور عام فہم ہوتی ہے وہ بھی اس کی زد سے نہ بچی اور اس میں بھی وہاں کے شاعروں نے ایسے ثقیل اور نامانوس عربی فارسی لفظ لکھنے شروع کر دیے

جو کسی طرح ان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میں مثالیں پیش کر کے آپ کی سمع خراشی کرنا نہیں چاہتا اس کا اثر اب بھی کچھ نہ کچھ باقی ہے۔

بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ایک غریب آدمی حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنوی کے مطب میں آیا اس کے گھٹنے میں درد تھا۔ حکیم صاحب نے معائنہ کے بعد کہا۔ حلتیت کا ضماد کرو۔ وہ بے چارہ ہکا بکا ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگا۔ اب کے حکیم صاحب نے ذرا ڈانٹ کر کہا حلتیت کا ضماد کرو۔ وہ خاک نہ سمجھا اور اسی طرح سہمے انہیں دیکھتا رہا۔ اس پر حکیم صاحب نے مولوی عبدالحلیم شرؔر سے جو ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، فرمایا کہ یہ کیسا جاہل گنوار ہے کہ بات نہیں سمجھتا۔ خیر وہ تو ایک گنوار تھا، آپ معاف فرمائیں گے۔ اگر میں اس تقریر سننے والوں سے یہ پوچھوں کہ آپ میں سے کتنے ہیں جو اس کا مطلب سمجھے۔ اگر حکیم صاحب معمولی زبان میں یہ کہہ دیتے کہ ”بھئی ہینگ کا لیپ کرو۔“ تو کیا ان کی شان ہیں جفتے پڑ جاتے اور ان کی حکمت و حذاقت میں فرق آ جاتا؟ مگر نہیں وہ طب کے علمی الفاظ اور اصطلاحات کو عام بول چال میں بیان کرنا اپنے فن کی توہین اور اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اگر عام بول چال میں یہ باتیں آ گئیں تو شان کہاں رہی۔

یہی حال مولویوں کا ہے وہ اپنی تقریر، وعظ یا بیان میں موٹے موٹے عربی یا فارسی کے لفظ اور جملے مزے لے لے کر بلا تکلف کہتے چلے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ سننے والوں میں بہت سے ایسے ہیں جو نہیں سمجھتے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ گو نہ سمجھتے ہوں لیکن دل میں سب قائل ہیں کہ یہ بڑا مولوی اور بہت بڑا عالم ہے۔ مرعوب کرنے کا یہ بہت اچھا گر ہے۔

سر سیّد احمد خان نے جہاں اور بہت سی بدعتوں کو توڑا جملہ ان کے ایک یہ بھی ہے۔ سر سید کی سادہ نویسی مشہور ہے۔ مجھے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کہا کرتے تھے۔ میں اپنے خیالات ایسی زبان میں ادا کرنا چاہتا ہوں جسے گھر کی ماما اور سائیس بھی سمجھ لے اور انہوں نے یہ کر دکھایا۔ سنجیدہ اور علمی مضامین بھی انہوں نے بڑی ستھری اور آسان زبان میں لکھے ہیں اور بعض وقت انہیں سادہ الفاظ اور فقروں کے صحیح استعمال میں وہ قوت اور دلکشی پیدا کر دی ہے کہ جو بڑے بڑے الفاظ اور جملوں سے ممکن نہیں۔ جس زمانے میں مولانا شبلی حیدر آباد میں مقیم تھے میں ایک

روز ان سے ملنے گیا۔ دیکھا کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں (اس زمانے میں وہ علم الکلام لکھ رہے تھے) میں نے پوچھا کس فکر میں ہیں۔ فرمایا الہام و وحی کے موضوع پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ سرسید نے بھی اس پر لکھا ہے۔ لکھا کیا ہے مسئلہ کو پانی کر دیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ کیا پیرایہ اختیار کروں۔

ہم کیوں لکھتے ہیں۔ اس لیے تا کہ ہمارے خیالات دوسروں تک پہنچیں اور لوگ ان سے مستفید ہوں تو جتنی زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ ہماری تحریر کو پڑھیں گے اُسی نسبت سے اس کا فائدہ بھی زیادہ ہوگا اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ تحریر آسان زبان میں ہو اور ایسے پیرائے میں لکھی گئی ہو کہ لوگ اُسے شوق سے پڑھ سکیں۔ اگر مشکل زبان ہو تو اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ اور اسے مقبولیت حاصل نہ ہوگی۔ اگر آپ دنیا کے ایسے ادیبوں کی فہرست بنائیں جنہیں قبولِ عام حاصل ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں یہ عزت انہیں کو ملی ہے جنہوں نے اپنے خیالات آسان اور شگفتہ زبان میں ادا کیے ہیں۔ ہم آسان اس لیے نہیں لکھتے کہ آسان لکھنا آسان ہے۔ بہت مشکل ہے اوّل تو لکھنے والے کو زبان پر پوری قدرت ہو دوسرے جس خیال کو وہ ادا کرنا چاہتا ہے وہ ہمارے ذہن میں اس قدر صاف اور روشن ہو اور اس کا ہر پہلو اس قدر رچا ہوا ہو کہ جب ہم لکھنے بیٹھیں تو صفحۂ کاغذ پر موتی کی طرح ڈھلکتا ہوا نظر آئے۔ جب خیال خود ہی ہمارے خیال میں سلجھا ہوا نہیں ہوتا تو بیان بھی مبہم اور تاریک ہوتا ہے اور اس وقت مشکل الفاظ اور پیچیدہ طرزِ بیان کی آڑ لینی پڑتی ہے۔ اس میں لفظ کے صحیح استعمال کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر ادیب کو یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ کون سا لفظ کب اور کہاں استعمال کیا جائے لفظ میں بڑی قوت ہے۔ صحیح لفظ صحیح مقام پر جادو کا اثر رکھتا ہے۔ بعض وقت اچھے اچھے ادیبوں کو لکھتے وقت صحیح لفظ نہ ملنے پر بڑی اُلجھن ہوتی ہے۔ ایک لفظ آتا ہے وہ اسے رد کر دیتا ہے۔ دوسرا آتا ہے اسے بھی ہٹا دیتا ہے تیسرا آتا ہے وہ بھی پسند نہیں آتا۔ آخر اسی ردّو بدل میں جب اسے صحیح لفظ مل جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے گھٹا میں سے چاند نکل آیا۔ جو اس گُر سے واقف نہیں اور صحیح لفظ کی قوت کو نہیں جانتے وہ اپنا مطلب ایچ پیچ اور ہیر پھیر سے کئی کئی جملوں میں ادا کرتے ہیں پھر بھی اس میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو صحیح لفظ صحیح مقام پر اپنی جادو بیانی سے پیدا کرتا ہے۔

ایک یہ بات بھی دماغوں میں سمائی ہوئی ہے کہ بڑے اور پُر شکوہ لفظوں میں زیادہ قوت

مولوی عبدالحق ...... آسان اُردو

ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خاص خاص موقعوں پر ان کی ضرورت ہوتی ہے لیکن عام طور پر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ شان و شوکت اور عظمت دکھانے کے لیے پُرشکوہ اور بڑے لفظوں کی ضرورت پڑتی ہے یا کبھی کبھی رعب ڈالنے اور مشیخت جتانے کے لیے بھی۔ لیکن اثر اور دل نشینی کے لیے آسان اور چھوٹے لفظ ہی کام آتے ہیں۔ بعض اوقات آسان اور چھوٹے لفظوں میں ایٹم بم کی سی قوت ہوتی ہے۔

ایک بار مولانا حالی کے پاس ایسی تحریر آئی جس میں بہت سے مشکل اور دقیق لفظ تھے اور عبارت بھی پیچیدہ تھی۔ فرمانے لگے کہ لوگ جیسے بولتے ہیں ویسے کیوں نہیں لکھتے۔ میں نے کہا کہ بولنے میں زبان کے سوا آدمی چشم ابرو ہاتھ کے اشارے اور چہرے کے تیور سے بھی کام لیتا ہے۔ لکھنے میں یہ میسّر نہیں اس لیے دقیق الفاظ اور پیچیدہ عبارت سے اس کمی کو پورا کرتا ہے۔ لیکن اگر زبان پر قدرت ہو اور لفظ کا صحیح استعمال معلوم ہو تو وہ گفتگو سے زیادہ تحریر میں حسن پیدا کر سکتا ہے۔

مشکل پسندی کا ایک دور لکھنؤ کا تھا۔ جس کا میں اشارتاً ذکر کر چکا ہوں۔ دوسرا دور اس وقت آیا جب مولانا ابو الکلام آزاد کا 'الہلال' افق صحافت پر نمودار ہوا۔ اور اس کے بعد انہوں نے 'البلاغ' بھاری فرمایا۔ حضرت نے صحافت کا رنگ ہی بدل دیا۔ بدل کیا دیا بگاڑ دیا۔ قیمت یا چندے کے لیے 'بدلِ اشتراک' ایڈیٹر کے لیے 'مدیر مسول' اور اسی قسم کی ماہوار اور غیر ضروری ترکیبیں رائج فرمائیں۔ انتہا یہ ہے کہ اپنے اسم شریف کو بھی عربی لباس پہنا دیا۔ یعنی 'احمد المکنی بہ ابی الکلام الدہلوی'۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ اُردو ہے یا اُردو دشمنی اسے زیادہ سے زیادہ اُردو نما عربی یا عربی نما اُردو کہہ سکتے ہیں۔ نقالی یا تقلید انسان کی فطرت میں ہے۔ بعض اخبار والے اور دوسرے لکھنے والے اس رنگ کو لے اُڑے اور عجیب و غریب واہی تباہی الفاظ اور ترکیبیں لکھنی شروع کر دی۔ ایک ان کے مقلد اخبار کے ایڈیٹر نے اپنا ایک مقالہ اس طرح شروع کیا۔

''بعد از انقضائے دہور و مرور ایام و ہشور'' اس قسم کی تحریروں کو پڑھ کر بہت افسوس ہوتا تھا لیکن یہ بہروپیا پن زیادہ دیر تک نہ رہا۔ یہ چیز چلنے والی نہ تھی نہ چلی اور خدا کا شکر ہے نہ چلی۔

* * *

مولوی عبدالحق ...... آسان اُردو

نزلہ کہیں جسے!

م ن عشرت

کوئی ایسی زیادہ طبیعت خراب بھی نہ تھی، بس ذرا نزلہ ہو گیا تھا، جو دو ایک دن بھوکے رہنے اور بستر میں منہ لپیٹے بے حس و حرکت پڑے رہنے سے جا سکتا تھا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ دو چار دن بھوسی اونٹا کر پی... نہیں گیا۔ پھر کچھ دن جوشاندے بھی پیے، لیکن جب تک پورا پرہیز نہ کیا جاتا تو نزلے کو کیا پڑی تھی کہ چلا جاتا۔ کہتے ہیں۔ "Feed the fever' starve the cold!'' لیکن یہاں معاملہ ہی اُلٹا تھا۔ نزلے کو بھوکا مارنے کی بجائے، اچھے اچھے کھانوں سے اُس کی خوب خاطر مدارت کی جا رہی تھی۔ سوچا، چلو ڈاکٹر چکرم ہی سے دو ایک روپے کا مکسچر لے کر نزلے سے پیچھا چھڑائیں۔ یہ تو معلوم ہی تھا کہ ڈاکٹر صاحب مکسچر سے پہلے لیکچر کافی مقدار میں پلاتے ہیں، اس لیے ڈرتے ڈرتے عرض حال کیا۔ فرماتے ہیں۔

"ہوں! تو جناب کو پندرہ بیس دن سے نزلہ ہے۔ کچھ دن اور انتظار فرماتے تو چار آدمی آپ کو اُٹھا کر میانی صاحب لے جاتے اور آپ کو یہاں آنے کی زحمت نہیں اُٹھانا پڑتی۔"

کھسیانی ہنسی ہنسنے کے علاوہ اور کوئی جواب ہی بن نہ پڑا۔

"کیا دوا کھاتے رہے آج تک... اور کھانا کیا کھایا؟"

"کھانا تو وہی معمولی، جو گھر میں سب کے لیے پکتا ہے، اور دوا میں بھوسی اور جوشاندہ پیا۔"

"یہی تو رونا ہے کہ پہلے سے ڈاکٹروں کے پاس نہیں آتے الم غلم کھائے پیے چلے جاتے ہیں، جب قریب المرگ ہوتے ہیں تو آتے ہیں۔ پھر اگر مر جائیں تو ایک ایک سے کہتے پھرتے ہیں کہ میں فلاں ڈاکٹر کی دوا سے مرا ہوں!"

ہاتھ سے نبض ٹٹولی اور سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکن محسوس کی اور جب یقین ہو گیا کہ ابھی موت واقع نہیں ہوئی ہے تو میں نے ہمت کر کے کہا،

"ڈاکٹر صاحب ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"ہوں! ابھی معلوم ہو جاتا ہے، ذرا قمیص اُٹھائیے۔" اور اسٹیتھو اسکوپ سے سینے اور پیٹھ کا معائنہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی شہرت کا اتنا رعب طاری تھا کہ اُن کے ایک ایک لفظ کو پتھر کی لکیر سمجھنے کو جی چاہنے لگا۔

"آپ کہتے ہیں کچھ ہوا ہی نہیں، یہاں پانی سر تک پہنچ گیا ہے۔"

ہاتھ سر پر پھیرا تو بال خشک تھے، بڑا تعجب ہوا۔

"سردی سے آپ کا سینہ بُری طرح جکڑا ہوا ہے، سانس رُک رُک کر آ رہا ہے۔ تھوڑی دیر اور نہ آتے تو بالکل رُک جاتا۔ پھیپھڑوں کی حالت اتنی خراب ہے کہ ٹی بی کی ساتویں اسٹیج میں داخل ہو چکے ہیں آپ۔"

کلیجہ دھک سے رہ گیا، لیکن یہ اطمینان تھا کہ سانس بالکل سے رُکا نہیں ہے۔

"ذرا حلق دکھائیے۔" حلق میں لوہے کا ایک اوزار اور بیٹری سے روشنی ڈالتے ہوئے بولے، "زبان نکالیے اور آ۔ آ، بولیے۔" زبان نکال کر آ۔ آ، بولا گیا۔ حلق دبا کر دیکھتے ہوئے کہا، "ٹانسلز بڑھ گئے ہیں آپریشن کروانا پڑے گا۔ ایکسرے بھی ہوگا۔ ذرا آنکھیں دکھائیے۔"

"جی؟ آنکھیں دکھاؤں؟"

"ہاں ہاں، آنکھیں دکھائیے، نزلہ آنکھوں میں اُتر آیا تو بینائی جاتی رہے گی۔"

آنکھیں دکھائی گئیں۔

"اُف آپ کی دونوں آنکھوں کی بینائی تو کب کی ختم ہو چکی، کس بُری طرح آنکھوں سے نزلہ بہہ رہا ہے۔ اگر نزلہ اچھا ہو گیا، تب بھی عینک ضرور بنوانی پڑے گی۔" نسخہ لکھتے ہوئے، "کیا نام ہے؟"

"میرا نام ڈاکٹر صاحب...؟"

"جی آپ ہی کا نام پوچھ رہا ہوں، اپنا نام تو مجھے پہلے ہی معلوم ہے۔"

"رمضان علی۔"

"والد کا نام عید محمد؟"

"جی ہاں۔"

”دراصل آپ لوگ حکیموں کے چکر میں ایسے پھنسے ہیں کہ اس سے نکلنا بڑا مشکل ہے۔ ایک تو دو چار آنے کے جوشاندے میں سستے چھوٹ جاتے ہیں، دوسرے...“

”جی وہ جوشاندے کے ساتھ لعوق سپتاں بھی...“

”ہاں، میرا مطلب بھی یہی ہے کہ حکیموں کی ان میٹھی معجونوں اور مربوں پر آپ لوگ اس طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں، جیسے شیرے پر مکھی۔ حکیموں کے پاس اب رکھا ہی کیا ہے میرے بھائی۔“

ٹی بی، آپریشن، ایکسرے اور آنکھیں جاتی رہنے کے خوف سے سانس اور نبض رکنا تو درکنار اور تیز تیز چلنے لگے۔

”آپ لوگ ان باتوں کو اہمیت نہیں دیتے لیکن یقین کیجیے اگر آپ کل میرے پاس آتے تو میں آپ کو دیکھنے کی بجائے ایمبولینس منگوا کر آپ کو سیدھا سول اسپتال بھیج دیتا۔“

”لیکن کل تو میری طبیعت اتنی خراب نہیں تھی۔“

”گزشتہ کل نہیں، حضرت آئندہ کل، نوٹ کر کے رکھیے رات بارہ بجتے ہی آپ ٹی بی کی آخری اسٹیج میں داخل ہونے والے ہیں۔ کیس اتنا سیریس ہونے پر کوئی ڈاکٹر آپ کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔“

”تو ڈاکٹر صاحب فوراً میری جان بچائیے نا۔“

”ہاں یہ لیجیے یہ نسخہ میں نے لکھ دیا ہے، ابھی ایک انجکشن لگے گا اور...“ معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے، ”کام کیا کرتے ہیں آپ؟“

”میں ڈاکٹر صاحب؟ آپ مجھے نہیں جانتے؟ میں دیوالیہ بینک میں کیش کلرک ہوں۔“

اوہ کیش کلرک مسٹر رمضان، بہت خوب بہت خوب۔ ہاں تو کیش کلرک مسٹر رمضان آپ ایسا کریں کہ آج شام ہی ڈاکٹر پلپلی سے اپنے سینے کا ایکسرے کروا کر کل صبح رپورٹ لیتے آئیں۔ میں نے ان کے نام یہ پرچہ لکھ دیا ہے، یہ لیتے جائیں، آپ سے دو سو روپے سے زیادہ چارج نہیں کریں گے۔ اور یہ دوسرا پرچہ ڈاکٹر تگڑم کے نام ہے۔ یہ ماہر حلقیات ہیں، ان سے حلق کا ایکسرے کروا کر وہ رپورٹ بھی لیتے آئیں۔ پانچ سو روپے ان کی فیس ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ اور یہ کچھ دوائیں آپ کو بازار سے خریدنا ہیں۔ ان میں ایک شربت ہے، جو رات میں تین بار، نیند

آجانے کے دو منٹ بعد دو چمچے لے لیں۔ دوسری گولیاں ہیں۔ چار گولیاں نیند میں خراٹوں کے درمیان ٹھنڈے پانی سے غرارے کرنے کے بعد حلق میں ڈالے بغیر نگل لیں۔“

سر میں ایک زوردار چکر سا محسوس ہوا۔ دل کو سمجھایا کہ یہ سب نزلے کا اثر ہے، ایکسرے اور دواؤں کی بھاری قیمت سے اس چکر کا کوئی تعلق نہیں۔

”سامنے والی کھڑکی پر کیشیر کو ساڑھے پانچ سو روپے دے دیں۔ پھر انجکشن لگوا لیں اور مکسچر بھی لیتے جائیں۔ یہ یاد رکھیں کہ بیس انجکشن کا پورا کورس لگوانا ہوگا اور بیس ہی دن یہ مکسچر بھی پینا ہوگا، اس کے بعد دوبارہ ایکسرے وغیرہ ہوگا۔ ایک بھی ناغہ ہوگیا تو اقدامِ خودکشی کے الزام میں پکڑے جانے کی صورت میں نتائج کے آپ خود ذمّے دار ہوں گے۔“

”شکریہ“ کہہ کر نسخہ لیا اور بھاگنے کی فکر میں تھا کہ ڈاکٹر نے ہاتھ پکڑ لیا۔

”اور سنیے، یہ تین پرچیاں ہیں۔ آپ کا خون، بلغم اور پیشاب ٹیسٹ ہوگا، سو سو روپے ان میں سے ہر ایک کی فیس ہوگی، جو اُن تین مختلف کھڑکیوں پر جمع کروا دیں اور ساتھ ہی خون، بلغم اور پیشاب کا نمونہ بھی وہیں دے دیں۔“

دل میں آیا، جوتے ہاتھ میں اُٹھا، یہ کہتا ہوا بھاگ نکلوں کہ ڈاکٹر صاحب کیش کلرک بھی بے چارے عام کلرکوں کی طرح کلرک ہی ہوتے ہیں، لیکن ضمیر نے ملامت کی کہ ابھی تو دودھ والے کا گزشتہ ماہ کا بل ادا نہیں کیا ہے اور پوری رقم اِس وقت جیب میں موجود ہے، پھر یہ بزدلی کیسی۔ کیوں نہیں لگاتے دواؤں پر ساری رقم۔ پھر مسلسل بیس دن یہ مہنگا علاج جاری رکھنے کا خیال آتے ہی مستقبل کی کھڑکی سے جھانکا تو وہاں اندھیرا گھپ۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ کلینک کی گیلری میں اچھا خاصا اندھیرا تھا، ارادہ کیا کہ اس اندھیرے سے جائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس میں غائب ہو جانا چاہیے۔ ابھی گیلری کی طرف مڑا ہی تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے ٹوک دیا، ”ہوں ہوں، اِدھر اُدھر۔ پیسے اِدھر دیجیے یہ تو باہر جانے کا راستہ ہے۔“

”جی، وہ بات یہ ہے ڈاکٹر صاحب کہ پیسے کچھ کم پڑ رہے ہیں، سوچا گھر سے اور لے آؤں۔“

”کوئی بات نہیں، پیسے پھر آ جائیں گے۔“

”جی نہیں، میں ادھار کا بالکل قائل نہیں۔“

"اچھا اچھا جیسی آپ کی مرضی، پیسے لے آئیے، کلینک رات بارہ بجے تک کھلا رہے گا۔"

کلینک سے نکل کر سڑک پر آیا تو دل، دماغ، آنکھیں اور پھیپھڑے پھر سے اپنا اپنا کام درست حالت میں کرنے لگے۔

بس ذرا خفیف سا نزلہ تھا۔ راستہ میں حکیم منقہ کا دواخانہ پڑتا تھا۔ ڈاکٹروں کو تو حکیموں سے خدا واسطے کا بیر ہوتا ہے وہ لاکھ حکیموں کی بُرائی کریں، لیکن آڑے وقت میں وہی غریبوں کے کام آتے ہیں۔ پکا ارادہ کرلیا کہ اب تو حکیم منقہ ہی کا علاج کرواؤں گا۔ اور پھر حکیم منقہ ٹھہرے خاندانی حکیم۔ ایک تخت پر گاؤ تکیہ سے پیٹھ لگائے گلے میں پان کی گلوری اور منہ میں حقے کی نَے دبائے، ایک شفیق بزرگ کی طرح حال سنتے اور نسخہ حافظ جی کو لکھوا دیتے تھے۔ حافظ جی نسخے باندھا کرتے تھے۔ ڈاکٹر چکرم کی طرح حکیم منقہ بھی علاج تجویز کرنے سے پہلے اس کی تمہید باندھنے کے کافی عادی تھے۔ لیکن ان کے دواخانے کا خالص مشرقی ماحول کچھ اتنا پُر سکون اور سہانا تھا کہ جی چاہتا تھا ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جائیں اور آنولہ وسیب کے مربوں اور شربت فرحت افزاء پر زندگی گزار دیں۔ دیکھتے ہی پوچھا، "کہیے برخوردار! کیسے آنا ہوا۔"

"حکیم صاحب پندرہ بیس دن سے نزلہ ہو رہا ہے، جاتا ہی نہیں۔"

"جاتا ہی نہیں، یہ کیا کہا آپ نے۔ یعنی نزلہ اور نہ جائے۔ یہ مجال نزلے کی۔ ارے میاں نزلہ تو ہوتا ہی جانے کے لیے ہے۔ یوں جائے گا، جیسے تھا ہی نہیں۔"

"بس اسی لیے حاضر ہوا ہوں۔"

"حاضری تو پہلے ڈاکٹروں کی خدمت میں دی ہوگی آپ نے، ورنہ پندرہ بیس دن دیر کرکے آنا کیا معنی۔"

"جی ذرا یوں ہی بس صرف ایک بار وہ ڈاکٹر چکرم..."

"میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ جب تک ہزار دو ہزار روپے ڈاکٹروں پر سے وار نہ دیں اور انجکشنوں سے جسم چھلنی نہ کروالیں، آپ لوگوں کو چین ہی نہیں آتا۔ شفا ہو یا نہ ہو، علاج ضرور فیشن ایبل ہونا چاہیے۔ لطف یہ کہ شفا کے لیے پھر حکیموں کے پاس ہی آنا پڑتا ہے۔"

"جی بس کیا بتاؤں وہ..."

"میاں بس رہنے دو، میں ان ڈاکٹروں کے ہتھکنڈے خوب جانتا ہوں۔ دواؤں اور

انجکشنوں کے فوری اثر سے وہ مرض کو وقتی طور پر دبا تو سکتے ہیں، جڑ سے نہیں اُکھاڑ سکتے۔"

"آپ نے بالکل درست فرمایا، لیکن میں نے تو ڈاکٹر..."

"اور پھر اِن دواؤں کی گرمی بڑھاپے میں کسی خطرناک بیماری کی شکل میں جسم سے پھوٹتی ہے۔ آیا خیال شریف میں؟"

"جی ہاں۔"

"اور یہ جو بھاری تعداد میں گولیاں دی جاتی ہیں، اُن کا سارا سفوف گردوں میں جم کر پتھری کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بس پھر ڈاکٹروں کی چاندی ہی چاندی ہے۔ ارے میاں کیا سمجھے۔"

"جی آپ نے ٹھیک فرمایا کہ پھر ڈاکٹروں کی چاندی ہی چاندی ہے۔"

"ہاں، لیکن وہ بے چارے بھی کیا کریں۔ اُن کے پاس وہ علم ہی نہیں ہے، جو خاندانی حکیموں کے سینہ بہ سینہ چلا آ رہا ہے... نزلے کے ساتھ کھانسی بھی ہے؟"

"جی وہ تو ہے۔"

"بلغم آتا ہے؟"

"بلغم بھی آتا ہے۔"

"حافظ جی! انہیں پندرہ تولے سفوف جلاب جمال گوٹے والا باندھ دیں۔"

"لیکن حکیم صاحب میرا معدہ تو بالکل ٹھیک ہے۔"

"میاں جاگتے میں آپ کھانستے ہیں، تو بلغم تھوک دیتے ہیں، لیکن سوتے میں یا خواب دیکھنے کے دوران کھانستے ہیں تو بلغم معدہ میں اُتر جاتا ہے، پہلے اس کی صفائی بہت ضروری ہے۔"

"حکیم صاحب! میری تو ایک ہی دست میں جان آدھی رہ جاتی ہے، پندرہ تولہ جمال گوٹہ لینے کے بعد شاید ہی زندہ رہ سکوں۔"

"کیسے زندہ نہ رہیں گے، آپ کے فرشتوں کو بھی زندہ رہنا پڑے گا۔ ذرا نبض دکھایئے (نبض دکھائی تو چونک اُٹھے اور بولے) "ہیں! ارے میاں نزلہ تو آپ کو پندرہ بیس سال پرانا ہے اور آپ کہتے ہیں پندرہ بیس دن سے ہے۔"

"جی میں نے کبھی پہلے تو محسوس نہیں کیا۔"

"نہیں کیا ہو گا، لیکن آپ کے سفید بال اس بات کی گواہی دے رہے ہیں۔"

''میرے سفید بال حکیم صاحب؟''

''اور کیا! آپ کا سارا سر سفید ہو رہا ہے یہ بال آپ نے دھوپ میں تو سفید نہیں کیے ہیں نا؟''

''جی بالکل نہیں۔''

''بس تو یہ پُرانے نزلے کا فتور ہے، ورنہ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے کہ یوں سارا سر سفید ہو جائے۔''

''مجھے خوب یاد ہے میرے سر میں صرف دو بال سفید تھے۔ حکیم صاحب کی زبانی سارا سر سفید ہونے کا سنا تو اوسان جاتے رہے کہ خدایا گھر سے یہاں پہنچتے پہنچتے صرف ایک گھنٹے میں بالوں کے ساتھ یہ کیا ٹریجڈی ہو گئی۔

''لیکن حکیم صاحب میرے سر میں تو بس دو چار ہی دھولے ہیں۔''

''پُرانے نزلے سے آپ کی نظر بھی کافی کمزور ہو گئی ہے، اس لیے دھولے بال کالے نظر آتے ہیں۔ خیر فکر کی کوئی بات نہیں، اس کا بھی علاج ہو جائے گا۔ سرمۂ محافظِ بصر کی دو درجن شیشیاں استعمال کرو گے تو دن میں تارے تک دیکھنے لگو گے۔ ذرا آنکھیں دکھانا۔''

''جی!'' (آنکھیں دکھائی گئیں)۔

''میاں کس احمق نے کہہ دیا ہے کہ آپ کو پُرانا نزلہ ہے۔ آپ کو تو یرقان ہو گیا ہے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے آپ کے بدن میں۔ حافظ جی! سفوف جلاب اور سرمۂ محافظِ بصر دو درجن کے ساتھ چار بوتل شربتِ فولادِ اصلی شیر مارکہ، چالیس تولہ خمیرہ مروارید، بیس تولہ خمیرہ ابریشم حکیم ارشد والا، مربہ آنولہ ایک سیر، مربہ سیب ڈیڑھ سیر، سونے کے ورق پچاس عدد، چاندی کے دو سو، حب قسطوار پانسو یہ ایک ہفتہ کا نسخہ ہے، چھ ماہ لگ کے علاج کرو گے تو پُرانے سے پُرانا نزلہ جڑ سے جاتا رہے گا۔''

''مگر حکیم صاحب آپ نے تو ابھی فرمایا کہ مجھے پُرانا نزلہ کس احمق نے بتا دیا پھر یہ نزلہ کی دوا...''

''کچھ کچھ آثار آنتوں کی دِق کے بھی ہیں، وہ حب قسطوار سے رفع ہو جائیں گے۔ پھیپھڑے بالکل ٹھیک ہیں، لیکن دل اور جگر پر ورم ہے اور تلی اور گردوں نے کام کرنا بالکل بند کر دیا

ہے، اس کے لیے خمیرے اکسیر ہیں، یرقان شربتِ فولاد سے جاتا رہے گا۔"

"جی۔"

"دو چار دن اور ڈاکٹروں کے چکر میں پھنسے رہتے تو کب کا کام تمام ہو چکا ہوتا۔"

حافظ جی نے قیمت کا حساب لگا کر پوچھا، "دو ہزار روپے بنتے ہیں کہیے تو نسخہ باندھ دوں۔"

"ہاں ہاں باندھ دیجیے۔" حکیم صاحب نے اُگالدان منہ تک لے جا کر اُس میں پان کی پیک تھوکتے ہوئے فرمایا۔

"تھوڑی دیر کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ واقعی بینائی جاتی رہی، دل اور جگر پر ورم ہے، تلی اور گردوں نے کام کرنا بند کر دیا ہے اور پھیپھڑے بالکل ٹھیک ہیں۔ جھوٹ کو مدد کے لیے پکارا گیا۔

"لیکن حکیم صاحب نزلہ تو میری بیوی کو ہوا ہے، اُس کی دوا لینے کے لیے حاضر ہوا تھا۔"

"کوئی مضائقہ نہیں، یہی دوائیں وہ بھی بے کھٹکے استعمال کر سکتی ہیں۔"

"میرا خیال تھا میں اپنی بیوی کو یہاں لے آتا، اُسے اچھی طرح دیکھنے کے بعد آپ اس نسخے میں پندرہ بیس دواؤں کا اضافہ کر دیتے تو زیادہ اچھا تھا۔"

"بہت خوب، مگر اُن کو لے کر جلدی آئیے گا جمعہ کی وجہ سے دواخانہ بارہ بجے بند ہو جائے گا۔"

"جی بس ابھی حاضر ہوا اُلٹے پاؤں۔"

"اپنی قلابازیوں پر پشیمان ہونے سے پہلے پنواڑی کے آئینے میں دیکھا تو اپنا سر نہیں، بلکہ حکیم جی کا جھوٹ، سفید نکلا۔ دراصل غلطی میری تھی۔ گھر کے نیچے ہی بے چارا جنگل رام ہومیو پیتھ دن بھر بیٹھا مکھیاں مارتا رہتا ہے، میں نے اس غریب کو آج تک موقع ہی نہیں دیا کہ میرا علاج کرے۔ سنا تھا کہ وہ ہائی سے ہائی پوٹینسی کی دوا صرف دو چار آنے لے کر دے دیتا ہے اور بڑے سے بڑا پرانے سے پرانا مرض، دو دن کی دوا سے چلا جاتا ہے۔ میں گردن جھکائے اس کے دواخانے میں داخل ہوا تو اُس غریب نے کچھ اِس تپاک سے میرا خیر مقدم کیا کہ میں زمین میں گڑنے سے بال بال بچا۔

"آؤ بھئی رمضان، عید کا چاند ہو گئے تم تو، آج کدھر راستہ بھول گئے۔"

"جنگل رام جی بس کیا بتاؤں، میری مت ماری گئی تھی کہ ایک معمولی نزلے کے علاج کے لیے خواہ مخواہ بڑے بڑے حکیم ڈاکٹروں کے دَروں کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔"

"کتنے دن سے ہے نزلہ؟ کسی بچے کو بھیج کر دوا منگوا لیتے۔"

"یہی کوئی پندرہ بیس دن سے۔"

"فکر کی کوئی بات نہیں۔ نزلے کی ایک تیر بہدف دوا، جرمنی نے حال ہی میں ایجاد کی ہے، ابھی ابھی پارسل آیا ہے، اصلی دواؤں کا۔ دراصل ایسی دوا ہومیوپیتھی میں پچھلے ایک سو تیرہ برس پانچ مہینے 23 دن سے ایجاد نہیں ہو سکی تھی، اب جا کے ہوئی ہے۔ میں پرائس لسٹ دیکھ رہا تھا کہ آپ آ گئے۔ اس کے اَن گنت فائدوں کے پیشِ نظر اِس کے مکمل کورس کی قیمت، صرف پندرہ سو روپے، کچھ زیادہ نہیں ہے۔ میرا دل بھی کہتا ہے کہ نزلہ کو یہی ایک دوا فائدہ کرے گی، اس کے علاوہ دنیا میں نزلہ کا کوئی علاج نہیں۔"

"جی! پندرہ سو روپے!" جنگل رام جی کے دواخانے میں مجھے ڈاکٹروں کی طرح تیر و نشتر قسم کے کوئی اوزار تو نظر نہیں آئے، پھر بھی وہ گویا میری کھال اُتارنے کے لیے دانت تیز کر رہے تھے۔

"جی ہاں، ویسے اس سے سستی دوا بھی ہے میرے پاس، لیکن اس سے آرام کی بجائے تکلیف بڑھ جانے کا خطرہ ہے اور پھر وہ ابھی تیار بھی نہیں۔" "اچھا تو جب تیار ہو جائے تو مجھے وہی بھجوا دیں میں چلتا ہوں۔"

میں سر پہ پاؤں رکھے بھاگا جا رہا تھا کہ ایک موڑ پر پنڈت ہزاری پرشاد سے ٹکرا گیا۔ ابا جی کے دوست ہیں اور بڑے سادھو منش انسان ہیں۔ پوجا پاٹ ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں۔ کوئی دُکھ، بیماری ہو جائے تو دوسری ٹانگ بھی زمین سے اُٹھا کر کچھ ایسی ورزش کرتے ہیں کہ فوراً ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی بولے،

"ارے بھئی خوب ملے رمضان۔ سنا ہے تمہیں نزلہ ہو گیا ہے۔"

"جی ہو تو گیا ہے پنڈت کاکا۔"

"تو بچے حکیم ڈاکٹروں کے چکروں میں کیوں پڑے ہو۔ صبح اُٹھتے ہی اُلٹ آسن کیوں نہیں کرتے۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری۔ یہی کوئی دس پندرہ دن میں رنگ چوکھا آ جائے گا۔"

"یہ اُلٹ آسن کیا دوا ہوتی ہے کاکا جی؟"

"دوا نہیں پگلے، یہ ایک طرح کی ورزش ہوتی ہے۔ صبح اُٹھتے ہی سر کے بَل بلا سہارے دو تین گھنٹے سانس روکے کھڑے رہو اور بس۔ جسم کا سارا خون سر میں جمع ہو جائے گا اور اِس کی حرارت سے نزلہ وزلہ سب دُم دبا کر بھاگ جائے گا۔ وعدہ کرو، کرو گے نا اُلٹ آسن، کل صبح سے ہی۔"

"جی ضرور کروں گا۔" لیکن دل نے کہا واہ پنڈت کا کا! خودکشی کرنے کا کتنا آسان طریقہ بتایا ہے، آپ نے۔

گھر پہنچا تو دیکھا کہ سائیں جی کے تکیے کا مجاور گلو دروازے پر کھڑا ہے۔ دیکھتے ہی بولا،

"واہ بھائی رمضان خوب انتظار کروایا۔ اِدھر سے گزرا تو بھابی نے بتایا کہ تمہارا نزلہ بگڑ گیا ہے۔ برگد والے پیر جی آئے ہوئے ہیں، شام کو تکیے آ جاؤ تو اُن سے تعویذ لے دوں۔"

"شام تک زندہ رہا تو ضرور آؤں گا۔"

"ہاں ضرور آنا۔ اور پیر جی کے لیے سوا پانچ سو روپے نذرانے کے، ایک کالا بکرا، ایک سفید مرغا، دس تولے اصلی زعفران اور ایک ولایتی چینی کی بڑی سفید پلیٹ لیتے آنا۔ مرغ کے خون میں زعفران گھول کر پلیٹ پر تعویذ لکھیں گے۔ صدقے کے لیے بکرا ذبح کر کے مسکین مریدوں کو قورمہ کھلائیں گے۔ بھولنا مت۔"

اور نہ جانے کتنی دیر تک وہ کیا کیا کہتا رہا۔ میں جو بھاگ کر بستر میں گھسا تو پورے تین دن بعد نکلا۔ خوب آرام کیا، خوب بھوک کو بے موت مارا اور مسلسل تین دن تک آٹے کی بھوسی میں سیاہ مرچ اور ادرک جوش دے کر پیتا رہا۔ چوتھے دن نزلے کا ذائقہ ہی بھول گیا اور اَب تک ہزار بار کوشش کر چکا ہوں، یاد ہی نہیں آتا۔

* *

اندر کی ٹوٹ پھوٹ

منصور قیصر

بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک تحریر میری نظر سے گزری۔ وہ کچھ یوں تھی۔ “لاشعور کی بنیادی اکائی ریزہ ریزہ ہو گئی ہے اس لیے یہ ریزے ہمیں مختلف شکلوں میں نظر آتے ہیں، لیکن مختلف ہونے کے باوجود اِن ریزوں کی کوئی شناخت نہیں بنی۔ شناخت بننے ہی نہیں دی گئی تاکہ ان ریزوں یا حصوں کی مجرد تخصیص باقی نہ رہے۔”

میں نے بڑی دیر تک سر کھپایا کہ اس تحریر میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے سمجھنے کی کوشش کروں۔ اپنے لاشعور کو ٹھوکے مار مار کر شعور کی طرف دھکیلا بھی، لیکن شعور نے لاشعور کی ریزہ ریزہ اکائی کو قبول کرنے سے ہی انکار کر دیا، میں بہت پریشان ہوا۔ پریشان ہو کر سوچا بھی لیکن ناخنِ عقل اتنے ترشے ہوئے تھے کہ کوششِ بسیار کے بعد بھی گتھی نہ سلجھ سکی۔ آخر میں نے تنگ آ کر اپنے ایک فلسفی دوست پروفیسر ابوالہول جدیدی کو یہ تحریر دکھائی اور اِس پر روشنی ڈالنے کی درخواست کی۔ پروفیسر جدیدی نے اس تحریر کو چشمہ لگا کر دائیں سے بائیں اور چشمہ اُتار کر بائیں سے دائیں طرف پڑھا۔ پھر ایک لاشعوری قہقہہ لگا کر کہنے لگا، “تم تو بالکل غبی ہو۔ اس تحریر کا مطلب یہ ہے کہ سائنسی ایجادات نے اعتقادات کے پہاڑ کو رائی بنا دیا ہے، جس کی وجہ سے انسان اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اور یہی اس عہد کا المیہ ہے۔”

“کیا واقعی یہی بات ہے؟” میرے اس استفسار پر جب اس نے اپنا کدو ایسا سر اثبات میں ہلایا تو میں نے کہا، “اگر یہی بات ہے تو پھر دوستوفسکی تمہارے اور میرے پیدا ہونے سے کئی برس پہلے کہہ چکا ہے کہ “میں ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہوں اور میری ایک ذات دوسری ذات کے برابر کھڑی ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ یہ ہمارے عہد کا المیہ ہے۔”

اس پر ابوالہول جدیدی چڑ کر بولا، “تم تو نرے جاہل ہو۔ تم میں تو حس مدرکہ بھی ختم ہو چکی

ہے۔ تم میں تو احساس کی قوت ہی نہیں رہی ورنہ تم محسوس کرتے کہ ہم سب اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں۔" خدا گواہ ہے کہ پروفیسر کی یہ بات سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ میں اس قدر خوفزدہ ہوگیا کہ اپنے یار جدیدی کے سامنے ہی اپنے تمام عضلات کو ٹٹولنے اور اعصاب کا معائنہ کرنے لگا۔ دل کی دھڑکنوں کو گھڑی دیکھ کر گننے لگا۔ بظاہر تو مجھے اپنا آپ چنگا بھلا نظر آیا مگر پروفیسر ابوالہول کی منطق کو جھٹلانے کی ہمت نہ ہوئی اور واقعی یقین کرلیا کہ میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں اس موٹر کی طرح ہوں جس کا انجن تو ورکشاپ میں مرمت کے لیے گیا ہوا ہو پر خود سڑکوں پر دوڑتی پھرتی ہو۔ مجھے اپنا پروفیسر دوست بھی یوں نظر آنے لگا، جیسے وہ بھی دو عمودی حصوں میں بٹ گیا ہو اور اُس کی حالت یوں ہوگئی ہو کہ آدھا دھڑ مغرب اور آدھا دھڑ مشرق کی طرف ہو۔ وہ سگار کا کش منہ سے لیتا ہو اور دھواں نیچے سے خارج ہوتا ہو۔ مجھے اپنی حالت بھی ایضاً ہی معلوم ہونے لگی۔

میں اپنی شخصیت کا ملبا اُٹھا کر اپنے گھر میں لے آیا اور پلنگ پر ڈھیر کردیا۔ مجھے اپنے زمانۂ طالب علمی کا پسندیدہ گیت یاد آنے لگا کہ:

اِک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے
کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

مگر اُس وقت میرا دل تو سلامت تھا، صرف میری ذات (ممکن ہے بدذات ہو) کے ٹکڑے ہزار ہو چکے تھے۔ میں اپنے بوجھل خیالوں تلے اتنا دب گیا جیسے میں نے بھنگ پی رکھی ہو۔ بڑی مشکل سے اُٹھ کر کمرے میں لگے ہوئے اس کیلنڈر کو اُلٹا کردیا جس پر لکھا تھا۔ "ہمتِ مرداں مددِ خدا" میں نے سوچا جب مرد ہی مُردے ہوگئے ہیں تو پھر ہمت کہاں سے آئے گی؟ وہ تو راشن کارڈ پر بھی نہیں ملے گی۔ میں پر سلے کی وہ میوزک کمپوزیشن بن چکا تھا، جو زندہ لاشوں پر نوحہ کرتی ہے۔

میں اپنی سوچوں میں گُم تھا کہ میری پیاری زوجہ نے آ کر میرا شانہ ہلایا اور شانہ بشانہ ہوکر کھرج میں بولی، "صبح سے کئی بار کہہ چکی ہوں کہ جا کر گاجریں لادو۔ گجریلے کی نیاز دینی ہے ایک تم ہو کہ سنتے ہی نہیں۔"

میں نے ادھوری آنکھیں کھول کر جواب دیا، "مائی ڈیئر زوجہ! میں کیسے سنوں؟ میں تو اندر

سے ٹوٹ پھوٹ چکا ہوں۔ تم بھی اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکی ہو۔ پورا سماج اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔''

''ٹوٹیں میرے دشمن، پھوٹیں میری ساس کے بھاگ، میری تو جوتی بھی نہیں ٹوٹتی۔'' میں نے اپنا سر سہلاتے ہوئے کہا، ''اے قابلِ احترام خاتون! مجھے تنگ نہ کر۔ مجھے آج یہ معلوم کر کے بے حد صدمہ ہوا ہے کہ میری ذات کئی حصوں میں بٹ چکی ہے۔''

میری یہ باتیں دروازے میں کھڑے ابا جان بھی سن رہے تھے۔ وہ وہیں سے بجلی کی طرح کڑکے، ''اوئے بدذات! اس کا مطلب یہ ہے تم دوغلے ہو گئے ہو۔ تمہارا کسی چیز پر اعتماد نہیں رہا کل کلاں یہ بھی کہو گے کہ میں تمہارا باپ نہیں ہوں۔''

ابا جی کی گھن گرج سن کر میری ذات کی پہاڑی سے لڑھکتے ہوئے پتھر سہم کر اپنی جگہ ہی رُک گئے۔ میں دھیمی آواز میں بولا، ''ابا جی! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ پروفیسر ابوالہول کہہ رہا تھا کہ انسان کے اندر اور باہر کی دنیا میں صدیوں کا فاصلہ پیدا ہو چکا ہے اور اَب یہ فاصلہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔''

''فوراً سبزی منڈی چلے جاؤ اور دس کلو گاجریں لے کر آؤ۔ سارا فاصلہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔'' ابا جان نے 'ہمتِ مرداں مددِ خدا' والا کیلنڈر سیدھا کرتے ہوئے حکم دیا۔ وہ کیلنڈر انہوں نے ہی خرید کر کمرے میں آویزاں کیا تھا۔ ابا جی خود بھی ایک آؤٹ آف ڈیٹ کیلنڈر تھے۔

سبزی منڈی جاتے ہوئے راستے میں میرا لنگوٹیا یار گامی ٹوٹی مل گیا۔ ٹوٹی تو وہ اس لیے مشہور ہے کہ بچپن میں بے حد شرارتی تھا اور ماسٹر جی اسے شیطان کی ٹوٹی کہا کرتے تھے، مگر اصل وجہ یہ تھی کہ وہ سرکاری نلکوں کی ٹوٹیاں اُتارنے میں یدِطولیٰ رکھتا تھا۔ وہ آج کل پُرانے کوٹوں کا بیوپاری ہے۔ اس نے میرا حال چال پوچھا تو میں نے انتہائی تاسف سے کہا، ''گامی یار! کچھ نہ پوچھو۔ میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں۔'' اس نے مجھے نیچے سے اوپر دیکھتے ہوئے کہا، ''فٹے منہ تیرا۔ تم تو نئے ٹوٹہ چاول کی طرح پھولے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔''

''یہی تو اس دور کا المیہ ہے۔'' میں نے لمبی آہ بھر کر کہا۔

''کہیں دھندے میں تو ٹوٹ نہیں پڑ گئی۔'' گامی ٹوٹی نے میرے کان کو ٹونٹی کی طرح مروڑتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! مگر پروفیسر ابوالہول جدیدی نے بتایا ہے کہ یہ ٹوٹ پھوٹ کا عہد ہے کائنات میں ہر شخص ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ مایوسیوں کی چڑیلوں نے انسانوں کو اندر سے چاٹ لیا ہے۔"

"اندر سے چاٹ لیا ہے؟" اس نے تعجب سے پوچھا، "تو پھر انسان اپنے اندر سے بچے کیوں پیدا کر رہا ہے؟" میں ایک لمحہ کے لیے چونک گیا۔ واقعی بچے کی مسکراہٹ تو امید کی روشنی ہوتی ہے۔ وہ تو ماضی اور مستقبل کے درمیان قوس قزح کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن میں نے کہا، "بچے بھی تو اندھیروں میں جنم لے رہے ہیں۔ تمہیں نہیں معلوم یہ احساس کی بات ہے۔ ہم سب اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں۔"

"اچھا! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" وہ حیران ہو کر بولا۔

"وہ کیوں؟" میں نے کہا۔

"میں شخصیت کے سپیئر پارٹس کی دکان کھول لیتا۔ اوئے خانہ برانداز! ایسی باتیں مت کیا کر۔ تیرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں کچھ ان کا ہی خیال کر۔"

"وہ تو میرے تجریدی خیالوں کا سمبل بن گئے ہیں۔"

"پھر خصماں نوں کھا اور جا کر گاجریں خرید۔"

گاجریں تو میں خرید لایا، لیکن ذات کی ٹوٹ پھوٹ کے احساس نے مجھے اپنے آپ سے بیزار کر دیا۔ میری تمام امنگیں اور آرزوئیں ذہنی بوجھ تلے دب کر کانچ کی کرچیاں بن گئیں۔ میں اپنے آپ کو بیمار خیالوں کا کولڈ سٹوریج محسوس کرنے لگا۔ میری یہ حالت دیکھ کر میرے گھر والے پریشان ہو گئے۔ میرے ابا جان مجھے فوراً حکیم بقل بطورا کے پاس لے گئے۔ حکیم صاحب نے میرا معائنہ کرنے کے بعد خالص طبی زبان میں فرمایا، "صاحبزادے کو تبخیرِ معدہ کا عارضہ لاحق ہے شدتِ تبخیر نے اعصابی تشنج پیدا کر دیا ہے۔ مزاج بھی صفراوی معلوم ہوتا ہے۔ قلب کی ماہیت بھی معتدل نہیں۔ عضلات میں بھی انقباض ہے۔"

"گولی مارو جی" ابا جی نے تشخیص سے بیزار ہو کر کہا، "کوئی دوائی دیجیے۔"

حکیم صاحب نے جوارشِ جالینوس اور حبوبِ اقر قرا دیتے ہوئے ہدایت کی کہ "صبح و شام حبوب کو شیرِ نیم گرم کے ہمراہ کھانا ہے اور بوقتِ شب خوابی جوارش استعمال کرنی ہے۔ پانچ بار مسلسل رفعِ حاجت کے بعد تمام اعصابی تشنج اور عضلاتی انقباض دُور ہو جائے گا۔"

دوائی کے استعمال کے بعد پانچ بار تو کیا رفع حاجت کی لائن لگ گئی۔ میرے اندر جو کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا سب باہر نکل آیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ چیزیں جو میرے اندر صحیح سلامت تھیں وہ بھی ٹوٹ پھوٹ کر باہر آ گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے لوگ تو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں مگر میں ہاتھ میں لوٹا لے کر پیدا ہوا تھا۔

حکیم بقل بطورے کو کروڑ کروڑ صلواتیں سنائیں۔ جسمانی نقاہت نے ذہنی اضمحلال میں دو چند اضافہ کر دیا۔ اپنی قوت کو مجتمع کرنے کی بھی سکت نہ رہی۔ اندر کی شکست و ریخت اور بڑھ گئی۔ جو دوست عیادت کو آتے تو یوں لگتا جیسے وہ بھی میری طرح ٹوٹے پھوٹے ہوئے ہیں۔ ان کی باتیں بے رس، مردہ اور گلی ہوئی ہیں۔ مجھے ان سے بھی مایوسی ہونے لگی۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ پروفیسر ابوالہول جدیدی سے ملاقات ہو جائے مگر اس کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ غائب ہے۔ کافی جستجو کے بعد پتا چلا کہ اسے یونیسکو کا اسکالرشپ مل گیا ہے اور وہ ہوائی یونیورسٹی میں تہذیبی ہیجانات کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کرنے چلا گیا ہے۔ مجھے بڑا دکھ ہوا کہ میرا مسیحا تو تہذیبی ہیجانات کا علاج ہونولولو کے ساحلوں پر تانبے کی رنگ والی لڑکیوں کے سن باتھ میں تلاش کرے گا اور میں اپنے ہیجانات کو ختم کرنے کے لیے جوارشِ جالینوس کھا رہا ہوں۔ اس نے اپنی شکست و ریخت کا مداوا ڈاکٹر یونیسکو سے حاصل کر لیا تھا اور میرا معالج دکان پر بیٹھا تانبے کا کشتہ کھرل کر رہا ہے۔

ایک روز میرے ایک بزرگ استاد جن سے میں نے کبھی علم الکلام کا درس لیا تھا میری عیادت کے لیے آئے اور فرمانے لگے، ”مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج کو مسلسل دیکھا کرو۔“

”کیا اس طرح میرے اندر کی ٹوٹ پھوٹ ختم ہو جائے گی؟“ میں نے استفسار کیا۔

”ہاں“ وہ بولے اور پھر ایک کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھ کر کہنے لگے، ”اس عبارت کو جلی حروف سے لکھوا کر کمرے میں لٹکا دینا تمہیں جو خوف ہے، وہ ختم ہو جائے گا۔“ اُن کے جانے کے بعد میں نے کاغذ کھول کر دیکھا، اُس پر لکھا تھا۔ ”خدا اُس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتا، جسے خود اپنی حالت کے بدلنے کا خیال نہ ہو!“

❖ ❖

مکتوبِ خالصتان

منو بھائی

وجہ تسمیہ

(بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ یہ خالصتان، خالصوں یعنی کہ سکھوں کا ملک ہو، مگر یہ خالص لوگوں، خالص چیزوں اور خالص جذبوں کا ملک ہے۔ سوائے اس ملک کے نام 'خالصتان' کے، جو اُردو اور ہندی کی ملاوٹ سے بنا ہے، یہاں کسی چیز میں ملاوٹ نہیں ہوتی۔ یہ نام بھی ابھی حال ہی میں رکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے اس ملک کا کوئی نام نہیں تھا۔ یہ ایک بے آباد، ویران اور سنسان جزیرہ تھا۔ یہ آباد کیسے ہوا اور خالصتان کیوں کہلانے لگا، اس کا ذکر اِس کی تاریخ بیان کرتے وقت آئے گا)۔

تاریخ

بہت عرصہ ہوا ایک سرو قد، ایک حسینہ کی گھنی سیاہ زلفوں کے دام میں پھنس گیا۔ اُس کی نگاہوں کے تیر اُس کے جگر سے پار ہوئے۔ سرو قد، گھنی لانبی پلکوں، سیاہ زلفوں اور سرخ گالوں والی حسینہ بھی اُس کی محبت کا دم بھرنے لگی۔ مگر ایک روز پتا چلا کہ وہ حسینہ سرو قد نہیں ہے، اُس کے اصلی قد میں اُونچی ایڑی کی ملاوٹ ہے۔ ایک انکشاف نے دوسرے انکشافات کی راہ ہموار کی اور ظاہر ہوا کہ جن گھنے سیاہ گیسوؤں کے دام میں وہ گرفتار ہوا تھا، وہ بھی خالص، یعنی اصلی نہیں ہیں اور جن پلکوں نے اُس کا جگر چھلنی کیا تھا، وہ بھی میک اَپ کی مرہونِ منّت تھیں۔

سرخ و سپید گال اور شفق رنگ ہونٹ بھی سرخی، پاؤڈر اور لپ اسٹک سے تیار کیے گئے تھے۔

گراہٹ بھی ٹوتھ پیسٹ کی محتاج تھی۔ یہاں تک کہ محبت کی خوشبو، جس نے اُسے اپنی محبوبہ کے

اور زیادہ قریب کر دیا، وہ بھی اصلی نہیں تھی، لیونڈر اور یوڈی کلون کی ملاوٹ سے تیار کی گئی تھی۔

اِن تمام حقائق کو جان کر وہ دل برداشتہ ہو گیا۔ محبوبہ سے قطع تعلق کر لیا۔ محبوبہ اپنے محبوب کی بے رُخی دیکھ کر... پڑی۔ محبوبہ کے آنسو دیکھ کر اُس کا دل پہلے زہر ہوا، پھر پسیجا اور پھر یہ جان کر ٹوٹ

گیا کہ محبوبہ کے آنسو بھی اصلی نہیں تھے۔ گلیسرین سے اشک آوری کا کام لیا گیا تھا۔ چنانچہ اُس نے خودکشی کی ٹھانی اور زہر کھا لیا۔ مگر یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ آنسو تو آنسو، اِس ملک میں زہر بھی اصلی نہیں ہے۔ ڈاکٹروں سے مشورہ کیا تو اُنہوں نے بتایا کہ خوراک کی صورت میں تم اتنا زہر کھا چکے ہو کہ اب خالص زہر بھی تمہاری زندگی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ خودکشی کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم ڈوب مرو۔ اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے اُس نے سمندر میں چھلانگ لگا دی، مگر لہروں نے اُسے قبول نہیں کیا اور اِس جزیرے میں اُچھال دیا، جو اَب خالصتان کہلاتا ہے۔ ملاوٹوں کا ستایا ہوا، ناکامِ محبت اس ملک کا پہلا باشندہ بنا۔

کچھ عرصہ بعد اُنہی لہروں نے ایک دوشیزہ کو بھی اِس جزیرے پر اُگل دیا۔ یہ وہی دوشیزہ تھی، جس کی ملاوٹی زندگی اور ملاوٹی حسن سے دل برداشتہ ہو کر اُس شخص نے، یعنی اس جزیرے کے پہلے شہری نے، اپنے آپ کو لہروں کے حوالے کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے محبوب کی جدائی سے پریشان ہو کر اُس دوشیزہ نے ایک نوجوان سے شادی کر لی تھی، مگر شادی کے چند روز بعد اُس نوجوان کا خاندان، جو خود ملاوٹ کا کاروبار کرتا تھا، یہ دیکھ کر ناراض ہو گیا کہ اُس کی بیوی کو میکے والوں نے جو زیورات پہنائے تھے، وہ ملاوٹ کے سونے سے تیار کیے گئے تھے۔ چنانچہ اُس نے اِس دوشیزہ کو طلاق دی اور اُسی رات خود بھی ملاوٹ کے جرم میں گرفتار ہو کر جیل چلا گیا۔ چنانچہ اس دوشیزہ نے سمندر میں کود کر خودکشی کر لی، مگر دبلے پتلے جسم کی وجہ سے ڈوب نہ سکی۔ کچھ روز لہریں اُسے اُٹھائے پھرتی رہیں، پھر ساحل پر یوں پھینک دیا، جیسے عام طور پر اغوا شدہ لڑکیوں کو تین چار روز بعد کسی سڑک کے کنارے پھینک دیا جاتا ہے۔ اس شخص نے دیکھا کہ پانی میں چند روز رہنے کی وجہ سے اس لڑکی سے ہر قسم کی ملاوٹ اُتر چکی ہے اور وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت نکل آئی ہے۔ چنانچہ دونوں نے شادی کر لی اور بغیر کسی ملاوٹ اور بناوٹ کے زندگی گزارنے لگے۔ کچھ عرصے بعد ایک اور شخص لہروں کے ساتھ لہراتا ہوا، ایک بڑے مٹکے پر سوار اِس جزیرے میں پہنچ گیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ گوالا تھا۔ ایک روز ساحلِ سمندر پر دودھ میں پانی ملانے پہنچا تو چند شراتی لہروں نے دودھ کا مٹکا اُٹھا لیا اور چل پڑیں۔ گوالا مٹکے کی طرف لپکا۔ مٹکے کو پکڑ لیا، مگر ساحل کو نہ پکڑ سکا۔ دودھ بہہ چکا تھا۔ خالی مٹکے کو اُٹھا لیا اور اُس پر سوار ہو کر اِس جزیرے تک پہنچ گیا اور توبہ کی کہ آئندہ ملاوٹ نہیں کرے گا۔ جزیرے پر چوں کہ کوئی

جاندار ہی نہیں تھا، اس لیے ملاوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

کچھ دنوں بعد ایک کشتی جزیرے کے ساحل پر آن لگی۔ اُس میں کچھ ایسے تاجر سوار تھے، جو ملاوٹ کا کاروبار کیا کرتے اور اُن کے پیچھے پولیس لگی ہوئی تھی۔ اُن میں سے ایک تاجر گاچنی اور چونے سے کھانسی کی گولیاں تیار کیا کرتا تھا۔ اِن گولیوں کے کھانے سے چھ بچوں کے ہلاک ہو جانے کی وجہ سے پولیس نے تحقیقات ضروری سمجھی۔ مخبری ہوئی کہ پولیس کو مخبری ہو گئی ہے۔ چنانچہ یہ شخص وہاں سے بھاگ گیا اور اُس کشتی میں سوار ہو گیا، جس میں کچھ لوگ پولیس سے ڈر کر چھپے ہوئے تھے۔ ایک تاجر سرخ مرچوں میں اینٹیں پیس کر ملاتا تھا۔ اُس کا اینٹوں کے نرخ میں کمی کرانے کی کوشش میں بھٹے والوں سے جھگڑا ہو گیا، جو مار کٹائی تک پہنچ گیا اور وہ پولیس کی مداخلت کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اسی طرح مالٹوں کو سرخ روشنائی کے ٹیکے لگا کر 'ریڈ بلڈ' بنانے والا ایک پھل فروش بھی پولیس سے ڈر کر بھاگا ہوا تھا۔ محبت کی تجارت میں ملاوٹ کرنے والے دو تین ایسے حضرات بھی تھے، جن کے خلاف لڑکیاں اغوا کرنے کے سنگین الزامات تھے۔ اِن سب لوگوں نے ملاوٹ سے توبہ کی اور اِس جزیرے میں آباد ہو گئے۔

چند روز بعد پولیس کے چند سپاہی جزیرے کو چھونے والے سمندر کے کنارے اپنی وردیاں نچوڑتے ہوئے دکھائی دے۔ سب لوگ ڈر گئے۔ پولیس ان کے تعاقب میں یہاں بھی پہنچ گئی۔ جزیرے کے پہلے شہری نے، جو اَب اس قبیلے کا حکمران بن چکا تھا، سپاہیوں سے پوچھا کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں؟ سپاہیوں نے بتایا کہ ان کے پیچھے اصلی پولیس لگی ہوئی ہے، چنانچہ پناہ حاصل کرنے کے لیے یہاں پہنچے ہیں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم بھی آپ جیسے ہی ہیں۔ بعض تاجر یہ دیکھ کر حیران اور پشیمان ہوئے کہ وہ نقلی سپاہیوں سے ڈر کر کیوں بھاگے تھے۔ قصہ مختصر، آہستہ آہستہ یہ غیر آباد اور سنسان جزیرہ زندگی کا معمورہ بن گیا اور اِس جزیرے کی خالص اور ملاوٹ سے پاک زندگی کی شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی۔ ملاوٹوں اور بناوٹوں سے تنگ آئے ہوئے لوگ محض تفریح کے لیے اس جزیرے کے چکر لگانے لگے، جیسے میدانی علاقوں کی گرمی کے ستائے ہوئے لوگ مری یا ایبٹ آباد چلے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ اِس جزیرے میں آئے اور یہیں کے ہو رہے اور پھر اُن کے بچے اور بچوں کے بچے پیدا ہونے لگے۔ اس ملک کے شہری آج بھی اس ملک کو جزیرہ ہی کہتے ہیں، مگر دیگر ملکوں میں یہ 'خالصتان' کے نام سے مشہور ہے۔

غیر ملکی سیاحوں نے اس ملک پر بڑے بڑے مضمون لکھے، جو غیر ملکی اخبارات میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کو پڑھ کر ملاوٹی ملکوں کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے خالصتان کو سیاحت کا مرکز بنا دیا۔ ان سیاحوں کی سہولت کے انتظامات کی دیکھ بھال کے لیے جزیرے کے چند بڑوں نے محکمۂ سیاحت قائم کیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں خالصتان والوں کی یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی، کیوں کہ اس سے بیرونی اثرات کو اِس ملک میں داخل ہونے کا راستہ ملا۔ سیاحوں کے بھیس میں تاجر اور صنعت کار بھی اس جزیرے پر آنے لگے اور اِن تاجروں اور صنعت کاروں کے بھیس میں ملاوٹ اور بناوٹ بھی اس جزیرے پر پہنچ گئی۔ وہ لوگ جو اِس جزیرے کے لوگوں کے لیے مچھلیاں پکڑنے کے کانٹے اور جال بطور عطیہ لے کر آئے تھے، مچھلی کا گوشت ڈبوں میں بند کرنے اور مچھلی کا تیل نکالنے کے کارخانے لگا بیٹھے۔ جو لوگ مچھلی جیسے پانی کے جانور سے تیل نکال سکتے ہیں، اس کام کے لیے اُنھوں نے جزیرے کے مختلف علاقوں میں اپنے مچھیاں پکڑوانے والے ایجنٹ مقرر کیے اور جمہوریت رائج کی۔ ان کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج یہ جزیرہ، جس پر کوئی مرغی موجود نہیں ہے، مرغی کے انڈوں کی سپلائی میں عالمی شہرت رکھتا ہے اور اِس صنعت کو فروغ دینے کے لیے خالصتان کے ساحلوں پر کچھوؤں کی کم و بیش پچاس پرورش گاہیں موجود ہیں۔ پچھلے دنوں جب اس جزیرے پر مچھلیوں کا قحط پیدا ہو گیا تو گندم سے لدے ہوئے پندرہ جہاز اس کے ساحلوں پر لنگر انداز دکھائی دیے، جن پر مختلف ملکوں کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔

تازہ ترین اطلاع کے مطابق محبت میں ناکام ہونے والے اس جزیرے کے ایک شہری نے ڈاکٹروں سے شکایت کی ہے کہ وہ زہر کھانے کے بعد بھی مر نہیں سکا۔ ڈاکٹروں نے اس کو بتایا کہ وہ خوراک کے طور پر اتنا زہر کھا چکا ہے کہ زہر اَب اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ خودکشی کا بہترین طریقہ ہے ڈوب مرو، چنانچہ اُس شخص نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ خودکشی میں کامیاب ہوا یا ناکام رہا ہے۔

ایک اور اطلاع کے مطابق اس جزیرہ کی تازہ ترین حکومت نے اس جزیرے کو ہر قسم کی برائیوں، ملاوٹوں اور بناوٹوں سے پاک کرنے کا ایک جامع منصوبہ تیار کیا ہے اور اس منصوبے کے تحت اس جزیرے کا نام سرکاری طور پر 'خالصتان' رکھ دیا ہے۔ اس پر تمام بیرونی ملکوں کے سربراہوں نے مبارک باد کے تار بھیجے ہیں۔

ہیلو ہیلو!

مہزاد سحر

بعض شاہکار اتنے اچھے قلمبند ہوئے ہیں کہ ان موضوعات پر دوبارہ لکھنا دل گردے کا، یعنی قصائیوں کا کام ہے۔ اِدھر بعض تحریروں کے مطالعہ کے وقت، ان کے ورق چہرے کے سامنے یوں تیزی سے پلٹے جاتے ہیں کہ لوڈشیڈنگ میں پنکھے کی کمی کا احساس نہیں ہوتا! ہم مؤخر الذکر تحریروں کے سبب ہاتھوں میں طنز کا نشتر اور گلے میں مزاح کی سٹیتھوسکوپ لٹکائے اس بیمار دنیا کے وارڈ میں راؤنڈ لگانے آئے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم کتنے راؤنڈز میں ٹھیک تخلیقی نشانے لگاتے ہیں۔ طنز و مزاح کو پڑھنا بہت آسان ہے، لیکن اگر آپ اسے خود لکھنے بیٹھیں تو انکشاف ہوتا ہے کہ 'ایفل ٹاور' کی بلندی کا صحیح لطف تو صرف اس کے بنانے والے ہی لے سکتے ہیں۔

نام ایسا انوکھا ہے کہ اصلی نام ہم اس وقت ہی کسی کو بتاتے ہیں، جب فالتو وقت ہو۔ ایسے نام کا فائدہ یہ ہے کہ پہلے تو لوگ لڑکی سمجھ کر 'فین' بنے رہے، جب حقیقت معلوم ہوئی تو سب 'فینز' نے ہوا دینا بند کر دی۔ ایک مرتبہ کسی انٹرویو میں بات نام سے شروع ہوئی۔ ٹائم ختم ہوا تو تب بھی صاحب کے سوالات نام کے ماخذ، املا، شانِ نزول اور خصوصیات وغیرہ کا طواف کر رہے تھے۔

عمر ابھی اتنی ہے کہ گدھے گھوڑے کے برابر والے ووٹ کی جمہوریت میں حصہ نہیں لے سکتے۔ اصل میں ہمیں بالغ ہونے سے زیادہ بالغ نظر ہونے کا شوق ہے۔ ہماری پہلی مزاحیہ کتاب کی تقریب رونمائی ہوئی تو لوگ کہنے لگے کہ مہزاد صاحب کیا بیمار تھے، جو بیٹے کو رونمائی کے لیے بھیج دیا! اسی لیے حفظ ماتقدم کے طور پر کتاب کے پیچھے اپنی ایک عدد تصویر کا لیبل لگوایا ہے۔ پھر ظالم سماج کا ہم سے اس لحاظ سے تعارف ہوا کہ ان کے والد بہت بڑے شاعر اور ادیب ہیں تو لوگوں کے پاس گتھی کا سرا آ گیا۔ ہماری تمام تر 'تخلیقی اولاد' کو ناجائز قرار دیتے ہوئے ایک اندازِ لاپروائی سے فرماتے، اب سمجھے آخر بیٹا کس کا ہے؟ اور جانے اس ایک فقرے کی ڈھال کے پیچھے کتنے اَن

ہے پچھے شعروں نے سیر ہوئے!

گرلز ہوسٹل کا چپڑاسی ہونے کے لیے لازمی شرط سفید داڑھی ہے۔ اِدھر ہمارے یہاں کامیاب ادیب کے حلیے میں بزرگی کا تڑکا لازمی سمجھا جاتا ہے، چاہے اسے اپنے نئے نویلے سفید بال کباب میں ہڈی لگ رہے ہوں۔ کتاب میں اپنی تصویر تو دے دی ہے، لیکن ڈر ہے کہ جوان، بلکہ نوجوان چہرے کو تو بزرگ ادیب سونگھ کر ہی پرے رکھ دیں گے کہ کیا پیدا ہوتے ہی شہد کی جگہ روشنائی کی گھٹی دی گئی تھی، جو یوں قلم اُٹھا کر کتابیں لکھنے بیٹھ گئے... کتاب کہیں کے!! لیکن شاید ہماری حالت ان کھلنڈرے لڑکوں کی سی ہے، جو موٹر سائیکل کا لائسنس ملنے سے پہلے ہی بڑے دھڑلے سے اسے اسٹارٹ کر کے سڑکوں پر بغیر اشارہ توڑے دوڑاتے پھرتے ہیں۔

شاعری کرتے ہیں، لیکن اس در پر حاضری ہم نے کچھ کم دی ہے، کیوں کہ عبرت کے طور پر ہم ایک ایسے اچھے شاعر کو جانتے ہیں، جن کے والد اُن سے بھی بلند قامت شاعر ہیں، اس لیے شعر بیٹا کہتا ہے تو بھی داد باپ کو ہی ملتی ہے۔ نثر نگاری بہر حال گھاٹے کا سودا ہے، کیوں کہ شاعر حضرات تو ہر دوسرے دن اسٹیج پر اپنی رونمائی کروا لیتے ہیں، لیکن نثر نگاروں کو اسٹیج پر اپنی رونمائی کے لیے اتنی بار ہی بلوایا جاتا ہے، جتنی بار ایک شریف اور غریب آدمی کو اُس کے نکاح کے موقع پر! یہ بڑی بات ہے کہ ایک ادیب کا بیٹا ادیب نکل آئے، ورنہ آج کل تو کسی باپ کا بیٹا، اس کا بیٹا بن کر ہی دکھا دے تو اُس کی مہربانی ہے۔

بچپن میں آواز ایسی تھی کہ ابو کے دوست فون پر بات بیٹی کہہ کر شروع کرتے، اَب اتنی بھاری ہو گئی ہے کہ ریٹائرڈ حضرات بھی فون پر 'انکل' سے بات شروع کرتے ہیں۔ منہ ایسا ہے کہ جب فیر اینڈ لولی لگاتے ہیں تو 'فِٹ' سے ماپ کر لگاتے ہیں۔ مانگ ایسی ہے کہ بالوں میں کنگھی کرنے پر ہر مرتبہ ایک نئی 'مانگ' برآمد ہوتی ہے۔ شیو اتنی آئی ہے کہ ایک بلیڈ چھ مہینے تک چل، بلکہ دوڑ سکتا ہے۔ مونچھوں کا سہرا ہونٹوں کے اوپر اِس لیے لگایا ہے کہ کم اَز کم یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ تو لگیں۔ شکل پر اتنی گمراہ کن معصومیت ہے کہ پندرہ سال تک ریلوے میں آدھے ٹکٹ پر سفر کرتے رہے۔ البتہ اب یونیورسٹی اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہیں! پیدائش اس شہر میں ہوئی ہے، جو اپنی گرد کی وجہ سے اتنا بدنام ہے کہ اگر سفید کریم والا کیک گھر لے کر جائیں تو منزل تک پہنچتے پہنچتے وہ چاکلیٹی بن جاتا ہے۔

رنگِ ادب پبلی کیشنز

بچپن میں ضدوں کے، ٹافیوں کی طرح شوقین تھے۔ محلے والوں کو جب کسی اجنبی کو اپنا پتا بتانا ہوتا تو سمجھاتے کہ جس گھر سے ضدوں اور جھڑکیوں کے طوفان کا شور سنائی دے، اس سے دائیں بائیں یا آگے پیچھے فلاں نمبر پر اُن کا گھر ہوگا۔ بچپن میں زیادہ رونے کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ کچھ فنِ گلوکاری سیکھ گئے ہیں، کیوں کہ رونا اور گانا کسے نہیں آتا۔ لکھائی ایسی ہے کہ گھر والوں کو قوی یقین تھا کہ 'تجریدی آرٹ' میں ہمارا رزق لکھ دیا گیا ہے۔ قد ایسا ہے کہ محلے میں جب کبھی کسی کو سیڑھی کی ضرورت ہو، ہماری طرف التجا آمیز نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ بچپن سے کتابیں خریدنے کا اتنا شوق تھا کہ گھر والے سبزی لینے بھیجتے تو کتابیں لے آتے۔ ہمارا بس چلتا تو گھر میں ٹارزن کی دال اور دیوانِ غالب کی چٹنی پکتی۔ ہماری کتابوں کا گھریلو بجٹ میں اتنا ہی حصہ رہا، جتنا ہماری فوج کا ہمارے قومی بجٹ میں!

ایسے کمرے میں پرورش ہوئی ہے، جس کی تین دیواروں کی چوٹیوں کو کتابوں نے سر کر رکھا تھا، ایک دیوار ہی ناخواندہ تھی۔ کھیلوں سے اتنا ہی تعلق ہے، جتنا منٹو کا ڈپٹی نذیر احمد کی 'مراۃ العروس' سے تھا۔ اپنی تعریف سن کر مسکرانا شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی تعریف نہ کرے تو بھی مسکرا دیتے ہیں کہ کم از کم مسکرانے کی تعریف تو کرے گا۔ بعض ردّی والوں نے اپنے تجربے کی بنا پر ہمیں ادبی کتب لکھنے سے منع کیا۔ ان کے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ بندہ 'کھانے پینے کی ترکیبیں'، 'لکھ پتی کیسے بنیں؟'، 'پتی کیسے بنیں؟'، 'رنگ گورا کرنے کے نسخے'، 'محبت میں کامیابی' اور 'گھر سے بھاگنے کے طریقے' جیسی کتابیں لکھ کر لکھ پتی، بلکہ کروڑ پتی بن جائے۔ کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں کہ ایسے معاشرے میں کتاب لکھنے کا کیا حاصل، جہاں لوگ میوزیکل پروگرام کا ایک ہزار روپے کا ٹکٹ تو لے لیتے ہیں، لیکن دہائی میں قیمت رکھنے والی کتاب کا 'شو' کبھی اٹنڈ نہیں کرتے (اسی لیے ہر صاحبِ کتاب دُہائی دے رہا ہے!)۔ اب تو لگتا ہے ادبی کتابوں کو بھی 'اسکیموں' کے تحت یوں بیچا جائے گا، جس طرح ٹوتھ پیسٹ والے پیسٹ کے ساتھ کنگھی، پرس، یامنے سے صابن کا تحفہ لف کرکے بیچتے ہیں۔

امیر آدمی پیتل بھی پہنے تو لوگ سونا سمجھتے ہیں اور غریب سونا بھی پہن لے تو پیتل خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک مزاحیہ فنکار رو بھی رہا ہو تو لوگ مذاق سمجھتے ہیں۔ ایک مزاح نگار کل وقتی مزاح نگاری کا لبادہ پہن کر نہیں بیٹھ سکتا۔ پھر بعض حضرات مزاح نگاروں اور بھانڈوں میں

کوئی فرق نہیں سمجھتے (اس موازنے سے کئی بھانڈوں کی دل شکنی بھی ہوئی ہے)۔

پیشے کے لحاظ سے ہم 'الیکٹریکل انجینیئرنگ' سے وابستہ ہیں۔ سنا ہے، امریکا میں 'ایڈیسن' کی یاد میں ہر سال ایک منٹ کے لیے بتیاں بجھا کر اُسے خراجِ تحسین دیا جاتا ہے، جب کہ ہم تو ایڈیسن کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ سارا سال بجلی بند رکھنے کو تیار بیٹھے رہتے ہیں۔

◆ ◆

یہ انشائیہ نہیں ہے!؟

میرزا اَدیب

بہت سے انشائیے پڑھے، انشائیوں کے قواعد و ضوابط پر جو مضامین لکھے گئے ہیں، ان کا مطالعہ کر ڈالا اور ان مضامین پر قارئین کی طرف سے جس جس ردِّ عمل کا اظہار ہوا تھا اسے بھی بطورِ خوض سمجھنے کی کوشش کر ڈالی مگر معلوم یہ ہوا کہ جہاں سے چلے تھے وہیں آ کھڑے ہوئے ہیں۔ انشائیہ کیا ہوتا ہے اور اسے کیا ہونا چاہیے۔ یہ بات اوّل تو سمجھ ہی میں نہ آئی اور آئی بھی تو اس انداز میں کہ ’’ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔‘‘ یہ تو پتا چل گیا کہ انشائیہ ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا۔ ہماری مراد اس فقرے سے یہ ہے کہ انشائیوں میں خاصا تنوع ہوتا ہے۔ زندگی کی طرح اس میں بھی رنگا رنگی ہوتی ہے مگر جو صاحب انشائیے کو اپنی اپج گردانتے ہیں یا جن کا یہ دعویٰ ہے کہ انشائیہ نگاری صرف انہی کی ذات سے وابستہ ہو کر رہ گئی ہے، انہوں نے فرمایا انشائیے کو انشائیہ ہونا چاہیے اور ہر شخص انشائیے کی تکنیک سے واقف نہیں ہے۔

ایک واقفِ حال سے پوچھا، ’’کہو حضرت! آپ کی سمجھ میں آیا کہ اصلی انشائیہ کیا ہوتا ہے۔ ہم نے تو اِس کا حدود اربعہ سمجھنے کی بہت کوشش کی ہے، لیکن اس سلسلے میں ہمارا وہی حال ہوا ہے، جو میرؔ کا انداز اختیار کرنے والے یاروں کا ہوا تھا۔‘‘

بولے، ’’انشائیہ سمجھنے کی چیز ہے ہی نہیں۔‘‘

عرض کیا، ’’انشائیہ سمجھنے کی چیز نہیں تو کیا، کوئی ایسا معما ہے، جو سمجھنے اور سمجھانے کا نہیں ہے بلکہ ایک دیوانے کا خواب ہے۔‘‘

فرمانے لگے، ’’میری مراد یہ نہیں تھی۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ انشائیے کو سمجھنے کے لیے ایک شرط پوری کرنی ضروری ہے۔‘‘

’’شرط؟ کیسی شرط؟‘‘ ہم نے حیرت زدہ ہو کر سوال کیا۔

جی ہاں شرط۔ اور وہ یہ ہے کہ انشائیہ لکھو۔ جب لکھ لوگے تو جان جاؤ گے کہ انشائیہ کیا ہوتا ہے۔"

ہم زیادہ حیرت زدہ ہو کر ان کا منہ تکنے لگے اور ان کی حالت یہ تھی جیسے وہ ہماری حماقت پر خاموش قہقہے لگا رہے ہیں انہوں نے جب ہمیں کچھ زیادہ ہی حیران و پریشان دیکھا تو یہ کہہ کر چلے گئے۔

"میاں بس یہی ایک شرط ہے۔ انشائیہ لکھو۔ انشائیہ سمجھ میں نہ آئے تو ہمارا ذمہ۔"

ان کا ارشاد تھا یا ایک لازمی شرط تھی کہ انشائیہ لکھو۔ مگر سوال یہ تھا کہ لکھیں کیوں کر جب کسی بات کا علم ہی نہیں ہے۔ جب یہ بھی معوم نہیں کہ ایک تخلیق کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے۔ اس کے وسطی حصے میں کیا کچھ پایا جاتا ہے اور اس کا خاتمہ کہاں ہوتا ہے۔ اس پر طبع آزمائی محض ایک سعیِ رائیگاں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ مگر انشائیے کے خیال کو ذہن سے نکالنا بھی ایک مسئلہ بن گیا تھا کیوں کہ اس میں اپنی سبکی تھی بلکہ احساسِ شکست تھا۔ بڑی کوشش کے بعد آخر خود کو انشائیہ لکھنے پر آمادہ کر ہی لیا۔ اب سوال یہ تھا کہ موضوع کیا ہو۔ موضوع کے بغیر تو کوئی تخلیق بھی بروئے کار نہیں آسکتی۔ یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ یہ مسئلہ۔ یعنی موضوع کے انتخاب کا مسئلہ اچانک حل ہو گیا۔ ایک صاحب نے از راہِ نوازش فرمایا کہ جب بارش کے کسی دن بیچ سڑک کے گر کر کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو جائیں تو اپنے کسی دوست کے سامنے اس وقت کا ذکر شگفتگیِ مزاج کے ساتھ کیا جائے تو اس روداد کو انشائیے میں شامل کر دیا جائے۔

یوں محسوس ہوا جیسے اندھیرے میں ایک دم اُجالا ہو گیا ہے۔ لیکن اب مشکل یہ تھی کہ یہ موضوع تو اُس مہربان کا تھا جس نے مہربانی کر کے اِس کا ذکر کر دیا تھا۔ کسی کے موضوع کو اپنانا ادب میں سرقے کے مترادف ہے۔ اس لیے موضوع اپنا ہونا چاہیے اپنا موضوع کیا ہونا چاہیے۔ غور و تامل کا مقام تھا۔ چند منٹ سوچا اور وہ جو کہتے ہیں "دِیے سے دِیا جلتا ہے" سو یہاں بھی ان کے دِیے سے اپنا دِیا جل اُٹھا اور وہ یوں کہ ہمارے گھر کے سامنے تین چار گز کے فاصلے پر جو مین ہول **"Manhole"** واقع ہے، کئی دن سے اُس کا ڈھکنا غائب تھا یا غائب کر دیا گیا تھا۔ کئی راہ گیر اس میں گرتے گرتے بچے تھے۔ ایک راہ گیر تو اپنا ایک پاؤں اس کے سپرد کر ہی چکا تھا کہ دوسرے راہ گیر نے اس کا بازو زور سے پکڑ لیا اور یوں حادثہ نہ ہو سکا۔ خیال آیا کہ اگر ہم اس سے

دو قدم دُور ہی رہتے ہیں اور گھر سے نکلتے ہی سب سے پہلے اس پر نظر ڈالتے ہیں تاہم ہمیں یہ فرض کر لینا چاہیے کہ آج صبح بے خبری میں اس کے اندر جا پڑے ہیں۔ کپڑے تباہ ہو گئے ہیں۔ جسم کے کئی حصوں پر چوٹیں آئی ہیں۔ جگہ جگہ درد ہو رہا ہے۔ اب اس کی رُوداد کسی بے تکلف دوست کو ہنس ہنس کر سنانی چاہیے۔ رُوداد کو ہنس ہنس کر سنانا ہی تو انشائیہ نگاری ہے۔ بس طے کر لیا کہ انشائیہ لکھیں گے اور فوراً لکھیں گے۔ چنانچہ ابتدائی سطریں سوچ لیں بلکہ لکھ دیں۔

مین "Man" انگریزی زبان میں آدمی کو کہتے ہیں۔ آدمی قدرت کا شاہکار ہے۔ قدرت کی سب سے حسین و جمیل مخلوق ہے کہ مین بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ مگر ایک چیز ایسی بھی ہے جس کے سامنے آدمی کی ساری قوتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ اور یہ چیز ہے 'مین ہول' جس کے اندر خدا کی یہ حسین و جمیل مخلوق جاتی ہے اور جب باہر آتی ہے یا جب اسے باہر نکالا جاتا ہے تو اس قدر بھیانک ہو جاتی ہے کہ لوگ دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں آج صبح ہم نے بھی یہی تجربہ کیا۔ گھر کے دروازے سے باہر نکلے تو نہ جانے یہ کیوں بھول گئے کہ چند گز کے فاصلے پر مین ہول ہے۔ بس گنگناتے ہوئے آگے جا رہے تھے کہ دھم سے نیچے جا پڑے۔ لوگ بھاگے آئے اور مشکل سے ہمیں نکالا۔ پر نہ جانے کیا حادثہ ہوا کہ ہم زور زور سے ہنس رہے تھے اور دیکھنے والوں کے چہرے خوف سے زرد پڑ گئے تھے۔

یہاں تک تو قلم برداشتہ لکھ گئے۔ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ وہ صاحب، جنہوں نے یہ تیر بہدف نسخہ ہمیں بتایا تھا آ موجود ہوئے۔ ہم نے پوری بے تکلفی سے اپنے انشائیے کا ابتدائیہ سنا دیا۔ توقع تھی کہ سن کر بے تحاشا داد دیں گے۔ مگر ان کے چہرے کے اثرات بتا رہے تھے کہ کچھ خوش نہیں ہوئے۔

"کیوں صاحب! ابتدا کیسی ہے؟" ہم نے بے صبری سے پوچھا۔

دو تین لمحے تامل کرنے کے بعد کہنے لگے:

ویسے تو ٹھیک ہے لیکن آپ نے انشائیے کے اُصول و ضوابط کا خیال نہیں کیا۔

بڑا غصہ آیا تاہم صبر و تحمل سے پوچھا:

"تم نے کہا ہے کہ انشائیے میں شگفتگیِ مزاج ہونی چاہیے۔"

"ہونی چاہیے۔ ضرور ہونی چاہیے۔ یہ تو اس کی بنیادی خصوصیت ہے۔"

''تو تم نے دیکھا نہیں کہ باوجود کیچڑ اور پانی میں لت پت ہونے کے ہم ہنس رہے تھے۔''

یہ سن کر وہ صاحب زور سے ہنس دیے۔ ہمیں یہ ہنسی بہت بری لگی۔ مگر ہمیں موقع پر بات سوجھ گئی۔

''دیکھا تم بھی ہنس دیے ہو۔''

زور سے قہقہہ لگا کر فرمانے لگے۔

''میاں یہ قہقہہ لگا کر فرمانے لگے۔

''میاں یہ قہقہہ خوش دلی کا قہقہہ نہیں ہے۔''

''تو کس بات کا ہے!'' ہم نے فوراً سوال کر دیا۔

''یہ قہقہہ تمہاری حماقت ... پر ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ روداد کو خوش دلانہ کیفیت کا اظہار ہونا چاہیے۔ ایسے جیسے تم اپنے ایک بہت بے تکلف دوست سے بڑی بے تکلفی سے گفتگو کر رہے ہو۔ خود خوش ہو، دوسرے کو خوش کر رہے ہو۔''

مجھے اپنے دوست کی ناسمجھی پر بڑا افسوس ہوا۔

''حضرت! یہی تو کیا ہے ہم نے۔ دیکھو مسٹر! مین ہول میں گر کر آدمی کا حلیہ ٹیٹ ہو جاتا ہے۔ مگر تم نے دیکھا۔ ہم ہنس رہے تھے۔ کیا یہ خوش دلی کی علامت نہیں ہے؟ کیا ہم نے انشائیے کا بنیادی تقاضا پورا نہیں کر دیا؟''

''اور یہ جو تم نے لکھا ہے۔ دیکھنے والوں کے چہرے خوف سے زرد پڑ گئے تھے۔ سوچو میاں جب تم کسی کو یہ بتاؤ گے کہ تماشائیوں کا رنگ زرد پڑ گیا تھا تو وہ شگفتگی خاطر کیونکر برقرار رہے گی جس کو انشائیے کے لیے سب سے ضروری عنصر سمجھا گیا ہے!''

''لیکن ہم تو ہنس رہے تھے نا۔'' ہم نے صحیح سوچا تھا لیکن وہ صاحب مانتے ہی نہیں تھے بار بار کہتے تھے کہ اس میں شگفتگی نہیں ہے۔ آخر ہم نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا کہ آخری فقرہ کاٹ کر کچھ اور لکھیں گے اور وہ چلے گئے۔

وہ تو چلے گئے اور ہم افکار کے ہجوم میں ڈوب گئے۔ آخری فقرہ انشائیے کی رو سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ فقرہ کاٹ دیا اور غور و فکر کے بعد یہ الفاظ لکھ دیے:

''ہم ہنسنے لگے اور جو لوگ ہمیں ہنستے ہوئے دیکھ رہے تھے وہ بھی ہنسنے لگے۔ صورتِ حال یہ

تھی کہ ہم کوشش کر کے قہقہے پر قہقہہ لگا رہے تھے اور ہمارے ارد گرد بے شمار مسکراتے ہوئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ بہت پُر لطف منظر تھا۔ اچانک خیال آ گیا کہ اگر ایسی حالت میں کسی نے فوٹو اتار لیا اور اسے کہیں چھپا دیا یا بوقت ضرورت کام میں لانے کے لیے بطور سند کے محفوظ کر لیا تو کیا ہو گا۔ ایسے میں ہوائیں کہ ہماری نظر اپنے ایک دوست پر پڑ گئی جو گردن میں کیمرہ لٹکائے کھڑا تھا۔ دل بُری طرح دھڑکنے لگا اور ہم قریب قریب بھاگنے لگے۔''

دوسرے دن وہ صاحب آئے اور انہوں نے پوچھا کہ انشائیے کو کچھ اور آگے بڑھایا ہے تو ہم نے پورے اعتماد کے ساتھ نئی سطریں سنا دیں۔ توقع تھی وہ ہنس پڑیں گے لیکن ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ قہقہہ جو وہ اپنے ہونٹوں تک لانا چاہتے تھے، راستے میں ہی کہیں بھٹک کر رہ گیا ہے۔

''میرزا صاحب!''

''جی صاحب!''

''آپ نے اپنی فکر مندی کا اظہار کر دیا ہے۔ جانتے نہیں ہیں کہ فکر مندی اور شگفتگی خاطر میں ایک بنیادی فرق ہوتا ہے۔''

''یہ تو صاحب ایک فطری تقاضا ہے۔''

''فطری تقاضا ہو یا غیر فطری۔ بہر حال آپ نے انشائیے کی نفی کر دی ہے۔ غور کرو گے تو خود بھی اسی نتیجے پر پہنچو گے۔

بحث فضول معلوم ہوئی۔ خاموش ہو گئے کہ پھر غور کریں گے۔ فکر مند والی سطریں کاٹ دیں اور لکھا۔

''وہ منظر ایسا تھا کہ جو شخص بھی دیکھتا تھا بے اختیار ہنس پڑتا تھا اور ہم بھی اس کا ساتھ دینے میں پوری پوری کوشش کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک صاحب نے پوچھا۔

''میرزا صاحب! آج تو آپ دولہا بن کر سسرال جا رہے ہیں۔

ہم نے قہقہہ لگایا اور جواباً کہا، ''دعا دیتا ہوں امپروومنٹ ٹرسٹ کو جس نے آج دولہا بنایا ہے۔''

ہمارا یہ کہنا تھا کہ ہر طرف سے قہقہے بلند ہونے لگے۔

ہمارے خیال کے مطابق بات بن گئی تھی۔ یہ فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ ہمارے وہی ستم ظریف

دوست آ گئے۔ انہوں نے بڑے اشتیاق سے نئی سطریں سنیں۔ ایک بار نہیں دو بار سنیں پھر ان کا چہرہ لٹک گیا۔

’’کیا افتاد پڑی؟‘‘ ہم نے پوچھا۔

بولے، ’’ہم پر کیا افتاد پڑنی تھی۔ یہ بتاؤ تم پر کیا مصیبت پڑی ہے؟‘‘

’’خیر تو ہے۔‘‘

’’ارے صاحب! تم نے اس امر کو کیوں یکسر نظر انداز کر دیا ہے کہ طنز اور شگفتگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تم تو خواہ مخواہ منصور قیصر بن گئے ہو۔‘‘

’’منصور قیصر بن گیا ہوں۔ وہ کیسے؟‘‘

’’بتاؤ کیا تم نے یہ فقرہ طنزاً نہیں لکھا کہ دعا دیتا ہوں امپرومنٹ ٹرسٹ کو جس نے آج دولہا بنا دیا ہے۔ اس میں نمایاں طور پر ’منصور قیصریت‘ ہے اور یہ حضرت بات بات پر طنز کرتے ہیں۔ نکالو اپنے اندر سے منصور قیصر کو۔‘‘

’’مگر صاحب! میرے اس فقرے پر لوگ بے اختیار ہنس پڑے تھے۔‘‘

’’انشائیے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں جو چیز بھی ہو شگفتگی کا نتیجہ ہو۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ لوگ زور زور سے ہنسیں نہیں۔ مسکراتے رہیں۔ بس مسکراتے رہیں۔ ہنسنا ضروری نہیں۔ بلکہ قطعاً ضروری نہیں۔ تبسّم زیرِ لب کی ضرورت ہے۔ سمجھے حضرت!‘‘

ہم خاموشی سے انہیں دیکھ رہے تھے کہ جاتے ہوئے بولے ’’دیکھو مایوس ہونے کی بات نہیں۔ ابتدا بہت اچھی کی ہے۔ بس شگفتگی کا احساس ہے۔ ایک شاندار انشائیہ لکھ لوگے۔ آج شام کو ملاقات ہوگی۔‘‘ یہ کہہ کر وہ تو رخصت ہوئے اور ہم نے طنزیہ فقرہ کاٹ دیا۔ مضمون کو آگے بڑھنا چاہیے مگر جب تک اس مقام سے آگے نہ بڑھیں وہ باتیں اظہار کے دائرے میں نہیں آ سکتیں جو ذہن میں محفوظ کر رکھی ہیں۔ ہاں تو یوں ہونا چاہیے۔ ایک تماشائی جب پوچھے کہ میرزا صاحب! آج تو آپ دولہا بن کر سسرال جا رہے ہیں تو اِس کے جواب میں کہنا چاہیے:

میرے تغیر حال پہ مت جا   اتفاقات ہیں زمانے کے

یقین ہو گیا اس سے زیادہ مناسب حال شعر اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ جو کچھ میں کہہ سکتا ہوں یا بہتر یہ کہ جو کچھ مجھے کہنا چاہیے۔ وہ میر تقی نے اپنے اس انتہائی خوب صورت شعر میں کہہ دیا ہے۔

اب تو ان صاحب کو اعتراض کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔

شام کے وقت وہ آ گئے۔

"بات آگے بڑھی!" انہوں نے آتے ہی سوال کیا۔

بڑے وثوق سے کہا، "بات آگے نہیں۔ بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ جو کچھ لکھا ہے سنو گے تو تڑپ جاؤ گے۔"

"بہتر تڑپایئے۔ شوق سے تڑپایئے۔"

اور میں نے یہ شعر سنا دیا۔ وہ تو کیا تڑپتے ان کی بے حسی پر ہم تڑپ کر رہ گئے۔

"حضرت میں تمہاری کوشش کی داد دیتا ہوں لیکن اس میں شگفتگی کی بجائے دل گرفتگی زیادہ پائی جاتی ہے۔"

"دل گرفتگی۔ کیسی دل گرفتگی؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا کہ دل گرفتگی کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں۔ بہر حال یہ دل گرفتگی ہے۔"

وہ ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

"مشکل مقام ہے۔ دونوں مل کر اس مشکل مقام سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"ایک منٹ ٹھہرو ایک آئیڈیا۔ میں آئیڈیا کے اظہار کے لیے بیتاب ہو گیا تھا۔

"آئیڈیا!"

"سنو۔ وہ آدمی جب کہتا ہے۔"

"آئیڈیا بتاؤ۔ فقرہ میرے ذہن میں ہے۔"

"وہ جب کہتا ہے۔ آج تو۔ وغیرہ وغیرہ، تو میں کہتا ہوں۔ "اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو۔ میں وہی ہوں جو تھا۔ برسوں سے تمہارے سامنے پھر رہا ہوں۔ آئندہ بھی پھرتا رہوں گا۔ دیکھے مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو۔"

ہم کچھ آگے کہنے ہی والے تھے کہ انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔"

"ونڈر فل آئیڈیا۔"

جی چاہتا تھا کہ انہیں بے اختیار اگلے سے لگا ئیں کہ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"بڑے ادب اور احترام سے ایک گزارش پیش کرتا ہوں۔"

ہم ان کے رویّے پر حیران رہ گئے۔ تاہم عرض کیا، "فرمائیے۔"

بولے، "انشائیہ لکھنا آپ کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اب آپ نے خطابت شروع کر دی ہے جو انشائیے میں شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لیے تو اپنے نقاد دوست مشکور حسین یاد کو انشائیہ نگار تسلیم نہیں کرتے کیوں کہ یہ صاحب بے اختیار وعظ و نصیحت شروع کر دیتے ہیں۔"

وہ جانے لگے۔ ہم نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"حضرت! ایک سوال کا جواب دیں۔ اس عہد میں کون ایسا باشعور انسان ہوگا جس کی رگوں میں زہر نہیں سرایت کر گیا۔ اس زہر کی وجہ زندگی کی سچی قدروں کی پامالی ہے۔ اس زہر کی وجہ وہ منافقت ہے جو ہمارے معاشرے میں ایک مرض متعدی کی طرح پھیلتی جا رہی ہے۔ یہ زہر اس شگفتگی کا رُودار نہیں جس پر تم اس قدر اصرار کر رہے ہو۔ ادب کی کوئی بھی صنف ہو یہ زہر لازماً اپنا اثر دکھائے گا۔ طنز اسی زہر کا نتیجہ ہے۔"

انہوں نے مسکرا کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"ایک دوستانہ مشورہ ہے۔"

"ارشاد۔"

"تم نے جو کچھ کہا بالکل درست ہے۔ پھر بھی طے کر لو کہ تم انشا پرداز نہیں بن سکتے۔"

"کیوں نہیں بن سکتا؟"

اس سے پیشتر کہ میرا ہاتھ ان کے ہاتھ کی طرف دوبارہ بڑھے وہ دروازے میں سے نکل چکے تھے۔

* * *

اَنڈا اسکوپی

(انڈے اور مُرغی پر ایک سیر حاصل بحث)

نادر خان سر گروہ

اَنڈا بھی ایک بے زبان جانور ہے۔ یہ اور بات ہے کہ چل پھر نہیں سکتا، لیکن اِس کو ذرا سی گرمی دی جائے تو اِس میں سے کوئی چلتا پھرتا نظر آ سکتا ہے۔ اَنڈے کی شکل بیضوی ہوتی ہے۔ یہاں ایک سوال قابلِ غور ہے کہ کیا اَنڈے کی بھی کوئی شکل ہوتی ہے؟ ویسے ہم نے دیکھا ہے کہ اَنڈے پر دو آنکھیں، ناک اور منہ بنا کر ایک شکل بنائی جاتی ہے، جس سے بدشکل چھپکلیوں کو ڈرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مُرغی کے ہاں ہر روز ایک انڈا پیدا ہوتا ہے۔ اِس حساب سے دنیا میں سب سے زیادہ آبادی انڈوں کی ہوئی۔ اگر دنیا کی بیشتر مرغیاں سونے کے اَنڈے دیتیں تو سونے کا بھاؤ انڈے کے برابر ہو جاتا اور اَنڈا سونے کے بھاؤ بکتا۔ اَنڈا بھی اپنے بَل پر سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اُسے کہیں رکھو تو لُڑھک لُڑھک جاتا ہے۔ اَنڈے کو اگر پکڑ کر سیدھا کھڑا کیا جائے تو وہ صفر کا ہم شکل نظر آتا ہے، اسی لیے جب صفر کی بات نکلتی ہے تو انڈے کا ذکرِ خیر ہوتا ہے۔

پتا نہیں مُرغی کے پیٹ میں پیکنگ کا کون سا ایسا نظام ہوتا ہے، جو وہ انڈے کو اِتنے خوب صورت اور نفیس کیپسول کی شکل میں برآمد کرتی ہے۔ یہ اُس وقت سے ہو رہا ہے جب مُرغی کو یہ پتا بھی نہیں تھا کہ انڈا کیا چیز ہوتی ہے۔ قدرت نے مُرغی کے بطن سے سیدھے مُرغی پیدا نہیں کی۔ پہلے انڈا پیدا کر کے ہمیں یہ اختیار دیا کہ انڈا کھاؤ! اگر انڈا کھانے کا موڈ نہیں تو تھوڑا انتظار کرو اور مُرغی کھاؤ!

ہمارے دوست پُر جوش پُوری انڈوں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ اُن کے اَندازے کے مطابق، دنیا میں سب سے زیادہ انڈے، انسان اور کوّے کھاتے ہیں۔ ان کے

بعد بے وزن شعرا اور بے سُرے گلوکاروں کا نمبر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں، ”اسکول کے زمانے میں مجھے وقتاً فوقتاً مُرغا بننے کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ لیکن افسوس! استاد نے کبھی مجھے مُرغا نہیں جانا۔ ہر بار اِتنی عمدگی سے مُرغا بننے کے باوجود وہ مجھے گدھا ہی سمجھتے تھے اور نتیجے میں کسی نہ کسی پرچے میں اَنڈا دیتے تھے۔“

مُرغیوں کے مقابلے میں مُرغوں کے پاس کرنے کے لیے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ یوں بھی پولٹری کی صنعت میں اِنہیں بے مصرف سمجھا جاتا ہے۔ یہ نہ انڈے دیتے ہیں نہ سیتے ہیں۔ نر چُوزوں کو اُن کے پیدا ہونے کے ۷۲ گھنٹوں کے اندر، گرائنڈر میں ڈال کر یا بجلی کے شاک "Electrocution" کے ذریعے قتل کر دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ مُرغے نہ ہوتے تو مُرغیاں بس کُڑک بیٹھی رہتیں۔ مُرغے؛ دو اہم فرائض انجام دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ انڈے کی تخلیق میں اپنا فرض (اور کردار) ادا کرتے ہیں۔ دُوسرے... بانگ دینے کے فرض کو اپنے اوپر واجب کر لیتے ہیں۔ گاؤں کے مُرغے جب بانگ دیتے ہیں تب ’اپنے اپنے‘ گھوڑے بیچ کر سو رہے لوگوں کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اب ہمیں اُٹھنا چاہیے۔ اور شہروں میں ’ایک دوسرے کے‘ گھوڑے بیچ کر سو رہے لوگ جب آنکھیں کھولتے ہیں تو پولٹری شاپ کے مُرغے کہتے ہیں کہ اب ہمیں بانگ دینا چاہیے۔ لیکن کبھی کبھار بانگ دینا کچھ مُرغوں کی عادت بن جاتی ہے تو کچھ کو بانگ دینے کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ ایسے مُرغوں کی ٹائمنگ اَپ سیٹ ہو جاتی ہے۔ اُن کا جب دل کیا، منہ اُٹھایا اور بانگ دے دی۔ ایسے مُرغوں کی ککڑوں کُوں سے تنگ آ کر لوگ اُن کے حلق پر چھری پھیر کر، اب کی، تب کی... سب بانگوں کو اپنے حلق سے اُتار لیتے ہیں۔

مُرغی کا شمار جزوی طور پر پرندوں میں ہوتا ہے، جو پَردار ہونے کے باوجود اُڑ نہیں سکتی۔ غنیمت ہے، مُرغی اُڑ نہیں سکتی، ورنہ اُس کو دبوچنے میں انسان کی جان نکل جاتی۔ جب کہ پُرپیچ خطوط پر جھپا جھپ دوڑنے والی مُرغی ہی ہمارے ہاتھ نہیں آتی۔ اُسے پکڑنے جھکو تو ٹانگوں کے بیچ سے نکل نکل جاتی ہے۔ ایک مرتبہ پُرجوش پُوری مُرغی کے پیچھے دوڑ لگاتے ہوئے، جانے کہاں کہاں سے ہوتے ہوئے، بے خیالی میں بہت دُور نکل گئے۔ جب تھک گئے تو دَم لینے کو رُکے۔ ہانپتے ہوئے پُرجوش پُوری کو دیکھ کر مُرغی بھی رُک گئی اور اُن کی بڑی بڑی آنکھوں میں اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ڈال کر سوچنے لگی کہ ”یونہی اکیلے اکیلے دوڑ لگانے کا کیا فائدہ۔“ پُوری جی کو ہم نے

بارہا سمجھایا کہ مُرغی کو پکڑنے کے لیے دانہ ڈالنا پڑتا ہے۔ دانہ نہ ڈالو تو مُرغی گھاس نہیں ڈالتی۔

ویسے... ایک منفرد ترکیب ہے ہمارے پاس، وہ یہ کہ جب بھی آپ مرغیوں کے غول سے مرغی پکڑنا چاہیں تو کسی دوسری مرغی پر نگاہ رکھیں، اِس طرح آپ کی مطلوبہ مرغی بلا مشقت آپ کے ہاتھ آجائے گی۔ (یہی دنیا کا اُصول بھی ہے، جس چیز کے پیچھے آپ دوڑتے ہیں، وہی آپ کے ہاتھ نہیں آتی) ہاں تو... بتائے گئے اُصول کے تحت تمام مرغیاں پکڑ پکڑ کر ڈربے میں ڈالتے جائیں۔ پھر جب آخری مرغی کی باری آئے تو سَر کھجاتے ہوئے سوچنے میں وقت ضائع نہ کریں۔ پہلے سے پکڑی گئیں مرغیوں میں سے ایک کو کھلا چھوڑ دیں اور آخری مرغی کو دبوچ لیں۔

ہر مُرغی کے سَر پر ایک کلغی ہوتی ہے اور گردن سے ایک جھالر لٹکی ہوتی ہے۔ ایک مُرغی کی کلغی دوسری سے جدا ہوتی ہے، جس سے مرغیاں ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں۔ پُر جوش پُوری کہتے ہیں کہ ایسی ہی کلغیاں چینیوں کے بھی ہونی چاہیے، تا کہ پتا تو چلے کہ اُن میں 'یہ چینی' کون ہے اور 'وہ چینی' کون۔

مُرغی پانچ مہینے کی عمر سے ہی انڈے دینا شروع کر دیتی ہے۔ اُس کے پیٹ میں انڈے کی تخلیق کا عمل تقریباً بیس گھنٹوں میں مکمل ہوتا ہے۔ ہائے بے چاری مُرغی! ایک انڈا دیا نہیں کہ اَگلے کی تیاری شروع۔ اگر اُس کی پیشانی ہوتی تو ہمیں پتا چلتا کہ اُس کے ماتھے پر شِکن تک نہیں آتی۔ اور یہ کہ وہ کتنی 'اَنڈا پیشانی' سے انڈا دیتی ہے۔ (معاف کیجیے) وہ کتنی خندہ پیشانی سے انڈا دیتی ہے۔ (انڈے کا ذکر اِتنی کثرت سے ہو رہا ہے کہ بات بات پر منہ سے انڈا نکل رہا ہے) تو جناب! بے چاری مرغی معلوم ہی نہیں ہونے دیتی کہ اُس کے انڈا ہُوا بھی ہے۔ ہمیں خود اُس کی تخلیق کو 'دریافت' کرنا پڑتا ہے کہ کدھر دیا ہے؟ کہاں دیا ہے؟

ایک زمانے تک 'مَرغزار' کو ہم 'مُرغ زار' پڑھتے تھے اور اِس کا مطلب پولٹری فارم سمجھتے تھے۔ بلکہ کئی موقعوں پر ہم نے یہ لفظ استعمال کر کے اپنی زبان دانی کا رُعب بھی جھاڑا۔ رُعب بھی ایسا کہ اچھے اچھوں نے ہمارے آگے زانوئے 'تلفُّظ' تہ کیا۔ لیکن جب ہمارے کلون پلانر "Clone Planner" کا ظہور ہوا تو پتا چلا کہ اِس لفظ کے صحیح معنی ہیں... سبزہ زار، ایسی جگہ جہاں دُور دُور تک ہری گھاس اُگی ہو۔ لیکن پُر جوش پُوری نے ہمیں ایک بار گمراہ کرنے کی کوشش کی اور مَرغزار کے یہ معنی بتائے کہ ایسی جگہ جہاں دُور... دُور تک ہری ہری گھاس اُگی ہو اور وہاں

ہزار مُرغیاں چگ رہی ہوں۔ ہم تو کہتے ہیں 'مرغزار' پر مرغیوں کا حق زیادہ بنتا ہے۔ پولٹری فارم کے متبادل کے طور پر اِس لفظ کو مُرغیوں کے حوالے کر دینا چاہیے۔ ہری گھاس کے پاس تو پہلے ہی سبزہ زار کا لفظ موجود ہے۔ کسی کے پاس دو... دو اور کسی کے پاس ایک بھی نہیں۔ یہ ہے اُردو کی حالتِ زار۔

انڈے سے ہوتے ہوئے بات اُردو کے مسئلے تک آ پہنچی، جو دنیا کے اُن پیچیدہ اور ٹھوسیدہ (جیسے پیچ سے پیچیدہ، ویسے ہی ٹھوس سے ٹھوسیدہ) مسائل میں سے ایک ہے، جن پر بات کرنا، انڈے اور مُرغی کی بحث کے مترادف ہے۔ جو صفر سے شروع ہوتی ہے اور گھوم پھر کر صفر پر ہی لوٹ آتی ہے۔

''جو ختم ہو کسی جگہ، یہ ایسا سلسلہ نہیں''

(جولائی، دو ہزار آٹھ)

* * *

نقادِ اعظم – حضرت نامی گرامی

نسیم سحر

ہمارے شہر میں یہ جو فتنہ سے قد وقامت کے منحنی سے، بڑے مسکین سے بزرگ دکھائی دے رہے ہیں، انہیں آپ کوئی معمولی ہستی مت سمجھیے اور اِن کے ظاہری حلیے پر بھی مت جائیے، جو کہ 'دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں' کا سا ہے۔ یہ ہیں ہمارے عہد کے نامور نقاد 'حضرت نامی گرامی'، جن کی بغل میں ہر وقت کسی زیرِ تکمیل مقالے یا مضمون کا مسودہ اور کچھ پایۂ تکمیل کو پہنچ جانے والے مقالے اور مضامین دبے ہوتے ہیں۔ منہ میں پان کی گلوری ہوتی ہے، جسے وہ اپنے دانتوں کی 'باقیات' یعنی پونے دو دانتوں اور ڈھیلے پڑے ہوئے مسوڑھوں کے ذریعے مسلسل چبانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور ہونٹ اس گلوری کے 'زیرِ اثر' کچھ اس قدر سرخ ہو جاتے ہیں، جیسے اُن پر لپ اسٹک تھوپی ہوئی ہو۔ مکمل طور پر کلین شیو، عموماً پیلے یا نیلے کرتے اور سفید پائجامے میں ملبوس، ہونٹوں پر ایک نہایت خفیف سی (مگر مکاری سے بھرپور) مسکراہٹ سجائے۔ 'حضرت نامی گرامی' شہر بھر کے ادبی، سماجی، سیاسی، ثقافتی اور دیگر حلقوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا ذریعۂ روزگار کیا ہے، یہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ مگر جس تواتر سے انہیں مختلف حلقوں سے تحائف اور 'نذرانوں' کی صورت میں ملبوسات اور دیگر ضروریاتِ زندگی اپنے 'قلم کا جادو' جگانے کے عوض موصول ہوتی ہیں اور جس تسلسل سے انہیں 'ضرورت مند لوگ' ناشتے، لنچ، ڈنر اور چائے پر مدعو کرتے ہیں، اس کے پیش نظر ایسا لگتا ہے کہ انہیں کسی ذریعۂ روزگار کی ضرورت نہیں۔

اپنے قلم کا جادو جگانے کے سلسلے میں کچھ لوگوں پر یہ بڑے مہربان ہیں اور اِن کی ایک خوبی، جو پڑھے لکھے لوگوں میں بڑی مقبول ہے، یہ ہے کہ بہت سی کتابیں جو اِنہیں تنقید کے لیے وصول ہوتی ہیں اور جن پر اِن کی تنقیدی تحریریں محفلوں میں سنی اور اخبارات میں پڑھی جا چکی ہوتی ہیں،

وہ اپنے دوستوں کو دے دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر کہ ”خدا کے لیے انہیں واپس مت کیجیے گا۔“ اور وصول کرنے والے حیرت میں اس لیے مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کتابوں کے بہت سے جڑے ہوئے اوراق کو کاٹ کر کھولنے کی زحمت بھی نہیں کی گئی ہوتی، گویا ’سونگھ کر‘ مقالہ لکھا گیا تھا۔ کئی مرتبہ کتاب کو سونگھنے کی بجائے (اگر مصنف کے گھر بیٹھے ہوں تو) کچن سے آنے والی طرح طرح کی خوشبوئیں سونگھ کر یہ اپنے مقالے کو مجرب اور مرغن بنانے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور جتنی ڈشیں ان کے لیے تیار کی جاتی ہیں، اسی مناسبت سے اس مقالے کی طوالت بھی ہوتی ہے۔ سویٹ ڈشوں کی تعداد جس قدر زیادہ ہو، مقالے یا مضمون کی مٹھاس بھی اسی تناسب سے بڑھتی جاتی ہے۔

آپ کا ’شعبۂ تعلقاتِ عامہ‘ (’بلکہ ’شعبۂ تعلقاتِ خاصہ‘) خاصا مضبوط ہے اور اپنے پسندیدہ وی آئی پی لوگوں کی کتابوں پر آپ ایک سے زیادہ مضامین بھی تحریر فرمانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ اس کے علاوہ اُن لوگوں کی کتابوں پر جو اِنہیں اپنے گھر زیادہ سے زیادہ دعوتوں میں بلائیں اور خوب پُر تکلف کھانے پیش کریں، اِن کا مضمون طویل اور ذائقے دار ہوتا ہے۔ بعض اہم لوگوں سے تعلقات بڑھانے کے لیے ایسا بھی ہو چکا ہے کہ کتاب کسی وجہ سے دیر سے شائع ہوئی مگر اُس پر تبصرہ پہلے آ گیا! کوئی ٹٹ پونجیا ادیب اپنی کتاب تبصرے کے لیے پیش کرے، تو یا تو اُس پر کچھ لکھتے ہی نہیں، یا ایسا لکھتے ہیں کہ پھر وہ دوسری کتاب یا تو شائع کرنے سے ہی توبہ کر لیتا ہے، یا پھر شائع کرتا بھی ہے تو اِنہیں پیش نہیں کرتا۔

اِن کے لکھنے کا ایک اور اہم پیمانہ مصنف سے اِن کا ’زمینی، علاقائی، شہری اور محلاتی رشتہ‘ ہوتا ہے۔ اِس میں بھی مختلف سطحیں ہیں۔ پہلے ملک، پھر شہر، پھر محلّہ۔ جوں جوں اِن کے یہ علاقائی رشتے مضبوط ہوتے جاتے ہیں، اِسی مناسبت سے اِن کے مقالے میں شہد اور شکر کی آمیزش بڑھتی جاتی ہے۔ اگر کسی دوسرے ملک، دوسرے شہر یا دوسرے محلے کا گستاخ شخص اپنی کتاب انہیں پیش کر بیٹھے تو بس پھر یوں سمجھیے کہ اُس نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا۔ اُس کے ایسے لتے لیں گے کہ وہ زندگی پھر دوسری کتاب لکھنے سے ہی توبہ کر لے گا۔ اِن کے نزدیک اُردو زبان نہ صرف اِن کے ملک اور اِن کے شہر کی لونڈی ہے، بلکہ اِن کے محلے، اِن کی گلی اور خود اِن کے گھر میں جو اُردو بولی جاتی ہے، وہی مستند اور نستعلیق ہے۔

آپ محفل میں جب اپنا مقالہ پڑھتے ہیں تو وہ منظر بھی قابلِ دید ہوتا ہے۔ ہر ہر جملے پر رُک کر حاضرین کی جانب ایک فخریہ انداز سے دیکھتے ہیں، جیسے کہہ رہے ہوں کہ 'دیکھیں اس سہرے سے بڑھ کر کوئی کہہ دے سہرا'۔ اور پھر داد کے منتظر رہتے ہیں، جو عموماً صرف صاحب کتاب کی طرف سے ہی موصول ہوتی ہے۔ بشیر بدر کی طرح یہ کوشش کرتے ہیں کہ جس طرح وہ پہلے مصرعے پر زبردستی داد وصول کرنے کے بعد دوسرا مصرعہ پڑھتے ہیں، اسی طرح یہ بھی پہلے جملے پر داد پا کر ہی آگے بڑھیں۔ مگر اکثر و بیشتر 'واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں' کا سماں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود انہیں اپنا مقالہ یا مضمون تو پڑھنا ہی ہوتا ہے کہ کھایا پیا حلال ہو۔ چنانچہ وہ اس سناٹے کو 'سکوتِ سخن فہم' سمجھ کر خود کو تسلی دیتے ہیں اور مقالے کی آخری سطریں پڑھنے تک 'پلٹنا، جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا' کی یہی کیفیت طاری رہتی ہے۔ البتہ جب وہ کسی صوفے پر بیٹھ کر مائیک پر مقالہ پیش کر رہے ہوں اور اُس صوفے پر اِن کے دائیں بائیں کچھ بدقسمت اشخاص مہمانانِ خصوصی یا ناظمِ محفل کے طور پر بیٹھے ہوں تو پھر جب حضرت نامی گرامی مقالہ پیش کرتے ہوئے دائیں بائیں گھوم کر اُن لوگوں کو متوجہ کرتے ہیں اور کچھ زورِ بیان سے کام لیتے ہیں تو اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اِن کے منہ کے 'پوپلے خلا' سے جو 'گلوریائی فائرنگ' ہوتی ہے، اُس کی زد میں آ کر اکثر اُن لوگوں کے شفاف ملبوسات پر سرخ سرخ نشان پڑ جاتے ہیں، جو بظاہر تو گلوری کی وجہ سے بنتے ہیں، مگر حضرتِ نامی گرامی کے کچھ حاسدین کا کہنا ہے کہ یہ نشان اِن کے مقالے کی وجہ سے اُن لوگوں کے لہولہان ہو جانے کے باعث نظر آ رہے ہیں!

آپ کتابوں پر مقالے اور مضمون لکھوانے کے علاوہ مختلف موضوعات پر اصلاحی مضامین بھی تحریر فرماتے ہیں، جن میں اُن تعلیمات اور اصولوں کا ذکر ہوتا ہے، جن پر انہوں نے خود کبھی عمل نہیں کیا۔ اپنے خورونوش اور بودوباش کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے اِن کا طریقۂ واردات کچھ ایسا ہے کہ اپنے 'اصلاحی' مضامین کا پلندہ بغل میں دبائے اشاروں کنایوں میں دوستوں سے کہتے رہتے ہیں کہ بھئی ہمیں بلاؤ کہ ہم آپ کے دولت کدے پر کچھ خیر و برکت کا سامان لائیں۔ اکثر محفلوں میں نئے آنے والے اِن کا ہدف بنتے ہیں اور پھر اِن نئے لوگوں کے ہاں موصوف کی لچھے دار گفتگو کے ذریعے چند دعوتوں کا سامان ہو جاتا ہے اور جب تک وہ نیا آدمی اِن سے ادب چکا ہوتا ہے، موصوف کچھ اور نئے دوست بنا کر وہاں اپنی مستقبل کی دعوتوں کا سامان کر چکے ہوتے ہیں۔

یہاں ہمیں یاد آیا کہ ماشاء اللہ اس عمر میں بھی (ستر سے کچھ اوپر ہی ہوگی) آپ ایک وقت میں تین چار وقتوں کا کھانا بڑی سہولت سے کھا لیتے ہیں۔ البتہ ماضی میں اِن کے ساتھ ایک 'خوراکی حادثہ' ضرور پیش آیا تھا، جس کے بعد کچھ عرصہ تک یوں ہوتا رہا کہ جہاں کہیں اِن کی دعوت ہوتی، میزبان طرح طرح کی ڈشوں کے ساتھ ساتھ ایمبولینس اور فرسٹ ایڈ کا انتظام بھی کر کے رکھتے تھے، بلکہ اُڑتی سی خبر تو یہ بھی ہے کہ کہیں کہیں تو تجہیز و تکفین کے انتظامات بھی کر لیے جاتے تھے۔ اس 'خوراکی حادثے' یا 'خوش خوراکی حادثے' کا سبب اِن کا ندیدہ پن کچھ یوں بنا، کہ ایک دعوت میں شدت خلوص کے ساتھ ایک بھنی ہوئی چانپ میں سے سارا گوشت نوچنے اور چوسنے کے باوجود بھی ان کا یہ خیال تھا کہ چانپ کی ہڈی کے آخر میں کہیں گوشت کا تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا ہے، جسے دانتوں سے توڑنا یا انگلیوں سے کھینچنا ممکن نہیں۔ مگر اُسے چھوڑنا بھی انہیں گوارا نہ تھا۔ چنانچہ 'چوس کر کھینچنے' کی کوشش میں وہ چانپ کی ہڈی اِن کے گلے میں اُتر گئی۔ موصوف واقعی مرتے مرتے بچے اور ایک "Major" آپریشن کے ذریعے وہ ہڈی نکالی گئی۔ مگر اِس کے باوجود اِن کی چرب زبانی اور دعوتیں وصول کرنے کی خصلت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ البتہ اب یہ احتیاط ضرور کرنے لگے ہیں کہ دعوت ملنے پر یہ فرمائش کر دیتے ہیں کہ گوشت کی چاہے جتنی ڈشیں بھی بنائی جائیں کوئی حرج نہیں، مگر ہڈی والا گوشت نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اب شہر میں جونہی کوئی کتاب شائع ہوتی ہے 'بون لیس' گوشت کی فروخت میں اضافہ ہو جاتا ہے، جب کہ ہڈیاں شہر میں کتوں کی ضیافت کا سامان بنتی ہیں۔ حالاں کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اِن ہڈیوں کے صحیح حق دار تو ہمارے یہی نقاد حضرت نامی گرامی ہیں!

پسِ تحریر: اگر حضرت نامی گرامی کے اس خاکے کے مطالعے کے بعد کسی صاحب کتاب کو اپنی کتاب پر تبصرے کے لیے اُن سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت ہو اور اَب تک کسی اور ذریعے سے رابطہ قائم نہ ہو پایا ہو تو 'زیرِ دستخطی ہٰذا' سے رابطہ کریں!

* *

نظیر صدیقی مرحوم

نظیر صدیقی

بعض لوگوں کے مرنے کی خبر سننے کے بعد بھی یقین نہیں آتا کہ وہ مر گئے ... لیکن نظیر صدیقی ان مرنے والوں میں سے ہیں، جن کے مرنے کی اطلاع سن کر یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہی کب تھے جو اَب مر گئے۔ بہر حال وہ کبھی زندہ رہے ہوں یا نہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ پرسوں رات کے تین بجے وہ جاں بحق ہو گئے۔ آپ قدرتی طور پر یہ جاننے کے لیے بیتاب ہوں گے کہ کس مرض نے مرحوم کو ٹھکانے لگایا۔ اس میں شک نہیں کہ مرحوم بہت سے امراض کا مسکن یا مجموعہ تھے، لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ان کی موت مرض کی بجائے خودکشی کا نتیجہ تھی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے اِس معاملے میں نہ تو پستول سے کام لیا اور نہ ریل کی پٹری سے، کیوں کہ پستول ان کے پاس تھا ہی نہیں اور ریل کی پٹری پر مرنا انہیں پسند نہ تھا۔ دراصل ان کی پوری زندگی ہی تدریجی خودکشی بن کر رہ گئی تھی۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ ان کی موت ان کی خودکشی کی تکمیل کا دوسرا نام ہے تو غلط نہ ہوگا۔

مرحوم نے شادی نہیں کی تھی اس لیے اُنہوں نے اپنے پیچھے کوئی یتیم نہیں چھوڑا۔ لیکن وہ خود ان یتیموں میں سے تھے، جن کے والدین بقیدِ حیات ہوتے ہیں۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے نظیر صدیقی ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے مسلمان ہونے میں اسی حادثے یا اتفاق کو دخل تھا۔ وہ لڑکپن کے زمانے تک غیر معمولی طور پر خدا پرست رہے۔ اس کے بعد خدا کے وجود پر ان کا ایمان تو باقی رہا، لیکن پرستش اُنہوں نے انسان کی شروع کردی۔ ان کی انسان پرستی ترقی پسندوں کے مانند نہ تھی، جن کے نزدیک انسان کے معنی صرف مفلوک الحال طبقے کے لوگ ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسانی حسن کے بڑے پرستار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جس خلوص اور شدتِ جذبات کے ساتھ اُنہوں نے انسانی بتوں کی پرستش کی اگر اس خلوص اور شدتِ جذبات کے ساتھ خدا کی عبادت کرتے تو ان کا شمار ان لوگوں

میں ہوتا، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ مگر انہوں نے خدا کو پانے کی کوشش نہیں کی اور انسانی بتوں کو کوشش کے باوجود نہ پاسکے۔ یہاں ایک واقعے کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ ان کے ایک ہم پیشہ و ہم مشرب دوست چند روز کے لیے ان کی کتاب 'زہرِ عشق' (از شوق لکھنوی) لے گئے۔ جب اس کی واپسی میں غیر معمول تاخیر ہوئی تو مرحوم نے اپنے عزیز دوست کو لکھا کہ 'زہرِ عشق' جلد سے جلد واپس کردو، کیوں کہ عشق تم کرتے ہو اور زہرِ عشق میں۔ اس لیے 'زہرِ عشق' میرے ہی پاس رہنی چاہیے۔ اگر آپ اِس جملے کی ظرافت سے لطف اندوز ہوتے وقت اس کی صداقت کو نظر انداز نہ کریں تو مرحوم کو سمجھنے میں نسبتاً زیادہ کامیاب ہوں گے۔

نظیر صدیقی مریض پیدا ہوئے اور مریض مرے۔ وہ جسمانی اور ذہنی دونوں اعتبار سے مریض تھے۔ جسمانی صحت کے لیے تمام عمر طبیبوں کی دوا کھاتے رہے اور ذہنی صحت کے لیے ترقی پسندوں کا ادب پڑھتے رہے لیکن بقول میرؔ:

شفا اُن کی تقدیر ہی میں نہ تھی

خدا کا شکر ہے کہ مرحوم افسانہ نگاری یا ناول نگاری کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ ان کی ادبی دلچسپی کا مرکز تنقید نگاری تھا۔ ادب کی اس صنف نے ان کی مریضانہ ذہنیت کا بھرم کھلنے نہ دیا۔ کیوں کہ تنقید میں مریض بھی محتسب بن جاتا ہے اور بن سکتا ہے، لیکن افسانہ نگاری اور ناول نگاری میں محتسب بھی مریض معلوم ہوتا ہے۔

مرحوم کی ابتدائی تعلیم اتنی گھٹیا ہوئی تھی کہ اس کی تلافی بعد کی اعلیٰ تعلیم سے بھی نہ ہوسکی۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ایم اے تک تعلیم پانے کے باوجود وہ اُردو اور انگریزی نہ صحیح پڑھ سکتے تھے نہ صحیح بول سکتے تھے۔ قدرت کی یہ ستم ظریفی عجیب ہے کہ اس نے انہیں زبان و بیان کے معاملے میں حد درجہ حساس تو بنا دیا تھا، لیکن انہیں ایسے ماحول سے محروم رکھا، جو زبان کی صحت اور بیان کی نزاکتوں پر قادر ہونے میں معاون ہوتا ہے۔

مرحوم کو تعلیمی اداروں کی ملازمت بہت پسند تھی۔ خصوصاً پروفیسری انہیں بہت محبوب تھی۔ وہ ایک کالج میں اُردو کے پروفیسر ہو بھی گئے تھے۔ پروفیسر ہونے کے بعد وہ اکثر سوچا کرتے کہ وہ اس معزز پیشے کے اہل ہیں بھی یا نہیں۔ لیکن جب ان کا دل یہ کہتا کہ وہ اس معزز پیشے کے اہل نہیں تو

انہیں اس خیال سے تسکین ہوتی تھی کہ یہ شعبہ ان سے بھی زیادہ نا اہلوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مرحوم کی آنکھیں گہری نیند سے ہمیشہ نا آشنا رہیں۔ اس معاملے میں وہ ان لوگوں کی ضد تھے، جن کی نیند میں بارات کا شور بھی خلل انداز نہیں ہونے پاتا۔ مرحوم کا حال یہ تھا کہ پتا کھڑکا اور وہ جاگ اُٹھے۔ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر انہیں یہ خیال اکثر آتا کہ اگر وہ پروفیسر ہونے کی بجائے پہرے دار ہوتے تو ملازمت کا حق ادا کرنے میں زیادہ کامیاب رہتے۔

مرحوم کو اپنی جن حماقتوں کا نہایت اذیت ناک احساس تھا اُن میں سے ایک حماقت یہ تھی کہ اُنہوں نے اپنی تعلیمی زندگی میں تقریر کرنے کی مشق بالکل نہیں کی تھی۔ مقرر بننا ان کی زندگی کے پروگرام میں شامل ہی نہ تھا۔ لیکن پروفیسر بننے کے بعد تقریر و مباحثے سے بچنا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ چنانچہ انہیں بادلِ ناخواستہ دونوں ہی میں حصہ لینا پڑتا۔ نتیجہ ظاہر ہے یعنی پروفیسر ہونے کے باوجود اچھی تقریر نہیں کر پاتے تھے۔ تقریر سے پہلے اور تقریر کے بعد کئی دن تک عجیب ذہنی عذاب میں مبتلا رہتے۔ تقریر سے پہلے یہ سوچتے رہتے کہ کہنا کیا ہے اور تقریر کے بعد اپنے آپ کو اِس بات پر کوستے رہتے کہ کیا کہنا تھا اور کیا کہہ گئے۔ جب میں ان کی اشک شوئی اور ہمت افزائی کے لیے ان سے کہتا کہ اچھی تقریر بغیر طویل مشق و مزاولت کے نہیں کی جا سکتی تو جواب میں کہتے آپ کا خیال صحیح مزاولت کے بغیر بھی نہ ہونی چاہیے۔ خصوصاً میرے ایسے تعلیم یافتہ شخص کی زبان سے نہ جانے کیوں میرا دماغ جلد یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ مجھے کس خاص موقع یا موضوع پر کیا کہنا ہے اور کس طرح کہنا ہے۔ اپنی اس کمزوری کی بنا پر میں خود اعتمادی سے محروم ہوں۔ دراصل میں نہیں جانتا کہ اپنی اس کمزوری کی بنا پر خود اعتمادی سے محروم ہوں یا خود اعتمادی سے محروم ہونے کے باعث اس کمزوری میں مبتلا ہوں۔

مرحوم ان لوگوں میں سے تھے، جو اپنی کمزوریوں سے چشم پوشی نہیں کرتے۔ وہ اپنے محتسب آپ تھے۔ اُنہوں نے اپنی کمزوریوں سے حتیٰ الامکان دوسروں کو نقصان نہیں پہنچنے دیا۔ البتہ انہیں دوستوں اور دشمنوں سے یکساں طور پر چھپاتے رکھنے کی کوشش ضرور کی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کسی آدمی کی کمزوریوں کو نہ تو اس کے دوست معاف کرتے ہیں اور نہ اس کے دشمن۔ اس باب میں دوستوں اور دشمنوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ دوست پیٹھ پیچھے مزے لے لے کر ان کمزوریوں کا مضحکہ اُڑاتے

ہیں اور دشمن موقع پا کر یا نکال کر فاتحانہ مسرت کے ساتھ ان کمزوریوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

مجھے مرحوم کے احباب اور شناساؤں میں کوئی شخص ایسا نہ ملا، جو ان کی شرافت کا قائل نہ ہو، لیکن اس سلسلے میں خود ان کا اپنا خیال عجیب و غریب تھا۔ ایک مرتبہ دورانِ گفتگو مجھ سے کہنے لگے۔ یار! میں بہت شریف آدمی ہوں اور بہت ہی ذلیل بھی۔ دوسروں کو میرے شریف اور مجھے اپنے ذلیل ہونے کے ثبوت اکثر ملتے رہتے ہیں۔ لوگ میرا احترام کرتے ہیں، لیکن میں اپنا احترام آپ کبھی نہ کر سکا۔ دوسرے لوگ مجھے جس قدر بھی عزت کی نگاہ سے دیکھیں، لیکن میں اپنی نگاہ میں ذلیل ہی رہا۔ میں نہیں جانتا کہ مجھ میں جو خرابیاں ہیں وہ میری سرشت میں تھیں یا ماحول کے اثر سے میری سرشت بن گئیں۔

اپنے بارے میں مرحوم کا خیال جتنا بھی بُرا ہو، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرحوم اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود خاصے اچھے آدمی تھے۔ ہر ایک سے اچھا سلوک کرتے تھے۔ خدا ان کے ساتھ کیسا سلوک کرے گا یہ کہنا مشکل ہی نہیں محال بھی ہے۔ ویسے ان کے ایک دوست کا قیاس یہ ہے کہ ان کے ساتھ خدا کا جو سلوک بھی ہوگا افسوس ناک ہی ہوگا۔ یعنی اگر جہنم کی نذر کیے گئے تو یہ تو افسوس ناک ہوگا ہی، لیکن اگر جنت میں بھیج دیے گئے تو یہ اور زیادہ افسوس ناک ہوگا کیوں کہ اُنہوں نے دنیا میں جن لوگوں کو جنت میں جانے کی تیاری کرتے دیکھا تھا ان میں سے بیشتر ایسے تھے کہ ان کے ساتھ اگر انہیں دو منٹ بھی بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوتی تو ان کا دم گھٹنے لگتا۔

مرحوم بظاہر بالکل نارمل آدمی معلوم ہوتے تھے، لیکن انہیں اپنے آپ پر ہمیشہ ابنارمل ہونے کا شبہ رہا، جس کا ایک خاص سبب ان کی ذہنی کیفیت بھی تھی۔ ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگے کہ میں کچھ عجیب آدمی ہوں۔ میری طبیعت یا تو مشتعل "Excited" رہا کرتی ہے یا مضمحل "Depressed" میں ذہن میں یا تو اقبالؔ و جوشؔ کی سی نظمیں کہتا رہتا ہوں یا میرؔ و فانیؔ کے سے اشعار۔ مجھے یا تو بڑے بڑے کارناموں کا بھی سرانجام پانا آسان معلوم ہوتا ہے یا پھر چھوٹے سے چھوٹا کام بھی دشوار نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ میرا خون یا تو بالکل گرم رہتا ہے یا بالکل سرد۔

مرحوم تنگ دلی سے جس قدر دُور تھے تنگ دستی اُن سے اتنی ہی قریب تھی۔ مگر یہ بات ایسے لوگوں کی سمجھ میں کیسے آسکتی ہے، جو والدین کی موجودگی اور بیوی بچوں کی عدم موجودگی کو اقتصادی آسودگی کی ضمانت سمجھتے ہیں۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ انہیں اچھا کھانے اور اچھا پہننے کی توفیق بہت

کم نصیب ہوئی۔ ایک مرتبہ بڑی مشکلوں سے وہ ایک سوٹ بنانے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن ایک سال تک ٹائی نہ خرید سکے۔ آخر کار مجبور ہو کر انہوں نے اپنے ایک عزیز اور بے تکلف دوست سے فرمائش کی کہ اب کی ہندوستان جاؤ تو وہاں سے میرے لیے ایک اچھی مگر سستی ٹائی لیتے آنا۔ ان کے دوست ہندوستان گئے تو اپنے لیے دو سوٹ لیتے آئے اور مرحوم کے لیے ٹائی لانا بھول گئے۔ جب مرحوم نے ٹائی مانگی تو کہنے لگے، میاں ٹائی خرید کر نہیں لگائی جاتی دوستوں سے چھین لی جاتی ہے، چوں کہ تم چھیننے کے فن سے واقف نہیں اس لیے میں اپنی ایک ٹائی تمہیں بخش دوں گا۔ اس پر مرحوم نے کہا ہاں بھئی میری زندگی کا مدار اب دو ہی چیزوں پر رہ گیا ہے۔ دنیوی زندگی کا مدار بخشش پر اور اُخروی زندگی کا مدار بخشائش پر۔ تم مجھے ٹائی بخش دو۔ خدا میرے گناہ بخش دے گا۔

مرحوم کی ایک بد نصیبی یہ تھی کہ وہ جس گھریلو تنہائی کے آرزو مند تھے وہ انہیں کبھی میسر نہ آئی اور جس روحانی یا جذباتی تنہائی نے ان کی زندگی کو ویران کر رکھا تھا اس سے انہیں کبھی نجات نہ مل سکی۔ ان کا قول تھا کہ اپنے گھر میں اکیلے رہنا حیات بخش مسرت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور دنیا میں اکیلے رہنا جانگسل محرومی ہے، لیکن ان کے ساتھ ہوا یہی کہ ان کا گھر ان کے خاندان کے افراد سے بھرا ہوا تھا اور وہ دنیا میں اکیلے تھے۔

مرحوم طبعاً بڑے نرم دل واقع ہوئے تھے، لیکن انہیں ہر غلط اور غیر منصفانہ بات پر شدید غصہ آتا تھا۔ اگر ظلم اور زیادتی کرنے والا ان کے قابو سے باہر ہوتا تو صرف یہ کہہ کر رہ جاتے کہ جی چاہتا ہے حرامزادے کو اتنا ماروں کہ خود مجھے رحم آنے لگے۔

قدرت کی طرف سے مرحوم کو جہاں دُکھا ہوا دل نصیب ہوا تھا وہاں شگفتہ طبیعت بھی ملی تھی۔ دوستوں کی محفلوں میں وہ ہمیشہ ہنستے ہنساتے پائے گئے۔ ان میں مذاق کرنے اور مذاق سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت خاصی تھی۔ البتہ بد مذاقی کو مذاق سمجھنے کی صلاحیت بالکل نہ تھی۔ اس وقت مجھے ان کا ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک مرتبہ وہ ایک ایسے دوست کے یہاں گئے، جو اپنے نوکروں سے لے کر دوستوں تک کو "ارے خانہ خراب" کے الفاظ سے خطاب کرتے تھے۔ باتوں باتوں میں اُنھوں نے مرحوم کو بھی خانہ خراب کہہ دیا۔ اس پر مرحوم نے کہا۔ دیکھیے حضرت! یہ الفاظ اگر آپ میرے گھر پر استعمال کرتے تو مجھے اعتراض نہ ہوتا، لیکن یہاں ان کا استعمال اس لیے غلط ہے کہ خانہ آپ کا ہے اور خرابی میری ہو رہی ہے۔

انور احمد علوی

یوں تو مرحوم عام اور نجی صحبتوں میں ہمیشہ ہنستے بولتے نظر آتے تھے، مگر جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں جلوت کے نظیر صدیقی خلوت کے نظیر صدیقی سے قطعاً مختلف تھے۔ تنہائی میں میں نے انہیں اور انہوں نے اپنے آپ کو اکثر افسردہ اور آزردہ پایا۔ نہ صرف دنیا سے آزردہ بلکہ اپنے آپ سے بھی۔ مجھ پر یہ راز آخر تک نہ کھلا کہ وہ اپنے آپ سے خفا ہونے کے باعث دنیا سے خفا تھے یا دنیا سے خفا ہونے کے باعث اپنے آپ سے بھی خفا تھے۔

مرحوم کی زندگی اقتصادی، ذہنی اور جذباتی بحران کا ایک ایسا سلسلہ تھی، جو ان کے مرنے سے پہلے کبھی نہیں ٹوٹا۔ اپنے بحران و ہیجان پر قابو پانے میں انہیں اپنے پسندیدہ گاؤں اور موسیقی سے بڑی مدد ملتی تھی۔ لیکن اس باب میں ان کی محرومی یہ تھی کہ انہیں نہ تو گراموفون رکھنے کی استطاعت تھی نہ ریڈیو رکھنے کی۔ تاہم جب کبھی اور جہاں کہیں اپنی پسند کا کوئی گانا سن لیتے تو اپنے سارے دُکھ درد کو بھول جاتے یا اُن پر غالب آنے کی قوت اپنے اندر محسوس کرنے لگتے۔ اچھا گانا سن کر ان کی خود اعتمادی واپس آجاتی اور انسانیت سے اُن کا اُنس بیدار ہو جاتا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر دنیا کی ساری قومیں شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر کی بجائے، طاؤس و رباب اوّل، طاؤس و رباب آخر، کے اُصول پر عمل کرنے لگیں تو دنیا میں وہ امن و آشتی قائم ہو جائے، جس کا خواب ہمیشہ دیکھا گیا ہے، لیکن جس کی تعبیر یُو این او کے باوجود نظر نہیں آئی۔

زندگی کے ہاتھوں اچھی طرح پٹنے کے بعد مرحوم نے رواقی فلسفے پر عمل کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہیں اپنے آپ پر یہ گمان بھی ہو چلا تھا کہ انہوں نے اپنے جی کو مار لیا ہے اور دنیا کے نشاط و الم اور سود و زیاں سے بلند ہو چکے ہیں۔ شاید اسی ذہنی رویّے کا ردِّ عمل تھا کہ جب کوئی دل آویز صورت ان کے سامنے سے گزرتی تو وہ غالب کا یہ شعر ضرور پڑھتے:

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

چوں کہ مجھے ان کے رازدار ہونے کا شرف حاصل ہے اس لیے ایک مرتبہ میں نے ان سے سنجیدگی سے پوچھا۔ کیا واقعی آپ نے اپنے جی کو مار لیا ہے؟ کہنے لگے کوشش تو ضرور کرتا ہوں، لیکن جی کو مار لینا اتنا آسان نہیں جتنا میں نے سمجھ لیا ہے۔ جام و سبو کو توڑ بیٹھنا اِس بات کی ضمانت نہیں کہ بادۂ گلفام کی آرزو جاتی رہی۔

رنگِ ادب پبلی کیشنز

نظیر صدیقی ...... نظیر صدیقی مرحوم

مرحوم بڑے صلح کل قسم کے آدمی تھے، لیکن ان کی ساری زندگی اپنے حالات وجذبات سے لڑتے گزری۔ جذبات کے معاملے میں وہ صرف جسمانی تسکین کے قائل نہ تھے، بلکہ روحانی تسکین پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ ایک محبت آمیز بوسہ ایک غیر محبت آمیز وصال سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

مرحوم خاصے ذہین آدمی تھے، لیکن ان کی ذہانت آڑے وقت کام نہ آتی تھی۔ وہ ایک ایسے مقرر تھے، جس کو اپنی تقریر کی اہم باتیں تقریر کے بعد بجھائی دیتی تھیں۔ وہ ایک ایسے معلم تھے، جو کلاس سے نکلنے کے بعد اپنے شاگردوں کو بہتر نکتے بتا سکتا تھا۔ وہ ایک ایسے اُمیدوار تھے، جو انٹرویو ختم ہونے کے بعد ہر سوال کا صحیح جواب دے سکتا تھا۔ غرض کہ انہیں پٹنے کے بعد بچنے کی تدبیریں خوب سوجھتی تھیں۔

مرحوم زندگی بھر صحیح زبان بولنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن کامیاب کبھی نہ ہوئے۔ نہ جانے کیوں صحیح اور مناسب الفاظ وقت پر ان کا ساتھ نہیں دیتے تھے اور جب غلط الفاظ اُن کی زبان سے نکل جاتے تو فوراً صحیح الفاظ رئیسانہ انداز سے ان کے ذہن میں تشریف لے آتے۔ مرحوم نے بچپن یا لڑکپن میں آنکھ مچولی کا کھیل کھیلا ہو یا نہیں، لیکن الفاظ زندگی بھر ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے رہے۔

مرحوم اپنے حافظے کی کمزوری سے سخت عاجز رہا کرتے تھے۔ ان کی یہ کمزوری بارہا ان کی سبکی کا باعث ہوئی۔ بے چارے اچھے سے اچھا شعر بھی یاد نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس کمزوری سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایک مرتبہ وہ ایک ڈاکٹر کے پاس گئے اور کہا کہ کوئی دوا ایسی دیجیے جس سے حافظے کی کمزوری دُور ہو جائے۔ ڈاکٹر نے انہیں ایک ایسی دوا دی، جو کھانا کھانے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد کھانا پڑتی تھی۔ لیکن جب ایک مہینے تک دوا کے استعمال کے باوجود دوا کھانے کا وقت بھولتے رہے تو انہوں نے ڈاکٹر سے جا کر کہا کہ ”جس دوا سے دوا کھانا بھی یاد نہ رہے اس سے اور کیا یاد رہ سکتا ہے۔“ جہاں تک مجھے علم ہے اس دوا کے بعد انہوں نے حافظے کی کمزوری کے لیے پھر کوئی دوا استعمال نہیں کی۔ ایک مرتبہ میں نے اُن سے کہا آخر آپ اپنے حافظے کی کمزوری کے لیے کوئی دوسری دوا کیوں نہیں استعمال کرتے۔ کہنے لگے کہ ”ممکن ہے کسی دوا سے حافظے کی کمزوری دُور ہو جائے، لیکن جب سرے سے حافظہ ہی نہ ہو تو دوا سے کیا ہوگا؟“

انور احمد علوی

نظیر صدیقی فرائض اور ذمہ داریوں سے بہت کتراتے تھے، لیکن جو فرائض اور ذمہ داریاں ان کے سارے پینترے اور پہلوتہی کے باوجود ان کو گھیر لیتی تھیں، ان کی انجام وہی میں وہ کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ وعدے وعید کے معاملے میں عموماً سچے پائے گئے، ویسے کبھی کبھی جھوٹ بھی بولتے تھے۔ غالباً اِس لیے کہ سچے آدمی اچھے نہیں مانے جاتے اور اچھے آدمی ہمیشہ سچ نہیں بولا کرتے۔ ساتھ ہی ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ انسانی سوسائٹی منافقوں کو برداشت کر سکتی ہے اور کر لیتی ہے، لیکن راست بازوں اور صاف گویوں کو ہرگز برداشت نہیں کرتی۔

مرحوم کی ایک خصوصیت عجیب و غریب تھی۔ وہ یہ کہ ان کا حافظہ جس قدر کمزور تھا اسی قدر انہیں شعر و اَدب کے بہترین ٹکڑوں کو یاد رکھنے کی خواہش رہا کرتی تھی۔ ان کی آواز جتنی خراب تھی اتنی ہی خوش آوازی کے ساتھ وہ گفتگو کرنے کے آرزومند رہا کرتے تھے۔ زبان جس قدر غلط بولتے تھے اسی قدر صحیح بولنے کی آرزو میں کھپے جاتے تھے۔ نغمہ و موسیقی سے جتنے محروم تھے اتنا ہی وہ ان چیزوں کو ترستے رہتے تھے۔ جس قدر پُرسکون و پُرسکوت ماحول میں رہنا چاہتے تھے، اتنے ہی شور و شغب کے ماحول میں انہیں رہنا پڑتا تھا۔ ان تمام باتوں نے ان میں ناتمامی، نارسائی اور ناآسودگی کا ایک ایسا احساس پیدا کر دیا تھا، جو ہر وقت انہیں ستاتا رہتا تھا۔ اِس اذیت ناک احساس نے ان سے زندہ رہنے کا حوصلہ چھین لیا تھا۔ وہ ہر وقت اپنے آپ سے اُلجھتے رہتے، اپنا احتساب کرتے رہتے اور اپنے آپ کو سزا دیتے رہتے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص ہمیشہ ذہنی کرب میں مبتلا رہتا ہوگا اور اس کے بارے میں یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ وہ کبھی سچی خوشی سے آشنا ہوا ہوگا۔

نظیر صدیقی میں خود اعتمادی کی بڑی کمی تھی۔ انہیں اپنے آپ پر اتنا بھی اعتماد نہ تھا جتنا ان کے جاننے والے ان پر اعتماد رکھتے تھے۔ انہیں اپنی زندگی میں کئی ایسے آدمی ملے جنہوں نے تعلقات کی مختصر مدت کے باوجود انہیں اپنا رازدار بنالیا۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ دوسروں کو دیرینہ تعلقات اور گہرے ارتباط کے باوجود اپنا رازدار بنانے سے احتراز کرتے تھے۔ شاید اس کی وجہ ان کا یہ عقیدہ ہو کہ راز رازدار کے سوا ہر ایک کے سینے میں محفوظ رہتا ہے۔

مرحوم کے بعض خیالات عجیب و غریب تھے۔ مثلاً وہ سنگ دل آدمیوں کو سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھتے تھے کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ جس دنیا کے لوگ چلتے پھرتے جیتے جاگتے انسانوں سے زیادہ افسانوی اور فلمی کرداروں پر ترس کھانے کے عادی ہوں اس دنیا میں سنگ دل

رنگِ ادب پبلی کیشنز

ہونا اپنے حق میں بڑی نعمت ہے۔ ان کا خیال تھا کہ حساس آدمیوں کو دنیا اتنی تکلیف نہیں پہنچاتی جتنی وہ خود اپنے آپ کو پہنچاتے ہیں۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں مرحوم انسانی حسن کے بڑے دلدادہ تھے۔ مگر اُن کی نظر حسن کے محبوب ہونے سے زیادہ مظلوم ہونے پر رہا کرتی تھی۔ انہیں اس خیال سے بڑا دُکھ ہوتا تھا کہ ہر زمانے میں حسن کے ساتھ جس قدر عیش وعیاشی کا تصور وابستہ رہا اتنا لطافت ونفاست کا نہیں۔ اس باب میں مجھے اُن کا یہ قول نہیں بھولتا کہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ”اچھی صورت پر بُری نظر حسن کا انعام بھی ہے اور انجام بھی۔“ مرحوم کسی حسین لڑکی یا لڑکے کو دیکھتے تو زیرِ لب اتنا ضرور کہتے۔ ”بہت حسین واقع ہوئے ہو۔ دنیا تمہیں اس جرم کی سزا دیے بغیر نہ چھوڑے گی۔“

مرحوم اسکول کی طالب علمی کے زمانے تک بڑے مذہبی تھے۔ پانچ وقت کی نماز پڑھتے، روزے رکھتے، تلاوت کرتے اور کبھی کبھی تہجد کی نماز بھی پڑھ لیتے تھے۔ لیکن عمر کے ساتھ ساتھ مذہب سے ان کی بیگانگی بڑھتی گئی۔ ایک مرتبہ اُنہوں نے ایک نوجوان کو نماز پڑھتے اور روزہ رکھتے دیکھا تو کہنے لگے۔ میاں نمازی یا روزہ دار بننے سے بہتر اچھا آدمی بننا ہے۔ اچھا آدمی بننے کی کوشش کرو۔ لیکن ان کی یہ نصیحت اِس نوجوان کی سمجھ ہی میں نہیں آئی کیوں کہ عام لوگوں کی طرح وہ بھی نمازی یا روزہ دار کو اچھے آدمی کا مترادف سمجھتا تھا۔ بہر حال مرحوم کو اس خبر سے کبھی خوشی نہ ہوئی کہ شہر میں نمازیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ وہ ہمیشہ اس خبر کے منتظر رہے کہ شہر میں چوروں اور رشوت خوروں کی تعداد گھٹ رہی ہے۔

مرحوم کو سیاسی واقعات اور حالات سے اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی عام آدمیوں کو ہوتی ہے۔ اسی لیے میں سیاسی اشخاص اور سیاسی اداروں کے متعلق ان کی رائے جاننے کا خواہشمند کبھی نہیں رہا۔ خود مرحوم بھی اِس باب میں غلط رائے ظاہر کرنے پر خاموش رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن ایک دفعہ ان کی موجودگی میں دو دوستوں کے درمیان یو این او کی دیانتداری کے متعلق گفتگو چھڑ گئی تو مرحوم یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ یارو! ایک ایسے ادارے کی دیانتداری کا قائل ہونا یا کسی کو قائل کرنا کیا معنی جہاں غیر جانبداری بھی غیر جانبداری نہیں ہوا کرتی۔

نظیر صدیقی کی ذات چھوٹوں خصوصا بچوں کے لیے یکسر محبت اور سراپا شفقت تھی۔ بچوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے مارنے پیٹنے کے قائل نہ تھے۔ اگر کسی بچے کو پٹتے دیکھتے تو اُسے

بچانے کی کوشش کرتے۔ ایک مرتبہ مرحوم اپنے ایک دوست سے ملنے گئے تو دیکھا کہ وہ اپنے لڑکے کی کسی غیر سعادت مندانہ حرکت پر بے حد خفا ہو رہے ہیں۔ مرحوم کو دیکھتے ہی کہنے لگے۔ نظیر صاحب! میرا خیال ہے غیر سعادت مند اولاد قوم کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ اس پر مرحوم نے کہا۔ آپ کا خیال صحیح نہیں۔ ''تو پھر اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہے؟'' دوست نے بڑی بے صبری سے پوچھا۔ مرحوم نے مفکرانہ انداز میں جواب دیا۔ قوم کی سب سے بڑی بدنصیبی غیر ذمہ دار والدین ہیں نہ کہ غیر سعادت مند اولاد۔

مرحوم کو انسانیت کے مستقبل سے مایوس بنانے میں روس اور امریکا کی سیاست کو اتنا دخل نہ تھا جتنا روزمرّہ زندگی میں عام لوگوں کی فرض ناشناسی اور بددیانتی کو۔ کہا کرتے تھے کہ جب آدمی معمولی معمولی باتوں میں ایمان اور توازن کھو دیتا ہے تو پھر بڑے معرکوں اور مقصدوں میں اس سے کیا اُمید کی جائے۔ جس دنیا میں محبت، شرافت، ہمدردی، صلح و آشتی اور عجز و انکسار کے پرچار کرنے والے خود ہی ان صفات سے محروم ہوں، اس دنیا کا حال ہولناک اور مستقبل معرضِ خطر میں کیوں نہ ہو۔

مرحوم اپنے ملک کے مستقبل سے صرف اس لیے مایوس ہو گئے تھے کہ یہاں کے لوگوں کو سڑک پر چلنے تک کا ڈھنگ نہیں آتا۔ اکثر کہا کرتے کہ جس ملک میں لوگ کاندھے پر چھاتا رکھ کر یا بغل میں چھتری دبا کر آگے پیچھے دائیں بائیں دیکھے بغیر سڑک پر چلنے کے عادی ہوں وہ ملک سقراط و بقراط پیدا کرلے تو کرلے، لیکن تہذیب و ترقی کے اعلیٰ منازل ہرگز طے نہیں کرسکتا۔

مرحوم کو انسان کی جس خصوصیت پر ہنسی بھی آتی تھی اور غصہ بھی وہ یہ ہے کہ انسان دوسروں کے احساسِ فرض اور خلوصِ جذبات کا ہمیشہ امتحان لیتا رہتا ہے، لیکن یہ کبھی نہیں دیکھتا کہ وہ خود اس امتحان میں کس حد تک کامیاب یا ناکامیاب رہا۔ دو آدمی کی اِس خصوصیت سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے کہ ایک برخود غلط آدمی دوسرے برخود غلط آدمی کو برداشت نہیں کرسکتا اور جو شخص خود ہی خودنمائی اور خودستائی کی کمزوریوں میں مبتلا ہے وہ دوسروں کی خودنمائی اور خودستائی کا مضحکہ اڑائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مرحوم کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا تھا۔ ان کی ابتدائی شاعری ان کے شوق کا نتیجہ تھی۔ اس وقت انہیں نہ تو شعر سمجھنا آتا تھا اور نہ شعر کہنا۔ جب شعر کہنے کی دقتیں ان کی سمجھ میں

آ گئیں تو اُنہوں نے شاعری ترک کر کے نثر نگاری شروع کر دی لیکن جب بی اے میں پہنچے تو ان کے دل میں پھر شعر کہنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ اس تحریک میں شوق کی بجائے ان کی شخصیت کو دخل تھا۔ اس زمانے سے لے کر مرتے دم تک ان کی شاعری کا سلسلہ جاری رہا۔ مرحوم کے اشعار سے تقریباً سبھی سننے والے متاثر ہوتے تھے، لیکن جب بعض خاص احباب انہیں ان کے اشعار کی داد دیتے تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر کہا کرتے۔ اچھے اشعار سے سبھی لوگ متاثر ہوتے ہیں سوائے اس شخص کے جس کے سلوک نے وہ اشعار کہلواتے ہیں۔ ایک مرتبہ میری موجودگی میں ان کے ایک نکتہ سنج دوست نے ان کے بعض اشعار کی نشتریت کی تعریف کی۔ اس پر مرحوم نے کہا۔ آپ کی تعریف سے مجھے خوشی تو ضرور ہو رہی ہے۔ لیکن جی یہی چاہتا ہے کہ کاش ایسے اشعار کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

کہا جاتا ہے کہ زندگی کا سب سے بڑا المیہ موت ہے۔ لیکن مرحوم کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ خود ان کی زندگی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی بھر زندگی کا رونا روتے رہے۔ ان کی شاعری اسی رونے سے عبارت ہے۔ اُنہوں نے شعر کے پردے میں بعض ایسی باتیں بھی کہی ہیں جنہیں ان کی زندگی کے ناگفتنی راز سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان کا قول تھا کہ شاعر جو باتیں روزمرہ زندگی میں کسی کو نہیں بتا سکتا انہیں اپنی شاعری میں بتا دیتا ہے اور جو باتیں شاعری میں بھی بتانے کے لائق نہیں ہوتیں انہیں وہ اپنی ڈائری میں چھوڑ جاتا ہے، لیکن زندگی میں بہت سی باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں نہ تو شاعری میں لایا جا سکتا ہے اور نہ ڈائری میں چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ مرحوم کی زندگی کے بہت سے راز ان کے ساتھ دفن ہو گئے اور اب ان کا معلوم ہونا محالات سے ہے، لیکن اگر مجھے ان کی ڈائری ہاتھ آ گئی اور روشنی ڈال سکوں۔ سرِ دست میں دعائے مغفرت پر اکتفا کرتا ہوں حالاں کہ مرحوم دعا کے قائل نہ تھے اور جب کوئی شخص انہیں کسی بات کی دعا دیتا تو وہ کہا کرتے:

”دعا سب کرتے آئے ہیں، دعا سے کچھ ہوا بھی ہو!“

* * *

انوار احمد علوی

ایک مکتوب بیوی کے نام!

نواب سیّد محمد آزاد

عفت بیگم!

میں تو یہاں پڑھنے آیا ہوں، مگر کیا خاک کتاب دیکھوں کوئی آن، کوئی وقت، کوئی لحظہ بھی تو آئینہ خیال کسی پری وش کے جلوہ سے خالی نہیں رہتا۔ جب کسی فرنگن کی واٹر سلک کی گون پر آنکھ پڑ جاتی ہے، مجھے تمہارا اگرنٹ کا پاجامہ کس نفرت سے یاد آ جاتا ہے۔ جب کسی کی میم کو دوسرے صاحب کے ساتھ بے تکلفانہ ناچتے کودتے دیکھتا ہوں، تمہاری شرم ایک تیر کی طرح دل کے پار ہو جاتی ہے۔ جب کسی معزز لیڈی کو بیف کے ٹکڑے پر ہاتھ صاف کرتے دیکھتا ہوں، تمہارا چپاتیوں کو حنائی انگلیوں سے کھنکھنانا یاد آتا ہے اور کیا جی گھبراتا ہے۔ یہاں کی عورتیں، واللہ عورتیں نہیں ہیں، تمہارے لکھنؤ کی بیگمیں نہیں ہیں کہ بھوت کا قصہ سن کر ڈریں، شیر کے نام سے کانپ جائیں، توپ کی آواز سے تھرتھرانے لگیں۔ ایک چپاتی کھانے پر غرور کریں۔ حضرت عباس کی درگاہ تک جانے کو حج کا سفر جانیں۔ حورانِ انگلستان ایک دم میں پرانے بھوت سر سے اُتار دیں۔ شیروں کے شکار کا تماشا دیکھنے جاتی ہیں۔ موقع اور محل سے ہاتھی پر بیٹھ کر گولی بھی لگاتی ہیں۔ سیر کرنے روم اور جزائر اور سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں پر، مرد احباب کے ساتھ، بلکہ اکثر اوقات تنہا بھی چلی جاتی ہیں۔ اپنے شوہروں کو وطن میں چھوڑ کر عجائباتِ روزگار دیکھنے دُور دراز ملکوں میں چلی جاتی ہیں اور اپنے تجربہ کو پختہ کرتی ہیں۔ بڑے بڑے لال کلّے اور سفید کلّے والے سفیروں سے ڈٹ کر ہاتھ ملاتی ہیں۔ کسی کے مر جانے سے برسوں لباس سیاہ پہن کر پیتی کھاتی اور ناچتی گاتی اور اُس کی رُوح کی دعوت میں مصروف رہتی ہیں۔ عمر بھر یار۔ سا بن کر گرجوں میں پادری صاحبوں کے ہاتھ پر صبح و شام توبہ کرتی ہیں۔

* * *

میری بھینس کوٹھے چڑھی

نواب مشتاق احمد خان

دودھ دینے والے جانوروں میں بھینس کا بھاری بھرکم جسم اور ڈیل ڈول جہاں گوالوں کی مداخلتِ بے جا (یعنی دودھ میں پانی یا پانی میں دودھ) کے باوجود ہمیں دودھ جیسی جنتی غذا کی نوید سناتا ہے وہاں اُس کی عقل اور سمجھ کے بارے میں ہماری قومی زبان کے صحیح یا غلط محاوروں کی یاد بھی دلاتا ہے۔ عقل بڑی کہ بھینس والی کہاوت آخر یونہی تو وجہ [illegible] نہیں آ گئی۔ بظاہر تو بھینس بڑی ہے۔ بھلا چھوٹی سی کھوپڑی میں اتنی عقل کہاں سما سکتی ہے کہ وہ بھینس کے حدود اربعہ کا مقابلہ کرسکے۔ اسی طرح بھینس کے سامنے بین بجانا، ایک عام محاورہ ہے، جس کسی کے ذہن کی یہ اختراع ہے، اُسے ضرور کوئی تلخ تجربہ ہوا ہوگا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اس کالی یا بھوری دیو ہیکل مخلوق (یہ علم حیوانات کے ماہر جانیں کہ کالوں کے ملک میں بھورے رنگ کی بھینس کہاں سے آ گئی) کی چال میں سست روی بھی ہے اور سلامت روی بھی۔ اُس کا ڈیل ڈول دیکھ کر پھرتیلا پن اُس سے کیسے منسوب کیا جاسکتا ہے، مگر اس کو کیا کیجیے کہ بلا اپنی مرضی اور خواہش کے جانوروں کے سلسلے میں اس بندۂ ناچیز نے کچھ شہرت حاصل کرلی ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ اِسی شہر لاہور میں قربانی کے لیے لائی جانے والی گائے نے قربان ہونے سے پہلے تہلکہ مچا دیا تھا اور میرے بیل نے 1965ء کی جنگ میں اُس بڑی نہر کو عبور کرلیا تھا، جسے بھارتی فوج عبور نہ کرسکی تھی۔ میری بھینس کیوں گائے اور بیل سے پیچھے رہتی، چنانچہ اس نے اپنے ڈیل ڈول کے ساتھ جسمانی کرتب کا وہ ناقابلِ یقین مظاہرہ کیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے اور مجھے مبارکبادیاں ملنے لگیں کہ میری بھینس دودھ ہی نہیں دیتی، بلکہ سرکس کے کرتب بھی دکھا سکتی ہے۔

انور احمد علوی

میرے حافظے میں بھینس کے بارے میں ایک ایسا واقعہ بھی ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ اس جانور کی نسبت سے مصیبت اور پریشانی میں ذہنی سکون بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ 1927ء میں برطانیہ میں مقیم ہندوستانی طلبا نے ایک ہاکی ٹیم بنائی اور یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں میچ کھیل کر رقیبانِ رُوسفید کو، آج کل کی طرح ایک دو گول سے نہیں، بلکہ درجنوں گولوں سے ہرایا۔ اسی فاتحانہ دورے میں بارسیلونا میں جو میچ ہوا، اُس میں ہمارے وطن کے اس بھاری بھرکم دودھ دینے والے جانور نے ایک ناقابلِ فراموش کردار ادا کر کے ہماری عزت کو دیارِ غیر میں بٹّہ لگنے سے بچا لیا۔

ہوا یوں کہ میچ شروع ہونے سے پہلے منتظمین نے ہماری ٹیم سے خواہش کی کہ اپنا قومی ترانہ پیش کریں۔ 1927ء میں ہمارا قومی ترانہ کہاں تھا، جو پیش کرتے اور اگر گاڈ سیو دی کنگ والا ترانہ گاتے تو نکو بن جاتے۔ ٹیم والے سب بے بسی کے عالم میں حیران و پریشان کھڑے تھے کہ اچانک اُن میں سے ایک منچلے نے "میری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا؟ کیوں مارا؟ وہ روز چرن کو جاتی تھی اور پیٹ بھرن کر آتی تھی۔ میری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا؟ کیوں مارا؟ بڑے ترنم سے گانا شروع کر دیا۔ ساری ٹیم نے اس کی ہمنوائی کر دی۔ ہزاروں تماشائی بڑے احترام سے یہ ایجادِ بندہ ترانہ سن رہے تھے اور ہم لوگوں کا ہنسی سے بُرا حال تھا۔ اس طرح بھینس کے واسطے سے ہمارا قومی بھرم قائم رہا۔

'کوٹھے چڑھنا' کا محاورہ کسی بات کے طشت از بام ہونے کے معنی میں سنا تھا۔ میری بھینس نے کوٹھے پر چڑھ کر واقعی سارا معاملہ طشت از بام کر دیا اور یہ جو کہتے ہیں، "نکلی ہونٹوں، چڑھی کوٹھوں" میری بھینس نے محاورے ہی کو اُلٹ کر رکھ دیا۔ وہ کوٹھے پر کیا چڑھی کہ گاؤں کے ہر شخص نے اُس کی جسمانی مہارت اور کرتب کے گن گانے شروع کر دیے۔ یہ کارنامہ کیسے انجام پایا، یہ بھی سن لیجیے:

گاؤں میں میرے مکان کے صحن میں دو بھینسیں چارہ کھا رہی تھیں۔ اس وقت تک تو ہمارے علم کی حد تک اُن دونوں میں بھائی چارے کے تعلقات تھے۔ اُس دن چارے کے معاملے میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا۔ اُن میں سے ایک جو زیادہ منہ زور تھی اور 'جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس' کے مروّجہ اُصول کی قائل تھی، شاید اپنے حصے سے کچھ زیادہ وصول کرنا چاہتی تھی۔ پہلے تو وہ دوسری

رنگِ ادب پبلی کیشنز

نواب مشتاق احمد خان ...... میری بھینس کوٹھے چڑھی

پر ذرا غرائی، پھر دونوں کے سینگ ٹکرائے اور دھکم پیل شروع ہوگئی۔ تھوڑی سی زور آزمائی کے بعد نرم مزاج بھینس نے پسپائی اختیار کرنا چاہی۔ مگر اُس بے چاری کے سامنے وہ ظالم خم ٹھونک کر کھڑی تھی۔

نرم مزاج بھینس کے لیے کوئی راہِ فرار نہ تھی، البتہ پیچھے کی طرف ہٹنا ممکن تھا جہاں کوٹھے پر چڑھنے کے لیے پتلی پتلی سیڑھیاں تھیں۔ اُس لالچی ظالم بھینس نے اپنے کمزور حریف کو اُسی طرف دھکیلنا شروع کیا اور اُس وقت تک دم نہیں لیا جب تک اُس کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کوٹھے پر نہیں پہنچا دیا۔ اس طرح وہ مظلوم بہ آں تن و توش اپنی مرضی کے بغیر اوپر چھت پر پہنچ گئی۔

جب گاؤں والوں نے یہ محیر العقول منظر دیکھا کہ ایک بھاری بھرکم جانور اپنی ذاتی کوشش کے بغیر کوٹھے پر پہنچ گیا تو ایک جم غفیر تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہوگیا اور سب سوچنے لگے کہ بھینس کوٹھے پر تو پہنچ گئی ہے، وہاں سے اُترے گی کیسے؟ اتنے میں زور آزمائی کے بعد تھکی ہاری بھینس نے جب ایک غیر مانوس مقام پر کھڑے ہوکر لوگوں کے اجتماع کو دیکھا تو وہ ڈر کر بدحواسی میں اس کوٹھے سے دوسرے پاس کے کوٹھوں پر دوڑنے لگی۔

ہم سب لوگ پریشان تھے کہ گاؤں کے کچے کوٹھوں کی چھتیں ایک بھینس کا وزن کیسے برداشت کرسکیں گی۔ یہ چھتیں تو بمشکل تمام انسانی بوجھ برداشت کرنے کی سکت رکھتی ہیں۔ وہ ایک بھاری بھرکم جانور کی چہل قدمی کے لیے میدان کیسے فراہم کرسکیں گی، اس لیے جب ہم اُسے ایک کوٹھے سے دوسرے پر جاتے دیکھتے تھے تو یہی ڈر لگتا تھا کہ اب کوئی شہتیر ٹوٹا اور چھت بیٹھ گئی اور اگر ایسا ہوا تو وہ دھڑام سے نیچے گر کر اپنے مکینوں کو بھی لے ڈوبے گی۔ یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں وہ خوفزدہ ہوکر کوٹھے کی منڈیر سے چھلانگ نہ لگادے۔

جنوبی ہندوستان میں سنا تھا کہ خوشی کے ماحول میں بچوں کی زبان پر ایک بڑا مقبول فقرہ آجاتا تھا "چہ خوش چرانہ غوری"، "چھپر سے بھینس کودی"۔ جو صورت ہمیں درپیش تھی وہ کوئی خوشی کا موقع نہ تھا۔ وہاں کوئی چھپر نہ تھا، جس پر یہ بچوں کی تصوراتی دنیا میں کوئی بھینس اپنی مرضی سے کودی ہوگی۔ یہاں دوسری صورت تھی۔ بھینس چھپر پر نہیں کوٹھے پر تھی۔ وہاں سے اُس کے کودنے پر بھلا ہمیں کیا خوشی ہوسکتی تھی، بلکہ بیٹھے بٹھائے یا کھڑے کھڑے پانچ چھ ہزار کا نقصان ہوجاتا۔

مگر الحمدللہ ایسا حادثہ پیش نہیں آیا اور میری بھینس کے سرکسی کرتب کی مہارت کا بھرم قائم رہا۔

اب سب کو فکر یہ تھی کہ اس ناخواندہ مہمان کو نیچے کیسے اُتارا جائے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے سوچ بچار کر کے یہ مشورہ دیا کہ چارے کے جس حصے سے اس کے ظالم رقیب نے اسے کوٹھے سے نیچے محروم کر دیا تھا، اُس کی تلافی کی جائے یعنی رکھوالا اسے سبز چارے کا ایک گٹھا دکھا کر اور پچکار کر آہستہ آہستہ اپنے قریب لائے اور جب وہ آجائے تو اُس کے سر پر اور ضرورت پڑے تو اُس کے جسم کے دوسرے حصوں پر دستِ شفقت پھیرے تاکہ اُس کی بدحواسی دُور ہو اور اُسے اپنی بلند مقامی کا احساس کم ہو جائے، چنانچہ یہی ترکیب آزمائی گئی۔ اُس کو رکھوالے نے سبز چارے کا گٹھا دکھا کر اُسے اپنے مخصوص انداز اور لہجے میں پچکارا تو وہ آہستہ آہستہ قدم جماتے ہوئے آگے بڑھی۔ چارے کو دیکھ کر اور سونگھ کر اُس کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ اُس پر منہ مارنے لگی۔ رکھوالے نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی ہوشیاری سے اُس کی آنکھوں پر ایک پٹی باندھ دی۔ اس کارروائی کا فلسفہ یہ تھا کہ وہ دیکھتی آنکھوں سے کبھی سیڑھیوں سے نیچے اترنے کے لیے تیار نہ ہوتی۔ پٹی باندھنے کے بعد رکھوالے نے چارہ اُس کے منہ سے لگائے رکھا اور اُس کے گلے کی رسّی سے اُسے نیچے کھینچنا شروع کیا۔ دو آدمی اُس کے ساتھ تھے، تاکہ اگر وہ لڑکھڑائے تو وہ بروقت سنبھال سکیں۔ ایک اور آدمی اُسے تھوڑے تھوڑے وقفے سے دھکیلتا رہا۔ اس طرح آدھ گھنٹہ کی صبر آزمائی کے بعد وہ سیڑھیوں سے نیچے اُتری اور جس طرح وہ بے خیالی اور اپنی مرضی کے بغیر اوپر چڑھی تھی، اُس طرح عالمِ بالا سے نیچے زمین تک پہنچ گئی۔

یہ سب کارروائی بخیر و خوبی انجام پا گئی۔ میں نے اس کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ کوٹھے کی سیڑھیوں کا راستہ بند کروا دیا تاکہ آئندہ مجھے اس قسم کے حادثات سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ سیڑھیوں کے راستے اگر ایک بھاری بھرکم بھینس چڑھ سکتی تھی تو بیل گائے خچر بھی چڑھ سکتے تھے اور پھر گاؤں میں جنگلی سور بھی ہوتے تھے۔ میں سوچتا تھا اگر اُن میں سے کسی نے کوٹھے کا رُخ کیا تو پھر میں کیا کروں گا۔

آخر میں بتاتا چلوں کہ تادمِ تحریر میری دونوں بھینسوں کے باہمی تعلقات خوشگوار ہیں، اس لیے کسی غیر متوقع فوری حادثے کا خطرہ نہیں۔

✡ ✡

اقبالستان سے خط

ن م راشد

پچھلے دنوں میں اپنے پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ چند خطوط نظر آئے، جو میرے بہت ہی قریبی عزیز نے، میرے نام اقبالستان سے لکھے تھے۔ اقبالستان کو آپ میں سے کون نہیں جانتا، یہ جنوب مشرق میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے، جہاں ہمارے کچھ بزرگ، جو اس بات سے نالاں تھے کہ پاکستان میں علامہ اقبالؔ مرحوم کی پوری قدر و منزلت نہیں ہو رہی، 1950ء میں پاکستان سے ہجرت فرما گئے تھے۔ اِس جزیرے میں اُنہوں نے دنیا بھر سے الگ تھلگ اپنی نئی دنیا بسالی تھی اور علامہ اقبالؔ کی تعلیمات کے مطابق اپنا سیاسی اور معاشرتی نظام قائم کر لیا تھا۔ جب علامہ اقبالؔ کی پہلی صد سالہ یادگار منائی گئی تو اقبالستان کی حکومت نے دوسرے خطوں کے علاوہ ایشیا سے بھی کچھ لوگوں کو شرکت کی دعوت دی تھی اور اِس طرح اپنے ملک کے کچھ روزن پہلی مرتبہ وا کیے تھے، تا کہ باہر کے لوگ بھی اُن کے اندر ایک حد تک جھانک سکیں۔ شہباز مرحوم کا یہ خط اُن کے سفر کی یادگار ہے۔ شہباز کا انتقال کراچی میں 1961ء کے اوائل میں ہو گیا تھا، اس لیے اُن سے خطوں کے بارے میں کبھی گفتگو نہ ہو سکی۔ حالاں کہ اُنہوں نے اپنے اِس دورے سے، جو نتائج اخذ کیے تھے اُن میں سے اکثر سے مجھے اتفاق نہ تھا۔ اور مجھے تعجب نہ ہوگا، اگر آپ میں سے اکثر حضرات بھی اُن سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرمائیں۔

اِس پہلے خط کی تاریخ 20 اپریل ہے:

”عزیز راشد! کوئی پانچ ہزار میل کی پرواز کے بعد ہم لوگ یہاں علامہ اقبالؔ کی برسی سے ایک دن پہلے پہنچ گئے۔ فضا سے جو کچھ نظر آیا، اُس سے اندازہ ہوا کہ یہ جزیرہ چاروں طرف سے جنگلات میں گھرا ہوا ہے۔ جزیرے کے بیچوں بیچ ایک بڑا ریگستان ہے اور ریگستان کے وسط میں اُس ملک کا دارالحکومت واقع ہے، جسے خودآبادی کہتے ہیں (عجیب نام ہے!) جس ہوا بندر پر ہم

اُتارے گئے، معلوم ہوا کہ حال ہی میں بنا ہے، تا کہ اِس برس کے موقع پر باہر سے آنے والے بڑے بڑے جہاز بخوبی اُتر سکیں۔ ہوا بندر پر ہمارا شاندار استقبال کیا گیا، ملک کی اَدبی انجمنوں کے علاوہ حکومت کے بہت سے سرکردہ کارندے بھی ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ جب ہم اُترے تو ہم نے دیکھا کہ جگہ جگہ دیواروں پر علامہ اقبالؔ کے بہت سے اشعار کندہ کیے گئے ہیں مثلاً:

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اِس شعر کا تو خیر موقع محل بھی نظر آتا ہے، لیکن:

دنیائے دُوں کی کب تک غلامی
یا راہبی کر یا بادشاہی

کا تُک سمجھ میں نہیں آتا۔ اِسی غزل کا مطلع ہے:

ہر شے مسافر ہر چیز راہی

لکھا گیا ہوتا تو بھی بات کچھ سمجھ میں آ سکتی تھی۔

ہوائی اڈّے پر اُترنے کے دو گھنٹے بعد ہمیں 'صاحبِ جنوں' کی خدمت میں پیش کیا گیا، جو یہاں کی حکومت کے سربراہ کا لقب ہے، جیسے ہمارے سامنے کسی زمانے میں گورنروں اور وزیروں کو عزت مآب اور فضیلت مآب کے القابات سے یاد کیا جاتا تھا۔ موجودہ صاحبِ جنوں چھٹے سربراہِ مملکت ہیں، اُنہوں نے حکومت ورثے میں پائی ہے، سنا ہے کہ یہ علامہ اقبالؔ کے ایک قریب ترین دوست کی اولاد سے ہیں، اُن کا نام شانِ بے نیازی ہے، جو غالباً علامہ اقبالؔ ہی کی کسی تصنیف سے فال نکال کر رکھا گیا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں اکثر نام اِسی طریقے سے رکھے جاتے ہیں۔ اِس نام میں خوبی یہ ہے کہ اگر اِسے اضافت کے بغیر پڑھا جائے تو ترکی نام معلوم ہوتا ہے۔ صاحبِ جنوں ایک چھوٹے سے مکان میں اپنے قومی لباس میں ملے، اُن کا قومی لباس وہی ہے، جو تم نے علامہ اقبالؔ کی بعض تصویروں میں دیکھا ہوگا۔ پرانے زمانے کی دیسی جوتی، شلوار اور فراک کوٹ، اوپر کمبل کی بکل اور سر پر کالی ٹوپی۔ سنا ہے اوائل میں ہندوستان کے اکثر و بیشتر شرفا یہی لباس پہنتے تھے۔

صاحبِ جنوں، اِس لباس میں بے حد بارعب اور باوقار دکھائی دیتے تھے۔ وہ اِس مختصر

ملاقات میں ہم سے پاکستان اور باقی ایشیا کے بارے میں طرح طرح کے سوال کرتے رہے۔ مثلاً پاکستان میں علامہ اقبال کی کتابیں مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں، یا نہیں؟ کیا پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ موجود ہے، جو علامہ اقبال کی تعلیمات کو فروغ دینے میں کوشاں ہو؟ پاکستان ایشیا کے وفاق میں کب اور کیوں کر شامل ہوا؟ پاکستان میں سنیما کی صنعت آذری تو رائج نہیں ہوئی! پاکستان میں کہیں عورت کو آزاد تو نہیں کر دیا گیا۔ پاکستان میں خودی بلند کرنے کا کیا انتظام کیا گیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ وہ اِس بات پر دیر تک افسوس کا اظہار کرتے رہے کہ اُن سے پہلے کی حکومتوں نے پاکستان اور دوسرے ایشیائی ممالک سے الگ تھلگ رہنے کی پالیسی قائم رکھی اور اُمید ظاہر کی کہ اَب جو ملاپ کی نئی بنیاد قائم کی گئی ہے اِس کے نتائج خوشگوار ثابت ہوں گے۔ ہم صاحبِ جنوں سے مل کر اُن کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے، بے حد ذہین اور دانا آدمی ہیں۔ انگریزی یا جرمن نہیں جانتے، لیکن یورپ کے فلسفیوں کے بارے میں بڑی واقفیت رکھتے ہیں، گفتگو میں نٹشے، برگساں اور ہیگل کے نام بار بار لیتے رہے، اِن فلسفیوں کے اکثر مقولے اُنہیں زبانی یاد ہیں۔

آج شام صاحبِ جنوں نے مندوبین کو دعوت دے رکھی ہے، کل کے یادگار جلسے میں شرکت کروں گا۔ اچھا ہوا تم نے چلتے چلتے جیبی ٹرانسمیٹر ساتھ لانے پر اصرار کیا۔ آج رات مریخ میں ضمیر سے بات کروں گا۔ اگر مشتری سے عینی کا کوئی پیغام آئے تو مجھے بھی مطلع کر دینا۔ ضیاء جالندھری سے میرا سلام کہو۔ غلام عباس بہت یاد آتا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔ کل شام کو پھر خط لکھوں گا۔"

تمہارا شہباز

دوسرا خط 22 اپریل کو لکھا گیا۔ یعنی برسی کی تقریبات کے ختم ہونے پر لکھتے ہیں:

"راشد عزیز! کل شام صاحبِ جنوں کی دعوت بڑی پُرتکلف رہی۔ میں تو لسی پیتا نہیں، لیکن اکثر مندوبین کو مشروب بے حد پسند آیا۔ کل برسی کے جلسے میں علامہ اقبال کی ذاتِ گرامی اور فلسفے پر بڑے بڑے مقالات پڑھے گئے۔ جلسہ علامہ اقبال کی مشہور نظم 'ساقی نامہ' کے کورس سے شروع ہوا۔ اِس دوران میں سب حاضرین دست بدستہ کھڑے رہے، کیوں کہ جلسہ گاہ کی دیواروں پر جگہ جگہ یہ تنبیہ کی گئی تھی کہ 'ساقی نامے' کے کورس کے دوران میں جو شخص کھڑا نہیں ہوگا، اُسے گرفتار کر کے سزا دی جائے گی۔ معلوم ہوتا ہے یہ لوگ اَز خود ایسے موقع پر تعظیم کے ابھی عادی نہیں

ہوئے۔ یوں میری اطلاع ہے کہ یہاں ہر گھر میں علامہ اقبال کی تصانیف غلافوں میں لپیٹ کر رکھی جاتی ہے۔

مقالوں میں بھول کر بھی اِس بات کا ذکر نہ تھا کہ علامہ اقبال کتنے بڑے شاعر تھے۔ بیشتر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ وہ دنیا بھر کے انسانوں سے بالا ہستی تھے۔ ایک مقالہ نگار نے اُنہیں پیغمبر ثابت کیا۔ ایک اور نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ انسان نہ تھے، بلکہ محض رُوح تھے، جنہیں زمین پر انسانوں کی رہنمائی کے لیے اُتارا گیا تھا۔ یہاں کے ادیب اور مقالہ نگار علامہ اقبال کی ذات، یا کلام کو پرکھنے سے بالکل قاصر ہیں۔ ایک تو یہاں عام تنقید نے ابھی تک وہ ترقی نہیں کی، جو ہمارے اپنے ملک میں ہوئی ہے، دوسرے ہر اَدبی تنقید کو یہاں بُری نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ خاص طور پر علامہ اقبال کے کسی شعر پر نکتہ چینی کرنا تو الحاد کے مترادف ہے۔ ہمارے ہاں بھی **1960**ء تک یہی دستور تھا، لیکن ہمارے ہاں گزشتہ ستر اسّی برس میں علوم و فنون نے، جو ترقی کی ہے اِس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہم کسی اَدبی نگارش کو محض تبرک سمجھ کر قبول نہیں کرتے، بلکہ اِسے خالص اَدبی نقطۂ نظر سے جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ اِس ملک میں ابھی صرف دس بارہ فیصد لوگ خواندہ ہیں، جیسے ہمارے ملک میں **1950**ء تک کی حالت تھی۔ خواندہ بھی یوں کہ دستخط کر لیتے ہیں، یا علامہ اقبال کی تصانیف بے سمجھے بوجھے یعنی 'ناظرہ' پڑھ لیتے ہیں۔ اصل میں اِن کی تعلیم میں سب سے بڑی رکاوٹ اِن کا رسم الخط ہے، تمہیں یاد ہوگا کہ ہمارے آبا و اجداد کے زمانے میں سب سے پہلے ترکی اور انڈونیشیا نے عربی رسم الخط ترک کیا تھا، پھر جب **1965**ء میں ایشیا کا وفاق قائم ہوا تو سارے خطے میں ایک نیا رسم الخط رائج کر دیا گیا، جو پرانے لاطینی رسم الخط پر مبنی تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ پاکستان میں بھی دوسرے ایشیائی ملکوں کی طرح دس بیس برس کے اندر اندر تعلیم کا تناسب ساٹھ فیصد ہو گیا تھا اور اَب خدا کے فضل سے سو فیصد ہے۔ یہ ابھی تک حروف کو دائیں سے بائیں لکھتے ہیں، لیکن اعداد کو بائیں سے دائیں۔ یہ بوالعجبی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ پھر اِن کا رسم الخط اِن کی زبان کی آوازوں کو پورے طور پر ادا نہیں کر پاتا۔ بعض آوازوں کو ادا کرنے کے لیے تین تین، چار چار نشانات موجود ہیں کہ اکثر حروف کی منفرد شکل اور ہے اور دوسرے حروف کے ساتھ مل کر شروع میں، یا وسط میں، یا آخر میں وہ اور ہی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مبتدی اس رسم الخط پر عمر بھر عبور نہیں پا سکتا۔ جب تک اسے فارسی اور عربی وغیرہ کا بھی پورا علم حاصل نہ ہو، یا اِن

زبانوں میں الفاظ کی ترکیب کے اُصول پورے طور پر نہ سمجھتا ہو، لیکن یہ لوگ رسم الخط کو بدلنے پر کسی طرح آمادہ نہیں۔ کل جلسے کے درمیان وقفے میں میری اِن کے عالموں کے ساتھ خاصی طویل گفتگو ہوئی، لیکن اِن کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر رسم الخط بدل دیا گیا تو لوگ علامہ اقبالؔ کی تصانیف کیسے پڑھ سکیں گے۔ میں نے اِنہیں بتایا کہ ہمارے ملک میں علامہ اقبالؔ کی تمام تصانیف نئے رسم الخط میں منتقل کی جا چکی ہیں، لیکن انہیں یقین نہیں آیا۔ اِن کے نزدیک رسم الخط کو خاص تقدس حاصل ہے اور اِسے بدلنا گناہِ کبیرہ کے مترادف ہے۔ ایک صاحب نے تو جوش میں آ کر یہاں تک کہہ دیا کہ اگر صاحبِ جنوں نے بھی رسم الخط بدل دیا تو میں اِن کی نافرمانی کروں گا۔ یہ لوگ رسم الخط کو ماضی کا ورثہ سمجھتے ہیں اور اِن کا خیال یہ ہے کہ اگر اِسے بدل دیا گیا تو اِن کی 'تہذیب' خطرے میں پڑ جائے گی۔ دراصل یہ لوگ بے حد ماضی پرست ہیں۔ اِن کی نظر آنے والے ہزاروں سال پر نہیں، بلکہ اپنی تہذیب کے گزشتہ سو برس تک جا کے رُک جاتی ہے۔ یہ زندگی کو دُوربین کے غلط سرے سے دیکھتے ہیں اور اِنہوں نے اپنے لیے ترقی کی سب راہیں مسدود کر رکھی ہیں، اسی طرح یہ لوگ ابھی تک طب یونانی کی پیرو ہیں۔ اور مسلم طب کے میدان میں پاکستان اور ایشیا کے دوسرے ملکوں نے جو ترقی کی ہے، اس سے استفادہ کرنے کے روادار نہیں۔ میں نے اِنہیں بہت سمجھایا کہ طب جدید جو پاکستان میں رائج ہے، طب یونانی ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے، لیکن یہ بات اِن کی سمجھ میں نہیں آئی، وہ بار بار یہ کہتے ہیں کہ جس علم کو ہمارے بزرگ اپنے ساتھ لائے تھے، اِسے ہم کیوں کر بدل دیں۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو بزرگوں کی روحیں ہمیں کبھی معاف نہ کریں گی۔ موسیقی میں بھی یہ لوگ اسی ڈگر پر چل رہے ہیں، جس پر 1961ء تک ہم چل رہے تھے۔ جب میں نے اِنہیں بتایا کہ ہم نے پوری دنیا کی موسیقی کے امتزاج سے ایک نئی موسیقی پیدا کی ہے، جس میں ہمارے نغمہ ساز نغمہ تالیف کر سکتے ہیں، او پیرا تیار کر سکتے ہیں اور جسے بڑے بڑے ایوانوں میں نوازا جا سکتا ہے تو یہ انگشت بدنداں رہ گئے۔ یہاں کے اخبار بھی میری نظر سے گزرے ہیں، اخباروں نے پاکستانی وفد کی خاص طور پر تعریف کی ہے۔ اِنہیں میرا ناقدانہ رویّہ ضرور ناپسند ہوگا، لیکن اس کا ذکر اخباروں نے نہیں کیا، اِنہیں سب سے زیادہ میرا نام پسند آیا اور اکثر نے اِس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ہم پاکستانی اپنا نام علامہ اقبالؔ کی تصانیف سے فال، نکال کر رکھتے ہوں گے۔ یہ ہمارے مشن کے حق میں بڑی مفید ثابت ہوئی، لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑی ہی

کوفت ہوئی کہ اِن کے ہاں، جو چند اخبار نکلتے ہیں وہ ہاتھ سے لکھے جاتے ہیں۔ آج صبح اِن کی طباعت کا یہ طریقہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، یہ طریقہ قریب قریب وہی ہے، جو ہمارے ہاں **1961**ء تک تھا۔ لیکن پاکستان میں اب اِس طریقے کو کون جانتا ہے۔ خود تم نے بھی شاید کتابوں میں اِس کا حال پڑھا ہو۔ واپس آؤں گا، تو تمہیں یہ مضحکہ خیز طریقہ سمجھاؤں گا، تاہم اِن لوگوں کو اِس پر بڑا ناز ہے اور کہتے ہیں کہ اِس کے بغیر طباعت میں حسن پیدا نہیں ہو سکتا۔ مجھے زندگی میں حسن پیدا کرنے کی کوشش ان کی طرف سے اور تو کہیں نظر نہیں آئی۔

دیکھو ممتاز حسین سے کہنا کہ اگر وہ اپنے تنقیدی مضامین کا مجموعہ مجھے یہاں بھجوا دیں، تو شاید اِن لوگوں کی تنقید کے میدان میں کچھ رہنمائی ہو سکے، لیکن اُنہیں یہ مجموعہ کاتب سے لکھوا کر قدیم رسم الخط میں چھپوانا ہوگا۔ میں سوچتا ہوں اِس کا، کیا انتظام ہوگا۔ شاید مولانا صلاح الدین احمد کے خاندان کے لوگوں میں کوئی پرانے بزرگ اب تک موجود ہوں، جو ان تنقیدی مضامین کو قدیم رسم الخط میں منتقل کر سکیں۔ اگر ممتاز حسین کا اپنا خط اچھا ہوتا تو کہتا کہ وہ اپنے ہاتھ ہی سے لکھ کر اِسے بلاک بنوا لیتے۔ بہر حال، یہ دیکھنا کہ اُس میں املا کی غلطیاں نہ رہ جائیں، ورنہ یہ لوگ ہمیں کبھی معاف نہ کریں گے، بلکہ پورے پاکستان کی طرف سے بد دل ہو جائیں گے۔

ضمیر، مریخ میں خیریت سے ہے۔ اگلی گرمیوں میں دو ماہ کی رخصت لے کر زمین پر آئے گا۔ کہہ رہا تھا میری تبدیلی عطارد میں ہونے والی ہے، لیکن معلوم نہیں کب اِسے آسمانی ٹیلی ویژن پر تو ہم نے کئی مرتبہ دیکھا ہے، لیکن رُو در رُو ملاقات دو برس کے بعد ہوگی۔ خدا حافظ۔

زندہ رہو اور خوش رہو۔ آفتاب سے سلام کہنا۔”

تمہارا شہباز

یہ تیسرا اور غالباً آخری خط ہے، جو میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ زیادہ تر اقبالستان کی ادبی اور معاشرتی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس میں بھی مرحوم شہباز نے اہلِ اقبالستان کی ظاہر پرستی کا رونا رویا ہے، لکھا ہے کہ یہاں بہت سی باتیں عجوبہ روزگار ہیں، بعض اُمور میں اِن لوگوں کی جدت طرازی ہمارے لیے سبق آموز بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ مثلاً اپنی مختصر سی ایئر لائن کو ’بالِ جبریل‘ کہتے ہیں۔ پولیس کے محکمے کا نام ’ضربِ کلیم‘ ہے۔ حال ہی میں جو ریڈیو اسٹیشن قائم کیا گیا ہے اُس کا نام ’بانگِ درا‘ رکھا گیا ہے۔ عجائب گھر کو ’ارمغانِ حجاز‘ پکارتے ہیں۔ ایک اور نیا محکمہ کھلنے والا

ہے، جو ملک کی تمام جماعتی اور ثقافتی زندگی کی رہنمائی کرے گا۔ اس کا نام 'اسرارِ رموز' تجویز کیا گیا ہے۔ سڑکوں کے نام بھی انہوں نے علامہ اقبالؔ ہی کے کلام سے لیے ہیں [illegible] 'جادۂ ابراہیمی' وغیرہ۔ آج صبح مجھے 'اِرمغانِ حجاز' دکھایا گیا۔ اِس میں اُن سب بزرگوں کی اصلی یا فرضی تصویریں ہیں، جن کے نام علامہ اقبالؔ کی تصانیف میں آئے ہیں۔ نظام حیدرآباد، نواب بھوپال، مسولینی وغیرہ سے لے کر نواب ذوالفقار علی اور جوگندر سنگھ تک سب کی تصویریں موجود ہیں۔ ایک کمرے میں علامہ اقبالؔ کا حقہ اور چھڑی اور ایسی ہی اور کئی سوغاتیں رکھی ہوئی ہیں، جو اقبالستان کی پہلی نسل کے لوگ پاکستان سے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ اسی کمرے کے ایک کونے میں 'علی بخش' کا مجسمہ مجھے بے حد پسند آیا، اِس مجسمے کے چہرے کی سادہ، لیکن پُرمعنی دیہاتی مسکراہٹ دل پر عجیب اثر کرتی ہے۔

پرسوں مجھے یہ لوگ اپنا سب سے بڑا قومی کھیل دکھانے لے گئے، اِس کھیل کا نام تو مجھے یاد نہیں رہا، لیکن اِس میں شہباز اور مَمولے کی لڑائی ہوتی ہے، اِسے دیکھنے کے لیے پورے کا پورا شہر ٹوٹ پڑا تھا، ہمیں اگلی صف میں بٹھایا گیا، تاہم مَمولے کو پورے طور پر نہ دیکھ سکے، اس لیے کھیل کا لطف ٹیلی ویژن پر آ سکتا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ایسا کھیل پسند نہیں، جن میں ایذا رسانی کا شائبہ ہو، لیکن یہ لوگ تو گویا اِس کھیل کو بھی الہامی سمجھ کر دیکھنے آتے ہیں۔ اصل میں علامہ اقبالؔ اور اُن کا کلام، اِن لوگوں کے لیے محض متبرک ہو کر رہ گیا ہے، اُن کی اصل شاعرانہ عظمت کا اپنا کوئی شعور، کوئی احساس نہیں رہا۔

کل اتوار تھا۔ یہاں ہر اتوار کی شام کو اَدبی انجمنوں کے جلسے ہوتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ شہر کے مختلف کونوں میں چند نوجوان جمع ہو جاتے ہیں اور ایک شخص صدارت کرتا ہے، دوسرا غزل پڑھ کر سناتا ہے، اِس پر تنقید، یا بظاہر تنقید ہوتی ہے۔ تیسرا کوئی مقالہ، یا افسانہ پڑھتا ہے، اِس پر بھی کچھ لے دے ہوتی ہے۔ پھر ایک نظم سنائی جاتی ہے اور اُس پر بھی لوگ اظہارِ خیال کرتے ہیں، اِسے یہ لوگ اَدبی خدمت کہتے ہیں، لیکن ساتھ ہی مجھے بعض اَدبی مجلسوں کے اربابِ بست وکشاد سے یہ بات سن کر حیرت ہوئی کہ اِن مجلسوں میں بہت کم لوگ آتے ہیں۔ جب میں اِن میں سے ایک مجلس میں خود شریک ہوا اور اُس کی کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ لوگ بے حد دانا ہیں، جو اِن مجلسوں سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ اگر ہر ہفتے تم پر، یا مجھ پر یہی عمل

وارد ہو، یعنی ایک غزل، ایک افسانہ، ایک نظم۔ پھر اِن سب پر بامقصد، یا بے مقصد قسم کی تنقید سُننی پڑے تو ہمارا کیا حال ہوگا۔ شکر ہے کہ پاکستان اس قسم کی مجالس سے ہمیشہ کے لیے نجات پاچکا ہے، حتیٰ کہ حلقہ اربابِ ذوق جیسی معتبر مجلس بھی قومی اکیڈمی میں تبدیل ہوکر رہ گئی، جو زیادہ مفید کام سرانجام دے رہی ہے۔ اصل میں اِن لوگوں کو ایسی مجلسوں کے بغیر چارہ کار بھی نہیں، کیوں کہ یہاں کے ادیبوں اور اَدب پرستوں کے لیے اظہار اور ہم کلامی اور تفریح کے ذرائع، یا تو موجود نہیں، یا بہت ہی کم ہیں، چوں کہ یہ لوگ لکیر کے فقیر واقع ہوئے ہیں، اِنہوں نے بھی اپنے ہاں کی سب سے بڑی اَدبی مجلس کا نام 'حلقہ اربابِ ذوق' رکھا ہے۔ پاکستان سے اوّلین ہجرت میں آنے والے کچھ لوگ اپنے ساتھ اِسی مجلس کا تخیل اور اِس کے دستور اساسی کی ایک نقل لے آئے تھے۔ اُسی دن سے یہ مجلس قائم ہے، اِس مجلس کی کارروائی دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے آج سے نوے، سو سال پہلے کے پاکستان کی اَدبی مجالس کا نقشہ پھر گیا، جس کا حال ہم نے اپنی کتابوں میں پڑھا ہے۔

اِس مجلس میں جو افسانہ اور جو اشعار پڑھے گئے مجھے تو اُن کا معیار نہایت پست نظر آیا، لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہاں بھی اِن مجالس کے ذریعے ادب میں اور خاص طور پر نظم میں نئے نئے تجربے کیے جارہے ہیں۔ پرسوں ایک صاحب نے بے قافیہ نظم سنائی۔ میرے ایک اقبالستانی ساتھی نے مجھے بتایا کہ اقبالستان میں یہ پہلی بے قافیہ نظم لکھی گئی ہے، حالاں کہ علامہ اقبالؔ کے کلام میں اِس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور شعرا حضرات کو اَدیبوں کی یونین کی طرف سے یہ سخت ہدایت بھی ہے کہ وہ کسی ایسی صنف میں شعر نہ کہیں، جس کی سند علامہ اقبالؔ کے کلام میں ناپید ہو۔ مجھے یہ سن کر ہنسی بھی آئی، کیوں کہ ہمارے ہاں یہ تجربات کوئی سو سال پرانے ہوچکے ہیں اور اَب بے قافیہ شعر پڑھ کر، یا سن کر کوئی شخص حیرت کا اظہار نہیں کرتا۔ اِس کے باوجود مجھے محسوس ہوا کہ یہ ملک شاعری اور اَدب میں عام جمود کا شکار ہے۔ اِس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ یہاں کے اُدب لکھتے زیادہ ہیں اور پڑھتے کم اور دنیا کے کسی مسئلے پر آزادانہ غور وفکر کے تو گویا قائل ہی نہیں۔ یہاں کوئی ایسی دانش گاہ بھی تو موجود نہیں جو نوجوان اُدیبوں اور شاعروں کی تصویروں، فلموں، ٹیلی ویژن کے پروگراموں وغیرہ کے ذریعے تربیت اور رہنمائی کرتی ہو، لیکن یہاں کی...

اس کے بعد نقطوں کی ایک لمبی لکیر ہے۔ شاید اتنا لکھنے کے بعد شہباز مرحوم کسی قسم کے

احتساب سے ڈر گئے ہوں، یا اُس مُزمن بیماری کا دورہ پڑا ہو، جو آخر انسان کی جان لے کر رہتی ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ شہباز مرحوم نے مجھے اِس کے بعد کوئی اور خط اقبالستان سے لکھا، یا نہیں۔ اگر لکھا ہوگا تو کم از کم میرے پاس محفوظ نہیں، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، مجھے شہباز مرحوم کے اکثر خیالات سے قطعی طور پر اتفاق نہیں ہے۔ مرحوم اپنی اکثر آراء میں بے حد انتہا پسند واقع ہوئے تھے۔

اصل میں مجھے اپنے مرحوم دوست کے یہ نہایت ذاتی قسم کے خط یوں 'پھلجڑی' میں اشاعت کے لیے نہیں دینے چاہیے تھے۔ معلوم نہیں میری اِس جسارت پر مرحوم کی روح مجھے کبھی معاف کرے گی، یا نہیں۔ لیکن 'پھلجڑی' کے مدیر کا سخت اصرار تھا جیسا کہ ہر مدیر کا ہوتا ہے کہ میں یہ خطوط رفاہِ عامہ کی غرض سے شائع کر دوں۔ شہباز مرحوم تو آج اس دنیا میں موجود نہیں، لیکن آپ جو اِس مضمون کو پڑھنے کے بعد بھی زندہ سلامت موجود ہیں، آپ سے میں تہ دل سے معافی چاہتا ہوں۔ اُمید ہے آپ دریا دلی سے کام لیں گے۔ شکریہ۔

* * *

حیدرآباد کا تغرافیہ

نریندر لوتھر

تغرافیہ ایک نئی اصطلاح ہے، جو تاریخ اور جغرافیہ کو ملا کر بنائی گئی ہے اس کے تحت تاریخ و جغرافیہ کے علاوہ تہذیب و تمدن اور سیاسی و اقتصادی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ طویل عرصہ سے حیدرآباد پر ایک جامع اور مستند مضمون کی کمی محسوس کی جارہی تھی۔ یہ مضمون اِس اُمید کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ اس کو پڑھ کر یہ کمی اور بھی شدّت کے ساتھ محسوس کی جائے گی۔

حیدرآباد اصل میں ایک مؤنث بستی تھی، جو بعد میں مذکر شہر بن گیا۔ اس کا اصلی نام 'بھاگیہ نگر' تھا۔ جب اس کی سیکس بدلی تو یہ حیدرآباد بن گیا۔ اس طرح جنس کی اس پیمانہ پر تبدیلی کا معجزہ پہلی بار یہیں ہوا۔ آج کل کے اوچھے سائنسدان اکے ڈکے کیس میں سیکس بدل کر اپنے آپ کو بڑے تیس مار خاں سمجھتے ہیں۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ صدیوں پہلے ہندوستان میں ایک پورے شہر کی سیکس بدل دی گئی تھی۔ یہاں کے لوگوں کو اَب بھی یہی خدشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں دوبارہ پھر ویسی ہی تبدیلی نہ واقع ہوجائے۔ اس لیے وہ کسی قسم کے جنسی تذکرے سے احتراز کرتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی نوٹ کیا ہوگا کہ یہاں کے پرانے خاندانوں کی بیگمات اور امیر زادیاں ابھی تک اپنے آپ کو جنس مذکر مان کر بات کرتی ہیں۔ مثلاً، "میں وہاں گیا" ... "میں آپ کو کھاؤں گا"۔ وغیرہ وغیرہ۔

حیدرآباد بہت خوب صورت شہر ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس کو لاثانی نہیں کہا جاسکتا، کیوں کہ اس نام کا ایک اور شہر پاکستان کے صوبہ سندھ میں بھی واقع ہے۔ آزادی سے پہلے جب سے سندھ، ہندوستان کا ایک صوبہ تھا۔ ان دونوں شہروں میں امتیاز کرنے کے لیے ہمارے شہر کو دکن کا تخلص دیا گیا تھا۔ (اس کے سودمند نتائج کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے)، تقسیم ہند سے پہلے ان دونوں شہروں میں کافی کنفیوژن "Confusion" رہتا تھا۔ اکثر مسافر حیدرآباد سندھ کا ٹکٹ لے کر

رنگِ ادب پبلی کیشنز

گاڑی میں بیٹھتے تو حیدر آباد دکن آ پہنچتے۔ مشہور شاعر جوشؔ ملیح آبادی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ (نتیجتاً وہ بے چارے دس پندرہ سال کی تاخیر کے بعد اپنی منزلِ مقصود تک پہنچے)۔ اس افراتفری سے بچنے کے لیے تقسیم ہند کے وقت سندھی حیدر آباد پاکستان کو دے دیا گیا اور اس کے بدلے کچھ سندھیوں کو لے لیا گیا۔

اس امر کے بارے میں اختلاف رائے ہے کہ یہ حیدر آباد پہلے قائم ہوا یا سندھ کا حیدر آباد۔ اب چوں کہ وہ حیدر آباد ہمارے ملک میں نہیں اس لیے ہمیں یہ کہتے ہیں کوئی گریز نہیں ہونا چاہیے کہ وہ حیدر آباد پرانا ہے اور ہمارا حیدر آباد نیا۔ اس لیے یہ زیادہ خوب صورت بھی ہے۔ کئی مؤرخین کی رائے ہے کہ بانی شہر محمد قلی قطب شاہ نے اپنے ماہر معماروں کو ڈیپوٹیشن پر سندھ بھیجا، تا کہ وہ وہاں کے حیدر آباد کا بغور مطالعہ کر کے یہاں کے لیے ایک ایسے شہر کا منصوبہ بنائیں، جس میں اس شہر کی کوئی بھی خامی نہ ہو۔ ان ماہروں کو یہاں کے لیے نئی خامیوں کی تلاش میں کافی محنت کرنی پڑی۔ اس محنت کے صلے میں ان کو ڈبل ٹی، اے اور ڈی، اے منظور کیا گیا۔

محمد قلی قطب شاہ کو عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا۔ ایک بار جب وہ دتی گیا تو شوق شوق میں اس نے ایک بہت اُونچا مینار بنا دیا، جسے آج کل قطب مینار کہتے ہیں۔ جب یہاں کی رعایا کو یہ بات معلوم ہوئی تو ان میں غیض و غضب کی ایک لہر دوڑ گئی کہ اپنے شہر کو چھوڑ کر دلی میں مینار بنوانے کا کیا مطلب۔ بادشاہ نے دلی والے آرکیٹکٹ کو بلا کر اسے یہاں بھی ویسا ہی مینار بنانے کو کہا۔ لیکن قطب مینار بناتے بناتے وہ آرکیٹکٹ بے چارہ بوڑھا ہو گیا تھا اور اَب اس میں اس بلندی پر پہنچنے کی سکت نہیں رہ گئی تھی۔ جب اس نے اپنی معذوری ظاہر کی تو بادشاہ نے کہا کوئی مضائقہ نہیں تم چار چھوٹے چھوٹے مینار بنا دو ہم کسی اور نوجوان آرکیٹکٹ کو کہہ دیں گے کہ وہ ان کو ایک دوسرے کے اوپر کھڑا کر کے ایک اونچا مینار تیار کر دے۔ جب چاروں مینار علٰیحدہ علٰیحدہ تیار ہو گئے تو ایک مدبر نے صلاح دی کہ عالم پناہ آپ کیوں نہ چار مینار علٰیحدہ علٰیحدہ ہی رہنے دیں۔ اس طرح آپ رعایا کو کہہ سکتے ہیں کہ اگر آپ نے دتی میں ایک مینار بنوایا تو یہاں کے لوگوں کے لیے چار مینار بنوایئے۔ اس کے علاوہ آپ کے نام کے چار حصوں یعنی محمد قلی قطب اور شاہ کے لیے ایک ایک مینار یادگار رہے گا۔ بادشاہ کو یہ صلاح پسند آئی اس سے نہ صرف فوری طور پر اس کی شخصیت کو چار چاند، بلکہ چار مینار لگ گئے اور ہمیشہ کے لیے اس کا نام امر ہو جانے کا امکان پیدا ہو گیا۔ اس مدبر کو

نریندر لوتھر ...... حیدر آباد کا تغرافیہ

انور احمد علوی

ایسی صلاح دینے کی پاداش میں پدما بھوشن کے خطاب سے نوازا گیا اور اس طرح حیدرآباد کا امتیازی نشان وجود میں آیا۔

چار مینار کی دھوم جب دلّی تک پہنچی تو مغل بادشاہ اورنگ زیب کے دل میں اسے دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی اس نے جب دکن کے دورہ کا پروگرام بنایا تو اس کا سپہ سالار اور فوج کے ہزاروں سپاہی سیاحت کے شوق میں اس کے ساتھ ہوئے۔ یہاں ٹورسٹ لوگوں کا رش اتنا تھا کہ اورنگ زیب کو چھ مہینے انتظار کرنا پڑا۔ بے تاب ہو کر اس نے شہر پر دھاوا بول دیا۔ یہ عمارت دیکھی تو اتنی پسند آئی کہ سات سال تک یہیں ٹکا رہا۔ آخر چار مینار کی تصویر دل میں لیے وہ دکن میں ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔

مغلوں کے ایک صوبیدار آصف جاہ نے خود مختاری کا اعلان کر کے یہاں آصف جاہی خاندان کی بنیاد رکھی۔ لیکن مغلوں کے تئیں وفاداری دکھانے کے لیے اس نے اپنا لقب نظام ہی رکھا۔ دیسی ریاستوں کے راجاؤں کو انگریزی سرکار نے 'ہز ہائی نس' کے خطاب سے نوازا تھا، لیکن چوں کہ حیدرآباد سطح مرتفع ہے اور یہاں کی سطح دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں اونچی یعنی ایکزالٹڈ ہے۔ اس لیے نظام کو محض جغرافیہ کی بنا پر ہز ایکزالٹڈ ہائی نس کا خطاب دیا گیا۔

یہاں کے ایک نظام نے عثمانیہ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ اس یونیورسٹی کی خاص خوبی یہ تھی کہ یہاں کا ذریعہ تعلیم اُردو تھا اور اُردو کے علاوہ باقی تمام مضامین اُردو میں پڑھائے جاتے تھے جب اُردو کے طلبا نے ایجی ٹیشن کیا کہ انہیں بھی اس زبان میں تعلیم حاصل ہونی چاہیے تو حکومت نے ذریعہ تعلیم بدل کر انگریزی کر دیا۔ یہاں کے پرانے طلبا آج تک انگریزی بھی اُردو میں بولتے ہیں۔ آج کل اس یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم ایجی ٹیشن ہے اور ہر مضمون اس کے ذریعہ پڑھایا جاتا ہے دُور دراز سے طلبا یہاں یہ مضمون پڑھنے آتے ہیں۔

حیدرآباد میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں، لیکن سمجھی کوئی نہیں جاتی۔ یہ اس لیے کہ ہر زبان میں دوسری زبانوں کا رنگ زیادہ ہے۔ مثلاً تلنگو میں اُردو اور مراٹھی کے الفاظ کی بھرمار ہے اور اُردو میں کنٹرا، تلنگی اور مراٹھی اصطلاحوں کی بہتات ہے۔ اس لیے یہاں ایک زبان سمجھنے کے لیے تین زبانوں میں مہارت لازمی ہے۔ اس حساب سے ظاہر ہے کہ تینوں زبانوں کو جاننے کے لیے تو زبانوں پر عبور کی ضرورت ہوگی اس لیے لوگوں کا خیال ہے کہ اس ریاست کو دو حصوں میں بانٹ

رنگِ ادب پبلی کیشنز

دینا چاہیے ایک میں تنگو زبان رائج ہوگی اور دوسرے میں بھی تلگو۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ سندھی حیدر آباد سے امتیاز کرنے کے لیے اس شہر کو دکن کا تخلص دیا گیا تھا۔ اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ یہاں بے شمار شاعر پیدا ہو گئے۔

حیدر آباد کا بانی محمد قلی قطب شاہ اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس نے اتنے شعر کہے ہیں کہ اس کو ایک تخلص کافی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے تین تخلص رکھے۔ قطب شاہ معانی اور ترکمان۔ اس کے بعد روایتاً ہر بادشاہ کو شعر کہنا لازمی ہو گیا، لیکن ان بادشاہوں کی شاعری میں وہ بات نہیں جو قلی میں ہے۔ وہ بادشاہ چوں کہ اصلاً قلی تھا اس لیے اس کی شاعری غریبوں مزدوروں اور قلیوں کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ اُس کی زیادہ تر شاعری پنجابی میں ہے۔ اس طرح اس نے طبقاتی لسانی اور علاقائی رواداری کی بنیاد رکھی۔ آج کل اس کی شاعری کو یہاں کوئی نہیں سمجھتا۔

حیدر آباد نے بہت بڑے بڑے شاعر اور اَدیب پیدا کیے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی لافانی نہیں ہوسکا، کیوں کہ یکے بعد دیگرے سب مر گئے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہاں کی مٹی میں کچھ ایسی بات ہے کہ جو شاعر اور اَدیب یہاں پیدا ہوتا ہے وہ ایک نہ ایک دن مر جاتا ہے اس لیے کئی شاعر یہاں سے ہجرت کر گئے۔ اب جب کہ اس شہر کا تخلص منسوخ کر دیا گیا ہے۔ شاعری کو بھی کافی نقصان پہنچا ہے۔ تاہم دکنی شاعری اب بھی بہت مقبول ہے اور مشاعرے اب بھی بہت کامیاب رہتے ہیں۔ جب بھی شکیلہ بانو بھوپال دوسرے شعرا کا کلام پیش کرتی ہے تو بے پناہ ہجوم ہوتا ہے۔

اب یہاں کے جغرافیہ کے بارے میں چند اہم معلومات پیش ہیں۔ حیدر آباد کا محل وقوع بہت ہی عمدہ ہے۔ ایک طرف شمال، دوسری طرف مشرق، تیسری طرف مغرب اور چوتھی طرف جنوب ہے۔ سب سے زیادہ جنوب ہے اس لیے بھی اسے دکن کہا جاتا ہے۔ 'وقوع' کے مقابلہ میں یہاں محل زیادہ ہیں۔ محلات شاہی میں چار محل چومحلہ اور فلک نما زیادہ مشہور ہیں۔ عموماً شہر دریا کے کنارے واقع ہوتے ہیں۔ اس روایت کو پیشِ نظر رکھ کر اس شہر کے کنارے ایک دریا بہانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کو موسیٰ ندی کہا جاتا ہے۔ یہ دریا ابھی تک پوری طرح آباد نہیں ہوا۔ اس میں پانی برائے نام ہے اور چٹانوں، کائی اور گھاس کی بھرمار ہے۔ چٹانوں کو توڑنے کا ٹھیکہ دھوبیوں کو دیا گیا ہے، جو انہیں کپڑوں سے توڑتے ہیں۔ کپڑے سکھانے کی سہولت کے لیے دریا پر جا بجا پل

نریندر لوتھر ...... حیدر آباد کا جغرافیہ

بنائے گئے ہیں ایک پل پر صرف چادریں سکھائی جاتی ہیں۔ اس کا نام چادر گھاٹ پل ہے اس طرح پرانے پل پر پرانے کپڑے سکھائے جاتے ہیں اور نئے پل پر صرف ٹیری لین کے نئے کپڑے۔ مسلم جنگ پل پر ایکس سروس مین مسلمان سکھائے جاتے ہیں۔ یہ نام نہاد دریا 50 سال میں صرف ایک بار دریا بنتا ہے باقی وقت دھوبی گھاٹ کا کام دیتا ہے۔ جب یہ دریا بنتا ہے تو بڑا غضب ڈھاتا ہے۔ 1908ء میں اور پھر ایک بار 1970ء میں اس کے پانی سے بہت تباہی آئی تھی۔ اب اُمید ہے کہ اس صدی کی طغیانیوں کا کوٹا پورا ہو گیا ہو گا۔

دریا کے ایک کنارے پر اسپتال ہے اور دوسرے کنارے ہائی کورٹ، فوجداری کیسوں کے شکاروں کو پہلے اسپتال کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ علاج معالجہ کے بعد عدالت میں پیش کیا جاتا ہے اگر وہ ان دونوں جگہوں سے زندہ بچ جائیں تو انہیں جیل بھیج دیا جاتا ہے، جو ہائی کورٹ سے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے۔

یہاں کے بازار اور سڑکیں کشادہ ہیں۔ مرکزی شاہراہ اتنی لمبی ہے کہ اس کے ایک ایک حصہ کا علیٰحدہ علیٰحدہ نام رکھا گیا ہے۔ چار مینار کے پاس اس کا نام پتھر گٹھی ہے۔ دریا پار کر کے اس کا نام افضل گنج اور عثمان گنج بن جاتا ہے۔ معظم جاہی مارکیٹ کے بعد وہ جواہر لعل نہرو سڑک بن جاتی ہے۔ اس کے بعد عابد روڈ، بشیر باغ، پھر کٹہ حسین ساگر۔ وہاں پہنچ کر ایک شاخ مہاتما گاندھی بن جاتی ہے اور دوسری راشٹر پتی۔ راشٹر پتی سے بچ کر جو حصہ سکندر آباد کی چھاؤنی میں داخل ہو جاتا ہے اسے بریگیڈیر سعید کی وردی پہننا پڑتی ہے۔ اس کے بعد سنا ہے کہ وہ سڑک نظام آباد علی جاتی ہے، لیکن میں کئی بار اس سڑک پر گیا ہوں میں نے تو اُسے کہیں بھی جاتے نہیں دیکھا۔ وہیں کی وہیں پڑی ہے۔ اس شاہراہ کے علاوہ بے شمار اور سڑکیں ہیں، لیکن فی الوقت ہمارے پاس ان کے نام لکھنے کی گنجائش نہیں۔ مرکزی شاہراہ اتنی کشادہ ہے کہ دس رکشا بازو بازو چل سکتے ہیں اور پھر بھی بس کے لیے جگہ رہ جاتی ہے۔ یہاں کی رکشا بہت چھوٹی اور بسیں بہت لمبی اور اُونچی ہوتی ہیں۔

حیدر آباد کی روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی آدھی بسوں کے انجن چوری ہو گئے ہیں اس لیے ان کو دوسری بسوں کے پیچھے باندھ کر چلایا جاتا ہے۔ کئی بار پچھلی بندھی ہوئی بسوں نے بور ہو کر بندھن تڑوا کر بھاگنے کی بھی کوشش کی ہے۔ دو منزلہ بسیں یہاں بہت عام ہیں۔ یہاں کی بسوں کی دو خوبیاں ہیں۔ دو منزلوں میں سے ایک منزل کے مسافر فری سفر کرتے ہیں۔ بسوں کے رکنے کا

سسٹم مسافروں کی صحت کی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر بنایا گیا ہے۔ روڈ کارپوریشن نے جگہ جگہ اسٹانڈ بنائے ہیں۔ ان کو کہا تو جاتا ہے بس اسٹانڈ، لیکن نہ ہوتے اصل میں پبلک اسٹانڈ ہیں۔ لوگ یہاں کھڑے رہتے ہیں بس یا تو اس سے کچھ پہلے ہی یا اس کے کچھ فاصلہ آگے ہی رکتی ہے۔ مسافروں کو وہاں تک بھاگ کر بس پکڑنی پڑتی ہے۔ اس جبری کسرت کی وجہ سے حیدرآباد کی جنتا کی صحت دوسرے شہروں کے رہنے والوں سے بہتر ہے۔ کرایہ دینے کے بھی یہاں دو سسٹم ہیں۔ اگر آپ ٹکٹ خریدنا چاہتے ہیں تو کرایہ پورا لگتا ہے۔ اگر آپ ٹکٹ خریدنے پر اصرار نہ کریں تو آپ آدھے کرایہ پر ہی سفر کر سکتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ اس سے کمپنی کے ٹکٹیں چھپوانے کا خرچ بچتا ہے۔ چھوٹا موٹا چینج کنڈاکٹر خود ہی 'ٹپ' کے طور پر رکھ لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کا بس سسٹم ہندوستان میں سب سے زیادہ 'القارمل' اور سستا ہے۔ یہاں کی بسیں بہت دندنا کر چلتی ہیں اور خوب دھواں چھوڑتی ہیں اس سے کم بینائی اور اُونچا سننے والے لوگوں کو بھی پتا چل جاتا ہے کہ بس کدھر اور کب گئی۔ اب چوں کہ بسوں ٹرافک اور بھی بڑھ رہی ہے اس لیے تجویز ہے کہ تین یا چار منزلہ بسیں بنائی جائیں۔ اس سے سفر اور بھی سستا ہو جائے گا۔

حیدرآباد کے مختلف محلوں کے نام جسم کے حصوں یا بیماریوں پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً امیر پیٹ، بیگم پیٹ، رحیم پیٹ وغیرہ بلغم پیٹ بھی ایک محلّہ کا نام ہے۔ نئی آبادیوں کے نام جسم کے دوسرے حصوں پر رکھے جائیں گے۔ کچھ اور نام مندرجہ ذیل ہیں۔

ماما جمیلہ کی ڈیوڑھی، چیلہ پورہ، گھاسی میاں بازار، کوکا کی ٹٹی، گھوڑے کی قبر، زچہ کی قبر، سلیمان جاہ کی چاوڑی، چوکِ مرغاں، شہر کے اطراف کئی خوب صورت جھیلیں ہیں۔ ایک جھیل حیدرآباد اور سکندرآباد کے درمیان واقع ہے۔ ان جھیلوں کو ساگر کہا جاتا ہے۔ امرود کو جام کہتے ہیں۔ روایت ہے کہ امرود کھا کر اگر کسی جھیل کا پانی پی لیا جائے تو وہی نشہ چڑھتا ہے، جو جام نوش کرنے پر آتا ہے۔

اب ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ حیدرآباد دراصل دو شہر ہیں۔ ایک حصہ کا نام حیدرآباد اور دوسرے کا نام سکندرآباد دونوں کو جڑواں شہر بھی کہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے سکندرآباد، سکندرِ اعظم کے نام پر آباد ہوا تھا۔ سکندر ہندوستان کا پہلا یوروپین حملہ آور تھا۔ پورس سے لڑائی کے بعد وہ حیدرآباد آیا۔ یہاں اس نے یونانی دواخانے کا سنگِ بنیاد رکھا اور اس کے لیے یونانی اکسپرٹ اور فارین

ایڈ دینے کا وعدہ کیا۔ یہ دواخانہ اب بھی چار مینار کے بازو قائم ہے۔ سنگِ بنیاد کی رسم کے بعد سکندر اعظم کے اعزاز میں پریڈ گراؤنڈ میں شاندار پریڈ ہوئی اور ساتھ ہی اس شہر کا نام سکندر آباد رکھا گیا۔ یونانی فاتح بجائے خوش ہونے کے معترض ہوا کہ اس کا پورا نام سکندر اعظم ہے اور شہر کا نام صرف سکندر آباد رکھا گیا ہے۔ کمی کی تلافی کے لیے فیصلہ ہوا کہ حملہ آور کے خطاب پر ایک محلہ کا نام اعظم پورہ رکھ دیا جائے۔ تب کہیں جا کر ہمارے معزز حملہ آور کی تسلی ہوئی۔ اور وہ یہاں سے واپس چلا گیا۔ اس دن سے آج تک اس آمد کی یادگار میں سکندر آباد پریڈ گراؤنڈ پر ہر سال دوبار پریڈ ہوتی ہے۔ ایک گرمیوں میں اور ایک سردیوں میں۔

ان جڑواں شہروں کی آبادی تقریباً بیس لاکھ ہے۔ پچھلی مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق غیر شادی شدہ طبقے میں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے پچاس سالوں میں عورتوں کی شادیاں زیادہ ہوئی ہیں۔ اب حیدر آباد کے نئے کلکٹر نے احکام جاری کر دیے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو عورتوں اور مردوں کی شادیاں بیک وقت ہوں۔ اس سے خرچ میں بھی بچت ہوگی اور توقع کی جاتی ہے کہ اگلی مردم شماری تک دونوں کی تعداد میں توازن پیدا ہو جائے گا۔

حیدر آباد کی آب و ہوا اور غذا میں ایک خاص اثر پایا جاتا ہے، جس سے یہاں کے لوگوں کی یادداشت کمزور ہو جاتی ہے وہ اپنے ماضی کے بارے میں صرف کل اور پرسوں تک ہی یاد رکھ سکتے ہیں۔ اس سے پہلے کے واقعات پرسوں تک ہی منجمد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کوئی واقعہ دو دن پہلے ہوا ہو یا پچاس سال پہلے پرسوں کی بات ہی کہا جاتا ہے۔ اکثر بزرگ 1908ء کی باڑھ کو بھی پرسوں کی طغیانی کہتے ہیں۔

یہاں کے لوگ بڑے ملنسار اور خوش طبع ہیں۔ برتاؤں میں بڑے سلیقہ شعار ہیں۔ ایسے لوگ گورنر اچھے بنتے ہیں اس لیے یہاں کے کئی معزز شہری گورنر بنا کر دوسرے صوبوں کو برآمد کیے جاتے ہیں۔ سروجنی نائیڈو، پدمجا نائیڈو، رام کرشنا راؤ، سری نگیش علی یاور جنگ، گوپال ریڈی اور اکبر علی خان یہیں سے گورنر بن کر گئے یہاں کے بنائے ہوئے گورنر اتر پردیش میں خاص طور پر پسند کیے جاتے ہیں۔

حیدر آباد جو بھی آتا ہے اسے اپنا لیتا ہے۔ یہاں کی مٹی ہر شخص کو اپنے وطن کی مٹی لگتی ہے۔

نریندر لوتھر ...... حیدر آباد کا تغرافیہ

اس لیے یہاں ہندوستان کے ہر کونے سے بلکہ دوسرے ممالک سے بھی لوگ آکر بس گئے اور جانے کا نام تک نہیں لیتے۔ جنوب کے لوگ اسے حد جنوب مانتے ہیں۔ شمال کے لوگ اسے خط شمال سمجھتے ہیں۔ یہاں کے پرانے شہر میں بغداد اور بصرہ کا ماحول ملتا ہے۔ سکندر آباد کی چھاؤنی پر اینگلو انڈین چھاپ ہے۔ کافی ہاؤس پال گھاٹ کے لوگ چلاتے ہیں۔ چائے خانے ایرانیوں کی ہو تو چلتی ہیں۔ ویجزین ہوٹل کے اکسپرٹ منگلور کے برہمن ہیں۔ بزنس میں مارواڑی اور سندھی پیش پیش ہیں۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی، یہودی، ہر قسم کے لوگ ہر موسم میں پائے جاتے ہیں۔ یہ شاید اسی مذہبی علاقائی اور تہذیبی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے کہ یہاں زیادہ تر موسم خوشگوار و معتدل ہوتا ہے۔ ویسے یہاں گرمیوں میں کڑاکے کی گرمی پڑتی ہے۔ سردیوں میں سردی بھی خوب ہو جاتی ہے۔ برسات کے موسم میں جھڑی بھی اچھی لگتی ہے باقی سال موسم معتدل رہتا ہے۔

حیدر آباد چھوٹے پیمانے پر ہندوستان کی تصویر ہے۔ ہمارے ملک کی طرح اس شہر میں بھی کثرت میں وحدت پائی جاتی ہے۔ یہ شہر بھی ہمارے ملک کی طرح گلہائے رنگا رنگ کا گلدستہ ہے، جس کی مہک سے سارا چمن معطر ہے۔

اگر حیدر آباد جیسے آٹھ دس اور شہر ہندوستان میں آباد ہو جائیں تو یہ ملک رشکِ جنت ہو جائے گا۔

سنا ہے کہ پانچویں پنجسالہ منصوبے کے لیے یہ تجویز زیرِ غور ہے۔

* *

گھوڑے، کبھی بوڑھے نہیں ہوتے!

نعیم نیازی

ایک پرانی کہاوت ہے کہ ”مرد اور گھوڑا کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔“ اس رسوائے زمانہ کہاوت کی صداقت مسلمہ ہے، کیوں کہ اس کی تردید میں آج تک کوئی جملۂ معترضہ ہماری نظر سے نہیں گزرا، حتیٰ کہ خواتین کی کسی تنظیم نے بھی اس دعوے کی صحت کو مشکوک قرار نہیں دیا۔ اور جس معاملے کی تردید نہ کی جائے، اُصولی طور پر وہ ثابت شدہ تصور ہوتا ہے۔ پس، ماننا پڑے گا کہ مرد اور گھوڑا ہمیشہ فٹ رہتے ہیں۔ لیکن فلاسفر اس دلیل کو بطورِ ثبوت تسلیم نہیں کرتا۔ وہ سائنٹیفک کلیے جیسا ثبوت مانگتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر مرد بوڑھا نہیں ہوتا، تو پھر پینڈولم کی طرح جھولتی گردن پر جھریوں بھرا چہرہ لٹکائے، ہانپتے کانپتے، کھانستے، کپکپاتے، لڑکھڑاتے ابنِ آدم کو کیا نام دیا جائے گا، جس کی مونچھ داڑھی اور چندیا چاندی کے تاروں سے بھر چکی ہو۔ فلاسفر کا نکتۂ اعتراض قابلِ غور ہے، لیکن اِس کا جواب دینا اُنہی پر فرض ہے، جو اپنے بڑھاپے کا دفاع کرنا چاہیں۔ ہمیں کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ مدعی سُست گواہ چست والی صورتِ حال پیدا کرتے پھیریں۔

بڑھاپے کی پہچان بڑی آسان ہے۔ مرد جب آئینہ دیکھنا چھوڑ دے تو سمجھو بڑھاپا آگیا ہے۔ عمر کے اس مرحلے میں مرد صورت سجانا چھوڑ دیتا ہے اور سیرت سنوارنے پر توجہ دینے لگتا ہے۔ بڑھاپا، نراسیاپا اُس وقت بنتا ہے، جب بندے کو اپنی بیوی کی نسبت چارپائی زیادہ آسودگی بخش محسوس ہونے لگے۔ ویسے بوڑھے مردوں کا مستقبل بڑا روشن ہے۔ ایک جائزے کے مطابق 2020ء تک دنیا بھر میں بوڑھوں کی تعداد تقریباً 70 فیصد ہو جائے گی، یعنی دنیا بڑی تیزی سے بوڑھی ہو رہی ہے۔ کچھ من چلوں نے اس صورتِ حال کے لیے ’سرمئی بادل‘ "Gray Clouds" کی اصطلاح استعمال کی ہے، یعنی دنیا پر سرمئی بادل چھا جائیں گے۔

فلاسفر کا خیال ہے کہ کوّے کا بڑھاپا مرد سے بدرجہا بہتر ہے۔ کوّا لاکھ بڈھا کھوسٹ

ہو جائے، اس کے بال سفید نہیں ہوتے۔ یوں دیکھنے والے کو کم از کم یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ سٹھیانے کی عمر کو پہنچ گیا ہے۔ لیکن مرد بے چارے کا بڑھاپا تو سیدھا سادہ بدنامی کا اشتہار ہے۔ اِدھر ذرا عمر ڈھلی، اُدھر کنپٹیاں سفید ہونا شروع ہو گئیں۔ گویا اعلانِ عام ہو گیا کہ لو میاں! بڑھاپا آن پہنچا ہے۔ ساتھ ہی صنفِ نازک نے گریزاں ہونا شروع کر دیا، یعنی اکیلے پن کے محل کی خشتِ اوّل رکھ دی گئی۔

اگر بوڑھے میاں جسمانی کمزوری کی آخری اسٹیج پر ہوں تو اور بات ہے، ورنہ کسی بھی بوڑھے کا دل "No woman's land" قطعاً نہیں ہوتا۔ چاہے اس کی کنپٹیوں، بھوؤں اور سر کے سارے بال سفید کیوں نہ ہوں۔ جب جب اور جہاں جہاں صنفِ نازک کا ذکر آئے، اس کے اندازِ بیان میں وہی والہانہ پن اور آرزوئے وصل مچلتی محسوس ہوتی ہے، جو بیس بائیس برس کے نوجوان کا خاصا ہے۔ کئی بوڑھے تو ایسی رومانوی گفتگو کرتے ہیں کہ الامان والحفیظ! اگر یہ ڈائیلاگ فلم کے کسی منظر میں شامل کر دیے جائیں تو فی الفور سینسر کی قینچی کی زد میں آ جائیں۔ اور اگر گفتگو کے یہ حصے اخلاق کی چھلنی میں ڈالے جائیں تو شرم و حیا کے ذرّات تہ میں بھی نہیں ملیں گے۔ حلقۂ یاراں، یعنی محفلِ بزرگان میں اِن بوڑھوں کا تکلم اتنا بے باکانہ ہوتا ہے کہ ایک آدھ فقرہ اگر پاس سے گزرتی کسی ہم عمر خاتون کے کانوں میں پڑ جائے تو وہ رُک کر پوری بات سننے کی بجائے، بھاگ کر اپنی عصمت بچانا زیادہ اہم سمجھے۔

بڑے بوڑھے عبادات میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں، لیکن یہ خشوع و خضوع بھی طمع سے خالی نہیں ہوتا۔ یہاں بھی حور و غلمان کا تصور اُن کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ ہاتھ میں تسبیح ہوتی ہے، لیکن گفت و شنید میں رنگِ عشقِ لیلیٰ نمایاں نظر آتا ہے۔ بات نیکی سے شروع کرتے ہیں اور تان بہتر حوروں پر آن ٹوٹتی ہے۔ باغِ عدن میں بھی ان کو محبوب کی وہی حشر سامانیاں مطلوب ہیں، جن کے نظارے کے لیے لوگ ایشوریہ رائے اور کترینہ کیف کی فلمیں دیکھتے ہیں۔ گرمیِ جذبات کی فعالیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ شاید یہی وجہ ہے کہ مسجد کے روزانہ پانچ بار طواف کے باوجود پارسائی شکل سے غائب رہتی ہے۔

فلاسفر کا مشاہدہ اس سے ایک قدم آگے ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر خوبیِ قسمت سے بڑھاپے میں دوسری یا تیسری شادی کا چانس مل جائے تو بندہ اتنی تن دہی سے بیگم پروری میں مشغول ہو جاتا

ہے کہ اللہ میاں کے ساتھ سلسلۂ مواصلات، یعنی ترتیبِ عبادات اُلٹ پلٹ ہو کر رہ جاتی ہے۔ حبالۂ عقد میں آنے والی محترمہ خواہ جتنے معمولی نقوش کی حامل ہو، پھر بھی بڑے میاں کو وہ حورِ ارضی نظر آتی ہے اور اپنا جھونپڑا مثلِ جنت۔ اور جب جیتے جی بہشت اور حور دونوں مل جائیں تو پھر عبادت کی مشقت کون اُٹھاتا ہے، صلے کی طلب جو نہیں رہتی!

دیکھا جائے تو بڑھاپا بچپن اور جوانی سے کم خرچ ہے۔ بالفاظِ دیگر اِس عمر میں اخراجات کم ہو جاتے ہیں، کیوں کہ بندہ فطری طور پر کفایت شعاری کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے بوڑھے اپنی سالگرہ نہیں مناتے۔ ویسے دانشمندی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایسے ہنگامے سے دُور رہا جائے، کیوں کہ موم بتیوں کی تعداد اور کیک کے سائز سے صحیح عمر کا پول کھل جاتا ہے، جسے افشا کرنا بوجوہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کفایت شعار بوڑھے اوّل تو اپنی سالگرہ مناتے ہی نہیں اور اگر اِس 'بلے گلے' سے مفر ممکن نہ ہو تو یہ تقریب اس انداز سے مناتے ہیں کہ بڑے سائز کی ایک لالٹین جلا لیتے ہیں اور اپنی عمر کے سالوں کی تعداد کے برابر چھوہارے گن کر محلے میں بانٹ دیتے ہیں۔ خود ہی 'ہپی برتھ ڈے ٹو می' گنگناتے ہیں، اپنے آپ کو خود ہی درازیِ عمر 'وِش' کرتے ہیں اور خود ہی تالیاں بجا لیتے ہیں۔ اسی طرح کئی بوڑھے شیو کرانا چھوڑ دیتے ہیں، یعنی حجام کی روزی پر لات مارتے ہوئے بارِیش بن جاتے ہیں۔ یوں شیو کی اُجرت بچ جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دوسری طرف خضاب کا خرچ بڑھ جاتا ہے اور حساب برابر ہو جاتا ہے۔ لیکن مونچھ اور داڑھی صفاچٹ کرانے کی 'گریس' (Grace) ہی کچھ اور ہے۔ خواتین ایسے 'مونڈے منڈائے' بڈھے کو ہاتھوں ہاتھ لیتی ہیں۔ تاہم، خوش آئند بات یہ ہے کہ صنفِ نازک میں اس شاندار آؤ بھگت کے باوجود، کلین شیو بوڑھوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ یہ تو تھا، تصویر کا ایک رُخ!

دوسرے رُخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ ملکی معیشت بوڑھے افراد کے دم قدم سے فروغ پا رہی ہے۔ انڈسٹری کا ایک حصہ ہمیشہ ان کے لیے درکار مصنوعات کی تیاری میں مصروف رہتا ہے۔ خضاب، وِگ، عینک، وہیل چیئرز، چھڑیاں اور سرمہ سلائی جیسے لوازمات انہی کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ کھانسی کے شربت، قہوہ جات، کشتہ جات، ہاضمے کی پھکیاں اور جوشاندے کا بزنس بھی انہی کے دم قدم سے چل رہا ہے۔ سلمنگ سینٹرز، پلاسٹک سرجری اور بڑے حکیموں کے مطبوں

کی رونق انھی کے دم سے ہے۔ کئی این جی اوز ان کے لیے اولڈ ہوم جیسے 'چکر' چلا کر اپنا دال دلیہ بنا رہی ہیں۔ فلاسفر کا کہنا ہے کہ حکیموں سے مستقل یاری اور عزرائیل سے ہر دم بیزاری بوڑھوں کی اکثریت کا شیوہ ہے۔ بہر حال، یہ امر اپنی جگہ مسلم ہے کہ اگر سوسائٹی سے ان بوڑھوں کو نکال دیا جائے تو ملکی معیشت زبوں حالی کا شکار ہو جائے۔

یوں تو بڑھاپا، بچپن سے کم اَز کم پچاس پچپن برس کی مسافت پر ہے۔ درمیان میں جوانی کی دیوارِ دیوانی حائل ہے، لیکن مشہور ہے کہ بوڑھے اور بچے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ان کے مابین پہلی قدرِ مشترک تو یہ ہے کہ 'بچہ' اور 'بوڑھا' دونوں لفظ 'ب' سے شروع ہوتے ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دونوں کے منہ میں دانت ہوتے ہیں، نہ سر پر بال۔ بچے کی بات کو کوئی فرد سنجیدگی سے نہیں لیتا، اسی طرح بوڑھے بابے کی بات بھی یہ کہہ کر رد کر دی جاتی ہے کہ بڈھا بے چارہ سٹھیا گیا ہے۔ بچپن اور بڑھاپا کچھ دیگر معاملات میں بھی مماثلت رکھتے ہیں۔ ہر دو کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی تیسری چیز ہمیشہ چپکی رہتی ہے۔ بچے کے سر پر تعلیم سوار رہتی ہے۔ وہ بے چارہ دن رات پنجے جھاڑ کر تعلیم کے پیچھے پڑا رہتا ہے، جب کہ بوڑھے میاں کے ساتھ حکیم جونک کی طرح چمٹ جاتا ہے۔ ہر روز بلا ناغہ دوائی لینا اس کا معمول بن جاتا ہے۔ یعنی بچپن میں تعلیم اور بڑھاپے میں حکیم کا بھوت سر پر سوار رہتا ہے۔

بچے کی طرح بوڑھا بھی ضدی ہوتا ہے۔ ہر معاملے میں اپنی بات منوانے کی ضد کرتا ہے۔ وہ کھانس بھی رہا ہو تو نواسوں پوتوں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کی طرف یوں ہمہ تن گوش رہیں، جیسے کوئی لوری سن رہے ہوں۔ جس طرح بچپن کی بنیاد شرارت پر اور جوانی کی بنیاد عشق پر ہے، اسی طرح بڑھاپے کی بنیاد عیب جوئی پر ہے۔ بڑے میاں ہر وقت دوسروں کی بات اور ذات میں خامیاں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ جوانوں کے ہر معاملے میں ٹانگ اَڑانا اپنا استحقاق سمجھتے ہیں۔ بالخصوص ملازمت اور شادی بیاہ کے معاملے میں تو دخل در معقولات سے کبھی نہیں چوکتے۔ جس نے خود لَو میرج کر رکھی ہو، وہ بھی نواسوں اور پوتوں کو یہی درس دیتا ہے کہ میاں جوڑے عرش پر بنتے ہیں، فرش پر شور نہ مچاؤ اور شادی اپنے بزرگوں کی مرضی سے رچاؤ۔

بڑے میاں دھن دولت والے ہوں تو بڑھاپا پلس پوائنٹ بن جاتا ہے۔ صنفِ نازک کی طرف سے بالعموم انھیں حوصلہ افزا رسپانس ملتا ہے۔ گلیمر کی شوقین خواتین، مرد کی عمر کو ثانوی

حیثیت دیتی ہیں۔ بڑے میاں بھی خواتین کی نفسیات کے اس کمزور گوشے سے خاطر خواہ آگہی رکھتے ہیں، لہٰذا جب اور جہاں موقع ملے، انہیں فوراً ایک اور شادی رچانے کی سوجھتی ہے۔

ایک معمر سیٹھ اپنی نئی گاڑی میں کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں ایک فیشن ایبل حسینہ نے اس سے لفٹ مانگی۔ سیٹھ نے لفٹ دے دی۔ اس دوران حسینہ نے سیٹھ کی شخصیت میں غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا تو سیٹھ جی کی 'حسِ بیاہ' بیدار ہو گئی۔ انہوں نے موقع غنیمت جانا اور جھٹ پٹ حسینہ کو شادی کی پیشکش کر دی۔ ساتھ ہی اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لیے کہا، ''دیکھو ڈارلنگ'' میں کوئی فراڈیا نہیں ہوں.... میں یہ بات تمہیں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ''.... ''کک.... کیا.... کہنا چاہتے ہیں آپ؟'' ''میں نے پہلے سے تین شادیاں کر رکھی ہیں۔ چار زوجگان والی شرعی رعایت سے استفادے کے لیے میں آپ کے ساتھ عقدِ اربعہ کرنا چاہتا ہوں۔ واضح رہے کہ میری عمر اس وقت 70 برس ہے، یعنی میں اب سترے بہترے کی کیٹیگری میں شامل ہو چکا ہوں۔ تمہیں اختیار ہے۔ چاہے قبولیت کا اظہار کرو، یا صاف انکار کر دو''۔ ''اوہو، جانی! آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں سمجھی، شاید آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ نئی نویلی چمچماتی گاڑی آپ کی اپنی نہیں ہے۔ مجھے آپ کی بیویوں سے کیا سروکار، مجھے تو آپ کا پیار درکار ہے۔ جب آپ مجھے اپنانے پر تیار ہیں تو میری طرف سے بھی اقرار ہے۔''

یوں تو انٹرنیٹ آج کل مرد، عورت، بچے سبھی کو مرغوب ہے، لیکن بوڑھے افراد کے لیے اس میں خصوصی 'چارم' ہے۔ اس ڈیوائس کی مدد سے چشمِ زدن میں وہ مدِ مقابل خواتین کو رام کر لیتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ساٹھے پاٹھے ہونے کے باوجود بیس بائیس برس کے گبھرو بن جاتے ہیں۔ صنفِ نازک سے رابطہ تو ٹیلی فون کے ذریعے بھی ہو جاتا تھا، لیکن قباحت یہ تھی کہ کپکپاتی آواز عمر کا پول کھول دیتی تھی۔ اب انٹرنیٹ کی بدولت ان کے وارے نیارے ہو گئے ہیں۔ عورت ایک کمزور مخلوق ہے، اس کی اوقات ہی کیا ہے۔ ایک آدھ رومانی مکالمے کا وار بھی نہیں سہہ سکتی، بے چاری آناً فاناً چت ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ بڑی صفائی کے ساتھ انہیں چکمہ دیتے ہیں اور وہ بے چاری جھانسے میں آ کر کہیں کی نہیں رہتی۔

کہتے ہیں کہ انسان، حیوانِ ناطق ہے، اسے بولنے والی مشین بھی کہا جا سکتا ہے۔ دیگر مکینیکل پراڈکٹس کی طرح یہ مشین بھی جب پرانی ہو جاتی ہے تو اس کے اسکروڈھیلے ہو جاتے ہیں

اور یہ خودکار طریقے سے وقت بے وقت بجنا شروع ہو جاتی ہے۔ آلۂ صوت، یعنی زبان کے ساتھ ساتھ دیگر کل پُرزے بھی اپنی اپنی جگہ سے ہل جاتے ہیں اور اُٹھتے بیٹھتے کھڑکھڑانے لگتے ہیں۔ بوڑھے میاں کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہوتی ہے۔ مختلف اعضا سے چنگھاڑنے، کھنگارنے، ہنکارنے اور کھانسنے کی آوازیں آنا شروع ہوتی ہیں تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ چنانچہ متعلقین کے پاس انہیں برداشت کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بڑھاپا نرا سیاپا ہے، لیکن فلاسفر اِس نظریے سے اتفاق نہیں کرتا۔ بڑھاپے کی تائید میں کیا یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ ماں جب اپنے بیٹے کے کسی عمل سے خوش ہوتی ہے تو اسے یوں دعا دیتی ہے۔ ”بیٹا! دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔“ یعنی بانگِ دہل بڑھاپے کی دعا دی جا رہی ہے۔ ہمارے ہاں تو بھکاری بھی یہی دعا دیتا ہے، ”جیتے رہو میاں، خدا دینے والے کو خضر علیہ السلام کی عمر لگا دے۔“ بڑھاپا اگر اتنا ہی برا ہوتا تو ماں لازماً اپنے بیٹے کو یہ دعا دیتی، ”بیٹا! اللہ کرے عالمِ شباب میں ہی اناللہ ہو جاؤ، تا کہ بڑھاپے کے عذاب سے بچ سکو۔“

الغرض عمر کی اس اسٹیج پر اگر بوڑھے مرد کی مردانگی زیرو ہو جاتی اور اُس کی صلاحیتِ گناہ واقعی ختم ہو جاتی تو اُس کے بائیں کندھے والا فرشتہ بھی یقیناً ریٹائر ہو جاتا کہ جب بوڑھے میاں نے کرنا کرانا ہی کچھ نہیں ہے تو کاتب فرشتہ ’ویلا‘ (فارغ) بیٹھا کیا کرے گا؟ لیکن ایسا نہیں ہے، لہٰذا اس دعوے کی صداقت مسلمہ ہے۔ کیا خیال ہے؟

* * *

انور احمد علوی

برکت ایک چھینک کی!

وجاہت علی سندیلوی

میری بھابی جان ساری دنیا کے لیے تو بہت خلیق، بامروّت اور ہنس مکھ واقع ہوئی تھیں، لیکن صرف مجھ سے، یعنی اپنے اکلوتے دیور سے، جو اپنے والدین سے دُور اُن کی اور بھائی صاحب کی سرپرستی میں زیرِ تعلیم تھا ہر وقت منہ پھلائے رہتیں۔ اور خدا لگتی پوچھیے تو اِس میں اُن کا قصور کم اور میرا پاجی پن زیادہ تھا۔ میرے اس پاجی پن میں درپردہ بھائی صاحب کی شہ اور ہمت افزائی بھی شامل تھی۔

بھابی جان کی ایک بہت چہیتی چھوٹی بہن شمیم تھی، جو میری ہی طرح بی اے کی طالب علم تھی۔ اس کی تعریف وتوصیف کرنے اور نت نئے گن گانے سے ان کا منہ کبھی نہ تھکتا۔ بات چاہے ایران اور توران کی ہو رہی ہو، لیکن وہ کسی طرح کوئی پہلو نکال کر اپنی 'شمو' کی شان میں کوئی بے ساختہ قصیدہ ضرور پڑھ دیتیں۔ ”میری شمو یہ کام ایسے کرتی ہے“۔ ”میری شمو وہ کام ویسے کرتی ہے“۔ ”مجال کیا جو میری شمو کے سر سے دوپٹہ سرک جائے۔“ میری شمو کی تہذیب اور شائستگی میرے یہاں سارے قصبے میں مشہور ہے“۔ ”بڑے بڑے باورچی اور رکاب دار میری شمو کے پکائے ہوئے کھانے پر اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔“ فلاں درزی کے سیے ہوئے کپڑے میں میری شمو نے ایسا نقص نکال دیا کہ وہ بس جھینپ کر کلا بتو ہو گیا“۔ ”میری شمو اپنے درجے میں ہمیشہ اوّل آتی ہے۔“ وغیرہ وغیرہ۔

بہتر تو یہ تھا کہ میں یہ سب کچھ سنتا اور خاموش رہتا اور بھابی جان سے بدمزگی نہ مول لیتا۔ لیکن، نہیں معلوم کیوں شمیم کی مداح سرائی سنتے سنتے مجھے اس سے ایک قسم کی چڑھ اور کدورت سی ہو گئی تھی اور جیسے ہی بھابی جان اس کی کوئی نئی خوبی بیان کرنے لگتیں میں خود اُس خوبی میں سیکڑوں کیڑے ڈالنے اور اُس کو خوبی کی بجائے خرابی ثابت کرنے لگتا، یا پھر اُس کے متعلق ایسے مضحکہ خیز

رنگِ ادب پبلی کیشنز

اور طنزیہ سوال کرنے لگتا کہ بھابی جان فوراً برہم اور برافروختہ ہو کر مجھ پر نکتہ چینی اور میری ہجو کرنے پر اُتر آتیں اور پھر جب بات بہت زیادہ 'ذاتیات' تک پہنچ جاتی تو بھائی صاحب ہنستے ہوئے بھابی جان سے فرماتے، ''تم سے ہزار دفعہ کہہ چکا ہوں کہ تم اس حاسد کے سامنے شمیم کا ذکر ہی مت کیا کرو اور مجھ سے آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہتے، ''ٹھیک تو کہتی ہیں تمہاری بھابی، تم سنیما بہت جاتے ہو اور ہر وقت اپنی کتابیں پڑھنے کی بجائے ادھر اُدھر کی فضول ناولیں اور رسالے دیکھا کرتے ہو۔'' اور اُن کی باتوں سے بھابی اور لہجے سے میں، مطمئن ہو کر اپنی لفاظی کی کبڈی کسی آئندہ موقع کے لیے ملتوی کر دیتے۔

ایک روز ناشتے پر میرے ہاتھ میں ایک باتصویر انگریزی رسالہ دیکھ کر بھابی جان بولیں،

''میری شمو تو اس قسم کے رسالوں پر تھوکتی بھی نہیں۔''

''اسی وجہ سے تو اس رسالے کی اشاعت ایک لاکھ سے بھی زائد ہے۔'' میں نے کہا۔

نہیں معلوم کیوں اُس وقت بھابی جان کچھ خاص طور سے بھری بیٹھی تھیں، لہٰذا بلا کسی تمہید کے فوراً ذاتیات پر اُتر آئیں، ''صرف سوٹ پہن لینے اور انگریزی بال بنا لینے سے انسان مہذب اور تعلیم یافتہ نہیں ہو جاتا ہے، اس کے لیے قابلیت اور ذہانت چاہیے اور اِس میں ماشاءاللہ آپ بالکل ہی صفر ہیں۔'' اور پھر اِس کے بعد اُنہوں نے میرے انگریزی بالوں کو میری حماقت، میری فیشن پرستی کو میری جہالت، میری سنیما بینی کو میرے شہدے پن اور میرے باتصویر رسالوں کے مطالعے کو میری بے ہودگی اور بدتمیزی سے تعبیر کر ڈالا۔

ان کا حملہ کچھ اس قدر غیر متوقع اور بے محل تھا کہ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اس کو میری بے غیرتی سے منسوب کرتے ہوئے وہ اور بھی جھلبلا گئیں، لیکن قبل اس کے کہ وہ مجھے اور کچھ کہتیں، درمیان میں بھائی صاحب کے منہ سے نہیں معلوم کیسے یہ غیر ذمہ دارانہ جملہ نکل گیا، ''تم اس کی تربیت کے لیے شمیم کو اس پر کیوں نہیں تعینات کر دیتیں۔ یہ اُس کی چپلوں کی زد میں آ کر خود بخود سدھر جائے گا۔'' یہ جملہ ایک پٹاخا ثابت ہوا اور بھابی جان واقعی غصّے میں آ کر کسی زخمی شیر کی طرح بپھر اٹھیں۔ خوب خوب صلواتیں انہوں نے مجھ کو، بھائی صاحب کو، بلکہ میرے خاندان کو سنا ڈالیں اور بار بار ٹیپ کے بند کے طور پر کچھ اس قسم کے کلمات دہراتیں، ''یہ منہ اور مسور کی دال!'' ''کوے کی چونچ میں انگور؟'' ''میری شمو کے دشمنوں کے منہ میں خاک''۔ ''میں اپنے جیتے جی تو

اپنی شمو کو ایسے نکھٹو کے حوالے کر نہیں سکتی۔ ایسی ہی اس کی قسمت پھوٹی ہے تو میں خود اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا داب کر رکھ دوں گی!'' وغیرہ وغیرہ۔ بڑی مشکل سے بے چارے بھائی صاحب انہیں قائل کر سکے کہ خدانخواستہ اُن کا رُوئے سخن کسی نسبت یا رشتے کی طرف نہیں تھا، بلکہ انہوں نے محض تفریحاً اپنا جملۂ معترضہ کہہ دیا تھا، ورنہ کہاں شمیم جیسی ہمہ صفت موصوف لڑکی اور کہاں ان کے بھائی جیسا بانگڑ ولڑکا؟

ایک روز شام کو گھوم پھر کر میں گھر پہنچا تو دیکھا کہ ایک ہل چل سی مچی ہوئی ہے اور گھر کا ہر فرد خواہ چھوٹا یا بڑا، انتہائی انہماک سے گھر کی صفائی اور آرائش میں مشغول ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل شمو بی آرہی ہیں اور اُن کے استقبال کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ میری صورت دیکھتے ہی بھابی جان نے 'حکمِ امتناعی' سنا دیا، ''دیکھو میاں! کل شمو آرہی ہے۔ وہ تم سے پردہ کرتی ہے، لہٰذا تم باہر اپنے کمرے ہی میں رہنا۔ میں تمہارا ناشتا اور کھانا وہیں بھجوا دیا کروں گی۔ اندر نہ آنا۔ اور وہاں باہر سبزے پر بھی نہ نکلنا، کیوں کہ جاڑوں کے دن ہیں، اکثر ہم لوگ نکل کر دھوپ میں بھی بیٹھیں گے۔'' میں نے بڑی سعادت مندی سے ''بہت اچھا'' کہا تو میری سزا میں کچھ تخفیف کر دیے جانے کی اُمید دلا دی گئی۔ ''ارے چار پانچ روز کی تو بات ہے۔ تم کو تکلیف تو ضرور ہوگی، لیکن پھر کیا کیا جائے؟ اتنی مختصر تو کوٹھی ہے۔'' میں نے پھر بڑی شرافت سے جواب دیا، ''مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ آپ بالکل فکر نہ کیجیے۔''

شمیم آئی تو واقعی ساری کوٹھی پر ایک نشاط انگیز فضا چھا گئی۔ اس نے میرے آٹھ سال کے بھتیجے جمال اور چھ سال کی بھتیجی حمیدہ کے ساتھ خوب ہڑدنگا اور شور وغل مچایا۔ میرے حصے میں صرف چند نقرئی قہقہوں کی جھنکار آئی اور بس۔ جمال اور حمیدہ سے کرید کر پوچھا تو پتا چلا کہ ان کی خالہ دراصل شیطان کی خالہ واقع ہوئی ہے۔ اپنی شوخی اور شرارت سے ہر وقت وہ کھلکھلاتی رہتی اور کسی وقت بھی نچلا بیٹھنا تو وہ جانتی ہی نہ تھی۔

ایک روز میں یونیورسٹی سے پلٹا تو اپنے کمرے کو ایک عجیب و غریب حالت میں پایا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ پانی پت کی چوتھی لڑائی میرے ہی کمرے میں میری کتابوں، جوتوں، کپڑوں اور کرسی میزوں وغیرہ سے لڑی گئی تھی۔ میں نے کمرے کی ہر چیز کو اُلٹا پایا، حتیٰ کہ دیوار پر تصویروں کی بجائے جوتے ٹنگے ہوئے تھے اور جوتوں کی جگہ تصویریں اوندھی پڑی تھیں۔ بے ترتیبی اور انتشار کا

ایک عجیب عالم تھا۔ میرا لحاف زمین پر پلنگ کے نیچے قالین کی جگہ بچھا ہوا تھا۔ قالین کو الگنی پر پھانسی دے دی گئی تھی۔ ایک چادر میں بکس سے نکال کر میرے کپڑے چیک کرلیں مجھے یہ لفظ دیے گئے تھے اور بکس میں ردّی اخبارات بڑی احتیاط سے رکھے ہوئے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ آتش دان پر رکھی ہوئی میری تصویر کے بڑی بڑی مونچھیں بنا کر عینک لگادی گئی تھی اور روشنائی سے ایک آنکھ کی تخفیف کردی گئی تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا، ”حمیدہ کے چچا، پھکوڑی مل گھامڑ داس۔“ پہلے تو دل چاہا کہ بھابی جان کو بلا کر یہ حماقت افزا منظر دکھاؤں، لیکن پھر میری حمیت نے اس کو گوارا نہیں کیا۔

دوسرے دن میں نے اپنا کیمرا نکالا اور دوپہر میں جب کہ سارا گھر سمجھ رہا تھا کہ میں یونیورسٹی گیا ہوا ہوں اور شمیم باہر سبزے پر جمال اور حمیدہ کے ساتھ اُچک پھاند میں مصروف تھی، میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کے اُس ٹوٹے ہوئے شیشے سے، جو اکثر دوسرا شو دیکھ کر واپسی پر کھڑکی کی چٹخنی کھولنے اور کمرے میں داخل ہونے میں بڑی مدد دیتا تھا، شمیم کی مختلف زاویوں سے تصویریں اُتارنا شروع کردیں۔ میں تصویریں اُتارتا جاتا اور اُن کے عنوانات میرے ذہن میں خود بخود اُبھرتے جاتے۔ ’دوپٹے سے رسہ کشی‘، ’کیچڑ میں مینڈک‘، ’جھاڑی میں خرگوش‘، ’پردے کا زردہ‘، ’شمیم بانو ایک باتصویر فلمی رسالے پر تھوک رہی ہیں‘ وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر دوسرے ہی دن حمیدہ کی معرفت اِن تصویروں کی ایک ایک کاپی عنوانات کے ساتھ شمیم کے پاس بھیج دی گئیں۔ جمال نے اُس کو یہ دھمکی بھی سنادی کہ اِن تصویروں کی ایک ایک نقل اس پیغام کے ساتھ بھجوادی کہ ”چچا جان کی وہ تصویر، جو آپ نے خراب کی تھی، امی جان کو بھی پہنچنے والی ہے۔ اس کے بعد میرے کمرے پر کوئی دوسرا حملہ نہیں کیا گیا۔

اور پھر جب کہ دوسرے دن شمیم واپس جارہی تھی، رات میں ایک خوشگوار قسم کا بہت ناخوشگوار حادثہ پیش آگیا، جس سے اُس کے سامنے میری شرافت کی رہی سہی ساکھ بھی ختم ہوگئی۔ آٹھ بجے رات کو ایک دم سے پوری کوٹھی کی بجلی فیل ہوگئی۔ میں بھائی صاحب کے پاس برآمدے میں بیٹھا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ سامنے لائبریری میں جاکر آتش دان پر سے اُن کی ٹارچ اُٹھا لاؤں۔ لائبریری میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں ہاتھ بڑھاتے ہوئے آگے بڑھا تو میرا دایاں ہاتھ کسی کے ملائم چہرے پر پڑا اور پھر ایک نازک سی عینک میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں پیچھے

دبا اور ساتھ ہی مجھے ایک گلوگیر چیخ سی سنائی دی۔ میں نے لپک کر ٹٹولتے ہوئے ٹارچ اُٹھا کر جلادی۔ ٹارچ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ شمیم آنکھیں جھپکاتے ہوئے لال پیلی ہو رہی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اُس کو اُس کی عینک پیش کی، لیکن قبل اس کے کہ میں کوئی معذرت کر سکوں، اُس نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے اپنی عینک نوچ لی اور پیر پٹخ کر 'لوفر، بدمعاش' کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

دوسرے روز وہ اپنے گھر واپس چلی گئی اور میرے لیے میری حماقت کی ایک تلخ یاد باقی رہ گئی۔ البتہ میں اس بات پر یقیناً اس کا شکر گزار تھا کہ اُس نے اِس واقعے کا کوئی ذکر بھابی جان سے نہیں کیا، ورنہ نہیں معلوم مجھ پر کون سی قیامت گزر جاتی۔

بھابی جان کے مرحوم چچا میرے پھوپھا تھے۔ امتحان ختم ہو جانے کے بعد جب میں گھر جانے لگا تو بھائی صاحب کی ہدایت پر میں علی گڑھ اپنی پھوپھی سے ملنے گیا۔ باہر بیٹھک میں بھابی جان کے والد مولانا عبدالقدوس صاحب سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ بڑی شفقت اور تپاک سے ملے۔ بڑی دیر تک مجھے بہت سی نصیحتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک چھوٹے سے لڑکے کی رہبری میں مجھے میری پھوپھی کے پاس بھیج دیا۔

مولانا عبدالقدوس صاحب کا پرانے زمانے کا بنا ہوا بڑا عالی شان مکان تھا اور اَب غالباً اِس کا تین چوتھائی حصہ غیر آباد تھا۔ میرا رہبر لڑکا پہلے تو مجھے بروٹھے سے ایک وسیع صحن میں لے گیا، جس کے سامنے ایک شاندار سہ در اور چاروں طرف تہ داریاں بنی ہوئی تھیں۔ پھر وہ ایک زینے پر چڑھا، اس کے بعد ایک کوٹھے پر سے گزر کر وہ داہنی طرف مڑ گیا۔ میں وہاں پہنچا تو وہ ایک دم سے غائب ہو چکا تھا اور میں اس شعر کی تفسیر بن کر رہ گیا تھا:

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی؟

ایک موڑ پر میرے سامنے دو دروازے تھے۔ میں دونوں دروازوں پر خوب کھنکھارا، کنڈی کھٹکھٹائی، پیر پٹخے۔ ''ابے او لڑکے'' چیخا، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مجھے واپس ہونے پر بھی راستہ بھول جانے کا احتمال تھا، کیوں کہ میں دیکھ چکا تھا کہ یہ مکان کیا تھا پوری بھول بھلیاں تھا۔ چار و ناچار میں ایک دروازہ کھول کر آگے بڑھا۔ سامنے پھر ایک بڑا صحن تھا، لیکن

اس کے داہنے کونے پر جو دروازہ تھا، اُس سے آبادی کے کچھ نشانات ظاہر ہو رہے تھے، کیوں کہ دو قطاروں میں پھولوں کے کئی گملے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے اُس دروازے پر دستک دی تو اندر سے شمیم کی آواز آئی، ''کون؟'' میں نے پٹ کھول کر ذرا جھانکا تو دیکھا کہ شمیم سامنے پنچی کرسی پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پہلے تو چونک پڑی، لیکن پھر اُس نے تعجب سے تیوریاں چڑھا لیں۔

میں نے کہا، ''السلام علیکم۔''

اُس نے جواب دیا، ''وعلیکم السلام! اِس وقت یہاں؟ آپ کی شانِ نزول کیا ہے؟''

میں نے کہا، ''راستہ بھٹک کر منزلِ مقصود پر پہنچ گیا ہوں۔''

وہ آنکھیں نکال کر مصنوعی غصّے سے بولی، ''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''میں ایک چھوٹے سے لڑکے کی رہبری میں پھوپھی جان کے پاس جا رہا تھا، لیکن وہ لڑکا درمیان ہی میں کہیں غائب ہو گیا اور میں بھٹک کر آپ تک پہنچ گیا۔''

شمیم: ''تو جایئے۔ جس دروازے سے آپ یہاں تک آئے ہیں، اُسی کے برابر والا دروازہ چچی جان کے کوٹھے پر کھلتا ہے۔''

میں: ''لیکن مجھے آپ سے ایک معافی بھی مانگنا ہے۔''

شمیم: ''تو جلدی سے مانگ لیجیے اور تشریف لے جایئے۔ غالباً آپ کو اِس کا احساس نہیں کہ میرے اور آپ کے درمیان سرکاری طور سے پردہ ہے۔ اور آپ کا اس طور سے میرے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہونا انتہائی معیوب ہے۔''

میں: ''اچھا تو میں کمرے کے اندر حاضر ہو کر معافی مانگے لیتا ہوں۔'' اور میں کمرے میں اندر داخل ہو کر اُس کی کرسی کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

شمیم: (گھبرا کر) ''ہٹایئے، یہ معافی وغیرہ کی باتیں۔ اب آپ تشریف لے جایئے، کوئی آ جائے گا تو کیا کہے گا۔''

میں: ''آپ اپنی بداخلاقی کا الزام کسی دوسرے پر کیوں تھوپنا چاہتی ہیں؟''

شمیم: ''آئے تھے آپ معافی مانگنے اور اُلٹا مجھی کو بداخلاق بنا رہے ہیں۔''

میں: ''اُس روز اندھیرے کے حادثے کا ذمّہ دار صرف اندھیرا تھا۔''

شمیم: ''اور تصویریں خود بخود کیمرے میں اُتر آئی تھیں۔''

میں: ''اور میرے کمرے میں شاید کسی بھوت نے گھس کر غدر مچایا تھا۔''

شمیم: ''اس کارِ خیر میں محلے کی کئی لڑکیاں شریک تھیں!''

میں: ''جن کی رہنمائی آپ نے فرمائی تھی؟''

شمیم: (ہنستے ہوئے) ''اچھا، پھکوڑی مل گھامڑ داس جی، اب یہ انٹرویو ختم ہو جانا چاہیے۔''

میں: ''بشرطیکہ آپ ایک دفعہ پھر مجھے لوفر اور بدمعاش کہہ دیں۔''

شمیم: سمجھ لیجیے کہ کہہ دیا، لیکن اب خدا کے واسطے جائیے۔ آپ جانتے نہیں کہ والد صاحب پردے کے کس شدت سے پابند ہیں۔''

دفعتاً باہر صحن میں بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور کسی نے پکارا، ''شمیم!''

''جی! ابا جان۔'' شمیم نے بدحواسی سے جواب دیا۔ میں سراسیمہ کھڑا تھا۔ قدموں کی آواز قریب تر ہو گئی۔ شمیم نے انتہائی گھبراہٹ میں مجھے اشارہ کیا اور میں غڑاپ سے صوفے کے پیچھے چُھپ گیا۔

مولانا عبدالقدوس صاحب کمرے میں آ کر اُسی صوفے پر جس کے پیچھے میں چُھپا ہوا تھا، بیٹھ گئے اور گھر کی کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بولے، ''آج نسیم کا دیور اپنی پھوپھی سے ملنے آیا ہے۔ ٹھیک ہی کہتی تھی، وہ عجیب بوکھل لڑکا دکھائی پڑتا ہے۔''

اور عین اس موقع پر روکنے کی انتہائی کوشش کے باوجود، میں ایک زبردست چھینک چھینک دیا۔ مولانا عبدالقدوس صاحب غالباً ایک فٹ صوفے کے اوپر اُچھل گئے، کیوں کہ ہوا میں پرواز کے چند لمحوں کے بعد جب وہ صوفے پر واپس گرے تو اُس کا ہر اسپرنگ بے اختیار چیخ اُٹھا تھا۔ شمیم منہ پھیر کر صوفے کے ایک کونے میں گر گئی اور میں سر جھکا کر خاموشی سے یوں کھڑا ہو گیا جیسے:

سرِ تسلیم خم ہے، جو مزاجِ یار میں آئے!

پردے کے زبردست حامی مولانا عبدالقدوس صاحب نے اس معصوم ڈرامے سے یقیناً بدترین نتائج اخذ کیے تھے۔ ان پر ایک دم سے شدید قسم کا پاگل پن کا دورہ پڑ گیا، ''شیطانو! ملعونو! کم بختو! تم نے میری عزت خاک میں ملا دی۔ میری ناک کاٹ لی۔ میرے چہرے پر سیاہی مل دی۔ میری...'' وغیرہ وغیرہ۔ وہ چیخے، گرجے، تڑپے اور پھر اُنہوں نے اپنے سر کے بال اور

داڑھی نوچ کر رکھ دی۔ شمیم نے سسکیوں کے درمیان کچھ کہنا چاہا تو اُنہوں نے لپک کر اُس کے ایک چھڑی رسید کی۔ میں بچانے کے لیے آگے بڑھا تو مجھ پر تابڑ توڑ کئی چھڑیوں کی بارش سی ہوگئی۔ میں فرش پر گرا تو کئی لاتوں سے ضیافت کی گئی۔ ”کمینہ، آوارہ، بدمعاش، جہنمی۔“ اور نہیں معلوم کن کن خطابات سے سرفراز کیا گیا۔

کافی مار دھاڑ کے بعد مولانا نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا، ”چل باہر ابھی ٹھیک کیے دیتا ہوں تجھے۔ تو بھی کیا یاد کرے گا کہ کسی شریف کی ناموس میں بٹہ لگانے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟“ میں نے لاکھ کچھ کہنا چاہا، مگر مولانا کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ میں جیسے ہی بولنے کے لیے منہ کھولتا، وہ فوراً ایک کرتھپڑ رسید کر دیتے۔ مارتے کوٹتے وہ مجھے ایک دوسرے کوٹھے پر لے گئے اور ایک تنگ اور تاریک کوٹھری میں بند کر دیا۔

میں سمجھتا تھا کہ اس کوٹھری سے براہِ راست مجھے کسی جلاد کے پاس مقتل گاہ بھیج دیا جائے گا۔ لیکن چند ہی گھنٹوں بعد مجھے اس سے نکال کر ایک قاضی اور چند گواہوں کے سامنے پیش کیا گیا اور میرا اور شمیم کا باقاعدہ نکاح ہوگیا۔ مولانا عبدالقدوس صاحب نے یہ بھی ایک نادری حکم لگا دیا کہ ہم دونوں میاں بیوی شام تک اُن کا گھر خالی کر دیں۔ جہیز کے طور پر اُنہوں نے انتہائی حقارت سے ایک دستاویز مجھے گھسیٹ ماری، جس میں انہوں نے پیشتر ہی سے اپنی کل جائیداد اپنی دونوں لڑکیوں نسیم (بھابی جان) اور شمیم کو دے رکھی تھی۔

ریل میں شمیم کبھی روتی، کبھی ہنستی اور کبھی میری چوٹوں پر مرہم لگاتی۔ بھائی صاحب اور بھابی جان کے سامنے جب ہم دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے پیش ہوئے تو بھائی صاحب مارے خوشی کے چیخے، ”کوے کی چونچ میں انگور۔“ بھابی کچھ دیر تو سکتے میں رہیں، پھر ایک ہاتھ سے ’میری شمو‘ کہہ کر شمیم اور دوسرے ہاتھ سے ’میرا ابنو‘ کہہ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔

واضح رہے کہ کچھ عرصے بعد مولانا عبدالقدوس صاحب سے بھی صفائی ہوگئی اور اُنہیں جب صحیح واقعے کا علم ہوا تو بہت ہنسے اور اپنی داڑھی میں خلال کرتے ہوئے فرمایا، ”جب میں صوفے پر بیٹھا تمہیں بوکھل کہہ رہا تھا تو صوفے کے پیچھے تم پر کیا گزر رہی تھی۔“ میں نے بڑے ادب سے جواب دیا، ”میں دنیا کی سب سے قیمتی چھینک روکنے کے لیے اپنی ناک اینٹھ رہا تھا۔“ مولانا نے قہقہہ لگاتے ہوئے فرمایا، ”واقعی ہم دونوں ہی کی ناکیں سخت خطرے میں پڑ گئی تھیں!!“

رنگِ ادب پبلی کیشنز

وجاہت علی سندیلوی ...... برکت ایک چھینک کی

بینک... 'باؤ بس'

وقار محسن

حالاں کہ کئی پسماندہ ممالک نے حکومتِ پاکستان سے درخواست کی تھی کہ ابن بطوطہ کے وقتوں کی اس بس کو ان کی نذر کر دیا جائے، تا کہ جو خطرناک مجرم بجلی کی کرسی اور پھانسی کے پھندے سے خوف زدہ نہیں ہوتے، اُن کو چند میل اس بس کی سیر کرا دی جائے۔ بہر حال، اللہ کی رضا اسی میں تھی کہ جو لوگ سود کے کاروبار میں ملوث ہیں، اُن کو اسی دنیا میں جہنم رسید کیا جائے، اس لیے یہ چاند گاڑی مختلف بینکوں سے تعلق رکھنے والوں کے پلے پڑی۔ بھائی میاں نے شہر کے بے شمار کباڑیوں سے رابطہ کیا اور ان سب کی مشترکہ کوشش کے نتیجے میں یہ بس دستیاب ہوئی۔ شارق صاحب کے تعلقات بحری قزاقوں سے بہت قریبی رہے ہیں، اس کے لیے ڈرائیور کا انتظام انہوں نے کر دیا۔

اس بس کے ناخدا، جناب پتن ہیں، جو ایک عرصے تک جیمنی سرکس میں موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلاتے تھے اور اَب اپنے اسی فن کا مظاہرہ کراچی کی پُر ہجوم شاہراہوں پر کرتے ہیں۔ مسافر دورانِ سفر ایک ہاتھ سے دل اور دوسرے سے برابر والے کا ٹینٹوا پکڑے، دم سادھے بیٹھے رہتے ہیں کہ:

نہ جانے کس سڑک پہ زندگی کی شام ہو جائے

بس کی کشادگی کا یہ حال ہے کہ ایک دوسرے میں یوں پیوست ہو کر بیٹھے ہیں کہ اکثر اپنی جیب کی بجائے ہم سفر کی جیب میں ہاتھ پڑ جاتا ہے۔ نتیجتاً سر پھٹول کی نوبت آ جاتی ہے۔ مسلم کمرشل بینک کے جناب آغا صاحب جو نہایت مہین واقع ہوئے ہیں، خود کو رسی سے باندھ کر بیٹھتے ہیں۔ جان عالم صاحب جو نیشنل بینک کی کرکٹ ٹیم کے بارہویں کھلاڑی ہیں، گھٹنوں کو بچانے کے

لیے پیڈ باندھ کر بیٹھتے ہیں۔

ڈرائیور صاحب کے عین سرِ مبارک کے نزدیک بس کی شکستہ چادر پر یہ شعر درج ہے:

صبر کر اپنی قسمت پر نہ پچھتا بیٹھنے‘ والے
یہی ’بس‘ تیری منزل ہے، اسی میں تیری تربت ہے

سوار ہوتے وقت تمام بینک کار ایک دوسرے سے کہا سنا معاف کرواتے ہیں، ایک دوسرے کا آخری دیدار کر کے بہ غرض احتیاط ایڈوانس میں سورۂ یٰسین پڑھ کر پھونک دیتے ہیں۔ بیگمات بھی وقتِ رخصت امام ضامن باندھ کر مکان کے کاغذات، چیک بک وغیرہ اپنے قبضے میں کرلیتی ہیں کہ پتا نہیں شام کو:

وہ آتے ہیں کہ خبر آتی ہے

ڈرائیور صاحب کے سپہ سالار، گوٹے کی ٹوپی سر پر منڈھے بس کے صدر دروازے میں جھولتے رہتے ہیں اور جب بھی کوئی گاڑی بس کے لب و رخسار کے نزدیک آتی ہے تو ایک لرزہ خیز چیخ کے ساتھ دوسری گاڑی والے کے ساتھ چند غیر شرعی تعلقات کا اظہار کرتے ہیں۔ کنارے کنارے ڈلکی چال چلتی ہوئی ہونڈا ففٹی کو چھیڑنے کے لیے ڈرائیور صاحب شرارتاً بس کو ایک ٹھمکا دیتے ہیں اور غریب سوار کو زمین بوس کرنے کے بعد اُس کو ڈانٹتے ہیں کہ اس نے جامِ شہادت نوش کرنے کا یہ سنہری موقع کیوں ضائع کر دیا۔ جہاں چتن (ڈرائیور) میں اور خوبیاں ہیں، وہاں اللہ کے فضل سے کلر بلائنڈ بھی ہیں اور یوں اُن کو سرخ سگنل کا رنگ ہرا نظر آتا ہے۔

نیشنل بینک کے جناب جمال صاحب کو جو تین سیٹوں میں سما پاتے ہیں، اکثر ’توازن‘ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جب گاڑی اُلار ہوتی ہے تو اُن کو آگے رکھ دیا جاتا ہے اور جب دباؤ ہوتی ہے تو پیچھے لڑھکا دیا جاتا ہے۔ اگر بس کہیں اَڑی کرے اور چلنے سے انکار کر دے تو جمال صاحب کو اُتار کر فٹ پاتھ سے ٹکا دیا جاتا ہے کہ:

جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو بوجھ اُتارا کرتے ہیں!

بس کی تعریف میں محترم بانکے پنواڑی فرماتے ہیں،

"دسری کی ہر چیز بولے ہے، ہارن کے علاوہ۔"

اگلی سیٹ سے ٹکرا ٹکرا کر گھٹنوں اور پیشانیوں پر ایسے گٹے پڑ گئے ہیں، جن کا حصول صدیوں کی عبادت کے بعد بھی ناممکن تھا!

جب کوئی مسافر بس سے اُترتا ہے، یا چڑھتا ہے تو جناب پتن شیشے میں دیکھتے رہتے ہیں اور جیسے ہی غریب کی ایک ٹانگ پائیدان پر اور ایک زمین پر ہوتی ہے تو ایکسیلیٹر کا ایک جھٹکا دے کر مسکرا کر دیکھتے ہیں کہ یہ 'جھر' کی آواز پتلون کے کون سے حصّے کی جدائی کی وجہ سے ہے۔

منزلِ مقصود، یعنی حبیب بینک پلازہ پر صحیح سلامت پہنچنے پر لوگ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے ہیں اور کرشمۂ قدرت کے قائل ہوتے ہوئے جناب پتن کی بارگاہ میں شکر بجالاتے ہیں اور فٹ پاتھ پر باجماعت سجدہ ریز ہو جاتے ہیں...

* * *

آسمان سے کھجور تک!

وحید الرحمٰن خان

میں اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار کے سرسری مطالعہ میں مصروف تھا۔ اخبارات کے بارے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان میں کوئی نئی بات نہیں ہوتی، روز وہی فرسودہ حادثات وواقعات کی خبریں ہوتی ہیں۔ بس اتنا ہے کہ یہ پرانے حادثات وواقعات ہر بار کسی نئے شخص کو پیش آتے ہیں۔ یوں موضوعِ خبر بننے والے افراد کہہ سکتے ہیں کہ:

ہم 'روحِ خبر' ہیں، ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آجائیں گے ہم لوگ

میں 'خبرزدگی' کی حالت سے گزر رہا تھا کہ اچانک صحن سے شور کی آواز سنائی دی۔ مجھے تجسس ہوا کہ کون ہنگامہ آرا ہے؟ کمرے سے باہر نکل کر دیکھا تو اپنے ملازم منگلے کو چھینکیں مارتے ہوئے پایا۔ اس کی آنکھوں میں پانی تھا اور ناک سرخ تھی۔ خیریت دریافت کی تو اس نے جواباً ایک سرخ گلاب میری خدمت میں پیش کر دیا۔ اس تحفۂ گل کو میں نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا اور خوشبو کے متوقع احساس سے آنکھیں بند کرتے ہوئے پھول ناک کے قریب لے گیا۔ بس پھر کیا تھا، پہلے ناک میں خارش سی ہوئی اور بعدازاں ناک کی گہرائیوں میں سے 'آب وہوا وصدا' پر مبنی ایک جھونکا زبردست دباؤ کے تحت خارج ہوا۔ 'صریرِ شامہ' کا سلسلہ ہائے دُور دراز شروع ہو گیا۔ منگلا ایک بار چھینکتا تو میں جواب میں دو چھینکیں نشر کرتا۔ میں نے 'ہائے گل' پکارتے ہوئے پھول زمین پر دے مارا اور ڈانٹ کر منگلا سے پوچھا، "یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

منگلے نے ناک پونچھتے ہوئے ننھے کی طرف اشارہ کیا جو 'کھی کھی' کرتے ہوئے ایک کونے میں ہنس رہا تھا۔ غصہ سے اس کی جانب دیکھا تو وہ ایک قہقہہ لگا کر کمرے کی طرف بھاگ گیا۔ بعدازاں منگلے نے صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے بتلایا کہ یہ سرخ گلاب ننھے نے اسے

سونگھنے کے لیے دیا تھا اور دینے سے قبل موصوف نے اس پر سرخ مرچیں چھڑک دی تھیں۔ ننھے کی اس شیطانی پر جی تو یہ چاہتا تھا کہ مرچوں کا سالم ڈبا اس کے نتھنوں میں انڈیل دوں لیکن ایک میزبان کی حیثیت سے مجھے ضبط اختیار کرنا پڑا۔ بہر حال، اس واقعہ سے میں نے یہ نصیحت حاصل کی کہ صرف کانٹے ہی نہیں، بعض اوقات پھول بھی انسان کے لیے باعثِ آزار ثابت ہوتے ہیں۔ اور اَب میری احتیاط کا عالم یہ ہے کہ اگر کوئی دوشیزہ بھی میرے کالر پر گلاب کا پھول سجائے تو سونگھا نہیں کرتا، اس ڈر سے کہ کہیں... 'مالی' نے کچھ ملا نہ دیا ہو 'گلاب' میں۔

قارئین، آپ یقیناً اس موقع پر اس ذاتِ شریر کے بارے میں جاننا چاہیں گے جسے 'ننھے' کے نام سے پکارا گیا ہے۔ ننھا، انکل وہاب علی خان کا سوتیلا بیٹا ہے۔ اور انکل، ابا کے ایک پُرانے دوست ہیں۔ آثارِ قدیمہ اور شرابِ کہن کی طرح دوستی بھی جتنی پرانی ہو، اتنی زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ خان صاحب چالیس سال تک مجرد رہے۔ اس عرصہ میں ایک دونالی بندوق کے ذریعے معصوم جانوروں کے ہوش وخرد، قلب ونظر اور جسم وجاں شکار کرتے رہے۔ چالیس کے دائرے سے باہر قدم رکھا تو خود شکار ہو گئے۔ ایک ہم عمر بیوہ سے شادی کر لی جو جہیز میں بدمزاجی کے علاوہ ایک بیٹے کو بھی لائی تھی۔ یہ شادی اب سے کوئی ایک ہفتہ قبل ہوئی تھی اور جب یہ نو بیاہتا جوڑا ہنی مون کی بدنیتی سے شمالی علاقہ جات کی طرف جانے لگا تو خان صاحب ننھے کو سپرد کرنے میرے پاس تشریف لائے۔ دراصل وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس رومانوی سفر میں فریقِ ثالث بھی شریک ہو۔ یوں بھی ہنی مون دفعہ 144 کی طرح ہوتا ہے، بس فرق یہ ہے کہ اس میں دو سے زائد افراد کی موجودگی نہیں ہونی چاہیے۔ بصورتِ دیگر یہ ایک سنگین رومانوی جرم بن جاتا ہے اور خان صاحب 'قانون شکنی' کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ننھے کو میری تحویل میں دے دیا۔ میں ان دنوں بہت مصروف تھا لیکن انکل کی ابا سے گہری دوستی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ننھے کی 'سرپرستی' کی ہامی بھر لی۔ رخصت ہونے سے قبل انکل نے یقین دہانی کرائی کہ وہ دس روز میں لوٹ آئیں گے اور اپنی 'امانت' وصول کر لیں گے، مزید براں یہ کہ ننھا ایک شریف، معصوم اور بے ضرر سا بچہ ہے۔

انکل رخصت ہوئے تو میں نے ننھے پر ایک نگاہِ درست انداز ڈالی۔ وہ ایک گول مٹول سا بچہ تھا، جس کی آنکھوں سے شرارت جھانک رہی تھی۔ بے تکلفی کی فضا پیدا کرنے کے لیے اس سے

دریافت کیا۔

''آپ کا نام؟''

''نام میں کیا رکھا ہے، کانٹے کو جس نام سے پکارو، وہ تکلیف دے گا۔''

''آپ کی عمر؟''

''ایک درجن سال'' جواب ملا۔

''کس جماعت میں پڑھتے ہیں؟''

''نصف درجن جماعت میں۔''

''تو گویا چھٹی میں ہیں آپ۔''

''جی نہیں، ششم میں۔''

یہ تھا ننھے سے میرا اوّلین تعارف۔ لیکن یہ فقط تعارف کی تمہید تھی۔ اس کے اصل جوہر اس وقت کھل کر سامنے آئے جب اس نے مرچوں والا 'گل کھلایا'۔ اس واقعہ کے بعد میں نے ننھے کے معاملے میں قدرے درشتی کا مظاہرہ کیا لیکن وہ شرارتوں سے باز نہ آیا۔ ایک روز ایک لاغری مرغی کو بغل میں دبائے گھر میں داخل ہوا۔ یوں لگا جیسے مرغی کو دو مُلّاؤں کے مابین ہونے والی جنگ میں مالِ غنیمت کے طور پر پکڑ لایا ہو۔ مرغی کا سرِ تسلیم اور دُم بیماری کے باعث خم تھے۔ ڈانٹ کر استفسار کیا۔

''کہاں سے لائے ہو یہ مرغی؟''

''پولٹری فارم سے... خریدی ہے۔'' اس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن یہ تو بیمار ہے۔''

''جی، اسے "Man pox" کی بیماری ہے۔''

''کیا کہا... Man pox?'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''جی ہاں، جس طرح انسانوں کو "Chicken pox" ہو جاتا ہے، اسی طرح یہ بے چاری "Man pox" کے مرض میں مبتلا ہے۔''

اس منطق پر بہت ہنسی آئی لیکن خاموش رہا۔ مجھے مرغی پر ترس آ رہا تھا۔ اس کا زندہ بچنا مشکل تھا اس لیے اسے ذبح کرنے کا مشورہ دیا۔ ابتدا میں ننھے نے بہ خنجر خود اس بے چاری کو کشمکشِ

دہرے سے آزاد کرنے کی کوشش کی لیکن خوش قسمتی سے منگلے نے دیکھ لیا۔ چنانچہ اس نے مرغی کو حرام موت سے بچا کر خود حلال کر دیا اور اُس کے سَر، پَر اور آنتیں گھر کے سامنے گندگی کے ڈھیر میں پھینک دیے۔ میں نے منگلے سے مزیدار چکن کڑاہی تیار کرنے کی فرمائش کی۔

دوپہر کے وقت ہم دسترخوان پر جمع ہوئے اور ابھی کھانے کا آغاز ہی کیا تھا کہ منگلے نے پریشان کن انداز میں ایک پڑوسی کی آمد کی اطلاع فراہم کی۔ کھانا وہیں پہ چھوڑتے ہوئے گیٹ کی طرف گیا تو وہاں ایک سخت مزاج ہمسائے کو مونچھیں مروڑتے ہوئے موجود پایا۔ ان کے دوسرے ہاتھ میں مرغی کے شکستہ پر تھے۔ ان پروں کو بھی وہ تاؤ دے رہے تھے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ مرغی دراصل ان حضرت کی تھی اور ننھا اسے اغوا کر کے لایا تھا اور اَب یہ صاحب کسی سراغ رساں کی طرح 'مرحومہ' کے پروں کی مدد سے جائے واردات پر پہنچے ہیں تاکہ ملزموں کو رنگے ہاتھوں گرفتار کیا جا سکے۔ میرے لیے فرار کی کوئی راہ نہیں تھی، سوائے اس کے کہ غلطی تسلیم کی جائے، سرقہ کو بچے کی شرارت قرار دیا جائے اور انہیں 'قصاص' ادا کیا جائے۔ لیکن وہ رقم کی وصولی پر بھی مطمئن نظر نہیں آتے تھے۔ چنانچہ اس دوپہر کا کھانا انہوں نے ہمارے ہاں تناول فرمایا۔ تب کہیں جا کر اُن کے چہرے پر اطمینان کے آثار نمایاں ہوئے۔

ننھا ایک پیٹو قسم کا بچہ تھا۔ مرغی بھی وہ شکم پرستی کی نیت سے چرا کر لایا تھا۔ پورے گھر میں اس کا پسندیدہ مقام باورچی خانہ تھا۔ وہ اکثر یہیں پایا جاتا۔ اگر اُس کی نقل و حرکت کا مربع صرف کھانے پینے تک محدود رہتا تو مجھے چنداں اعتراض نہیں تھا لیکن وہ تو باورچی خانے میں گھستے ہی وحشی بن جاتا اور وحشی کو سکوں سے کیا مطلب؟ برتنوں کی شکست و ریخت اس کا گویا 'قومی کھیل' تھا۔ کبھی اس کے ہاتھوں سے رکابی گر کر پاش پاش ہوتی تو کبھی چائے کی پیالی چکنا چور ہو جاتی۔

اگر اِس موقع پر میں آواز دے کر پوچھتا۔

"ننھے اب کے کیا توڑا ہے؟"

"تو گنگنا اُٹھتا کہ:

تم پوچھو اور میں نہ بتاؤں ایسے تو حالات نہیں
ایک ذرا سا کپ 'ٹوٹا ہے اور تو کوئی بات نہیں

ایک دن تو ننھے نے حد کر دی۔ ایک قیمتی ڈنر سیٹ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

میرے وجود میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ڈانٹ کر کہا،

”میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ کچن میں مت جایا کرو۔“

”سترہ مرتبہ“ اس نے معصوم بنتے ہوئے جواب دیا۔

”تو پھر تم باز کیوں نہیں آتے؟“

”میں اس 'سومنات' کو فتح کر کے ہی دم لوں گا۔“

وہ عموماً اسی طرح کی اوٹ پٹانگ باتیں کیا کرتا۔ اس کی باتیں دلچسپ تو ہوتیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ بہت زچ اور بیزار بھی کر دیتیں۔ ایک روز میرے کمرے میں آیا اور پوچھنے لگا،

”رحمان بھائی، وہ کون سا مقام ہے جہاں منگل سے پہلے بدھ آتا ہے؟“

”منگل سے پہلے بدھ؟!... مجھے نہیں معلوم۔“

”فیروز اللغات میں“ اس نے خود ہی میری مشکل حل کر دی۔

میں اس لڑکے کی باتوں اور شرارتوں سے عاجز آ چکا تھا۔ انکل وہاب کی آمد کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا کہ وہ آئیں اور اپنی 'باقیات' واپس لے جائیں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جس دن ننھا ہمارے مکانِ فانی سے کوچ کرے گا، اسی روز میں منگلے کے ساتھ مری روانہ ہو جاؤں گا تا کہ کچھ ذہنی سکون حاصل کر سکوں۔ انکل کی آمد میں دو دن باقی تھے۔ اور اس دوران میں ننھے نے گلہائے رنگ رنگ کھلائے۔ اس کی حرکتوں کے بیان کے لیے دفتر درکار ہے۔ لیکن یہاں صرف جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں:

- میری ایئر گن سے اس نے کالونی کے تمام چراغِ رہ گزر گل کر دیے۔ اس کارروائی میں متعدد چھپکلیاں ہلاک ہوئیں۔ نیز ہمسائے کا پالتو کتا بھی ایک ٹانگ سے معذور ہو گیا۔ اب وہ کتا کسی کھمبے کے پاس نظر نہیں آتا۔
- منگلا بیٹھنے لگا تو نیچے سے کرسی کھینچ لی۔ جس کے نتیجے میں دھڑام سے گرا اور اُس کے پاؤں میں موچ آ گئی۔ دو روز تک وہ بھی لنگڑا کر چلتا رہا۔
- میری ایک اہم کتاب کا اُس نے شیرازہ بکھیر دیا اور اُس کے اوراقِ پریشاں کے جہاز بنا کر ہوا میں اُڑائے...

اور بالآخر انکل وہاب علی خان آ ہی گئے۔ میں ان کی آمد سے بہت خوش ہوا۔ اُدھر ننھا ان

سے آ کا س بیل طرح لپٹ گیا اور اٹکھیلیاں کرنے لگا۔ انکل خاصے مسرور دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہنی مون بہت خوشگوار رہا۔ وہ بار بار میرا شکریہ ادا کرتے کہ میں نے ننھے کو اس عرصے میں اپنی تحویل میں رکھا۔ وہ ہنی مون کی دلکش رُوداد بیان کر رہے تھے کہ منگلا چائے لے کر آ گیا۔ ہم سب نے مل کر چائے نوش کی جب کہ ننھے نے چائے قالین پر گرا دی۔ جانے سے پہلے خان صاحب نے مجھ سے دریافت کیا،

”رحمان میاں، آج کل کیا مصروفیات ہیں؟“

میں نے زہر خند انداز میں کہا،

”جی، اب تک تو ننھے کی 'سر پرستی' میں مصروف رہا... اب سیر و تفریح کے لیے مری جانے کا ارادہ ہے... کوئی دس دن کا پروگرام ہے۔“

میری بد قسمتی دیکھیے کہ ننھے نے بھی یہ 'عزائم' سن لیے اور وہ بھی مری جانے کی ضد کرنے لگا۔ یہ ایک نئی افتاد تھی۔ میں نے ٹالنے کی بہتیری کوشش کی، خان صاحب نے بھی اسے سمجھایا لیکن اس کے 'پائے اضداد' میں لغزش نہ آئی۔ جب وہ اپنی بالک ہٹ پر قائم رہا تو انکل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا،

”رحمٰن، بھئی ایسا کرو، ننھے کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ، بے چارہ ہمارے ساتھ بھی سیر و تفریح نہیں کر سکا... کچھ گھوم پھر ہی آئے گا۔“

اور پیارے قارئین، آپ جانتے ہیں کہ انکل وہاب علی خان، ابا کے ایک پرانے دوست ہیں۔ ان کا یہ حکم سن کر میں نے ایک سرد آہ بھری اور کھلی کھڑکی میں سے باہر افق کی طرف دیکھا۔ وہاں نیلے آسمان کے پیش منظر میں کھجور کا ایک سبز درخت لہلہا رہا تھا۔

* *

غالبؔ اپنے کلام کے آئینے میں!

ہری چند اخترؔ / بشیر منذر

"تنقید عالیہ" کا دور دورہ ہے اور تحقیق و تدقیق کی سنگلاخ زمین میں نئے نئے پھول اور پودے اُگا کر ویرانوں کو گلزار بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس ضمن میں مصنفوں اور شاعروں کی سوانح حیات، ان کے کلام اور تصانیف سے مرتب کرنے کا شغل عام ہو چکا ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ حنظل سے عطر نکالنے کی کوشش کے مترادف ہے، لیکن لکھنے والوں نے کتابیں لکھ ڈالیں اور ہم ابھی اظہارِ رائے کے گنبد سے باہر نہیں آ چکے:

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

پس خاک از تودۂ کلاں بردار پر عمل کرتے ہوئے مرزا غالبؔ پر قلم صاف کرتا ہوں ان کے سوانح حیات بعض حضرات بڑی تحقیق و تفتیش کے بعد کتابی صورت میں پیش کر چکے ہیں پھر بھی میرا خیال ہے کہ ان سطور میں جو کچھ مختصراً پیش کیا جا رہا ہے اسے پڑھنے کے بعد آپ مصنف کو دعائے مغفرت سے یاد فرمائیں گے۔

غالبؔ کے حالات

نام: مرزا کا نام تمام تذکرہ نویسوں نے اسد اللہ خاں لکھا ہے چوں کہ آپ ایرانی النسل تھے اس لیے اسد اللہ اور خان کے درمیان بیگ کا لفظ بھی بڑھا دیا جاتا ہے، لیکن نئے محققوں نے اس نام کے معاملے کو بھی خاص تحقیقات کا مستحق سمجھا اور بڑی کاوش و تلاش کے بعد ثابت کر دکھایا کہ: آپ کا نام احمد شاہ ابدالی یا ماؤزے تنگ نہیں، بلکہ اسد اللہ خاں تھا۔ اُن کے اِس انکشاف کی تائید مرزا کے اس شعر سے ہوتی ہے:

مارا زمانہ نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں جو جوانی کدھر گئی

انور احمد علوی

مرزا کا تخلص کئی غزلوں میں اسدؔ ہے اور اکثر میں غالبؔ اس سے پڑھے لکھے لوگوں کو شک ہو چلا تھا کہ مرزا کا دیوان دو مختلف شاعروں کے کلام کا مجموعہ ہے، لیکن ہمارے نئے تذکرہ نویسوں نے بزورِ قلم ثابت کر دیا ہے کہ غالبؔ اور اسدؔ دراصل ایک شخص کے دو تخلص ہیں۔ البتہ ان تذکرہ نگاروں کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ مرزا پہلے اسدؔ تھے پھر غالبؔ بن گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا نے آخر اسدؔ تخلص ترک نہیں کیا، بلکہ مرنے کے بعد بھی سب سے پہلا شعر اسی تخلص سے کہا، فرماتے ہیں:

یہ لاشِ بے کفن اسدِؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے! عجب آزاد مرد تھا

پیدائش: نام اور تخلص کا مسئلہ یوں حل ہو گیا، لیکن مرزا کے سنہ پیدائش اور عمر کے بارے میں نئے اور پُرانے تمام تذکرہ نویسوں نے بُری طرح ٹھوکریں کھائی ہیں۔ سب نے غالبؔ کا سنہ پیدائش 1212ھ لکھا ہے اور عمر 73 سال۔ لیکن یہ صریحاً غلط ہے۔ مرزا خود کہتے ہیں:

فنا تعلیمِ درسِ بے خودی ہوں اس زمانہ سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

اس سے ظاہر ہے کہ مرزا نہ صرف قیس عامری کے زمانے میں زندہ تھے، بلکہ عمر میں بھی اس سے بڑے تھے، کیوں کہ جن دنوں قیس ایک مبتدی چھوکرے کی حیثیت سے مکتب کی دیواروں پر 'لام الف لا' لکھتا تھا، اُس وقت مرزا صاحب بے خودی کے پروفیسر ہو چکے تھے۔ مجنوں کے زمانہ میں مرزا کی موجودگی کا ایک اور شعر سے بھی ثبوت ملتا ہے:

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

ان دونوں شعروں کو ملا کر پڑھیں تو یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ مرزا غالبؔ قیس عامری سے بہت زیادہ خوب صورت تھے۔ پہلا شعر بتاتا ہے کہ آپ مجنوں سے عمر میں بہت بڑے تھے، لیکن دوسرا شعر کہہ رہا ہے کہ لیلیٰ، جو مجنوں کی محبوبہ ہونے کے علاوہ خود بھی اُس پر فریفتہ تھی، جب مرزا غالب کے سامنے آئی تو نوجوان مجنوں کو بہت حقیر سمجھنے لگی تھی اور اِس حقارت کا کھلے لفظوں میں اظہار کر دیتی تھی۔ مرزا نے اگرچہ اسے اپنی معشوق فریبی کا کرشمہ ظاہر کرنا چاہا، لیکن یہ اُن کی کسرِ نفسی ہے۔ اگر مرزا مجنوں کے مقابلے میں سچ مچ یوسف نہ ہوتے تو لیلیٰ پر اُن کی معشوق فریبی بھی کارگر نہ ہو سکتی۔

رنگِ ادب پبلی کیشنز

والدین: غالب کے باپ کا نام تمام تذکروں میں عبداللہ بیگ درج ہے، لیکن مرزا کے کلام سے اس پر کچھ روشنی نہیں پڑتی۔ تاہم، مرزا کے باپ کا کچھ نہ کچھ نام ضرور تھا، کیوں کہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اب سے کئی سو سال پہلے بھی ہندوستان میں باپوں کے نام ہوا کرتے تھے۔ مثلاً، جہانگیر کے والد کا نام جلال الدین اکبر تھا اور ہمایوں کے باپ کا نام ظہیر الدین بابر۔ اِس تاریخی انکشاف کے بعد اگر قافیہ کی رعایت سے اسد اللہ کے باپ کا نام عبداللہ تسلیم کر لیا جائے تو میرے خیال میں کوئی قیامت نہیں۔ مرزا کی والدہ ماجدہ کا نام کسی کو معلوم نہ ہوسکا، لیکن انہوں نے اپنے ایک خط میں شکایت کی ہے کہ ایک شخص نے ان کو بڑھاپے میں ماں کی گالی دی۔ اس سے ثابت ہے کہ غالب کی کم سے کم ایک ماں ضرور تھی!

تعلیم: معلوم نہیں مرزا نے تعلیم کہاں پائی، مجنوں کے زمانہ میں کوئی باقاعدہ اسکول اور کالج تو تھا نہیں۔ صرف ایک دلبستان تھا، جس کی دیواریں مجنوں نے 'لام الف' لکھ کر سیاہ کر ڈالی تھیں۔ اس لیے کسی اور کے لیے وہاں کچھ لکھنے پڑھنے کی گنجائش ہی نہ نہیں رہی۔ مجنوں سے پہلے غالب نے بھی یہاں کچھ دن گزارے تھے۔ خیال ہے کہ اس مکتب کا نام 'غمِ دل' تھا۔ اس میں آپ داخل تو ہوئے، مگر 'رفت اور بود' سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس مکتب کا ذکر آپ نے اپنے ایک شعر میں واضح طور سے کر دیا ہے:

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

لیکن اس کے بعد مرزا گھر پر ہی پڑھتے تھے۔ بہر حال، یہ ظاہر ہے کہ وہ جاہل نہیں تھے۔ اگر ناخواندہ ہوتے تو شعر کیوں کر لکھ سکتے تھے اور اتنی تصانیف کہاں سے آجاتیں؟ 'آبِ حیات' والے محمد حسین آزاد نے بھی صرف بہادر شاہ ظفر کے اشعار کو ذوق کی تصنیف بتایا ہے، غالب کے بارے میں اس حسنِ ظن کا اظہار نہیں کیا۔

غالب نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ پس وہ تھوڑی بہت دونوں زبانیں جانتے تھے، البتہ اپنی ایک کتاب کا نام 'عودِ ہندی' رکھنے سے ظاہر ہے کہ تحریر و تصنیف میں اُردو کو ہندی لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ مردم شماری کے وقت انہوں نے اپنی مادری زبان ہندی لکھوائی تھی۔

انور احمد علوی

پیشہ اور شغل: مرزا کا سب سے بڑا اور مستقل پیشہ تو عاشقی تھا، جس کا ثبوت ان کے دیوانوں میں جا بجا ملتا ہے۔ دوسرا شغل یہ تھا کہ شعر چن چن کر رُسوا ہوتے رہتے تھے۔ خود مانتے ہیں کہ:

شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

اس کے علاوہ بعض اور اشغال بھی تھے۔ مرزا کوئی ہنر مند آدمی نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود فلک ناہنجار آپ کی دشمنی پر تل گیا تھا۔ فرماتے ہیں:

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

البتہ فنِ مصوری میں کچھ دسترس حاصل کی تھی۔ ایسا کیوں کیا تھا، اِس کا جواب خود دیتے ہیں:

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

ایک مدّت تک یہ شیوہ رہا کہ صبح سویرے ضروریات سے فارغ ہوتے ہی کان پر قلم رکھ کر نکل کھڑے ہوتے اور سارا سارا دن بلا معاوضہ لوگوں کے خط لکھتے پھرا کرتے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی سوشل سروس لیگ کے ممبر بن گئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ:

مگر لکھوائے کوئی اُن کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ایک شعر سے پتا چلتا ہے کہ ابنائے روزگار کی بے مہریوں سے تنگ آ کر گداگری بھی اختیار کی۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ اس حالت میں بھی عاشقی کو ترک نہیں کیا۔ کہتے ہیں:

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

لڑکپن کا زمانہ گزرا جوانی آئی، سرخ سرخ اور گرم گرم خون رگوں میں ایک تلاطم پیدا کرنے لگا۔ مرزا سے نہ رہا گیا اور عشق نامی ایک شہ زور حریف پر فتح حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ فریقین کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان میں اُترے۔ گھمسان کا رن پڑا، مگر افسوس کہ مرزا کے پاؤں پر ایک زخم کاری آ گیا اور آپ شکست کھا گئے۔ اُس وقت نہایت مایوسی کے عالم میں بے ساختہ پکار اُٹھے:

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے، مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

آپ کا ہتھیار ڈالنا تھا کہ حریف نے آپ کو گرفتار کر لیا اور پا بجولاں اپنے قلعہ کی طرف لے

رنگِ ادب دہلی نمبر

ہری چند اختر/ بشیر منذر ...... غالب اپنے کلام کے آئینے میں ۔

گیا۔ تماشائیوں کا ایک بہت بڑا مجمع ساتھ ہولیا، کیوں کہ یہ بات زبان زدِ خاص و عام ہو چکی تھی کہ مرزا غالب کے وہاں خوب پُرزے اُڑیں گے اور عین مجمع میں آپ کی رُسوائی ہوگی۔ مگر وہاں کچھ بھی نہ ہوا اور تماشائی بے نیل مرام یہ کہتے ہوئے واپس لوٹ آئے:

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

موثق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حریف نے آپ کو جیل میں قید کر دیا۔ مگر قید کا عرصہ معلوم نہیں ہوسکا، البتہ جو ظلم آپ سے روا رکھے گئے، اُن کے متعلق آپ نے ہلکا سا اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

یعنی کم بخت حریف نے آپ کے پاؤں کے نیچے آگ تک رکھنے سے دریغ نہیں کیا۔ اس قید سے آپ کو کئی بار ضمانت پر رہا کیا گیا، مگر آپ کا دل ہر بار 'فراغ' سے دیرینہ دشمنی کی بنا پر کوئی شرارت کر دیتا اور مع دل و دماغ دھر لیے جاتے۔ جیسا کہ آپ فرماتے ہیں:

سو بار بندِ قید سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

خیال کیا جاتا ہے کہ آخری وقت فراغ سے صلح ہوگئی ہوگی۔

مختصر حالات: اب مرزا کے مختصر سوانح حیات سنیے۔ بخوفِ طوالت صرف چند واقعات کے بیان پر ہی اکتفا کروں گا، جو عام محققوں اور تذکرہ نویسوں کی نظر سے اوجھل رہے۔ مرزا کی زندگی اگرچہ عسرت میں گزری تھی، لیکن اس کے لیے اللہ میاں ذمہ دار نہ تھے۔ خود مرزا کو اقرار ہے کہ خدا نے اُنہیں دونوں جہان دے دیے تھے۔ سنیے:

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ دونوں جہان گئے کہاں؟ جواب مرزا کے اس شعر میں موجود ہے:

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

پس دونوں جہان بھی گھر کے ساتھ ہی لٹا دیے ہوں گے۔

ہری چند اختر / بشیر منذر ...... غالب اپنے کلام کے آئینے میں

غالب کا گھر نہ صرف ویران تھا، بلکہ اس میں ویرانی سی ویرانی تھی۔ چنانچہ:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

لیکن یہ گھر وسیع نہ تھا اور مرزا کو ورزش کے لیے یا شاید گیند بلاّ کھیلنے کے لیے، بہت کھلی جگہ کی ضرورت تھی اس لیے جنگل میں جارہے تھے۔ فرماتے ہیں:

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

جنگلوں کی زندگی مرزا کو بہت عزیز تھی اور انہوں نے اپنے گھر کو طاق نسیاں پر رکھ کر قفل لگا دیا تھا، مرزا کے پاؤں میں چکر تھا وہ کسی جگہ بیٹھ نہیں سکتے تھے، جب چلتے چلتے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے تو اُس وقت انہیں جھاڑ جھنکاڑ کی تلاش ہوتی تھی۔ کانٹوں کو دیکھ کر آپ کا دل مسرّت وشادمانی کے جھولے میں جھولنے لگتا تھا۔ کہتے ہیں:

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

مرزا بڑے سادہ لوح اور صاف دل انسان تھے۔ اکثر ایسی حرکتیں کر بیٹھتے، جن کا نتیجہ ان کے حق میں بہت بُرا ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک دن محبوب کی گلی میں بیٹھے بیٹھے کسی ذرا سی غلطی پر پاسبان سے اپنی چندیا گنجی کرالی۔ اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

ایک مرتبہ خود محبوب کے ہاتھوں سے بھی پٹے، مگر چوں کہ قصور اپنا تھا اس لیے نہایت ایمانداری سے اعتراف بھی کرلیا کہ:

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

اس سادہ لوحی کی بدولت ایک دن محبوب کی حد سے زیادہ تعریف کر کے ایک رازدار کو رقیب بنالیا، ثبوت ملاحظہ ہو:

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

لیکن دیوانہ بکار خویش ہشیار کبھی کبھی رقیب کو جُل بھی دے جاتے:

تا کرے نہ غمازی کرلیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

رنگینیٔ ادب پبلی کیشنز

۔ کی چند اختر/ بشیر منذر ...... غالب اپنے کلام کے آئینے میں

مرزا نجوم اور جوتش کے نہ صرف قائل تھے، بلکہ محبت کے معاملوں میں بھی جوتشیوں سے پوچھ گچھ کرتے رہتے تھے۔ اسی لیے کہا ہے:

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

غالبؔ کا دل عام لوگوں کی طرح خون کا قطرہ یا گوشت کا لوتھڑا نہ تھا، بلکہ آفت کا ایک بڑا سا ٹکڑا تھا۔ اس میں کئی جگہ ٹیڑھ میڑھ تھے اور وہ ہر وقت شور و غل مچائے رکھتا تھا۔ مرزا بھی اس کی آوارگی کے ہمیشہ شاکی رہتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے:

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

مرزا کبھی کبھی اپنے اس دل سے کام بھی لے لیا کرتے تھے۔ مثلاً، ایک دفعہ محبوب کی تمنا کہیں آپ کے ہتھے چڑھ گئی آپ نے جی بھر کے انتقام لیے اور دل کے شور و غل کے ذریعے اس بے چاری کے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ رات دن دل میں چکر کاٹتی، مگر باہر نکلنے کا رستہ نہیں ملتا۔ آخر ایک دن خود اس پر ترس کھا کر محبوب سے درخواست کی ہے:

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

لیکن خدا کے فضل و کرم سے مرزا کو جلد ہی اس سے رہائی مل گئی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے سوزِ نہاں کا دورہ ہوا اور سارے کا سارا دل بے محابا جل گیا۔ اس حادثۂ فاجعہ کا ذکر مرزا نے یوں کیا ہے:

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

بدقسمتی سے مرزا کے ناخن بہت جلد جلد بڑھتے تھے۔ چنانچہ دل کا زخم ابھی بھرنے بھی نہ پاتا تھا کہ ناخنوں کے کھرپے پھر تیز ہو جایا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں:

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

غالبؔ کا زمانہ: غالبؔ کے زمانے میں دلّی میں غمِ اُلفت کا قحط پڑ گیا تھا۔ فرماتے ہیں:

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

افسوس کہ سارے دیوان میں یہ کہیں وضاحت نہیں کی گئی کہ غمِ اُلفت بادشاہ کے توشہ خانہ میں موجود تھا یا وہاں بھی جھاڑو پھر گئی تھی۔ نیز یہ کہ راشن کی دکانوں پر کس بھاؤ بکتا تھا۔ البتہ یہ

انور احمد علوی

صاف ظاہر ہے کہ مرزا کی خوراک غمِ اُلفت تھی یا کم اَز کم غمِ اُلفت ان کی خوراک کا جزوِ اعظم تھا۔

لیکن اِس قحط سالی میں بعض چیزوں کی ارزانی بھی تھی، مثلاً، دل اور جان بازار میں بکا کرتے تھے اور ہر شخص جب اور جتنے چاہے خرید سکتا تھا۔ مرزا کو اعتراف ہے:

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

غالبؔ کے زمانے میں پورے سات آسمان تھے۔ آج کل نو آسمان بتائے جاتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ باقی دو آسمان 1857ء کے بعد انگریزی عہد میں ولایت سے بن کر آئے مرزا کے زمانے کے ساتھ آسمان ایک لحظہ بھی سکون و قیام کی لذت سے آشنا ہوتے، بلکہ رات دن گھومتے رہتے تھے۔ مرزا لکھتے ہیں:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اس زمانے کی ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ تھی کہ کسی کو محبوب کا منہ معلوم نہ ہو سکے تو اس کی ہیچمدانی کھل جاتی تھی۔ ایک مرتبہ مرزا پر بھی یہ کیفیت گزر گئی۔ اعتراف فرماتے ہیں:

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچمدانی میری

مرزا غالبؔ خوب صورت مجنوں کے مقابلے میں تو تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے، مگر کچھ زیادہ خوب صورت نہ تھے، یعنی قضا و قدر کی طرف سے انہیں حسن کا کوئی وافر حصہ نہیں ملا تھا۔ اس کا احساس خود انہیں بھی تھا اپنی صورت اور حسینوں کی چاہت کے بارے میں فرماتے ہیں:

چاہتے ہیں خوبرویوں تو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

لیکن کسی مصلحت کے تحت ایک عدد محبوب کے عاشق بن بیٹھے تھے۔ مرزا کا محبوب بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا۔ اس کا نام سارے جہان کو معلوم تھا، لیکن کسی ملک، کسی شہر اور کسی تھانے میں کوئی شخص اس کا نام ستمگر کہے بغیر نہ لیتا تھا:

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

اس محبوب کے عادات و خصائل بھی عجیب تھے۔ مثلاً، گالیاں بہت دیتا تھا۔ مرزا پوچھتے ہیں:

واں گیا میں بھی تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

رنگِ ادب، دہلی کینٹ

ہری چند اختر/ بشیر منذر ...... غالب اپنے کلام کے آئینے میں

اسی طرح اگر مرزا کبھی شکوہ شکایت کریں تو وہ فوراً اُٹھ کر بھاگتا اور بلیماران سے باڑہ ہندو راؤ تک مرزا کے جتنے رقیب ہوتے ان سب کو جمع کر لیتا۔ مرزا جھنجھلا کر کہتے ہیں:

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اِک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

جب کبھی وہ رقیب کی بغل میں سوتا تو مرزا کے خواب میں آ کر پنہاں تبسّم کیا کرتا۔ اسی لیے کہا ہے:

بغل میں غیر کی آپ آج سوئے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

یہ معشوق تخت کرسی مونڈھے یا چارپائی پر بیٹھنا پسند نہ کرتا تھا، ہمیشہ بوریے پر بیٹھتا اور اگر بوریا نہ ملے تو کھڑے کھڑے چل دیتا۔ مرزا رو رہے ہیں کہ:

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

یوں بھی وہ اچھا خاصا احمق تھا۔ عشق و محبت کے سیدھے سادے معاملات بھی نہ سمجھ سکتا تھا۔ مرزا شاکی ہیں کہ:

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

آخر میں وہ بے طلب بوسے بھی دینے لگا تھا۔ مرزا کی بدگمانی بھری شہادت حاضر ہے:

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کیے

معشوق کی صحت اچھی نہ تھی اکثر رعشہ وغیرہ کا شاکی رہتا تھا۔ ایک دن بڑی منتوں کے بعد مرزا کے قتل پر راضی ہوا نوکِ شمشیر سے دو چار کچوکے دینے کے بعد کاری زخم لگانے کے لیے ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ فالج گرا اور بھلا چنگا ہاتھ پیر تسمہ پا کی ٹانگ بن کر لٹکنے لگا۔ مرزا کی رنج و غم کے مارے چیخ نکل گئی:

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

لیکن کچھ عرصے کے بعد فالج کا اثر ختم ہو گیا اور ہاتھ پہلے کی طرح کام کرنے لگا۔

اس کے مذہب کے متعلق صرف یہ پتا چلا ہے کہ غیر مسلم تھا۔ جبھی تو کہا ہے کہ:

دل دیا جان کے کیوں اُس کو وفادار اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

بین الاقوامی شہرت کے باوجود شروع شروع میں اُس کا گھر گھاٹ کہیں نہیں تھا، بلکہ ایک خیمہ میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔ مرزا فرماتے ہیں:

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

لیکن بعد میں اسے کوئی مکان الاٹ کر دیا گیا تھا، جس میں سنگ در و دیوار تھے اور ایک پاسبان بھی۔

مرزا کی بڑی خواہش تھی کہ آپ کو بھی محبوب کے دروازے پر تھوڑی بہت جگہ مل جائے۔ چنانچہ ایک دن باتوں ہی باتوں میں نہایت مایوسی کے عالم میں محبوب سے کہا:

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

محبوب نے کمالِ نوازش سے آپ کو دروازے پر رہنے کی اجازت دے دی، لیکن اس کے بعد فوراً ہی جب کہ آپ اپنا بستر کھول رہے تھے صاف انکار کر دیا اور اپنی زبان واپس لے لی۔ ہوسکتا ہے کہ مرزا نے کوئی چبھتی ہوئی شرارت کر دی ہو۔ اس قصہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

لیکن مرزا ایسے نہ تھے کہ اُٹھ جاتے آپ دھرنا دے کر بیٹھ گئے اور تماشائیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

اس فتنہ خو کے در سے تو اُٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پر قیامت ہی کیوں نہ ہو

اس پر محبوب نے ظلم و تشدّد میں اضافہ کر دیا اور نئے طریقوں سے درپے آزار ہو گیا۔ یہاں تک کہ آپ کی قوتِ برداشت نے جواب دے دیا۔ اپنا بستر لپیٹا اور محبوب کے راستے پر ڈیرا جما دیا، مگر وہاں بھی اس ظالم نے پیچھا نہ چھوڑا اور اُٹھ جانے پر مصر ہوا۔ چوں کہ معاملہ اب نازک صورت اختیار کر گیا تھا، لہٰذا آپ محلّہ کی پنچایت کی طرف رجوع ہوئے اور بڑی انکساری کے ساتھ پوچھا:

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں

قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ پنچایت نے نہایت ستم ظریفی سے کام لیا اور اِس معاملے میں آپ کے محبوب کی طرفداری کی۔ اس طرح آپ کو وہاں سے بسترا گول کرتے ہی بنی۔ روتے دھوتے اُٹھے اور سنگ دل محبوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

اس کے بعد آپ گھر لوٹ آئے، مگر گھر میں بھلا جی کب لگتا اور اس پر طرہ یہ کہ ہمسایوں نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ واقعہ دراصل یہ ہے کہ اکیلے آدمی کو کوئی شریف اپنے ہمسایہ میں بھی نہیں رہنے دیتا۔ بڑی ٹوہ لگائی گئی، مگر یہ پتا نہ چل سکا کہ مرزا کا پری زاد بھی خلد میں حور بنا، یا نہ بنا؟

چند متفرق واقعات: مرزا کا ایک دربان تھا۔ جب مرزا کا گھر ویران ہو گیا تو اُس کے لیے کوئی کام نہ رہا، مگر تھا وفادار مرزا کا ساتھ نہ چھوڑا اور گھر میں سے گھاس کھود کھود کر گزر اوقات کرتا رہا۔ مرزا فرماتے ہیں:

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اَب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

غالبؔ نے کئی مرتبہ بہشت کی بھی سیر کی۔ ایک مرتبہ وہاں سے واپس آئے تو محبوب سے کہنے لگے:

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے وَلے اس قدر آباد نہیں

خواجہ خضر سے بھی مرزا کی اکثر ملاقاتیں ہوئیں۔ نصرت الملک کے قصیدے میں ارشاد ہوتا ہے:

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

لیکن دوسرے مصرعہ میں شرف کا لفظ محض دوستانہ مروّت کے بارے کہا ہے ورنہ دراصل وہ خضر کو رہنمائی کے قابل نہ سمجھتے تھے۔ ثبوت حاضر ہے:

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

مرزا بزدل بھی بہت تھے۔ ایک مرتبہ سڑک پر راہزن کا سامنا ہو گیا تو اسے دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگ نکلے، لیکن دوڑ دھوپ کے باوجود پکڑے گئے۔ اب ستم ظریف بٹ مارنے ڈانٹ کر کہا:

وہ کمبخت ہمیں اس قدر دوڑایا ہے لے اب ذرا پاؤں داب‘‘ اس واقعہ کو یوں نظم کیا ہے:

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

جب ان کی تھکاوٹ دُور ہو گئی تو انہوں نے مرزا سے کہا کہ ہمیں اپنے گھر لے کر چل۔ مرزا نے ایسا ہی کیا۔ وہاں پہنچ کر ان لوگوں نے مرزا کا سارا اثاثہ اُڑا لیا اور چمپت ہو گئے۔ مرزا ان کے اس برتاؤ سے بہت خوش ہوئے اور چادر میں منہ لپیٹ کر سو رہے۔ صبح بستر سے اُٹھتے ہی یہ شعر گنگنانے لگے:

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

مرزا اپنے رقیب کے دروازے پر ایک کم نہ ایک زیادہ پورے ہزار مرتبہ گئے۔ شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب بھی اتنی ہی بار وہاں گیا:

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

کچھ مدت مرزا کی عسرت نے یہ شدت اختیار کر رکھی تھی کہ بے چارے دلی کی گلیوں میں بالکل ننگ دھڑنگ پھرتے رہے۔ ایک دن اسی حالت میں بادشاہ بہادر شاہ کے دربار میں جا پہنچے اور بہادر شاہ ظفر سے شکوہ کیا:

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

اس پر بادشاہ نے آپ کو ایک بڑا سا کُرتا سلوا دیا، جس کا دامن اتنا بڑا تھا کہ اس کا ایک سرا دھونے میں ہی پورا دریا خشک ہو گیا۔ اس پر ارشاد ہوا:

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اس زمانہ میں دریائے جمنا کا نام دریائے معاصی تھا اور مرزا وہیں کپڑے دھونے جایا کرتے تھے۔

دریائے گنگا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پہلے یہ سورگ لوک میں، بہتا تھا اور سری رام چندر جی کے ایک بزرگ مہاراجہ بھاگیرتھ تپسیا کے زور سے اسے زمین پر لائے تھے۔ اب دریائے جمنا کے ظہور کا حال مرزا سے سن لیجیے کہتے ہیں کہ میری وحشت کے لیے عرصۂ آفاق بھی تنگ ہو گیا

تو زمین کو بڑی شرم آئی۔ حتیٰ کہ اس کی پیشانی پر بڑے زور کا پسینہ آ گیا۔ بس وہی دریا بن گیا:

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

مرزا کا محبوب کہیں کعبہ کے گرد و نواح میں سکونت پذیر تھا۔ چنانچہ جب کبھی مرزا کو درِ یار پر ڈانٹ ڈپٹ ہوئی تو وہ کعبے کی جانب چل دیتے۔ کہا ہے:

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

اس طرح آئے دن محبوب کے گھر اور کعبۃ اللہ جانے آنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں کعبہ دلّی سے بہت قریب تھا۔ بعد میں گرمی کی شدّت سے زمین پھیل گئی تو دہلی اور مکے کا درمیانی فاصلہ بھی بڑھ گیا یا پھر مرزا کو کوئی بہت سی تیز رفتار سواری مل گئی ہوگی۔

مجنوں عمر میں تو مرزا سے چھوٹا تھا ہی، مگر اس کا انتقال بھی مرزا کے سامنے ہی ہوا۔ مرزا مجنوں کے مرنے کے بعد کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

ہر اِک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

مرزا کی موت کا معاملہ ذرا پیچیدہ ہے۔ مختلف لوگوں نے ان کے اشعار سے مختلف مطالب اخذ کیے ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ آخر میں مرزا کے دوستوں نے انہیں مشورہ دیا کہ اب جینے سے کیا حاصل؟ بہتر یہی ہے کہ آپ مر جائیں اور اس دار المحن کے جھمیلوں سے نجات پائیں۔ لیکن مرزا نے اُلٹا ان کو بیوقوف بنایا اور فرمایا:

ناداں ہیں جو کہتے ہیں کہ کیوں جیتے ہو غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

مگر نہ جانے ایک دن کیا سر میں سمائی کہ خود بخود اس کارِ خیر کے لیے کمر بستہ ہو گئے اور باوجود مفلسی کے ایک تلوار اور کفن بھی خرید لیا۔ کفن کو سر پر باندھ لیا اور تلوار بغل میں لٹکائی اور دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہوئے فرمانے لگے:

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اَب لائیں گے کیا

اس مجاہدانہ شان سے جب محبوب کی بارگاہ میں داخل ہوئے اور اپنی عرضداشت پیش کی تو وہ بہت برہم ہوا۔ پیچ و تاب کھا کر تالی بجائی فوراً مسلح سپاہی حاضر ہو گئے حکم ہوا نکال دو اسے کہیں اور

ہری چند اختر / بشیر منذر ...... غالب اپنے کلام کے آئینے میں
رنگِ ادب پبلی کیشنز

جا کر قسمت آزمائی کرے، کیوں کہ ہم نے آج کل تلوار اُٹھانا چھوڑا ہوا ہے (شاید محرم کا مہینہ ہوگا) مسلح سپاہی مرزا پر پل پڑے اور دھکے دے دے کر دربار بدر کر دیا۔ آپ محبوب کی طرف مخاطب ہوئے اور دونوں ہاتھ باندھ کر گڑگڑانے لگے:

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزمانہ ہوا

مگر وہ ایسا سنگ دل انسان واقع ہوا تھا کہ مرزا کی ایک نہ سنی۔ آپ کے لیے یہ کوئی کم صدمہ نہیں تھا۔ سوچا سارے شہر میں دُھوم مچی ہوئی ہے کہ مرزا غالبؔ آج محبوب کے ہاتھوں قتل ہونے کو گئے ہیں۔ واپس جا کر انہیں کیا منہ دکھاؤں گا۔ چنانچہ محبوب کی محل سرا کی دیواروں کے ساتھ (جہاں آپ پہلے بھی اکثر آ بیٹھتے تھے) ٹکریں مارنا شروع کر دیں اور اسی طرح اپنی جان شیریں جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ غلط ہے، کیوں کہ مرزا بے چارے کی موت تو غریب الوطنی کی حالت میں ہوئی تھی۔ انہوں نے خود کہا ہے:

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

مرضِ موت کے بارے میں خیال ہے کہ آخر عمر میں وحشت کے دورے پڑنے لگے تھے اور اسی حالت میں ایک دن سر پھوڑ پھوڑ کر مر گئے۔ مرتے ہی یہ ارشاد ہوا:

مر گیا پھوڑ کے سر غالبؔ وحشی ہے ہے
بیٹھنا آ کے وہ اس کا تری دیوار کے پاس

مرزا کی رُوح کے پرواز کرنے سے پہلے ہی ان کے رقیبوں نے جا کر معشوق سے کہہ دیا کہ مرزا جاں کنی کے عالم میں ہیں۔ اس کو جب یہ حال معلوم ہوا تو مروّت نے جوش مارا اور وہ دوڑا ہوا مرزا کے پاس آیا۔ لیکن اس غریب میں ایک نظر دیکھنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ یہ شعر پڑھا اور ہمیشہ کی نیند سو گئے:

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
خوب وقت آئے تم اِس عاشق بیمار کے پاس

انا للہ وانا الیہ راجعون!

یہ خبر آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی لوگ بازاروں اور گلیوں میں ایک دوسرے سے

کہتے جاتے تھے:

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رند شاہد باز

یہ 'رند شاہد باز' ہونے ہی کی وجہ تھی کہ نعش کئی گھنٹے تک بے گور و کفن پڑی رہی۔ کسی نے تجہیز و تکفین کا انتظام نہ کیا۔ آخر آپ کے محبوب کو ترس آ گیا اور وہ پوری تمکنت سے اُٹھا اور نعش کے پاس کھڑے ہو کر کہا:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا
یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے

کفن دفن کا انتظام کر کے جب مرزا کو کفنایا گیا تو آپ جھٹ بول اُٹھے:

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

محبوب نے اپنی گلی کے عین درمیان آپ کی قبر کھدوانا شروع کر دی، لیکن آپ بھی کوئی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں تھے۔ جھٹ باوازِ بلند اس نامعقول حرکت پر پُر زور احتجاج کرتے ہوئے فرمانے لگے:

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعد مرگ
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

محبوب بہت سٹپٹایا اور اسے خدا جھوٹ نہ بلوائے مرزا پر غصہ آ گیا۔ کہنے لگا عجیب قسم کا آدمی ہے زندگی میں بھی آرام کا سانس نہیں لینے دیا اور اَب مرنے پر بھی اس کے وہی طور اطوار ہیں، لیکن چوں کہ مرزا صاحب مرنے کے بعد وصیت فرما گئے تھے۔ اس لیے ان کی بات کو رد کرنا مناسب نہ سمجھا اور قبرستان میں لے جا کر دفنا دیا۔

مرزا کے بعد شہر والوں کی عجیب حالت تھی۔ وہ آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے اور سر دیواروں سے پٹختے تھے۔ ہائے ہائے کی صداؤں سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ مگر یکا یک ان میں کچھ ایسی تبدیلی ہوئی کہ وہ سب کے سب کہنے لگے:

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

مگر خدا لگتی تو یہ ہے کہ مرزا غالب کو یہ لوگ ہزاروں کوشش کے بعد بھی نہ بھول سکے اور آپ کی ہنسنے ہنسانے والی باتیں انہیں اکثر یاد آتیں۔ اس وقت وہ بول اُٹھے:

انور احمد علوی

ہوئی مدت کہ غالبؔ مرگیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

مرزا نے مرنے کے بعد بھی بہت سے شعر کہے اور کسی نہ کسی طرح اپنے شاگردوں کو پہنچاتے رہے، جو انہوں نے دیوان میں شامل کر لیے:

''حسن غمزے کی کشاکش سے چُھٹا میرے بعد!''

یہ ساری غزل مرنے کے بعد لکھی گئی۔ اس سے قبل کے دو شعر اور حاضر ہیں:

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

مرزا غالبؔ کے کلام پر سیکڑوں، بلکہ ہزاروں تبصرے ہو چکے ہیں، مگر یہ بات آج تک کسی کے ذہن میں نہیں آئی کہ مرزا کے کلام میں گرمی بہت ہے اور یہ گرمی آپ اس لیے پیدا کرتے تھے کہ جو شخص آپ کے شعر پر انگلی رکھے فوراً شعر کی حدت سے انگلی جل جائے اور دوبارہ اُسے جرأت نہ ہو سکے۔ چنانچہ خود ارشاد فرمایا ہے:

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

آپ کے کلام کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مزا بہت ہے اور یہ مزا اس لیے پیدا ہو گیا تھا کہ آپ ایک 'خسرو شیریں سخن' نامی شخص کے پاؤں کی میل دھو دھو کر پیا کرتے تھے، جس کا انہیں خود اعتراف ہے۔ فرماتے ہیں:

غالبؔ مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو؟
پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پاؤں

✡ ✡

ہم نے مشاعرے کی صدارت کی!

یوسف مرزا

بات ہی ایسی ہے، ہمیں خود یقین نہیں آتا کہ ہم کسی مشاعرے کی صدارت کر سکتے ہیں، یا کسی مشاعرے کے منتظمین کی نگاہ نامزدگی ہم پر بھی پڑ سکتی ہے۔ مگر ایک بار تو ایسا ہو گیا تھا، یہ کیسے ہوا؟ ہم اس کا جواب ڈھونڈ رہے ہیں، ہو سکے تو آپ بھی ہماری مدد کر دیں۔

مشاعرے کا اعلان پڑھا تو ہمارے پاؤں تلے زمین سرکنے لگی، اعلان میں صدر مشاعرہ کے طور پر ہمارا نام دیا ہوا تھا۔ پہلے تو ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا، چشمہ اُتار کر پڑھا، آنکھیں مَل مَل کر دیکھا، دوبارہ چشمہ لگایا، آنکھیں چندھیا کر دیکھا، نام تو ہمارا ہی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اور ہمارا ہم نام ہو، ہماری حیثیتِ عرفی سے فائدہ اُٹھا کر ہمارا کوئی رقیب خود صدارت کرنا چاہتا ہو، ایسی جعلسازیاں تو آج کل عام ہیں۔ ہم نے کئی مشاعراتی شاعروں کو دوسرے معروف یا گمنام، زندہ، یا مردہ شاعروں کا کلام اپنے نام سے سناتے سنا ہے، بلکہ 'چور' شاعر کو چوری کے الزام سے بچانے کے لیے ایسے کلام کو 'توارد' کا نام دے دیتے ہیں۔ اس طرح ہاتھ کی صفائی کو فنی اور رسمی تحفظ فراہم کر دیا جاتا ہے۔

نام ہمارا ہی تھا اور منتظمین نے بقائے باہمی ہوش و حواسِ ستہ ہمیں نامزد کیا تھا۔ ہماری علمی و اَدبی اور معاشرتی تنظیموں میں ہر کام نامزدگی سے ہی چلتا ہے۔ انتخاب نہیں ہوا کرتے کیوں کہ انتخابات برپا کرنے کے لیے ارکان کی کم اَز کم تعداد تین ہونا چاہیے اور یہ تعداد میسر آنا آسان نہیں ہوتا، اس لیے نامزدگی کے بَل پر ہینگ پھٹکری لگائے بغیر چوکھا رنگ نکال لیتے ہیں۔ آج کل تو بڑی بڑی سیاسی جماعتوں نے بھی یہی طریقہ کار اپنا رکھا ہے۔ ایک بار جو جس عہدے پر چپک گیا۔ وہاں سے اسے غسال اور کفن دوز ہی ہلا سکتے ہیں۔ لیکن ہمارا سوال تو اَب بھی جواب طلب ہے، آخر ہمیں صدر کیوں بنایا جا رہا ہے؟ ہم تو تین میں نہ تیرہ میں، ہمارا کوئی بھائی بھتیجا، سالا، یا

بہنوئی ایوانِ اقتدار کے کسی بالا خانے پر براجمان نہیں، جو ہمارے ذریعہ دوسروں کے لیے قاضی الحاجات بن جائیں۔ ہم نے کبھی 'من تراحاجی بگویم' کی پالیسی بھی نہیں اپنائی، جو ہمارے احسان کا بدلہ چکانے کے لیے کسی نے 'تو مراحاجی بگو' کا مظاہرہ کیا ہو۔ ایسا بھی نہیں کہ جہانِ شعر وسخن میں ہمارا طوطی بول رہا ہو اور ہماری تشریف فرمائی سے مسندِ صدارت کو چار چاند لگ جائیں۔ ہماری مشقِ سخن کے متاثرین میں صرف ہمارے گھر والے ہیں، وہ بھی مثبت نہیں، منفی انداز میں۔ انہیں ہمیشہ ہم سے شکایت رہی ہے کہ وقتِ قیام آتا ہے تو ہم سجدے میں گر جاتے ہیں، جب انہیں ہماری ضرورت ہوتی ہے تو ہم اپنی مطالعہ گاہ میں بیٹھے سر کھپا رہے ہوتے ہیں۔ اور جب تک ہم فارغ ہوتے ہیں، انہیں ہماری ضرورت نہیں رہتی، اس طرح ہم خود ہی اپنی رسوائی کا تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا حلیہ ہی ایسا ہوتا ہے، جیسے اللہ نے انہیں پیدا ہی مشاعروں کی صدارت کے لیے کیا تھا۔ وہ بیگم کی جوتی گنٹھوانے بھی جا رہے ہوں تو لگتا ہے کہ مشاعرے کی صدارت فرمانے جا رہے ہیں۔

مشاعروں اور دوسری تقریبات میں، وہ جہاں بھی بیٹھ جائیں صدر ہی لگتے ہیں، ویسے وہ ایسی محفلوں میں شاذ ہی شریک ہوتے ہیں، جہاں ان کی بجائے کوئی اور صدر بنایا جانے والا ہو۔ لیکن ہماری چال ڈھال اور نشست و برخاست میں بھی ایسی کوئی بات نہیں جو ہمیں صدارت کی اہلیت سے ہم آغوش کر سکتی ہو۔ ہم ایسے حاتم طائی بھی نہیں کہ اپنی صدارت کا شوق پورا کرنے کی خاطر شعرا اور اُن کے حاشیہ برداروں کی فوج ظفر موج کے لیے آئے دن لذتِ کام و دہن کا اہتمام کرتے پھریں اور اپنے گھر والوں کے ساتھ بوجوہ کشیدہ رہنے والے تعلقات کو کشیدہ تر کرتے رہیں۔ پھر ہُمائے صدارت کا سایہ اس کی بیٹ سمیت ہمارے فرقدان کی زینت کیسے بن گیا؟ اس سوال کا جواب ابھی کوسوں دُور تھا کہ 'یوم موعود' سر پر آن پہنچا۔

جب تک ہم دولہا نہیں بنے تھے، ہم نے دوسروں کی خوش نظری اور حسنِ ذوق کو رہنما بنایا تھا۔ اب جب کہ ہم اس ارمان انگیز تجربہ سے فاتحانہ گزر چکے تھے، اگر ہم سے دولہا بننے کو کہا جاتا تو ہمارے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا۔ اب تو اِس کھیل کا ہر مرحلہ ہمیں ازبر تھا، کہاں قہقہہ سے اجتناب کرنا ہے اور صرف تبسمِ پنہاں سے کام لینا ہے۔ کس کے آگے سر جھکانا ہے، کہاں نگاہیں نیچی رکھنا ہے اور کسے جی بھر کر دیکھنا ہے، کس کس موقع پر آنکھیں ملانا یا چُرانا ہے۔ کن لوگوں سے

دامن بچانا ہے اور کہاں گریبان کی دھجیاں حاضرات میں بانٹ دینا ہے۔ کس کے دیے ہوئے روپے شیرِ مادر کی طرح ہضم کرنا ہیں اور کس کو لوٹا دینا ہیں، کہاں شرافت کا پتلا بن کر بیٹھنا ہے اور کس جگہ ناز یا حرکتوں کا لائسنس استعمال کرنا ہے۔ آج اگر ہمیں موقع دیا جائے تو ہم پچھلی بار کی نسبت، بہت ہی بہتر دولہا ثابت ہو سکتے ہیں، لیکن مشاعرے کی صدارت کا ہمیں قطعاً کوئی تجربہ نہ تھا۔

ہم نے مختلف قد و قامت، ممتاز شہرت و مرتبہ اور فراواں قدر و قیمت کے صدر کو صدارت کرتے ہوئے بہت دُور سے دیکھا تھا۔ ان کی بول چال اور حرکات و سکنات سے سوائے تکلف اور تصنع کے کچھ اور جھلکتا نظر نہیں آیا۔ اگر ہم کبھی صدارت کے جلو میں بیٹھنے کا شرف حاصل کر پاتے تو صدر نشین کی اور بہت سی چیزیں جھلکتی نظر آ سکتی تھیں، جن کے اظہار یا اخفا کا سنہری موقع آج میسر آ رہا تھا۔ لیکن اس کم نصیبی کا کیا علاج کہ نشست گاہ کی اگلی قطاریں جن زمینی مردوں اور آسمانی عورتوں کے لیے مخصوص ہوتی ہیں، ان میں ہمارے نام کا شامل ہونا نظامِ کائنات کے درہم برہم ہونے کے مترادف تھا۔ ویسے ہمارے خیال میں مشاعروں کے صدر ماں کے پیٹ سے تو اس طرح پیدا نہیں ہوتے کہ کسی کرسیِ صدارت ان کی دُم سے بندھی ہوئی ہو۔ اس وقت ہماری طرح ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوتے ہوں گے۔ یہ تمیز اور تفریق تو بعد کی باتیں ہیں، جو ہمارے ساتھ ہونے سے رہ گئی ہیں اور اُن کے ساتھ ہوتی چلی جا رہی ہیں اور ''خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔''

مگر صدارتی نزاکت کے پھولوں کا رنگ و بو اپنا ہوتا ہے۔ صدارت کے انداز ہر صدر نے محنت شاقہ سے خود ایجاد کیے ہوئے ہوتے ہیں، جنہیں وہ تقریب کے شروع سے آخر تک قائم رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی ذرا سی کوتاہی، غفلت یا بھول چوک اس کے میزبانوں کو کبیدہ خاطر کر سکتی ہے اور اِس کا اثر آنے والی تقریبات میں صدارتی نامزدگی پر پڑ سکتا ہے۔ اس لیے وہ بہروپ کو ہر حال میں فعال اور مؤثر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر صاحبِ صدارت کوئی نامور شاعر ہے (اور ہر شاعر نامور ہی ہوتا ہے) تو اُس کے جلوس فرمانے اور داد دینے کا انداز جداگانہ ہوگا۔ سماجی کارکن اور سیاسی رہنما اپنے منفرد ڈھنگ سے پہچانے جا سکتے ہیں، یہاں تک کہ قیادت کی مقامی یا قومی سطح بھی ان کے رویّے کی ساخت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سرکاری افسر کا اپنا رنگ

روپ ہوتا ہے۔ چھوٹے اور بڑے افسر میں بھی نمایاں فرق دیکھا گیا ہے، حالاں کہ افسر تو افسر ہے، چھوٹا ہو یا بڑا۔ کوئی افسر جتنی دیر مسندِ صدارت کو زینت بخشتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے کانٹوں پر بٹھا دیا گیا ہو۔ پہلو پہ پہلو بدلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ محفل شباب پر آ جائے۔ بس یہی سرکاری افسر کے رخصت ہونے کا وقت ہوتا ہے، کیوں کہ اسی شام یا رات کو اُسے سرکاری کام سے کسی دوسری جگہ بھی پہنچنا ہوتا ہے۔ مشاعرے کے منتظمین سراپا سپاس بن کر اُسے رخصت کرتے ہیں اور مہمان سامعین سے ان کی محرومی، اپنی نارسائی اور افسر کی مجبوری پر معذرت پیش کرتے ہیں۔

صدر نشین کا تعارف کراتے ہوئے منتظمین کا نمائندہ، یا ناظم مشاعرہ بڑے گنے چنے محتاط اور جامع الفاظ کا انتخاب کرتا ہے، آسمان شعر و اَدب کا شہابیہ ہو تو اُسے چودھویں کا چاند یا سردیوں کا سورج ثابت کیا جاتا ہے۔ سیاسی رہنما یا سماجی شخصیت ہو تو اُس کی ایسی عوامی خدمات کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے، جن کا علم شاید اُس کے فرشتوں تک کو نہیں ہوتا۔ سرکاری افسر کا نام ہی جادو اثر ہوتا ہے، اس کی رحم دلی اور فرض شناسی پر ایک آدھ قصیدہ سونے پر سہاگہ سمجھ لیں، ورنہ ہر سرکاری افسر اپنی مخصوص چال ڈھال اور منفرد وضع سے بھیڑوں میں اونٹ کی طرح نمایاں ہوتا ہے۔ سامراجی قوتیں ہمارے ملکوں سے رخصت ہوتے وقت افسر شاہی کا ایک مستقل بالذات ادارہ قائم کر گئیں۔ اس ادارے کے ارکان آج تک ان قوتوں کی غلامی کا دَم بھرتے ہیں۔ وہ کھاتے ہمارا ہیں اور گن ان کے گاتے ہیں۔ ان کا رنگ ہماری طرح گندمی یا مشکی ہوتا ہے، مگر اُن کی رگوں میں دوڑنے والا خون سفید فام آقاؤں کے خون کی کیمیاوی ہیئت کے اجزائے ترکیبی سے مالا مال ہوتا ہے۔ وہی ثقافتی اقدار، وہی نفسیاتی رویّہ، وہی طبقاتی تفاوت، وہی اندازِ فکر اور وہی طرزِ زندگی، وہ شاہین، ہم کرگس اور ’’شاہیں کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور۔‘‘

کہتے ہیں، طوطے کو بولنا سکھانے کے لیے اس کے سامنے آئینہ رکھ دیتے ہیں اور خود آئینہ کے عقب میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ طوطے کو صرف اپنے جیسا طوطا سامنے نظر آتا ہے، مگر اُسے سبق پڑھانے والا کوئی اور ہوتا ہے۔ بس ہمارے ملکوں اور معاشروں کا یہی المیہ ہے، عکس کی حد تک تو ہمارے افسر ہم جیسے لگتے ہیں، مگر باقی سب کچھ... انہیں ہماری تہذیب کی مظہر تقریبات سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ وہ کچھ دیر کے لیے مسند پر جلوہ افروز ہوتے ہیں، ہم پر احسان کرتے اور اپنی شبینہ عشرت گاہوں کی آغوش گرمانے کے لیے سرکاری مصروفیت کا بہانہ بنا کر ہماری آنکھوں

یوسف مرزا ...... ہم نے مشاعرے کی صدارت کی

میں ڈھول جھونک جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ہماری افسر شاہی کا ایک آدھ رکن شاعر یا ادیب نکل پڑتا ہے، اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ تقریب کے شروع میں آجائے اور آخر تک بندھا رہے، اس لیے مشاعرہ گاہ کی اسٹیج سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہ نوید جانفزا نشر ہوتی رہتی ہے کہ فلاں افسر اپنی دوسری مصروفیات سمیٹ کر ہماری عزت افزائی کے لیے تشریف لانے والے ہیں، یہاں تک کہ تقریب اپنے آخری مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ اب وہ بادِ نسیم کا جھونکا بن کر حاضرین کے سر آنکھوں پر وارد بزم ہوتے ہیں اور اپنا کلام بلاغت نظام مرحمت فرما کر فرشی سلاموں کو روندتے ہوئے واپس چلے جاتے ہیں۔

ادبی اور شعری تقریبات کے کرتا دھرتا بہت ہی ''سرگشتۂ خمار رسوم و قیود'' ہوتے ہیں۔ جزئیات تک کا خیال رکھتے ہیں۔ اسی لیے دو اہم مسئلے ہمیں پریشان کیے ہوئے تھے کہ آج شام ہم کیسا لباس زیب تن کریں گے اور خطبہ صدارت کے بنیادی نکات کیا ہونے چاہییں؟ اگر یہ سانحہ چار پانچ سال پہلے ہم پر گزرتا تو لباس کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہوتا، کیوں کہ ہمارے ملبوسات کی عیب پوشی کے لیے ہمارے پاس دو تین شیروانیاں موجود تھیں، جو گاہے گاہے کسی بارات کے ساتھ جانے یا ختم درود کی مجلسوں میں شرکت کے لیے استعمال ہوتی رہی تھیں۔ شعری اور ادبی محفلوں میں ان کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی، کیوں کہ ہم باہر جانے والے راستے کے قریب بیٹھا کرتے اور جب جی چاہتا اٹھ کر آ جاتے۔ اتنے بڑے مجمع میں ہماری کمی کسے محسوس ہوتی۔ ہر شاعر کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے مشاعرے کے آخر میں دعوت کلام دی جائے۔ اس کے خیال میں اس طرح [illegible] میں اس کی عظمت کے جھنڈے گڑ جاتے ہیں۔ اگر اسے پہلے پڑھوا دیا جائے تو [illegible] اس کے جھنڈے اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ [illegible] کر جاتے ہیں۔ [illegible] کیا جاتا [illegible]

[illegible]

تھے۔ اقبال نے ایسے ہی کسی موقع پر برافروختہ ہو کر شکم کی آزادی کو سامانِ موت قرار دے ڈالا تھا، ہمارے شکم کی آزادروی پر شیروانی کی قدغن سامانِ موت سے کم نہ تھی۔ ہمارے گھر والے ہماری مدد کو آئے اور ہمیں تکلف کی تکلیف سے بچالیا۔ ہم ایک سادہ شلوار قمیض پر راضی ہو گئے، سج دھج اور نمود نمائش میں تو کئی مدِ مقابل ہو سکتے ہیں، سادگی میں ہم ہی ہم ہوں گے۔

اب صدارتی خطبہ کی صورت میں آنکھوں کی سوئیاں باقی تھیں، جو کسی بھی وقت نکل سکتی تھیں، اس لیے ہمارے ریش مآب چہرے پر اطمینان کی شفق پھول اُٹھی۔ ویسے بھی پیشگی تیار کیا ہوا خطبہ بے وقت کی راگنی بن سکتا ہے، اس کا انحصار سامعین کے ذوق، تقریب کے مجموعی تاثر اور مجلس ماحول پر ہوتا ہے۔ خالص مردانہ نشست کے تقاضے اور ہوتے ہیں، خواتین کے ساتھ مخلوط یا جداگانہ محفل کے لیے صدارتی کلمات کا آہنگ مختلف ہوگا۔ اس لیے ہم نے یہ کام آنے والے وقت پر چھوڑ دیا اور کیل کانٹے سے لیس مشاعرہ گاہ میں پہنچ گئے۔ دراصل یہ شہر کی ایک ادب نواز شخصیت کا محل نما دولت کدہ تھا، جہاں منتخب روزگار شعرا اور اہلِ ذوق مدعو تھے۔

لذتِ کام و دہن سے فارغ ہوتے ہی مشاعرے کی نوید سنائی گئی اور سب مہمانوں نے نشستیں سنبھال لیں۔ مہمانِ خصوصی ایک نامور اور صاحبِ دیوان شاعر تھے، جو مسند پر آتے ہی چارزانو بیٹھ گئے اور آخر تک اسی طرح بیٹھے رہے۔ ہمیں پکارا گیا تو ہم مصنوعی چال چلتے ہوئے مسند تک پہنچے اور جاتے ہی جیسے ڈھیر ہو گئے۔ مسند کا حدودِ اربعہ موٹے نرم گرم گدوں پر مشتمل تھا، جنہیں اوپر تلے رکھ کر غالیچوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ہم آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے، تیز روشنی کا سیلاب ہمارا جسم برماتا ہوا رُوح کو گھائل کرنے پر مائل تھا، تقریب فلمائی جا رہی تھی۔ ہماری ہر دیدنی و نادیدنی شے دوسروں کی نظر میں تھی، مگر ہمیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف داد بیداد کا شور سنائی دیتا تھا، ہم سخت اور بے لچک فرش پر چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور سونے جاگنے غرض ہر کام کرنے کے عادی ہیں، یا اللہ! آج ہمیں کس آزمائش میں ڈال دیا، ہمیں مشاعروں کی وہ روایتی شمع رہ رہ کر یاد آتی رہی، جو اپنی سرور انگیز لو کے ساتھ شاعروں کے درمیان مجرے کی طوائف بنی رہتی تھی، ہم چوکڑی مار کر بیٹھے تھے اور ہمارے جسم کے جو اعضا و جوارح مسند سے بغلگیر تھے، ان کے گوشت پر آرے چل رہے تھے اور یہ کسک ہماری بھربھری ہڈیوں کے گودے تک پہنچتی محسوس ہوتی تھی۔ ہم نے پینترا بدلا اور اکڑوں بیٹھ گئے، مگر یہ انداز ہمیں خود ہی بہت مضحکہ

خیز لگا۔ دوسرے ہمیں دکھائی ہی نہیں دیتے تھے جو اُن کے تاثرات کا اندازہ ہو سکتا۔ خواتین کا ردِّ عمل کیا تھا، ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہم دوزانو ہو گئے۔ جلدی ہی زانو بدلنا پڑا، لیکن عذاب کی شدّت میں کمی نہ آسکی۔ آخر ہم نے تمام لحاظ اُٹھا دیے، مسند کے سرے پر کھسک آئے اور پاؤں نیچے لٹکا کر بیٹھ گئے جیسے کوئی الھڑ دوشیزہ ادائے بے نیازی سے سب کے سامنے چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے ہاتھ باندھے بیٹھی ہو۔ ہمیں کچھ چین ملا تو سوچنے لگے، ہمارے مہمانِ خصوصی نجانے کس مٹی کے بنے ہوں گے، جو بتِ طناز کی صورت ڈٹے ہوئے تھے اور اَب تک سوائے منہ کے (وہ بھی اپنا کلام سنانے کے لیے) ان کے جسم کا کوئی حصہ متحرک نہیں ہوا تھا۔

ہمارے عذاب میں تخفیف ہوئی تو ہم اپنے گرد و پیش سے رابطہ جوڑنے میں لگ گئے۔ مشاعرہ اب جوبن پر تھا۔ ایک خاتون اپنا یا کسی اپنے کا کلام ترنم سے سنا رہی تھیں اور حاضرین پر وجد طاری تھا۔ نسوانی لے کا اپنا لوچ ہی بہت ہوتا ہے اور اُس میں اگر ترنم کی نغمگی شامل ہو تو سب کچھ دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ ہمیں انگلستان کا ایک مشاعرہ یاد آیا، جہاں ایک اکلوتی شاعرہ کوّوں میں چکوری بنی ہوئی تھی۔ اس کا کلام تو بدکلامی سے ملتا جلتا تھا، مگر اُس کی صورت، آواز اور ترنم شعلہ افشانی کر رہے تھے۔ اس کے ہر شعر پر ذوقِ نظر رکھنے والوں نے دل و جان سے داد دی اور بار بار سنا۔ غزل ختم ہو گئی، لیکن سامعین ابھی تسکین کو رو رہے تھے۔ ایک منچلے نے پوری غزل دوبارہ سنانے کی فرمائش کر دی، جو پوری ہوئی۔ بدذوق کہیں کا، ایک اور غزل کی التجا کر دیتا۔

داد و تحسین میں نہائی ہوئی شاعرہ کے بعد مہمانِ خصوصی سمیت دوسرے حاضر شعرا اپنے برسوں پہلے لکھے ہوئے اور بار بار سنائے ہوئے 'تازہ کلام' کی جگالی کرتے رہے اور ہم کھلی آنکھوں کے ساتھ بیٹھے بیٹھے سویا کیے۔ کبھی کبھی کسی نسوانی آواز کی دلکشی یا اچھے شعر پر داد کے شور سے ہماری مشقِ ناز ٹوٹ ٹوٹ جاتی۔ وہ تو خدا بھلا کرے منتظمین کا، جنھوں نے مشاعراتی روایت کو نبھاتے ہوئے مشاعرہ شروع کرنے میں اڑھائی گھنٹے کی تاخیر کر دی تھی۔ اس طرح ہماری مدّت جانکنی میں کمی ہو گئی، ورنہ ہمارا حشر ہو جاتا۔ ہمارا تو معمول ہی یہ رہا ہے کہ مشاعرہ کے ابتدائی مرحلہ ہی میں فارغ ہو کر دوسروں سے نظریں ملائے بغیر گھر لوٹ آتے تھے اور اخبارات میں چھپنے والی کارروائی پڑھ کر حاصلِ مشاعرہ اشعار سے لطف اندوز ہو لیتے۔ رندی کی لاج بھی رہ جاتی اور جنت کا دعویٰ بھی قائم رہتا، لیکن آج شب تو ہمیں لینے کے دینے پڑے ہوئے تھے۔

یوسف مرزا ...... ہم نے مشاعرے کی صدارت کی

خدا خدا کر کے کفر ٹوٹا اور فجر کی اذان کے ساتھ ناظمِ مشاعرہ نے ہمیں صدارتی کلمات کے لیے طلب کیا۔ ہم بصد خرابی ٹانگیں گھسیٹتے ہوئے مائک تک آئے۔ چیونٹیوں کے لشکر ہماری دونوں ٹانگوں میں بار برداری کا شغل فرما رہے تھے اور شاید اُن کے بوجھ سے ہمارے پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے۔ اس کو پاؤں بھاری ہونا تو نہیں کہتے نا! ہم نے صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا، ہماری اپنی آواز بہت دُور سے ہمارے کانوں میں آ رہی تھی اور ہمارے عالمِ تقریر کا مدعا عنقا دتھا۔ سامعین کے تھکے تھکے سے قہقہے احساس دلا رہے تھے کہ ہم کہنے والی باتیں ہی کہہ رہے ہوں گے۔ تقریب ختم ہو گئی تو ہم نے زبان سے فرداً فرداً میزبانوں کا شکریہ ادا کیا۔ ہمارے دلی جذبات زبان کا ساتھ دینے سے قاصر تھے۔ ہم نے مشاعرے کی فلم کے لیے اپنی فرمائش درج کرائی اور جب تک وہ فلم ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک نہ بن گئی، ہمیں چین نہ آیا۔ ہم وہ سب کچھ دیکھنے کو بے تاب تھے، جو تیز روشنی کے سیلاب کی وجہ سے وہاں نظر نہ آ سکا تھا اور... ہمارا خطبۂ صدارت تو ہمارے اندازِ بیان کا عکاس تھا۔ واقعی دُور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ راز آج بھی راز ہے کہ ہمیں صدارت کے لیے کس نے نامزد کیا تھا؟

* * *

ہم اور خانے

یوسف ناظم

کبھی تم نے غور کیا کہ ہم سب کتنے خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ غور کرنے کی تمہیں فرصت ہی کہاں ملی ہوگی۔ اتنا ڈھیر سارا تو ہوم ورک ہوتا ہے۔ پھر تھوڑا بہت گھر کا کام، تھوڑا بہت کھیل، لیکن اب ہمارے ساتھ غور کرلو۔

ہم جن خانوں میں بٹے ہوئے ہیں، انہیں گنتے جاؤ تو بس گنتے ہی رہو۔ ہم نے بھی گننے کی کوشش کی تھی، لیکن جلد ہی تھک گئے۔ کچھ خانے، جو بہت ضروری اور بہت مشہور ہیں، ہمیں یاد رہ گئے اور ہم دعا کرتے ہیں کہ ہمیں زیادہ خانوں سے واسطہ نہ پڑے۔

آدمی کو سب سے پہلے ایک 'غریب خانہ' چاہیے۔ سر چھپانے کی جگہ چھوٹی ہو یا بڑی، اچھی ہوں یا بُری، عالی شان ہو یا بے شان، غریب خانہ ہی کہلاتی ہے۔ جب کوئی آدمی اپنے گھر کسی کو کھانا کھلانے بلاتا ہے، تو یہی کہتا ہے کہ آج رات آپ کھانا غریب خانے پر کھایئے گا۔ جواب میں اُس شخص کو کہنا چاہیے کہ جی بہت اچھا، میں آپ کے دولت خانے پر حاضر ہو جاؤں گا۔ پریشان مت ہو کہ ایک ہی گھر کے دو نام کیسے ہوئے۔ یہی تو خوبی ہے اُردو زبان کی!

غریب خانہ بن جائے تو آدمی اُس میں سب سے پہلے 'باورچی خانہ' بناتا ہے۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے باورچی خانہ میں آگ سلگانا ضروری ہوتا ہے۔ گھر کا باورچی خانہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ صبح کے وقت باورچی خانے میں اُن برتنوں کا ڈھیر لگا ہوتا ہے، جو دِن بھر کے استعمال کے بعد دھوئے بغیر یونہی چھوڑ دیے گئے ہوں۔ رات کو بھلا کون برتن دھوتا ہے۔ برتن دھوئیں گے تو ٹی وی پر ڈرامہ کب دیکھیں گے۔ باورچی خانے میں اگر ہر چیز پھیلی ہوئی نہ ہو تو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ باورچی خانے اور دیوان خانے میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔

اِس باورچی خانے میں ایک 'نعمت خانہ' ہوتا ہے۔ نعمت خانہ اُس چھوٹی سی الماری کو کہتے

ہیں، جو اَب گھروں میں نہیں پائی جاتی۔ جب یہ الماری ہوا کرتی تھی، اِس میں دودھ، دہی اور کبھی کبھی کوئی مٹھائی سنبھال کر رکھی جاتی تھی۔ بچے اِسی نعمت خانے سے مٹھائی چُرا کر کھاتے تھے۔ اپنے ہی گھر میں چُرائی ہوئی مٹھائی کیوں اتنی لذیذ ہوتی تھی، کوئی نہیں بتا سکتا۔ آج جو لوگ والدین ہیں، انہوں نے بھی یہ کام ضرور کیا ہوگا۔ اسی لیے تو یہ الماری نعمت خانہ کہلاتی تھی۔ اب اس کی جگہ فریج رکھے جانے لگے ہیں۔ جن گھروں میں بچوں کو چُرا کر کوئی چیز کھانے کی ضرورت پیش نہیں آتی، وہ بھی باہر جا کر چوری چھپے کھٹی میٹھی چیزیں کھاتے ہی ہیں۔ نعمت کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو آسانی سے نہ ملے۔

گھر بڑا ہو تو اُس میں ایک 'دیوان خانہ' بھی ہوتا ہے۔ بچوں کو دیوان خانے میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی، بلکہ بعض گھروں میں تو بچوں کی ماں کا بھی دیوان خانے میں آنا اور کسی چیز کو ہاتھ لگانا منع ہوتا ہے۔ پھر بھی مائیں دیوان خانے میں پہنچ کر صاحبِ خانہ کا قلم اُٹھا لیتی ہیں اور اُس کی مدد سے پاجامے میں ازار بند ڈال کر قلم ایسی جگہ رکھ دیتی ہیں کہ سارا گھر بھی ڈھونڈے، تو یہ نہ ملے۔ دیوان خانے میں طرح طرح کے ملاقاتی آتے ہیں۔ آج کل دیوان خانے کو ڈرائنگ روم کہتے ہیں۔

اب ذرا گھر کے باہر چلو۔ یہ 'ڈاک خانہ' ہے۔ اِس کے بغیر بھی بھلا کوئی رہ سکتا ہے۔ کبھی تم نے سوچا کہ ڈاک خانوں میں، یا سڑکوں پر جو لیٹر بکس ہوتے ہیں، اُن کا رنگ لال کیوں ہوتا ہے؟ یہ خطرے کی علامت ہے۔ خطرہ اِس بات کا ہوتا ہے کہ تم جو خط اُس میں ڈالو گے، وہ پہنچے گا بھی یا نہیں۔ تمہارے نام جو اچھے اچھے رسالے بھیجے جاتے ہیں، اُن میں سے کچھ رسالے گم کیسے ہو جاتے ہیں؟ تمہارے نام اگر امریکا یا لندن سے کوئی خط آتا ہے، تو لفافے پر جو ٹکٹ لگے تھے، وہ کہاں گئے؟ کبھی کبھی تو لوگوں کے منی آرڈر کھو جاتے ہیں، پارسل گم ہو جاتے ہیں، لیکن کچھ بھی ہو، ڈاک خانہ ہے ضروری چیز۔ یہ نہ ہو تو ہم ادھورے رہ جائیں، دنیا سے ہمارا رشتہ ٹوٹ جائے۔

چلو ذرا 'شفا خانے' چلیں۔ شفا خانے کو لوگ عام طور پر 'دوا خانہ' کہتے ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے، اُمید اچھی رکھنی چاہیے اور زبان پر لفظ بھی اچھا آنا چاہیے۔ شفا خانے کے لفظ میں جو بات ہے، وہ دوا خانے میں نہیں ہے۔ دوا خانے کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں دوا ملتی ہے۔ صرف دوا لے کر کوئی کیا کرے گا؟ شفا خانے کے لفظ سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مریض کو شفا حاصل

رنگِ ادب پبلی کیشنز

یوسف ناظم ...... ہم اور خانے

ہوگی۔ دوا خانوں کو صاف ستھری حالت میں رکھنا مشکل تو ہے، لیکن ناممکن نہیں۔ اسی لیے وہ دوا خانے، جہاں ڈاکٹر، نرسیں اور وارڈ بوائے یہ سمجھ کر کام کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں، صاف ستھرے ہوتے ہیں اور صفائی علاج کی پہلی شرط ہے۔ صاف ستھری جگہ دیکھ کر ہی آدمی خوش ہو جاتا ہے اور ڈاکٹر اُسے اچھی طرح دیکھ لے، اُس سے اچھی طرح بات کرے، اُسے ہمت دلائے تو اُس کا آدھا مرض دُور ہو جاتا ہے۔

سب سے اچھا خانہ جو ہمیں پسند ہے، وہ 'کتب خانہ' ہے۔ کچھ لوگ تو اپنی ساری زندگی کتب خانے میں ہی گزار دیتے ہیں۔ یہ بھی کوئی بہت اچھی بات نہیں ہے۔ آدمی کو ہوا خوری بھی کرنی چاہیے، مناظر سے بھی لطف اندوز ہونا چاہیے۔ کتب خانے میں جگہ جگہ یہ نوٹس لگا ہوتا ہے، ''شور مت کیجیے۔'' ظاہر کہ کتب خانہ، کتب خانہ ہوتا ہے، ریلوے پلیٹ فارم نہیں ہوتا۔ کتب خانوں میں ایک مشکل ضرور ہوتی ہے کہ پورا اخبار پڑھنے کے لیے بہت گھومنا پڑتا ہے۔ اور اخبار میں پوری خبر ایک صفحے پر چھاپنا منع ہے۔ معلوم نہیں، اِس میں اخبار والوں کی کیا مصلحت ہوتی ہے۔ ایک خبر کا باقی حصہ پڑھنے کے لیے اتنا وقت صَرف ہو جاتا ہے کہ آدمی بھول جاتا ہے کہ اُس نے پہلے پڑھا کیا تھا۔

کتب خانوں میں بہت سے لوگ پڑھتے کم ہیں، لکھتے زیادہ ہیں۔ کوئی بھی کتاب لیں گے، تو اُس کے ہر صفحے پر اپنی رائے ضرور لکھیں گے۔ لکھنا ہی ہے تو گھر بیٹھ کر خود ایک کتاب کیوں نہیں لکھ لیتے؟ کچھ کتابوں سے تو بیچ کے صفحے بھی غائب ہوتے ہیں۔ یہ کون لے جاتا ہے؟ کتب خانے کو جو لوگ اپنے گھر کا نعمت خانہ سمجھتے ہیں، انہیں یہ خبر نہیں ہے کہ چُرایا ہوا علم ہضم نہیں ہوتا۔ کتب خانہ تو وہ جگہ ہے، جہاں اچھی اچھی کتابیں تحفے کے طور پر پہنچانی چاہییں۔ اسکولوں اور کالجوں میں جانے سے آدمی تعلیم یافتہ ہوتا ہے، لیکن تعلیم یافتہ لوگوں کو اگر عالم فاضل بننا ہے، تو اس کے لیے انہیں کتب خانے ہی جانا پڑے گا۔ یہاں فیس کم ہوتی ہے اور علم زیادہ ہوتا ہے۔

اِن خانوں کے علاوہ اور بھی کئی خانے ہیں، اچھے بھی اور بُرے بھی۔ ہماری سمجھ میں جو آئے، اُن خانوں کا ذکر ہم نے کر دیا۔ باقی کی خانہ پُری تم کرو۔

* * *

انور احمد علوی

کتابیات

رنگِ ادب پبلی کیشنز

کتب

کتاب	مصنف/مرتب	سنہ اشاعت	ناشر
اُردو اَدب کی سدابہار مزاحیہ تحریریں	اقرار حسین شیخ	2011	دی بکس اسلام آباد
لکھ رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ	ایس ایچ جعفری	2011	رائٹرز بک فاؤنڈیشن امروہہ سوسائٹی کراچی
بزمِ مزاح (2011)	انور احمد علوی	2012	بزمِ مزاح پوسٹ بکس نمبر 492 کراچی جی پی او74200
اسرافِ باہمی	انور احمد علوی	2010	بزمِ مزاح پوسٹ بکس نمبر 492 کراچی جی پی او74200
باأدب بامحاورہ ہوشیار!	نادر خان سرگروہ	2012	الکتاب گرافکس بیرون بوہڑ گیٹ ملتان
خوب سے خوب تر	ابوالفرح ہمایوں	2008	اکادمی بازیافت کتاب مارکیٹ اُردو بازار کراچی
شگوفہ زار	خواجہ عبدالغفور	1977	نئی آواز جامعہ نگر نئی دلی
اُردو کی آخری کتاب	ابن انشا	1971	لاہور اکیڈمی چوک اُردو بازار لاہور
مکمل مزاحیات	معاذ حسن	2006	علم العرفان پبلشرز اُردو بازار لاہور
پیچ در پیچ	مظفر بخاری	1993	مکتبہ القریش اُردو بازار لاہور
سقراط سے شیخ چلی تک	رفیع الدین راز	2010	رنگِ ادب پبلی کیشنز کراچی
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	1998	سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور
فلمی الف لیلیٰ (حصہ اوّل)	علی سفیان آفاقی	....	اٹلانٹس پبلی کیشنز سائٹ کراچی
بہترین مزاحیہ تحریریں	اعظم گیلانی	2003	علم دوست پبلی کیشنز لوئر مال لاہور
حکیم فخر الدین	ملک دیوانا	2006	قلم کار قلم پاکستان کراچی
اُمرزدگیاں	امر	2006	اوراق پبلشرز کراچی
سفرنامہ سبزی منڈی	محمد انوار احمد	2011	مطلعِ انوار ناظم آباد کراچی
مزاح برائے فروخت	مرزا عابد عباس	2009	بزمِ مزاح پوسٹ بکس نمبر 492 کراچی جی پی او74200
شہرت کی خاطر	نظیر صدیقی	1979	اُردو اکیڈمی سندھ کراچی

انور احمد علوی

بس گائیڈ	انور احمد علوی	1999	ویلکم بک پورٹ اُردو بازار کراچی
وسیلۂ ظفر	انور احمد علوی شوکت جمال	2010	اکادمی بازیافت کتاب مارکیٹ اُردو بازار کراچی
حفظِ ماتبسّم	وحید الرحمٰن خان	1998	الرزاق پبلی کیشنز ٹمپل روڈ لاہور
جدید اُردو انشائیہ	اکبر حمیدی	1991	اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد
مزاحیہ کہانیاں	اطلس حسینی	......	کلیکشن بکس شاہ فیصل کالونی کراچی
تبسّم برطرف	محمد اکرام سرا	2008	بیت الحکمت لاہور
قلم آرائیاں	خادم حسین مجاہد	2008	حق پبلی کیشنز اُردو بازار لاہور
ماورائے تبسّم	خورشید احمد عون	2013	سلطان پبلشرز کمال آباد راولپنڈی
گل افشانیٔ گفتار	اقبال ساغر صدیقی	1987	کاروانِ ادب ملتان صدر
نیرنگِ مزاح	شجاع الدین غوری	2013	سٹی بک پوائنٹ اُردو بازار کراچی
کون سے کام بند ہیں!	مرزا عاصی اختر	زیرِ طبع	بزمِ مزاح پوسٹ بکس نمبر 492 کراچی جی پی او 74200
دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ	مرزا فرحت اللہ بیگ	1977	عشرت پبلشنگ ہاؤس اسپتال روڈ لاہور
اچھا تو جناب ہیں!	آزاد رشیدی	1998	عادل کتاب گھر سکھر
خان کی ڈائری	محمد اصغر خان	2005	بزمِ تخلیقِ ادب پاکستان کراچی
تماشا کہیں جسے	مشکور حسین یاد	2009	کلاسیک دی مال لاہور
اُردو کی آخری مکمل کتاب (پارٹ I)	عرفان احمد خان	2003	ٹی این ٹی پبلشرز لاہور
اُردو کی آخری مکمل کتاب (پارٹ II)	عرفان احمد خان	2004	دعا پبلی کیشنز لوئر مال لاہور
قطعِ کلام	رعنا فاروقی	1989	مکتبۂ ہم زبان پوسٹ بکس نمبر 11533 کراچی 74800
ایک غیر مطبوعہ کتاب	فخر الدین کیفی	2013	فخر الدین کیفی D-97 میر خان کالونی لطیف آباد نمبر 12 حیدر آباد
مثبت نتائج	زاہد ملک	1979	مطبوعاتِ حرمت بینک روڈ راولپنڈی
تبسّم زیرِ لب	مسعود احمد چیمہ	1993	ورڈ ویژن پبلشرز بلیو ایریا اسلام آباد
اولادِ آدم	محمد منور	1973	مکتبہ اُردو ڈائجسٹ سمن آباد لاہور
اے دوست	ڈاکٹر محمد محسن	1996	سیّد اینڈ سیّد ایم اے جناح روڈ کراچی

رنگِ ادب پبلی کیشنز

بے ساختہ	قاسم بن نظر	2007	ادارۂ انشاء پوسٹ بکس نمبر 8712 صدر کراچی
نقش ہائے رنگ رنگ	نظیر صدیقی	1977	کاروانِ اَدب ملتان صدر
کہے بغیر	عثمان جامعی	2011	سٹی بک پوائنٹ اُردو بازار کراچی
سخن ہائے ناگفتنی	مظفر علی سیّد	2004	اکادمی بازیافت کتاب مارکیٹ اُردو بازار کراچی
بات سے بات	حمیرا اطہر	2007	رب پبلشرز کراچی
طنزیاتِ مان پوری	مظفر بخاری	1995	مکتبہ القریش اُردو بازار لاہور
ماسٹر صاحب،	دری کتاب	2005	بک گروپ پی ای سی ایچ ایس کراچی
ہوائیاں	ڈاکٹر رؤف پاریکھ	1992	فرید پبلشرز اُردو بازار کراچی
طنز و مزاح 81ء	منصور قیصر	1982	مطبوعاتِ حرمت بینک روڈ راولپنڈی
یہ اقبالیے!	شجاع الدین غوری	2011	بزمِ مزاح پوسٹ بکس نمبر 492 کراچی جی پی او 74200
اُردو اَدب میں طنز و مزاح کی روایات	......	......	کلاسیک دی مال لاہور
مجبوریاں	ڈاکٹر اقبال ہاشانی	......	......
چچا چھکن	سیّد امتیاز علی تاج	......	ویلکم بک پورٹ اُردو بازار کراچی
وارے نیارے	مہزاد سحر	1997	گورا پبلشرز لمیٹڈ لوئر مال لاہور

رسائل و جرائد

رسالہ	مدیرِ اعلیٰ / مدیر	شمارہ
سہ ماہی 'مزاح پلس' کراچی	شوکت جمال، انور احمد علوی، نعیم نیازی سائرہ غلام نبی، ڈاکٹر عابد علی، محمد اصغر خان	شمارہ 1 تا 18 (اپریل 2008ء تا مارچ 2014ء)
ماہنامہ 'شگوفہ' حیدر آباد دکن	ڈاکٹر سیّد مصطفیٰ کمال	جون 1985
ماہنامہ 'سپوتنک' لاہور	آغا امیر حسین	اکتوبر 1996
نقوش (طنز و مزاح نمبر)	محمد طفیل	......
ماہنامہ 'چشمک' لاہور	مشکور حسین یاد	مئی 1989
ماہنامہ 'زعفران' لاہور	ظفر اللہ خان / اسرت پراچہ	اگست 1973
ماہنامہ 'زعفران' لاہور	ظفر اللہ خان / اکرام غازی / اسد اللہ غالب	نومبر 1977

ماہنامہ ’زعفران‘ لاہور	ظفر اللہ خان/ اکرام غازی/ اسد اللہ غالب	دسمبر 1977
سہ ماہی ’ظرافت انٹرنیشنل‘	ضیاء الحق قاسمی	اکتوبر تا دسمبر 2005
سہ ماہی ’ظرافت انٹرنیشنل‘	ضیاء الحق قاسمی	جولائی تا ستمبر 2006
ماہنامہ ’زعفران‘ لاہور	مشکور حسین یاد/ ظفر اللہ خان اکرام غازی/ فرید الدین احمد	مئی 1972
’اردو پنچ‘ راولپنڈی	سیّد ضمیر جعفری/ کرنل محمد خاں ڈاکٹر صفدر محمود/ سلطان رشک	شمارہ 1989-3-4
سہ ماہی ’خوش نما‘ اسلام آباد	سرفراز شاہد	جولائی تا ستمبر 2011
ماہنامہ ’شگوفہ‘ حیدر آباد دکن	ڈاکٹر سیّد مصطفیٰ کمال	جون 2004
ماہنامہ ’شگوفہ‘ حیدر آباد دکن	ڈاکٹر سیّد مصطفیٰ کمال	نومبر 2007
ہفت روزہ ’لیل و نہار‘ لاہور	......	11 اگست 1957
’اردو پنچ‘ راولپنڈی	سیّد ضمیر جعفری/ کرنل محمد خاں ڈاکٹر صفدر محمود/ سلطان رشک	شمارہ 1984-1-2-3-6
ہفت روزہ ’لیل و نہار‘ لاہور	......	14 اپریل 1963
ماہنامہ ’زعفران‘ لاہور	مشکور حسین یاد/ ظفر اللہ خان/ اکرام غازی	جون 1972

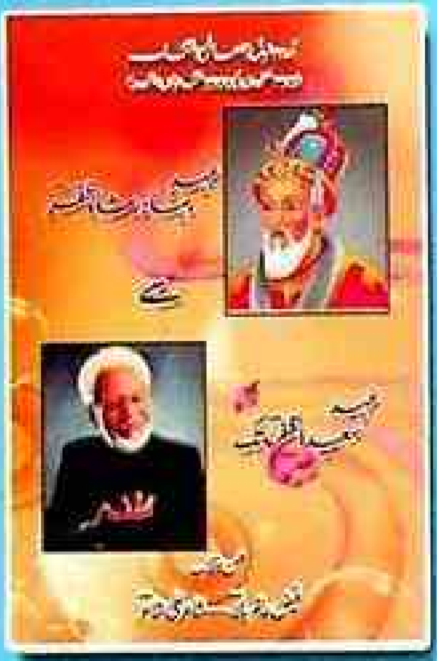
سے

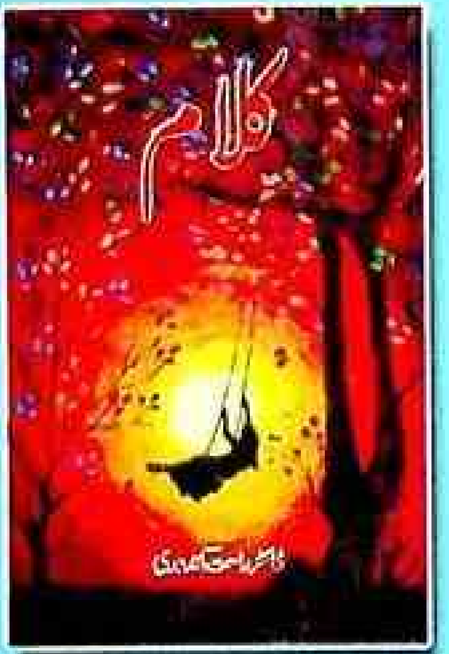
کلام

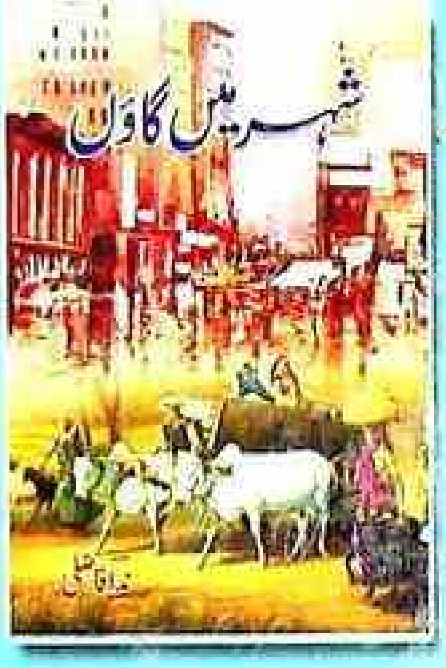
شہر میں گاؤں

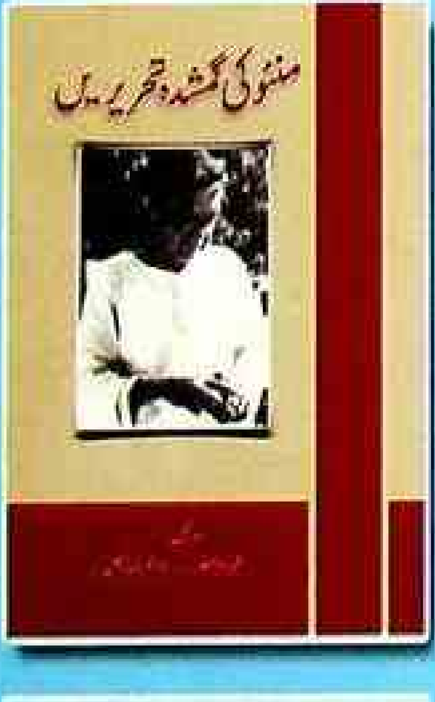
منٹو کی گمشدہ تحریریں

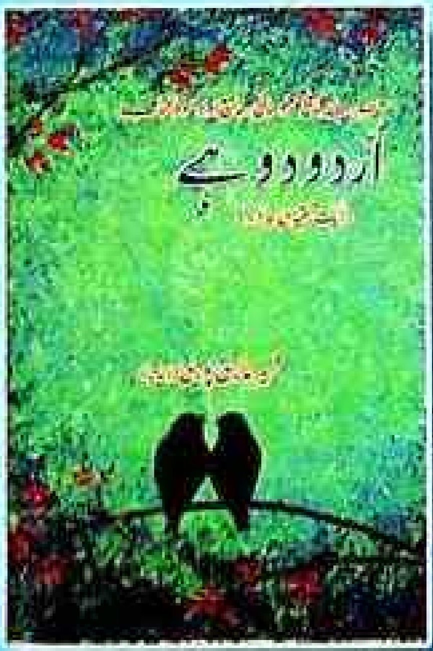
اُردو دوہے

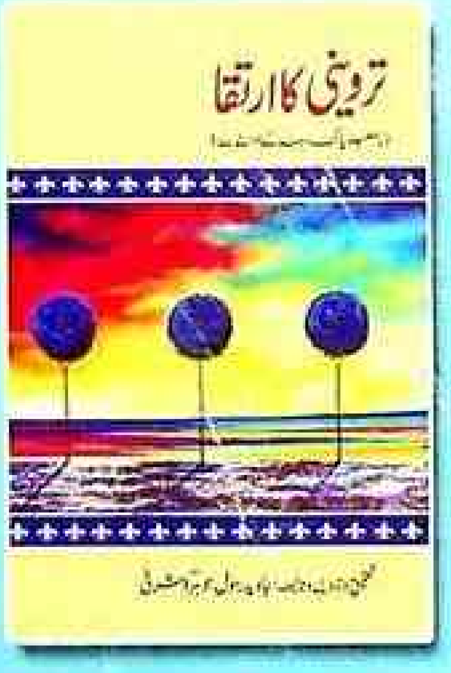
تروینی کا ارتقا

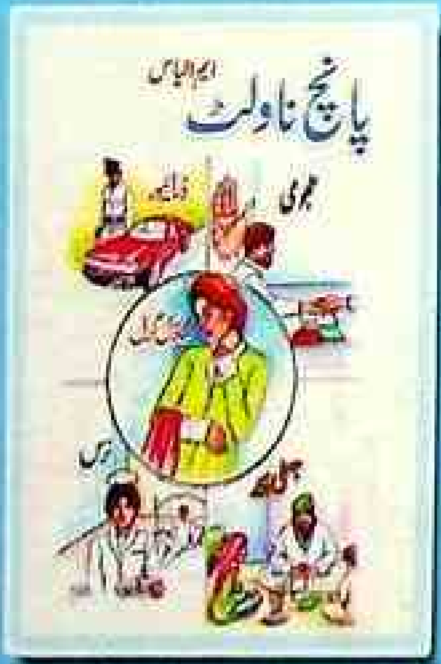
ایم الیاس
پانچ ناولٹ

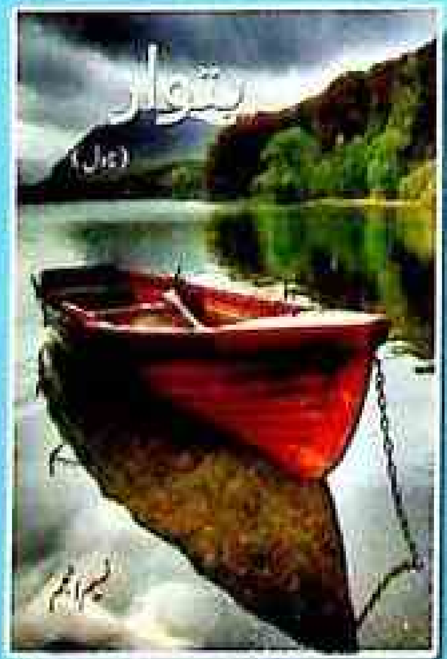
پتوار
(ناول)
نسیم انجم

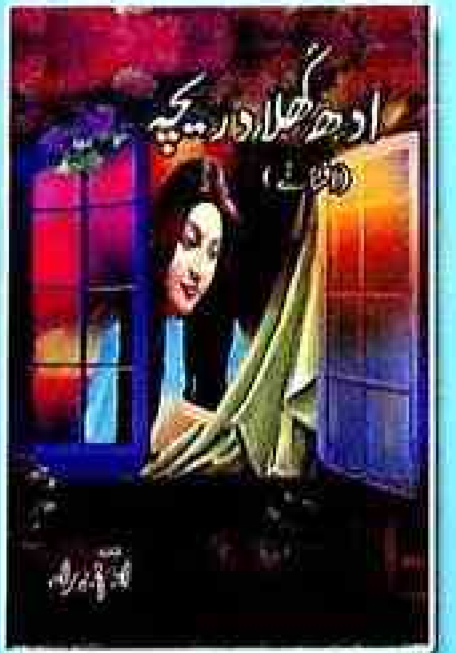
ادھ کھلا دریچہ

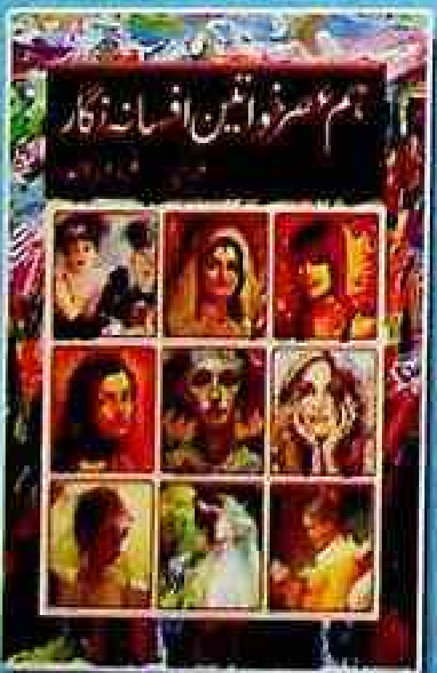
ہم عصر خواتین افسانہ نگار

ہم عصر اُردو افسانہ

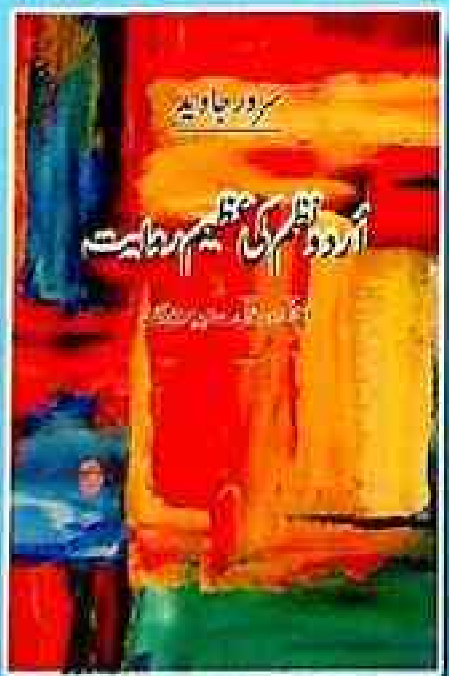
سرور جاوید
اُردو نظم کی تفہیم